علم و ادب کا معیار

سورج

سہ ماہی

مدیر: تسلیم احمد تصور

گوشۂ اختر شیرانی

- شاعرِ رومان اختر شیرانی کی غیر مطبوعہ تحریریں اور تصویریں
- کیا سلمیٰ کے پردے میں بلقیس تھی؟ بلقیس کے محبت نامے منظرِ عام پر

میرزا غالب کی وفات سے 6 برس قبل شائع ہونے والا

دیوانِ غالب مطبوعہ آگرہ 1863ء

اس نادر و نایاب نسخے کا مکمل عکس پہلی مرتبہ قارئینِ سورج کی نذر

- یونیورسٹی کانووکیشن میں مشتاق احمد یوسفی کا ایک اچھوتا مسکراتا خطبہ صدارت
- نوید انجم - ایک گم شدہ افسانہ نگار
- میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں؟ ڈاکٹر سلیم اختر
- پاکستان کا خیال سب سے پہلے غالب نے پیش کیا تھا۔ مصور اقبال اسلم کمال
- مولانا حالی کی ایک نایاب تحریر
- اردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ

بین الاقوامی غالب سیمینار - نئی دہلی

—— کفایت دہلوی کی رپورٹ

جلد 35 شمارہ 2

اکتوبر تا دسمبر 2006ء

سالنامہ 2006

علم و ادب کا معیار

سُورج

سہ ماہی

Quraterly

SURAJ

Lahore

قیمت:
600 روپے
بھارت
-/1000 انڈین روپے
دیگر ممالک 40 امریکی ڈالر

مدیر: تسلیم احمد تصور

اشاعت کا 35 واں سال

خط و کتابت کے لیے:

6/A نصیر الدین روڈ، اسلام پورہ، لاہور۔ پاکستان فون: 7226970

E-mail: surajquarterly@yahoo.com

رابطے کے لیے:

میاں چیمبرز 3۔ ٹمپل روڈ، لاہور۔ فون: 6280305

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی بھاگلپور، بھارت

شبہ طراز لاہور، پاکستان

عبدالاحد ساز ممبئی بھارت

اوریا مقبول جان، لاہور۔

پروفیسر جلیل نقوی، لاہور

ڈاکٹر مشتاق اعظمی آسنسول، بھارت

اصغر مہدی، کراچی

پروفیسر شمیم حنفی۔ نئی دہلی

گلشن کھنہ، برطانیہ

ترنم ریاض، نئی دہلی

خالد اقبال یاسر، لاہور

ڈاکٹر انجم رحمانی، لاہور

امریکہ کے شہر ہوسٹن میں مقیم

ڈاکٹر خالد حمید شیدا (ایم ڈی)

نے اردو ادب کا دامن لازوال فارسی اشعار سے بھر دیا

غالب، حافظ، خسرو اور اقبال کی فارسی غزلیات کا منظوم اردو ترجمہ

سہ ماہی **سوج** لاہور

کی جانب سے محسنِ اردو ڈاکٹر خالد حمید شیدا کی مایۂ ناز خدمات کا اعتراف

ڈاکٹر خالد حمید شیدا نمبر

آئندہ شمارہ • ایک شہ پارہ

غالب کی قریباً 300 فارسی غزلیات کا منظوم اردو ترجمہ

شامِ غریب ۔ ڈاکٹر صاحب کا غیر مطبوعہ مجموعہ کلام

حافظ، خسرو اور اقبال کے منظوم تراجم

اور بہت کچھ

سفید کاغذ • دیدہ زیب طباعت • مضبوط جلد

جنرل منیجر
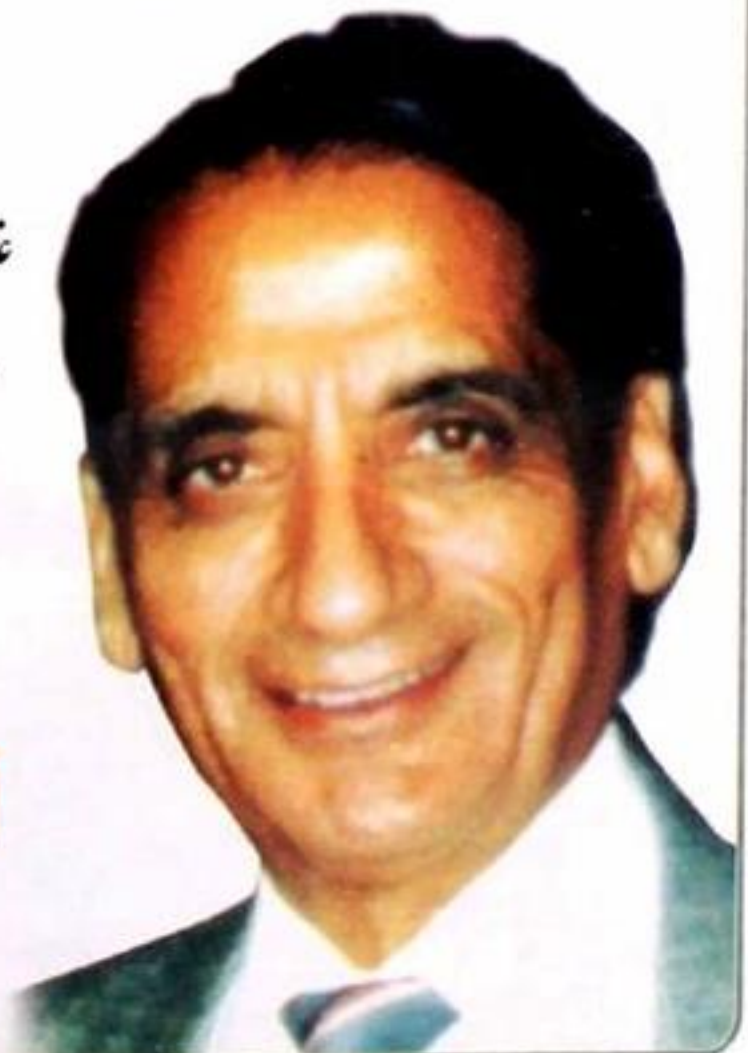
علم وادب کا معیار

سہ ماہی

سورج

Quarterly

SURAJ

Lahore

جناب ابوسعید احسن اصلاحی

سرپرست غالب میموریل ٹرسٹ

جناب شمشاد احمد خاں

سابق سیکریٹری خارجہ پاکستان

اور

ممتاز بینکار جناب تجمل حسین بخاری

کے نام

سالنامہ 2006

سہ ماہی ''سورج'' لاہور
درج ذیل مقامات پر بھی دستیاب ہے

کراچی

ویلکم بک پورٹ، اردو بازار، کراچی

لاہور

بک ہوم، بک سٹریٹ، مزنگ روڈ، لاہور
ماورا بکس، شاہراہ قائداعظم، لاہور
رابطہ دفتر ''سورج'' میاں چیمبرز 3-ٹمپل روڈ، لاہور

اسلام آباد

مسٹر بکس، سپر مارکیٹ، اسلام آباد

راولپنڈی

بک سنٹر، حیدر روڈ، راولپنڈی۔

پشاور

سعید بک بنک، ارباب روڈ، پشاور

کوئٹہ

ناشاد بکس، جناح روڈ، کوئٹہ

گوادر

البدر بک سنٹر، فاضل چوک، گوادر، بلوچستان

کرنیں

گوشۂ اختر شیرانی

سرور کائنات خاتم النبین حضرت محمد ﷺ کے حضور اختر شیرانی کا ہدیۂ نعت

غزلیات

اختر شیرانی کی یاد میں

اختر شیرانی کے خطوط

خصوصی پیشکش

اختر شیرانی کے نام خطوط

نادراتِ اختر شیرانی

تحقیق کے آئینے میں

داستان طرازی

ایک گمشدہ افسانہ نگار

مشتاق احمد یوسفی کو پڑھیے

یاد رفتگاں

افسانے سے ڈرامے تک

نوائے سروش

ندیم بنام بھوپالی

غزلیات

کلام شاعر بقلم شاعر

اظہارِ خیال

کوئی میرؔ بھی تھا

ایوان غالب

ایک کتاب، دو ملک — مطالعہ خصوصی

دیوان غالب مطبوعہ آگرہ 1863ء

جہان اُردو

کرن کرن اجالا

'سورج' خرید کر پڑھیے ○ سورج کو روشن رکھیے

پاکستان میں :

'سورج' پوری قیمت پر بذریعہ وی پی منگوائیے۔ ڈاک خرچ جو اندرون ملک ہو یا بیرون ملک آسمان کو چھونے لگا ہے۔ ادارہ ادا کرے گا۔ یاد رہے کہ سورج کے ہر شمارے کی قیمت ضخامت کے اعتبار سے مقرر کی جاتی ہے۔

بیرون ملک :

'سورج' کی قیمت کے مطابق امریکی ڈالرز کا پے آرڈر/ بنک ڈرافٹ جو لاہور کے کسی بنک کا بنام *Quarterly SURAJ Lahore* بذریعہ رجسٹرائر میل درج ذیل پتے پر ارسال کیجیے۔

سہ ماہی 'سورج' *6-A*، نصیر االدین روڈ، اسلام پورہ، لاہور پاکستان

فون: *92-42-7226970*

بھارت میں قارئین 'سورج' توجہ فرمائیں

دہلی میں ہمارے عزیز دوست ماہنامہ 'فلمی ستارے' کے مدیر کفایت دہلوی اعزازی طور پر 'سورج' کی نمائندگی کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں۔ بھارتی احباب 'سورج' کی قیمت انڈین کرنسی میں بذریعہ منی آرڈر/ بنک ڈرافٹ بنام جناب کفایت اللہ مکان 2072-73 گلی قطب الدین، کلاں مسجد، بازار ترکمان گیٹ، دہلی۔ پوسٹ کوڈ: 110006 فون نمبر: *23280007* بھجوا سکتے ہیں۔

جنرل منیجر

پہلی کرن

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب گیت دیکھے نہیں سنے جاتے تھے۔ ٹیلی ویژن اور کیبل کا دور نہیں آیا تھا۔ ترقی ضرور ہوئی تھی۔ بس اتنی کہ کسی کسی گھر میں گراموفون کی جگہ ریڈیو نے لے لی تھی اور یہ اس محلے کا ذکر ہے جس کے صرف ایک گھر میں ریڈیو تھا۔ اور گھر والے اُس کی آواز اتنی بلند رکھتے تھے کہ گلی میں سے گزرنے والے گیتوں کا فرمائشی پروگرام سُننے کے ساتھ ساتھ ایک بجے کی خبریں بھی بآسانی سن سکتے تھے۔ اس لیے یہ ریڈیو والا گھر کہلاتا تھا۔ یہ ریڈیو والا گھر مجھے آج برس ہا برس گزر جانے کے باوجود یاد ہے۔

مجھے یاد ہے کہ صبح سویرے سکول جاتے ہوئے شمشاد بیگم کی مدھر آواز میں ایک غزل کے اشعار میرے کانوں میں اُترتے۔

تو جانِ آرزو ہے ، تو ایمانِ آرزو

میرے اُٹھتے قدم رُک جاتے۔ یوں محسوس ہوتا جیسے آواز کے دوش پر کہیں دور اُڑا چلا جا رہا ہوں۔ سکول دیر سے پہنچنے اور ٹیچر کے ہاتھوں پٹائی کا خوف دماغ کے کسی کونے سے سر اٹھاتا مگر میں غزل کے ختم ہونے تک خود کو ایک جگہ کھڑے رہنے پر مجبور پاتا۔

یہ اختر شیرانی سے میرا پہلا تعارف تھا جو شمشاد بیگم نے مجھ سے کرایا۔ سکول سے میں کالج میں آ گیا۔ اب اختر شیرانی سے میرا تعلق بے تکلفی کا ہو گیا تھا۔ مجھے معلوم تھا سلمٰی کون ہے؟ ریحانہ کہاں رہتی ہے؟ عذرا کا کیا قصہ ہے؟ ----- اب میں خود شاعر تھا اور اختر شیرانی کا پیروکار، شمشاد بیگم کی گائی ہوئی غزل کے رسیلے بول کا جادو آج بھی میرے دل و دماغ کو گھیرے ہوئے تھا۔ میں نے اس غزل کے علاوہ اختر شیرانی کی کئی زمینوں میں طبع آزمائی بھی کی۔ 'اے عشق کہیں لے چل' اور میں چلتا رہا۔ فیض نے

مجھے ٹوکا' اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا' میں نے نیم دلی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ دل نے کہا' ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں' اور دن گزرتے رہے۔ کیلنڈر کے ورق بدلتے رہے۔

ایک روز مجھے معلوم ہوا۔ اختر شیرانی کے صاحبزادے شیخوپورہ کے کسی کالج میں پڑھاتے ہیں۔ سچی بات ہے۔ مجھے عجیب سا لگا۔ اختر شیرانی ----- اردو شاعری کے اہم ترین باب کا عنوان، میری جوانی کے ابتدائی دنوں کا ایک خواب مسلسل ----- اس کا ایک بیٹا ہے جس سے ملا جا سکتا ہے۔ اختر شیرانی کی باتیں کی جا سکتی ہیں۔ کسی نے بتایا، بڑا پڑھا لکھا آدمی ہے، بہت لیے دیے رہتا ہے مجھے بڑی بوریت ہوئی ----- اور پھر نہ مل سکا۔

گزشتہ برس شاعرِ رومان اختر شیرانی کا صد سالہ جشن ولادت تھا۔ پاکستان کے محکمہ ڈاک نے یادگاری ٹکٹ جاری کیا۔ مختلف شہروں میں تقاریب کا اہتمام کیا گیا۔ اور ایک روز میں جی۔سی یونیورسٹی لاہور کے شعبہ فارسی میں ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی کے سامنے بیٹھا تھا۔ اختر شیرانی کے صاحبزادے ان دنوں ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد جی۔سی یونیورسٹی کے شعبہ فارسی سے وابستہ ہیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ میں "سورج" کے لیے گوشۂ اختر شیرانی ترتیب دینا چاہتا ہوں۔ اور ان کے تعاون کا متمنی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے میری درخواست کو بھرپور انداز میں پذیرائی دی۔

حافظ محمود شیرانی اردو زبان و ادب کا ممتاز ترین نام ----- آپ کے علم و فضل کا ایک زمانہ معترف ہے۔ سنا ہے کہ طالب علموں کی پذیرائی میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ ان دونوں خصوصیات کا عکس حافظ صاحب کے ذی وقار پوتے سے ہونے والی ملاقاتوں میں مجھے بارہا نظر آیا۔

گوشۂ اختر شیرانی میں صاحبِ گوشہ کی نایاب تصاویر کے علاوہ ان کا بہت سا کلام اور خطوط بھی شائع کیے گئے ہیں۔ چند خطوط مختلف مشاہیر کے ہیں۔ خطوط کے حصے میں تین خطوط ایسے ہیں جنھیں حاصلِ گوشہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ خطوط بلقیس کے ہیں جو اختر شیرانی کے نام ہیں۔ سلمیٰ کا نام اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ کے لیے رقم ہو چکا ہے۔ لیکن یہ بلقیس کون تھی؟ ہمیں کلام اختر میں یہ نام کہیں نہیں ملتا۔ ایسا تو نہیں کہ سلمیٰ کے پردے میں اصل نام بلقیس ہی کا ہو؟ بلقیس کے یہ محبت نامے پہلی بار منظر عام پر لائے جا رہے ہیں۔

اختر شیرانی کا ایک مجموعہ کلام 'شعرستان' کا دیباچہ فیض احمد فیض نے لکھا تھا۔

اس نایاب تحریر کا عکس بھی شاملِ اشاعت ہے۔

ڈاکٹر خورشید رضوی، سید افضال حسین زیدی، جمیل یوسف، مسعود احمد برکاتی اور دیگر ممتاز اہل قلم کے علاوہ احمد ندیم قاسمی مرحوم کی ایک یادگار تحریر بھی شامل ہے۔ جس میں انھوں نے اختر شیرانی کے حوالے سے یادوں کے چراغ روشن کیے ہیں۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے پہلی مرتبہ اپنے والد گرامی کے بارے میں قلم اٹھایا اور 'بھا جی' کے عنوان سے ایک نہایت خوبصورت شہ پارہ تخلیق پا گیا۔ داؤد رہبر نے ذاتی مخاصمت کی بناء پر ایک تحریر میں اختر شیرانی کے بارے میں من گھڑت باتیں منسوب کر دی تھیں ڈاکٹر صاحب نے اردو ادب پر احسان کیا کہ بدنیتی پر مبنی اس افترا پردازی کا مدلّل و مفصّل جواب تحریر کیا۔ تاکہ تاریخ کے صفحات پر اختر شیرانی جیسی بلند پایہ شخصیت کے حوالے سے صرف اور صرف حقائق جگہ پا سکیں۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ مفصّل مقالہ 'چہ دلاور یست وزدے' کے عنوان سے مختلف دستاویزات کی نقول کے ساتھ شامل اشاعت ہے۔

گوشۂ اختر شیرانی کی اشاعت ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی کی نوازشاتِ بے پایاں کی مرہونِ منت ہے۔ ڈاکٹر صاحب! شکریہ، بے حد شکریہ۔

داستان طرازی کے باب میں بھی بہت کچھ ہے۔ ایک عنوان ہے 'گم شدہ افسانہ نگار' ------ اس مرتبہ جو گم شدہ افسانہ نگار ہم ڈھونڈ کر لائے ہیں وہ ہیں نوید انجم ------ نوید انجم کہاں ہیں؟ کس حال میں ہیں؟ ہمیں معلوم نہیں ہو سکا۔ ہم ان کی تصویر بھی شائع کرنا چاہتے تھے۔ افسوس! وہ بھی نہ مل سکی ------ دیکھیے تو سہی کیسی کیسی مرصع کہانیاں لکھنے والا خود کہانی بن گیا۔

آپ افسانہ کیونکر لکھتے ہیں؟ ہم نے پوچھا ڈاکٹر سلیم اختر سے، ڈاکٹر صاحب جواب لکھنے بیٹھے تو چار برس سے جمی برف بھی پگھل گئی اور ایک افسانہ ''بلی'' بھی لکھا گیا۔ 'آئس برگ' کے عنوان سے لکھا جانے والا جواب اور یہ افسانہ دونوں نذر قارئین ہیں۔

پروفیسر جلیل نقوی ہمارے بہت مہربان اور شفیق دوست ہیں انھوں نے ''سورج'' کے لیے فارسی ادب کے ممتاز قلم کار محمد علی جمال زادہ کی کہانی کو اردو قالب میں ڈھالا ہے۔ ''مرغوب'' پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ یہ کہانی اردو ہی میں لکھی گئی تھی۔

محمد سعید شیخ، بشریٰ رحمٰن، خالد فتح محمد، پروین عاطف، نیلم احمد بشیر اور دیگر لکھنے والوں کے علاوہ ہمارے ہمسایہ ملک بھارت سے دو نہایت خوبصورت کہانیاں ''سورج'' کے صفحات کی زینت ہیں۔ انھیں لکھا ہے آسنسول کے مشتاق اعظمی اور ممبئی

کے مراق مرزا نے۔

مزاح لکھنا بہت مشکل کام ہے اور مزاح کو سمجھنا اس سے بھی مشکل کام۔ مزاح لکھنے اور سمجھنے والوں نے یک زبان کہا ہے کہ ہم مزاح کے عہد یوسفی میں زندہ ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی کا تازہ ترین شہ پارہ ''پانچواں شیر'' پڑھیے اور بتایئے کیا جادو اثر تحریر ہے۔ عقل دنگ ہے۔ یوسفی صاحب یہ سب کچھ کیسے لکھ پاتے ہیں۔

نوائے سروش کے عنوان سے پاک و ہند کے منتخب شعرائے کرام کی نظمیں، گیت اور غزلیں آپ کے ذوق مطالعہ کی نذر ہیں۔ ''سورج'' کے ایک شمارے میں معروف ادیب اور شاعر شہزاد احمد شہزاد نے بتلایا تھا کہ نثر لکھنا شاعری سے زیادہ مشکل کام ہے۔

امریکہ میں مقیم معروف بھارتی دانشور ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے شہزاد احمد کے موقف سے اختلاف کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے کیا لکھا؟ انھیں کی تحریر میں آپ دیکھ سکیں گے، آئندہ صفحات پر، بشریٰ شریف لائی ہیں۔ میر تقی میر کی ایک غزل کے مختلف انگریزی تراجم، یہ اہم مقالہ بھی نوائے سروش کا حصہ ہے۔

تنقید و تحقیق کے لیے وقف صفحات میں ظفر علی راجا خط اور خطاطی کے مزید بہت سے چھپے گوشوں کو روشن کر رہے ہیں۔ اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ کے بارے میں بھی ڈاکٹر روبینہ ترین کا ایک پرمغز مقالہ زیر نظر شمارے کا حصہ ہے۔

خط اور فن خطاطی کی مختصر تاریخ کا دوسرا حصہ شاملِ اشاعت ہے۔ جبکہ عذرا اصغر کا ناول 'مسافتوں کی تھکن' بھی ایک دلچسپ موڑ پر آ پہنچا ہے۔ قارئین کرام آئندہ دونوں مقبول سلسلے کتابی صورت میں پڑھ سکیں گے۔ جو عنقریب منظر عام پر آ رہی ہیں۔

اور اب ذکر ایک نادر و نایاب تحریر کا ----- شطرنج کے موضوع پر ایک تقریظ لکھی گئی۔ کتاب 1901ء میں شائع ہوئی۔ اور تقریظ لکھنے والے تھے ممتاز مصلح قوم مولانا الطاف حسین حالی۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مولانا کو شطرنج کے کھیل سے بھی دلچسپی تھی۔

زیر نظر شمارے میں ڈاکٹر سلیم اختر، امجد اسلام امجد، بانو قدسیہ اور مشتاق احمد یوسفی کے کیری کیچرز اسلم کمال کے فن کمال کا نتیجہ ہیں جبکہ غالب کا اسکیچ بشیر موجد کا تیار کردہ ہے۔ جس کے لیے میں اپنے دونوں احباب کا شکر گزار ہوں۔

اس مرتبہ 'ایوان غالب' کی سج دھج ہی نرالی ہے۔ یوں کہیے کہ ایک غالب نمبر ہے جو اس حصے میں شامل کر لیا گیا ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی اور ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے

مقالات کے بارے میں کیا کہا جائے۔ ہمارے لیے تو یہی سب کچھ ہے کہ یہ ''سورج'' کے صفحات کی زینت بنے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے ہم شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ہمارے لیے لکھا۔ جبکہ پروفیسر شمیم حنفی سے معذرت خواہ ہیں کہ ان کی تحریر ان سے پوچھے بغیر شائع کی گئی ہے۔ بس جی چاہا کہ اس مرتبہ پروفیسر صاحب کا نام ''سورج'' کے لکھنے والوں میں ضرور شامل ہو۔ ڈاکٹر رضا حیدر سے گزشتہ برس قیامِ دہلی کے دوران ملاقات رہی۔ یوں لگا جیسے برسوں کی جان پہچان ہو۔ یہ کمال رضا حیدر کی بھرپور شخصیت کا ہے۔ 'غالب کی رہائش گاہیں' ڈاکٹر رضا حیدر کا تحقیقی مقالہ غالب دوستوں کے لیے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم غالبیات کے موضوع پر سند کا درجہ رکھتے ہیں ان کی گراں مایہ تصنیف 'غالب کا سفر کلکتہ، اور کلکتہ کا ادبی معرکہ' اس مرتبہ خصوصی مطالعے کا موضوع ہے۔ عنوان ہے ''ایک کتاب —— دو ملک'' بھارت سے رفعت سروش نے کتاب کے بارے میں تفصیلی رائے کا اظہار کیا ہے جبکہ پاکستان سے پروفیسر جلیل نقوی کا تبصرہ شاملِ اشاعت کیا گیا ہے۔

غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کے زیرِ اہتمام منعقدہ بین الاقوامی غالب سیمینار کی رپورٹ کفایت دہلوی نے ارسال کی ہے۔ یہ رپورٹ رنگین تصاویر کے ساتھ ایوانِ غالب کا حصہ ہے۔ لاہور میں غالب میموریل ٹرسٹ نے شہرہ آفاق مصور اسلم کمال کے اعزاز میں ایک خصوصی تقریب کا اہتمام کیا۔ جہاں اسلم کمال کے تیار کردہ غالب کے پورٹریٹ کی رونمائی کی گئی۔ یہ خوشگوار فریضہ سابق سیکرٹری خارجہ شمشاد احمد خاں کے ہاتھوں انجام پایا۔ اس یادگار تقریب کی تصویری رپورٹ زیرِ نظر شمارے کا حصہ ہے۔ غالب میموریل ٹرسٹ کے تمام تر اخراجات غالب دوستوں کے رضاکارانہ تعاون سے پورا کیے جاتے ہیں اسے کسی قسم کی سرکاری امداد حاصل نہیں ہے۔ البتہ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ سالِ رواں سے ٹرسٹ کو ملنے والے عطیات کو انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا ہے۔

پروفیسر حکیم ظل الرحمٰن علی گڑھ کے باسی ہیں اور گرانقدر ذخیرہ غالبیات کے مالک و مہتمم۔ میری درخواست پر دیوانِ غالب کے ایک نایاب نسخے کی زیراکس کاپی بھجوائی جبکہ اس نسخے پر ایک مبسوط دیباچہ بھی رقم فرمایا۔

دیوانِ غالب کے اس نسخے کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ غالب کے انتقال سے صرف چھ برس پیشتر اشاعت پذیر ہوا اور اس کی ترتیب و تصحیح غالب ہی کی نگرانی میں

ہوئی۔ بہت سے صفحات پر نسخے کی قدامت اثر انداز ہوئی اور حروف دھندلا گئے۔ جنھیں روشن کرنے کی کوشش کی گئی ہے جبکہ جو اشعار ادھورے یا پڑھے نہیں جاتے تھے انھیں الگ سے کمپوز کر دیا گیا ہے۔ دیوان غالب مطبوعہ 1863ء قارئین سورج کی نذر ہے جبکہ اس کا ڈی لکس ایڈیشن غالب میموریل ٹرسٹ کی جانب سے شائع کیا جا رہا ہے۔ پروفیسر حکیم ظل الرحمٰن کے اس توشۂ خاص کے لیے غالب دوست ان کے ہمیشہ احسان مند رہیں گے۔

پاکستان میں ڈاک خرچ کا بے لگام اضافہ، ایک ایسا موضوع ہے۔ جس کا رونا اپنے اپنے انداز میں تمام علمی و ادبی جرائد رو چکے ہیں ----- اب ہم کیا کہیں، یہی کہ ہم بھی متاثرین ڈاک میں شامل ہیں۔

زیر نظر شمارے کے صفحات نہ چاہتے ہوئے بھی خاصے ہو گئے۔ صورت حال کچھ یوں تھی کہ پرچے کی ضخامت میں بڑھوتری کے ساتھ ساتھ میرا دم سوکھ رہا تھا۔ کہ پرچے کی قیمت سے زیادہ کے تو اس پر ڈاک ٹکٹ لگ جائیں گے۔ خاص طور پر بیرون پاکستان کے لیے۔ جس کے بعد اس سیلاب بلا کو خوش آمدید کہنے کے لیے آج کے بے ادب دور میں کتنے گھر ہوں گے جو اپنا در کھولیں گے۔ یہ تو عام ڈاک کا ذکر تھا۔ جو دنوں کا سفر مہینوں میں طے کرتی ہے۔ رجسٹرڈ ہوائی ڈاک کا تکلف کرنا ہو تو بہتر ہے، پرچہ کوٹ کی جیب میں ڈالو اور ہوائی جہاز میں جا بیٹھو سستے میں چھوٹ جاؤ گے ———

ادبی جرائد چھاپنا یوں تو کبھی بھی آسان نہ تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ مشکل تر ہوتا چلا گیا۔ کاغذ کی گرانی، اشتہارات کی نایابی اور ادب پڑھنے والوں کی کم یابی، ایسے مسائل تھے جو روز بروز بڑھتے ہی چلے گئے، اسی لیے بڑے بڑے نام ادبی صحافت کی تاریخ کا حصہ بن کر رہ گئے۔ چند قابلِ ذکر ادبی جرائد ہیں کہ رسم وفا نبھائے جاتے ہیں۔ ان پر بھی پیغمبری وقت آ گیا ہے۔ جہالت کے اندھیروں سے اک غول بیابانی ٹوٹ پڑا ہے۔ جو نہیں جانتا کہ علم و ادب کی روشنی میں ہی آگے بڑھا جا سکتا ہے۔ زندہ رہا جا سکتا ہے۔

پیارے قارئین! ہمیں آپ کا بھرپور تعاون درکار ہے۔ ڈاک خرچ میں اضافے کو قبول کیجیے۔ سورج خرید کر پڑھیے مزید خریدار بنائیے۔ اشتہارات کی فراہمی میں ہماری مدد کیجیے۔ سورج کو روشن رکھیے۔ روشنی ہی زندگی ہے ---- اللہ حافظ

مدیر

گوشۂ اختر شیرانی
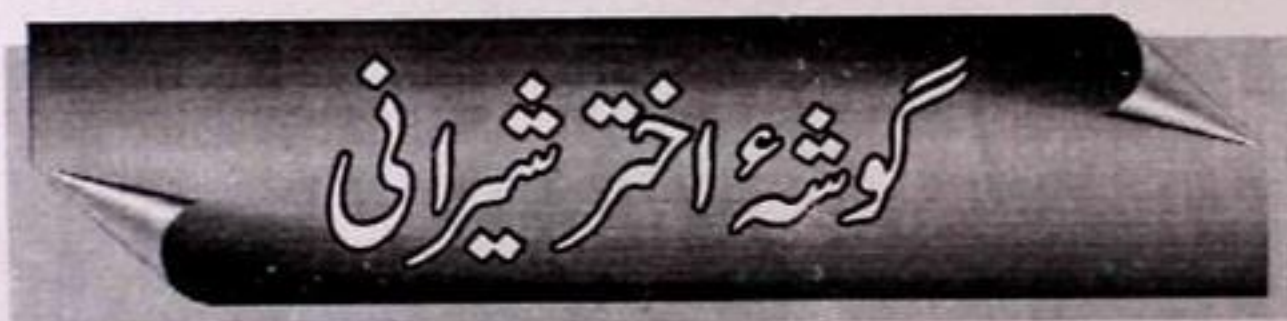
PAKISTAN POST OFFICE

2005-9

AKHTAR SHAIRANI
(1905 - 2005)
IN THE SERIES OF POETS OF PAKISTAN
COMMEMORATIVE POSTAGE STAMP
June 30, 2005

SALIENT FEATURES

Size of stamp	29 x 34 mm
Size of print	25 x 30 mm
Perforation	13C
Denomination	Rs. 5/-
Printing	Multi Colour Litho Offset
No.of Stamps in each Sheet	24 Stamps (4 x 6)
Paper / Grammage	Special Anti-Counterfeit PVA Gum Paper 102 gsm
Paper Security Features	Invisible Blue Fibers (visible only under UV light)
Paper Manufacturer	Shanghai Kailum Paper (Group) Co. Ltd. CHINA
Colour Separation Processed on	Crossfield Drum Scanner/Processor
Quantity	0.5 Million Stamps
Designer	Raza Ahmed
Printer	Pakistan Post Foundation Press (Security Division) Karachi.

PAKISTAN
AKHTAR SHAIRANI

1905 1948
POETS OF PAKISTAN SERIES
AKHTAR SHAIRANI
30TH JUNE 2005
PHILATELIC BUREAU LAHORE

نعت

لائی نسیمِ بادیہ خوشبوئے گیسوئے نبی
قربانِ گیسوئے نبی، قربانِ خوشبوئے نبی

ہم بیخودانِ عشق کا دیر و حرم سے واسطہ
محرابِ بیت حق نما ہے قوسِ ابروئے نبی

گلہائے رنگینِ جہاں، رکھتے ہیں وقفِ این و آں
ہاں اے ہوائے گلفشاں لے آ ذرا بوئے نبی

دورِ زماں، پردے اٹھا، میں شوق سے ہو لوں ذرا
صدقے سراپائے نبی، قرباں سرروئے نبی

"میں بھی ہوں تم سا اک بشر" فرما چکے پھر بھی مگر
تو لے تو جا بادِ سحر، میری دعا سوئے نبی

دنیائے آب و گل کہاں، اختر سکونِ دل کہاں
ہے تو سکونِ دل سے ہے آباد اک کوئے نبی

اختر شیرانی

نعت

لائی نسیمِ بادیہ خوشبوے گیسوئے نبی
قربانِ گیسوے نبی ، قربان خوشبوئے نبی

ہم بیخودانِ عشق کا ، دیر و حرم سے واسطہ
محرابِ بیت حق نما ، ہے قوسِ ابروئے نبی

گلہائے رنگینِ جہاں ، رکھتے ہیں وقفِ این و آں
ہاں اے ہوائے گلفشاں ، لے آ ذرا بُوئے نبی

دورِ زماں ، پردہ اٹھا ، میں شوق سے ہولوں ذرا
صدقے سرِپائے نبی ، قرباں سرِ رُوئے نبی

"میں بھی ہوں تم سا اک بشر" فرما چکے پھر بھی مگر
تو لے تو جا بادِ سحر ، میری دعا سوئے نبی

دنیائے آب و گل کہاں ، اختر سکونِ دل کہاں
ہے تو سکونِ دل سے ہے آباد اک کُوئے نبی

نعت

سحر دم رحمتِ حق کا یہ مستانہ پیام آیا
مبارک اہلِ ایماں کو کہ وہ خیر الانام آیا

خدائی جس کے جلووں سے ہمیشہ جگمگائے گی
شبستانِ خدا کا آج وہ ماہِ تمام آیا

زمین و آسماں بھی جس کے در پر سر جھکائیں گے
ہیں چرچے قدسیوں میں آج وہ عالی مقام آیا

جبینِ بندگی بے تاب ہے سجدے لٹانے کو
الٰہی، تیرے بندوں کی زباں پر کس کا نام آیا؟

مرے دل میں ہزاروں طورِ سینا جگمگا اٹھے
کچھ اس انداز سے دل میں ترا شوق تمام آیا

بشر تھا وہ مگر ایسا جسے خیر البشر کہیے
غریبوں کی خبر لی اس نے، بیماروں کے کام آیا

زباں چپ ہو گئی، جب دل نے چھیڑا تذکرہ ان کا
دلوں کو وجد آیا، جب زباں پر ان کا نام آیا

تھے جتنے داغ کثرت کے، دلوں سے دُھل گئے سارے
لیے ہاتھوں میں ساقیٔ عرب وحدت کا جام آیا

مزہ جب ہے کہ جا بیٹھیں خلد میں ہم اس طرح اختر
کہیں حوریں، محمد کا وہ مستانہ غلام آیا

اختر شیرانی

نعت

سحر دم ، رحمتِ حق کا یہ مستانہ پیام آیا
مبارک اہل ایماں کو کہ وہ خیرالانام آیا
خدائی جس کے جلووں سے ہمیشہ جگمگائے گی
شبستان حرا کا آج وہ ماہِ تمام آیا
زمین و آسماں بھی جس کے در پر سر جھکائیں گے
ہیں چرچے قدسیوں میں ، آج وہ عالی مقام آیا
جبینِ بندگی بے تاب ہے سجدے لٹانے کو
الٰہی ، تیرے بندوں کی زباں پر کس کا نام آیا؟
مرے دل میں ہزاروں طورِ سینا جگمگا اٹھے
کچھ اس انداز سے دل میں ترا شوقِ تمام آیا
بشر تھا وہ مگر ایسا ، جسے خیر البشر کہیے
غریبوں کی خبر لی اُس نے ، بیماروں کے کام آیا
زباں چپ ہوگئی ، جب دل نے چھیڑا تذکرہ اُن کا
دلوں کو وجد آیا ، جب زباں پر اُن کا نام آیا
تھے جتنے داغ کثرت کے ، دلوں سے دُھل گے سارے
لیے ہاتھوں میں ساقیِ عرب وحدت کا جام آیا
مزہ جب ہے کہ جائیں خُلد میں ہم اس طرح اخترؔ
کہیں حوریں ، محمدؐ کا وہ مستانہ غلام آیا

نعت

مژدۂ رحمتِ حق ہم کو سنایا کس نے؟ — مرتبہ اُمتِ عاصی کا بڑھایا کس نے؟

بخش کر اپنی محبت کا ہمیں دردِ حسیں — دل سے ہر دردِ زمانہ کا مٹایا کس نے؟

کر کے طے ہفت سماوات بہ یک جنبشِ چشم — فخر ہم خاک نشینوں کا بڑھایا کس نے؟

کس نے کثرت کے نشاں محو کیے سینوں سے — جامِ توحیدِ خدائی کو پلایا کس نے؟

ہمت و شوق کو ہے عرشِ بریں ایک قدم — خیمۂ کونین سے یہ برتر اٹھایا کس نے؟

کر کے سرشار ہمیں بےخودیِ الفت سے — دل سے رنجِ غمِ ہستی کو مٹایا کس نے؟

کس نے بخشی مرے نالوں کو سرافرازیِ شوق
خاک سے اخترِ بےکس کو اٹھایا کس نے؟

(ربیع الاول میں لکھی گئی)

سحر کے وقت یہ مژدہ لیے ابرِ بہار آیا — [illegible] اے زمیں، پیغمبرِ [illegible] وقار آیا

ستارے محوِ حیرت ہیں، فرشتے وقفِ عجلت ہیں — کہ اک خاکی بہ شکلِ رحمتِ پروردگار آیا!

حرا کے غار سے سرچشمۂ آبِ بقا چھوٹا — خزاں آبادِ ہستی کو پیامِ نو بہار آیا!

مہ و انجم بھی جس کی راہ میں آنکھیں بچھانے لگے — ہے شہرہ آسماں پر آج وہ کیوں وقار آیا!

سرِ اُم القریٰ، توحید کی بجلی نے کروٹ لی — حرم کے گنبدوں پر جھوم کر ابرِ بہار آیا!

یہ چرچے ہو رہے ہیں قصرِ کسریٰ سے خورنق تک — عجم کا شہریار آیا، عرب کا تاجدار آیا!

جگر کو داغ، جاں کو سوز، سینے کو خلش بخشی — کچھ اس صورت سے دل میں اُن کا عشقِ لالہ کار آیا!

دھڑکتے دل سے میں نے جب بھی نام اُن کا لیا اختر
زباں پر نغمۂ صلِ علیٰ بے اختیار آیا!

اختر شیرانی

نعت

مژدۂ رحمتِ حق ہم کو سنایا کس نے؟
مرتبہ اُمتِ عاصی کا بڑھایا کس نے؟

کر کے طے ہفت سماوات بیک جنبش چشم
فخر ہم خاک نشینوں کا بڑھایا کس نے؟

کس نے کثرت کے نشاں محو کیے سینوں سے
جامِ توحید خدائی کو پلایا کس نے؟

ہمت و شوق کو ہے عرشِ بریں ایک قدم
چشمِ کونین سے یہ پردہ اٹھایا کس نے؟

کر کے سرشار ہمیں بیخودیِ الفت سے
دل سے رنگِ غم ہستی کو مٹایا کس نے؟

کس نے بخشی مرے نالوں کو سرافرازیٔ شوق
خاک سے اخترِ بیکس کو اٹھایا کس نے

نعت

سحر کے وقت یہ مُژدہ لیے ابر بہار آیا
مبارک اے زمیں، پیغمبرِ گردوں وقار آیا

ستارے محوِ حیرت ہیں، فرشتے وقفِ خجلت ہیں
کہ اِک خاکی بہ شکلِ رحمتِ پروردگار آیا

حرا کے غار سے سرچشمۂ آبِ بقا پھوٹا
خزاں آبادِ ہستی کو پیامِ نو بہار آیا

مہ و انجم بھی جسکی راہ میں آنکھیں بچھائیں گے
ہے شہرہ آسماں پر" آج وہ کیواں وقار آیا

سرِ اُم القریٰ، توحید کی بجلی نے کروٹ لی
حرم کے گنبدوں پر جھوم کر ابرِ بہار آیا!

یہ چرچے ہو رہے ہیں قصرِ کسریٰ سے خورنق تک
عجم کا شہر یار آیا، عرب کا تاجدار آیا!

جگر کو داغ، جاں کو سوز، سینے کو خلش بخشی
کچھ اس صورت سے دل میں اُن کا عشقِ لالہ کار آیا!

دھڑکتے دل سے میں نے جب بھی نام اُن کا لیا اختر
زبان پر نغمۂ صلِ علیٰ بے اختیار آیا!

نعت

جو آنکھ ہے وہ اشک فشاں تیرے لیے ہے
سینے میں جنوں، لب پہ فغاں تیرے لیے ہے

ہے وہ کہ تری یاد، دوائے دلِ عالم!
ہر سینے میں اک دردِ نہاں تیرے لیے ہے

کعبے کی ہواؤں میں ترے نام کے نغمے
مسجد کی فضاؤں میں فغاں تیرے لیے ہے

ہر مدرسہ معمور ترے ذکرِ حسیں سے
ہر خانقہ لبریزِ فغاں تیرے لیے ہے

آنکھوں سے ہے خونابہ چکاں ذوقِ شہادت
سر گردنِ اختر پہ گراں تیرے لیے ہے

نعت

دل کو ہے تمنائے گلستانِ مدینہ
لائے کوئی بوئے گل و ریحانِ مدینہ

اٹھتا نہیں بارِ غمِ ہجرانِ مدینہ
بلوا لو مدینے ہمیں سلطانِ مدینہ

تاجِ سرِ قیصر ہو کہ ہو تختِ کیانی
آتے نہیں خاطر میں گدایانِ مدینہ

حسرت ہے اگر آنکھوں کو تو ہے حسرتِ دیدار
ارمان ہے دل میں تو ہے ارمانِ مدینہ

ان کوچوں کے ہر ذرے پہ قربان دل و جان
پھرتا تھا جہاں ماہِ خرامانِ مدینہ

گلزارِ جناں کیونکر ان آنکھوں میں سمائے
جن آنکھوں میں بستا ہو گلستانِ مدینہ

تقدیر غنی آئے کبھی وہ وقت بھی اختر
آنکھیں ہوں مری اور درِ سلطانِ مدینہ

اختر شیرانی

نعت

جو آنکھ ہے ہو اشک فشاں تیرے لیے ہے
سینے میں جنوں، لب پہ فغاں تیرے لیے ہے

اے وہ کہ تری یاد ، دوائے دلِ عالم!
ہر سینے میں اِک دردِ نہاں تیرے لیے ہے

کعبے کی ہواؤں میں ترے نام کے نغمے
مسجد کی فضاؤں میں فغاں تیرے لیے ہے

ہر راستہ معمور ، ترے ذکرِ حسیں سے
ہر خانقہ لبریز فغاں تیرے لیے ہے

آنکھوں سے ہے خونابہ چکاں ذوقِ شہادت
سر ، گردنِ اختؔر پہ گراں تیرے لیے ہے

نعت

دل کو ہے تمنائے گلستانِ مدینہ
لاوے کوئی بوئے گل و ریحانِ مدینہ

اٹھتا نہیں بارِ غم حرمانِ مدینہ
بلوا لو مدینے ، ہمیں سلطانِ مدینہ

تاجِ سرِ قیصر ہو کہ ہو تختِ کیانی
لاتے نہیں خاطر میں گدایانِ مدینہ

حسرت ہے گر آنکھوں کو تو ہے حسرتِ دیدار
ارمان ہے دل میں تو ہے ارمانِ مدینہ

اُن کوچوں کے ہر ذرے پہ قربان ، دل و جان
پھرتا تھا جہاں ماہِ خرامانِ مدینہ

گلزارِ جناں کیونکر اُن آنکھوں میں سمائے
جن آنکھوں میں بستا ہو گلستانِ مدینہ

تقدیر سے آئے کبھی وہ وقت بھی اختؔر
آنکھیں ہوں مری اور درِ سلطانِ مدینہ

غزل

وہ دور سے نقاب اٹھا کر چلے گئے
آنکھوں پہ بجلیاں سی گرا کر چلے گئے
دامن بچا کے، ہنس کے، لجا کر چلے گئے
کیا کیا، لحد پہ پھول چڑھا کر چلے گئے
سینے میں اک تپش سی بسا کر چلے گئے
کیسے مزے کی آگ لگا کر چلے گئے
شاداب ہو سکا نہ گلستانِ آرزو
کتنے ہی ابر، باغ پہ چھا کر چلے گئے
بادِ بہار آگ لگا کر چلی گئی
ابرِ بہار ہمکو رلا کر چلے گئے
آنسو نہ تھم سکے مری چشمِ امید کے
کتنے ہی موسم آئے، رلا کر چلے گئے
اختر بُرا ہو بیخودیٔ جذبِ شوق کا
کس کو خبر کب آئے، کب آ کر چلے گئے

اختر شیرانی

⊙

وہ دور سے نقاب اٹھا کر چلے گئے
آنکھوں پہ بجلیاں سی گرا کر چلے گئے

دامن بچا کے ، ہنس کے ، لجا کر چلے گئے
کیا کیا ، لحد پہ پھول چڑھا کر چلے گئے

سینے میں اک تپش سی بسا کر چلے گئے
کیسے مزے کی آگ لگا کر چلے گئے

شادابیِ ہو سکا نہ گلستانِ آرزو
کتنے ہی ابر ، باغ پہ چھا کر چلے گئے

بادِ بہار ، آگ لگا کر چلی گئی
ابر بہار ہم کو رُلا کر چلے گئے

آنسو نہ تھم سکے مری چشمِ اُمید کے
کتنے ہی موسم آئے ، رُلا کر چلے گئے

اختؔر برا ہو بیخودیِ جذب و شوق کا
کس کو خبر کب آئے ، کب آ کر چلے گئے

غزل

شاید کہ دیکھے ہیں لبِ غنچہ دہن کے پھول
کیوں آج مسکراتے ہیں سارے چمن کے پھول

شادابِ جلوہ ہائے بہاریں ہے بزمِ ناز
جھڑتے ہیں منہ سے اُس گلِ رنگیں دہن کے پھول

بے اختیار جھومتے ہیں شاخسار پر
بیخود ہیں کس کے شوق کے مارے چمن کے پھول؟

اس پیکرِ بہار کی کیا بات ہے ندیم!
چھو لے اگر تو سرو میں آئیں سمن کے پھول

دستِ حنائی کسی کے اٹھے فاتحہ کو آج
شاداب ہو رہے ہیں ہمارے کفن کے پھول

ہم غم زدوں کو سرو و گل و یاسمن سے کیا
قسمت میں ہیں فقط غم و رنج و محن کے پھول

اس بزمِ رنگ و بو میں اگر بار مل سکے
قرباں اُس پہ ایک نہیں سو چمن کے پھول

کیوں عارضوں کا رنگ اڑا، عرضِ شکوہ پر
نسرین کے پھول بن گئے کیوں یاسمن کے پھول

اڑ جائیں بن کے موجۂ نکہت سوئے جناں
تم دستِ نازنیں سے جو چھو لو چمن کے پھول

کیا بات گلشنِ لبِ رودِ بناس کی
دیکھے ہیں ہم نے وادیِ گنگ و جمن کے پھول

اختر شیرانی

⊙

شاید کہ دیکھے ہیں لبِ غنچہ دہن کے پھول
کیوں آج مسکراتے ہیں سارے چمن کے پھول

شادابِ جلوہٴ ہائے بہاریں ہے بزمِ ناز
جھڑتے ہیں منہ سے اُس گلِ رنگیں دہن کے پھول

بے اختیار جھومتے ہیں شاخسار پر
بیخود ہیں کس کے شوق کے مارے چمن کے پھول؟

اُس پیکرِ بہار کی کیا بات ہے ندیم!
چھو لے اگر ، تو سرو میں آئیں سمن کے پھول

دستِ حنائی ، کس کے اٹھے فاتحہ کو آج
شاداب ہو رہے ہیں ہمارے کفن کے پھول

ہم غم زدوں کو سرو و گل و یاسمن سے کیا
قسمت میں ہیں فقط غم و رنج و محن کے پھول

اُس بزمِ رنگ و بو میں اگر بار مل سکے
قربان اُس پہ ایک نہیں ، سو چمن کے پھول

کیوں عارضوں کا رنگ اُڑا ، عرضِ شکوہ پر
نسریں کے پھول بن گئے کیوں یاسمن کے پھول

اڑ جائیں بن کے موجۂ نکہت سوے جناں
تم دستِ نازنیں سے جو چھو لو چمن کے پھول

کیا بات گلشنِ لبِ رودِ بناس کی
دیکھے ہیں ہم نے وادیٔ گنگ و جمن کے پھول

غمِ زمانہ نہیں اک عذاب ہے ساقی
شباب تجھ لیے تو یہ عذاب ہے ساقی
پلا دے آج تو جتنی شراب ہے ساقی
کھلا رہی ہے نئے پھول، یاسمینِ فلک
چھلک رہا ہے یہ ساغر میں کس کا حسن و شباب؟
اٹھا پیالہ کہ گلشن پہ پھر برسنے لگی
نکال پردۂ مینا سے دخترِ رز کو!
چھلک رہی ہے یہ ساغر میں تیری برقِ جمال
ڈبو دے آج تو مجھ کو حباب ساغر میں!
— یا دہ خانۂ غم بن رہی ہے کل دنیا
اُٹھا سحر سے ہے ہم میکدے میں شام و سحر
یہ سوزِ دائمی کب تک برنگِ لالۂ طور؟
زمانے بھر کے حسینوں کو ہے دعوتِ آزار
[illegible] کہ ہنستی ہے کہ جبیں قہر استبداد
[illegible] غنیمت [illegible] کو!
کتاب پڑھنے دے زاہد کو جا کے مسجد میں
چھلکا دے آج کہ کل کی خبر کسے معلوم
یہ کس کی یاد میں روتی ہے آج رہ رہ کر
تو واعظوں کی نہ سن، میکشوں کی خدمت کر
ہے میکدے پہ کوئی ابر میکدہ رقصاں

شراب لا مری حالت خراب ہے ساقی
شراب دے مجھے پاسِ شباب ہے ساقی!
کہ موسمِ گل و فصلِ شباب ہے ساقی!
پلاؤ پھول کہ رنگِ گلاب ہے ساقی!
یہ کون پردہ نشیں بے حجاب ہے ساقی؟
وہ مے کہ جس کا قدح ماہتاب ہے ساقی!
گھٹا میں کس لیے یہ ماہتاب ہے ساقی؟
کہ مہر اگم شدہ رنگیں شباب ہے ساقی!
کہ زندگی کا محل بھی حباب ہے ساقی!
کہ بادلوں میں ترا آفتاب ہے ساقی!
کہ ماہتاب قدح، آفتاب ہے ساقی
یہ زندگی تو سراسر عذاب ہے ساقی
کہ ایک جام میں سب کا جواب ہے ساقی
[illegible] انتخاب ہے ساقی!
شراب دے ابھی فصلِ شباب ہے ساقی!
مرے لیے ترا ساغر کتاب ہے ساقی!
نشاطِ عمر بخود سراب ہے ساقی!
گھٹا ہے یا مری چشم پر آب ہے ساقی!
گنہ ثواب کی خاطر ثواب ہے ساقی!
کہ یہ بہار کا پہلا سحاب ہے ساقی

اگر شراب ہوئی ختم، اقند لب ہی سہی
جہاں میں رندوں کی خدمت ثواب ہے ساقی!

شبِ شباب کٹے کس طرح وہ تیغ اٹھا
کہ جس کا بادہ رنگیں خضاب ہے ساقی!

نکال دفترِ مینائی سے وہ مصرعِ تر
کہ جس کا مصرعِ ثانی گلاب ہے ساقی!

کلام جس کا ہے معراجِ حافظ و خیام
یہی وہ اختر خانہ خراب ہے ساقی

پلا دے تو بھی مئے بے حساب اختر کو
غمِ زمانہ اگر بے حساب ہے ساقی!

اختر شیرانی

غم زمانہ نہیں اک عذاب ہے ساقی
شراب لا، مری حالت خراب ہے ساقی!

شباب کے لیے توبہ عذاب ہے ساقی
شراب دے مجھے پاسِ شباب ہے ساقی!

پلا دے آج تو جتنی شراب ہے ساقی
کہ موسم گل و فصل شباب ہے ساقی!

کھلا رہی ہے نئے پھول، یاسمینِ فلک
پلا وہ پھول کہ رشک گلاب ہے ساقی!

گرا دیں ایک ہی ٹھوکر میں قصر استبداد
پلا کہ آج سر انقلاب ہے ساقی!

پڑی ہے عمر بہت زہر درد پینے کو!
شراب دے ابھی فصل شباب ہے ساقی!

کتاب پڑھنے دے زاہد کو جا کے مسجد میں
مرے لیے ترا ساغر کتاب ہے ساقی!

چھکا دے آج کہ کل کی خبر کسے معلوم
نشاط عمر نمود سراب ہے ساقی!

یہ کس کی یاد میں روتی ہے آج رہ رہ کر
گھٹا ہے یا مری چشم پر آب ہے ساقی!

تو واعظوں کی نہ سن، میکشوں کی خدمت کر
گنہ ثواب کی خاطر ثواب ہے ساقی!

ہے میکدے پہ کوئی اور میکدہ رقصاں
کہ یہ بہار کا پہلا سحاب ہے ساقی!

اگر شراب ہوئی ختم، قندلب ہی سہی
جہاں میں رندوں کی خدمت ثواب ہے ساقی!

شب شباب کٹے کس طرح وہ تیغ اٹھا
کہ جس کا بادہ رنگیں خطاب ہے ساقی!

نکال دفتر مینائی سے وہ مصرع تر
کہ جس کا مصرع ثانی گلاب ہے ساقی!

کلام جس کا ہے معراجِ حافظ و خیام
یہی وہ اختر خانہ خراب ہے ساقی

پلا دے تو بھی مئے بے حساب اختر کو
غم زمانہ اگر بے حساب ہے ساقی!

سید افضال حسین زیدی

سابق ڈائریکٹر جنرل' وزارت اطلاعات' حکومت پاکستان

اختر شیرانی

(یادیں)

زیر نظر مضمون کے تعارف میں محترم سید افضال حسین زیدی صاحب اپنے گرامی نامے میں لکھتے ہیں:

"1954-55" میں ناصر کاظمی کی فرمائش پر میں نے ایک مضمون اختر صاحب سے اپنی ملاقاتوں کی باتوں پر ارتجالاً لکھ کر انہیں دیا تھا۔ وہ کراچی میں میرے مہمان تھے اور غالباً انتظار حسین کی شرکت میں ایک رسالہ نکال رہے تھے۔ یہ مضمون مدت تک ان کے کاغذات میں پڑا رہا۔ چند سال کے بعد میں لاہور گیا تو بڑی تلاش کے بعد مضمون مل گیا۔ اس کے بعد وہ میری سرکاری مصروفیتوں میں دبا رہا۔ آپ کا خط آیا تو میں نے اپنے کاغذوں کے انبار میں سے ڈھونڈ نکالا......" (مکتوب بنام مظہر محمود شیرانی)

مضمون کی پاک نویسی ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے کی ہے اور ضروری حاشیوں کا اضافہ کیا ہے۔

(ادارہ)

یقیناً سن 1940ء اور مارچ کا مہینہ' تاریخ اور دن یاد نہیں۔ سال اور مہینہ بھی یاد رہ گئے کہ اس سال میں نے میٹرک کا امتحان دیا تھا اور نتیجہ کا انتظار تھا۔ خوب یاد ہے کہ اس زمانہ میں دن رات اختر شیرانی کی نظموں اور غزلوں کی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا اور اختر کی شاعری کا جادو دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا اسی کیف و سرشاری کے عالم میں ایک عزیز کی شادی کی شرکت کے لیے انبالہ جانا ہوا اور اسی موقع پر ناصر کاظمی سے ملاقات ہوئی اور وہ ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغ ستم نکلے۔ اس شادی کی تقریب میں ایک

طرف بیٹھا اپنے گرد و پیش سے بے خبر ایک کتاب کے مطالعہ میں غرق تھا۔ بھائی غضنفر نے کہا کہ آؤ تمھیں ناصر رضا سے ملاؤں' وہ بھی تمھاری طرح اختر شیرانی کا دیوانہ ہے۔ چنانچہ ہم دونوں ناصر رضا کے پاس گئے اور بھائی غضنفر نے ہمارا ایک دوسرے سے تعارف کروایا۔ جب میں نے ناصر کی کتاب میں محویت سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا تو انھوں نے کتاب میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا کہ ''یہ میرے محبوب شاعر کی نظموں کا مجموعہ ہے'' یہ کتاب ''نغمہ حرم'' تھی۔ جو اسی سال شائع ہوئی تھی۔ (1) میں نے دلچسپی اور شوق کے عالم میں فہرست پر نظر ڈالی اور تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس کتاب میں اختر کی کوئی مشہور نظم شامل نہیں ہے۔ ناصر نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اختر صاحب کو اس سلسلہ میں لکھا تھا اور اختر صاحب نے لکھا ہے کہ جلد ہی ان کے کلام کا مجموعہ چھپنے والا ہے۔ میرے دریافت کرنے پر ناصر نے کہا کہ ان کی اختر صاحب سے خط و کتابت ہے جس پر مجھے بہت رشک آیا کیونکہ میں نے اختر صاحب کو کئی خط لکھے تھے اور ایک خط کا بھی جواب نہیں آیا تھا۔

اسی رات کو ناصر مجھ سے ملنے بھائی غضنفر کے مکان پر آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک رجسٹر نما کاپی تھی۔ اس کاپی میں ان کی پسندیدہ نظمیں اور غزلیں درج تھیں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ وہ آدھی رات گزرنے تک اختر کی معرکتہ الآرا نظمیں سناتے رہے اور ہم دونوں جھومتے رہے۔ بھائی غضنفر' جواب تک سونے کی کوشش میں کروٹیں بدل رہے تھے' یکا یک اٹھ کر بیٹھ گئے اور ہم دونوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ تم دونوں میرے ساتھ لاہور چلو اور اپنے محبوب شاعر سے مل لو۔ ناصر فوراً تیار ہو گئے۔

بھائی غضنفر اسلامیہ کالج لاہور میں بی۔ اے کے طالب علم تھے۔ ان سے میری خط و کتابت تھی۔ میرے شوق کو دیکھتے ہوئے وہ اکثر اختر شیرانی کے متعلق لکھتے کہ آج انھوں نے اختر صاحب کو عرب ہوٹل میں اپنے مداحوں میں گھرا ہوا دیکھا۔ آج وہ سڑک پر پنواڑن کی دکان پر پان بنوا رہے تھے اور آج تانگے میں میکلوڈ روڈ کی طرف جا رہے تھے۔ یہ خط پڑھ کر میرے رشک اور شوق پر تازیانہ کا کام دیتا تھا۔ اب جو انھوں نے لاہور چلنے کی دعوت دی اور ناصر رضا کو تیار پایا تو میں بھی تیار ہو گیا۔ صرف والد صاحب قبلہ و کعبہ کی اجازت درکار تھی۔ وہ بھی تھوڑے اصرار اور ضد سے مل گئی۔

بھائی غضنفر لاہور چلے گئے۔ ناصر کو اپنی والدہ سے اجازت لینے میں کچھ وقت لگا لیکن وہ کامیاب ہو گئے۔ ہم دونوں نے خط و کتابت سے لاہور کی روانگی کا پروگرام طے کیا اور آخر کار آدھی رات کے وقت انبالہ سے لاہور جانے والی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ انٹر کلاس میں چند مسافر تھے جو شملہ سے لاہور جا رہے تھے۔ میرا اور ناصر کا لاہور کا پہلا سفر تھا اور شوق کا یہ عالم تھا کہ تخیل ریل کی رفتار سے بھی زیادہ اڑ رہا تھا۔ اس عالم کیف و سرشاری میں لاہور کا سٹیشن آ گیا۔ اب صبح ہو گئی تھی اور نگاہیں لاہور کے در و دیوار کو سجدے کر رہی تھیں۔ ہم پلیٹ فارم پر ادھر ادھر دیکھ رہے تھے کہ سامنے سے بھائی غضنفر جلدی

جلدی ہماری طرف آ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں سوٹ کیس تھا۔ ایک صاحب ان کے ہمراہ تھے۔ میں نے دیکھا کہ بھائی غضنفر کے چہرے پر بشاشت کی جگہ تشویش اور پریشانی کے سائے منڈلا رہے تھے۔ انھوں نے جلدی جلدی ہم دونوں کی مزاج پرسی کے بعد کہا کہ کل رات انھیں ان کی اماں کی بیماری کا تار ملا ہے اور وہ ابھی انبالہ جا رہے ہیں لیکن تم دونوں کو یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ یہ میرے نہایت عزیز دوست مرتضیٰ صاحب ہیں۔ یہ تم دونوں کا مجھ سے بھی زیادہ خیال رکھیں گے۔ میرے کمرے کی چابیاں ان کے پاس ہیں۔ آپ اماں کی صحت کی دعا کریں میں جلد سے جلد واپسی کی کوشش کروں گا۔

میں ابھی اس اچانک صدمے سے سنبھل نہ پایا تھا کہ ناصر نے باآواز بلند کہا کہ وہ بھی بھائی غضنفر کے ہمراہ انبالہ واپس جائیں گے۔ انھوں نے آنسو بھر کر کہا کہ انھیں اپنی اماں یاد آ رہی ہیں اور وہ جب چلے ہیں تو بیمار لگ رہی تھیں۔ اب میں بھائی غضنفر کو چھوڑ ناصر کو سمجھانے میں لگ گیا۔ لیکن ناصر جلد چل کر قدم اٹھاتے ہوئے بکنگ آفس کی طرف چلے گئے اور خود اپنی انبالہ کی ٹکٹ لے کر واپس آ گئے۔ میں لاہور کے پلیٹ فارم پر حیران و سراسیمہ کھڑا تھا۔ مرتضیٰ صاحب میرا ہاتھ پکڑ کر ریلوے سٹیشن سے باہر لے آئے۔ آج سے ساٹھ سال پہلے کا لاہور آج کا لاہور سے قطعی مختلف تھا۔ کسی قسم کی گہما گہمی اور شور وغل کا نشان نہ تھا۔ صرف چند تانگے والے آواز لگا رہے تھے۔ ہم بھاٹی دروازہ جانے والے تانگہ میں سوار ہو گئے۔ راستے میں مرتضیٰ صاحب نے موچی دروازہ، شاہ عالمی، لوہاری دروازہ، انارکلی، موری دروازہ کی نشان دہی کی۔

سرکلر روڈ پر حلقہ اردو اور ادب لطیف کے سائن بورڈ دیکھے۔ پھر بھاٹی دروازہ آ گیا۔ مرتضیٰ صاحب نے تانگہ والے سے پنجابی میں بات کی اور وہ ہمیں مونی روڈ پر پہنچا گیا۔ جہاں الراعی بلڈنگ واقع تھی اور جس میں بھائی غضنفر اور مرتضیٰ صاحب کا قیام تھا۔

مونی روڈ ایک سنسان اور غیر آباد علاقہ تھا اور الراعی بلڈنگ شاید لاہور کی آخری عمارت تھی۔ اس سے آگے کھیتوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ الراعی بلڈنگ ایک پرائیویٹ ہاسٹل تھا جس میں مختلف کالجوں کے طالب علم اقامت پذیر تھے۔ الراعی بلڈنگ کے متصل ایک اور ہاسٹل تھا جس میں مختلف کالجوں کے طالب علم اور مختلف محکموں کے ملازم قیام پذیر تھے۔ بھائی غضنفر اسلامیہ کالج اور مرتضیٰ صاحب گورنمنٹ کالج کے طالب علم تھے۔

مرتضیٰ صاحب ایک باغ و بہار شخصیت تھے۔ ان کی کس کس خوبی کا ذکر کروں۔ انھوں نے میرے چند روزہ قیام لاہور کو خوشگوار بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ افسوس کہ ان چند دنوں کی ملاقات کے بعد ان سے پھر ملنا نصیب نہ ہوا لیکن ان کی رفاقت کی یاد اب تک باقی ہے۔

میں نے مرتضیٰ صاحب سے کہا کہ اختر شیرانی کو ملنے کی کشش مجھے لاہور لائی ہے اور یہی خواہش مجھے بے تاب کیے ہوئے ہے۔ مرتضیٰ صاحب ادب کے طالب علم نہیں تھے۔ انھوں نے اختر شیرانی کا نام سنا تھا لیکن وہ ان کی جائے قیام سے واقف نہ تھے۔ میں نے بھائی غضنفر کی زبانی سن رکھا تھا کہ اختر صاحب عرب ہوٹل میں مل سکتے ہیں اور عرب ہوٹل اسلامیہ کالج کے مقابل ریلوے روڈ پر واقع ہے۔ چنانچہ اسی شام کو میں مرتضیٰ صاحب کے ہمراہ موہنی روڈ سے روانہ ہوا۔ ہم دونوں پیدل چل کر بل روڈ کے راستے سے ریلوے روڈ آ کر عرب ہوٹل پہنچ گئے۔

عرب ہوٹل کو دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی۔ یہ ایک تنگ و تاریک دکان تھی اور کسی صورت بھی ہوٹل کہلانے کا مستحق نہیں تھا۔ ایک چبوترہ پر عربی لباس میں ایک صاحب گاہک سے الجھ رہے تھے۔ مرتضیٰ صاحب نے ان صاحب سے کہا کہ میرے ساتھی انبالہ سے اختر شیرانی کی ملاقات کی غرض سے آئے ہیں۔ ان صاحب نے کہا کہ اختر صاحب کئی مہینے سے نہیں آئے۔ ہماری درخواست پر انھوں نے ایک لڑکے کو کمرہ کے اندر سے بلایا اور اسے ہمیں اختر صاحب کے مکان پر پہنچانے کے لیے کہا۔ وہ لڑکا فلیمنگ روڈ پر مڑ گیا۔ ہم اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے ایک احاطہ میں داخل ہوئے۔ احاطہ کے اندر ہی [ایک] بوڑھے سے شخص سے جو شکل و صورت سے خانگی ملازم معلوم ہوتا تھا' ملاقات ہوئی۔ اس لڑکے نے ہمیں اس شخص کے حوالہ کیا اور چلا گیا۔ اس شخص نے ہمیں سر سے پاؤں تک دیکھا اور کہا کہ اختر صاحب گھر چھوڑ کر کہیں چلے گئے ہیں البتہ ان کے والد اور بچے یہیں پر ہیں۔ ہم نے جب انبالہ سے آنے کا حوالہ دیا تو اس نے ایک یا دو منٹ کے توقف کے بعد کہا کہ آپ میرے ساتھ آئیں۔ فلیمنگ روڈ پر تھوڑی دور چلنے کے بعد وہ ہمیں لے کر ایک گلی میں مڑ گیا۔ سامنے ایک عمارت پر ''شاہکار'' کا سائن بورڈ لگا تھا۔ اختر صاحب ان دنوں ''شاہکار'' کے ایڈیٹر تھے۔ ''شاہکار'' کا دفتر اس عمارت میں نیچے کے کمرہ میں تھا۔ وہاں ایک چپڑاسی کچھ کاغذات سمیٹ رہا تھا۔ ان صاحب نے جو فلیمنگ روڈ کے احاطہ سے ہمیں لے کر آئے تھے ان چپڑاسی صاحب سے بات کی اور ہمیں ان کے حوالہ کر کے چلے گئے۔ ان صاحب نے ایک رجسٹر اپنی بغل میں دابا' کمرہ بند کیا اور ہم دونوں کو ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

اب ہم اس کے ساتھ چلے اور وہاں پہنچے جہاں فلیمنگ روڈ ختم ہو جاتی ہے۔ اس جگہ ایک نہایت تنگ سی گلی تھی جس میں چند چھوٹے چھوٹے ایک یا دو کمروں کے گھر تھے۔ اس گلی میں داخل ہو کر غالباً داہنے ہاتھ دوسرا یا تیسرا گھر تھا۔ اس گھر کا دروازہ جو گلی میں تھا' کھلا تھا۔ وہ شخص دروازہ میں داخل ہو گیا اور ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔

میں دروازہ میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ایک صاحب بان کی چارپائی پر پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ ان کے سامنے کرسی پر ایک صاحب جو چالیس پینتالیس کے ہوں گے اور معمولی سے سوٹ میں ملبوس

تھے' بیٹھے ہیں۔ ایک لڑکا ساتھ ہی ایک مونڈھے پر بیٹھا ہے۔ ایک اور لڑکا چارپائی کی پٹی پر ٹکا ہے اور ایک اور نوجوان' جس نے سفید ململ کا کرتا پہنا ہوا ہے' اس کے اوپر اچکن ہے جس کے سب بٹن کھلے ہیں' سر پر سیاہ رامپوری ٹوپی ہے' چھوٹی چھوٹی سنہری مونچھیں ہیں' وہ ان صاحب کے' جو شلوار قمیض پہنے ہیں اور چارپائی پر پاؤں لٹکائے کرسی والے صاحب سے گفتگو میں مصروف ہیں' شانے دبا رہے ہیں۔

''شاہکار'' کے دفتر سے جو آدمی ہمیں لے کر آیا اس نے رجسٹر چارپائی پر بیٹھے شخص کو دیتے ہوئے کہا کہ یہ لڑکا انبالہ سے آپ کی ملاقات کے لیے آیا ہے۔ میں اپنے محبوب شاعر اختر شیرانی کے سامنے کھڑا تھا۔

اختر صاحب کو غالباً مداخلت ناگوار گزری۔ انھوں نے آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پوچھا ''کیا آپ سٹوڈنٹ ہیں؟'' میں نے جھجکتے ہوئے کچھ ڈرتے ہوئے کہا:

''میں نے میٹرک کا امتحان دیا ہے اور پٹیالہ سے آپ سے ملنے کے لیے آیا ہوں'' اتنا کہہ کر میں نے فوراً کوٹ کی جیب سے ایک خط نکال کر اختر صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ خط میں صاجزادہ عبدالمنعم خان صاحب سے اختر صاحب کے نام لکھوا کر لایا تھا۔ صاجزادہ عبدالمنعم خان کا ٹونک کے حکمران خاندان سے تعلق تھا۔ (3) وہ پٹیالہ گورنمنٹ میں کسی اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے اور میرے والد کے دوستوں میں تھے۔ اختر صاحب کے ہم وطن ہونے کے واسطے سے صاجزادہ صاحب نے خط لکھ دیا تھا۔ میں نے وہ خط پڑھ لیا تھا اور اس خط کا مضمون نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزرنے پر مجھے یاد ہے۔ صاجزادہ صاحب نے لکھا تھا کہ یہ لڑکا ریاست پٹیالہ کے سادات کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ آپ کی شاعری کا والہ وشیدا ہے۔ آپ کی ملاقات کا شوق لے کر لاہور جا رہا ہے۔ آپ کی ذاتی اور نسبی شرافت سے امید ہے کہ آپ اس کے ساتھ شفقت اور محبت سے پیش آئیں گے۔

اختر صاحب خط پڑھ رہے تھے۔ مرتضیٰ صاحب نے جو میرے پیچھے کھڑے تھے' چپکے سے میرے کان میں کہا کہ وہ عرب ہوٹل میں میرا انتظار کریں گے اور رخصت ہو گئے۔ اس عرصہ میں اختر صاحب خط پڑھ چکے تھے۔ انھوں نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر دیکھا اور میں نے ان کی آنکھوں میں شفقت اور محبت سے لبریز آنسوؤں کو دیکھا۔ پھر وہ ان صاحب سے مخاطب ہوئے جوان کے سامنے کرسی پر بیٹھے تھے کہ یہ لڑکا آپ کا ہم وطن ہے اور ان صاحب کا نام لیتے ہوئے کہا کہ آپ کا تعلق مالیر کوٹلہ سے ہے۔ اس اثنا میں وہ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے اختر صاحب سے رخصت کی اجازت مانگی اور مجھے پکڑ کر اپنی جگہ بٹھا دیا اور چلے گئے۔

اب اختر صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے اور کسی قدر دکھ بھرے لہجے میں کہا کہ چاہیے۔ تھا کہ میں آپ کو اپنے گھر مہمان ٹھہراتا لیکن میں خود بے گھر ہوں اور ادھر ادھر بسر اوقات پر مجبور ہوں۔ (5) میں نے نہایت ادب سے کہا کہ میں اپنے عزیز کے پاس موہنی روڈ پر ٹھہرا ہوں۔ میرے قیام لاہور کا مقصد

صرف آپ کی ملاقات تھی۔ یہ دولت مجھے مل گئی ہے۔ اختر صاحب نے کہا کہ ادب اور شعر کا شوق انسان کو مہذب بناتا ہے لیکن آپ کو اپنی پوری توجہ اپنی تعلیم پر دینی چاہیے۔

اتنی ہی بات ہوئی تھی کہ پانچ چھ لڑکے مکان میں داخل ہوئے۔ ان میں ایک لڑکے نے اختر صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے۔ ایک لڑکا کوٹھڑی نما کمرہ کے اندر گیا اور اختر صاحب کی اچکن لے کر نکلا۔ دوسرا ان کے جوتے صاف کرنے لگا۔ ظاہر تھا یہ لڑکے اختر صاحب کو ساتھ لے جانے آئے تھے۔ ہم سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ اختر صاحب نے ان صاحب کو مخاطب کیا جو چارپائی کی پٹی پر ٹکے تھے: ''تابش تم انہیں ان کے قیام کی جگہ پہنچاؤ۔ یہ لاہور کے گلی کوچوں سے واقف نہیں۔'' پھر مجھ سے ہاتھ ملایا اور کہا کہ ''میں صاحبزادہ صاحب کو خط لکھوں گا۔ تم اپنے والد سے میرا غائبانہ سلام کہنا اور پٹیالہ پہنچ کر خط لکھنا۔''

ہم گلی سے نکل کر سڑک پر آئے اور تابش صدیقی صاحب نے میرا تعارف میرا جی اور مختار صدیقی سے کروایا۔ یہ ملاقات آگے چل کر تابش صدیقی' میرا جی اور مختار صدیقی سے اخلاص اور دوستی کی بنیاد بنی۔

ایک دن مرتضٰی صاحب نے شاہدرہ میں نور جہاں اور شہنشاہ جہانگیر کے مقبروں' شالیمار' لارنس گارڈن اور انارکلی کی سیر کرائی۔ تابش صدیقی نے مولانا صلاح الدین احمد' مرزا ادیب اور حکیم یوسف حسن سے ملوایا۔

پٹیالہ پہنچ کر میں نے ناصر کاظمی کو اختر صاحب اور لاہور کے ادبی مشاہیر سے ملاقات کا نہایت مبالغہ آمیز خط لکھا۔ ناصر کا جواب آیا۔ اس میں میری خوش قسمتی پر مبارکباد اور اپنی محرومی پر نہایت رنج اور افسوس کا اظہار کیا تھا۔

اے سرزمین گجرات

دو سال بعد 1942ء میں لاہور کی کشش مجھے اور ناصر کو اس شہر بے مثال میں کھینچ لائی جہاں میں نے اپنی زندگی کے پانچ دلچسپ' رنگین اور شیریں سال گزارے اور ناصر کی شاعری اور شاعرانہ زندگی کا ستارہ یہیں طلوع ہوا اور تابانی دکھا کر گم ہو گیا۔ مجھے اور ناصر کو اپنی اس محرومی پر رنج اور افسوس تھا کہ اختر شیرانی اپنی زندگی کا ہنگامہ خیز دور لاہور میں گزار کر اپنے وطن ٹونک چلے گئے۔

لاہور میں میرا قیام موہنی روڈ پر الراعی بلڈنگ میں تھا۔ بھائی غضنفر کو گورنمنٹ آف انڈیا میں ملازمت مل گئی اور وہ دلی جانے سے پہلے اپنا کمرہ مجھے دے گئے تھے۔ ناصر کا قیام اسلامیہ کالج کے ہاسٹل میں تھا جو کالج کے احاطہ میں واقع تھا۔

لاہور کے قیام کے پہلے ایک سال میری اور ناصر کی دوستی کے شباب کا زمانہ تھا۔ ہمارا یہ معمول تھا کہ ہر اتوار کو میں موہنی روڈ سے پیدل یا سائیکل پر ریلوے روڈ پر اسلامیہ کالج کے ہاسٹل جاتا۔ پھر ہم دونوں کسی ہوٹل میں جا کر کھانا کھاتے پھر کوئی فلم دیکھتے اور شام کو وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کے بورڈ روم میں حلقہ ارباب ذوق کی میٹنگ میں شرکت کرتے، کافی ہاؤس میں کافی پیتے اور اس کے بعد اپنے اپنے مستقر کا راستہ لیتے۔

ایک ایسے ہی اتوار کے دن میں فلیمنگ روڈ پر سے ہو کر ناصر سے ملنے جا رہا تھا کہ پرانی کتابوں اور رسالوں کی دکان پر میں نے ''خیالستان'' کا پرانا شمارہ دیکھا جو میں نے خرید لیا۔ ''خیالستان'' اختر صاحب 31-1930ء میں لاہور سے نکالتے تھے۔ رسالہ لے کر میں ناصر کے پاس پہنچا۔ اس شمارے میں اختر صاحب کی نظم ''اے سرزمین گجرات'' شامل تھی۔ (6) نظم پڑھتے ہوئے یکا یک ناصر نے کہا کہ اس نظم سے صاف ظاہر ہے کہ سلمیٰ گجرات کی رہنے والی ہیں اور ذرا سی کوشش سے ہم ان کا کھوج نکال سکتے ہیں اور ادبی دنیا میں ایک تہلکا مچا سکتے ہیں۔ ناصر نے جوش اور جذبے سے کہا کہ گجرات چھوٹی سی جگہ ہے اور وہاں ان کے دو ایک دوست ہیں۔ جو اس تلاش میں ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ غرضیکہ ہم دونوں ریلوے سٹیشن پہنچے حسن اتفاق سے راولپنڈی جانے والی ٹرین روانہ ہونے والی تھی اور ہم تقریباً ایک بجے دوپہر گجرات پہنچ گئے۔ ستمبر یا اکتوبر کا مہینہ تھا۔ گجرات پہنچ کر معلوم ہوا کہ ناصر کے کوئی دوست اس شہر میں نہیں اور ناصر نے حسب عادت گپ لگاوی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ تلاش کیسے شروع کی جائے۔

آخر مجھے یہ خیال سوجھا کہ پوسٹ آفس کی مدد لی جائے۔ اب یہ دقت آن پڑی کہ اتوار کا دن تھا اور پوسٹ آفس بند تھا۔ ہم نے پوسٹ ماسٹر صاحب کے گھر کا پتہ لگایا اور ان سے ملے جو ہندو تھے۔ ناصر نے ان صاحب سے کہا کہ وہ گجرات کے شاعروں اور ادیبوں پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں کچھ پتے درکار ہیں۔ وہ صاحب کافی درشتی سے پیش آئے اور کہا کہ انکے پاس ایسی کوئی فہرست نہیں۔ وہاں سے مایوس ہو کر ہم لوگ پوسٹ مین کی تلاش میں نکلے۔ ایک صاحب ملے۔ انہوں نے کہا کہ کیوں وقت ضائع کر رہے ہو؟ پوسٹ آفس آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اب شام ہو رہی تھی۔ بھوک زوروں سے لگی تھی۔ گجرات میں کوئی ہوٹل نہ تھا جہاں کھانا مل سکتا۔ یہاں تک کہ ریلوے سٹیشن پر بھی کھانے پینے کا سامان نہ تھا۔ مناسب یہی معلوم ہوا کہ اس بے معنی تلاش سے ہاتھ اٹھایا جائے اور لاہور کا رخ کیا جائے۔ رات کو بھوکے پیاسے لاہور پہنچے۔ لاہور سٹیشن پر سیر ہو کر کھانا کھایا۔ ناصر نے رخصت ہوتے ہوئے کہا کہ یقیناً اختر صاحب نے اپنے پڑھنے والوں کو بے وقوف بنایا ہے، سلمیٰ ایسے گھٹیا شہر میں کیسے رہ سکتی ہیں۔

اختر شیرانی کی لاہور آمد

1942ء میں جب تھرڈ ایئر میں داخلہ کے لیے لاہور آیا اور موہنی روڈ پر واقع الراعی بلڈنگ میں بھائی غضنفر کے کمرہ میں میں ٹھہر گیا تو تابش صدیقی کی تلاش شروع کی اور بالآخر انھیں انقلاب اخبار کے دفتر میں ڈھونڈ نکالا۔ یہاں سے میری اور تابش کی دوستی کا آغاز ہوا۔ جلد ہی میں نے ناصر کو تابش سے ملوایا کئی مہینے میں اور ناصر ہر شام انقلاب کے دفتر پہنچتے۔ تابش خبروں کے ترجمے سے فارغ ہو چکتے پھر ہم تینوں لاہور کی آوارہ گردی پر نکلتے۔ عرب ہوٹل میں چائے پیتے' ادبی رسائل کے چکر لگاتے' حلقہ ارباب ذوق کے جلسوں میں شرکت کرتے۔

اسی زمانہ میں جناب احمد ندیم قاسمی اخبار ''پھول'' اور ''تہذیب نسواں'' کے ایڈیٹر ہو کر لاہور تشریف لائے۔ وہ تابش صاحب کے عزیز دوستوں میں تھے۔ اب میں نے اور ناصر نے تابش صاحب کے ساتھ دارالاشاعت' جہاں اخبار ''پھول'' کا دفتر تھا' ندیم صاحب کی خدمت میں حاضری دینا شروع کیا۔ تقریباً ہر شام کو ندیم صاحب کے دفتر میں جمع ہوتے' چائے پیتے اور گپ شپ کرتے۔ اکثر مولانا عبدالمجید سالک تاج صاحب سے ملنے آتے۔ دو چار مرتبہ پطرس بخاری اور حفیظ جالندھری بھی آئے۔ مجھے ان مشاہیر سے ملنے اور ان کی گفتگو سننے کا موقع ملا۔ ایک شام میں اور ناصر' ندیم صاحب کی خدمت میں حاضر تھے کہ تابش صاحب کمرہ میں داخل ہوئے تو انھوں نے کہا کہ ''حضرات! ایک خوش خبری''۔ ندیم صاحب نے ایک مسودہ پر سے نظریں اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''انقلاب سپیشل'' اب ہم تابش صاحب کی طرف متوجہ تھے۔ انھوں نے اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''مصدقہ ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اردو کے نامور شاعر اختر شیرانی آج صبح لاہور پہنچ گئے ہیں۔''

ندیم صاحب نے کہا ''اور یہ مصدقہ ذرائع کون سے ہیں؟'' انھوں نے بتایا کہ قمر تسکین آج ان سے ملنے آئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ اختر صاحب آج صبح آئے ہیں اور شیش محل روڈ پر .... صاحب (ان صاحب کا نام اب مجھے یاد نہیں) کے مہمان ہیں۔ ناصر نے حسب عادت جوش اور جذبے سے کہا کہ چلیے اختر صاحب سے ملتے ہیں۔ ندیم صاحب نے اپنی دھیمی آواز میں مشورہ دیا کہ افضال صاحب موہنی روڈ پر رہتے ہیں جو شیش محل کے بالکل نزدیک ہے۔ وہ کل پتہ کر کے آئیں اور رپورٹ پیش کریں۔ اگلے دن میں نے تابش کی رپورٹ کی تصدیق کر دی۔

میری ملاقاتیں

اختر صاحب دو سال کی مفارقت کے بعد لاہور آئے تھے۔ ان کا قیام شیش محل روڈ پر ان کے کسی دوست کے مکان پر تھا۔ خوش قسمتی سے میرا قیام موہنی روڈ پر تھا جو شیش محل روڈ کے بالکل قریب ہے۔

میں اختر صاحب سے ملنے کے موقعے نکالتا رہا۔ وہ ہمیشہ دوستوں اور اپنے مداحوں اور ثنا ساؤں میں گھرے رہتے۔ ایک اتوار کی صبح میں گیا اور سڑک پر پنواڑی کی دکان سے پان بنوائے۔ اس پنواڑی کو اختر صاحب کی مصروفیات کا علم رہتا تھا۔ اس نے کہا کہ اختر صاحب اس وقت اکیلے ہیں۔ میں اوپر گیا تو اختر صاحب کھانے کی میز پر بیٹھے اخبار پڑھنے میں مصروف تھے۔ انھوں نے آنکھیں اٹھائے بغیر کہا کہ بیٹھ جاؤ۔ میں ادب سے ان کے سامنے بیٹھ گیا اور اس انتظار میں رہا کہ وہ مطالعہ سے فارغ ہوں تو بات کروں۔ میں نے دیکھا کہ وہ اخبار انقلاب کے افکار و حوادث کا کالم پڑھ رہے تھے۔

آخر انہوں نے اخبار ایک طرف کھسکا کر پان کھایا اور کہنے لگے کہ بہت اچھی بات ہے کہ تمھیں پان کھانے کی علت نہیں پڑی۔ میں نے ان کے خوش گوار موڈ کو دیکھتے ہوئے کہا کہ اختر صاحب! میں اور ناصر رضا آپ کی نظم ''اے سرزمین گجرات'' پڑھ کر گجرات گئے تھے۔ اختر صاحب نے میری بات کا کسی قسم کا نوٹس نہ لیا اور بدستور پان چباتے رہے۔ میں نے پھر ہمت کی اور کہا کہ ہم دونوں بہت خوار ہو کر واپس آئے تو ناصر نے کہا کہ اختر صاحب نے اپنے پڑھنے والوں کو بے وقوف بنایا ہے۔ سلمیٰ ایسے گھٹیا شہر میں نہیں رہ سکتی ہیں۔ یہ سننا تھا کہ اختر صاحب نے گھور کر مجھے دیکھا اور کہا کہ یہ ناصر رضا کون صاحب ہیں؟ میں نے کہا کہ وہ آپ کی شاعری کے والہ و شیدا ہیں۔ اختر صاحب چپ ہو گئے۔ تھوڑے وقفہ کے بعد بولے کیا تم سی۔ آئی۔ ڈی میں کام کرتے ہو؟ اس قسم کی حرکتیں شریف لوگوں کو زیب نہیں دیتیں۔ میں ارادہ کر رہا تھا کہ اختر صاحب سے اپنی نامعقولیت پر افسوس کا اظہار کروں اور معافی مانگوں کہ اختر صاحب کے چند ملنے والے آ گئے۔ اختر صاحب نے کہا کہ اب تم جاؤ' پھر کسی وقت آؤ۔ میں سلام کر کے چلا آیا۔

ایس۔ پی۔ ایس کے ہال کا مشاعرہ

چند روز کے بعد ہم یعنی ہیں' ناصر اور تابش حسب معمول اخبار ''پھول'' کے دفتر میں جمع تھے۔ یکا یک تابش صدیقی' ندیم صاحب سے مخاطب ہوئے کہ آپ میٹنگ میں نہیں آئے۔ ندیم صاحب نے پوچھا کیسی میٹنگ؟ تابش نے کہا کہ حکیم صاحب کے مطب میں اختر صاحب کے دوستوں اور عقیدت مندوں کی میٹنگ ہوئی تھی کہ اختر صاحب کی آمد کی تقریب میں مشاعرہ ہونا چاہیے اور مشاعرہ کی آمدنی اختر صاحب کی خدمت میں پیش کی جائے۔ ندیم صاحب نے کہا کہ مجھے تو کسی نے نہیں بلایا۔ بات ختم ہوئی۔ ایک دو دن کے بعد کرسمس کی تعطیلات تھیں۔ کالج بند ہو گئے اور میں اور ناصر لاہور سے اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

میں دس پندرہ دن کے بعد واپس آیا اور تابش سے ملنے اخبار ''انقلاب'' کے دفتر گیا تو

عبدالسلام خورشید، میر اقبال احمد اور حفیظ ہوشیار پوری پہلے سے موجود تھے اور مشاعرے کی تفصیلات طے کر رہے تھے جو دو دن کے بعد ایس، پی ایس کے ہال میں ہونے والا تھا۔ ٹکٹوں کی کاپیاں چھپ چکی تھیں۔ دو روپیہ ٹکٹ تھا اور مشاعرہ کے پوسٹر شہر میں لگ گئے تھے۔ کاپی میں دس ٹکٹ تھے۔ تابش صاحب نے ایک کاپی مجھے دیتے ہوئے کہا ''وقت کم ہے اور ابھی سے ٹکٹ بیچنے کی کوشش کرو۔'' میں اور میر اقبال احمد باہر آئے۔ اقبال نے کہا کہ انھوں نے دس ٹکٹ بیچنے کا انتظام کر رکھا ہے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر کنیئرڈ کالج گئے اور وہاں ایک لڑکی سے ملے اور ٹکٹوں کی کاپی اس کے حوالے کر دی۔ اس نے فوراً بیس روپے نکال کر اقبال صاحب کے ہاتھ میں رکھ دیئے۔ جب ہم چلنے لگے تو اس لڑکی نے اقبال صاحب کو مخاطب کر کے پوچھا۔ ''کیا مشاعرہ میں سلمیٰ بھی آئیں گی؟'' اقبال صاحب نے کہا۔ ''اگر وہ آئیں بھی تو کیسے پتہ چلے گا۔''

مجھے اپنے حصہ کے ٹکٹ بیچنے میں کافی تگ و دو کرنا پڑی۔ میں اور اقبال صاحب مشاعرہ میں ایک ساتھ گئے۔ ہال بھرا ہوا تھا۔ اختر صاحب کرسی صدارت پر تشریف فرما تھے اور مبتدی قسم کے کوئی صاحب اپنی غزل نہایت بھونڈے ترنم سے پڑھ رہے تھے۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے دو ایک شاعروں کے بعد عبدالسلام خورشید نے جو سٹیج سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اعلان کیا کہ اب میر اقبال احمد صاحب اپنا کلام پیش کریں گے۔ اختر صاحب، جو سخت ناگواری کی حالت میں گردن جھکائے بیٹھے تھے، یکا یک چونکے اور حیرت اور مسرت سے اقبال کی طرف دیکھا۔ اقبال صاحب نے کچھ جھجکتے اور کچھ گھبراتے ہوئے ایک غزل پڑھی جس پر انہیں بہت داد ملی۔ ان کی غزل کے دو شعر اتنا عرصہ گزرنے پر بھی مجھے یاد ہیں۔

جام شراب و روئے دل آرام تک گئی
آغاز میں نگاہ سر انجام تک گئی

آخر وہ دل کی بات جو لب تک نہ آئی تھی
اتنی بڑھی کہ نامہ و پیغام تک گئی

اختر صاحب اقبال کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ اقبال صاحب کے بچپن میں اختر صاحب کے والد حافظ محمود شیرانی اور اقبال صاحب کے والد میر نور احمد فلیمنگ روڈ پر رہا کرتے تھے۔ اقبال صاحب نے عبدالسلام خورشید صاحب کے کان میں کچھ بات کی اور فوراً خورشید صاحب نے اعلان کیا کہ اب افضال زیدی صاحب اپنی غزل پیش کریں گے۔ پہلے تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ کس صاحب کا نام پکارا گیا ہے۔ پھر اقبال صاحب نے مجھے لے جا کر اختر صاحب کے سامنے کھڑا کر دیا۔ مجھے اپنے پاؤں

تلے سے لکڑی کا فرش کھسکتا ہوا محسوس ہوا۔ اب اختر صاحب بڑی حیرت سے میری پریشانی کو دیکھ رہے تھے۔ پھر میں نے دیکھا کہ اگلی صفوں سے ناصر اور تابش صدیقی کھڑے ہو کر چلا چلا کر کہہ رہے تھے ارشاد ارشاد میں نے انہی دنوں ایک متبدیانہ غزل لکھ کر اقبال صاحب کو سنائی تھی جو میرے لیے مصیبت کا باعث ہوئی۔ میں نے جب فرار کے راستے بند دیکھے تو گھبراہٹ کے عالم میں وہ غزل پڑھ دی۔ اس کے بعض شعر یاد رہ گئے ہیں۔ آپ بھی سن لیجیے۔

شوق نظارہ کو پھر دعوت حیرانی دے
اور مجھے درد محبت کی فراوانی دے

پھر نہ ساحل رہے نے سطوت ساحل باقی
دریا موجوں کو اگر رخصت جولانی دے

اپنے افضال کو دینا ہے اگر کچھ یا رب
ذہن غالب تو دل اختر شیرانی دے

مقطع کا پڑھنا تھا کہ جیسے زلزلہ آ گیا۔ ناصر اور خدا جانے کون کون اپنی اپنی جگہوں پر کھڑے ہو کر چلا رہے تھے، مکرر، مکرر، میں اپنی جگہ پتھر ہو چکا تھا۔ اختر صاحب کو میری بے چارگی پر ترس آیا۔ وہ کھڑے ہوئے اور مجمع سے مخاطب ہو کر کہا کہ وہ تو دعا مانگ چکے آپ ان سے ہمدردی کا اظہار کریں اور رحم کھائیں۔

اس ہڑبونگ میں ایک لڑکا سامعین کی صفوں میں سے نکلا، سٹیج پر آیا اور زور سے چلایا کہ معزز سامعین! آپ خاموش ہو جائیں۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہو گی کہ محترمہ سلمیٰ تشریف رکھتی ہیں اور اپنا کلام پیش کریں گی۔'' اس اعلان کے بعد وہ مجمع میں غائب ہو گیا۔ اب سامعین کھڑے ہو گئے تھے۔ اور اس طرف دیکھ رہے تھے جہاں خواتین جمع تھیں۔ اختر صاحب نے کہا: ''یہ کیا بیہودگی ہے!'' اب ایک افراتفری کا عالم تھا۔ اقبال نے میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے مخصوص انداز میں کہا: ''میری جان! اب یہاں سے نکلنا چاہیے۔'' چنانچہ ہم دونوں سیڑھیوں سے اتر کر سڑک پر آ گئے اور پھر مشرق ہوٹل جا کر دم لیا۔ اگلے دن تابش صاحب نے کہا کہ اختر صاحب نے ایک نظم اور دو غزلیں سنائیں۔ دو چار دن کے بعد اختر صاحب ٹونک چلے گئے۔

ایک ڈیڑھ سال کے بعد پھر اختر صاحب لاہور آئے تو میرے بی۔ اے کے امتحان ہو رہے تھے۔ اگرچہ اختر صاحب کا قیام شیش محل روڈ پر تھا لیکن میں امتحان کی مصروفیت کی وجہ سے ان کی خدمت

میں حاضر نہ ہو سکا۔ ایک شام دیر سے اپنے کمرہ پر واپس آیا تو میرے ہم کمرہ ڈاکٹر عبداللطیف نے بتلایا کہ کچھ دیر پہلے اختر شیرانی تانگہ پر آئے لیکن کھڑے کھڑے تمھاری خیریت دریافت کی۔ اس کے بعد فرمایا کہ کوئی کتاب پڑھنے کے لیے دو۔ میری میز پر چارلس ڈکنز کا ناول ''اے ٹیل آف ٹوسٹیز'' رکھا تھا' وہی لے گئے۔ چند دن کے بعد امتحان ختم ہونے پر میں اختر صاحب کی قیام گاہ پر گیا۔ خوش قسمتی سے گھر پر موجود تھے۔ میرے امتحان کے متعلق دریافت فرمایا۔ پھر کہا کہ سامنے الماری میں تمہاری کتاب رکھی ہے۔ میں نے یہ ناول بہت سال پہلے پڑھا تھا۔ دوبارہ پڑھنے میں لطف نہیں آیا۔ میں نے کتاب اٹھائی۔ سرورق پر میں نے ڈکنز کے کردار سڈنی کارٹن سے متاثر ہو کر یہ شعر لکھ دیا تھا:

مرگ سڈنی سے عقل گم ہے میر
کیا دوانے نے موت پائی ہے

اختر صاحب نے اپنے قلم سے ''سڈنی'' کاٹ کر مجنوں لکھ دیا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ میں نے شدت جذبات سے مغلوب ہو کر میر کے شعر میں تحریف کی جسارت کی تھی۔ اختر صاحب تھوڑی دیر چپ رہے۔ پھر بولے کہ فرضی کردار اتنا متاثر کر سکتا ہے لیکن زندہ انسانوں پر جو گزرتی ہے اس کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے۔ پھر یہ شعر پڑھا:

جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں

اتنے میں سیڑھیوں پر قدموں کی آہٹ ہوئی۔ آختر صاحب کے چند دوست ان سے ملنے آئے تھے۔ اختر صاحب نے کہا کہ ''اب تم جاؤ' کل کسی وقت آؤ''۔ میں اپنے کمرہ پر واپس آیا اور کتاب پھر کھولی تو سرورق پر اختر صاحب کے ہاتھ کا نہایت خوش خط شعر لکھا ہوا تھا:

لایا کتاب اختر بے حال کے لیے
دل سے دعا نکلتی ہے افضال کے لیے

یہ شعر' اختر صاحب کی بے پایاں شفقت کا گنجینہ بے بہا' میرے دل پر نقش ہے۔ افسوس ہے کہ کتاب 1947ء کے آشوب میں ضائع ہوگئی۔ میں دو چار دن کے بعد اختر صاحب کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ان کی قیام گاہ پر گیا تو وہ ٹونک واپس جا چکے تھے۔

اسلامیہ کالج کا مشاعرہ

کوئی ڈیڑھ دو سال کے بعد اختر صاحب کا لاہور کا پھیرا ہوا اور یہ میری اختر صاحب سے آخری ملاقات کا سبب ٹھہرا۔ میں بی۔ اے پاس کرنے کے بعد کچھ عرصہ ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' میں کام

کرنے کے بعد حکومت ہند کے محکمہ اطلاعات کے پندرہ روزہ رسالے ''انڈین انفارمیشن'' کے سٹاف میں شامل ہو چکا تھا۔ میرا دفتر نیڈوز ہوٹل کی بالائی منزل پر واقع تھا۔ ایک دن' جہاں تک یاد پڑتا ہے' ستمبر 1945ء کی کوئی تاریخ تھی۔ صبح کا وقت تھا کہ چپڑاسی پیارا سنگھ اوپر آیا اور اس نے مجھے بتلایا کہ نیچے کوئی صاحب تانگے میں بیٹھے ہیں اور آپ کو بلا رہے ہیں۔ میں نیچے گیا تو تانگے کی پچھلی سیٹ پر اختر صاحب نیم دراز تھے۔ میں قدم بوسی کے لیے بڑھا تو اٹھ کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے ''تم یہ چاہتے ہو کہ میری شفاعت نہ ہو اور میں سیدھا جہنم میں جاؤں۔ تم سید ہو اور میں گناہ گار ہوں لیکن بے خبر نہیں ہوں۔'' میں نے اوپر چلنے کے لیے اصرار کیا لیکن وہ جلدی میں تھے۔ فرمایا کہ میں کل آیا ہوں اور حکیم صاحب (حکیم نیر واسطی) کے مکان پر ٹھہرا ہوں۔ پھر پوچھا' تمھیں معلوم ہے کہ اسلامیہ کالج کے سٹاف اور طلباء نے آج رات حبیبیہ ہال میں بزم مشاعرہ منعقد کی ہے۔ مجھے چند دوست گوجرانوالہ لے جا رہے ہیں لیکن مشاعرہ سے پہلے واپس پہنچ جائیں گے۔ تم ''ادبی دنیا'' کے دفتر جاؤ اور جس شمارہ میں میری نظم ''عزم رنگیں'' چھپی ہے' لے کر مشاعرہ میں پہنچ جاؤ۔ میں وہ نظم پڑھ دوں گا۔

میں ''ادبی دنیا'' کے دفتر پہنچا تو وہاں ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی اور امجد حسین تشریف فرما تھے۔ میں نے اپنے آنے کا مدعا عرض کیا تو مولانا صلاح الدین احمد صاحب نے عاشق صاحب سے پوچھا کہ آپ کے دوست لاہور میں ہیں اور آپ کو خبر تک نہیں؟ عاشق صاحب نے کہا کہ خبر کیسے ہو؟ خط وہ لکھتے نہیں اور اخبار میں ان کے آنے کی خبر چھپتی نہیں۔ اب دیکھیے مشاعرہ کا بھی کوئی اعلان میری نظر سے نہیں گزرا۔ مولانا صاحب نے تھوڑی سی کوشش سے ''ادبی دنیا'' کا شمارہ ڈھونڈ نکالا۔ عاشق صاحب نے اختر صاحب کی نظم بلند آواز سے پڑھی اور کہا ''تخیل اور جذبہ کا ایسا امتزاج کہیں مشکل سے ملے گا' لیکن اختر صاحب ایسی طویل نظم کیسے پڑھیں گے اور اگر جسٹس دین محمد کے بیٹے اور بھتیجے انہیں گوجرانوالہ لے گئے ہیں تو سمجھ لیجیے کہ اللہ حافظ اور مشاعرہ کا بھی اللہ حافظ۔''

میں ادبی دنیا کا شمارہ لے کر اسلامیہ کالج پہنچا تو حبیبیہ ہال میں سامعین جمع ہو رہے تھے۔ نو بجے تک ہال بھر گیا تھا۔ تھوڑی دیر میں مولانا عبدالمجید سالک تشریف لائے اور کرسی صدارت پر رونق افروز ہو گئے۔ پھر مشاعرہ شروع ہو گیا اور مقامی اور نوآموز شعراء سٹیج پر آتے رہے اور ہوٹ ہوتے رہے۔ اسی مشاعرے میں میں نے حمید نسیم صاحب کو پہلی دفعہ دیکھا اور سنا۔ انہوں نے ترنم سے غزل پڑھی اور داد پائی۔ ناصر کاظمی بھی مشاعرے میں موجود تھے لیکن انہیں کلام سنانے کے لیے نہیں پکارا گیا۔ غالباً ابھی ان کی شاعری کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ اس تمام عرصہ میں اختر صاحب کا پتہ نہ تھا اور مولانا سالک اور کارکنان مشاعرہ کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس پریشانی اور انتظار کے عالم میں بارہ بجے کے قریب اختر صاحب چند اصحاب کے سہارے تشریف لے آئے۔ مولانا سالک نے سامعین کو مخاطب کیا

اور کہا ''لیجیے اب اختر صاحب آپ کو اپنا کلام سنائیں گے جو انہوں نے لاہور سے جانے کے بعد لکھا ہے۔'' اس عرصہ میں میں نے ''ادبی دنیا'' کا شمارہ انہیں دے دیا تھا۔ اختر صاحب نے نظم شروع کی لیکن آواز ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اس کے علاوہ یہ نظم اپنی ہیئت اور طرز کی وجہ سے مشاعرہ کے لیے غالباً موزوں بھی نہ تھی۔ سامعین میں شور اٹھا 'سلمیٰ! سلمیٰ!' اختر صاحب نے بھی نظم ادھوری چھوڑ دی اور اپنی مشہور نظم ''سنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں' اور ایک غزل ''زمان ہجر مٹے دور وصل یار آئے'' سنائیں۔

اس مشاعرہ کی ایک بات جو اس وقت بھی میری حیرت کا سامان تھی اور آج بھی ہے۔ مشاعرہ ختم ہو گیا۔ اختر صاحب کو کچھ لڑکے اپنے ساتھ لے گئے اور کالج کے سامنے کے وسیع میدان میں گھاس پر بیٹھ گئے۔ میں کالج کے پورچ میں غالباً ناصر کاظمی کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک سیاہ رنگ کی شورلٹ کار سے باوردی شوفر میرے پاس آیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ ہماری بیگم صاحب آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ ایک خاتون نے جو حسن اور وجاہت کا پیکر تھیں' نہایت شائستہ اردو میں مجھ سے پوچھا کہ آپ اختر صاحب کو مشاعرہ میں لائے ہیں؟ میں نے انکار میں سر ہلایا تو وہ بولیں کہ ''یہ سب لڑکے انہیں شراب پلا کر چھوڑ کر چل دیں گے''۔ میں نے کہا کہ میں ایک تانگہ لاتا ہوں اور انہیں شیش محل روڈ پر اختر صاحب کے دوست کے گھر چھوڑ دوں گا۔ اس کے بعد میں فلیمنگ روڈ کے نکڑ سے تانگہ لایا۔ وہ خاتون جا چکی تھیں۔ تانگہ والا اختر صاحب کا جاننے والا نکلا۔ اس نے مجھے اطمینان دلایا کہ آپ بے فکر رہیں میں اختر صاحب کو حکیم صاحب کے مکان پر چھوڑ کر آؤں گا اور واقعی اس نے چند لڑکوں کی مدد سے اختر صاحب کو تانگہ میں سوار کیا اور سٹیشن کی طرف لے گیا۔

یہ میری اختر صاحب سے آخری ملاقات تھی۔ وہ ایک یا دو دن کے بعد ٹونک چلے گئے۔ اس کے بعد ملک میں خون آشام انقلاب آیا۔ ملک تقسیم ہوا۔ دونوں طرف خون کے دریا بہہ گئے۔ لاکھوں انسان انقلاب کی بھینٹ چڑھ گئے۔ کروڑوں بے گھر ہو گئے۔ میں بھی اس انقلاب کی رو میں کراچی پہنچ گیا جو حکومت پاکستان کا دارالحکومت تھا۔ اس ہنگامہ گیرودار میں اختر صاحب کی خبر نہ ملی۔ دلی سے جو احباب کراچی پہنچے انہیں بھی اختر صاحب کی خیریت معلوم نہ ہو سکی۔

جب ذرا سکون ہوا اور آندھی تھمی تو پرانے دوستوں کی تلاش شروع کی۔ خوش قسمتی کہیے کہ اولین دنوں میں کراچی کے کافی ہاؤس میں تابش صدیقی سے ملاقات ہوئی۔ وہ مجھ سے زیادہ اختر صاحب کی خیریت معلوم کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ اسی زمانہ میں یونس سعید سے ملاقات اور دوستی ہوئی۔ پھر ہم تینوں یعنی تابش' یونس سعید اور میرا گروپ بن گیا اور ہم تینوں کی شامیں اکٹھی گزرنے لگیں۔ ایک شام تابش صاحب جب کافی ہاؤس آئے تو ان کا چہرہ مسرت اور خوشی سے تمتما رہا تھا۔ انہوں نے خوشی

سے کھنکھناتی آواز اور کیف آمیز لہجے میں کہا کہ ایک بہت بڑی خوش خبری، اختر صاحب بخیریت لاہور پہنچ گئے ہیں۔ میں نے فوراً اختر صاحب کو حکیم نیر واسطی کے پتے پر خط لکھا۔

کچھ دنوں کے بعد تابش صاحب نے تجویز پیش کی کہ اختر صاحب کے ساتھ کراچی میں ایک شام منانے کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ اس کے لیے تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ تابش صاحب بہت سرگرم تھے۔ وہ ہر شام اپنی کارگزاری کی رپورٹ دیتے ملک غلام محمد وزیر مالیات جلسہ کی صدارت فرمائیں گے۔ اختر صاحب کا قیام شجاعت علی حسنی کے گھر پر ہوگا۔ تابش صاحب تیاریوں میں مصروف تھے اور حسب معمول اپنی کارگزاری سنا رہے تھے کہ کافی ہاؤس کی سیڑھیوں پر حفیظ ہوشیار پوری نمودار ہوئے۔ انھوں نے تابش اور مجھے دیکھا تو سیدھے ہماری میز پر آئے۔ ان کا تبادلہ لاہور سے کراچی ریڈیو سٹیشن پر ہو گیا تھا۔ تابش نے حفیظ صاحب کو جب اختر صاحب کے ساتھ شام منانے کے پروگرام سے مطلع کیا تو حفیظ صاحب چپ ہو گئے اور تھوڑے توقف کے بعد بولے کہ اختر صاحب اب اس حالت میں نہیں ہیں کہ سفر کر سکیں اور کسی جلسہ میں حصہ لے سکیں اور پھر چند دنوں کے بعد ''امروز'' میں یہ خبر پڑھ لی کہ اختر صاحب میو ہاسپٹل میں کوما کی حالت میں ہیں۔ تابش صاحب کو اور مجھے اپنی بے بسی پر رونا آیا کہ اختر صاحب کو سلام رخصت بھی نہ کر سکے۔

12 ستمبر 1948ء کو قائد اعظم کا جنازہ بندر روڈ سے پرانی نمائش کی طرف جا رہا تھا۔ لاکھوں سوگواروں میں ہم بھی تھے۔ اس ہجوم میں تابش صاحب ملے۔ انھوں نے میرا ہاتھ دبایا اور روتی ہوئی آواز میں کہا کہ اختر صاحب کل انتقال کر گئے۔

اختر صاحب کے ساتھ ایک شام منانے کی سب تیاریاں دھری کی دھری رہ گئیں۔ تابش صاحب نے ''ماہ نو'' میں اختر شیرانی کی شاعری پر مضمون لکھ کر ایک مدت کی رفاقت کا حق ادا کر دیا۔

وائے گر [در] پس امروز بود فردائے

حواشی

1- ''نغمہ حرم'' جو خواتین کے لیے لکھی گئی منظومات پر مشتمل تھی، مکتبہ اردو لاہور نے 1939ء میں شائع کی تھی۔

2- بسم اللہ پنواڑن کی دکان چوک برف خانہ کے نزدیک بل روڈ پر ایک احاطے کے پھاٹک سے متصل تھی۔ بڑی نستعلیق اور باذوق عورت تھی۔ اشعار کثرت سے یاد تھے اور ان کے باموقع استعمال پر عبور حاصل تھا۔ دونوں میاں بیوی دکان سنبھالتے تھے۔ یہ دکان قیام پاکستان کے

ایک عرصہ بعد تک موجود تھی۔

3- صاحبزادہ عبدالمنعم خاں' ریاست ٹونک کے نواب ابراہیم علی خاں (1867ء۔ 1930ء) کے بھتیجے یعنی ان کے برادر خورد صاحبزادہ عبدالرحیم خاں کے فرزند تھے۔

4- یہ صاحب یقیناً مہر محمد خاں شہاب مالیرکوٹلوی ہوں گے جن کے اختر سے پُر خلوص تعلقات تھے۔ ان کا انتقال فروری 1976ء میں بمبئی میں ہوا۔

5- یہ وہ زمانہ تھا جب اختر کو مے نوشی کی پاداش میں ان کے والد نے گھر سے نکال دیا تھا۔

6- یہ نظم ''خیالستان'' کے شمارہ فروری۔ مارچ 1931ء میں چھپی تھی۔

7- حکیم نیر واسطی صاحب مراد ہیں جن کا مطب سرکلر روڈ پر بیرون مستی گیٹ واقع تھا۔

8- میر نور احمد (1900ء۔1970ء) معروف صحافی تھے۔ ان کا تعلق سادات ساڈھورا (ضلع انبالہ) سے تھا۔ ''مارشل لاء سے مارشل لاء تک'' ان کی مشہور تالیف ہے۔

9- اختر کا انتقال 9 ستمبر 1948ء کو ہوا تھا اور تدفین 12 ستمبر کو عمل میں آئی تھی۔

☆......☆......☆

اختر شیرانی مرحوم ...... (ذاتی حوالوں سے)

حکیم سید محمود احمد برکاتی صاحب، ٹونک کے مشہور فاضل حکیم مولانا سید برکات احمد علیہ الرحمتہ کے پوتے، ملک کے سربرآوردہ طبیب اور برکاتی خاندان کی طبی اور علمی روایات کے امین ہیں۔ اکتوبر 1926ء میں ٹونک میں پیدا ہوئے۔ دہلی سے فاضل طب والجراحت، اجمیر سے فاضل دینیات اور الہ آباد سے فاضل ادب کی اسناد حاصل کیں۔ قیام پاکستان کے بعد سے کراچی میں مطب کر رہے ہیں۔ متعدد کتابوں کے علاوہ بہت سے مقالات ان کے قلم سے نکلے ہیں۔ ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں ہمدرد یونیورسٹی کراچی نے 2001ء میں ان کو ڈاکٹر آف سائنس کی اعزازی ڈگری تفویض کی۔

(ادارہ)

رات کا وقت تھا۔ چچا کے وسیع مردانے کے صحن میں محفل احباب آراستہ تھی۔ اختر صاحب اور چچا کے دو ایک مشترک احباب جمع تھے۔ ہم دو ایک نوعمر بھی اختر صاحب کی محبت و عقیدت کی وجہ سے اپنا رات کا مطالعہ چھوڑ کر شریک محفل تھے۔ ہماری موجودگی کے باعث مدرسے کے ایک نوجوان طالب علم بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ مردانے کے بیرونی دروازے کے برابر ایک کھانچا سا تھا جس میں ایک طاق بھی تھا۔ اختر صاحب نے مردانے میں داخل ہوتے وقت شیروانی کی جیب سے ایک ادھا نکال کر اس طاق میں رکھ دیا تھا۔ وہ تھوڑی دیر بعد اٹھ کر اس گوشے میں جاتے اور ایک منٹ بعد واپس آجاتے۔ میں نے تو اس طرف دھیان ہی نہیں دیا کہ یہ بار بار ادھر کیوں جاتے ہیں مگر وہ مدرسے کے مولوی صاحب تاڑ گئے اور ان کی رگ جہاد پھڑک اٹھی۔ وہ اٹھ کر طاق کی طرف چلے۔ معاً اختر صاحب کو بھی تنبہ ہوا اور وہ مولوی صاحب کے پیچھے لپکے۔ مولوی صاحب نے جیسے ہی اختر صاحب کو اپنے تعاقب میں پایا، وہ طاق سے بوتل اٹھا کر باہر کی طرف دوڑ پڑے۔ گھر کے سامنے ہی

مسجد تھی جس کی کرسی اونچی تھی۔ مولوی صاحب اس کی سیڑھیوں پر چڑھ کر اوپر پہنچ گئے۔ ہم بھی پیچھے پیچھے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ اختر صاحب بھی سیڑھیاں چڑھنا چاہتے تھے مگر پہلی سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ اچانک ایک جھٹکے سے رک گئے۔ تقریباً 65-70 سال پہلے کی بات ہے مگر اب تک یہ منظر یاد ہے کہ جیسے ہی انہوں نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے ان کے قدم پکڑ لیے بلکہ جکڑ لیے۔ پھر فوراً ہی اس پہلی سیڑھی سے بھی نیچے اتر آئے اور ایک خاص تیور کے ساتھ کرارے لہجے میں کہا۔

''مولوی صاحب! نیچے آ جاؤ' شرم کرو شرم' اس ناپاک بوتل کو لے کر مسجد میں داخل ہو گئے۔ مجھے دیکھو۔ اللہ کے فضل سے ایک سیڑھی سے آگے نہیں بڑھا۔ اللہ مجھے معاف کرے۔''

یہ کہہ کر وہ پلٹے۔ سب بزرگ گھر کے پھاٹک پر کھڑے تھے اور اس منظر سے ششدر رہ گئے تھے۔ اب اختر صاحب ایک خاص عالم میں چچا کی طرف متوجہ ہوئے۔

''ظہیر میاں! آپ طلبہ کو علم دین کی تعلیم دیتے ہیں۔ ان کو تربیت بھی دیا کیجیے۔ شراب ناپاک ہے' حرام ہے۔ گندی چیز ہے۔ میں سیاہ کار شرابی ہوں مگر شراب کی حرمت کا قائل ہوں بالکل اسی طرح جیسے آپ اور یہ طلبہ اور علماء ہیں۔ بزرگوں کی تربیت کام آئی اور گناہگار اور مدہوش ہونے کے باوجود میں مسجد کی سیڑھیاں نہ چڑھ سکا اور یہ مولوی صاحب مسجد میں داخل ہو گئے''

اب مولوی صاحب بھی نیچے اتر آئے تھے اور حیران حیران سے' سہمے سہمے سے کھڑے تھے۔ اختر صاحب بولے۔

''مولوی صاحب! بوتل نالی میں پھینک دو۔ اب یہ میرے کام کی نہیں رہی۔ میں گندہ آدمی ہوں' میرے مقدر میں گندگی لکھی ہے۔ یہ بوتل تمہارے طفیل مسجد میں ہو آئی ہے۔ اب میرے کام کی نہیں رہی۔''

یہ کہتے ہوئے مولوی صاحب کی طرف بڑھے اور ان کے ہاتھ سے بوتل لے کر پوری طاقت سے دیوار پر دے ماری۔ بوتل بکھر گئی' شراب بہہ گئی۔

اس واقعے پر ماہ و سال کی کم و بیش ستر تہیں چڑھ چکی ہیں اور ان گردشوں سے میرے حافظے پر خوب خوب مشق کرم کی ہے۔ اس کے باوجود مجھے یہ سب کچھ اس طرح یاد ہے جیسے کل کی بات ہو۔ اختر صاحب کی آواز یاد ہے' اپنی حیرت یاد ہے اور اس وقت کا یہ تاثر اب تک تازہ ہے کہ ان کا ایمان بڑا قوی تھا۔ وہ بادہ خوار تھے اور اس وقت بھی نشے میں تھے۔ ایک شخص ان کی بوتل لے کر بھاگ رہا تھا اور وہ پوری طاقت سے اس کا پیچھا کر رہے تھے کہ اس سے چھین لیں۔ اسی کوشش میں وہ مسجد کی سیڑھی پر بھی چڑھ گئے مگر صرف ایک سیڑھی پر۔ اس سے آگے نہ بڑھ سکے اور پھر اس پہلی سیڑھی سے بھی

فوراً اتر گئے اور اس کے بعد انہوں نے جو باتیں کیں وہ ہوش و حواس کی باتیں تھیں' ایک مسلمان کی سی باتیں تھیں' جس کے دل میں شراب کی حرمت کا وہی عقیدہ تھا اور مسجد کے تقدس کا وہی جذبہ تھا جو ایک مسلمان کے دل میں ہوتا ہے۔ اس بوتل کے مسجد کے در تک لے جانے پر ان کا ملال دیدنی تھا۔

اسی مردانے کا ایک اور واقعہ بھی حافظے کی لوح سے محو نہیں کیا جا سکا' جو ان کی ایمانی کیفیت اور ذکر رسول ﷺ کے احترام کا ثبوت ہے۔ چچا سے ان کے دیرینہ مراسم تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ اس زمانے میں اختر صاحب کی ایک نعت آل انڈیا ریڈیو سے روزانہ بالخصوص ہر اتوار کی صبح کو نشر ہوتی تھی۔

سحر دم رحمت حق کا یہ مستانہ پیام آیا

مبارک اہل ایماں کو کہ وہ خیر الانام آیا

چچا کو یہ بہت پسند تھی۔ ایک بار اختر صاحب تشریف لائے ہوئے تھے۔ چچا نے ان سے یہ نعت سنانے کی فرمائش کی۔ اختر نے معذرت کی۔ چچا نے اصرار کیا تو بڑی لجاجت سے کہنے لگے۔

''ظہیر میاں! آپ کہیں تو کوئی نظم سنا دوں۔ اس وقت نعت نہیں سنا سکوں گا۔ میں پھر آؤں گا اور یہ نعت ضرور سناؤں گا مگر اس وقت نہیں۔''

انکار کی وجہ سب سمجھ گئے۔ گویا نعت رسولؐ کے لیے جس طہارت جسم و ذہن کی ضرورت ہے اور حضور قلب کی جو کیفیت' اس کے لیے' ان کی نظر میں مطلوب تھی' اس وقت وہ اس سے محروم تھے۔

اختر صاحب کا نام تو میں نے بہت ہی کم عمری میں سن لیا تھا اور ان کے ماہنامہ ''رومان'' کے شماروں کی ورق گردانی بھی کر لی تھی' جو ہمارے یہاں آتا تھا۔ پھر یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ اپنے ہی شہر کے ہیں' شاعر ہیں' بہت مشہور ہیں۔ کچھ دن بعد جب ہر چیز پڑھنے کی لت اور شعر و ادب سے فطری والہانہ شغف کی بنا پر ان کی نظمیں پڑھنے میں آئیں تو خوب خوب جھوما ہوں۔ ان دنوں حافظہ' جو آج کل بے جان ہو گیا ہے' اتنا ہی جاندار تھا۔ اس لیے طویل طویل نظمیں نوک زبان پر تھیں۔ ''رومان'' کے علاوہ دوسرے رسائل میں بھی ان کی نظمیں نظر سے گزرتیں۔ بعض قدیم رسائل کے فائلوں میں اختر صاحب کی نظمیں پڑھیں مثلاً مولانا آزاد کے ''البلاغ'' میں ان کی ایک نظم' غالباً ''ماں'' پڑھی تھی۔

اختر صاحب کو دیکھنے کی آرزو 1941ء میں پوری ہوئی جب وہ لاہور کی سکونت ترک کر کے ٹونک آئے۔ ان کے والد حافظ محمود خاں شیرانی اپنا عہد ملازمت ختم کر کے ٹونک آ رہے تھے۔ سعادت مندی کا بے مثال نمونہ ہے کہ اختر صاحب بھی لاہور جیسے علمی و ادبی مرکز کو چھوڑ کر' جہاں انہوں نے اپنے فن کے علم اہرا رکھے تھے' ٹونک آ بسے۔ ایک دن وہ میرے چچا سے ملنے تشریف لے

آئے تو اپنے محبوب شاعر کی زیارت ہوئی۔ قد متوسط' بدن بھرا بھرا' رنگ سرخ و سفید' خد و خال دلکش' شیروانی اور چوڑے پائینچے کا پاجامہ' تمباکو نوشی سلسلہ نوشی کی حد تک۔ عقیدت کے جواب میں شفقت' مرعوبیت کے جواب میں بے تکلفی۔ اس وقت تک ان کا ایک ہی مجموعہ ''نغمہ حرم'' شائع ہوا تھا' وہ بھی خواتین کے لیے۔ اس کی ایک بار اختر صاحب کو ضرورت لاحق ہو گئی۔ ان کے پاس نہیں تھا۔ وہ میرے پاس نکلا تو یہ باہم تعارف پختہ ہو گیا۔

پھر ان کا دوسرا مگر درحقیقت پہلا مجموعہ کلام ''صبح بہار'' چھپا تو شاید ٹونک میں اس کا پہلا خریدار میں تھا۔ ان کو خبر ہوئی تو اپنی شخصیت میں میری والہیت نے انہیں متاثر کیا۔ قریب آنے کی ہمت ہوئی تو میں مختلف ادبی و علمی موضوعات پر ان سے طالب علمانہ سوالات کرتا رہتا اور وہ بزرگانہ شفقت اور معلمانہ توجہ سے جوابات دیتے۔ ان کی شفقت نے کسی قدر گستاخ اور بے تکلف بھی کر دیا تھا۔ اس لیے نامناسب سوال بھی کر گزرتا تھا مگر وہ مایوس نہ فرماتے۔ مثلاً ان کی نظم ''یورہائی نس'' کے سلسلے میں میرے سوال کے جواب میں...... ''فلاں رئیس کی فلاں صاحبزادی'' کی نشان دہی بھی بے خیالی میں فرما گئے۔ میں نے بھی آج تک ان کی امانت کا تحفظ کیا ہے۔ اسی طرح ''وادی سندھ سے ایک دعوت عشق'' کے سلسلے میں...... ''فلاں خاندان کی فلاں خاتون'' کی نشان دہی بھی اپنے بھولپن میں اور مجھ سے اپنائیت اور مجھ پر اعتماد کی بنا پر فرما گئے الحمد للہ میں نے بھی اب تک اس راز کو راز ہی رکھا ہے۔ انہی خاتون کا وہ خط بھی میں نے دیکھا تھا جس کے جواب میں ''میرا موجودہ مشغلہ'' کے نام سے طویل نظم لکھی گئی تھی۔ اس خط کا جواب بھی میں نے لیٹر بکس میں ڈالا تھا۔

میں اسی تعلق اور عقیدت کی بنا پر' جو ان سے تھی اور اس شفقت کے سہارے' جو وہ فرماتے تھے' ان کے دولت کدے پر حاضری دیتا رہتا تھا۔ ایک بار ان کے والد مرحوم' حافظ محمود خاں شیرانی کا ذکر آیا تو فرمانے لگے کہ آخر وقت میں کسی (شاید والدہ صاحبہ) نے میرے متعلق پوچھا کہ آپ اس سے خوش ہیں تو رو کر فرمانے لگے۔ ''اس کے علاوہ میرا اور کون ہے؟''

یہ کہتے ہوئے اختر صاحب کی آواز بھی رندھ گئی۔ پھر فرمانے لگے۔ ''زندگی میں صرف ایک بار باوا نے ہمیں منہ لگایا تھا اور تنقید شعر العجم کا مسودہ دے کر فرمایا' اس پر ایک نظر ڈال لو۔ میں نے دیکھا تو جہاں جہاں لہجہ سخت ہو گیا' پنسل سے وہاں نرم کر دیا۔ ایک موقع پر انہوں نے یہ مصرع تک لکھ دیا تھا۔

سخن شناس نہ ای دلبرا خطا ایں جاست

حافظ صاحب کچھ دن انجمن ترقی اردو' دہلی میں بھی مولوی عبدالحق کے ساتھ رہے تھے۔ اس زمانے کا ذکر سنانے لگے کہ۔ ایک دن ہم دونوں مولوی صاحب کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ مولوی

صاحب کو شوخی سوجھی تو حافظ صاحب سے کہنے لگے۔

''آپ کو معلوم ہے 'اختر بہت مشہور (یا بڑے) شاعر ہیں؟'' باوا مسکرا کر چپ ہو گئے۔

اس زمانے میں جگر صاحب کی ایک غزل بہت مقبول تھی۔

اے ہجوم نامرادی دل بہت گھبرائے ہے

گھبرائے ہے' آئے ہے' جائے ہے' زمین تھی۔ مجھے متروکات کا استعمال بہت اکھرا ہم سنوں سے ذکر کیا تو انہوں نے حسب توقع طنز فرمایا۔ ''ماشاللہ آپ اتنے بڑے شاعر پر اعتراض فرما رہے ہیں؟'' مگر یہ بات نہ اس دور میں دل کو لگی نہ آج تک کبھی یہ سوچا کہ فلاں شخص فلاں فن میں باکمال ہے لہذا اس کی غلطی کی تقلید کی جانی چاہیے۔ اس کی غلطی کو غلطی نہ کہا جائے۔ چنانچہ اپنی تسکین کے لیے میں نے اسی زمین میں چند شعر گھڑ لیے۔

اس کے بارے میں غلط فہمی تھی ہم کو کس قدر

شیر سمجھے تھے اسے ہم' وہ تو لیکن گائے ہے

دوسروں کے واسطے ہیں اور بھی چیزیں کئی

میرے حصے میں وہاں بس ایک پیالی چائے ہے

کر رہے ہیں آپ متروکات کو پھر اختیار

اپنا اپنا ذوق ہے اور اپنی اپنی رائے ہے

مختصر یہ کہ میں اس باب میں حساس سا ہو گیا تھا۔

اختر صاحب اور ملک کے چند دیگر شعراء نے تک'' کے بجائے اشعار میں'' تلک'' بھی استعمال فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک بار میں نے ان سے بڑے ادب سے عرض کی۔ ''اساتذہ نے تلک کو متروکات میں شامل کیا ہے' پھر آپ یہ لفظ کیوں استعمال فرماتے ہیں؟'' فرمایا ''تک کی نسبت تلک کانوں کو بھلا لگتا ہے۔'' ان کا یہ جواب میرے دل نشین نہیں ہوا چونکہ میرے خیال میں اس کی اصل وجہ ضرورت شعری تھی۔ چنانچہ میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ''تو پھر آپ گفتگو میں بھی تلک استعمال فرماتے ہوں گے؟'' میری اس گذارش پر ایک لمحہ تامل کے بعد وہ کھل کر ہنسے' لطف اندوز ہوئے اور فرمایا۔ ''چبھتا ہوا سوال ہے۔''

ان کے مزید قرب اور ان کے مزاج سے تعارف کا ایک نادر موقع یوں ملا کہ ایک بار بھری برسات میں گوٹ (پکنک) کا پروگرام بنا چچا نے اپنے احباب مولانا فضالی اور اختر صاحب کو مدعو کیا تھا۔ ہم نوعمر بھی بزرگوں کے ساتھ تھے۔ شہر سے دو تین میل دور ایک سرسبز پہاڑ کے دامن میں ایک بڑا گھنا باغ تھا اس لیے اسے اندھیرا باغ کہتے تھے۔ ہم لوگ روانہ ہوئے ہی تھے کہ کالی گھٹا چھا گئی اور

ابھی ہماری منزل نہیں آئی تھی کہ گھٹاؤں سے زیادہ صبر نہیں ہو سکا اور وہ ٹوٹ کر برسنے لگیں۔ یہ دیوانہ گر موسم بھلا ہم نوجوانوں سے کیسے برداشت ہوتا چنانچہ ہم لوگ سواریوں سے اتر پڑے اور بھیگتے ہوئے' دھوم مچاتے' چہلیں کرتے' کھیلتے کودتے' راستہ طے کرنے لگے۔ اختر صاحب کے علاوہ سب بزرگ اپنے کپڑے محفوظ رکھنے کی خاطر سواریوں میں سمٹ سمٹا کر بیٹھ گئے مگر اختر صاحب نے ہمارا ساتھ دیا اور موسم سے لطف اندوز ہونے میں ہمارے شریک ہو گئے۔ بھیگتے ہوئے' ہنستے ہنساتے چلتے رہے۔ ہمارے ایک ہمجولی ایک گھنے درخت کے نیچے پانی سے پناہ لینے لگے تو اختر صاحب چیخے۔ یہ بچہ بے ذوق بڈھا ہے۔ اس کو بڑوں کے ساتھ سواری میں بٹھا دو۔ یہ برسات کی' ان گھنگور گھٹاؤں کی توہین کر رہا ہے۔'' میں نے گرہ لگائی ''ناشکرا ہے۔'' بہت خوش ہوئے۔ ''ہاں ناشکرا بھی ہے۔ کیسی نعمت ہے یہ بارش''۔ اتفاق سے مجھے اختر صاحب کی ایک نظم یاد آ گئی۔

کوہساروں کا' بیابانوں کا' گلزاروں کا
منہ دھلاتی ہوئی آتی ہے گھٹا ساون کی
کوک کوئل کی' پپیہے کی صدا' مور کا شور
غل مچاتی ہوئی آتی ہے گھٹا ساون کی

اس وقت یہی دو شعر یاد آ رہے ہیں' اس وقت تو پوری نظم سنا دی تھی۔ اختر صاحب پر یہ نظم سن کر وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ غرض ہم اسی طرح کھیلتے کودتے اختر صاحب کی سربراہی میں منزل پر پہنچے۔ دیکھا کہ سب بزرگ ایک بارہ دری میں اطمینان سے بیٹھے ہیں۔ کسی نے کہا۔ ''ان سب کے کپڑے خشک ہیں۔'' اختر صاحب چہکے۔ ''یہ سب خود بھی خشک ہیں۔'' ایک بزرگ نے کہا آپ لوگ تو تر بتر ہو رہے ہیں۔ اختر صاحب نے جواب دیا۔ ''یہ ظالم گھٹائیں ایسی موسلا دھار بارش اور اس جنوں انگیز موسم میں اپنے کپڑے بچانے کے لیے مولانا فضائی کی سی بے ذوقی اور بے حسی کی ضرورت ہے۔ وہ ہم غریبوں کو کہاں نصیب؟ پھر وہ ان بزرگوں کو بیٹھا چھوڑ کر اور ہم نوجوانوں کی ٹولی کو ساتھ لے کر باغ میں اتر گئے۔ بارش تیز ہو گئی اور ہم سب کا نشہ بھی تیز ہو گیا۔ یہ عرض کر دوں کہ اس روز اختر صاحب پیے ہوئے نہیں تھے مگر ایسی موج میں تھے جیسے دو چار جام نہیں' خم کے خم لنڈھا چکے ہوں۔ ہم لوگ جامن توڑ توڑ کر لا رہے تھے اور اختر صاحب بھی ہمارے ساتھ کھا رہے تھے۔ اسی اثنا میں بزرگوں کی طرف سے کھانے کا بلاوا آ گیا۔ اختر صاحب بولے۔ ''جاؤ کہہ دو' ہم کھائیں گے نہیں' ہم پی رہے ہیں۔'' مگر ہم جوانوں کی آنتیں کلام اللہ کی بہت سی آیات پڑھ چکی تھیں۔ اس لیے اختر صاحب بادل ناخواستہ اس رنگین ماحول سے نکلنے پر راضی ہوئے اور اوپر جا کر کھانا کھانا پڑا۔

اختر صاحب! اس دن بڑی موج میں تھے اگرچہ کم سخن تھے مگر اس روز خوب چہکتے رہے کئی

لطیفے اور مشاہیر شعراء کے بہت سے قصے سنائے ایک مشہور شاعر کے ترنم کی نقل مطابق اصل اتاری' غرض آخر تک چہکتے رہے۔

ایک بار دہلی میں اچانک ملاقات ہوگئی۔ میں ان دنوں طبیہ کالج میں پڑھتا تھا۔ کبھی میں ایسا کرتا تھا کہ ہوسٹل سے رخصت لے کر رات کو اپنے رفیق درس حکیم سید اشتیاق احمد مرحوم کے گھر چلا جاتا اور ہم مل کر امتحان کی تیاری کرتے تھے۔ ایک دن مغرب کے بعد اسی نیت سے نکلا تھا کہ چاندنی چوک میں اختر صاحب اور مجاز صاحب مل گئے۔ دونوں سرشار تھے اور بازار کا چکر لگا رہے تھے۔ اختر صاحب نے مجاز صاحب سے میرا تعارف کروا دیا اور ہم ایک پارک (غالباً کمپنی باغ' میں جا کر بیٹھ گئے۔ میں نے اپنے ادبی مطالعے کے اظہار کے لیے مجاز صاحب کے چند شعر'ان کی نظموں کے دو تین بند سنائے تو مجاز صاحب ترنگ میں آ گئے اور کئی نظمیں سنا ڈالیں۔

اختر صاحب داد کے بجائے کہتے ''شاباش'' اور مجاز صاحب مسکرا دیتے۔ میں نے کہا ''مجاز صاحب! نظم تو آپ نے ایک ہی کہی ہے۔ کہنے لگے کون سی؟'' میں نے کہا۔ ''خواب سحر''

اختر صاحب نے وہ نظم نہیں سنی تھی یا ذہن سے محو ہوگئی تھی۔ اس لیے سنانے کی فرمائش کی۔ مگر مجاز صاحب جانے کیوں ٹال گئے۔ یہ میرا وہ دور تھا کہ ادب خصوصاً شعری ادب کے مطالعے کا جنون سا تھا ان دنوں نئے شعراء میں سے شاید ہی کسی کا مجموعہ چھپا ہو اور میں نے حاصل نہ کیا ہو۔ نوعمری کا اتھلاپن بھی تھا کہ جو پڑھا ہے اس کا اظہار بھی ہو۔ چنانچہ جوش' جگر' حسرت' فراق' آرزو' اثر' حفیظ' پھر میرا جی' فیض' ن۔م۔ راشد' جاں نثار' اختر' جذبی' ساحر وغیرہ نجانے کتنے شاعروں کا نام بتا گیا اور یہ بھی بتا تا گیا کہ ان کے مجموعے میرے پاس ہیں' میں نے پڑھے ہیں اور ان پر اپنی ''رائے گرامی'' بھی بتا تا گیا۔ مثلاً میں نے کہا ''جن جن شاعروں نے پہلے غزل گوئی کی مشق کی ہے وہ نظم میں بھی کامیاب ہیں۔ دیکھیے جاں نثار اختر نے اپنی فلاں نظم میں ایک نئے مضمون اور ایک طویل بات کو ایک شعر میں موزوں کر دیا ہے۔

جس طرح اندھیرے میں ابھرتے ہیں بتدریج
ڈھلتی ہوئی تصویر کے برعکس نشانات

اس پر مجاز نے کہا۔ ''ہاں بھئی' اس شعر پر تو میں نے انہیں داد دی تھی'' اور پھر جوش میں آ کر اپنی نظم۔ اب میرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو!

خوب لہک لہک کر سنائی۔

1946ء میں میری شادی کے موقع پر جیسا کہ رواج ہے' دوستوں اور عزیزوں نے میرے سہرے لکھے۔ شہر کے بعض بزرگ شعراء صولت صاحب' بسمل صاحب اور سیف صاحب نے بھی کرم

فرمایا۔ اختر صاحب کو معلوم ہوا تو انہوں نے بھی از راہ محبت ایک سہرا لکھا حال آں کہ اس سے پہلے انہوں نے شاید ہی کسی کا سہرا لکھا ہو۔ یہی نہیں' میری بہنوں کی درخواست پر ان کی طرف سے بھی ایک سہرا لکھا۔ یہ دونوں سہرے ڈاکٹر یونس حسنی نے اختر صاحب پر اپنی کتاب میں شامل کر دیئے ہیں۔

اختر صاحب! شراب پیتے تھے اور خوب پیتے تھے۔ نجانے کیسے ان کو یہ لت لگی تھی۔ ان کی پرورش سخت نگہداشت کے ماحول میں ہوئی تھی اس لیے ایسی کسی لغزش کا کوئی موقع نہیں تھا۔ ٹونک چھوڑنے کے بعد ان کو کس قسم کا ماحول ملا کہ یہ کافر منہ لگ گئی اور اسی نے آخر ان کا کام تمام کیا۔ وہ پی کر بہکتے ضرور تھے مگر بے قابو نہیں ہوتے تھے۔ چھوٹوں کا خیال' بڑوں کا لحاظ' آداب محفل کسی چیز میں فرق نہیں آتا تھا۔ صرف میرا ہی نہیں اور دوسرے کئی حضرات کا بیان ہے کہ نشے کی حالت میں بھی کبھی ان کی زبان سے خدا' رسول' مذہب' دینی شعائر کے سلسلے میں کوئی گستاخانہ جملہ سننے میں نہیں آیا۔ ان کے بزرگ سید احمد شہید کی تحریک جہاد سے وابستہ رہے تھے اور ان کے ٹونک منتقل ہونے کا موجب و محرک بھی یہی تعلق تھا۔

اختر صاحب عملی کوتاہی کے باوجود اپنے بزرگوں کی روش سے سرمو منحرف نہیں ہوئے تھے۔ ان کے کردار کا دامن شراب نوشی کے سوا ہر نوع کی آلودگی سے پاک تھا۔ وہ اخلاق و سیرت کے محاسن کے حامل تھے۔ مشرقیت اور قدامت ان کی ادا ادا سے جھلکتی تھی۔ ''نغمہ حرم'' میں پردے کی حمایت میں ان کی بڑی موثر نظم ہے۔ ان کی جوانی کے دوست' مشہور کالم نگار نصر اللہ خاں نے لکھا ہے اور مجھ سے زبانی بھی فرمایا کہ اختر ایسے شرمیلے انسان تھے کہ اگر کوئی عورت ان کے دفتر میں آجاتی تو وہ گھبرا جاتے تھے۔ ان کے قومی و ملی جذبات کی آئینہ دار وہ نظمیں ہیں جو انہوں نے افغانستان کے سلسلے میں لکھی تھیں۔ ''فتح کابل'' اور ''آرزوئے یک جوان افغانی'' وغیرہ ان کی بڑی پرجوش اور ولولہ انگیز نظمیں ہیں۔ نعتوں کی ایک خاصی تعداد ان کے حب رسول کی شاہد ہے۔ میں نے ایک بار ترقی پسند ادب کی تحریک کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا۔ ''مجھے بھی دعوت دی گئی تھی مگر بے دینوں اور خدا ناشناس لوگوں کا ساتھ میں کیسے دے سکتا تھا۔ میں نے صاف انکار کیا اور اسی وجہ سے ترقی پسند اہل قلم اور نقاد مجھ سے ناخوش اور ہمیشہ برسر تنقیص رہے یا کم سے کم نظر انداز کرتے رہے۔''

اختر کی منظومات میں لائے جانے والے اسماء' سلمیٰ' ریحانہ' عذرا وغیرہ' میرے علم کی حد تک فرضی نام ہیں' صرف تخیل کی کارفرمائیاں ہیں' یہ سب ان کی ذہنی تخلیق ہیں۔ آب وگل کی دنیا میں ان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ''رومان'' میں ان کی ایک نظم شائع ہوئی تھی۔ ''اک بار دیکھا اور دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے۔'' اس کے بعد ''رومان'' ہی میں ایک گم نام نظم چھپی تھی۔ ''کیوں دیکھے''۔ اس نظم کے متعلق بعض حضرات سے سنا گیا تھا کہ محترمہ کنیز فاطمہ حیا کی نظم ہے مگر کراچی میں جب محترمہ سے ملاقات

ہوئی اور بار بار ہوتی رہی ہیں اور ان میں اختر صاحب موضوع گفتگو رہے ہیں تو معلوم ہوا کہ اس قیاس اور سوظن کی کوئی اساس نہیں ہے۔ وہ ایک باوقار اور بلند کردار خاتون ہیں۔ ان کا خاندان ایک شریف و موقر و معزز خاندان ہے۔ اختر صاحب کا جب بھی میں نے ان سے ذکر چھیڑا تو ان کی باتوں سے اختر صاحب کے ساتھ احترام و عزت کا وہی جذبہ جھلکتا نظر آیا جو ایک نامور اور پسندیدہ شاعر کے لیے کسی قاری کے دل میں ہوتا ہے۔

اختر صاحب ایک بار لکھنو کسی مشاعرے میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ محترمہ کے گھر بھی ان کی دعوت ہوئی تھی مگر اس دور میں ان کے یہاں پردے کا رواج تھا اس لیے وہ پردے ہی میں رہیں۔ اس وقت وہ شادی شدہ اور صاحب اولاد تھیں۔ ایک بار انھوں نے اختر صاحب کو آموں کا پارسل بھیجا تھا۔ اختر صاحب نے ان کے شکریے میں یہ قطعہ لکھا تھا۔

حیا نے لکھنو سے آم بھیجے
ہمیں بھیجے ہمارے نام بھیجے
نہ ہوں کیوں بندہ بے دام ان کے
کہ بھیجے آم اور بے دام بھیجے

سلمی اور ریحانہ وغیرہ ناموں کے سلسلے میں اپنا یہ خیال بھی عرض کردوں کہ شاید اختر صاحب نے ابتداء عمر میں عربوں کی تاریخ اور عربی شاعری کا کثرت سے مطالعہ کیا تھا۔ اس کا ایک اثر ان کا یہ جرات مندانہ قدم ہے کہ اردو شاعری کی تاریخ میں پہلی بار محبوب کے لیے صیغہ تانیث استعمال کیا۔ بعد میں دوسرے شعراء نے ان کی تقلید کی۔ یہ نام بھی عربی ادب سے ہی اخذ کیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی کئی نظموں میں عربی ماحول جھلکتا ہے۔ مثلاً ایک نظم ہے ''مرا ننھا جواں ہوگا''۔ اس میں ماں کہتی ہے۔

''ہے اس کے باپ کے گھوڑے کو کب سے انتظار اس کا''

اردو ادب کی تاریخ میں اختر صاحب کا جو مقام ہے وہ میرا موضوع نہیں ہے۔ مختصراً عرض ہے کہ وہ جوش اور جگر کے عہد کے صف اول کے شاعر تھے، غزل سے زیادہ نظم پر توجہ تھی اور رومانی شاعری میں وہ اپنے دور کے بیشتر شعراء سے ممتاز تھے۔ ن۔ م۔ راشد، احمد ندیم قاسمی جیسے متعدد شعراء انھیں کی رہنمائی میں آگے بڑھے تھے۔ اردو شاعری کی حد تک محبوب کی تانیث کی ترویج انھیں کا کارنامہ تھا۔ اس خصوص میں ان کو تقدم حاصل تھا۔ بعد کا ہر شاعر اس باب میں ان کا مقلد کہلائے گا۔

حواشی

1- شفاالملک حکیم ظہیر احمد برکاتی کا تعلق حضرت سید احمد شہید کے معتمد خاص شیخ ولی محمد پھلتی کے اخلاف سے تھا۔ وہ ٹونک کے معروف فاضل حکیم مولانا برکات احمد کے بھانجے تھے۔
1322ھ (1904-05ء) میں بمقام ٹونک پیدا ہوئے۔ عالم دین اور ماہر طبیب تھے۔
نواب صاحب ٹونک کے معالج خاص اور دارالعلوم خلیلیہ کے مہتمم رہے۔ 1960ء تک ٹونک میں مطب قائم رکھا۔ پھر جے پور میں برکاتی دواخانہ کے نام سے یہ سلسلہ جاری کیا۔ 2 فروری 1987ء کو جے پور میں وفات پائی اور ٹونک لے جا کر اپنے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے۔

2- مسجد حکیم برکات احمد جو عرف عام میں ہٹو کی مسجد کہلاتی تھی۔

3- ''نغمہ حرم'' پہلی بار مکتبہ اردو' لاہور نے 1939ء میں شائع کی تھی۔

4- ''صبح بہار'' پہلی مرتبہ اختر صاحب نے خود چھپوائی تھی۔ اس کی پرنٹ لائن یوں تھی۔ ''مسٹر اختر شیرانی پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس' لاہور میں چھپوا کر ٹونک راج سے شائع کیا۔''
ملنے کا پتہ یہ تھا۔ ''میسرز حامد اینڈ سنز' علی گنج' ٹونک راج''
حامد اینڈ سنز اختر صاحب کے جگری دوست صاحبزادہ حامد سعید خاں کی دکان تھی۔

5- ابوالعرفان مولانا حبیب اللہ خاں فضائی کا شمار زمرہ علما میں تھا۔ وہ اختر صاحب کے لڑکپن کے استاد مولوی محمد صابر شاکر کے بھانجے اور اختر کے ہم سبق تھے۔ دونوں میں کمال بے تکلفی تھی۔ اختر صاحب ان کو فضائی کی تصحیف کر کے قصائی صاحب کہتے۔ شاعری سے بھی رغبت تھی۔ 1925ء سے 1927ء تک اجمیر سے ماہنامہ ''کیف'' نکالتے رہے۔ اخبار ''اتفاق'' کی ادارت بھی کی۔ سیاسی میدان میں مولانا معین الدین اجمیری کے ساتھ کام کیا۔ مدتوں اجمیر میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ 20 ستمبر 1960ء کو ٹونک میں انتقال ہوا۔

6- استاذ الشعرا، سید محمود الحسن صولت ٹونکی' ولادت 1898ء وفات 29 مارچ 1968ء

7- حضرت بسمل سعیدی۔ اصل نام سید عیسیٰ میاں تھا۔ ولادت 1319ھ (1902ء) وفات 26 اگست 1977ء بمقام دہلی۔

8- مولوی محمد شریف خاں سیف ٹونکی' امام الشعرا، حافظ عالمگیر کیف ٹونکی کے فرزند اور حکیم سید برکات احمد کے شاگرد تھے۔ 1954ء میں وفات پائی۔

☆ ☆ ☆

پروفیسر مظہر محمود شیرانی
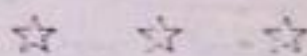
کچھ ''بھاجی'' کے بارے میں

'بھاجی' مشہور شاعر جناب اختر شیرانی کی گھریلو زندگی پر ایک مختصر سی طائرانہ نظر ہے۔ جو ان کے صاحب زادے پروفیسر مظہر محمود شیرانی نے ڈالی ہے۔
یہ مختصر مضمون بڑا اہم ہے اس لیے کہ اختر شیرانی کی زندگی پر یہ واحد مضمون ہے جسے مظہر محمود صاحب نے لکھا ہے۔

(ادارہ)

درمیانہ قد' وجیہہ چہرہ' گسرتی جسم پر پاجامہ' قمیض اور شیروانی' پاؤں میں گرگابی (Moccasin) یہ تھے ہمارے والد اختر شیرانی' جنھیں ہم پنجابی محاورے کے مطابق ''بھاجی'' کہا کرتے تھے۔ شعروادب کے حلقوں میں وہ ''شاعر رومان'' ''ابوالمعانی'' ''ادیب الملک'' اور اس قسم کے دوسرے القاب سے یاد کیے جاتے تھے مگر ہمارے لیے تو وہ بس ''بھاجی'' تھے۔ 1905ء میں جب وہ پیدا ہوئے تو ان کے والد حافظ محمود شیرانی بیرسٹری کی تعلیم کے سلسلے میں لندن جا چکے تھے۔ دادا نے داؤد خان نام رکھا۔ حافظ صاحب کی ان کے سوا کوئی اولاد منزل شباب کو نہ پہنچی۔

ٹونک علوم وفنون کا گہوارا تھا۔ ہند اسلامی تہذیب نے دہلی مرحوم سے نکل کر جن مقامات پر بسیرا کیا ان میں (لکھنو کے بعد) حیدرآباد (دکن)' ٹونک بھوپال اور رام پور کے نام نمایاں ہیں۔ اسی علمی فضاء نے حکیم سید برکات احمد' مفتی عبداللہ ٹونکی اور خود حافظ محمود شیرانی جیسی شخصیتوں کو جنم دیا۔

حافظ صاحب بیٹے کو جامع العلوم بنانا چاہتے تھے۔ بچپن ہی سے متعدد اساتذہ تعلیم وتادیب پر مقرر کیے تھے۔ ان میں مولوی محمد صابر شاکر کا نام اس لیے قابل ذکر ہے کہ اختر صاحب کو زلف سخن سنوارنے کا لپکا انھی سے پڑا۔ ذہنی تعلیم کے علاوہ ورزش کرانے کے لیے قیوم خاں پہلوان تعینات تھے۔ لڑکپن کی عمر کو پہنچے تو باپ نے اورینٹل کالج میں داخل کرا دیا جہاں سے فارسی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں سنٹرل

ماڈل سکول لاہور میں داخلہ لیا لیکن طبیعت کا شاعرانہ پن رنگ لایا اور تعلیم ادھوری چھوڑ کر مسلک شعر و ادب اختیار کر لیا۔

حافظ صاحب جز بز ہوئے مگر یہ نشہ ترشی سے اترنے والا نہ تھا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ صاحب کو ان کے تعلیم مکمل نہ کرنے کا ملال عمر بھر رہا۔ اس تکدر کا اظہار اس وقت ہوا جب والد کی پہلی قابل ذکر نظم ''جوگن'' شائع ہوئی اور مولوی عبدالحق صاحب نے حافظ صاحب کو مبارک باد کا خط لکھا۔ حافظ صاحب خط پڑھ کر بڑے جھلائے اور بظاہر اپنی اہلیہ مگر حقیقت میں اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہا ''ہونہہ! اسرا شاعری کرنے چلا ہے!''

مگر غضب اس وقت ہوا جب حافظ صاحب کو ان کی مے نوشی کی خبر ہوئی اور اتنی تاخیر سے جب یہ عادت راسخ ہو چکی تھی۔ اللہ دے اور بندے لے' گھر میں بھونچال سا آ گیا۔ بیک بنی و دو گوش گھر سے نکال دیے گئے۔ ہم لوگ حافظ صاحب کے ساتھ فلیمنگ روڈ والے مکان میں رہتے تھے۔ میری عمر چار پانچ سال کی ہوگی۔ اختر صاحب اپنے رسالے کے دفتر میں اٹھ گئے۔ ٹوہ لگائے رکھتے کہ بابا کب پرانی کتابوں اور سکوں کی تلاش میں لاہور سے باہر جاتے ہیں۔ حافظ صاحب لاہور سے نکلے اور انہیں گھر آنے کی چھٹی ملی۔ ہم بہن بھائیوں کے لیے مٹھائی اور کھلونے لاتے۔ حافظ صاحب واپس آتے تو ہم کھلونے چھپا دیتے اور ان کے کالج جانے پر ہی نکالتے۔ ہمیں سمجھا دیا گیا تھا کہ اگر بابا پوچھیں کہ یہ کھلونے کہاں سے آئے ہیں تو بھاجی کا نام نہ لینا۔ ایک دن بابا کالج سے آ کر دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے اور میں ایک نئی چابی والی موٹر سائیکل جس سے شعلہ نکلتا تھا' دالان میں چلا رہا تھا۔ بابا نے انکھیوں سے دیکھ کر پوچھا ''بیٹا یہ کون لایا تھا؟'' اور میں نے بڑی معصومیت سے کہا۔ ''جب ہم امرتسر پھوپھی کے ہاں گئے تھے تو وہاں سے لائے تھے۔'' انھوں نے بڑے استعجاب سے کہا۔ ''اچھا!'' آج میں سوچتا ہوں کہ اس ''اچھا'' میں کتنا تجاہل عارفانہ تھا۔

جب بابا ملازمت سے ریٹائر ہو کر ٹونک جانے لگے تو اختر صاحب بڑے گھبرائے۔ بابا کے قریبی دوستوں سے سفارش کرائی۔ بابا بہ مشکل اس پر آمادہ ہوئے کہ ''چلا چلے مگر میری نظروں کے سامنے نہ آئے۔'' دونوں باپ بیٹوں نے یہ معاہدہ مرتے دم تک نبھایا۔ نہ باپ نے کبھی بلایا نہ بیٹے نے جرات کی۔ آبائی حویلی کی اوپر کی منزل میں باپ اور نیچے بیٹا۔ کبھی کبھی حافظ صاحب کوئی علمی مسئلہ چھان بین کے لیے کاغذ کے پرزے پر لکھ کر نیچے بھیج دیتے۔ اختر صاحب اپنا سب کام چھوڑ چھاڑ اس پر توجہ دیتے اور مطلوبہ معلومات مہیا کر کے اوپر بھجوا دیتے۔ ایسے موقعوں پر سفارتی فرائض میں انجام دیتا تھا۔ ٹونک پہنچنے کے ایک عرصے بعد حافظ صاحب کے ضیق النفس کے مرض میں شدت پیدا ہو گئی اور انہوں نے شہر سے دور دریائے بناس کے کنارے اپنی زرعی زمین پر ڈیرہ جما لیا۔

ٹونک میں میں نے ''بھا جی'' کو بہت قریب سے دیکھا۔ وہ ہم بہن بھائیوں سے بے انتہا پیار کرتے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے مجھے کبھی مارا یا جھڑکا ہو۔ کھانے پہننے کا شوق انہیں نہ تھا۔ ان کی ضروریات شراب کے علاوہ سگریٹ اور پان تک محدود تھیں۔ ان کا پینے کا ڈھنگ ہی نرالا تھا۔ دو تین دن وہ شراب پانی کی طرح پیتے تھے اور اس میں صافی و دردی کی قید نہ تھی۔ تیسرے یا چوتھے دن اس کثرت مے نوشی کا ردعمل شروع ہوتا تھا۔ معدہ مزید شراب قبول کرنے سے انکار کر دیتا۔ الٹیاں آنے لگتیں۔ دو تین دن تک اس بیماری میں مبتلا رہنے کے بعد ٹھیک ہو جاتے۔ اب دس پندرہ روز کے لیے شراب حرام ٹھہرتی۔ پائیں باغ کے سامنے ان کا کمرہ تھا۔ پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھے آگے میز رکھے لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے۔ گھر سے باہر جانا تو دور کی بات ہے ملاقات کے لیے آنے والوں کو ان کی شکل تک دیکھنا میسر نہ تھی۔ ان دنوں میں (جنہیں ایام مسترقہ کہنا چاہیے) مجھے خاص ہدایت تھی کہ جو بھی آئے کہہ دو کہ گھر پہ نہیں ہیں۔ تحریری کام سے اکتاتے تو باغ میں پودوں کو پانی دینے لگتے اور گھنٹوں اس میں صرف کر دیتے۔ ہفتہ عشرہ اس پرسکون طریقے سے گزارنے کے بعد ایک شام وہ چپکے سے گھر سے نکل جاتے۔ واپس آتے تو نشہ میں دھت۔ ڈیوڑھی کے باہر میدان میں مجلس جم جاتی شعر و ادب کا ذوق رکھنے والوں کے علاوہ رنگ رنگ کے لوگ جمع ہو جاتے۔ ان میں رند و زاہد اور عالم و عامی کی قید نہ تھی۔ مونڈھوں' کرسیوں' چارپائیوں پر بھانت بھانت کا آدمی بیٹھا ہے اور اختر صاحب ہزار داستان بنے ہوئے ہیں۔ یاد رہے کہ ان محفلوں میں وہ اپنا کلام تو کجا ایک شعر تک سنانے کے روادار نہ تھے۔ دنیا بھر کے موضوعات پر باتیں ہو رہی ہیں۔ قاری جمیل صاحب بڑے خوش الحان تھے۔ اگر بیٹھے ہوتے تو ان سے سورۃ یٰسین سنانے کی فرمائش کر دیتے۔ اب قاری صاحب تلاوت کر رہے ہیں اور اختر صاحب کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی ہے۔ یہ اس محفل کا آخری آئٹم ہوتا تھا کیونکہ قاری صاحب عموماً عشاء کی نماز کے بعد ہی تشریف لاتے تھے۔

جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں ان محفلوں میں اختر صاحب اپنا کلام کبھی نہیں سناتے تھے۔ نہ ہی کوئی شخص ان کے ساتھ پینے پلانے کا تصور کر سکتا تھا۔ ان کا اپنا یہ حال تھا کہ کلال کے ہاں سے پی آئے اور ایک بوتل شیروانی کی جیب میں چھپا لائے۔ ڈیوڑھی کے بھاری بھرکم دروازے کے ایک پٹ کی آڑ میں یہ بوتل رکھ دیتے۔ وقفے وقفے سے اٹھ کر دروازے کے پیچھے جاتے اور گھونٹ لے لیتے۔ اس غرض سے اٹھنے سے پہلے مجمع پر نظر ڈال کر ''میں ابھی حاضر ہوا'' کہا اگر میں نظر پڑ گیا تو کسی بہانے مجھے گھر کے اندر بھیج دیتے۔ میں سمجھ جاتا اور وہاں سے کھسک جاتا۔ انہیں اس بات کا بہت خیال رہتا تھا کہ میرے بچوں کو کہیں مجھ سے نفرت نہ ہو جائے۔ اصل میں ان کی یہ محفلیں مے نوشی اور شعر فروشی کی مجلسیں نہ تھیں۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں ان کی شخصیت میں ایک مقناطیسی کشش تھی اور یہ کشش عبارت تھی علم و فن'

آداب واخلاق، شرم وحیا، مروت و وفا اور سب سے بڑھ کر دوسروں سے ہمدردی کرنے اور ان کے چھوٹے چھوٹے غم بانٹ لینے سے۔ رات دس گیارہ بجے یہ محفل برخاست ہوتی۔ وہ اٹھ کر اندر آتے اور چند لقمے کھا کر سو رہتے۔

ان کی آمدنی محدود تھی اور اخراجات بھی۔ کھانا گھر سے مل جاتا تھا۔ اپنے لیے کپڑا انہوں نے شاید ہی کبھی خریدا ہو۔ ان کے کپڑے تیار کروانا ان کی والدہ کی ذمہ داری تھی۔ جیب خالی ہونے کی صورت میں (اور یہ اکثر ہوتا تھا) سگریٹوں تک کی فرمائش انہی سے کی جاتی تھی۔ ہاں نقد پیسے وہ اس ڈر سے کبھی نہ دیتی تھیں کہ شراب پر صرف ہوں گے۔ ماں آخر ماں ہوتی ہے۔ ایک بار بیٹے کے لیے کرتے سلوائے اور پہناتے وقت بڑے چاؤ سے اپنی طلائی گھنڈیاں جن میں زنجیریں پڑی ہوتی تھیں لگا دیں۔ وہ باہر نکلے۔ کسی ضرورت مند نے سوال کیا۔ انہوں نے زنجیریں نوچ کر اس کو بخش دیں۔ نتیجہ یہ کہ گھنڈیاں بحق سرکار ضبط ہو گئیں اور سیپ کے بٹن منگوا دیے گئے۔

اصل میں وہ کسی کو دکھ یا تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ جب کبھی کسی ادبی رسالے یا ریڈیو اسٹیشن سے روپیہ آتا تو اس کا ایک حصہ شراب اور سگریٹ پر صرف ہوتا اور باقی سائلوں کے کام آتا۔ مے خانے سے گھر تک راستے ہی میں پیسے ختم ہو جاتے۔ واپسی پر اگر اتفاق سے شیروانی اتار کر کھونٹی پر ٹانگی اور خود باہر جا بیٹھے تو بڑے اشتیاق اور تجسس سے ہم لوگ تلاشی لیتے تھے۔ منی آرڈر فارم کا پرزہ تو اکثر نکلتا تھا۔ باقی مال گاؤ خورد۔ ہاں دو چار آنے ریزگاری کی قسم نہیں۔

خرابی اس وقت ہوتی جب ان کی جیب خالی ہوتی اور کوئی سوال کر بیٹھتا ایک بار حسب معمول دادی جان نے ان کے لیے بوسکی کی دو قمیصیں سلوائیں۔ پہلے ہی دن قمیض پہن کر باہر گئے۔ کسی شخص نے اپنی بوسیدہ قمیض دکھا کر کچھ پیسے طلب کیے۔ ان کی جیب خالی تھی۔ چنانچہ نئی قمیض اتار کر اسے دے دی اور بنیان پر شیروانی پہنے گھر آ گئے۔ دادی جان نے آڑے ہاتھوں لیا کہ قمیض میں نے بنائی تھی تم دے ڈالنے والے کون تھے۔ بیٹے نے معصومیت سے کہا۔ اس آدمی کی قمیض تار تار تھی۔ جب اس نے سوال کیا تو میں انکار نہ کر سکا اور دادی جان کا آخری فقرہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بیٹا! کسی دن پاجامہ اتار کر نہ دے آنا۔

پاجامے کی نوبت تو خیر نہ آئی مگر ایک موقع پر تھوڑی سی کسر رہ گئی جب وہ سلیپر پہن کر نکلے۔ کسی شخص نے جو ننگے پاؤں تھا امداد کی التجا کی۔ اس کو ساتھ لگا لائے۔ ڈیوڑھی میں پہنچ کر سلیپر اس کے حوالے کیے اور آپ گھر میں داخل ہو گئے۔

ایک بار ٹونک ہی میں مجھے ایک ہوائی بندوق لے کر دی۔ بندوق پا کر میں اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھنے لگا۔ پڑھنے سے فارغ ہو کر باغ میں فاختاؤں کو نشانہ بناتا۔ لیکن یہ حرکت فلک پیر کو ایک آنکھ نہ بھائی۔ ابھی دو تین ماہ بمشکل گزرے ہوں گے کہ کسی اللہ کے بندے نے مانگ لی۔

جب بندوق لینے اندر آئے تو میں بہت مچلا۔ مگر یہی کہتے رہے کہ ہم تمہیں اور لے دیں گے۔

ان کی اس عادت سے حافظ صاحب بھی باخبر تھے۔ اس لیے 1945ء میں جب ان کی صحت تیزی سے گرنے لگی تو انھوں نے اپنے سونے چاندی کے مسکوکات کا گراں بہا مجموعہ اونے پونے فروخت کر دیا اور اس طرح حاصل ہونے والی رقم پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے ملنے والی رقم میں ملا کر بینک میں ہمارے نام جمع کرا دی۔

حویلی کی وسیع عمارت اور کھلے صحن میں ہم بہن بھائی ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہوئے مرغیوں کے چوزے نکلواتے۔ جب یہ چوزے ذرا بڑے ہو جاتے تو ان کا مالک ''بھا جی'' سے سودا طے کرتا۔ ظاہر ہے کہ یہ سودا ادھار کی بنیاد پر چکتا تھا اور کھانے میں سب ہی شریک ہوتے تھے۔ اب منی آرڈر کا انتظار شروع ہوا اور رقم میں سود در سود کا اضافہ بھی جو یک طرفہ ہوا کرتا تھا۔ پیسوں میں اس اضافے کی اطلاع انہیں وقتاً فوقتاً کر دی جاتی تھی۔ ''ابے! سود کھاتا ہے؟'' ''جی! آپ سے سود نہ لیں گے تو اور کس سے لیں گے؟''

''اچھا یہ بات ہے! آئندہ تمہاری مرغیاں خریدنا بند۔''

''جی پہلے پچھلا حساب بے باق کر دیں اس کے بعد کوئی فیصلہ کریں۔ اس نوک جھونک کے بعد ہم بچے روایتی سود خوروں کی طرح انہیں مزید مرغیاں خریدنے پر آمادہ کر لیتے تھے۔

اکثر و بیشتر وہ منی آرڈر ڈاک خانے جا کر وصول کر لیا کرتے تھے۔ ہاں اگر پوسٹ مین گھر لے آیا تو ہمارے پو بارہ۔ اپنا مطالبہ وصول کر کے انہیں باہر نکلنے دیتے تھے۔

حافظ صاحب کا انتقال فروری 1946ء میں ہوا۔ کیا وضعدار اور اصول پرست آدمی تھے۔ بیٹے کو مرض الموت میں بھی قریب نہیں پھٹکنے دیا۔

وما کان قیس ہلکہ ہلک واحد ولکنہ بنیان قوم تہدما

(قیس کی موت ایک شخص کی موت نہ تھی بلکہ (اس کے مرنے سے تو) تمام قوم کی عمارت منہدم ہوگئی ہے)

اختر صاحب کو بے انتہا صدمہ ہوا۔ خاندان کی سربراہی کا بوجھ ان کے سر پر آن پڑا۔ اس قسم کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا ان کے بس کی بات نہ تھی نتیجہ یہ کہ شراب نوشی میں تسلسل اور کثرت پیدا ہو گئی۔ بہکنے اور بڑکارنے لگے۔ پائیں باغ اور حویلی میں موہوم ہیولوں کے پیچھے بھاگتے رہتے۔ گھر کے ماحول میں ایسا ہراس پیدا ہو گیا کہ آج بھی تصور کرتا ہوں تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ ادھر ملک کا سیاسی مطلع ابر آلود بلکہ خون آلود تھا۔ غرض 1946ء اور 1947ء کے دو سال ہم پر بڑے شاق گزرے۔ پاکستان بنا تو اختر صاحب نے اپنی قوت ارادی کو مجتمع کیا۔ پروگرام یہ بنا کہ وہ لاہور جائیں گے اور وہاں مکان کا انتظام کر کے ہم لوگوں کو بلوا لیں گے۔ فسادات کے باعث وہ غالباً 1947ء کے اوائل میں لاہور پہنچ

سکے۔ اپنے جگری دوست حکیم نیر واسطی صاحب کے ہاں قیام کیا۔

کئی ماہ گزر گئے اور ہنوز روز اول کا نقشہ رہا۔ اصل میں وہ میدان عمل کے آدمی نہ تھے۔ فسادات کی کثرت اور گھر والوں سے جدائی نے ان کے رہے سہے قویٰ بھی سلب کر لیے تھے۔ ان کی ایسی مایوسی کا آئینہ داران کا سانیٹ ''مہاجرہ'' ہے جسے میں یہاں درج کیے بغیر نہیں رہ سکتا کیونکہ یہ ان کی ایسی نظموں میں سے ایک ہے جو مجھے پسند ہیں:

سکوں نصیب نہیں میری جان بسمل کو

قضائے غم میں مرے قلب کو قرار نہیں
کوئی امید نہیں ہے کہ سوگوار نہیں

وہ گم شدہ ہوں ترستا رہے جو منزل کو
دیار غیر میں روئے نشاط محفل کو

وہ شاخ خشک جو معمور برگ و بار نہیں
فسردہ گل جسے امید نو بہار نہیں

الٰہی کیا کروں اپنے الم زدہ دل کو
چمن سے دور ہوں اک بلبل حزین وخموش

سنا رہی ہو جسے یاد آشیانے کی
فلک نے چھین لی جس سے خوشی زمانے کی

گلوں سے دور ہوں میں اک گل حزین وخموش

ہوائے خلد ہو دل میں تو خار بھی نہ ملے
جو مر رہوں تو کنار مزار بھی نہ ملے

ان کی ہدایت کے مطابق ہم لوگ بعض اعزہ کی معیت میں ٹونک سے چل کر 1948ء کے وسط میں کھوکھرا پار کے راستے لاڑکانہ پہنچے۔ ابھی سنبھلنے نہ پائے تھے کہ لاہور سے ان کی شدید علالت کا تار ملا۔ میں' چھوٹے بھائی' والدہ اور دادی جان کے ساتھ ایک شام کو لاہور پہنچا تو ان کا انتقال ہو چکا تھا اور لاش ہم لوگوں کے انتظار میں سردخانے میں رکھی تھی۔ اگلی صبح جب ان کا تابوت حکیم صاحب کے ہاں لایا اور منہ دیکھنے کے لیے رکھا گیا تو میں سب کے کہنے کے باوجود ان کے چہرے پر نظر نہ ڈال سکا۔ جس کی شعوری توجیہہ میں آج تک نہیں کر پایا۔

☆.......☆.......☆

احمد ندیم قاسمی

خانوادہ شیرانی سے وابستہ یادیں

(ایک صدارتی خطبہ)

میں جو کچھ عرض کرنے چلا ہوں یہ شیرانی خاندان کے ساتھ میری طویل وابستگی کی کہانی ہے یوں سمجھئے کہ میں نے اس تقریب کو اپنی یادوں کی بازیات کے لیے غنیمت سمجھا۔ چنانچہ عرض ہے کہ خانوادہ شیرانی سے میرا تعارف اپنے وقت کے نہایت مشہور اور مقبول رومانی شاعر حضرت اختر شیرانی صاحب کے توسط سے ہوا میں جب 1935ء میں فارغ التحصیل ہوا تو کچھ عرصہ بعد مجھے اختر شیرانی مرحوم کا رسالہ رومان دیکھنے کا اتفاق ہوا چنانچہ میں نے اپنی ابتدائی شاعری رومان ہی میں بھیجی اور میرا پہلا افسانہ ''بدنصیب بت تراش'' بھی پہلی بار اسی رسالے میں شائع ہوا اختر سے مجھے باقاعدہ تلمذ تو حاصل نہیں تھا مگر وہ میرا نو مشقی کا کلام شائع کرتے ہوئے کسی شعر میں کوئی ایک آدھ تبدیلی کر لیتے تھے اس سے میں اپنی اصلاح کر لیتا تھا مثلاً ایک بار میں نے انہیں ایک غزل بھیجی جس کا ایک شعر یہ تھا اور یہ بہت ابتدائی شعر ہے۔

تم نے اک روز کیا وعدہ پرسش ہم سے
بس اسی روز سے آشفتہ و بیمار ہیں ہم

اختر شیرانی نے اس شعر میں صرف ایک لفظ بدل کر اسے زیادہ بامعنی بنالیا پہلے مصرعے میں ''اک'' کی جگہ ''جس'' رکھ دیا اور شعر نے یہ شکل اختیار کر لی۔

تم نے جس روز کیا وعدہ پرسش ہم سے
بس اسی روز سے آشفتہ و بیمار ہیں ہم

میں انہیں اپنے گاؤں سے محبت بھرے خط لکھتا انہوں نے میرا ایک خط رومان میں درج کرنے کے بعد جواب میں اپنی طرف سے غالب کا یہ شعر لکھا تھا۔

دل نہیں، ورنہ دکھاتا تجھ کو داغوں کی بہار
اس چراغاں کا، کروں کیا، کار فرما جل گیا

لاہور میں جب آنا ہوتا میں فلیمنگ روڈ پر ان کے ہاں ضرور حاضری دیتا انہی دنوں انجمن حمایت اسلام کی گولڈن جوبلی کی عظیم الشان تقریب منائی گئی انجمن کے کارپردازوں نے ''پیغام عمل'' کے عنوان

سے نظمیں بھجوانے کا اعلان کیا میں نے بھی نظم بھیجی اور اسے اول انعام دیا گیا یہ انعام سونے کے ایک تمغے کی صورت میں تھا بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کی صدارت تھی۔ انہوں نے ایک بہت بڑے جلسہ عام میں یہ تمغہ مجھے عنایت کیا میں واپس اپنی نشست پر آ کر بیٹھا تو ایک صاحب نے کہا کہ ادھر ایک طرف اختر شیرانی صاحب کھڑے ہیں اور آپ کو بلا رہے ہیں میں فوراً ان کے پاس پہنچا انہوں نے پیار سے معانقہ کیا مبارک باد دی مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ''ندیم تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمغے گونگے ہوتے ہیں'' وہ تو یہ کہہ کر چلے گئے مگر میں ان الفاظ کے چکر میں ہی پڑ گیا بیس بائیس سال کی عمر تھی اس جملے کا مفہوم گرفت میں نہ آ سکا دو چار برس بعد اس کے معانی واضح ہوئے اختر صاحب نے دراصل مجھے سمجھایا تھا کہ اس تمغے کو سب کچھ نہ سمجھ لینا ورنہ تم شعر گوئی کی ابتداء میں ہی رک جاؤ گے ان کا یہ بالواسطہ سبق مجھے اب تک یاد بھی ہے اور میں اس پر عمل پیرا بھی رہا ہوں۔

ان دنوں سید ضمیر جعفری اور میں طرہ وار پگڑیاں باندھا کرتے تھے اور اختر صاحب ہم دونوں عقیدت مندوں کو اپنے طرہ باز دوست کہا کرتے تھے بعد میں ضمیر صاحب تو فوج میں چلے گئے مگر میں خاصی مدت تک بے کار رہا میرے بڑے بھائی وطن ہائی اسکول میں استاد تھے اور میں ان کے ساتھ ریلوے روڈ کے ایک کمرے میں رہتا تھا۔ اختر صاحب نے میری بیکاری اور بیروزگاری کا سنا تو ایک ایسے وقت میں جب ہم دونوں بھائی موجود نہ تھے اور کمرہ مقفل تھا تشریف لائے اور اپنے محیر العقول حد تک خوبصورت خط میں ایک چٹ دروازے کے اندر ڈال گئے اس میں لکھا تھا کہ جب تک تمہیں کوئی معقول ذریعہ معاش نہیں ملتا تم میرے مہمان ہو اور تم میرے حساب میں ریلوے روڈ کے عرب ہوٹل میں صبح و شام کا کھانا کھاؤ گے اور ساتھ ہی ناشتہ بھی وہیں کرو گے میں نے ہوٹل کے مالک سے کہہ دیا ہے بغیر کسی تکلف کے وہاں جانا شروع کر دو۔ میں نے ایسا ہی کیا یہ سلسلہ تین چار ماہ تک جاری رہا اور عرب ہوٹل کے مالک نے حیرت زدگی کی حالت میں مجھے بتایا کہ یوں تو میرے ہاں شاعروں' ادیبوں' اخبار نویسوں کا ہجوم رہتا ہے اور ان میں اختر شیرانی صاحب بھی شامل ہوتے ہیں مگر ان میں سے بیشتر خاصی دیر کے بعد حساب صاف کرتے ہیں اختر صاحب بھی اس سلسلے میں تاخیر کرتے تھے مگر جب سے تم نے یہاں کھانا شروع کیا ہے وہ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو آتے ہیں اور میرے سب بل ادا کر کے چلے جاتے ہیں خانوادہ شیرانی کی وسیع القلبی اور دوست داری کی یہ ایک ننھی ہی سہی مگر بڑی بلیغ مثال ہے۔

ایک دن میں نے اختر شیرانی صاحب کے سامنے ان کے والد گرامی حافظ محمود شیرانی سے تعارف اور قربت کی خواہش کا اظہار کیا اختر صاحب کا کمرہ مکان کی پہلی منزل پر تھا اور میں اکثر دیکھتا تھا کہ جب حافظ صاحب کے قدموں کی چاپ سیڑھیوں میں گونجتی تھی تو اختر صاحب سگریٹ پی رہے ہوں یا کچھ بھی پی رہے ہوں فوراً ایک کتاب یا رسالہ لے کر پڑھنے کا انداز بنا لیتے تھے اور جب حافظ صاحب اس کمرے

میں جھانکے بغیر اوپر چلے جاتے تھے تو اختر صاحب کتاب ایک طرف رکھ کر اپنا ادھورا شغل دوبارہ شروع کر دیتے تھے وہ اپنے والد گرامی کا مبالغے کی حد تک احترام کرتے تھے میری خواہش کا سن کر اختر صاحب مسکرائے پھر فرمایا کہ کبھی کوئی نایاب کتاب دستیاب ہو تو لے آنا میں تمہارا تعارف کرا دوں گا اور تم کتاب کا یہ تحفہ ان کی خدمت میں پیش کر دینا وہ پرانی کتابوں، مخطوطوں اور قدیم سکوں کا بے حد شوق رکھتے ہیں میں گاؤں گیا تو ایک عزیز کے ذخیرہ کتب میں سے خواجہ حافظ شیرازی کا ایک ایسا دیوان اٹھا لایا جو چھپا تو شاید نصف صدی پہلے بمبئی میں تھا مگر اس میں وہ تمام رنگ استعمال ہوئے تھے جو انسان اب تک دریافت نہیں کر پایا ہے اتنی دیدہ زیب کتاب میں نے آج تک نہیں دیکھی میں فخر و مسرت کے جذبات کے ساتھ خواجہ حافظ شیرازی کا یہ دیوان لیے اختر شیرانی صاحب کے پاس آیا وہ دیوان دیکھ کر خوش ہوئے اور مجھے اوپر قبلہ حافظ کے کمرے میں لے گئے۔ حافظ صاحب نے بڑی شفقت سے مصافحہ کیا میرے مشاغل کا پوچھتے رہے پھر میں نے دیوان حافظ کا یہ تحفہ ان کی خدمت میں پیش کر دیا وہ مسکرائے۔ اپنی نشست سے اٹھے، مجھے اپنے پاس بلایا اور ایک الماری میں سے دیوان حافظ کا ایک ایسا ہی نسخہ نکال کر فرمایا کہ میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں مگر یہ تو میرے پاس پہلے سے موجود ہے میں چپ چاپ واپس آ گیا اور حافظ صاحب سے قربت حاصل کرنے کا خواب کرچی کرچی ہو گیا۔

1947ء میں جب پاکستان قائم ہوا تو ایک بار اخباروں میں اختر شیرانی صاحب کے انتقال کی غلط خبر چھپ گئی مگر وہ راجستھان کے شہر ٹونک میں محفوظ تھے پھر وہ لاہور تشریف لائے میں نے ان دنوں رسالہ ''نقوش'' جاری کر رکھا تھا اس کے لیے کلام بھی عنایت کیا مگر ستمبر 1948ء میں بے ہوشی کے عالم میں انتقال کر گئے ان کے اہل و عیال لاڑکانہ میں تھے البتہ ان کے ایک داماد عمر کوٹ چلے گئے ان کے انتظار میں اختر شیرانی صاحب کی میت میو ہسپتال کے برف خانے میں منتقل کر دی گئی مگر جس روز انہیں دفن ہونا تھا اسی روز (بابائے) قائداعظم محمد علی جناح کا انتقال ہو گیا اور سارا ملک لاہور سمیت سناٹے میں آ گیا یہی وجہ ہے کہ اختر کا جنازہ اٹھا تو وہاں ان کے سینکڑوں عقیدت مند موجود نہ تھے۔ پھر یہ پورا شیرانی خاندان شیخوپورہ میں منتقل ہو گیا اور یوں اس شہر کو علم و حکمت اور شعر و فن کے چار چاند لگ گئے۔ برادر عزیز و مکرم ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی سے ملاقات ہوئی میں نے روزنامہ ''امروز'' کی ادارت سے الگ ہو کر اپنا ایک اشاعتی ادارہ ''کتاب نما'' کے نام سے قائم کیا تو برادر عزیز مظہر ایک روز میرے پاس آئے اور انہوں نے شیرانی خاندان کی فراخ دلی اور دوست داری کا ایک اور مظاہرہ کیا انہوں نے اپنے محترم دادا حافظ محمود شیرانی کی مشہور اور لاجواب تحقیقی کتاب پنجاب میں اردو میرے حوالے کر دی مقصد یہ تھا کہ اس کتاب کی اشاعت سے کتاب نما کی ساکھ قائم ہو گی ساتھ ہی انہوں نے میرے مجموعہ کلام دشت وفا کی اشاعت کے لیے مجھے ایک معقول رقم بھی عنایت کی جو وہ دے کر بھول گئے ہوں گے اور میں لے کر بھول گیا ہوں مگر یاد ہے تو

برادر مظہر کی محبت کا یہ بلیغ Gesture یاد ہے۔

ایک بار ہمدرد کے نیک نام حکیم محمد سعید صاحب نے مجھے شام ہمدرد میں حافظ محمود شیرانی کی شخصیت اور علمی وادبی کارناموں پر مقالہ پڑھنے کو کہا میں علمی تحقیق کی دنیا میں حافظ صاحب کے حیرت انگیز کمالات کا تو معترف تھا مگر یہ ضروری نہیں ہوتا کہ شعر کہنے اور افسانے لکھنے والا علمی تحقیق پر بھی پوری طرح حاوی ہو۔ میں نے حکیم صاحب سے معذرت کی مگر وہ بضدر ہے اور فرماتے رہے کہ خانوادہ شیرانی کے ساتھ تمہارے قریبی مراسم مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ تمہی حافظ کے علمی کمالات پر مقالہ لکھو میں برادر عزیز مظہر کے پاس المدد الغیاث کا نعرہ لگاتا پہنچا تو انہوں نے مجھے میرے مقالے کے لیے اتنا بھرپور اور معقول مواد عنایت کیا کہ مرتب کردہ اس وقت تک کے مقالات شیرانی کے مطالعے کے علاوہ اس مواد کے مطالعے نے مجھے ایک ایسا مقالہ لکھنے کے قابل بنا دیا کہ سچی بات ہے بعض محققین بھی یہ مقالہ سن کر مبہوت ہو گئے اس مقالے کا یہ اعزاز بھی ہے کہ برادر عزیز مظہر نے حافظ صاحب کی حیات و کمالات پر دو جلدوں میں جو کتاب لکھی ہے اس میں میرے اس مقالے کے جابجا حوالے موجود ہیں۔

مجھے فخر ہے کہ برادر عزیز مظہر محمود شیرانی صاحب کی یہ تصنیف مجلس ترقی ادب کے ناظم کی حیثیت سے میں نے ہی چھاپی ہے بلکہ مقالات شیرانی کی جلدیں بھی میری ہی نظامت میں شائع ہوئی ہیں ان کی تازہ تصنیف کے بارے میں علی گڑھ کے معروف محقق اور عربی زبان کے ایک بڑے عالم ڈاکٹر مختار الدین احمد نے ابھی ایک ہفتہ پہلے ایک خط میں مجھے یہ الفاظ لکھے ہیں۔ ''ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی صاحب کی کتاب کی دوسری جلد موصول ہوئی تھی بہت اچھی' مفید اور معیاری کتاب کی اشاعت پر دلی مبارک باد قبول فرمایئے ایسا اچھا مقالہ ہندوستان اور پاکستان کی جامعات میں کم ہی لکھا جاتا ہے''۔

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی کے جسم میں تو جیسے اپنے محترم دادا کی روح حلول کر چکی ہے مگر میری ان سے استدعا ہے کہ وہ اپنے والد گرامی ''حضرت اختر شیرانی صاحب'' کی حیات و کمالات پر بھی ایک کتاب لکھ ڈالیں کہ اختر صاحب نے اقبال' جوش' حفیظ' فانی' حسرت' جگر' اصغر اور یگانہ کی موجودگی میں بھی اپنی انفرادیت بڑے بڑوں سے تسلیم کرائی تھی اور اتنی ہر دلعزیزی اور مقبولیت حاصل کی تھی کہ وہ اپنے دور کی نوجوان نسل کا (Craze) بن گئے تھے اور پھر وہ صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ بہت عمدہ نثر نگار اور افسانہ نگار بھی تھے۔ میں شیخوپورہ کو اس لحاظ سے ایک خوش قسمت شہر سمجھتا ہوں کہ خانوادہ شیرانی مستقل طور پر آباد ہو چکا ہے پھر اگر گورنمنٹ کالج شیخوپورہ میں بزم شیرانی کا قیام عمل میں آ رہا ہے تو یہ اس کالج کا فرض بھی تھا اور اعزاز بھی۔ میں شیرانی خاندان کی خیر و عافیت اور مادی و روحانی آسودگی کی دعاؤں کے ساتھ آپ سے رخصت چاہتا ہوں۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی

ایک یادگار تصویر

ہم یہاں ایک پرانی تصویر انجمن ارباب'' شملہ گروپ کی پیش کرتے ہیں جو ماہوار رسالہ ''ہزارداستان'' کے لاہور کے شمارہ ماہ فروری 1926ء میں چھپی تھی جسے آج 80 سال ہو چکے ہیں۔ ہزارداستان کا پرچہ اسی زمانے میں چھپتا تھا اور یہ تصویر اس کی لاہور جلد نمبر 2 میں طبع ہوئی ہے اس پرچہ میں تلوک چند مرحوم کی نظم ''نورجہاں'' بھی ہے اور نظم بعنوان ''شملہ بھی ہے جو انہوں نے وہاں پڑھی تھی اور اس میں ایک نظم مولانا احسان اللہ تاجور کی بعنوان ''کوہسار شملہ'' صفحہ 55 تا 58 ہے اور اسے انہوں نے وہاں شملہ میں پڑھا بھی تھا اور ظاہر ہے کہ شملہ میں ''انجمن ارباب علم'' کا جلسہ موسم گرما میں اس سے پیشتر ہوا ہوگا یعنی قریبا 80 سال قبل یہ علمی جلسہ موسم گرما میں شملہ میں ہوا تھا۔

اس رسالہ ''ہزارداستان'' کے چیف ایڈیٹر حکیم احمد شجاع تھے جو ایک مستند علمی شخصیت تھے اور جن کا انتقال 4 جنوری 1962ء کو ہوا۔ جب آپ کی رہائش لاہور (اچھرہ) میں فیروز پور روڈ پر تھانہ کے قریب تھی اور دراصل آپ کی رہائش بازار حکیماں اندرون بھاٹی دروازہ میں بھی تھی اور اسی وجہ سے آپ کے نام کے ساتھ حکیم ''خاندانی'' امتیاز کے طور پر ہمیشہ بولا جاتا اور لکھا جاتا رہا ہے آپ حکماء کی اولاد تھے اور خاص کر آپ کے والد لاہور کے مشہور اطباء میں سے حکیم شجاع محمد تھے آپ نے خاندان کی علمی روایات کو برقرار رکھنے کیلئے یہ رسالہ ''ہزار داستان'' 1922ء میں شروع کیا تھا اور اس سال علامہ اقبال نے اپنی شاہکار نظم ''پیامِ مشرق'' فارسی میں طبع کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظم پر اول تبصرہ بھی از قلم اسلم چودھری محمد حسین اسی ہزار داستان میں طبع ہوا تھا یہ ایک حقیقت ہے۔ حکیم احمد شجاع دراصل علامہ اقبال کے خاص احباب میں سے تھے یہ تبصرہ فروری 1923 کے ''ہزارداستان'' میں طبع ہوا تھا اس کے ساتھ علامہ اقبال کی اپنی تصویر اور ایک رباعی فارسی میں لکھی ہوئی بعنوان ''خودنگر ے'' شائع ہوئی تھی۔

حکیم صاحب اس زمانے میں بھاٹی دروازہ کے اندر رہائش رکھتے تھے جہاں علمی مجالس

ہوتی تھیں اور علامہ اقبال ان میں شرکت فرماتے تھے اور حکیم احمد شجاع نے بھاٹی دروازے کی ان علمی مجالس کا ذکر بعنوان ''لاہور کا چیلسی'' کیا ہے جو دراصل لندن میں ایک علمی لوگوں کے محلے کا نام ہے۔ اسی زمانہ میں حکیم احمد شجاع نے ایک کتاب ادارہ ''عطر چند'' لاہور سے آئینہ عجم'' کے نام سے شائع کی تھی جس کے مصنفین علامہ اقبال اور حکیم احمد شجاع تھے اور اسی میں قدیم شعراء کا کلام ہے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ کس انہماک سے ''ہزار داستان'' لاہور سے نکلا۔ اس کا دفتر چیمبر لین روڈ احاطہ حاجی قادر بخش میں تھا جس کے سامنے لاہور کی علمی فضا وابستہ تھی۔ اگرچہ اسی زمانے میں لاہور سے اور رسائل بھی نکلتے تھے مگر حکیم احمد شجاع کی وجہ سے اس ''ہزار داستان'' کا رنگ بھی نرالا تھا۔ اسی دور میں حکیم صاحب پنجاب اسمبلی کے اسسٹنٹ سیکرٹری ماتحت ابنا شا سنگھ ہو گئے تھے۔ جس وجہ سے ہی یہ پرچہ اور چند سالوں کے بعد ختم ہو گیا۔

ہم جب اس تصویر پر کرتے ہیں تو اس کے درمیان مرحوم ''شیخ عبدالقادر'' تشریف فرما ہیں اور اس میں تین صفوں پر احباب کو ترتیب دیا گیا ہے۔ ان حضرات کے ناموں کو اسی ترتیب سے درج کرتے ہیں جس طرح اس تصویر پر بھی انگریزی میں درج ہے۔

صف اول: پنڈت کرشن کانت مالوی۔ سید عابد علی جنہوں نے اس وقت تک ایل ایل بی کا امتحان پاس کر لیا تھا اور تازے تازے سامنے آئے تھے۔ آپ کے بعد صدر جلسہ اور صدر انجمن ہائے ادبی لاہور حضرت شیخ عبدالقادر بیٹھے ہیں۔ جن کے دم سے لاہور کی ادبی انجمنیں زندہ رہیں۔ آپ نے ابتداء میں مخزن ماہوار رسالہ جاری کیا تھا جس میں علامہ اقبال کی اکثر نظمیں چھپی ہیں مگر اسی پرچہ ہزار داستان میں بھی آپ کا مقالہ بعنوان محمد حسین آزاد چھپا ہے۔ جسے آپ نے ایک انجمن ''ینگ مین محمڈن ایسوسی ایشن'' کیلئے لکھا ہے۔

ابوالاثر حفیظ جالندھری اپنے خاص انداز میں کرسی پر بیٹھے ہیں۔ اس کے بعد لاہور اسلامیہ کالج کے علم ریاضی کے پروفیسر خواجہ دل محمد صاحب ہیں۔ انہوں نے بے شمار اردو نظمیں لکھی ہیں۔

آپ کے بعد محمد داؤد شیرانی اختر کی تصویر جو پروفیسر محمود شیرانی کے فرزند تھے اور شیرانیوں کی دھانی کھاٹو سے ان کا خاندان ہجرت کر کے آ گیا اور ان کا لڑکا مظہر محمود شیرانی جو یہاں پنجاب ضلع شیخوپورہ میں مقیم ہے اور کالج میں پروفیسر ہے بہر حال ان کی یہ تصویر بھی نایاب ہے۔

صفِ دوم: ہر چند شرما اختر جو فخر سے ابوالاثر حفیظ کے تلمیذ کہا کرتے تھے۔ ان کا انتقال یکم جنوری 1958ء کو دہلی میں ہوا۔ انہوں نے اکثر نعتیں بھی لکھی ہیں۔ عارف شمس یہ نوجوان

بھی جلد فوت ہو گیا تھا۔ یہ اکثر تاثیر مرحوم کے ہاں آتے تھے اور عمدہ شاعر تھے۔ چودھری عبد الحکیم خان صاحب، کے ایم انصاری، انعام الحق اور تلوک چند محروم یہ دراصل میانوالی کے باشندے تھے پاکستان کے ظہور میں آنے پر آپ کو مع اپنے خاندان کے بھارت جانا پڑا۔ اور آپ کالڑکا بہت بڑا پروفیسر تھا اور اکثر ہندوستان سے یہاں آکر انجمنوں کے جلسوں میں حصہ لیتا تھا اور خود عمدگی سے نظم پڑھتا تھا۔ لاہور میں جب 1918ء کے مہینے میں '' ہمارا دن '' جنگ عظیم کے ختم ہونے پر لاہور کے جنرل ایڈوائر نے ایک مشاعرہ کیا تھا۔ جس میں تلوک چند محروم کو علامہ اقبال نے ان کی نظم پر اول انعام دیا تھا۔ اور ایڈوائر نے خود اس جلسے کی صدارت کی تھی۔ افسوس مجھے اس نظم کا عنوان یاد نہیں ہے۔

(روزنامہ نوائے وقت لاہور 18 مئی 1979)

حکیم نیر واسطی

اختر شیرانی

گھٹا کعبے سے اٹھی اور برسی خاک ایراں پر
ہوئی رحمت کی بارش شعر و حکمت کے گلستاں پر

اسی گلشن میں حافظ نے سرودِ آتشیں چھیڑا
کنارِ آب رکنا بادسازِ دل نشیں چھیڑا

اسی محفل میں کھولے رازِ مستی آ کے جامی نے
جہانِ شعر کو بخشا نظامِ نو نظامی نے

جہانِ نو پھر اردو غزل خوانوں کا دور آیا
نئے رند آئے اور رندوں کے پیانوں کا دور آیا

اب اس محفل میں میر و آتشِ آتش بیاں آئے
جناب داغ آئے اور امیر نکتہ داں آئے

پھر آخر اِس چمن میں اخترِ رنگیں بیاں آیا
گلوں کا ہم نشیں آیا صبا کا راز داں آیا

وہ عذرا کے فسونِ ناز کی رنگیں ادا لایا
وہ بوئے زلف سلمیٰ کی بہار جا نفزا لایا

عجب طرزِ نوا لے کر گدائے میکدہ آیا
زبانِ میر لایا اور بیان میرزا لایا

وہ بزمِ غالب رنگیں نوا کی یادگار آیا
وہ گلگشت چمن زارِ مصلےٰ کی بہار آیا

الٰہی اس کی تُربت خلد زارِ نور ہو جائے
نسیم شہر خاموشاں شمیم حور ہو جائے

لحد کو اس کی یا رب یاسمن زارِ جناں کر دے
اور اس کے نام کو نقشِ حیات جاوداں کر دے

شعرستان

اختر شیرانی کا جدید طرز کا کلام

(سانیٹ)

پبلشرز

اُردو اکیڈمی پنجاب لوہاری دروازہ لاہور

۲۰۰۰ دسمبر ۱۹۳۱ء قیمت

نذرِ نیرنگِ خیال

پیارے حکیم صاحب (یوسف حسن)

تسلیم۔ عرض ہے کہ آپ کی فرمائش دربابِ اشاعت
بست ۲۰ سانیٹ بصورتِ کتاب، مجھے پسند آئی۔ آپ میرے
بیس سانیٹ ایک کتاب کی صورت میں شائع کر سکتے ہیں۔ مارچ ۱۹۴۱ء
سے لیکر مارچ ۱۹۴۳ء تک آپ اس کتاب کو فروخت کر سکتے ہیں
"نیرنگِ خیال" کی اعانت کے سلسلے میں یہ میرا ناچیز نذرانہ ہے قبول فرمائیے

والسلام

آپ کا
اختر شیرانی

۲

ہدیۂ تشکّر

میرے کرم فرما اور محترم دوست حضرت اختر شیرانی ابتدا ہی سے نیرنگِ خیال کی قلمی اعانت فرماتے رہے ہیں اور آپ کا کلام بالتزام نیرنگِ خیال میں شائع ہوتا رہا ہے آپ نے موجودہ وقت میں جبکہ کاغذ کی گرانی نے رسائل کے مالیات کو بہت بڑی حد تک نقصان پہنچا لیا ہے، اپنے جدید طرز کے کلام (سانیٹ) کی اشاعت کی اجازت مرحمت فرما کر ادارہ کی قابلِ قدر اعانت فرمائی ہے۔

اختر صاحب کی اس نیرنگ نوازی کیلئے میں اُن کا تہِ دل سے ممنون و مشکور ہوں۔

سانیٹ حضرت اختر شیرانی کی ایجاد ہے اور بلاشبہ وہ اتنی مقبول ہے کہ اب اکثر شعرا اس طرز میں لکھنے لگے ہیں حضرت اختر شیرانی نے قریباً ۲۰ سانیٹ لکھے ہیں لیکن اُن کے منشا کے مطابق اُن کا انتخاب شائع کیا جا رہا ہے۔ توقع ہے کہ علم دوست اور ادب نواز حضرات ان دُرہائے بے بہا کی قدر فرمائینگے

نیاز مند

حکیم یوسف حسن

مدیر نیرنگ خیال لاہور

۵

پیش لفظ

ہم میں سے اکثر کو وہ زمانہ یاد ہوگا جب اختر شیرانی پہلے پہل موجودہ شاعری کے میدان میں وارد ہوئے، یوں تو موجودہ دور سے پہلے ہمارے ادب میں حسن و عشق کے مرقعے بھی موجود تھے اور حدیثِ دل کے مفسر بھی، لیکن ہمارے ہمعصر نوجوان حسن و عشق کے اس تصور سے ایک بُعد سا ایک اجنبیت سی محسوس کرتے تھے، انہیں محسوس ہوتا تھا کہ ان کے اپنے شعراء کا حسن، یا بالکل خیالی اور غیر مرئی ہے یا بالکل سفلی اور غیر دلکش، ان کا عشق یا بالکل متین اور حسن آفریں ہے یا بالکل اوباش اور آبرو باختہ۔ سماج کی ہر عورت یا تو شریف عورت تھی جسکے متعلق عشقیہ لہجہ میں گفتگو کرنا بد اخلاقی تھی یا پھر بیسوا تھی جسکے متعلق ساری دنیا میں ایک ہی لہجے سے گفتگو کیجاتی ہے چنانچہ بیسویں صدی کے نوجوانوں کو عنفوانِ شباب کی اس خوبصورت اور والہانہ کیفیت کا کوئی ترجمان نہیں ملتا تھا جس کے زیرِ اثر ہوس اپنی پاکیزگی اور خلوص کی وجہ سے

٦

عشق بن جاتی ہے اور مادی جسم اپنے حسن اور لطافت کی وجہ سے روح میں مدغم ہو جاتا ہے، یہ وجدان، یہ الہانہ پن در اصل اُس احساس آزادی کے اجزا تھے جس کی لذت پرانی سماجی قیود کی شکست اور نئے ذہنی اثرات کے نفوذ کی وجہ سے ہمارے دور کے نوجوانوں نے سب سے پہلے محسوس کی، اس ہیجانی دور کے فوری اثرات ایک ذہنی اور جذباتی غیر ذمہ داری، ایک دنیا و مافیہا سے بے خبر رومانیت، اور ایک تُند لیکن پاکیزہ لذت پسندی کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ اختر شیرانی اسی تحریک کے سر کردہ شعراء میں سے ہیں۔ اُن کی شاعری اسی احساسِ بلوغت کی متحیر، گلکار، مخلیں شاعری ہے، ہر تصویر، ہر مشاہدہ، دلہن کی طرح تخیل کے گھونگھٹ سے آہستہ آہستہ نمودار ہوتا ہے اور بالکل عریاں نہیں ہونے پاتا، ان میں کہیں محسوسات کی لذت ہے، کہیں تصورات کی رنگینی، کہیں اصوات کا ترنم ہے کہیں معانی کی خواب آفرینی

یہ دنیا، یہ نظارے اور یہ رنگینی فضاؤں میں!

یہ جلوے چاند سورج کے یہ تابانی ستاروں کی!

یہ نزہت لالہ زاروں کی، یہ رفعت کوہساروں کی!

۷

یہ بھینی بھینی آوارہ سی خوشبوئیں ہواؤں میں!

یہ بکھری بکھری مستی جھومنے والی گھٹاؤں میں!

یہ تیزی آبشاروں کی، روانی جوئباروں کی!

یہ پھولوں کا ہجوم اور یہ لطافت سبزہ زاروں کی!

یہ موسیقی جو رقصاں ہے پرندوں کی صداؤں میں!

تری صورت سراسر، پیکرِ مہتاب ہے سلمیٰ!

ترا جسم اک ہجومِ ریشم و کمخواب ہے سلمیٰ!

شبستانِ جوانی کا تو اک زندہ ستارہ ہے!

تو اس دنیا میں گویا حسنِ فطرت کا اشارہ ہے!

تو اس سنسار میں اک آسمانی خواب ہے سلمیٰ!

سراپا، اک خیالی حور، جسمِ نازنیں تیرا!

مجسم خندۂ خوابِ پری روئے حسیں تیرا!

۸

یہ موتی - یہ جبیں یا انجم و مہتاب کا عالم!
پریشاں خواب کا سا گیسوئے شب تاب کا عالم!
چمن زارِ شعاعِ نور، عکسِ دل نشیں تیرا!

اس مجموعہ میں کچھ سانیٹ ہیں اور چند سانیٹ نما نظمیں، سانیٹ ایک بہت ہی پابند اور محدود صنفِ سخن ہے اور جب موجودہ شعرا طرزِ تنگنائے غزل کی شکایت کرتے ہیں تو مجھے اس صنف کی مقبولیت کو دیکھکر اکثر حیرت ہوتی ہے اس میں شک نہیں کہ اس مقبولیت کی ایک اہم وجہ اختر شیرانی کی نظموں کی کامیابی ہے، ماحول کی روز افزوں تلخی اور کشمکشِ حیات کی سخت گیری کی وجہ سے ہماری شاعری کا رُخ پھر بدل چلا ہے، لیکن اغلب ہے کہ خالص شاعرانہ محاسن کی وجہ سے ان نظموں کی تفریحی قیمت ہمیشہ برقرار رہے گی +

— فیض

اختر شیرانی کی ایک نادر تصویر
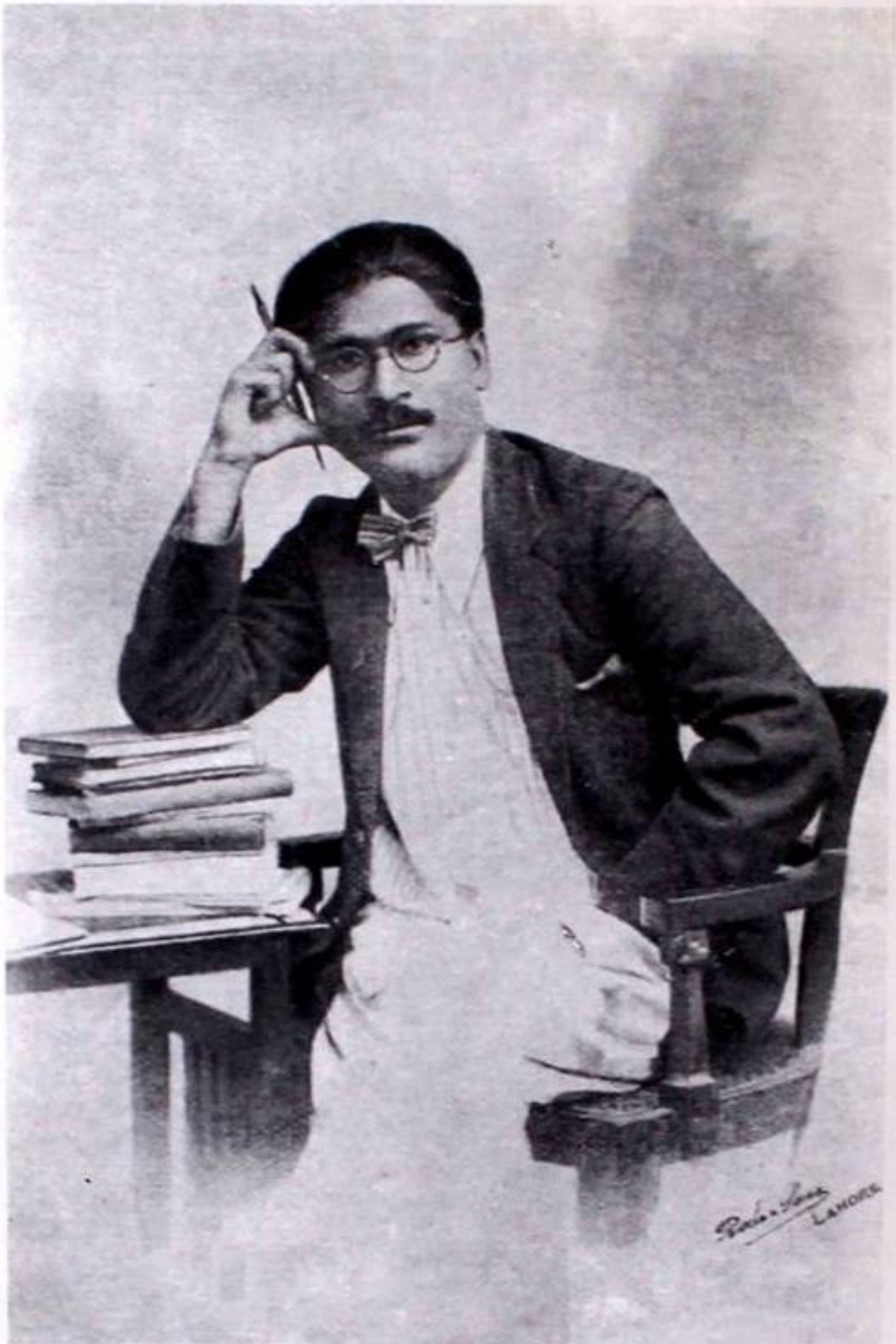
ایک یادگار تصویر

پہلی قطار (بائیں سے دائیں) پنڈت کرشن کانت مالوی، سید عابد علی، شیخ عبدالقادر، حفیظ جالندھری، خواجہ دل محمد، جناب اختر شیرانی، دوسری قطار (بائیں سے دائیں) ہری چند شرما، عارف شمس، چودھری عبدالحکیم، کے ایم انصاری، انعام الحق، تلوک چند محروم، عندلیب شادانی، ضیاء الدین شمسی، ناصر ہریانوی، سوہن لعل ساحر۔ تیسری قطار (بائیں سے دائیں) حسرت، حیرت دہلوی، ایم ڈی تاثیر، اودھے سنگھ شائق، تاجور، نذیر لدھیانوی، نیر بنگالی، آغا گل۔ اس تصویر کے بارے میں ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کا مضمون اندرونی صفحات پر ملاحظہ فرمائیں۔

اختر شیرانی (دائیں سے تیسرے) کی ایک نایاب تصویر

مہندی باغ۔

برادرم　تسلیم۔　اسی کاغذ پر اس بات کی تصدیق کر دیجیے کہ
اس چیک کی پشت پر جو دستخط ہیں وہ اختر شیرانی ہی کے ہیں۔ اگر عدالت کی
مہر ہو تو اپنے عہدے کی تفصیل کے ساتھ وہ بھی لگا دیجیے۔ اگر گنجائش نکل آئے
تو چیک کی پشت پر ہی تصدیق کر دیجیے۔

والسلام

آپ کا
اختر شیرانی

یہ رقعہ غالباً ۱۹۴۶-۴۷ء میں لکھا گیا ہے اور مجید ملک مرحوم کے نام ہے جو ان دنوں ٹونک میں مجسٹریٹ تھے۔

اختر شیرانی کی ایک یادگار تصویر

ہوا ہے مخالف، خفا ہے زمانہ
مگر درد! کھانا یہیں آج کھانا

یعنی ۹ یا ۱۰ بجے۔

والسلام

تمہارا

اختر

درد سے مراد ٹونک کے معروف شاعر بسمل سعیدی مرحوم کے شاگرد درد سعیدی ہیں۔ یہ رقعہ ۱۹۴۲ء کے وسط میں لکھا گیا ہوگا۔

تار کا پتہ "ہمدرد" دہلی

ٹیلیفون نمبر ۵۵۶

ہمدرد

روزانہ

ایڈیٹر محمد علی

شنبہ ۱۴ شوال المکرم ۱۳۴۶ھ

نمبر ۷۰ — جلد ۵ — دہلی، ۲۷ مارچ ۱۹۲۸ء

نذرِ عقیدت

("فسانۂ غمِ دل" کے جواب میں)

[illegible]

کہاں تلک غمِ دل کو نہ آشکار کروں؟
زباں بند رکھوں، صبر اختیار کروں!

"فسانۂ غمِ دل" پڑھ کے رو رہا ہوں میں
نہیں یہ تاب کہ کچھ عرضِ حالِ زار کروں!

بجائے خامہ مجھے چاہیے زبانِ سرشک
کہ شرحِ سوزِ غمِ روحِ بیقرار کروں!

حریمِ دل میں ہے بیتاب حسرتوں کا ہجوم
کہاں تک، آہ! میں ان زخموں کا شمار کروں؟

اگر میں شاہِ جہاں ہوں تو تیرے قدموں پر
خزانۂ زر و لعل و گہر نثار کروں!

اگر ہو کارگہِ دہر پر مرا قبضہ
تجھے میں ساری خدائی کا تاجدار کروں!

اگر اک دن کے لئے تخت و تاج مل جائے
تو تیرے زیرِ نگیں ہند کا دیار کروں!

اگر نظامِ فلک پر مری حکومت ہو
فدا میں تجھ پہ ستاروں کے جلوہ زار کروں!

جو بزمِ فطرتِ گل میرے زیرِ فرماں ہو
تو تجھ پہ صدقے ہر اک باغ کی بہار کروں!

اگر ہو گل کدۂ دہر پر مرا قبضہ
نثار تجھ پہ خدائی کے لالہ زار کروں!

اگر مری تلوار ہند میں بے بس
تو فتح تیرے لئے بیسیوں دیار کروں!

مرا قلم نہ ہو گر شکوہ سنجِ بے ہنری
تو اس کو تیرے لئے صرفِ جوشِ کار کروں!

غرض نصیبوں کی برکت سے جو بھی حاصل ہو
وہ سب کا سب میں ترے نام پر نثار کروں!

مگر یہ ساری امیدیں ہیں خوابِ بے تعبیر
کوئی بھی ایسی نہیں جس پہ اعتبار کروں!

سوائے اس کے کہ اپنی حقیر ہستی کو
بطورِ نذر ترے قدموں پر نثار کروں!

امیدِ دل کی کلی کھل کے پھول ہو جائے!!
یہ میری "نذرِ عقیدت" قبول ہو جائے!!

(اختر شیرانی)

اخبار ہمدرد دہلی (۲۷ مارچ ۱۹۲۸) کے صفحہ اول پر اختر شیرانی کی ایک یادگار نظم

یہ دنیا دیکھنے میں کس قدر معصوم جنت ہے

جہاں کا ذرہ ذرہ درسِ خونخواری سکھاتا ہے × جہاں حیران ہے یزداں اور شیطاں مسکراتا ہے

یہ دنیا دیکھنے میں کس قدر معصوم جنت ہے

بیاضِ اختر شیرانی کا ایک ورق

۲۲ جنوری ۴۶ء

محترمی نسیم،

اتنے عرصے بعد آپ کا نوازش نامہ ابھی ملا۔ آپ کہیں گی کہ "خود ساختہ بات ہے"۔

میں ۲۹ جنوری کو کشمیر جا رہی ہوں۔ پیکنگ میں بے حد مصروف ہوں، اس لئے مفصل خط نہیں لکھ سکوں گی۔ ہمارا قیام سری نگر ہی میں ہوگا۔ آپ مجھے خط گورنمنٹ پوسٹ آفس سری نگر لکھئے گا۔ دیکھئے بھول نہ جائیے گا۔ میں پہلے کشمیر کی اونچے اونچے چناروں کی اوٹ سے جھانکنے والی پر حسین صبح کو آپ کے خط کا انتظار کیا کروں گی۔ کتنا پُر کیف ہوگی وہ لذتِ انتظار!

آجکل میں "ناز" دیکھی۔ بڑی حسین ہے اور سالنامہ "نیرنگ خیال" کی کیا بات ہے۔ پھر لطف کی ہے مجھے پڑھ کر میرے دل میں بھی بیمار پڑ جانے کی خواہش جاگ اٹھتی ہے۔

"آج احساس ہوا دل کو کہ لذت کیا ہے" کیسا درد بھرا مصرع ہے۔

اور "کیا خبر بے خبروں کو کہ یہ لذت کیا ہے"۔ واقعی

بے خبروں کو کیا خبر!

لاہور سے احمد ندیم قاسمی اور نذیر احمد کی ادارت میں رسالہ "سویرا" کا اجرا ہوا ہے۔ آپ بھی اسے ضرور دیکھئے گا۔

والسلام

بلقیس

اختر شیرانی کے نام بلقیس کے مکتوب کا عکس

اختر شیرانی کے خطوط
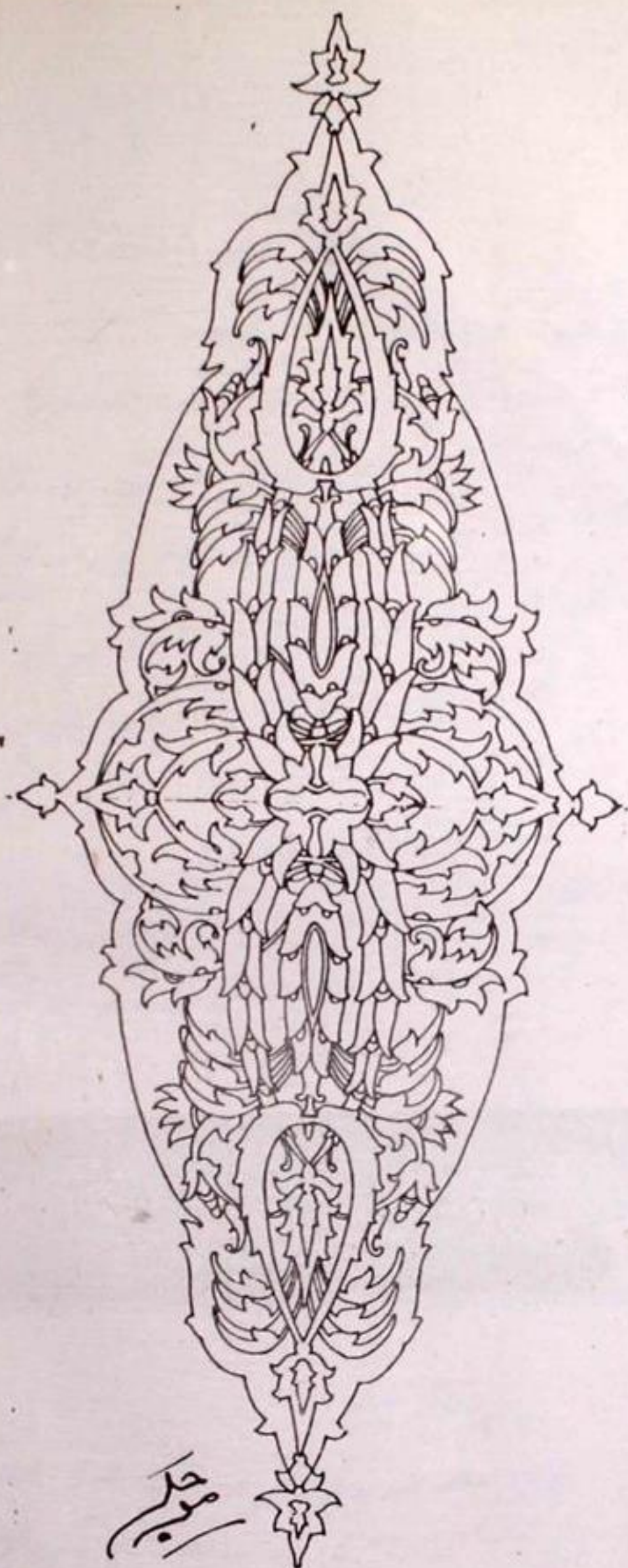
THE
SHAHKAR," LAHORE
India's foremost Illustrated Literary & Educational Monthly

Organ of :
URDU MARKAZ, LAHORE
A High Class Publishing House.

Other Publications :
THE " PREM. " LAHORE
Children's Popular Weekly.

شاہکار، لاہور

Ref :

Directed by :
HON'BLE SIR ABDUL QADIR
Member Indian Council London

K. B. Sh. NUR ELAHI, I. E. S.,

ALLAMA Pt. BRIJ MOHAN
KAIFI, DEHLAVI.

Edited by :
ALLAMA I. K. TAJWAR.

Dated 193

برادر مکرم! تسلیم - مدت سے آپ نے "شاہکار" کو یاد نہیں کیا - ازراہ کرم اولیں فرصت میں اپنی کوئی نظم اور مضمون بھجوا کر ممنون فرمائیے -

امید ہے آپ مع بچوں کے بخیریت ہونگے۔

والسلام
آپکا
اختر

THE
"SHAHKAR," LAHORE
India's foremost Illustrated Literary & Educational Monthly

Organ of :
URDU MARKAZ, LAHORE
A High Class Publishing House.

Other Publications :
THE " PREM. " LAHORE
Children's Popular Weekly.

شاہکار، لاہور

Ref :

Directed by :
HON'BLE SIR ABDUL QADIR
Member Indian Council London

K. B. Sh. NUR ELAHI, I. E. S.,

ALLAMA Pt. BRIJ MOHAN
KAIFI, DEHLAVI.

Edited by :
ALLAMA I. K. TAJWAR.

Dated 193

برادر مکرم! تسلیم - مدت سے آپ نے "شاہکار" کے لیے کوئی چیز نہیں بھیجی - ازراہ کرم اپنے مضامین نظم و نثر سے نوازتے رہیے - اس مرتبہ بلکہ اسی ہفتے میں آپکے ایک نثری مضمون یا افسانے کی سخت ضرورت ہے - اولیں فرصت میں ارسال فرمائیے۔

امید ہے آپ مع الخیر ہونگے -

والسلام
آپکا
اختر (شیرانی)

مہندی باغ۔

برادرم تسلیم۔ ایک کاغذ پر اس بات کی تصدیق کر دیجیے کہ
اس چیک کی پشت پر جو دستخط ہیں وہ اختر شیرانی ہی کے ہیں۔ اگر عدالت کی
مہر ہو تو اپنے عہدے کی تفصیل کے ساتھ مہر بھی لگا دیجیے۔ اگر گنجائش نکل آئے
تو چیک کی پشت پر ہی تصدیق کر دیجیے۔

والسلام

آپکا

اختر شیرانی

یہ رقعہ غالباً ۴۷-۱۹۴۶ء میں لکھا گیا ہے اور مجید ملک مرحوم کے نام ہے جو ان دنوں
ٹونک میں مجسٹریٹ تھے۔

مہندی باغ - ٹونک راج -

عزیزم سلمہٗ، دعا و سلام - محبت نامہ پہنچا "جج بہار" بھی نام نہ ہونے کی شکایت بیجا ہے - تفصیل کا یہ موقع نہیں اس لیے صرف اتنا لکھنا چاہتا ہوں کہ دوسری جلد میں تلافی ہو جائیگی -

"جج بہار" میری مرضی کے مطابق شائع نہیں ہوئی کاغذ کی گرانی اور اخراجات کی زیادتی نے مجبور کر دیا - جب کبھی کسر نکالی جائیگی -

ٹونک میں رہنا یاد بھی ہے اور مصلحت بھی لیکن بعض بیہودہ سی مصروفیتوں سے نجات نہیں ملتی - فرصت کا انتظار رہتا ہے -

یک دست جام بادہ و یک دست زلف یار
رقص چنیں بصحن گلستانم آرزوست!

ایک ہی آوری کا دل تشنۂ گزار ہو
امید ہے آپ خیریت سے ہونگے - والدعا

[illegible]

مہندی باغ - ٹونک راج

عزیزم سلمہ، دعا و سلام۔ محبت نامہ پہنچا۔ ''صبح بہار'' میں نام نہ ہونے کی شکایت بے جا ہے۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ اس لیے صرف اتنا لکھنا چاہتا ہوں، کہ دوسری جلد میں تلافی ہو جائے گی۔ ''صبح بہار'' میری مرضی کے مطابق شائع نہیں ہوئی۔ کاغذ کی گرانی اور اخراجات کی زیادتی نے مجبور کر دیا۔ پھر کبھی کسر نکالی جائے گی۔

ٹونک میں نہر رُکنا باد بھی ہے اور مصلیٰ بھی۔ لیکن بعض ٹھوس مصروفیتوں سے نجات نہیں ملتی۔ فرصت کا انتظار رہتا ہے۔

یک دست جام بادہ و یک دست زلف یار
رقص چنیں ''بصحن گلستانم'' آرزو است!

آپ کی یاد آوری کا دل سے شکر گزار ہوں۔

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔

والدعا
اختر

قرآنی آیات اور عربی کے
اشعار استعمال ہوئے ہیں۔ ان کی درستی کے باب میں میں نے غالباً پہلے تذکرہ کیا تھا
آج یا تو خود آؤ یا مولوی ذفیر سے کہو کہ اپنی ڈاڑھی کے مشک اذفر سے مشام کتاب
کو معطر کریں۔
عربی اشعار ان کے بس کی بات نہیں لیکن آیات کو وہ ضرور درست کر سکیں گے
کسی حافظ قرآن سے بھی کام چل سکتا ہے۔ بہر حال جو کچھ ہو آج کر دو تا کہ میں کل
دہلی روانہ ہو سکوں۔
میں بیتابی سے تمہارا یا تمہارے قاصد کا آج شام تک انتظار کروں گا۔
والسلام

”پیارے ظہیر

سلام شوق۔ میری کتاب میں چند قرآنی آیات اور عربی کے اشعار استعمال ہوئے ہیں۔ ان کی درستی کے باب میں میں نے غالباً پہلے تذکرہ کیا تھا۔ آج یا تو خود آؤ یا مولوی ذفیر سے کہو کہ اپنی ڈاڑھی کے مشک اذفر سے مشام کتاب کو معطر کریں۔

عربی اشعار ان کے بس کی بات نہیں لیکن آیات کو وہ ضرور درست کر سکیں گے۔ کسی حافظ قرآن سے بھی کام چل سکتا ہے۔ بہر حال جو کچھ ہو آج کر دو تا کہ میں کل دہلی روانہ ہو سکوں۔

میں بیتابی سے تمھارا یا تمھارے قاصد کا آج شام تک انتظار کروں گا۔

والسلام“

یہ رقعہ ۱۹۴۲ء کے اواخر میں لکھا گیا ہے۔ کتاب سے مراد محمد عوفی کی جوامع الحکایات کے انتخاب کا اردو ترجمہ ہے جو مولوی عبدالحق کے ایما پر اختر نے کیا تھا۔ کتاب ۱۹۴۳ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) نے دہلی سے شائع کی۔

۱۸ - فلیمنگ روڈ - لاہور

کرم فرمایم،

تسلیم - "حدیقۃ الشعر" کا دعوت نامہ اور آپ کا مکتوب گرامی باعث نواز
ہوا - ممنون التفات فرمایا - حالات نے اجازت اور مشاغل نے فرصت دی تو
مشاعرے کی شرکت اور آپ کی زیارت کا شرف حاصل کر سکوں گا -

"نوبہار" کے نام سے ایک ماہانہ ادبی رسالے کا اجرا پیش نظر ہے -
ممکن ہو تو اسکے لیئے اپنے "تبرکاتِ شعری" مرحمت فرمائیے -

"نوبہار" میں بعض اور دلچسپیوں کے علاوہ، اردو کی ادبی تحریکات
کی روئدادیں شائع کیئے جانے کا مستقل انتظام بھی زیر تجویز ہے - ازراہ کرم اپنی
انجمن [حدیقۃ الشعر] کے معتمد صاحب سے فرما دیجیے کہ انجمن مذکور کے سالانہ مشاعرے
کی تفصیلی روداد، مناسب وقت پر اولیں فرصت میں بھیجکر ممنون فرمائیں - غزلیات و
منظومات بھی روداد میں محسوب ہونگی - گو انتخاب کا حق مدیر متعینہ اپنا جائز فرض
تصور کرے گا -

امید ہے مزاج بخیر ہوگا -

والسلام

اخلاص کیش

اختر شیرانی

سورج

۱۸۔فلیمنگ روڈ۔ لاہور

کرم فرمایم

تسلیم۔ ''حدیقۃ الشعر'' کا دعوت نامہ اور آپ کا مکتوب گرامی باصرہ نواز ہوا۔ ممنون التفات فرمایا۔ حالات نے اجازت اور مشاغل نے فرصت دی تو مشاعرے کی شرکت اور آپ کی زیارت کا شرف حاصل کر سکوں گا۔

''نوبہار'' کے نام سے ایک ماہانہ ادبی رسالے کا اجرا پیش نظر ہے۔ ممکن ہو تو اس کے لیے اپنے ''تبرکاتِ شعری'' مرحمت فرمایئے۔

''نوبہار'' میں بعض اور دلچسپیوں کے علاوہ، اردو کی ادبی تحریکات کی روئدادیں شائع کیے جانے کا مستقل انتظام بھی زیر تجویز ہے۔ از راہ کرم اپنی انجمن [حدیقۃ الشعر] کے معتمد صاحب سے فرما دیجیے کہ انجمن مذکور کے سالانہ مشاعرے کی تفصیلی روداد، مناسب وقت پر اولیں فرصت میں بھیج کر ممنون فرمائیں۔ غزلیات و منظومات بھی روداد میں .... ہوں گی۔ گو انتخاب کا حق مدیر متعینہ اپنا جائز فرض تصور کرے گا۔

امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔

والسلام

اخلاص کیش

اختر شیرانی

[illegible] باغ - ٹونک راج -

برادر عزیز! دعا - تعزیت نامے کا دلی شکریہ۔
آپ کا خط کھو گیا - ساتھ ہی پتہ بھی ذہن سے اتر
گیا - جو کچھ یاد رہا اس کے مطابق پتہ لکھ رہا ہوں۔
خدا کرے یہ خط آپ تک پہنچ جائے -

مجھے اپنی نظم "غم رنگیں" ع
میں خواب بن کے تیرے شبستاں میں آؤں گا
کی نقل مطلوب ہے۔ آپ کے پاس ہو تو بھجوا دیجئے
"ادبی دنیا" میں شائع ہوئی تھی -
امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے -

والدعا

آپ کا

اختر

مہندی باغ۔ ریاست ٹونک راج۔

بخدمت حضرت قبلہ ناظم صاحب محکمہ شرع شریف ٹونک، مدظلہ

جناب قبلہ، آداب و نیاز۔ گزارش ہے کہ ٹونک سے باہر کی جائداد کے سلسلے میں مجھے ایک وراثتی تصدیق نامے کی ضرورت ہے۔ چونکہ والد مرحوم پروفیسر محمود خاں صاحب شیرانی [سابق لکچرر پنجاب یونیورسٹی (لاہور)] کے انتقال کے بعد میں ان کا تنہا وارث اور اکلوتا فرزند ہوں۔ بنابرایں مجھے امید ہے کہ آپ کو اپنے معلومات و اطلاعات کی بنا پر میری جائز اور تنہا وراثت کی تصدیق پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اگر خدانخواستہ ہو تو آپ اپنے مفتیان کرام میں سے کسی بزرگ کو بھجوا کر غریب خانہ کے ذمہ دار اور متعلقہ افراد سے تصدیق فرما سکتے ہیں۔

زیادہ حد ادب

خادم

اختر شیرانی

۴۶-۱۲-۲

مہندی باغ - ٹونک راج -

برادرِ عزیز سلمہ، دعا - تمہارا ایک خط
پیشِ نظر ہے اور اس پر پورا پتہ درج نہیں - اس لیے
صرف نیڈو ہوٹل کے پتے پر لکھ رہا ہوں - خدا کرے یہ
خط مل جائے -

مجھے حسبِ ذیل نظموں کی ضرورت ہے - جو دستیاب ہو
سکیں فوراً روانہ کر دو :-

(۱) اجڑے ہوئے پائیں باغ میں [مطبوعہ ادبی دنیا]
(۲) تجھے مجھ سے پیار کیوں ہے -
(۳) اٹھا جام ساقی، جہاں کو بدل دیں [ادبی دنیا]
(۴) محبت کی زباں کا نالۂ مستانہ بن جاؤں ["]

امید ہے تم خیریت سے ہوگے -

والدعا
تمہارا
[illegible]

[illegible]

مہندی باغ-ٹونک راج

برادر عزیز سلمہ، دُعا۔ تمھارا ایک خط پیش نظر ہے۔ اور اس پر پورا پتہ درج نہیں۔ اس لیے صرف نیڈو ہوٹل کے پتے پر لکھ رہا ہوں۔ خدا کرے یہ خط مل جائے۔

مجھے حسبِ ذیل نظموں کی ضرورت ہے۔ جو دستیاب ہوسکیں فوراً روانہ کر دو۔

(۱) اُجڑے ہوئے پائیں باغ میں (مطبوعہ ادبی دنیا)

(۲) تجھے مجھ سے پیار کیوں ہے

(۳) اُٹھا جام ساقی، جہاں کو بدل دیں (ادبی دنیا)

(۴) محبت کی زباں کا نالۂ مستانہ نہ بن جاؤں (ادبی دنیا)

امید ہے تم خیریت سے ہوگے

مکرر
فلم میں شرکت کے لیے کسی نے تم سے غلط کہا

والدعا
تمھارا
اختر

ORGAN OF
URDU MARKAZ, LAHORE
1. The Shahkar Monthly } Editor
2 The Prem Weekly. } I. K TAJWAR

پیارے ظہیر! سلام شوق۔ صاحبزادہ احمد سعید خاں کی فرمائش پر تمھارے نام شاہکار وی۔ پی۔ بھیجا گیا تھا مگر تم نے وہ بلا کسی قصور کی پاداش لئے واپس کر دیا۔ تمھیں کیونکر سمجھاؤں کہ مجھے جولائی تک دو سو نئے خریدار پورے کرنے ہیں۔ اب اگر کوئی غصہ ہے تو اسے بھول جاؤ اور شاہکار کی خریداری قبول کرو۔ عمر کی رعایت سے وی پی بھیج رہا ہوں۔

امید ہے تم مع الخیر ہو گے۔ "سلام کے جواب میں" والی نظم پہنچی کہ نہیں؟ والسلام

تمھارا۔ اختر (شیرانی)

یہ پوسٹ کارڈ لاہور سے ٹونک حکیم ظہیر احمد برکاتی صاحب کے نام لکھا گیا ہے۔ ڈاک خانے کی مہر کے مطابق یہ ۱۴ مارچ ۱۹۴۱ء کو ٹونک پہنچا تھا۔

صاحبزادہ احمد سعید خان عاشق ٹونک کے نمایاں شعراء میں تھے۔ ان کا کلام اختر صاحب کے زیرادارت شائع ہونے والے رسائل میں چھپتا رہتا تھا۔

پیارے ظہیر، سلام شوق۔ صاجزادہ احمد سعید خاں کی فرمائش پر تمھارے نام ''شاہکار'' وی، پی بھجوایا گیا تھا۔ مگر نہ جانے کس قصور کی پاداش میں واپس کر دیا۔ تمھیں کیونکر سمجھاؤں کہ مجھے آئندہ جولائی تک دو سو نئے خریدار پورے کرنے ہیں۔ اب اگر کوئی غصہ ہے۔ تو اُسے بھول جاؤ۔ اور ''شاہکار'' کی خریداری قبول کرو .... کی رعایت سے وی پی بھجوار ہا ہوں۔

امید ہے تم مع الخیر ہوگے۔ ''سلام کے جواب میں'' والی نظم پہنچی کہ نہیں؟ والسلام۔

تمھارا -- اختر (شیرانی)

مورخہ
دفتر

دیسی دواخانہ بیرون مستی گیٹ۔ لاہور
زیر سرپرستی حکیم نیر واسطی

عزیزہ ام سلمیٰ، دعا۔ خط پہنچا۔ جس میں سانپ کا تذکرہ تھا۔

شہزادہ اب تک کیوں نہیں پہنچا۔ یہاں سے گئے ہوئے کافی دن ہوئے۔ جسکا تذکرہ میں پچھلے خط میں کر چکا ہوں۔ میں نے لکھا تھا کہ بی۔جی۔ بھی آئی تھی۔ ایک ہزار بی۔جی کو دیدیا تھا۔ ڈھائی سو کے قریب شہزادے کو۔

نوشہ میاں کا خط یہاں بھی آیا تھا۔ اس سے پہلے بندوق لے لو۔ پھر روپیہ ادا کرنا۔ میرا کوٹ بھی اس نے وہیں رکھ لیا۔ کیونکہ بستر اسی نے باندھا تھا۔

منظور عالم صاحب کا خط آیا ہے۔ مکان کرایہ پر مانگتے ہیں۔ میں نے جواب نہیں دیا ہے۔ حامد سعید خاں سے بات کرائی جائے۔ بندوق قیمہ وغیرہ انہی کی معرفت فروخت کراؤ۔ مکان وغیرہ بھی۔ مکان کے لیے تو انہوں نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا بھی تھا۔

[illegible]

دیسی دواخانہ بیرون مستی گیٹ۔ لاہور
زیر سرپرستی حکیم نیر واسطی

میرا آخری خط وہ تھا جس میں دو تصویریں بھجوائی تھیں۔

بہو کو پیار۔ بھابھو اور والدہ کو سلام۔
[illegible] پھوپھو کی خدمت میں نیاز۔

شہزادے کو جو خط زیادہ لکھکر میں نے دیا ہے وہ پھوپھا کو دکھا لینا۔

ڈھولیا کو باہر اور اسکی بیوی کو اندر سلا لیا کرو۔

والدعا

[illegible]

مکرر: [illegible]

پس نوشت: ریڈیو کا چیک ملا یا نہیں؟
پرچے کون کون سے آ رہے ہیں؟
مکرر
ک

عزیزہ ام سلمہا، دُعا۔ خط پہنچا۔ جس میں سانپ کا تذکرہ تھا۔ شہزادہ اب تک کیوں نہیں پہنچا۔ یہاں سے گئے ہوئے کافی دن ہوئے۔ جس کا تذکرہ میں پچھلے خط میں کر چکا ہوں، میں نے لکھا تھا کہ بی۔ جی بھی آئی تھی۔ ایک ہزار بی۔ جی کو دے دیا تھا۔ ڈھائی سو کے قریب شہزادے کو۔

نوشہ میاں کا خط یہاں بھی آیا تھا۔ اس سے پہلے بندوق لے لو۔ پھر روپیہ ادا کرنا۔ میرا کوٹ بھی اس نے وہیں رکھ لیا۔ کیونکہ بستر اُسی نے باندھا تھا۔ منظور عالم صاحب کا خط آیا ہے۔ دکان کرایہ پر مانگتے ہیں۔ میں نے جواب نہیں دیا ہے۔ حامد سعید خاں سے بات کرائی جائے۔ بندوقیں وغیرہ اُنھی کی معرفت فروخت کراؤ۔ مکان وغیرہ بھی۔ مکان کے لیے تو انھوں نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا بھی تھا۔

میرا آخری خط وہ تھا جس میں دو عدد تصویریں بھجوائی تھیں۔

بہبود کو پیار، بھابھو اور والدہ کو سلام۔ پھوپھا اور پھوپھو کی خدمت میں نیاز۔

شہزادے کو جو مختار نامہ لکھ کر میں نے دیا ہے۔ وہ پھوپھا کو دکھا لینا۔

دھولیا کو باہر اور اُس کی بیوی کو اندر سلا لیا کرو۔

والدعا

اختر

مکرر۔

بنک اور لائبریری کے روپے اب تک نہیں ملے ہیں۔

پسِ نوشت :

مکرر۔

ریڈیو کا چیک ملا یا نہیں؟

پرچے کون کون سے آرہے ہیں؟

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی

حواشی

☆ یہ خط اختر صاحب نے 1948ء کے وسط میں لاہور سے اپنی دوسری صاحبزادی کے ٹونک سے آمدہ خط کے جواب میں لکھا تھا۔

☆ انھی دنوں ایک رات پائیں باغ سے ایک سانپ ملحقہ کمرے میں آ گھسا تھا جس کا تذکرہ اختر صاحب کے نام خط میں کیا گیا تھا۔

☆ ''شہزادہ'' عرفیت تھی اختر صاحب کے بڑے داماد علی گوہر خاں شیرانی مرحوم کی۔ یہ اختر صاحب کے حقیقی چچا مودود خاں شیرانی کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے۔

☆ اختر صاحب اپنی دوسری والدہ (بیگم حافظ محمود شیرانی) کو بی چی کہتے تھے۔ یہ پہلے اختر کے حقیقی چچا مقصود خاں شیرانی کی اہلیہ یعنی اختر صاحب کی چچی تھیں۔ چچی بی کا مخفف بی چی ہے۔ اختر صاحب آخر تک انھیں اسی نام سے مخاطب کرتے تھے۔

☆ نوشہ میاں عرفیت ہے اختر صاحب کے ایک عم زاد عبدالعلیم خاں شیرانی مرحوم کی۔ موصوف حافظ صاحب کے سب سے بڑے علاتی بھائی محمد ابراہیم خاں شیرانی کے بیٹے تھے اور شیرانی آباد (ریاست جودھپور) میں رہتے تھے۔ اختر صاحب ٹونک سے شیرانی آباد ہوتے ہوئے کھوکھراپار کے راستے لاہور پہنچے تھے۔

☆ منظور عالم صاحب ٹونک کے سربرآوردہ وکیل تھے اور اب بھی ہیں۔

☆ صاحبزادہ حامد سعید خان، اختر صاحب کے گہرے دوست اور بچپن سے ہمدرس تھے۔

☆ بہبود خاں میرے چھوٹے بھائی تاثیر محمود شیرانی مرحوم کا خاندانی نام تھا۔

☆ ہم بہن بھائی اپنی والدہ کو بھابھو کہتے تھے۔

☆ والدہ سے مراد ہماری دادی جان یعنی اختر صاحب کی والدہ مرحومہ ہیں۔

☆ پھوپھا اور پھوپھو سے اختر صاحب کی مراد حافظ صاحب کی علاتی بہن اور ان کے شوہر نیاز محمد خاں شیرانی ہیں، جو ٹونک میں وکالت کرتے تھے۔

☆ مختار نامہ اختر صاحب نے ٹونک کی جائیداد کے سلسلے میں علی گوہر خاں شیرانی کو دیا تھا۔

☆ دھولیا ایک بوڑھا اور پرانا ہندو ملازم، قوم کا نایک تھا۔ اس کا باپ بھی حافظ صاحب کے والد کے زمانے میں ڈیوڑھی پر ملازم تھا۔

☆ لائبریری کے روپوں سے مراد وہ رقم ہے جو حافظ صاحب کے انتقال کے بعد ان کے باقی ماندہ مخطوطات کی قیمت کے طور پر پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے وصول ہونا تھی۔ یہ قلمی نسخے ہماری خواہش پر لائبریری کے اہلکار غالباً 1947ء کے اوائل میں ٹونک سے لائے تھے۔

بلقیس بنام اختر شیرانی

اختر شیرانی کے نام بلقیس کے محبت نامے

شاعرِ رومان جناب اختر شیرانی کی محبوبہ سلمیٰ کا نام اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ کے لیے رقم ہو چکا ہے، لیکن ...... بلقیس کون تھی؟ جو شاعر رومان کے عشق میں بُری طرح گرفتار تھی۔ ہمیں کلام اختر میں یہ نام کہیں نہیں ملتا۔ ایسا تو نہیں کہ سلمیٰ کے پردے میں اصل نام بلقیس ہی کا ہو؟

مدیر سورج کو خاندان شیرانی کے ایک انتہائی قابلِ اعتماد ذریعے سے جناب اختر شیرانی کے نام بلقیس کے تین خطوط حاصل ہوئے ہیں۔

خط پڑھیے، صاف دکھائی دیتا ہے کہ دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی۔ بلقیس کے یہ محبت نامے پہلی بار منظر پر لائے جا رہے ہیں۔ نایاب ادبی نوادر قارئین سورج کی نذر ...... ہمیشہ کی طرح اس بار بھی۔

مکتوباتِ بلقیس کے عکسی نقول کے ساتھ کمپوزنگ بھی شامل اشاعت کی گئی ہے۔ چونکہ یہ خطوط انتہائی بوسیدہ حالت میں ہیں اس لیے جو الفاظ پڑھے نہیں جا سکتے اُن کی جگہ نقاط دیئے گئے ہیں۔

(ادارہ)

محترمی نسیم،

سوچ رہی ہوں جواب فوراً ہی لکھوں یا تاخیر کیلئے؟

...ں کا شکوہ ہے؟ نہ کہیں "عذر گناہ بدتر از گناہ" والا معاملہ نہ ہو جائے۔ پچھلے گزشتہ
ہفتے بہت ہی مصروفیت میں گزرے۔ گھر بھر پہلے بھی جمعیت خاطر نصیب
نہیں ہوتی تھی اس پر جب خیال بر ابر آتی "حرف گفتار نہ تھا" لیکن عجیب بے سکونی قلب
کی میسر نہیں تھی تو خط کیسے لکھا جاتا مگر آپ نے بھی تو اس عرصے میں یاد
نہیں کیا "غزل آ تنا ہو کر"..... کی شکل البتہ پہنچ گئی تھی "غزل سنانے والی"
پر آپ کو واقعی رشک ہے؟ لیکن آپ ہی کے لفظوں میں کس طرح نسبت اس کو نا
آسیہ اختیار کرے" جبکہ آپ جان بوجھ کر ایسے "موقعے" کھو دیتے ہیں
سنا ہے بنوں کی درخواست آپکے ہاں نا منظور ہوگئی مگر مجھے شکایت
کی نسبت تشویش زیادہ ہے خدا کرے آپ خیریت سے ہوں اور
یہ "انکار" محض نے ہیل پر مبنی ہو۔ ہاں آپ نے یہ کیا لکھا کہ
غزل گانے والی کی آواز نے مجھ پر سحر کر دیا تھا؟ بلکہ حالانکہ
وہ تو ان انٹی ری کا جادو تھا آواز کے رشتوں کو اس میں چنداں دخل نہیں تھا۔
"تجربے کا سلسلہ" بھی ایک ہی رہا۔ لیکن خیر، ہر کچھ نہیں بولتے کچھ ہی
کہیں تک کچھ عرض ہے آپ کی۔ کچھ سمجھ لیا جائے گا آپ سے۔

محترمی تسلیم!

سوچ رہی ہوں جوابِ خط میں اتنی طویل تاخیر کے لیے معافی مانگوں یا نہیں، کہیں ''عذرِ گناہ بدتر گناہ'' والا معاملہ نہ ہو جائے۔ سچ گذشتہ دو ہفتے بہت ہی مصروفیت میں گزرے۔ گھڑی بھر کے لیے بھی جمعیت خاطر نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اگرچہ خیال برابر ''اُسی'' طرف لگا رہتا تھا۔ لیکن جب یکسوئی قلب ہی میسر نہیں تھی۔ تو خط کیسے لکھا جاتا۔ مگر آپ نے بھی تو اس عرصے میں یاد نہیں کیا۔ غزل ''آشنا ہو کر ....'' کی نقل البتہ پہنچ گئی تھی۔ ''غزل سنانے والی'' پر آپ کو واقعی رشک ہے؟ لیکن آپ ہی کے لفظوں میں ع ''کسے یقیں آئے کون اس پہ اعتبار کرے'' جبکہ آپ جان بوجھ کر ایسے 'موقع'' رکھ دیتے ہیں۔

سنا ہے .... کی درخواست اب کے بھی نامنظور ہوئی۔ مگر مجھے شکایت کی نسبت تشویش زیادہ ہے۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔ اور ''یہ انکار'' محض تساہل پر مبنی ہو۔ ہاں، آپ نے یہ کیا لکھا ہے کہ غزل سنانے والی کی آواز نے مجھ پر سحر کر دیا تھا۔ حالانکہ وہ اُن اشعار کا جادو تھا۔ آواز کے فسوں کو اس میں چنداں دخل نہیں تھا۔ ''تجربہ کاری'' کی بھی ایک ہی رہی۔ لیکن خیر ہم کچھ نہیں بولتے، کچھ ہی کہہ لیجیے۔ مرضی ہے آپ کی کبھی سمجھ لیا جائے گا آپ سے۔ ''اصل سوال'' کا ابھی پورا جواب نہیں دے سکتی ہوں۔ کچھ روز ٹھہر کر لکھوں گی۔ ابھی کوئی فیصلہ نہیں کی۔

میں ''جادوگروں'' کے سحر کی معتقد تو ضرور ہوں۔ لیکن ''یاسمیں'' یا ''نسرین'' میں تبدیل ہونے سے نہیں ڈرتی۔ مگر شرط وہی ہے۔ کہ ''قید'' کیے جانے کے لیے وہی ''پائیں باغ'' ہو۔ ورنہ کہیں اور کے لیے میں پیاری زندگی چھوڑنے پر تیار نہیں ہوں۔ خدا جانے زندگی اس قدر پیاری کیوں ہوتی ہے۔ ہزاروں تلخیاں سہنے کے باوجود اس کی آرزو نہیں جاتی۔ کسی نہ کسی اُمید موہوم کے آسرے پر جیے جانے کی تمنا دل کے گوشے گوشے میں چھپی رہتی ہے۔ شاید یہ میری ہی کیفیت ہو۔ لیکن جہاں تک میرا تجربہ ہے۔ ہر ایک ہی اس دنیا پر فدا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کسی کا مقصود صرف پیسہ ہے۔ اور کسی کا حاصلِ زندگی خوابوں کی دنیا۔

لوگ کہتے ہیں اس مادّی دور میں تخیل پرستوں کا کام نہیں لیکن حقیقت کی تلخیاں خیال کی دنیا ہی میں بھلائی جاسکتی ہیں اگر مادّہ پرستی ہی ہر شعبۂ زندگی پر حاوی ہو جائے۔ تو زندہ رہنے کے لیے باقی ہی کیا رہ جاتا ہے؟ دنیا .... کے لیے مگر خیال پرستی اور رومان مٹ نہیں سکتا۔ جب اڈیٹر ادیب کے ایک مقالے میں مَیں نے یہ الفاظ پڑھے ''اختر شیرانی کا دبستانِ مدت ہوئی اُجڑ گیا۔ اور اب وہ اپنے پائیں باغ میں بیٹھے اپنی سلمیٰ کو خط لکھ لکھ کر دل بہلایا کرتے ہیں۔'' تو میرے دل سے فوراً صدا آئی تھی۔ یہ ''دبستان'' کبھی نہیں اُجڑ سکتا۔ جب تک اس دنیا میں گوشت پوست سے بنے ہوئے انسانوں کے بدلے فولاد کے پتلے نہ پیدا ہونے لگیں اس دبستان کی یاد ہمیشہ قائم رہے گی۔ اور .... معاف فرمایئے جانے کس خیال میں یونہی بے سر پیر کی ہانکنے لگی۔

دراصل کئی روز سے دل کی کچھ عجیب سی کیفیت ہو رہی ہے۔ طبیعت ہر وقت اُداس اُداس سی رہتی ہے۔ بے کلی سی ہے۔ جیسے کسی شیریں سپنے سے بیدار ہوئی ہوں۔ لیکن اس افسردگی اور اضطراب میں بھی ایک لذت آگیں کیف ہے۔ سرور انگیز کسک ہے۔ ''طلب'' اور ''انتظار'' کی کسک!

''یاد کرتی ہے'' نظم پڑھی۔ ماشاء اللہ خوب ہے۔ خصوصاً جفائے ناز کی عادت سہی نہیں لیکن .... اور

وہ جس کے خوف سے .... تھی
وہ سرد سرد ہوا تم کو یاد کرتی ہے

اور

تم ایک دن جسے سمجھی تھیں میرے غم کا غرور
وہ آنسوؤں کی حیا تم کو یاد کرتی ہے

اور پھر

ہے جس کی آرزو ''اختر'' کو مدتوں سے مگر
ہوئی نہیں جو خطا تم کو یاد کرتی ہے

بے حد پسند آئے۔ حیرت ہوتی ہے۔ آپ اتنے اچھے اس قدر پُر تاثیر اور ایسے ''جیتے جاگتے'' اشعار کیسے کہہ لیتے ہیں۔ جی چاہتا ہے ....

آنسو نکل رہے ہیں تصور میں بن کے پھول
شاداب ہو رہا ہے گلستانِ آرزو

آہ۔ یہ شعر کس ناکام محبت کے خونِ دل میں قلم ڈبو کر لکھا ہے آپ نے۔ شعر نہیں ایک تیز نشتر ہے۔ جو دل میں اُترتا چلا جاتا ہے۔ مگر اس جراحت میں تکلیف کی خلش نہیں ہلکا ہلکا درد ہے۔ جی چاہتا ہے۔ ایک بار پھر یہی شعر پڑھوں:

آنسو نکل رہے ہیں تصور میں بن کے پھول
شاداب ہو رہا ہے گلستانِ آرزو

کاش میں اپنے دلی تاثرات زبان قلم سے ادا کرنے پر قادر ہو سکتی! میں اب ختم کرتی ہوں۔ آپ یہ بے ربط خط پڑھتے پڑھتے اُکتا جائیں گے۔ اور پھر مجھے بھی تو نیند آ رہی ہے۔ آنکھیں کسی نشے باز کی طرح بند ہوئی جاتی ہیں۔ ادھر سے دودھ جیسی سفید شفاف چاندنی کی کشش باہر کھینچ رہی ہے۔ چاند پر نظریں جمائے ہوئے سو جانا کیسا اچھا لگتا ہے۔ اور جب کہ دل میں یہ دیوانہ گر احساس موجود ہو کہ اسی چاند پر اس وقت کسی ''اور'' کی نگاہیں بھی لگی ہوں گی۔ نظروں کے اس سنگم کا خیال اس قدر مسحور کن ہوتا ہے۔

دیکھیے نا، جواب بہت جلدی لکھیے گا، بہت اچھے سے بن کر، دیر ہرگز نہ کریں ورنہ ......

......

فقط

۲ جولائی ۴۸ء　　　　محترمی نسیم،

اتنے عرصے بعد آپ کا نوازش نامہ پا کر

کہونگی کہ "خوے ساز باشد ہے"۔

میں ۱۰ جولائی کو کشمیر جا رہی ہوں۔ پیکنگ میں بے طرح

مصروف ہوں ورنہ مفصل خط نہیں لکھ سکوں گی۔ ہمارا قیام

سری نگر ہی میں ہوگا۔ آپ مجھے خط معرفت پوسٹ ماسٹر سری نگر

لکھئے گا۔ دیکھئے مقبول ہو جائیگا میں پہلے کشمیر کی

اونچے گھنے چناروں کی اوٹ سے جھانکنے والی ہر

حسین صبح کو آپ کے خط کا انتظار کیا کروں گی کتنی

لطیف ہوگی وہ لذت انتظار!

آجکل میں "بار" دیکھی۔ بڑی حسین ہے اور سالنامہ

'نیرنگ خیال' کی عبارت بھی غضب کی ہے مجھے جیسے

پڑھ کر ہر دل میں ہمارا بسیار رنگ جانے کی خواہش

جاگ [illegible] اٹھتی ہے۔

دو "آج احساس ہوا دل کو کیا لوٹ لیا ہے" کیسا درد بھرا

مصرعہ ہے۔

اور "کیا خبر بے خبروں کو کہ یہ لوٹ لیا ہے"۔ واہ،

بے خبروں کو کیا خبر!

لاہور سے احمد ندیم قاسمی اور [illegible] احمد کی ادارت میں

رسالہ "سویرا" شائع ہو رہا ہے۔ آپ بھی اسے

دیکھئے گا۔

والسلام

بلقیس

اختر شیرانی کے نام بلقیس کے مکتوب کا عکس

جولائی ۴۷ء

محترمی تسلیم!

اتنے عرصے بعد آپ کا نوازش نامہ! یہی کہوں گی کہ "خدا ساز بات ہے۔"
میں ۲۰ جولائی کو کشمیر جا رہی ہوں۔ پکنگ میں بے طرح مصروف ہوں۔ اس لیے مفصل خط نہیں لکھ سکوں گی۔ ہمارا قیام سری نگر ہی میں ہوگا۔ آپ مجھے خط معرفت پوسٹ ماسٹر سری نگر لکھیے گا۔ دیکھیے بھول نہ جایئے گا۔ میں کشمیر کے اونچے گھنے چناروں کی اوٹ سے جھانکنے والی ہر حسین صبح کو آپ کے خط کا انتظار کیا کروں گی۔ کس قدر لطیف ہوگی وہ لذتِ انتظار!
آج کل، میں "یاد" دیکھی۔ بڑی حسین ہے اور سال نامہ 'نیرنگ خیال' کی "عیادت"، بھی غضب کی ہے۔ جسے پڑھ کر ہر دل میں بیمار پڑ جانے کی خواہش جاگ اٹھتی ہے۔
"آج احساس ہوا دل کو علالت کیا ہے" کیسا درد بھرا مصرع ہے۔
اور "کیا خبر بے خبروں کو کہ یہ لذت کیا ہے" واقعی بے خبروں کو کیا خبر! لاہور سے احمد ندیم قاسمی اور نذیر احمد کی ادارت میں رسالہ 'سویرا' کا اجرا ہو رہا ہے۔ آپ بھی اس میں لکھا کیجیے نا۔

والسلام
بلقیس

محترمی تسلیم!

معلوم ہوا ہے ----- ماہ حال کو دہلی ریڈیو سٹیشن سے ایک مشاعرہ براڈ کاسٹ ہو رہا ہے۔ آپ ضرور شرکت کیجیے گا۔ از حد تاکید ہے۔ آپ کے کے پہلے خط کا مفصل جواب پھر لکھوں گی۔ ''ادب لطیف'' والی نظم کا انتظار ہے۔ اب تک نہیں ملی۔ مجھے دفتر ''ادب لطیف'' کا پتہ بھی یاد نہیں ہے۔ ورنہ خود ہی ----- وہ پرچہ منگانے کی کوشش کرتی۔ آپ مجھے اس دفتر کا پتہ ضرور لکھیے گا۔

کہیے آپ کے ''پائیں باغ'' کا آج کل کیا حال ہے؟ اور ''شملہ'' کیا ہے؟

والسلام

بلقیس

----

94 J Block,
Model Town
Lahore

MODEL
INDIA POSTAGE

جناب اختر شیرانی صاحب
مہندی باغ - ٹونک راج

TONK RAJ

TONK RAJ
DELY
21 AUG 46
8 — A.M.

۱۷/اگست ۱۹۴۶ء

محترمی اختر صاحب۔ تسلیمات!

گرامی نامہ ملا۔ معاف کیجیے ملفوف جواب کی بجائے کارڈ لکھ رہا ہوں۔ وہ یہ کہ لفافہ دستیاب نہیں ہو سکا اور جواب فی الفور دینا ضروری ہے۔

میں نیکس یا جزیہ یا اسے جو کچھ بھی آپ فرمائیں فوراً دینے کو تیار ہوں۔ بشرطیکہ کچھ سوجھ بوجھ میں آئے۔ انشاء اللہ جلد ہی کوئی چیز لکھ کر بھیج دوں گا۔

الفت ابھی تک اپنی ''گلابی دنیا'' میں مگن ہے۔ اُسے مردہ تصور فرمائیے اور پھر زندوں کی محفل میں مُردوں کا کیا دخل؟

والسلام

دفتر ماہنامہ ہم لوگ
بلاک نمبر ۱۸ سرگودھا

جناب اختر صاحب! سلام خلوص

آپ کو یہ سنکر خوشی ہوگی۔ کہ میں نے سرگودھا سے
رسالہ جاری کیا ہے۔ اُمید ہے کہ آپ اپنی پہلی
فرصت میں اپنا تازہ ترین کلام بھجوا کر
الطاف و قدر کا ثبوت دینگے۔ کیا کبھی سرگودھا
تشریف نہیں لائینگے۔ قبلہ محترم حکیم
نیر واسطی صاحب کی خدمت میں سلام عرض
ہے۔ جواب کا بیتابی سے منتظر ہوں۔

آپ کا مخلص

پاکستان
POST CARD
ADDRESS ONLY
INDIA POSTAGE

بخدمت گرامی ادیب الملک حضرت اختر شیرانی
بوساطت حکیم سید علی احمد صاحب نیر واسطی
بیرون مستی گیٹ
لاہور

دفتر ماہنامہ ''ہملوگ''
بلاک نمبر 18 سرگودہا

جناب اختر صاحب! سلام خلوص

آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی۔ کہ میں نے سرگودہا سے رسالہ جاری کیا ہے۔ اُمید ہے کہ آپ اپنی پہلی فرصت میں اپنا تازہ ترین کلام بھجوا کر الطاف نوازی کا ثبوت دیں گے۔ کیا کبھی سرگودہا تشریف نہیں لائیں گے۔ قبلۂ محترم حکیم نیر واسطی صاحب کی خدمت میں سلام عرض ہے۔ جواب کا بے تابی سے منتظر ہوں۔

آپ کا مخلص
15/6 الطاف مشہدی

حضرت اختر

سلام نیاز!

سب سے پہلے تو اس بات کا اظہار ضروری ہے آپ کے صحیح سلامت لاہور آ جانے کا پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ کیونکہ اختر ایسے رنگ اور دور کا ترجمان ہے جو آج بھی ہماری مضمحل اور بیمار زندگی کو چند لمحوں کے لیے .... خوابوں سے ہمکنار کر دیتا ہے۔

سنگ میل ایک دور افتادہ سرزمین کی ترقی پسند اور نئی قدروں کی طرف پہلی کروٹ ہے۔

اس کا پہلا شمارہ ہم جولائی میں پیش کر رہے ہیں۔ اس کے لیے اپنی پہلی فرصت میں کوئی غیر مطبوعہ غزل ارسال فرما کر ممنون فرمائیں۔

حکیم صاحب کی خدمت میں ہدیۂ نیاز۔

مخلص

فارغ بخاری

پاکستان
POST CARD
ADDRESS ONLY
TONK

Tonk Raj
Akhtar Sherani

کراچی

۱۰ر مارچ ۱۹۴۸ء

بھائی اختر ہدیہ سلامِ کیف ونشاط !

ایک قدسی صاحب ہیں ان سے ہر روز پوچھتا ہوں کہ اختر کا کوئی اتا پتہ بتاؤ۔ وہ کمبخت زندہ ہے یا یکتا کی طرح چل بسا !

معلوم نہیں احباب کہاں گئے -----؟

میں چار پانچ مہینے سے کراچی میں ہوں۔

روز نامہ انجام اور قومی گزٹ میں کام کر رہا ہوں ۔ یہ خط ''بارش'' میں لکھ رہا ہوں۔ آپ تو ''صحرا'' میں ہیں ----- بلکہ ''ریگستان'' میں ----- کیا یہ سچ ہے؟ ----- آپ کا مجید لاہوری ؟

خدا جانے یکتا کہاں ہے؟ فساد کے دنوں میں گوجرانوالے تھا۔ آپ خوشتر کو خط لکھیے۔ شاید اُس سے معلوم ہو سکے؟

کراچی تین روپے پانچ آنے نو پائی قسم کا شہر ہے۔ یعنی کاروباری ----- اس ''اجڑے دیار میں دل نہیں لگتا-----؟ لیکن کیا کہیے۔ سانس لے رہے ہیں۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ جی رہے ہیں۔

آج بارش میں آپ یاد آگئے۔ کہیے ان دنوں کیا مشغلہ ہے؟

مجید

کرول راج - راجپوتانہ

6-3-1948

بھائی اختر -- سلام و شوق

پیام زبانی ملا۔ شکریہ۔ آپ کا کیا بگڑتا ہے جو دو لفظ خیریت کے تحریر کر دیا کریں۔ میری تسلی ہو جایا کرے گی۔ ابھی طبیعت بہلتی نظر نہیں آتی۔ کوئی صورت آشنا نظر نہیں آتا۔ مجید لاہوری لق لق، عدم، سالک، الطاف مشیری، منظور لائل پوری اور آپ بہت یاد آتے ہیں۔ جانے وہ زمانے کہاں گئے، کبھی لوٹ کے آئیں گے یا نہیں۔ پھر ایک آپ ہی نزدیک ہیں۔ مگر آپ ہیں کہ ٹونک سے نکلنے کا نام نہیں لیتے۔ میں آ نہیں سکتا۔ نوکر آدمی ہوں۔ رخصت ملنی مشکل ہے۔ نئی ملازمت ہے۔

بقول غالب :

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دُعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھی نوکر نہیں ہوں میں

جواب کا طالب۔

دیسراج یکتا
ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ

سورج
روزنامہ ''ڈان'' (اُردو)
کراچی

محترم اختر صاحب

ہدیہ سلام و نیاز۔!!

امید کہ آپ کے مزاج گرامی بخیر ہوں گے اور یہ اُمید ہے کہ مجھے فراموش نہ کر دیا ہوگا۔
بہت دل چاہتا ہے کہ ملا جائے مگر لاہور تک آنے میں جیب اجازت نہیں دیتی آپ تو جانتے ہیں کہ ہم دونوں جیب کے معاملے میں پورے کامریڈ واقعہ ہوئے ہیں کیا اچھا ہوتا کہ آپ کراچی آتے، یہ دیکھیے مظفر کاظمی صاحب کشمیر فنڈ کے لیے ایک بڑا مشاعرہ کر رہے ہیں جس میں لاہور کے تمام چوٹی کے ادیب بھی شریک ہوں گے، آپ کے نام دعوت نامہ معہ سفر خرچ جا رہا اور اخراجات کا بار یہاں سے پورا ہو جائے گا، آپ ضرور آیئے آپ کا ایک پرستار نہیں دو اور یعنی جوہر اور سالک بھی موجود ہیں اور عوامی جنگ اور کشمیر کے غریبوں پر ڈوگرا مظالم ختم کر دینے کے لیے جو آواز اٹھائی جا رہی ہے اُس میں حصہ لیجیے۔ ''ساقی اُٹھ تلوار اُٹھا'' کس نے کہا تھا؟

منتظر دید آپ کا مخلص
قمر ہاشمی ٹونکی

کشمیر ریلیف ویک

KASHMIR RELIEF WEEK

Under the auspices of

Red Crescent Society Of Pakistan

In Co-operation with

All Pakistan Muslim Youths Convention

2-Adam Mansion,
Lawrence Road,

Karachi 1. 9. 1948.

جناب محترم! سلام مسنون

آل پاکستان مسلم یوتھ کنونشن کے اشتراک کے ساتھ ستمبر ۴۸ء کے آخری ہفتہ میں انجمن ہلال احمر پاکستان ہفتۂ "آزاد کشمیر" منا رہی ہے۔ اسی سلسلہ میں ۱۵ ستمبر ۴۸ء کو ایک کل پاکستان مشاعرہ زیرِ صدارت چوہدری غلام عباس صدر آزاد کشمیر حکومت منعقد ہوگا۔ مشاعرہ کی تمام آمدنی کشمیر ریلیف فنڈ میں دے دی جائے گی۔

پاکستان کے نوجوان پورے خلوص اور اعتماد کے ساتھ آپ کی خدمت میں درخواست کرتے ہیں کہ آپ اس مشاعرہ میں شرکت فرمائیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ مایوس نہ کریں گے۔ آپ کی شرکت مشاعرہ کی کامیابی کی ضمانت ہوگی اور مشاعرہ کی کامیابی مجاہدینِ کشمیر کی مدد کا ایک وسیلہ۔

اختر شاعرِ رومان سہی مگر اس نے حریۂ زمانہ کا ساتھ دیا ہے۔ مشرق کے افق پر اس نے خونیں بادلوں کو دیکھ کر ساقی کو مشورہ دیا تھا یا حکم دیا

اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

آج کشمیری عوام اپنی آزادی کی خاطر آزادی کے پرچم کو لئے دنیا کی سب سے بڑی [illegible] فاشسٹ حکومت کے خلاف

کشمیر ریلیف ویک

KASHMIR RELIEF WEEK

Under the auspices of

Red Crescent Society Of Pakistan

In Co-operation with

All Pakistan Muslim Youths Convention

2-Aslam Manzion,
Lawrence Road,

Karachi ______________

جہاد کر رہے ہیں — آپ کو یقیناً ان کے ساتھ ہمدردی ہوگی
اور ان کی مدد کا جذبہ آپ کے دل میں ہوگا ——— ایسے ہی
[illegible] آپ خود تشریف لائیں گے - اشارتاً ہم اتنا
عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ اخراجاتِ سفر کا بار آپ پر نہیں ڈالا جائے گا
اور ہم اس خدمت کو بہ خلوص انجام دیں گے

ہفتۂ آزاد کشمیر کے سلسلہ میں کشمیر کے متعلق
نظموں کا ایک مجموعہ بھی ہم شائع کر رہے ہیں جس کی آمدنی
کشمیر ریلیف فنڈ میں دی جائے گی ——— آخر میں یہ درخواست بھی ہے
کہ اس مجموعہ کے لئے اولین فرصت میں ایک نظم مرحمت فرما دیں
— غالباً ثاقب صاحب کا پوسٹ کارڈ آپ کو مل گیا ہوگا - ساتھ ہی ساتھ
یہ عرض کرنا ہے کہ بہ موقعہ جو آپ کے مخلص اور دیرینہ دوست
حضرت ثاقب کانپوری میرے والد ہیں

مخلص

سید ابوالخیر کشفی

حضرت اختر شیرانی

لاہور

ڈاکٹر خورشید رضوی، لاہور

اختر شیرانی — چند اوجھل زاویے

آپ بھولے تو نہ ہوں گے مجھ کو
آپ کا اختر شیرانی ہوں

اختر شیرانی کے اپنے دور میں تو اس شعر کا ایک ہی جواب ہو سکتا تھا۔ اور وہ یہ ''کہ آپ کو کون بھول سکتا ہے۔'' وہ ایک طویل عرصے تک غیر منقسم ہندوستان میں شاعرانہ ہر دلعزیزی کی علامت بنے رہے۔ اُن کے اشعار نہ صرف گرلز ہاسٹلوں کی فضاؤں میں گنگنائے اور عشقیہ خطوط میں لکھے جاتے تھے، بلکہ موقّر و مستند ادبی حلقوں میں بھی اُن کا بڑا نام اور مقام تھا۔ فیضؔ اور راشدؔ جیسے اُٹھتے ہوئے شعراء نے جو آگے چل کر نہایت قد آور ثابت ہوئے، اپنے ادبی سفر کے آغاز میں اختر شیرانی سے آشیر بادلی اور اُن کے اسلوب سے اثر قبول کیا۔

اختر شیرانی کی طبیعت میں بلاشبہ رومانیت کا وفور تھا اور اُن کی عشقیہ شاعری کی برجستگی و بے ساختگی نوخیز دلوں میں اتر جانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ تاہم اُن کا محض ''شاعرِ رُومان'' کی حیثیت سے پہچانا جانا، ایک ادھورا تعارف ہے جو اُن کی شخصیت کی گوناگونی کے ساتھ انصاف نہیں کرتا۔

''غم خوردنم نہفتہ و مے خوردن آشکار'' کے مصداق، دنیا کی نظر صرف اُن کے شغل بادہ و ساغر پر ہی رہی۔ اُن کے مضبوط عقائد بھرپور عقیدتیں، بلند آدرش، ملّی آرزوئیں، علمی صلاحتیں اور فنی اختراع و تنوّع کے پہلو ظاہر بین نگاہوں سے اوجھل رہے۔ اس عاجلانہ سی تحریر میں تفصیلی تجزیے کی تو گنجائش نہیں تاہم چند سرسری اشارات ضرور کیے جا سکتے ہیں۔

اختر شیرانی عملاً رندِ خراب حال ہی سہی، اُن کے عقائد راسخ اور عقیدتیں عمیق تھیں۔ یہاں کسی زمانے کا پڑھا ہوا یہ واقعہ یاد آتا ہے کہ اختر ایک روز جام بدست نگینہ بیکری میں بیٹھے تھے کہ ایک کمیونسٹ نوجوان نے اُن سے رسولؐ پاک کے بارے میں سوال کر ڈالا۔ اختر نے گلاس اُس کے سر پر توڑ دیا اور کہا کہ میں تمہارے خبثِ باطن کو خوب سمجھتا ہوں۔ تم نے سوچا کہ یہ نشے

میں ہے کچھ اول فول بک دے گا مگر میں اتنا بھی بے ہوش نہیں۔ اخترؔ کے نعتیہ کلام میں حسنِ عقیدت کی یہی سرشاری جھلکتی ہے۔

لٹائے سجدے نہ کیوں آسماں مدینے میں
رسولؐ پاک کا ہے آستاں مدینے میں
درِ رسولؐ کے ذرّوں کی گر تلاش نہیں
تو کس کو ڈھونڈتی ہے کہکشاں مدینے میں
قدم اُٹھائے ادب سے ذرا نسیم سحر
ہیں محوِ خواب شہِ دو جہاں مدینے میں

زبان چپ ہوگئی جب دل نے چھیڑا تذکرہ اُن کا
دلوں کو وجد آیا جب زباں پر اُنؐ کا نام آیا
مزا جب ہے کہ جائیں خُلد میں ہم اِس طرح اخترؔ
کہیں حوریں محمدؐ کا وہ مستانہ غلام آیا

مئے افرنگ میں باقی نہ رہا کوئی سُرور
ہم نے جس دن سے چکھی ہے مئے مینائے حجاز
بھر کے دامن میں غریبوں کی دعائیں لے جا
اے نسیم سحرائے بادیہ پیمائے حجاز
خاکِ یثرب کے ہر اک ذرّے سے آتی ہے صدا
اخترِ خاک نشیں، ناصیہ فرسائے حجاز

اختر شیرانی کے عمومی رومانی تعارف کے زیرِ اثر بیشتر قارئین کے لیے ''اسلام کا شکوہ مسلمانوں سے'' اور ''عورت اور پردہ'' جیسی نظمیں یکسر غیر متوقع ہوں گی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اخترؔ کے یہ قومی و ملّی جذبات بھی اتنے ہی حقیقی ہیں جتنی اُن کی رومانی سرشاری۔ اوّل الذکر نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اے مسلماں! تیری وہ دیرینہ عظمت کیا ہوئی
وہ حمیت ، وہ دلیری ، وہ شجاعت کیا ہوئی
کُفر زارِ ہند کا تجھ پر اثر کیوں ہو گیا
وہ عرب والوں کی اسلامی صداقت کیا ہوئی

دجلہ و نیل آج تک ہیں جس کے غم میں اشکبار
وہ خلافت کیا ہوئی وہ اُس کی سطوت کیا ہوئی
اُٹھ رہا کر دل کو خوابِ عیش کی زنجیر سے
گونج اُٹھیں پھر فضائیں نعرہ تکبیر سے

دوسری مختصر سی نظم ''عورت اور پردہ'' بانگِ درا کے ابتدائی دور کا اسلوب لیے ہوئے ہے:

پردہِ برگِ گلِ تر میں ہے نگہت پنہاں
دل انساں میں ہے جذبِ محبت پنہاں
ظلمتِ بحر میں ہے گوہرِ رنگیں مستور
پردہِ قبر میں ہے چشمہِ شیریں مستور
حسنِ فطرت ہے گلستان کی بہاروں میں نہاں
نغمہِ روح فزا ساز کے تاروں میں نہاں
لعل پنہاں ہے اگر کان کے گنجینے میں
برقِ رخشاں ہے نہاں ابر کے آئینے میں
جب ہر اک طرفہ لطافت ہے نہاں پردے میں
پھر بُرا کیا ہے جو عورت ہے نہاں پردے میں

یہ اخلاقی و اصلاحی رُخ اختر کے ہاں بار بار نمود کرتا ہے اور بقولِ ن۔م۔راشد:

''میرے ایک دوست نے اختر کی نظموں ''انجام ہستی'' اور ''شہرِ دل کی ویرانی'' کو دیکھ کر کہا تھا کہ ''ہوس و گناہ کے خلاف جنگ تو اِس جوان شاعر کو بوڑھا بنا رہی ہے''

(کلیاتِ اختر شیرانی ص ۱۷۴)

اختر کے اپنے ہاتھ مصروفِ جام و مِنیا ہی سہی مگر اُن کے تخیّل میں شمشیر اُٹھانے کی حسرت برابر زندہ رہتی ہے۔ ایک فارسی نظم میں جوانِ افغانی کی آرزو بیان کرتے ہوئے۔ (جو اُن کی اپنی آرزو کی بھی آئینہ دار ہے) کہتے ہیں:

من شیرِ نوجوانم و میدانم آرزوست
افغانم و شجاعتِ افغانم آرزوست
با ساقی و مغنّی و دلبر مراچہ کار
تیغ و تفنگ و خنجرِ بُرّانم آرزوست

اس طرح نظم ''دعوتِ جہاد'' میں فرماتے ہیں:

مسندِ عیش سے اُٹھ ، منزلِ پُرخار میں آ
بزمِ جم چھوڑ کے بزمِ رسن و دار میں آ
تابکے بندگیِ ساغر و مینا اختر
اب تو اللہ کے بندے صفِ احرار میں آ

اختر محض شاعر ہی نہ تھے بلکہ ایک محقق باپ کے بیٹے ہونے کے ناطے، علمی مزاج بھی رکھتے تھے۔ حافظ محمد شیرانی کے لیے اختر کی مے نوشی اور لاابالیانہ طرزِ حیات شکستِ خواب اور شکستِ دل کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اختر سے مکمل طور پر قطع تعلق کر لیا تھا۔ تاہم بیٹے کی علمی استعداد اُن کی نظر میں بھی تھی۔ شنید ہے کہ گاہے گاہے کاغذ کے ایک پُرزے پر کوئی تحقیق طلب نکتہ لکھ کر بھجوا دیتے تھے اور اختر سب کام چھوڑ کر مختلف کتابوں سے مواد تلاش کر کے اُن کی خدمت میں ارسال کرتے تھے۔ ''مجموعۂ نغز'' کی تبییض تو شاید باپ بیٹے کے مقاطعے سے پہلے کی بات ہوگی۔ اس کے پیش لفظ کے آخر میں حافظ صاحب نے یہ جملہ لکھا ہے:

''برخورداری اختر شیرانی کتاب کی نقل کا ذمہ دار ہے۔''

ایک تحقیقی متن کی نقل کی ذمہ داری اختر پر ڈالنا بہرحال حافظ صاحب کے اعتماد کی دلیل ہے مگر اُس وقت بھی شاید کچھ غبار دل میں تھا کہ ایک جملے سے زیادہ کا مستحق نہ سمجھا اور جملہ بھی ایسا کہ اعتبار سے ممکنہ فروگذاشتوں کی الابلا اختر کے سر ڈالنے کے مترادف ہے۔

اختر شیرانی نے خود بھی علمی موضوعات پر قلم اُٹھایا مگر اُن کی یہ کاوشیں طاقِ نسیاں کی زینت ہو چکی ہیں۔ ضرورت ہے کہ اُن کی علمی تحریروں کو یکجا کر کے اشاعت کا اہتمام کیا جائے۔ مقامِ مسرّت ہے کہ اُن کے قلم سے عوفی کی "جوامع الحکایات ولوامع الروایات" کا فارسی سے اردو ترجمہ انجمن ترقی اردو پاکستان سے دو جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ اختر صاحب نے ''تعارف'' کے زیرِ عنوان جو پیش لفظ تحریر کیا ہے وہ اُن کی غیر معمولی علمی و تحقیقی استعداد کا بیّن ثبوت ہے اور خود حافظ محمود شیرانی صاحب کے تحقیقی اسلوب کی یاد تازہ کرتا ہے۔

اختر شیرانی فارسی زبان کے باقاعدہ فارغ التحصیل تھے اور فارسی نظم و نثر کا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ اُن کے کلام میں بعض فارسی منظومات اُن کی قدرتِ کلام کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ نظم ''فتح کابل'' سہل ممتنع کے درجے کو پہنچتی ہے۔ اس کا یہ بند زمانۂ طالب علمی سے میرے ذہن میں گونجتا چلا آیا ہے:

اس غیب آمد یک مردِ سنگی
افرشتہ پیکر باروح جنگی
از سطوتِ او دل چاک زنگی

دز ہیبتِ او لرزاں فرنگی
ضرغام پُر دل شیرِ دلاور
اللہ اکبر
اللہ اکبر

اختر کی شاعری میں ہیئت کا تنوع لائقِ توجہ ہے۔ انھوں نے نظم، غزل، گیت، دوہے، ماہیے، مستزاد، ترکیب بند، ترجیع بند اور سانیٹ سب اصناف میں طبع آزمائی کی اور جدید اسالیب کے لیے راہ ہموار کی۔ نظم ''تیتری'' میں جو ایک مستزاد ہے۔ اُن کا اسلوب اور امیجری اُن کے زمانے سے آگے کی ہے جس سے جدید تر ذہنوں نے فنی اثر قبول کیا:

یہ تیتری ہے یا کوئی رنگِ پریدہ ہے
بوئے چکیدہ ہے
آغوشِ گل میں یا کوئی نقش دمیدہ ہے
عکسِ کشیدہ ہے
اُٹھے تو ایک بوسۂ رقصیدہ سامنے
پاشیدہ سامنے
بیٹھے تو ایک لذت خوابیدہ سامنے
دامن کشیدہ ہے

یہی کیفیت ''لارنس باغ میں ایک چاندنی رات'' کی ہے:

چاندنی سے بن گئیں نیلی فضائیں بحرِ نور
کہکشاں موجوں کا کف
قصر میں بے انتہا موتی ہیں غلطاں بے صدف
دُور و نزد و نزد و دُور
آرہی ہے سطح پر (سوئے زمیں) آبی پری
زہرہ گوں اُس کی جبیں

اختر کے ہاں امیجری کا یہ حُسن شعوری تجربے سے نہیں بلکہ داخلی واردات اور صداقت احساس سے پھوٹتا ہے اور روایتی مضامین میں بھی تازگی کا ایک کوندا لپکا دیتا ہے:

شبِ وصل کی بے خودی چھا رہی ہے
کہو تو ستاروں کی شمعیں بجھا دیں

آہ یہ زُلف ہے یا ابرِ سرِ میخانہ
آہ یہ آنکھ ہے یا جامِ شراب آلودہ

رُخِ صبح پہ گیسوئے مشکبو کا ہجوم
فرشتے جانبِ افلاک پر اُٹھائے ہوئے

سنہرے پانی میں چاندی سے پاؤں لٹکائے
شفق نے تم کو سرِ جوئبار دیکھا ہے

جمیل یوسف، کوہ مری، پاکستان

چند لمحے اختر شیرانی کے ساتھ

عجیب بات ہے اختر شیرانی نے یہ اشعار آج سے تقریباً 75 سال پہلے کہے تھے مگر لگتا ہے یہ آج کے مظلوم اور بے بس انسان کے دل کی آواز ہیں۔ یہ مظلوم اور بے بس انسان، ایک طرف امریکہ جیسی اندھی اور حیوانی طاقت کی دہشت گردی اور جارحیت کا شکار ہے دوسری طرف خود اس کے اپنے وطن میں چور، ڈاکو، قاتل اور ہوس پرست اس کے جسم کی بوٹیاں نوچ رہے ہیں۔ اختر شیرانی کی نظم ''اے عشق کہیں لے چل'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اے عشق کہیں لے چل اس پاپ کی بستی سے
نفرت گہِ عالم سے، لعنت گہِ ہستی سے
اِن نفس پرستوں سے، اس نفس پرستی سے

دور اور کہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

یہ درد بھری دنیا بستی ہے گناہوں کی
دل چاک امیدوں کی سفاک نگاہوں کی
ظلموں کی جفاؤں کی آہوں کی، کراہوں کی

ہیں غم سے حزیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

اک ایسی جگہ جس میں انسان نہ بستے ہوں
یہ مکر و جفا پیشہ حیوان نہ بستے ہوں
انساں کی قبا میں یہ شیطان نہ بستے ہوں

تو خوف نہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

اک ایسی فضا جس تک غم کی نہ رسائی ہو
دنیا کی ہوا جس میں صدیوں سے نہ آئی ہو
اے عشق جہاں تو ہو اور تیری خدائی ہو

اے عشق وہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

اے عشق ہمیں لے چل اک نور کی وادی میں
اک خواب کی دنیا میں اک طور کی وادی میں
حوروں کے خیالاتِ مسرور کی وادی میں

تاخلدِ بریں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

آنکھوں میں سمائی ہے اک خواب نما دُنیا
تاروں کی طرح روشن مہتاب نما دنیا
جنت کی طرح رنگیں شاداب نما دنیا

لِلّٰہ وہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

قدرت ہو حمایت پر، ہمدرد ہو قسمت بھی
سلمٰی بھی ہو پہلو میں، سلمٰی کی محبت بھی
ہر شے سے فراغت ہو اور تیری عنایت بھی

اے طفلِ حسیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

جب سلمٰی سے اختر شیرانی کا عشق کامیاب نہ ہوسکا تو عشق اور سلمٰی دونوں اس کی شعری دنیا میں محبت مسرت انسان دوستی اور امن و آشتی کا استعارہ بن گئے۔ اس استعارے سے اختر شیرانی نے ایک ایسی مثالی دنیا تخلیق کی ہے۔ جس میں داخل ہوتے ہی ہم دنیا کی مصیبتوں اور زندگی کی تلخیوں سے نجات حاصل کر لیتے ہیں اور وہ جنت جس کے خواب ہر مذہب نے انسان کو دکھائے ہیں ایک حقیقت بن کر ہماری آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ ہم اپنے آپ کو ایک ایسی فضا میں پاتے ہیں

جہاں زندگی مسرت و شادمانی کے جھولے جھلا رہی ہے۔ ہر طرف نغمے ہی نغمے ہیں۔ سارا ماحول ایک وجد آفریں غنائیت میں ڈوبا ہوا ہے۔ جہاں دور دور تک غم و اندوہ کا نام و نشان تک نہیں۔ جہاں انسان صرف مستقبل کے سنہرے خواب ہی نہیں دیکھتا بلکہ اُسے اپنا ماضی بھی حسین لگتا ہے۔ عہد حاضر کے مقابلے میں انسان کا ماضی یقیناً امن و سکون اور مسرت و طمانیت کا گہوارہ تھا۔ اس وقت بستیوں پر بم نہیں گرائے جاتے تھے۔ کارپٹ بمباری کے الفاظ سے انسان کے کان نا آشنا تھے۔ جنگ کے شعلے صرف میدان جنگ تک محدود ہوتے تھے۔ اغوا برائے تاوان اور گینگ ریپ جیسے الفاظ سے لوگ آگاہ نہ تھے۔ روزمرہ کی لغت ان الفاظ سے خالی تھی۔ انسان اتنا بے بس، مجبور، نہتا اور مظلوم کبھی نہ تھا۔ جبر تھا مگر اتنا وحشی اور اندھا نہ تھا۔ ماضی کی سادہ اور دیہاتی زندگی میں بڑی عافیت تھی۔ ایسی صورت حال میں اختر شیرانی کی مشہور نظم ''او دیس سے آنے والے بتا'' میں لفظ دیس ایک نئی معنویت اختیار کر لیتا ہے:

او دیس سے آنے والے بتا　　کس حال میں ہیں یارانِ وطن
آوارۂ غربت کو بھی سنا　　کس رنگ میں ہیں کنعانِ وطن
وہ باغ وطن فردوسِ وطن　　وہ سروِ وطن ریحانِ وطن

او دیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی وہاں کے پنگھٹ پر　　پنہاریاں پانی بھرتی ہیں
انگڑائی کا نقشہ بن بن کر　　سر اپنے یہ گاگر دھرتی ہیں
اور اپنے گھروں کو جاتے ہوئے　　ہنستی ہوئی چُہلیں کرتی ہیں

او دیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی فضا کے دامن میں　　برکھا کے سے لہراتے ہیں
کیا اب بھی کنارِ دریا پر　　طوفان کے جھونکے آتے ہیں
کیا اب بھی اندھیری راتوں میں　　ملاح ترانے گاتے ہیں

او دیس سے آنے والے بتا

کیا شام کو اب بھی جاتے ہیں　　احباب کنارِ دریا پر
وہ پیڑ گھنیرے اب بھی ہیں　　شاداب، کنار دریا پر
اور پیار سے آ کر جھانکتا ہے　　مہتاب، کنار دریا پر

او دیس سے آنے والے بتا

کیا پہلی سی ہے معصوم ابھی　　وہ مدرسے کی شاداب فضا
کچھ بھولے ہوئے دن گزرے ہیں　　جس میں وہ مثالِ خواب فضا
وہ کھیل وہ ہم سن وہ میداں　　وہ خوابگہِ مہتاب فضا
او دیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی گجردم چرواہے　　ریوڑ کو چرانے جاتے ہیں
اور شام کے دھندلے سایوں کے　　ہمراہ گھروں کو آتے ہیں
اور اپنی رسیلی بانسریوں میں　　اُلفت کے نغمے گاتے ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

کیا ہم کو وطن کے باغوں کی　　مستانہ فضائیں بھول گئیں
برکھا کی بہاریں بھول گئیں　　ساون کی گھٹائیں بھول گئیں
دریا کے کنارے بھول گئے　　جنگل کی ہوائیں بھول گئیں
او دیس سے آنے والے بتا

اختر شیرانی ایک نئی دنیا کے خواب دیکھتا ہے۔ نئی دنیا جو اس کے شاعرانہ تخیل میں آباد ہے۔ جہاں کسی قسم کی برائی یا کجی کا گزر نہیں۔ جہاں محبت ہی محبت ہے۔ نغمگی ہی نغمگی ہے۔ حُسن ہی حُسن ہے۔ وہ اپنی نظم ''سرزمینِ عشق'' میں اسی خیالی دنیا کا نقشہ کھینچتا ہے:

اک سرزمینِ عشق ہے

ہنگامۂ عالم سے دُور، آفت گہِ ہستی سے دُور
اس مکر کی دُنیا سے دُور، اس ظلم کی بستی سے دُور
اس رات اس دن سے الگ اس اوج اس پستی سے دُور

دُور از زمین و آسماں
اک سرزمینِ عشق ہے

اس کے گلستاں پُرفضا اس کی بہاریں دلنشیں
اس کی زمینیں خوشنما اس کی فضائیں مرمریں
اس کے نظارے دل کُشا اس کی ہوائیں عنبریں

مثلِ بہشتِ گل فشاں
اک سرزمینِ عشق ہے

اگرچہ یہ اختر شیرانی کی خیالی سرزمینِ عشق ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر کوئی واقعی کسی کے عشق میں مبتلا ہو اور عشق روایتی طور پر ناکام و نامراد نہ ہو تو وہ اپنے آپ کو اس سرزمینِ عشق میں پائے گا۔ دنیا میں ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے آپ کو دُنیا سے الگ تھلگ کسی اور ہی دُنیا میں محسوس کرے گا۔ اختر خواب و خیال کی جس وادی میں اپنی سلمیٰ کا انتظار کرتا ہے۔ وہ اسی سرزمینِ عشق کی وادی ہے، جو اس کی اپنی تخلیق کردہ ہے:

بہار و کیف کی بدلی اتر آئے گی وادی میں
سرور و نور کا کوثر چھڑک جائے گی وادی میں
نسیم بادیہ منظر کو مہکائے گی وادی میں
شباب و حسن کی بجلی سی لہرائے گی وادی میں
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

ابھی سے جاؤں اور وادی کے نظاروں سے کہہ آؤں
بچھا دیں فرشِ گل وادی میں گلزاروں سے کہہ آؤں
چھڑک دیں مستیاں پھولوں کی، مہکاروں سے کہہ آؤں
کہ سلمیٰ، میری سلمیٰ نور برسائے گی وادی میں
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

بہارِ وادیٔ رنگیں کو یہ مژدہ سُنا آؤں
زمیں کو نکہتِ گل ہائے رعنا سے بسا آؤں
اور اس پر نازنیں کلیوں کا اِک بستر بچھا آؤں
کہ وہ نازک بدن ہے اور تھک جائے گی وادی میں
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

مرے آغوش میں ہوگا وہ جسم مرمریں اس کا
وہ اس کے کاکلِ مشکیں وہ روئے نازنیں اس کا
وہ رُخسارِ حسیں اُس کے وہ حسنِ یاسمیں اس کا
وہ جس سے شوق کی دنیا کو مہکائے گی وادی میں
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

تمنا و حیا کی کشمکش کیسے مٹاؤں گا
میں اس کے یاسمیں پیکر کو کیسے گد گداؤں گا
اور اس کے لعلِ لب سے کس طرح بوسے چراؤں گا
وہ پھولوں اور ستاروں سے بھی شرمائے گی وادی میں
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

آپ نے محسوس کیا ہوگا جس احترام اور محبت سے اختر شیرانی نے اپنی محبوبہ کا ذکر کیا ہے اور شاعر کے دل میں اپنی محبوبہ کے لیے جس طرح کے لطیف اور نازک جذبات ہیں۔ اُردو شاعری کی عام روایت اس سے بالکل مختلف ہے محبوب سے جو برتاؤ اردو شاعروں نے کیا ہے اور ان کے ساتھ جو عموی روّیہ اختیار کیے رکھا ہے اس کی مثال تو غالب کے اس شعر سے دی جا سکتی ہے:

عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے

یا

کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

اس نوع کے اشعار، شاعر اور اس کے محبوب کے مابین جس طرح کے تعلق کا پتہ دیتے ہیں اس میں عشق کی کیفیت کم اور بازاری پن زیادہ ہے۔ اس بازاری پن میں وہ ادب اور احترام کسی اور ہی دُنیا کی چیز لگتا ہے جس کا اظہار میر نے اپنے اس شعر میں کیا ہے:

دُور بیٹھا غبارِ میر اُن سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

میر کا عشق بھی اپنی محبوبہ کو حاصل کرنے میں اسی طرح ناکام رہا تھا جس طرح اختر شیرانی کی سلمیٰ سے محبت ناکام و نامراد رہی۔ یہ دونوں شاعر وصل یار سے محروم رہے۔ دُور سے ہی اپنی محبوبہ کے حسن کے جلوے دیکھتے رہے۔ وہ بھی زیادہ تر شاعرانہ تصور کے سہارے۔ یعنی محض خواب و خیال میں۔ اس لیے ان دونوں کے ہاں اپنی محبوبہ کے حسن و جمال کے بیان میں احساس کی وہ نزاکت اور بیان کی وہ لطافت پائی جاتی ہے جس کا تعلق حقیقت سے زیادہ خواب و خیال سے ہے۔ میر نے کہا تھا:

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اِک گلاب کی سی ہے

اختر شیرانی بھی اپنی محبوبہ کے پیکر کی تصویر کشی میں اظہار و بیان کی ساری لطافتیں سمو دیتا ہے:

بہارِ حسن کا تو غنچۂ شاداب ہے سلمٰی
تجھے فطرت نے اپنے دست رنگیں سے سنوارا ہے
بہشتِ رنگ و بو کا تُو سراپا اک نظارہ ہے
تری صورت سراسر پیکرِ مہتاب ہے سلمٰی
شبستانِ جوانی کا تو اک زندہ ستارا ہے
تو اس دنیا میں بحرِ حسن فطرت کا کنارا ہے
تو اس سنسار میں اک آسمانی خواب ہے سلمٰی

جہانِ قدس کا تو ایک فردوسی فسانہ ہے
تجھے مصرِ جمال و ناز کی اک ساحرہ کہیئے
صنم آبادِ عفت کی مقدس کافرہ کہیئے
رباب حسن کا تو ایک الہامی ترانہ ہے
پرستانِ لطافت کی تو اک رنگیں کہانی ہے
جواں فطرت کا تو اک گمشدہ خوابِ جوانی ہے

محبوبہ کے حسن و جمال کے بیان میں شاید اُردو کی کوئی نظم اختر شیرانی کی اس نظم کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ سلمٰی کے بارے میں ہر نظم سلمٰی کے حسن و جمال کی دلفریبیوں اور اس کے بدن کی نزاکتوں اور لطافتوں کے تذکرے سے مہک رہی ہے۔ حسن و شباب کی تصویر کشی جس خوبی اور حسن کاری سے اختر شیرانی نے اپنی نظموں میں کی ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ میر کے ناکام عشق کا تجربہ بھی اگرچہ اختر کے تجربے سے ملتا جلتا ہے مگر اختر کی طرح میر اس ناکامی کا مداوا خواب و خیال کی وادیوں میں نہیں ڈھونڈتا اسی لیے اس کے ہاں محبوبہ کے جسمانی اور ملکوتی حسن کا بیان بہت کم ہے:

نازکی اس کے لب کی کیا کہیئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

جیسے اشعار اس کے ہاں ڈھونڈے سے نہیں ملتے۔ یہ شعر گویا اپنی مثال آپ ہے۔ جبکہ اختر

کی شاعری محبوبہ کے حسن و جمال کی تصویروں کا ایک دلکش مرقع ہے۔ جہاں بظاہر حسن کی تصویر کشی کا کوئی پہلو نہیں نکلتا وہاں بھی اختر شیرانی اس لذت میں ڈوب جاتا ہے۔ ایک نظم جس کا عنوان ہے۔ ''سلام کے جواب میں'' ملاحظہ ہو:

سلام اس پہ کہ جس نے سلام بھیجا ہے
نگاہِ ناز کا رنگیں پیام بھیجا ہے
سلام اس پہ کہ گر اس کی مدح ناز کروں
ذرا سی عمر کو میں حشر تک دراز کروں
مہ و ستارہ کا پیکر رُخِ حسیں اُس کا
بہار و نور کا بت جسمِ مرمریں اُس کا
وہ گلبدن کہ اگر سیرِ گل کو آ جائے
غرورِ گل کی نزاکت کا سب مٹا جائے
شمیمِ زلف سے سو جنتیں مہک جائیں
نگاہِ مست سے میخانے تک بہک جائیں
وہ زلفِ تیرہ کہ دن ہو تو رات ہو جائے
سیاہ آنکھوں میں کل کائنات ہو جائے
وہ شوخ آنکھیں، جہاں بجلیاں مچلتی ہیں
وہ نظریں جن سے جواں مستیاں اُبلتی ہیں
شفق سے، گُل سے، سمن سے بنے ہوئے عارض
بہارِ باغِ عدن سے بنے ہوئے عارض
وہ لعلِ لب کہ جنہیں آرزوئیں پیار کریں
بہشتیں غنچوں کی شادابیاں نثار کریں
خرامِ ناز کہ موجِ نسیم رُک جائے
ادائے شوخ کہ قدموں پہ زہرہ جھک جائے

اختر شیرانی کے ہاں شاعرانہ اظہار کی جو لطافت اور نزاکت ہے وہ اس کی شاعری کا وصفِ خاص ہے۔ حُسن کی تعریف و توصیف تو اس کی شاعری میں ہے ہی مگر اس کا اسلوب اور اس کا الفاظ و تراکیب کا انتخاب اور ان کا ماہرانہ استعمال اس کے ہر اچھے شعر کو خود ایک حسن پارہ بنا دیتا ہے، ایک ایسا

حسن جو اپنی لطافت اور نزاکت سے قاری اور سامع کا دل موہ لیتا ہے۔ اس کے بیان میں کہیں کوئی ناہمواری اور کھردراپن نہیں۔ اس کی شیریں بیانی ذہن و دل میں حلاوت گھولتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے شعریت کی ساری مٹھاس اس کے لفظ و بیان میں در آئی ہے۔ اردو شاعری میں اختر شیرانی کے بعد فیض احمد فیض میں اسی شیرینی اور مٹھاس کا ذائقہ محسوس ہوتا ہے۔ شاید اس لیے کہ ان دونوں شاعروں نے حافظ شیرازی سے کسب فیض کیا ہے۔ حافظ شیرازی کی شیریں سخنی اور جادو بیانی ان شعراء میں اپنا جلوہ دکھاتی نظر آتی ہے۔ فیض نے تو اپنے بعض مصرعے پورے کے پورے حافظ کی تراکیب سے بنے ہیں جیسے، شاہِ شمشاد قداں، خسروِ شیریں دہناں۔ فیض کے ہاں فارسی تراکیب زیادہ ہیں۔ اس کے مقابلے میں اختر شیرانی اُردو محاورے کے زیادہ قریب رہتا ہے مگر اپنے شعروں میں وہی مٹھاس اور رس گھول دیتا ہے جو حافظ کی عطا ہے۔ اختر شیرانی کی ایک اور نظم کلیاں اپنی نزاکتِ بیان کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ اس میں وہی نزاکت اور لطافت ہے جو کلیوں اور پھولوں میں ہوتی ہے:

نہ پھولوں کی تمنا ہے نہ گل دستوں کی حسرت ہے
مجھے تو کچھ انہی بیمار کلیوں سے محبت ہے
ابھی الٹا نہیں بادِ بہاری نے نقاب اُن کا
ابھی محفوظ ہے اک خلوتِ رنگیں میں خواب اُن کا
ابھی سرمستیوں میں رات دن سونے کی عادت ہے
مجھے تو کچھ انہی بیمار کلیوں سے محبت ہے
ہوا میں جھولتے رہتے ہیں ہر دم آشیاں اُن کے
ہیں دو دو، پتیوں کی گود میں قائم مکاں اُن کے
مکاں یا آشیاں جو کچھ بھی ہے نکہت ہی نکہت ہے
مجھے تو کچھ انہی بیمار کلیوں سے محبت ہے
کوئی دوشیزہ جب آغوشِ بیماری میں سوتی ہے
تو صحت سے کہیں بڑھ کر حسیں معلوم ہوتی ہے
یونہی پھولوں میں اور کلیوں میں بھی فرقِ لطافت ہے
مجھے تو کچھ انہی بیمار کلیوں سے محبت ہے
کوئی چھو لے اگر اِن کو تو یہ کمہلا کے رہ جائیں
حیا میں اس قدر ڈوبیں کہ بس مرجھا کے رہ جائیں

ابھی الہڑپنے کے دن ہیں شرمانے کی عادت ہے
مجھے تو کچھ انہی بیمار کلیوں سے محبت ہے

....

مرا بس ہو تو اختر میں انہی کا رنگ ہو جاؤں
ہمیشہ کے لیے ان چمپئی پردوں میں سو جاؤں
مجھے ان کی رسیلی گود میں مرنے کی حسرت ہے
مجھے تو کچھ انہی بیمار کلیوں سے محبت ہے

خالص محبت اور عشق کے سادہ اور معصوم جذبات کا یہ اظہار ہماری آج کل کی شاعری میں بوجوہ مفقود ہو رہا ہے۔ آج کل تو ایک عام ہوس پرست دنیادار کی طرح شاعر بھی کہہ رہا ہے:

تو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

یا

اب تو مجھے بھی ترک تعلق کا دکھ نہیں
پر دل یہ چاہتا ہے کہ آغاز تو کرے

یا جیسا کہ مصطفیٰ زیدی نے اپنی محبوبہ شہناز کا ذکر کرتے ہوئے صرف اپنے مطلب کی بات کی ہے اور عورت کو محض اپنے استعمال کی چیز سمجھا ہے۔ اسے اپنے جیسا انسان نہیں سمجھا۔ اسی لیے ان شعراء کے کلام میں عورت کے لیے محبت اور احترام کے جذبات نہیں ہیں:

فن کار خود نہ تھی مرے فن کی شریک تھی
بستر کی ایک ایک شکن کی شریک تھی

اور پھر یہ اظہار بھی کس قدر غیر شاعرانہ ہے۔ ایک سچا عاشق اس طرح کے خیالات کا اظہار نہیں کرتا۔ اختر شیرانی کے جذبات واحساسات ایک ایسے عاشق کے جذبات واحساسات ہیں جس کے دل میں محبت کا سمندر موجزن ہے۔ وہ اپنے محبوب کے حسن و جمال پر اس قدر فریفتہ ہے اور اس کیفیت میں اس قدر گم ہے کہ اُسے دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں۔ اختر شیرانی کی شاعری میں عاشقِ زار کا وہی حال ہے جو ولیم شیکسپیئر کے ڈرامے رومیو جولیٹ میں رومیو کا ہے۔ یہ عشق ہماری زندگی کی ایک جیتی جاگتی حقیقت ہونے کے باوجود ہمیں ایک قسم کی ماورائی اور خوابناک دنیا میں لے جاتا ہے۔ نظم ''بستی کی لڑکیوں میں'' کے چند بند ملاحظہ ہوں:

اُس حوروش کے غم میں دنیا و دیں گنوا کر ہوش و حواس کھو کر، صبر و سکوں لٹا کر
بیٹھے بٹھائے دل میں غم کی خلش بسا کر
ہر چیز کو بھلا کر
سلمیٰ سے دل لگا کر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو گیا ہوں

....

پنگھٹ پہ جب وہ ساری ہوتی ہیں جمع آ کر
گاگر کو اپنی رکھ کر گھونگھٹ اُٹھا اُٹھا کر یہ قصہ چھیڑتی ہیں مجھ کو سُنا سُنا کر
سلمیٰ سے باتیں کرتے دیکھا ہے اس کو جا کر
ہم نے نظر بچا کر
سلمیٰ سے دل لگا کر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو گیا ہوں

....

تب راستے ہیں باہم وہ میری داستاں کو دُہرا کے چھیڑتی ہیں سلمیٰ کو میری جاں کو
اور وہ حیا کی ماری سی لیتی ہے زباں کو
کیا چھیڑے اس بیاں کو
سلمیٰ سے دل لگا کر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو گیا ہوں

....

اک شوخ چھیڑتی ہے اس طرح پاس آ کر
"دیکھو وہ جا رہی ہے سلمیٰ نظر بچا کر شرما کے مسکرا کر آنچل سے منہ چھپا کر۔
جاؤ نا پیچھے پیچھے، دو باتیں کر لو جا کر
کھیتوں میں چھپ چھپا کر
سلمیٰ سے دل لگا کر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو گیا ہوں

ان کی زباں پہ میری جتنی کہانیاں ہیں
کیا جانیں یہ کہ دل کی سب مہربانیاں ہیں کم سن ہیں بے خبر ہیں اٹھتی جوانیاں ہیں
کیا سمجھیں غم کے ہاتھوں کیوں سرگرانیاں ہیں
کیوں خوں فشانیاں ہیں
سلمیٰ سے دل لگا کر
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو گیا ہوں

کم سن، بے خبر اور اُٹھتی جوانیوں کی محبت کی یہ داستان اردو شاعری میں اختر شیرانی ہی کی عطا ہے۔ اُردو کے ایوانِ شعر میں مرد اور عورت کے مابین محبت کے جذبوں کے گیت سب سے پہلے اختر شیرانی ہی نے کھل کر اونچے سُروں میں گائے ہیں۔ ورنہ اس سے قبل تو عشق کا اظہار اردو شعراء کم و بیش اس طرح کرتے تھے:

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اُسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

اختر شیرانی کے ہاں کہیں کوئی بازاری پن نہیں کہیں چوما چاٹی کا رجحان نہیں۔ اس کے ہاں وہ شائستگی اور احترام ہے جو ایک سچے عاشق کے دل میں ہی ہو سکتا ہے۔ یہاں یہ ذکر کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ عورت کا جو احترام اور اس کی جو عزت اور وقار اختر شیرانی کی شاعری میں ہر جگہ موجود ہے۔ اس سے پہلے اردو شاعری میں کہیں نہیں ملتا۔ ایک نظم کا عنوان ہی عورت ہے:

کہیں وہ شعر کے پردے میں چھپ کر مسکراتی ہے
مصور کی نظر میں اس کی تصویریں پریشاں ہیں
ادب کی محفلوں میں اس کی تویریں پریشاں ہیں
مغنی کی صدا میں نغمہ بن کر جھلملاتی ہیں
نقابِ ساز میں آہنگ ہو کر تھرتھراتی ہیں
نقوشِ آب و گل میں اس کی تصویریں پریشاں ہیں
صنم سازوں کے دل میں اس کی تفسیریں پریشاں ہیں
حریمِ رنگ و بو میں نشہ بن کر لہلہاتی ہیں

سلمیٰ کے حسن و جمال اور اس کے دل نواز پیکر کی تصویر جن خوبصورت اور دلفریب رنگوں میں اختر شیرانی نے اپنی شاعری میں کھینچی ہے اس کا لفظ لفظ محبت اور احترام کے جذبات سے مملو ہے۔ اسی

سلسلے کی ایک اور نظم عذرا ملاحظہ ہو:

پری و حور کی تصویرِ نازنیں ، عذرا
شہید جلوۂ دیدار کر دیا تو نے
نظر کو محشرِ انوار کر دیا تو نے
بہار و خواب کی تنویرِ مر مریں، عذرا
شراب و شعر کی تفسیرِ دلنشیں عذرا
دل و دماغ کو سرشار کر دیا تو نے
شباب و عشق کو بیدار کر دیا تو نے
مری حسین، مری ناز آفریں عذرا

☆☆☆

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی

چہ دلاور یست دزدے......

ہفت روزہ ''لاہور'' (لاہور) کے ۲۶ جون ۲۰۰۴ء کے پرچے میں مرزا خلیل احمد قمر صاحب کا ایک مختصر مضمون بعنوان شاعر رومان...... اختر شیرانیس چھپا ہے جو میرے مرحوم والد اختر شیرانی کے بارے میں ہے۔ (۱) نام میں در آنے والی غلطی کتابت (کمپوزنگ) کا شاخسانہ معلوم ہوتی ہے۔ میں اس ہفتہ وار رسالے کا قاری نہیں ہوں۔ میرے ایک مہربان نے میری توجہ اس مضمون کی طرف مبذول کی جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ اس مختصر مضمون کا ایک چوتھائی حصہ تو اختر مرحوم کے مختصر سوانح حیات اور ان کے قلمی آثار کے نام درج کرنے پر صرف ہوا ہے اور باقی تین چوتھائی ڈاکٹر داؤد رہبر کے ایک مکتوب بنام ڈاکٹر اسلم فرخی (نوشتہ ۱۰ فروری ۱۹۸۹ء) کے طویل اقتباس پر مشتمل ہے جو داؤد رہبر صاحب کے مجموعہ مکاتیب ''سلام و پیام'' سے لیا گیا ہے۔ (۲)

مجھے اعتراف ہے کہ میں اس مجموعہ مکاتیب کی اشاعت سے بھی بے خبر تھا اس لیے جب میں نے یہ اقتباس پڑھا تو اس میں درج کردہ انکشاف پر میرا چونکنا فطری امر تھا۔ میں فن تحقیق کا طالب علم ہوں اور اس اعتبار سے حقائق کی جستجو اور واقعات کی صحت میرا پیشہ بھی ہے اور مشغلہ بھی۔ علاوہ ازیں رہبر صاحب نے اپنے مکتوب میں بزعم خود انکشاف کیے ہیں ان کی اصل حقیقت آشکار کرنا میرا فرض بھی بنتا ہے کہ معاملہ میرے والد کے بارے میں ایک بے رحمانہ غلط بیانی کا ہے۔

اہل علم جانتے ہیں کہ خالص جھوٹ کے مقابلے میں صداقت آمیز جھوٹ زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ بالخصوص جبکہ وہ ڈاکٹر داؤد رہبر جیسے تر دماغ شخص کے ذہن کی اختراع ہو۔ انھوں نے اس ''دروغ گویم برروی تو'' پر مبنی تحریر میں یہی طریقہ استعمال کیا ہے کہ اشخاص کے نام، مقام اور وقت تو درست معلوم ہوتے ہیں لیکن اس بنیاد پر جو داستان طرازی کی گئی ہے وہ تمام تر لغو اور حقیقت کے منافی ہے۔ داؤد رہبر صاحب کے فرمودات کا جائزہ لینے سے قبل مناسب ہوگا اگر

قارئین کی توجہ دو بنیادی باتوں کی طرف منعطف کرا دی جائے۔

پہلی بات تو یہ کہ اداکاروں اور کھلاڑیوں کی طرح شاعر اور ادیب بھی ایک طرح سے عوامی ملکیت ہو جاتے ہیں اور ان کے بارے میں لوگ اپنی پسند ناپسند کا کھل کر اظہار کرتے رہتے ہیں۔ جہاں تک فن پر تنقید کا تعلق ہے اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب مسلمہ واقعات کو قیاسات و مفروضات کی زد میں لا کر حقائق کا چہرہ مسخ کیا جانے لگے۔ زیادہ تر کم سواد لوگ وقتی محفل آرائی کی غرض سے اس قسم کے اشقلے چھوڑا کرتے ہیں۔ خطرے کی گھنٹی اس وقت بجتی ہے جب بظاہر پڑھے لکھے حضرات بغیر سوچے سمجھے (یا شاید سوچ سمجھ کر) بے سروپا باتیں تحریر میں لانے لگیں۔

دوسری بات یہ کہ ہمارا مجموعی مزاج واقعاتی تحقیق سے میل نہیں کھاتا۔ علامہ اقبال نے یہی گلہ کرتے ہوئے ہمارے بارے میں کہا تھا کہ......

تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا۔

چنانچہ ہم لوگ سنی سنائی باتوں پر نہ صرف یہ کہ فوراً ایمان لے آتے ہیں بلکہ افواہوں کو آگے بڑھانے اور پھیلانے میں لطف محسوس کرتے ہیں۔ یہ اس قوم کا حال ہے جس کے پیشوا ہادی برحقؐ نے بالالفاظ صریح فرمایا تھا کہ آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ سنی سنائی باتوں کو بغیر تصدیق و تحقیق کے آگے بیان کر دے۔

غلط فہمیاں اور مغالطے انسانی معلومات کے مغلوط ہونے کا ایک اہم سبب ہیں۔ اس ضمن میں یہاں ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ اکتوبر ۱۹۸۰ء میں حافظ محمود شیرانی کی صد سالہ تقریب ولادت کی مناسبت سے ہندوستان سے کچھ اہل علم لاہور آئے ہوئے تھے تین روزہ تقاریب سے فراغت پا کر ایک شام نامور محقق ڈاکٹر نذیر احمد (پروفیسر ایمریطس، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) ڈاکٹر امیر حسن عابدی (سابق صدر شعبہ فارسی، دہلی یونیورسٹی) اور آنجہانی ڈاکٹر حکم چند نیر (اس وقت صدر شعبہ اردو، ہندو یونیورسٹی، بنارس) بعض تحائف وغیرہ خریدنے کے لیے انارکلی بازار گئے۔ دو تین میزبان جن میں بھی شامل تھا۔ ان کے ساتھ تھے۔ انارکلی کی ایک گھریلو مصنوعات کی دکان پر کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے مالک کو ان لوگوں کی گفتگو سے کچھ خیال آیا اور وہ پوچھ بیٹھا کہ آپ لوگ کہاں سے اور کس سلسلے میں آئے ہیں؟ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے بتایا کہ ہم لوگ معروف محقق حافظ محمود شیرانی کی صد سالہ تقریبات ولادت کے سلسلے میں ہندوستان سے آئے ہیں۔ یہ بات اس شخص کے سر کے اوپر سے گزر گئی تو ڈاکٹر صاحب موصوف نے صراحت کرتے ہوئے کہا کہ حافظ محمود شرانی مشہور شاعر اختر شیرانی کے والد تھے۔ اس پر وہ شخص بول اٹھا ''اچھا اچھا! وہی اختر شیرانی جنھوں نے خودکشی کی تھی۔'' یہ سن کر ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے استعجابیہ انداز

میں میری طرف دیکھ کر کہا یہ کیا کہہ رہے ہیں!...... میں نے انھیں مختصر جواب دیا۔ ''اور کیجیے تحقیق'' وہ شخص اس جواب میں مضمر طنز کو کیا سمجھتا۔ اپنی بات پر بڑے وثوق سے اصرار کرتا رہا۔ بات صرف اتنی تھی کہ ایک بار کسی صاحب (غالباً شورش کاشمیری) نے اختر شیرانی پر اپنے ایک مضمون کی ابتدا ان الفاظ سے کی تھی۔ ''لوگ کہتے ہیں اختر مر گیا۔ میں کہتا ہوں اختر نے خودکشی کی۔'' ظاہر ہے کہ یہ اشارہ اختر کی بلانوشی کی طرف تھا۔ یہ مضمون کہیں اس نیم خواندہ شخص کی نظر سے گزرا تھا اور اس نے یہ بات پلے باندھ لی تھی۔

غلط فہمی سے کہیں زیادہ افسوس ناک بات کسی واقعہ کے راوی کی بدنیتی ہوتی ہے۔ اسی لیے تحقیقی جرح و تعدیل کے بنیادی اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ کسی راوی کی باتوں کو تسلیم کرنے سے قبل اس کی صدق نیت کا جائزہ لیا جاتا ہے وہ جس شخص کے بارے میں کوئی واقعہ بیان کر رہا ہے اسے اس شخص سے کوئی ذاتی پرخاش تو نہ تھی یا اپنے بیان کردہ واقعہ سے راوی کو کسی قسم کا فائدہ اٹھانا یا کسی نقصان یا بدنامی سے بچنا تو مقصود نہ تھا۔ یہ عمل اصطلاح میں منفی داخلی تنقید کہلاتا ہے۔

زیر بحث مضمون میں شامل داؤد رہبر صاحب کے مکتوب کے اقتباس میں ضمناً ڈاکٹر عاشق بٹالوی مرحوم کے ایک مضمون کا حوالہ بھی آیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اختر شیرانی کے بارے میں ان دونوں صاحبان کے بیانات منفی داخلی تنقید کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے۔

اختر شیرانی نے ۱۹۳۵ء میں اپنا ذاتی رسالہ ''رومان'' لاہور سے جاری کیا تھا جو ۱۸ فلیمنگ روڈ سے شائع ہوتا تھا۔ عاشق بٹالوی مرحوم کو انھوں نے اپنا معاون مدیر بنایا رسالے کا ڈیکلریشن ایک اور دوست کے نام سے لیا تھا۔ جب رسالہ چل نکلا تو اس ناشر دوست کی نیت میں فتور آ گیا اور اس نے رسالہ پر قبضہ جمانا چاہا۔ اس معاملے میں عاشق بٹالوی صاحب کی ہمدردی اور غالباً مشورہ بھی اس کو حاصل تھا۔ اختر کو عاشق صاحب کے اس رویہ سے صدمہ ہوا اور اس کا ذکر انھوں نے بعض دوستوں سے کیا۔ بالآخر ان کی جگہ خلیل احمد صاحب کو نائب مدیر مقرر کرنا پڑا۔ عاشق بٹالوی صاحب نے اس مخاصمت کا بالواسطہ اظہار اختر پر اپنے مضمون میں کیا جو ادبی دنیا لاہور کے خاص نمبر (دورہ پنجم، شمارہ اول) میں چھپا تھا اور بعد ازاں ان کی کتاب ''چند یادیں چند تاثرات'' میں شامل کیا گیا جس کا حوالہ ڈاکٹر داؤد رہبر نے اپنے خط میں دیا ہے۔ اس مضمون میں عاشق بٹالوی صاحب نے اختر سے اپنے اختلاف کی توجیہہ ایک نظم کی اشاعت سے کی ہے اور اپنے آپ کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے تحریک پاکستان کا سہارا لیا ہے تاہم عاشق صاحب اور ان کے مضمون پر بحث اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

ڈاکٹر داؤد رہبر صاحب کے والد پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال مرحوم کے حافظ محمود اختر شیرانی سے جو گہرے اخلاص مندانہ تعلقات تھے ان کا ذکر تحصیل حاصل ہے۔ [۳] ان مراسم کا اندازہ

پروفیسر اقبال صاحب کے حافظ صاحب پر مضمون (مطبوعہ اورینٹل کالج میگزین، اقبال نمبر) اور ان باپ بیٹوں کے نام حافظ محمود شیرانی کے خطوط سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ یہ خطوط پہلے اقبال نمبر (نومبر ۱۹۵۱ء) اور پھر مکاتیب حافظ محمود شیرانی (لاہور ۱۹۸۰ء) میں شائع ہوئے۔ حافظ صاحب کو اقبال صاحب کی اولاد بالخصوص داؤد رہبر صاحب سے بے پناہ محبت تھی اورہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے محمد داؤد (اختر شیرانی) پر محمد داؤد رہبر کو کھلی ترجیح دیتے تھے چنانچہ ایک بار جب داؤد رہبر صاحب نے حافظ صاحب سے ملنے ٹونک جانے کا ارادہ کیا اور ان سے ریلوں کے اوقات دریافت کیے تو اس کے جواب میں اقبال صاحب کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔ ''مجھے ریل گاڑی اور اس کے اوقات سے اب کوئی واسطہ نہیں رہا۔ اس شرابی سے اوقات ریل لکھوا کر بھیج رہا ہوں۔ اس داؤد اور اس داؤد میں کس قدر فرق ہے۔'' (نوشتہ ۱۵ اپریل ۱۹۵۴ء)

پروفیسر اقبال صاحب نے اپنے ایک خط میں اختر صاحب کے کلام کی مقبولیت کا تذکرہ کیا تھا۔ اس کا جواب ان الفاظ میں دیا گیا۔ ''داؤد کے نغمے اور گیت آپ کو اور ریڈیو کو مبارک ہوں۔ آپ تو ہمیں وہ داؤد دے دیجیے جو اورینٹل کالج میں ایم اے کی جماعت میں داخل ہے۔'' (نوشتہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء)

یقینی بات ہے کہ ان ترجیحات کے باعث داؤد رہبر صاحب کے ذہن میں اپنے ہم نام کے بالمقابل ایک زبردست احساس برتری پیدا ہو گیا تھا۔[۴] لیکن ایک اور قضیہ بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے جس کا تذکرہ نہ چاہنے کے باوجود مجھے یہاں کرنا پڑ رہا ہے۔

حافظ صاحب نے لاہور چھوڑنے سے پہلے اپنا کتب خانہ برائے نام قیمت پر پنجاب یونیورسٹی لائبریری کو دے دیا تھا۔ ان کا مسلمان حکمرانوں کے سونے اور چاندی کے سکوں پر مشتمل نادر مجموعہ کوشش کے باوجود لاہور میوزیم لینے پر آمادہ نہ ہوا اور یہ انھیں اپنے ساتھ ٹونک لے جانا پڑا۔ علاوہ ازیں ایک بڑی تعداد میں شاہی فرامین، اسناد و دستاویزات، خطاطی کے نمونے، مرقع ہائے تصاویر، وصلیاں اور تاریخی سنگی لوحیں و کتبات تھے جنھیں وہ معائنہ کی غرض سے یونیورسٹی لائبریری کی تحویل میں دے گئے تھے۔ بعد میں جب لائبریری نے ان اشیاء کی خرید سے معذوری ظاہر کی تو حافظ صاحب نے ایک خط میں اقبال صاحب سے درخواست کی کہ وہ یہ تمام اشیاء لائبریری سے وصول کر کے اپنے پاس امانت رکھ لیں۔ (نوشتہ ۱۴ دسمبر ۱۹۴۴ء)

اقبال صاحب غالباً اپنی دگرگوں صحت کے پیش نظر یہ ذمہ داری لینے پر بمشکل آمادہ ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں جب داؤد رہبر صاحب ٹونک جانے پر کمربستہ ہوئے تو اقبال صاحب یہ تمام اشیاء ان کے ساتھ بھیجنا چاہتے تھے لیکن حافظ صاحب نے لکھا کہ میں نہیں چاہتا کہ شیخ لدھے پھندے آئیں (نوشتہ ۱۵ اپریل ۱۹۴۵ء) پھر اقبال صاحب کے اصرار کے پیش نظر وہ اس بات پر

آمادہ ہوئے کہ خطاطی کے نمونے اور مرقع تصاویر اگر رہبر صاحب لاسکیں، لے آئیں۔ (ایضاً) لیکن داؤد رہبر صاحب ٹونک نہ جا سکے اور یوں وہ تمام نوادرات بدستور اقبال صاحب کی تحویل میں رہے۔ فروری ۱۹۴۶ء کے وسط میں حافظ صاحب کی وفات ہوئی۔ ۲۱ مئی ۱۹۴۸ء کو اقبال صاحب سفر آخرت پر روانہ ہوگئے۔

ایک طویل مدت گزرنے کے بعد غالباً سنہ ۱۹۷۲ء کے آخر میں حافظ صاحب کے ایک اور گہرے دوست پروفیسر محمد فضل الدین قریشی صاحب نے جو اس معاملے سے واقف تھے لاہور میں مجھ سے ان اشیاء کے بارے میں دریافت کیا۔ میں نے لاعلمی ظاہر کی تو وہ بولے کہ اقبال صاحب کے ایک فرزند شیخ محمد ایوب جو پہلے مشرقی پاکستان میں کاروبار کرتے تھے اب لاہور آگئے ہیں۔ میں ان سے ان امانت رکھے ہوئے نوادرات کے بارے میں دریافت کروں گا۔ کچھ عرصے بعد قریشی صاحب نے بتایا کہ میری شیخ محمد ایوب سے ملاقات ہوئی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ جب ہم نے اپنے والد کا ترکہ تقسیم کیا تو وہ امانت داؤد رہبر صاحب کی تحویل میں دے دی گئی تھی کیونکہ ہم سب بھائیوں میں وہی ایک علوم مشرقی کے شناسا اور ان چیزوں کی قدر و قیمت سے واقف تھے۔ بعد ازاں قریشی صاحب نے داؤد رہبر صاحب سے رابطہ کرنے پر زور دیا۔ میں نے پتہ نہ ہونے کا عذر کیا لیکن وہ اصرار کرتے رہے۔ بالاخر محبی ڈاکٹر وحید قریشی صاحب سے رہبر صاحب کا پتہ ملا جو ان دنوں ترکی (غالباً انقرہ یونیورسٹی) میں مقیم تھے۔ میں نے انھیں خط لکھا لیکن کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی۔ خدا جانے انھیں میرا عریضہ ملا بھی یا نہیں؟ بہرحال میں نے یہ قصہ حسب سابق فراموش کر دیا لیکن میرے بہنوئی خورشید احمد خاں یوسفی مرحوم ایسے معاملات میں بڑی پافشاری دکھاتے تھے۔ چنانچہ کئی برس بعد جب داؤد رہبر صاحب اتفاق سے لاہور آئے تو خورشید صاحب کو کسی ذریعہ سے ان کی آمد کی اطلاع مل گئی اور وہ ان سے جا کر ملے۔(۵) ان کے استفسار کا داؤد رہبر صاحب نے یہ مختصر جواب دیا کہ وہ تمام اشیاء میں نے بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کو دے دی تھیں۔ خورشید صاحب اس جواب سے مطمئن نہ تھے۔ بقول ان کے یہ ''حلوائی کی دکان پر دادا جی کا فاتحہ'' والا مضمون تھا بلکہ انھیں یقین تھا کہ یہ غلط بیانی محض جان چھڑانے کے لیے کی گئی ہے۔ خورشید صاحب نے کراچی میں مولوی عبدالحق مرحوم کے قریبی حلقوں سے بھی پوچھ تاچھ کی لیکن وہ بھی اس دادوستد سے لاعلم تھے۔

ان معروضات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ذیل میں داؤد رہبر صاحب کے بیان کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ ان کے بیان کا پہلا فقرہ ہی مغالطہ انگیز ہے۔ فرماتے ہیں۔

> جب باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو ایک روز اختر نے ماڈل ٹاؤن کا رخ کیا۔

اس جملے کے نصف اول کا نصف آخر سے کوئی تعلق نہیں ہے جب کہ رہبر صاحب ان کے مابین سبب و مسبب کا رشتہ بتا رہے ہیں۔ یہ بات خلاف واقعہ ہے کہ کیونکہ ٹونک میں حافظ صاحب کے انتقال (فروری ۱۹۴۶ء) کے بعد دو سال سے اوپر کا عرصہ گزرنے پر اختر صاحب لاہور آئے تھے۔ وہ غالباً ماہ اپریل یا زیادہ سے زیادہ مئی ۱۹۴۸ء کے آغاز میں اقبال صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے ہوں گے جن کی تاریخ وفات ۲۱ مئی ۱۹۴۸ء ہے۔ اختر صاحب پر ان دنوں اپنے اہل خانہ کو ٹونک سے لاہور بلانے کی دھن سوار تھی جس کے لیے انھیں پیسوں کی ضرورت ہوگی۔ یہ امر یقینی ہے کہ وہ اقبال صاحب سے متذکرہ بالا نوادرات کا مطالبہ کرنے گئے تھے گو رہبر صاحب نے اس بات کا اپنے مکتوب میں کوئی ذکر نہیں کیا۔ ادھر اقبال صاحب کو بخوبی علم تھا کہ حافظ صاحب نے بیٹے کی دنیاوی معاملات میں غیر ذمہ داری کے پیش نظر اپنا مسکوکات کا بیش بہا مجموعہ اپنی وفات سے چند ماہ قبل اونے پونے فروخت کر دیا تھا اور اس سے حاصل شدہ رقم اپنے پوتوں پوتیوں کے نام بنک میں جمع کرا دی تھی۔ لہٰذا اقبال صاحب نے اپنے پاس امانت رکھے ہوئے آثار عتیقہ کے ضیاع کے خدشہ سے اختر صاحب کی درخواست پر اعتنا نہیں کی جس کی طرف رہبر صاحب کے خط میں اشارہ موجود ہے (والد صاحب شروع سے آخر تک خاموش رہے)۔

ڈاکٹر داؤد رہبر کے چونکا دینے والے جملے ''اختر شیرانی کی وفات کے حالات کی ایک تفصیل ایسی مجھ تک پہنچی ہے کہ اختر کے شیدائیوں کو اس کا علم ہونا چاہیے'' سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ بڑے وثوق کے ساتھ ایک سربستہ راز کا انکشاف کر رہے ہیں حالانکہ یہ ایک صریح مغالطہ ہے جس کا شکار داؤد رہبر صاحب کے بڑے بھائی ڈاکٹر محمد اسحاق اپنے ''سدھائے ہوئے مددگار'' کے ہاتھوں ہوئے۔

رہبر صاحب نے علم الابدان کی عملی تشریح کے تعارف میں جو عبارت درج کی ہے یعنی۔

''استاد آزمودہ طریقوں سے بتدریج چیر چیر کر گوشت پوست، استخواں، رگ، ریشہ، دل، جگر، پتا، تلی، بھیجے، انتڑیوں، پٹھوں وغیرہ کی ساخت سمجھاتا ہے......الخ''

ان باتوں کا ہر پڑھے لکھے شخص کو علم ہے اس لیے ایک ایسے خط میں جو ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب جیسے صاحب علم کو لکھا جا رہا ہے اس طرح انسانی گوشت کی دکان سجانے کی چنداں ضرورت نہ تھی تاہم اس سے لکھنے والے کی ذہنیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ موصوف ایک طرف تو معاملہ کی نوعیت کو زیادہ سے زیادہ گمبھیر بنا کر پیش کرنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف یہ حرکت ان کی اذیت رسانی کی حس کو تسکین دیتی نظر آتی ہے۔ اسی تناظر میں ڈاکٹر فخر الدین کے کہے ہوئے الفاظ کو بھی ڈاکٹر داؤد رہبر کے اپنے دل کی آواز سمجھنا ہوگا۔

اختر صاحب کو ۳ ستمبر ۱۹۴۸ء کو میو ہسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ ان کی وفات سے ایک روز قبل حکیم نیر واسطی صاحب نے لاڑکانہ میں اختر کے اہل خانہ کو ان کی شدید علالت سے بذریعہ تار مطلع کر دیا تھا۔ یہ تار محکمہ ٹیلی گراف کی نا اہلی سے ہمیں ۹ ستمبر کو دوپہر سے قبل ملا۔ لاڑکانہ روہڑی ریلوے لائن سیلاب کی زد میں آ کر ٹوٹ چکی تھی۔ چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک مسافر گاڑی لاڑکانہ سے کوٹری جاتی تھی جو تار ملنے سے قبل نکل چکی تھی۔ مجبوراً ہم پانچ افراد (میں، چھوٹا بھائی، والدہ، دادی جان اور چچا جمیل الرحمٰن خان شیرانی۔ یہ جونا گڑھ میں ڈویژنل فارسٹ آفیسر تھے اور ریاست پر بھارتی قبضہ کے بعد ٹونک سے ہمارے خاندان کو ساتھ لے کر چند روز قبل ہی لاڑکانہ پہنچے تھے) دس ستمبر کی صبح دس بجے اسی واحد گاڑی سے بجائے شمال کے جنوب کی طرف روانہ ہوئے۔ ۹ ستمبر کی شام کو دیا گیا والد کی وفات کا اطلاعی تار اگلے روز ہمارے روانہ ہونے کے بعد لاڑکانہ پہنچا تھا۔ کوٹری جنکشن پر ریڈیو پاکستان کی خبروں کے ذریعہ ہمیں اختر صاحب کے انتقال کا پتہ چلا۔ وہاں سے ہم نے پاکستان میل (موجودہ خیبر میل) پکڑی اور ۱۱ ستمبر کو بعد از غروب آفتاب لاہور پہنچے۔

ہم لوگوں کے انتظار میں اختر کے جسد خاکی ۹ ستمبر کی شام ہی کو میو ہسپتال کے ائیر کنڈیشنڈ مردہ خانے میں بطور امانت رکھوا دیا گیا جو ۱۲ ستمبر کی صبح تک وہاں رہا۔ داؤد رہبر صاحب نے جو واقعہ بیان کیا ہے وہ ۱۰ ستمبر کی صبح کو رونما ہوا ہوگا جب ڈاکٹر اسحاق صاحب تدریسی فرائض انجام دینے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج پہنچے ہوں گے۔ ان کے جس مددگار نے ان کو ایک نئی میت کی اطلاع دی اس کی ڈیوٹی بھی صبح کی ہوگی۔ بالفاظ دیگر اس سے پہلے روز شام کو اختر کی میت امانت رکھتے وقت وہ شخص موجود نہ تھا اسی لیے صبح کے وقت وہ اختر کے جسد خاکی کو بھی لاوارث نعش سمجھا اور فی الفور ڈاکٹر اسحاق صاحب کو اطلاع دی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ شخص، جس کو داؤد رہبر صاحب اختر کا شیدائی بتا رہے ہیں اس بات سے کیسے بے خبر رہا کہ اس کا پسندیدہ شاعر گزشتہ ایک ہفتے سے اسی ہسپتال میں موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے جبکہ اس کی علالت کی اطلاعات لاہور کے اخباروں میں برابر شائع ہو رہی تھیں یا پھر یہ ماننا پڑے گا کہ وہ شخص جاہل مطلق تھا اور اسے محض لاوارث لاشوں کے ایک شکاری کی حیثیت حاصل تھی۔ لیکن اس صورت میں وہ اختر کی نعش کو پہچاننے کے قابل نہ ہوسکتا تھا۔ ساتھ ہی یہ بدگمانی بھی سر اٹھاتی ہے کہ داؤد رہبر صاحب اس درجہ کے شخص کو اختر کی شاعری کا دلدادہ یا دوسرے الفاظ میں اختر شیرانی کا کلام پسند کرنے والوں کو نہایت پست طبقہ سے تعلق رکھنے والا بتا کر اپنی انا کی تسکین کر رہے ہیں۔

۱۰ ستمبر کی صبح کو شائع ہونے والے لاہور کے اخبارات (یاد رہے کہ اس زمانے میں اخبارات پر ایک روز بعد کی تاریخ ڈالی جاتی تھی) میں اختر کی وفات کی اطلاع پہلے صفحات پر سیاہ

حاشیوں کے ساتھ نمایاں انداز میں چھپی تھی۔ ساتھ ہی ان کے اہل خانہ کی لاڑکانہ سے آمد اور اس انتظار میں لاش کو امانت رکھنے کی اطلاعات بھی درج تھیں۔ حکیم نیر واسطی مرحوم نے ان دنوں کے اخبارات کا ایک پلندا ہماری لاہور سے واپسی پر ہمیں دیا تھا جن میں سے کچھ بحالت خستہ اب بھی میرے پاس موجود ہیں۔ ان میں امروز، احسان اور آزاد کے پرچے شامل ہیں۔

فرض کیجیے کہ ڈاکٹر اسحاق صاحب کو اخبار بینی کی فرصت نہ تھی تو کیا داؤد رہبر صاحب اخبارات کو درخور اعتنا نہ سمجھتے تھے ورنہ آخر کیا وجہ ہے کہ وہ اپنے والد کے عزیز ترین دوست اور اپنے مشفق و مہربان کے فرزند نیز اپنے ہمنام جو کچھ ایسا گمنام بھی نہ تھا کی علالت اور وفات کی خبروں سے مطلع نہ ہو سکے۔ بالفرض داؤد رہبر صاحب ان دنوں لاہور میں موجود نہ تھے تو بعد میں مختلف ذرائع سے انھیں اختر کی وفات اور علالت کی کچھ نہ کچھ تفصیلات کا علم تو ہوا ہوگا پھر کیا وجہ ہے کہ وہ اس واقعہ پر چالیس برس سے اوپر کا عرصہ گزر جانے کے بعد اپنے برادر بزرگ کی ایک غلط فہمی کی بنا پر بیان کردہ قصے کو ایک نجی خط میں امر واقعہ کے طور پر بیان کر رہے ہیں چنانچہ ارشاد ہوا ہے۔ لاش شہر میں کسی سڑک پر پائی گئی تھی پولیس نے تانگے میں رکھ کر مردہ خانے پہنچائی تھی۔

چلئے ایک لمحے کے لیے فرض کر لیجیے کہ رہبر صاحب صحیح فرما رہے ہیں۔ دنیا میں ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے وقت مرگ اختر صاحب کی کسی سڑک پر موجودگی ضروری ہے۔ ادھر واقعات میں اس امر کی گنجائش مطلق نہیں نکلتی۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا انھیں ۳ ستمبر کو تقریباً بے ہوشی کے عالم میں ہسپتال پہنچایا گیا جہاں وہ ۹ ستمبر کی سہ پہر تک موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا رہے ان تاریخوں کے بعض اخبارات میں ہسپتال کے بستر پر بے خبر لیٹے ہوئے ان کے فوٹو بھی چھپے ہوئے موجود ہیں اس اثناء میں جن ڈاکٹروں کے وہ زیر علاج رہے ان کے نام بھی رپورٹ ہوئے ہیں یعنی ڈاکٹر پیرزادہ، ڈاکٹر بشیر اختر، ڈاکٹر بلوچ، ڈاکٹر امتیاز اور ڈاکٹر کرنل ضیاء اللہ۔ ممکن تھا کہ وہ ۸ اور ۹ ستمبر کی درمیانی رات کو کسی وقت ہسپتال کے ماحول سے گھبرا کر نکل کھڑے ہوتے اور کسی سڑک پر حادثہ کا شکار ہو جاتے یا طبعی موت مر جاتے۔ تاہم اس بات کا ایک فی صد امکان بھی نہیں کیونکہ اس عرصے میں وہ بے ہوشی یا نیم بے ہوشی کے عالم میں رہے۔

ہسپتال میں موت سے ہم کنار ہونے کے بعد ۹ ستمبر کی شام کو ان کی نعش سرد خانے میں امانت رکھوائی گئی اور رہبر صاحب ہمیں بتا رہے ہیں کہ ۱۰ ستمبر کی صبح ان کی لاش کسی سڑک پر پائی گئی تھی جسے پولیس اٹھا کر ہسپتال کے مردہ خانے لائی۔ یہ تو ڈاکٹر اسحاق کی مہربانی تھی جنھوں نے ایک امانت رکھی ہوئی نعش کو اپنے سینئر ڈاکٹر فخر الدین کے دندان آز سے نجات دلائی اور پھر اپنے مرحوم شفیق بزرگ حافظ محمود شیرانی کے پسماندگان کی جستجو کرنی پڑی۔ اب ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ انھیں (بلکہ ان کے برخودار ڈاکٹر داؤد رہبر صاحب کو) اختر کے ورثا ملے بھی تو کہاں، شیخوپورہ شہر میں

جس سے اس وقت تک ہم لوگوں کا کوئی واسطہ ہی نہ تھا۔ فضل الرحمٰن خاں صاحب حافظ محمود شیرانی کے بھانجے ضرور تھے لیکن وہ شیخوپورہ میں کبھی نہیں رہے۔ اختر صاحب کی وفات کے دنوں میں وہ لاڑکانہ میں مقیم تھے اور جمیل الرحمٰن خاں صاحب جن کے ساتھ ہم اس موقع پر لاڑکانہ سے لاہور پہنچے تھے انہی کے چھوٹے بھائی تھے لیکن داؤد رہبر صاحب بھی کیا کریں؟ انھیں ہمارے عزیزوں میں سے صرف فضل الرحمٰن صاحب ہی کا نام آتا تھا کیونکہ ادارہ معارف اسلامیہ لاہور وغیرہ کی منعقد کردہ اسلامی آثار کی نمائشوں کے موقعوں پر دادا جان انھیں گورداس پور وغیرہ مقامات سے جہاں وہ گورنمنٹ ہائی سکولوں میں او۔ٹی۔ ٹیچر ہوا کرتے تھے اپنی اعانت کے لیے طلب کر لیا کرتے تھے۔ ایسے موقع پر پروفیسر صاحب اور ان کا ہاتھ بٹانے کے لیے ان کے فرزند اقبال حضرت داؤد رہبر بھی موجود ہوتے تھے چنانچہ خانہ پری کے لیے فضل الرحمٰن صاحب ہی کا نام ان کو یاد آیا۔(٦) اور شیخوپورہ شہر کا نام لینے کا سبب یہ ہوا کہ اسلم فرخی صاحب کے نام یہ خط لکھنے سے قبل داؤد رہبر صاحب کی خورشید یوسفی صاحب سے ملاقات ہو چکی تھی جس کا حوالہ اوپر گزر چکا ہے اور خورشید صاحب ان کو بتا چکے تھے کہ اختر مرحوم کے ورثا شیخوپورہ میں رہتے ہیں۔

ذرا اس زحمت کا اندازہ کیجیے جو اختر کے پسماندگان کی تلاش میں داؤد رہبر صاحب اور ان کے برادر بزرگ کو اپنی بے پناہ مصروفیات چھوڑ کر اٹھانی پڑی ہوگی گو یہ ان کی خود اختیار کردہ اور غیر ضروری تھی کیونکہ ۱۰ اور ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کے قریب قریب تمام اخبارات میں بالفاظ مختلف یہ خبر موجود ہے کہ اختر کے ورثاء لاڑکانہ سے آ رہے ہیں اور ان کے لاہور پہنچنے کے بعد اختر کی تدفین عمل میں لائی جائے گی۔ مثال کے طور پر ۱۰ ستمبر کی صبح شائع ہونے والے روزنامہ "احسان" کے صفحہ اول پر اختر کی وفات کی خبر کے ضمن میں یہ اطلاع بدیں الفاظ درج ہے۔

"یہاں لاہور میں اختر کے اعزہ و اقرباء میں سے کوئی نہ تھا۔ ان کی والدہ محترمہ کو جو لاڑکانہ (سندھ) آئی ہوئی تھیں بذریعہ تار ان کی بیماری کی اطلاع دی گئی۔ شاعر رومان کی والدہ محترمہ پرسوں تک لاہور پہنچ رہی ہیں چنانچہ اختر صاحب کی تجہیز و تکفین کا پروگرام ان کی والدہ صاحبہ کی آمد تک ملتوی کر دیا گیا ہے نعش بڑی حفاظت کے ساتھ میو ہسپتال کے سرد خانے میں رکھ دی گئی ہے۔"

اور اسی اخبارات کی ۱۲ ستمبر کی اشاعت میں جس کے پورے پہلے صفحہ پر قائداعظم کی رحلت کی خبر جلی حروف میں درج ہے پچھلے صفحہ پر سیاہ حاشیے میں "حضرت اختر شیرانی کا جنازہ آج صبح نو بجے اٹھایا جائے گا" کے عنوان کے تحت خبر کا آغاز بدیں الفاظ ہوتا ہے حضرت اختر شیرانی کی بیگم صاحبہ اور ان کی والدہ تشریف لے آئی ہیں اس لیے تجہیز و تکفین کی آخری رسوم آج صبح نو بجے انجام دی جائیں گی...... لیکن رہبر صاحب کو ان تمام اطلاعات و اعلانات سے کوئی سروکار

نہیں۔ ظاہر ہے کہ اختر کے حقیقی ورثاء سے ملنا ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ اقبال صاحب کے انتقال کو صرف ساڑھے تین ماہ گزرے تھے۔ اختر کے وارثوں اور عزیزوں سے ملاقات کے موقع پر کوئی واقف حال شخص ان سے ان کے والد کے پاس رکھوائی ہوئی امانت کا تقاضا کر سکتا تھا۔ ان کا یہ خدشہ بے جا بھی نہ تھا کیونکہ جمیل الرحمٰن خاں صاحب ان تمام حالات سے نہ صرف واقف تھے بلکہ نہایت معقول اور بے حد صاف گو واقع ہوئے تھے۔

اب اس معمہ کا حل باقی رہ جاتا ہے کہ آخر وہ کون لوگ تھے جو بقول داؤد رہبر ڈاکٹر اسحاق صاحب کی اطلاع پر دو دن کے اندر اندر شیخوپورہ سے آ کر اختر کی میت لے گئے۔ یہ تو آسمان سے گرا اور کھجور میں اٹکا والا مضمون ہوا کہ ڈاکٹر اسحاق صاحب نے ڈاکٹر فخر الدین کے پنجوں سے لاش چھڑا کر کچھ جعلی وارثان کے حوالے کر دی داؤد رہبر صاحب اس بارے میں بھی ہماری رہبری نہیں کرتے کہ آخر یہ لاش شیخوپورہ میں دفن کی گئی یا لاہور میں؟

اس تمام بحث و تمحیص کا ماحصل یہ ہے کہ ڈاکٹر داؤد رہبر صاحب نہ صرف اپنے والد کے پاس امانت رکھی ہوئی اشیاء کو لاوارث قرار دے کر ان پر متصرف ہوئے بلکہ اپنے اس فعل کی پردہ پوشی کی خاطر انھوں نے اس امانت کے اصل حقدار کی ہسپتال میں امانت رکھی ہوئی لاش کو بھی لاوارث ثابت کرنے کی جسارت کی۔

یک زندہ دل نرفت سلامت زعیب جو
تا معاملہ بہ خضر علیہ السلام رفت

☆......☆......☆

حواشی

۱۔ ملاحظہ ہو ضمیمہ نمبر ۱۔

۲۔ دیکھیے مکتوب داؤد رہبر بنام ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب مشمولہ ''سلام و پیام'' سنگ میل پبلیکیشنز لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ص ۳۸۲-۳۸۶۔

۳۔ اس بارے میں داؤد رہبر صاحب اپنے محولہ بالا مکتوب (بنام ڈاکٹر اسلم فرخی) میں لکھتے ہیں۔
''لاہور سے حافظ محمود شیرانی کی محبت کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۴۱ء میں ریٹائر ہوئے تو کنبے کو ٹونک بھیج دیا اور خود ماڈل ٹاؤن میں ہمارے ہاں آ مقیم ہوئے۔ گرمیوں کے تین مہینے جون، جولائی اور اگست انھوں نے یہاں گزارے فردوسی پر چار مقالے تنقید شعر العجم اور پرتھوی راج راسا ان تینوں کی پروف خوانی انھوں نے یہیں ماڈل ٹاؤن میں کی۔ اس شغل کے اوقات میں اکثر مجھے پاس

بٹھایا کرتے۔ ٹونک سے برابر پیغام آ رہے تھے کہ متعلقین منتظر ہیں لیکن لاہور کو چھوڑنے کے خیال سے شیرانی صاحب پر وحشت سوار ہو جاتی تھی۔......" (سلام و پیام، ص ۳۸۳)

رہبر صاحب کو مغالطہ ہوا ہے۔ شیرانی صاحب مع اہل خانہ ۶ اگست ۱۹۴۱ء کو لاہور سے ٹونک روانہ ہو گئے تھے۔ اس سال آخر اکتوبر سے آخر دسمبر تک انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کے دفتر میں مولوی عبدالحق صاحب کے پاس رہ کر اپنے بعض سلسلہ ہائے مضامین کو کتابی صورت دیتے رہے۔ سردی کے شدت پکڑنے پر ٹونک چلے گئے اور جون ۱۹۴۲ء میں پھر دہلی آئے۔ دس دن وہاں مقیم رہ کر اور پہلی دو کتابوں کے پروف ساتھ لے کر (پرتھی راج راسا کی طباعت ابھی شروع نہیں ہوئی تھی) لاہور آئے تھے اور کوئی دو ماہ تک پروفیسر اقبال کے ہاں قیام کیا تھا۔ گویا یہ ۱۹۴۲ء کا واقعہ ہے۔

- یہ حقیقت ہے کہ اختر شیرانی مرحوم کا نام آتے ہی رہبر صاحب کا یہ نفسیاتی مرض عود کر آتا ہے۔ اگر آپ ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کے نام ان کے خط کی ابتداء کے یہ الفاظ پیش نظر رکھیں۔ "جب میں رخصت ہونے کو اٹھا تو آپ نے فرمایا کہ تمھارا نام یعنی داؤد، اختر شیرانی کے نام پر رکھا گیا تھا۔ یہ سن کر مسرت کے ساتھ حیرت بھی ہوئی کہ آپ کی واقفیت کیونکر تہہ تک پہنچی۔" (سلام و پیام، ص ۳۸۳) تو اختر کی میت کے بارے میں رہبر صاحب کے پروپیگنڈا کی اصل وجہ معلوم ہو جاتی ہے۔ اس کی ایک تازہ مثال ان کی حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب "تسلیمات" (سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور ۲۰۰۴ء) میں شامل ایک مضمون ہے۔ جو انھوں نے اختر شیرانی کے جوامع الحکایات عوفی کی منتخب حکایات کے اردو ترجمے پر بطور تبصرہ لکھا ہے۔ اس کا عنوان ہے۔ "اختر شیرانی کا ایک کارِ ثواب" جو بذاتِ خود ہجوِ ملیح کا حکم رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اختر صاحب کا کیا ہوا یہ ترجمہ اتنا معیاری اور مثالی ہے کہ اسے اعجاز کہا جا سکتا ہے۔ مولوی عبدالحق کو کوئی علمی ادبی کام مشکل سے پسند آتا تھا لیکن وہ بھی اس ترجمے کی دل کھول کر تعریف کیا کرتے تھے۔ ادھر رہبر صاحب اس کی توصیف میں جس خست اور تنگ دلی کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ بڑی مضحکہ خیز ہے۔ ان کے مضمون کی سطور ذیل ملاحظہ ہوں۔

"ترجمہ عوفی کی کتاب جوامع الحکایات ولوامع الروایات کا ہے اسے پڑھ کر اختر کی فارسی دانی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اختر نے لاہور کے اورینٹل کالج سے منشی فاضل کی سند حاصل کی تھی۔ اپنے والد بزرگوار سے بھی لڑکپن میں اس نے بہت کچھ سیکھا ہوگا۔

اختر کی شاعری کا ایک زمانے میں غلغلہ تھا۔ آج اس کی شاعری طاق نسیاں پر پڑی ہوئی ہے۔ مقفی شاعری کا مزہ لینے والے اب بہت کم ہیں۔ پردہ نشین اور برقعہ پوش سلمی کی محبت میں رومان کی سنسنی نہیں رہی اور راقم تو غزلایا ہوا آدمی ہے۔ غزل میں محبوبہ تو کیا محبوب کا نام بھی نہیں لیا

جاتا، صرف ضمیر اشارہ سے کام لیا جاتا ہے۔ پس اختر کی شعر خوانی اور سلمٰی کی داستانی کا بول بالا دوسرے کریں گے۔ میں تو اختر کے اس ترجمے کی داد دیتا ہوں اسے پڑھ کر میری آنکھیں کھلیں کہ افسانہ نویسی اور ناول نویسی کے زمانے سے پہلے ادب کی ایک اور صنف موجود تھی یعنی حکایت نویسی، اچھی حکایت ایک آدھ صفحے کی ہوتی ہے چھوٹی سی بات جلد پوری ہو جاتی ہے۔

اس بارے میں رہبر صاحب کے پہلو دار ارشادات قابل غور ہیں۔ میں صرف اشارے دے رہا ہوں۔

(ا) اس ترجمے اختر کی فارسی دانی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ (یعنی بادل ناخواستہ) لیکن ایسے کم سواد شخص سے ہم مرعوب کیونکر ہو سکتے ہیں جو صرف منشی فاضل تھا اور پھر اس میں اس کا کمال بھی کیا ہے۔ اصل کمال تو اس کے باپ کے سکھانے پڑھانے کا تھا (رہبر صاحب کو اس حقیقت کا علم نہیں کہ اختر کو اپنے والد سے پڑھنے کا موقع ہی میسر نہیں آیا)

(ب) اختر کی شاعری کسی زمانے میں مقبول تھی اب تو وہ کسی کو یاد ہی نہیں کیونکہ ردیف قافیہ والی شاعری کو اب کون پسند کرتا ہے۔ (باایں ہمہ رہبر صاحب کو غزلائے ہوئے ہونے کا دعویٰ ہے)

(ج) بے شک عربی شاعری کی پیروی میں اردو میں محبوبہ کا نام متعارف کرانا اختر کی متبدعات میں سے ہے۔ میں اس بارہ خاص میں رہبر صاحب سے متفق ہوں کہ ضمیر اشارہ میں جو وسعت اور بلاغت ہے وہ نام لینے میں نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اردو شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کی اکثریت رہبر صاحب سے اور مجھ سے متفق نہیں۔

(د) آخر میں رہبر صاحب نے اختر کے ترجمے کی داد دی اور کیا داد دی! کہ

''میں تو اختر کے اس ترجمے کی داد دیتا ہوں اسے پڑھ کر میری آنکھیں کھلیں کہ افسانہ نویسی اور ناول نویسی کے زمانے سے پہلے ادب کی ایک اور صنف موجود تھی......'' جو الفاظ یہاں درج ہوئے ہیں ان کے درمیان کوئی توقیفی علامت موجود نہیں جس سے کوئی مطلب واضح ہو سکے۔ اگر یہ داد ہے تو بیداد کیا ہوتی ہے۔ خدا خدا کر کے ترجمے کی داد دینے کے لیے آنکھیں کھولیں تو وہ کھولتے ہی کھولتے مند بھی گئیں۔ ''کھلیں'' کے بعد حرف ''کہ'' نے ساری داد صنف حکایت نویسی کی طرف منتقل کر دی۔ یوں اختر کا صرف ایک ''کارثواب'' بھی رہبر صاحب کو گوارا نہ ہوا۔ ہوئے تم راہبر جن کے انھیں رہزن کی کیا حاجت۔ بعد ازاں حکایات نویسوں کے ذیل میں سعدی، حافظ، المبرد، ابن الجوزی اور ان کی تالیفات کا طویل تذکرہ ملتا ہے۔ پھر جب رہبر صاحب اس بالا دوی سے لوٹ کر اصل موضوع پر آتے ہیں تو یہ نیا گل کھلاتے ہیں۔

''جوامع الحکایات کے ترجمے کے کام میں اختر شیرانی کو اپنے فاضل باپ حافظ محمود شیرانی صاحب سے ضرور مدد حاصل رہی ہوگی۔ ترجمے کی جلد اول میں ایک دیباچہ بعنوان ''تعارف'' ہے جو اختر

شیرانی کے نام سے چھپا ہے اس کا پیرایہ صاف بتا رہا ہے کہ یہ دیباچہ اختر کا نہیں حافظ صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ عوفی کے بارے میں جو معلومات اس میں دی گئی ہیں ان کی فراہمی اختر کے بس کی بات نہیں تھی۔''

صاف ظاہر ہے کہ رہبر صاحب اختر کو عضو معطل سمجھ رہے ہیں اور ان سے کسی علمی کام کی توقع نہیں کرتے۔ یہ ان کی خام خیالی ہے اگر انھوں نے اختر کے زیرِادارت نکلنے والے ادبی پرچوں میں ان کے لکھے ہوئے علمی اور تاریخی مضامین دیکھے ہوتے تو وہ اس بے بنیاد رائے کا اظہار نہ کرتے۔ گو مولوی عبدالحق نے ۴ نومبر ۱۹۴۲ء کو حافظ صاحب کے نام حیدر آباد (دکن) سے ایک خط میں لکھا تھا۔

''......آپ کی صحت کا کیا حال ہے۔ داؤد کیسے ہیں۔ سب حال تفصیل سے لکھئے۔ جوامع الحکایات کا کام اب ختم ہوگیا ہوگا۔ اسے بھی دیکھ لیجیے۔'' اور اس بات کا امکان ہے کہ حافظ صاحب نے مولوی صاحب کی خواہش کے مطابق بیٹے کے کام پر نظر ڈالی ہو لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ یہ کام بیٹے کے لیے باپ نے انجام دیا تھا ہرگز قابلِ تسلیم نہیں۔ اختر صاحب کی یہ مجال نہ تھی کہ وہ اپنے کام کو خود کرنے کی بجائے والد کے حوالے کر دیتے۔ ان دنوں حافظ صاحب کی صحت نہایت مخدوش تھی۔ ضیق النفس کے دوروں نے انھیں ہلکان کر رکھا تھا۔ علاوہ ازیں میں اس امر کا عینی شاہد ہوں کہ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں وہ اپنے علمی کاموں کے سلسلے میں حوالے وغیرہ تلاش کرنے کے لیے بیٹے سے کام لیتے رہتے تھے چہ جائے کہ وہ الٹا ان کا کام خود کرنے بیٹھ جاتے لیکن رہبر صاحب کے سوئے ظن کا کیا علاج؟ یہ رہبر صاحب کی سینہ زوری ہے کہ بعد ازاں ان کے مضمون میں جہاں عوفی کے تعارف کا حوالہ آتا ہے وہاں حافظ شیرانی صاحب لکھتے ہیں۔ کے الفاظ درج کرنا نہیں بھولتے۔ اسے نرم سے نرم الفاظ میں رہبر صاحب کی علمی بددیانتی کہا جا سکتا ہے۔ بعدازاں وہ اختر کی ترجمہ کردہ حکایات نقل کر کے اپنا مضمون ختم کر دیتے ہیں۔

۔ غالباً ۱۹۹۳ء کے آخر کا واقعہ ہے۔

۔ بات میں نے اپنی معلومات کی بنیاد پر قیاساً لکھی تھی۔ بعد میں جب رہبر صاحب کی کتاب ''تسلیمات'' چھپی تو اس میں ادارہ معارف اسلامیہ کے بارے میں انھوں نے اپنے مضمون ''ایک یادگار مرحوم ادارہ'' میں فضل الرحمٰن شیرانی صاحب کا ذکر بدیں الفاظ کیا ہے۔

''تیسری کانفرنس اس کی ۱۹۳۸ء میں ہوئی اور بجائے لاہور کے دہلی میں ہوئی میں اور میرا بھائی محمد ایوب والد صاحب کے ہمراہ دلی گئے......حافظ محمود شیرانی صاحب کے ایک عزیز فضل الرحمٰن صاحب بھی ان کے ساتھ دلی پہنچے۔ والد صاحب نے ہم دونوں بھائیوں کو یہ کہہ کر ان کے سپرد کر دیا کہ برخورداروں کو دلی کی سیر کرا دو چنانچہ مقالات سننے کی بجائے ہم چاندنی چوک میں گھومتے پھرے۔ فضل الرحمٰن صاحب نے بڑی خستہ گزک خرید کر ہمیں کھلائی۔'' (ص ۱۷۹)

ضمیمہ 1

لاہور ۲۶ جون ۲۰۰۴ء.......... 1

مرزا خلیل احمد قمر

شاعرِ رومان......اختر شیرانی

اردو زبان کے معروف شاعر اختر شیرانی جو اردو ادب میں شاعر رومان کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ اختر شیرانی کا اصل نام محمد داؤد تھا۔ ۴ مئی ۱۹۰۵ء میں ٹونک میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم وہاں سے حاصل کی۔ ۱۹۲۰ء میں لاہور آ گئے۔ جہاں آپ کے والد حافظ محمود شیرانی اسلامیہ کالج میں پڑھاتے تھے میں داخلہ لیا۔ ۱۹۲۱ء میں منشی فاضل اور ۱۹۲۲ء میں ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا۔ اختر شیرانی کو شعر گوئی کا شوق بچپن سے تھا۔ پہلی نظم "جوگن" ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی۔ اس نظم نے اختر کو ہندوستان بھر میں شہرت عطا کی۔ اختر نے مضمون نگاری بھی کی۔ ہمایوں، انتخاب، اختر اور شاہکار کی ادارت بھی کی۔

اختر شیرانی اردو شاعری میں پہلے شاعر ہیں جس نے عورت سے براہ راست خطاب کیا۔ ان کی شاعری حسن مجازی کے لطیف جذبات اور وجد انگیز غنائیت سے معمور ہے۔ وہ ایک رومانی شاعر ہیں اور ان کی شاعری پر جوانی چھائی ہوئی ہے۔ اختر شیرانی نے اپنے کلام میں بڑے حسین و دلکش موضوعات کا انتخاب کیا۔ انہوں نے محض موضوع ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بحروں کا انتخاب بھی نئے انداز میں کیا۔ اختر کو نہ صرف زبان پر قدرت ہے بلکہ ان کے انتخاب الفاظ تراکیب تشبیہات، استعارات میں اکثر جدت و خوش آہنگی بھی پائی جاتی ہے۔ اور واضح معنویت بھی۔ عالم جوانی ہی سے اختر شیرانی کو شراب نوشی کی لت پڑ چکی تھی۔ جس نے ان کے دماغ اور دوسرے اعضاء پر بہت برا اثر ڈالا۔ جس کے باعث یہ نامور ادیب اور اعلیٰ پایہ کا شاعر صرف ۴۳ برس کی عمر میں ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کو انتقال کر گیا۔

اختر کی شاعری کے آٹھ مجموعے، صبح بہار، اختر ستان، لالہ طور، طیور آوارہ، شہناز۔ پھولوں کا گیت۔ نغمہ حرم اور شہرود شائع ہو چکے ہیں۔ نثری مجموعوں کے نام۔ آئینہ خانے میں۔ جامع اللغات، دھڑکتے دل اور وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھا۔

جناب ڈاکٹر داؤد رہبر نے اپنے خطوط کے مجموعہ سلام و پیام میں اختر شیرانی کے آخری ایام اور شراب خانہ خراب کی تباہ کاریوں کے سلسلہ میں اپنے ایک خط مورخہ ۱۰ فروری ۱۹۸۹ء جناب ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب مشیر علمی و ادبی انجمن ترقی اردو کراچی کے نام لکھتے ہیں

"جب باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو ایک روز اختر نے ماڈل ٹاؤن کا رخ کیا، پہلے ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی صاحب کے ہاں پہنچے، ان کے ساتھ مل کر برسوں پہلے اختر نے رومان نام کا رسالہ نکالا تھا، عاشق صاحب نے اس ملاقات کا حال یوں لکھا ہے۔

"چنانچہ وہ ایک دن ماڈل ٹاؤن میرے مکان پر تشریف لے ہی آئے۔ بوتل ان کی جیب میں تھی کچھ دیر بیٹھے پیتے رہے۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر بے حد تعجب ہوا کہ اب وہ شراب میں افیم بھی ملاتے تھے۔ میں نے پوچھا یہ بدعت کب سے شروع کی ہے کہنے لگے فقط شراب سے نشہ نہیں ہوتا۔ اس لئے افیم بھی ساتھ ملاتا ہوں۔ پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد یکایک کہنے لگے۔ اب زندگی سے اکتا گیا ہوں۔ آپ نے کبھی زندگی کا اتار چڑھاؤ خوب دیکھ لیا ہے، چلئے اب آگے چلیں۔

میں نے ہنس کر غالب کا یہ شعر پڑھ دیا

خون ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یہاں کہ ابھی کام بہت ہے

شعر سن کر آب دیدہ ہو گئے اور پھر زار زار رونے لگے۔ یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔" (چند یادیں چند تاثرات۔ مکتبہ آئینہ ادب" لاہور" ۱۹۶۰ء، صفحہ ۱۵۶)

عاشق صاحب سے ہمارے مکان کا پوچھ کر وہاں سے پیدل چلے اور ہمارے ہاں پہنچے، اوور کوٹ کی جیب میں گردن دراز بوتل تھی، والد صاحب سے انہوں نے سگریٹ مانگا۔ میں اندر سے پیکٹ لے کر آیا، اجازت لے کر اختر نے سلگایا اور ساتھ ہی والد صاحب سے یہ کہا "آپ ہی نے مجھے سگریٹ پینا سکھایا تھا" میں اس تلمیح کے معنے نہیں سمجھا، آدھ گھنٹہ بیٹھے، زیادہ تر رویا کیے، بیچ میں معما بن کر زرا ہنسے بھی، بے ربط گفتگو کی، والد صاحب شروع سے آخر تک خاموش رہے، میں اس ملاقات کے دوران برابر حاضر رہا، جب چلنے کو اٹھے تو والد صاحب نے مجھ سے کہا "ان کو بس سٹاپ تک پہنچا آؤ" میرے بازو میں بازو ڈال کر اختر چلے تو مجھ سے صرف اتنا کہا۔ ہاں ہاں میں جانتا ہوں، آپ کا نام بھی داؤد ہے، مگر میاں وہ بات کہاں؟"

اختر شیرانی کی وفات کے حالات کی ایک تفصیل ایسی مجھ تک پہنچی ہے کہ اختر کے شیدائیوں کو اس کا علم ہونا چاہیے۔

میرے بھائیوں میں سب سے بڑے ڈاکٹر محمد اسحاق صاحب ہیں، کراچی کے میڈیکل ریسرچ سنٹر میں کرنل خواجہ عبدالرشید صاحب کے ماتحت بہت دنوں پہلے ان کی ملازمت تھی، وہاں سے ریٹائر ہو کر امریکہ کی ایک یونیورسٹی کے میڈیکل کالج میں سولہ برس پروفیسر رہے۔ اب یہاں سے بھی ریٹائر ہو گئے ہیں اور امریکہ میں مقیم ہیں۔

جن دنوں اختر کا انتقال ہوا بھائی صاحب مرحوم میڈیکل کالج میں اناٹامی (علم الابدان) پڑھانے پر مامور تھے، اناٹومی کے کورس میں انسانی بدن کے اعضاء کی شناسائی بہم پہنچانے کو لاشیں مہیا کی جاتیں، استاد آزمودہ طریقوں سے بتدریج چیر چیر کر گوشت، پوست استخواں، رگ ریشہ، دل، جگر، پتا، تلی، بھیجے، انتڑیوں، پٹھوں وغیرہ کی ساخت سمجھاتا

ہے۔ اس کورس کی یہ ضرورت گمنام لاوارث لاشوں سے پوری ہوتی ہے۔ گمنام لاش پولیس لے کر آتی ہے۔۔ پہلے اس کا پوسٹ مارٹم معاینہ ہوتا ہے، اس کے بعد لاش اناٹومی ڈیپارٹمنٹ کو پہنچائی جاتی ہے۔ وہاں اس پر ایک کیمیائی عمل کیا جاتا ہے۔ جو لاش کو گلنے سڑنے سے بچا لیتا ہے۔

میو ہسپتال کے مردہ خانے میں پوسٹ مارٹم کے فرائض گاہے گاہے بھائی اسحاق صاحب کے سپرد بھی ہوتے تھے۔ ایک روز ان کا سدھایا ہوا ایک مددگار دوڑا دوڑا آیا اور بولا "ڈاکٹر صاحب، ذرا میرے ساتھ چلئے ایک میت آپ کو دکھانی ہے۔" بھائی صاحب چکرائے کہ خدا خیر کرے، میت کے قریب پہنچے تو وہ مددگار بولا غور سے دیکھئے! میرا تو خیال ہے یہ اختر شیرانی ہیں۔ بھائی صاحب نے سنبھل کر دیکھا تو یقین ہو گیا کہ یہ اختر ہی کی میت ہے، یہ مددگار اختر کا شیدائی تھا، بولا کہ فوراً اختر کے عزیزوں کو خبر پہنچائی جائے۔

لاش شہر میں کسی سڑک پر پائی گئی تھی، پولیس نے تانگے میں رکھ کر مردہ خانہ پہنچائی تھی، اناٹومی کے بڑے پروفیسر ڈاکٹر فخر الدین مرحوم تھے، بھائی صاحب ان کے ماتحت تھے، بھائی صاحب نے ان کو آگاہ کیا اور کہا کہ غضب ہے، ایسا نامی آدمی گمنام ہو کر یہاں پہنچا، اختر کے عزیزوں کو فوراً خبر کی جائے کہ آ کر جنازے کا انتظام کریں، ڈاکٹر فخر الدین نے فرمایا، اجی یہ شرابی تھا، اس کی لاش کیمیائی جائے اور علم الابدان کی چیر پھاڑ کے لئے استعمال کی جائے، ایسوں کا یہی انجام ہونا چاہئے۔

بھائی صاحب نے کہا آپ صورت حال کی نزاکت کو نہیں سمجھے، جو میں کہتا ہوں وہی کیجئے۔ ورنہ خیر نہیں۔ چنانچہ بھائی صاحب نے بتایا کہ حافظ محمود خاں شیرانی مرحوم کے بھانجے فضل الرحمن صاحب کو اطلاع دی گئی، اور یہ کہ دو دن کے اندر اندر شیخوپورہ سے اختر کے چند احباب میت کے لینے کو میو ہسپتال پہنچ گئے اور میت ان کو دے دی گئی،

(سلام پیام ص ۳۸۴ تا ۳۸۵)

ضمیمہ 3

ڈاکٹر اسلم فرخی

فون: ۳۹۸۷۳۰۵
ل-۱۵۵/۵
گلشن اقبال کراچی

۲۵ اکتوبر ۲۰۰۷ء

برادرم ڈاکٹر صاحب۔ السلام علیکم

اُمید ہے کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔ آپ کا گرامی نامہ اور مضمون کا تراشہ ملا۔ میں نے مضمون پڑھ لیا ہے بڑا اچھا اور ساری حقیقت تو منکشف ہوگئی۔ کردار کشی کا مقصد اختر آپ کو بدگمان ثابت کرنا تھا۔ امانت کا لحاظ نہ ہو اور کسی قسم کا شک و شبہ بھی ظاہر کیا جائے۔ بڑا افسوس ہوا لیکن آپ کے مضمون سے حقائق پوری طرح واضح ہوگئے۔ آپ نے ایک نادر اور بے ہودہ الزام کا ازالہ کیا۔ اور یہ ثابت کر دیا کہ حضرت اختر شیرانی نہ پیار وہ گام رہیں بلکہ معتبر ثبوت کے مطابق بزرگ تھے ان کی وفات کے عرصہ بعد جو الزام ان پر لگایا گیا وہ سراسر غلط اور بے بنیاد تھا۔ اختر شیرانی مرحوم کی کردار کشی بہت ہوئی لیکن ان ساری کوششوں کے باوجود وہ سارے ملک کے نیاز اور دنیا کے ہر فرد سے بے غرض محبت اور صرف محبت کے لئے غزل خواں تھے۔

میں اس بیچ کے آغاز سے علیل ہوں۔ سب سے بڑا مرض بڑھاپا ہے۔ ان دنوں گھر سے باہر نکلنے پر بھی پابندی ہے۔

آپ کے خاکوں کا مجموعہ کب شائع ہو رہا ہے۔ آپ کے لیے خاکے لاجواب ہیں امید ہے جلد از جلد کتابی صورت میں منظر عام پر آجائے گا۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت، صحت مند اور مطمئن رکھے۔ آمین

نیازمند

Post Office
Savings Bank

UMS Urgent Mail Service

EMS International Speed Post
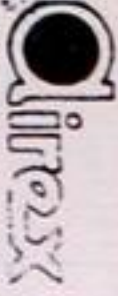
EXPRESS SERVICE
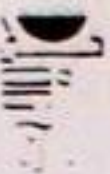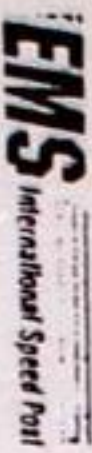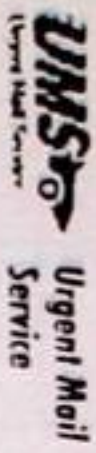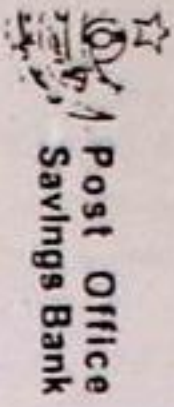
w.pakpost.gov.pk
w.postmarksofpakistan.com

PAKISTAN Rs.4

بخدمت جناب ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی

۳۰۔ حافظ محمود شیرانی روڈ

اسلام پارک

[illegible]

POSTCODE

ضمیمہ 6

FORM 4

PANJAB UNIVERSITY LIBRARY
LAHORE

No. 131

Date 15/2/49

عزیزی!

سلام مسنون!

آپ کا خط مورخہ ۸ فروری ملا۔ شکریہ۔

کتابوں کی قیمت کا فیصلہ جناب پروفیسر محمد اقبال صاحب مرحوم اور جناب مولوی محمد شفیع صاحب کے مشورہ سے کیا گیا ہے۔ یونیورسٹی تو اتنی رقم دینے سے بھی گریز کر رہی تھی لیکن چونکہ اس مجموعہ میں بعض کتابیں قیمتی بھی تھیں اس وجہ سے ان کو لینا منظور کر لیا گیا۔ قیمت کا تو فیصلہ اب ہو گیا ہے۔ فضل الرحمٰن صاحب آئیں تو چیک بنوا کر ان کو دے دیا جائیگا۔

رجسٹرار صاحب کے پاس جو چیزیں بطور امانت رکھی ہیں ان کی قیمت کا فیصلہ بھی آپ کی رضامندی کے بغیر تو نہیں ہوگا۔ ہم رجسٹرار صاحب کو لکھ رہے ہیں کہ چیزیں لائبریری میں بھیج جائیں تو پھر قیمت کا فیصلہ ان کو دیکھنے کے بعد آپ سے کر لیا جائیگا۔ آپ بھی ان کو لکھ دیں کہ وہ ان چیزوں کو پہنچوا دیں۔

ہماری خواہش ہے کہ مرحوم کی یادگار چیزیں تمام ایک ہی جگہ
یہ مجتمع ہو جائیں اور ان کی یاد باقی رہے۔

والسلام

مخلص

سید عبداللہ

آنریری ایڈیٹر رسالہ

versity of the Panjab
Lahore

M. Shirani
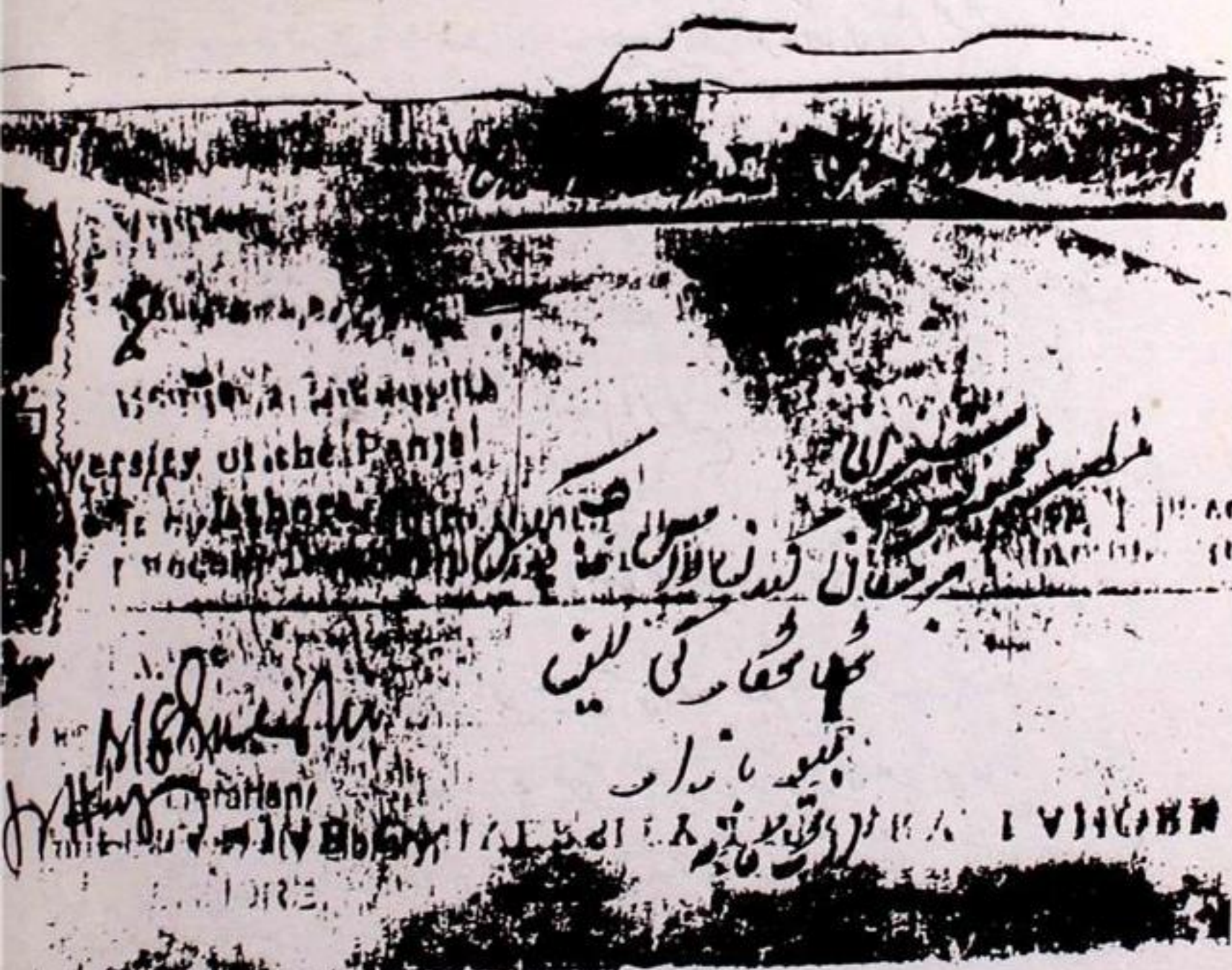
ضمیمہ 5

357 Tilford Q —
Deerfield Beach, Florida 33442

بخدمت محترمی مشفق خواجہ صاحب
photocopy

7· November, 2004

محبِ مہربان عبدالوہاب خاں سلیم صاحب،

السلام علیکم، پروفیسر مظہر محمود خاں شیرانی صاحب کا شکایت نامہ جو تخلیق کے تازہ شمارے میں چھپا ہے اسے پڑھ کر دکھ ہوا، سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنے اس عزیزِ باتمیز کی رنجش دور کرنے کو کیا کروں۔

انہیں مجھ سے دو شکایتیں ہیں، ایک یہ کہ میں نے ان کے والد مرحوم کے انتقال کی من گھڑت کہانی لکھ کر شائع کی، دوسری یہ کہ میں نے ان کے دادا مرحوم کی امانت میں خیانت کی۔

پہلی شکایت کا میرے پاس کوئی جواب نہیں اس لیے کہ اختر شیرانی مرحوم کے انتقال کے کوائف مجھ سے میرے بڑے بھائی ڈاکٹر محمد اسحاق مرحوم نے بیان کیے، اور بھائی صاحب افسانہ گھڑنے کے ماہر ہرگز نہ تھے، ان کے بیان میں تفاصیل ایسی تھیں کہ اگر یہ سب دروغ بافی تھی تو اس پر بڑے سے بڑے افسانہ نگار کو رشک آنا چاہیے، اگر یہ پروفیسر مظہر صاحب اس گمان میں ہیں کہ یہ دروغ بافی میری طرف سے ہوئی ہے تو اس بدگمانی کا میرے پاس کوئی علاج نہیں، (الف)

دوسری شکایت کو پڑھ کر پہلے آداب عرض ہے اور پھر جواب عرض ہے، یہ سچ ہے کہ ان کے دادا مرحوم کی امانت ہمارے موڈل ٹاؤن والے گھر میں پڑی ہوئی تھی، میں مارچ ۱۹۴۹ء میں انگلستان کو چل دیا، اسی سال ستمبر میں میرے

- 2 -

برادر محمد یعقوب مرحوم بھی انگلستان آن پہنچے، پھر چند ماہ بعد بھائی اسحاق صاحب بھی، میرا ایک برادر محمد ایوب کاروبار کے لیے ڈھاکے جا بیٹھا، ایک اور برادر محمد الیاس ایئر فورس میں ٹریننگ حاصل کرکے ہوا بازی میں لگ گیا، ہماری بہن سارہ اپنے شوہر کے ساتھ ڈھاکے چلی گئی، چنانچہ موڈل ٹاؤن والا مکان خالی ہوگیا، اس میں والد مرحوم کی بے بہا لائبریری کی دیکھ بھال کے لیے کوئی موجود نہ رہا، دیمک سے کتابوں کے بچاؤ کے لیے کسی رکھوالے کا وہاں رہنا ممکن نہ رہا۔

اسی فکر میں میں ۱۹۵۰ء میں چند روز کے لیے لاہور پہنچا، بھائی اسحاق مرحوم نے جھٹ پٹ میری شادی کا انتظام کر دیا، گرہستی ہوکر واپس انگلستان جانے سے پہلے میں نے افراتفری میں اپنے والد مرحوم کی لائبریری انگلستان پہنچانے کا بندوبست کیا اس لیے کہ میرا تہیہ انگلستان ہی میں ساری عمر گزارنے کا تھا۔

اتفاقاً بابائے اردو انہی دنوں لاہور تشریف لائے، میرے التماس پر موڈل ٹاؤن تشریف لائے، میں نے انہیں بتایا کہ میں والد صاحب کی لائبریری انگلستان لے جاؤں گا، شیرانی صاحب کی امانت کی چیزیں اس خالی گھر میں پڑی رہ گئیں تو ان کا انجام معلوم! بہتر ہے کہ یہ چیزیں انجمن ترقی اردو کے سپرد کر دوں، وہاں یہ محفوظ رہیں گی، مولوی صاحب نے دوسرے روز اپنے ایک

-3-

کارندے کو موڈل ٹاؤن بھیجا اور یوں یہ نوادر انجمن کے مستقر میں کراچی پہنچ گئے اور محفوظ ہو گئے۔ اپنے اُس مختصر قیام لاہور میں ان کے تحفظ کی اس سے بہتر تدبیر میرے خیال میں نہ آسکی۔

۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۲ء میں میرا کراچی جانا ہوا، انجمن کی نئی عمارت ابھی تعمیر نہیں ہوئی تھی، پرانی عمارت کے اندر میں نے اُن نوادر میں سے دو کو دیوار پر آویزاں پایا، ایک تو زیب النساء (دختر اورنگ زیب عالمگیر) کی تصویر تھی اور ایک طغرا بہادر شاہ ظفر کا تھا۔

پچھلے دنوں ٹیلی فون پر میں نے محترمی مشفق خواجہ صاحب کو یہ قصہ سنایا تو انہوں نے تعجب کے ساتھ فرمایا "میں چار پانچ سال روزانہ مولوی صاحب کے پاس حاضر رہتا تھا، انہوں نے تو کبھی ذکر نہیں کیا کہ حافظ شیرانی مرحوم کے جمع کیے ہوئے نوادر انجمن کو کیسے حاصل ہوئے" میں نے جواب دیا کہ مولوی صاحب نے احتیاطاً ذکر نہ کیا ہوگا جبکہ وہ جانتے تھے کہ یہ چیزیں امانتاً تمہارے والد مرحوم کے پاس رکھوائی گئی تھیں۔

اب اگر مظہر محمود صاحب کو یہ شبہ ہے کہ یہ نوادر میں نے بیچ کھائے تو یہ اُن کا سوءِ ظن ہے۔ بابائے اردو اور بھائی اسحاق صاحب آج زندہ ہوتے تو اُن کی گواہی مجھے تہمت سے بچا لیتی۔

والسلام۔

نیازمند
داؤد رہبر

چند تصریحات:

اس خط کی عکسی نقل ڈاکٹر داؤد رہبر صاحب نے ریاستہائے متحدہ امریکہ سے مشفق خواجہ مرحوم کو روانہ کی تھی۔ خواجہ صاحب نے اس کا فوٹو مجھے بھیجا۔ اس میں رہبر صاحب نے کوئی نئی بات نہیں کی البتہ دو ایک جگہ غلط مبحث کے مرتکب ہوئے ہیں جن پر میں حواشی دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

(ا) میں نے ڈاکٹر اسحاق مرحوم پر دروغ بافی کا الزام ہرگز نہیں لگایا بلکہ اسے ان کی غلطی فہمی قرار دیا ہے۔ مجھے اصل شکایت خود رہبر صاحب سے ہے۔ جنھوں نے آنکھیں بند کر کے نہ صرف اس غلط فہمی پر آمنا وصدقنا کہا بلکہ اسے خوب نمک مرچ لگا کر اور قیاس کے طوطا مینا بنا کر اچھالا۔

حالت یہ ہے کہ بقول ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا بیسویں صدی کے آخری عشرے میں ایک بار جب رہبر صاحب کو یونیورسٹی اور اورینٹل کالج میں خطاب کرنے کا موقع ملا تو وہاں بھی انھوں نے اپنے اسی مرغوب موضوع پر ویاکھیان دیا۔ ڈاکٹر رہبر کی نیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے تردید کے ڈر سے بطور پیش بندی، فرخی صاحب کے نام اپنے خط میں ہی حکیم نیر واسطی صاحب پر کتمان حق کا الزام لگاتے ہوئے طنز کے تیر چھوڑے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

''حکیم نیر واسطی نے اختر کی وفات کے بیان میں ان احوال کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ یہ قصہ دلدوز ہے ممکن ہے بعض سننے والے کہیں کہ چپ رہو لیکن یہ قصہ اختر و سلمیٰ کا اسطورہ نہیں ہے، واقعہ ہے۔ بھائی صاحب کو کیا پڑی تھی کہ ایسا قصہ محض سننی کے لیے گھڑ کر ہم کو سناتے۔ (سلام و پیام، ص ۳۸۵)

(ب) درحقیقت اپنے عبدالوہاب خاں سلیم کے نام خط میں بھی رہبر صاحب نے دروغ راستی آمیز سے کام لیا ہے۔ ان کے اور ان کے بھائیوں کے لاہور کا قیام ترک کرنے کی اطلاع بالکل درست ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ رہبر صاحب مارچ ۱۹۴۹ء میں انگلستان چلے گئے لیکن اصل مسئلے کی طرف انھوں نے مطلق دھیان نہیں دیا۔ یہ مجھ سے سنئے۔ ہوا یہ تھا کہ میں نے ۸ فروری ۱۹۴۹ء کو لاڑکانہ سے ڈاکٹر سید عبداللہ کے نام، جو ان دنوں پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں اعزازی لائبریرین کے فرائض انجام دے رہے تھے، ایک عریضہ تحریر کیا اس میں دو باتوں کا ذکر تھا۔ ایک تو شیرانی صاحب کی وفات کے بعد ٹونک میں جمع کردہ قلمی و مطبوعہ کتابوں کی قیمت اور اس کی وصولی کا معاملہ دوسرے اس خواہش کا اظہار کہ ہماری جو اشیاء پروفیسر اقبال صاحب کے پاس امانت تھیں وہ ان کے ورثاء سے یونیورسٹی لائبریری وصولی کر لے اور اس کا مناسب معاوضہ بھی ہمیں ادا کر دے۔ میرے خط کا جواب سید عبداللہ صاحب نے ۱۵ فروری ۱۹۴۹ء کو لائبریری کے

سرکاری پیڈ پر دیا۔ اس میں ہمارے موضوع سے متعلق حصہ یہ ہے۔
''رہبر صاحب کے پاس جو چیزیں بطور امانت رکھی ہیں ان کی قیمت کا فیصلہ بھی آپ کی رضا مندی کے بغیر تو نہیں ہوگا۔ ہم رہبر صاحب کو لکھ رہے ہیں کہ چیزیں لائبریری میں پہنچ جائیں تو پھر قیمت کا فیصلہ ان کو دیکھنے کے بعد آپ سے کرلیا جائے گا۔
آپ بھی ان کو لکھ دیں کہ وہ ان چیزوں کو پہنچا دیں۔ ہماری خواہش ہے کہ مرحوم کی یہ یادگار چیزیں تمام ایک ہی جگہ پر جمع رہیں اور ان کی یاد باقی رہے۔ والسلام۔ (سید صاحب کے خط کا عکس بطور ضمیمہ ۶ ملاحظہ ہو)

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ سید صاحب کی ہدایت کے مطابق رہبر صاحب کو فوراً خط لکھا گیا۔ گویا رہبر صاحب کے انگلستان تشریف لے جانے سے پیشتر سید صاحب کا اور میرا دونوں مکتوب انھیں مل چکے تھے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اندریں حالات داؤد رہبر صاحب کے ۱۹۵۰ء میں لاہور آنے اور اپنے والد کا کتب خانہ اپنے ساتھ لے جانے کے موقع پر اس ارشاد کو کہ ''شیرانی صاحب کی امانت کی چیزیں اس خالی گھر میں پڑی رہ گئیں تو ان کا انجام معلوم!'' کیا نام دیا جائے؟

شرفا کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنے پاس موجود امانت کو اس کے حق دار تک پہنچانے کو پورا جتن کرتے ہیں۔ اگر رہبر صاحب اس معاملے میں سنجیدہ ہوتے تو چلیے ۱۹۴۹ء میں نہ سہی ۱۹۵۰ء میں صرف اتنا کرتے کہ حکیم نیر واسطی صاحب کو پیغام دے دیتے کہ شیرانی خاندان کی کچھ اشیاء میرے پاس امانت ہیں یہ وصول کرکے ان کے ورثاء کو پہنچا دیجیے۔ حکیم صاحب یہ فریضہ بڑی توجہ اور احتیاط کے ساتھ انجام دیتے۔

ج) مگر یہ سیدھا سا طریق چھوڑ کر رہبر صاحب نے مفت کرم داشتن کا راستہ خدا جانے کس اصول کے تحت اختیار کیا۔ بہر حال اگر عتیقیات کا یہ مجموعہ مولوی عبدالحق کو نذر کر دیا تھا تو انجمن کے خزائن میں اس کا وجود تو ہوتا۔ مولوی صاحب کا تو یہ عالم تھا کہ وہ اپنی ذاتی اشیاء کو بھی انجمن ہی کی ملکیت سمجھتے تھے۔ ایسے شخص کے بارے میں ایک لمحے کے لیے بھی تصور نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے یہ نایاب چیزیں کسی اور شخص یا ادارے کو دے ڈالی ہوں۔

د) داؤد رہبر صاحب کی یہ بات بھی درست ہے کہ انھوں نے ۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۴ء میں ان نوادر میں سے دو یعنی شہزادی زیب النساء کی تصویر اور بہادر شاہ ظفر والا طغرا انجمن کی پرانی عمارت میں دیوار پر آویزاں دیکھے تھے۔ ان کا عبدالوہاب خاں سلیم کے نام خط کا عکس مجھے روانہ کرتے ہوئے مشفق خواجہ مرحوم نے اپنے نوشتہ (۲۳ نومبر ۲۰۰۴ء) میں لکھا تھا۔

''ڈاکٹر داؤد رہبر صاحب نے رسالہ ''تخلیق'' دیکھ کر اپنے ایک دوست کو خط لکھا اور اس کی عکسی نقل مجھے بھیج دی۔ یہ میں آپ کے ملاحظے کے لیے بھیجتا ہوں۔ انھوں نے اپنے خط میں جن دونوادر کا ذکر کیا ہے وہ تو آج بھی انجمن میں موجود ہیں مگر یہ کیسے ثابت ہو کہ یہ کہاں سے آئے ہیں۔''

خواجہ صاحب کا شبہ اپنی جگہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں چیزیں شیرانی صاحب کی امانت رکھی ہوئی اشیاء میں شامل تھیں اور یقیناً یہ رہبر صاحب نے مولوی صاحب کو نذر کی ہوں گی۔ اس کی تصدیق ایک تیسرے ذریعہ سے ہوتی ہے۔

جب میرا مضمون ''چہ دلاور یست دزدے...... ''تخلیق میں چھپا تو وہ مجی ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی نظر سے گزرا۔ کچھ عرصے بعد وہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کی ایک میٹنگ میں تشریف لائے تو عندالملاقات فرمانے لگے کہ میں ۱۹۴۷ء میں کسی کام سے پروفیسر اقبال صاحب سے ملنے ان کے گھر ماڈل ٹاؤن گیا۔ انھوں نے مجھے شیرانی صاحب کی امانتوں کے بارے میں بتایا جو کمرے کے ایک گوشے میں بحفاظت بندھی بندھائی رکھی تھیں۔ البتہ دو چیزیں فریم کی ہوئی دیوار پر آویزاں تھیں۔ ان میں ایک بہادر شاہ ظفر کے ہاتھ کا لکھا ہوا طغرا تھا اور دوسری ایک تصویر جو یاد نہیں کس کی تھی؟

ظن المومنین خیرا بہت اچھا لائحہ عمل ہے لیکن ہمارے پیش نظر معاملے میں حدیث ضعیف ہے اور راوی غیر ثقہ اس لیے شک کا فائدہ ملزم کو نہیں دیا جا سکتا جس کی حالت یہ ہے کہ:

آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں خنجر کھلا

میں نے اپنے پہلے مضمون میں عرض کیا تھا کہ خالص جھوٹ کے مقابلے میں دروغ راستی آمیز زیادہ خطرناک اور گمراہ کن ہوتا ہے اور یہی رہبر صاحب کی وقتی کامیابی کا راز ہے۔ چنانچہ مجموعی صورت حال کے پیش نظر کہنا پڑتا ہے کہ محترم داؤد رہبر صاحب نے یہ دونوں چیزیں، جنھیں فریموں سے نکال کر لپیٹنے کی صورت میں ان کے ضائع ہونے کا اندیشہ کیا یقین تھا۔ بڑی فراخ دلی سے مولوی عبدالحق صاحب کو نذر گزرایں اور باقی پیک کی ہوئی تمام اشیا اپنے والد کے کتب خانے کے ساتھ انگلستان لے گئے جہاں بیسیوں من وزنی کتابیں منتقل ہوئیں وہاں چند سیر وزن کا کیا مسئلہ تھا؟

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

مولوی صاحب بھی خوش ہو گئے اور قسم کھانے کی گنجائش بھی نکل آئی۔

آخر میں اس قضیے کے بنیادی مسئلے کے یعنی اختر کی نعش کے لاوارث ہونے والے معاملے پر سید ذہانت حسین کا خط بنام ایڈیٹر تخلیق (بطور ضمیمہ نمبر ۷) اضافہ کرتا ہوں اور اپنی معروضات اس دعا

پر ختم کرتا ہوں۔

اعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا و من سیات اعمالنا و من یهده اللّٰه فلا مضل له و من یضلله فلا هادی له۔

ضمائم:

ضمیمہ ا شاعر رومانی اختر شیرانیس

ضمیمہ ۲، عکس مکتوب مشفق خواجہ مرحوم بنام راقم، نوشتہ ۱۲ اکتوبر ۲۰۰۴ء

ضمیمہ ۳، عکس مکتوب ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب بنام راقم، نوشتہ ۲۵ اکتوبر ۲۰۰۴ء

ضمیمہ ۴، عکس مکتوب مشفق خواجہ مرحوم بنام راقم، نوشتہ ۴ نومبر ۲۰۰۴ء

ضمیمہ ۵، عکس مکتوب ڈاکٹر داؤد رہبر بنام عبدالوہاب خاں سلیم، نوشتہ ۷ نومبر ۲۰۰۴ء

ضمیمہ ۶ عکس مکتوب ڈاکٹر سید عبداللہ بنام راقم

ضمیمہ ۷ عکس مکتوب سید ذہانت حسین بنام ایڈیٹر تخلیق، لاہور
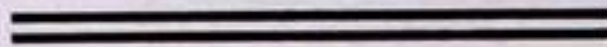
ضمیمہ 7

اظہر میاں!

دعائے صحت و سلامتی! ''تخلیق'' اکتوبر 2004ء میں عزیزی مظہر محمود شیرانی کا مضمون ''چہ دلاور یست دُزدے....'' پڑھا جس میں انہوں نے نہایت تفصیل سے داوَر رہبر کی تر دماغی جسے میں ''خر دماغی'' کہوں گا اور ذاتی مخاصمت کی بنیاد پر دیدہ و دانستہ غلط بیانیوں کو ہر پہلو سے روشنی ڈال کر بیان کیا ہے۔ مجھے یہ مضمون پڑھ کر خوشی بھی ہوئی اور اس بات پر اطمینان بھی ہوا کہ مظہر محمود شیرانی نے اپنے والد اور دادا سے جو علم و دانش کی وراثت حاصل کی ہے اور تحقیق و تنقید میں جو مقام حاصل کیا ہے۔ اس کا انہوں نے صحیح استعمال کیا ہے۔ ان کے اس جامع اور دلائل سے بھر پور مضمون کے بعد میرے لئے کوئی گنجائش نہیں رہتی ہے، لیکن چونکہ جناب اختر شیرانی کی بیماری، وفات اور تجہیز و تکفین کا میں عینی شاہد ہوں اور اس لئے عزیزی مظہر میاں کی وضاحتوں کی مزید تحقیق کیلئے میں یہ چند سطریں لکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔

اختر شیرانی جب میو ہسپتال میں داخل ہونے کیلئے گئے تو اس وقت میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہاں کچھ تاخیر کے بعد انہیں داخل کر لیا گیا۔ پرائیویٹ وارڈ میں کوئی کمرہ خالی نہ تھا، اس لئے اسپیشل وارڈ میں، جہاں ایک بڑے کمرے میں چار مریض ہوتے ہیں، اختر صاحب کو بھی ایک بیڈ مل گیا۔ میں شام تک ان کے ساتھ رہا۔ مغرب کے قریب مجھے بھی وارڈ سے جانے کو کہا گیا۔ میں ٹھہرنا چاہتا تھا لیکن ہسپتال کے قوانین کے تحت مجھے اجازت نہیں ملی۔ دوسرے دن اختر صاحب آدھے سوئے اور آدھے جاگے کی کیفیت میں رہے۔ کچھ دیر گفتگو کے بعد ان پر غنودگی طاری ہو جاتی تھی۔ لیکن تیسرے دن صبح کو جب میں ہسپتال پہنچا تو اختر صاحب کی حالت خاصی بہتر تھی۔ خدا کا شکر ادا کیا اور ایک لمحے کو یہ خیال بھی آیا کہ شاید معجزہ ہو رہا ہے۔ مجھے دیکھ کو اختر صاحب مسکرائے اور کہنے لگے ''مولانا! اب میری طبعیت بہتر ہے۔ حکیم صاحب سے کہیے کہ مجھے گھر لے چلیں۔ وہاں جا کر میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔'' لیکن شام سے ان کی حالت پھر

ہوش میں اور کبھی نیم بے ہوشی والی ہوگئی۔ شام کو جب میں چلنے لگا تو انہوں نے بڑی محبت سے میرا ہاتھ دبا کر ''خدا حافظ!'' کہا۔ میں نے بھی بڑے پیار سے جواباً ''خدا حافظ'' کہا۔ ہماری زندگی کا یہ آخری مکالمہ تھا۔ چوتھے دن کی صبح تک وہ بالکل بے ہوش ہو چکے تھے۔ اتنے زیادہ کہ اب نہ بات سن رہے تھے اور نہ ہی کسی قسم کی حرکت جسم میں تھی۔ آنکھیں بند سانس چل رہی تھی۔ پانچویں اور چھٹے دن، ڈاکٹروں کی پوری کوشش کے باوجود ان کی حالت بہتر نہ ہو سکی۔ ان دنوں میں بھی پورا دن ان کے بیڈ کے ساتھ بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ 9 ستمبر کی سہ پہر کو بھی اختر صاحب کے بیڈ کے ساتھ ہی بیٹھا تھا جب انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس پورے عرصے میں کوئی دن ایسا نہیں آیا جب میں صبح کو ہسپتال پہنچا تو اختر شیرانی اپنے بستر پر نہ ہوں۔ اور پھر ستمبر کی وہ صبح بھی آئی جو بہت قیامت خیز تھی۔ جب قائد اعظم کے انتقال کی خبر ریڈیو اور اخبارات کے ذریعے پورے ملک میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ ہر طرف ایک کہرام بپا تھا۔ پوری قوم اس اندوہناک خبر پر مختل و بدحواس ہو کر سڑکوں پر آ گئی تھی۔ جگہ جگہ دکانیں اور بازار بند کروائے جا رہے تھے اور جو رضامندی سے بند نہیں کر رہے تھے ان کی توڑ پھوڑ ہو رہی تھی۔ سڑکوں پر Barriers لگا کر جگہ جگہ راستے بند کئے جا رہے تھے۔ اور لوگ ہر آنے جانے والے کو خصوصاً تانگہ، موٹر، لاری، روک رہے تھے۔ ہم جب اختر شیرانی کی لاش لینے حکیم نیر واسطی صاحب کی کار میں میو ہسپتال جا رہے تھے تو موچی دروازے کے باہر ہماری کار کا بھی گھیراؤ ہو گیا۔ لوگ چلا رہے تھے کہ آج قوم کے باپ کا انتقال ہو گیا ہے آج ملک کا بادشاہ مر گیا ہے اور تم لوگوں کو آج بھی سیر و تفریح کی سوجھ رہی ہے، بلکہ کچھ لوگ تو گاڑی کو توڑنے کیلئے آگے بڑھے۔ میں ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر کفن گود میں لئے آگے ہی بیٹھا تھا۔ میں جلدی سے گاڑی سے اترا اور انہیں بتایا کہ یہ دیکھو میرے پاس کفن ہے۔ ہم لاش لینے میو ہسپتال جا رہے ہے۔ ہم بالکل سیر و تفریح کیلئے نہیں نکلے۔ کفن دیکھ کر لوگوں کو یقین آیا اور بڑی مشکل سے ہم لوگوں کیلئے راستہ کھولا اور جانے دیا۔ میو ہسپتال میں بھی تقریباً ہڑتال والی کیفیت تھی۔ عملے کے جو لوگ آ چکے تھے وہ اندر تھے اور جو نہیں آئے تھے وہ راستے میں ہی کہیں پھنسے ہوئے تھے۔ ہمیں مردہ خانے کے سرد خانے سے اختر صاحب کی لاش حاصل کرنے میں کارروائیوں کی وجہ سے کچھ دقت پیش آئی۔ لاش حاصل کرنے کیلئے حکیم نیر واسطی کے دستخط ہونے ضروری تھے۔ اور حکیم صاحب نہ ہمارے ساتھ آئے تھے اور نہ ہی شہر کی دگرگوں حالت کی صورت میں وہ فوری طور پر آ سکتے تھے۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کے لاش دینے کے انکار پر میں نے حکیم صاحب سے فون سے رابطہ کیا۔ انہوں نے متعلقہ ڈاکٹر کو میرا نام اور میرے ساتھ اپنا رشتہ بتا کر اس سے درخواست کی کہ وہ میرے دستخط لے کر لاش دے دے اور اسے یہ یقین دلایا کہ اگر ان کے

دستخط بہت ضروری ہیں تو وہ شہر کی فضا ٹھیک ہوتے ہی ہسپتال آ کر دستخط کر دیں گے۔ ہم سرد خانے میں گئے میری زندگی میں یہ پہلا اور ابھی تک آخری موقع تھا کہ میں کسی مردہ خانے کے سرد خانے میں گیا۔ وہاں چاروں طرف دیواروں کے ساتھ سٹیل کی الماریاں لگی تھیں۔ اور بیچ میں ایک لائن میں تین چار میزیں رکھی تھیں۔ الماریوں میں نیچے اوپر اتنی لمبی لمبی درازیں تھے جن میں انسانی لاش لٹائی جا سکے۔ ہم سے پہلے کچھ لوگوں نے ایک بڑھیا کی لاش اس دراز سے نکلوائی تھی، جسے بڑی بے رحمی سے قتل کیا گیا تھا۔ اس کے چہرے پر کرب اور شدید تکلیف کے جو آثار تھے وہ مجھے آج بھی یاد ہیں۔ اس لاش کو دیکھ کر میں کانپ گیا تھا۔ وہاں درازوں پر لاشوں کے نام نہیں تھے بلکہ نمبر لگے ہوئے تھے۔ جس نمبر کی دراز میں اختر شیرانی کی لاش تھی اس کو کھول کر سرد خانے کے اہلکاروں نے لاش کو نکالا اور میز پر رکھ دیا۔ اختر صاحب اس طرح لیٹے ہوئے تھے۔ جیسے کہ سو رہے ہیں اور ابھی تھوڑی دیر میں اٹھ جائیں گے۔ لیکن سرد خانے میں رہنے کی وجہ پورا جسم اکڑ گیا تھا۔ غسل اور تکفین کے بعد coffin carrying van میں تابوت رکھ کر ہم نیّر منزل لے آئے، جہاں اختر شیرانی کی فیملی، دوست احباب، ادیب، صحافی کافی بڑی تعداد میں منتظر تھے۔ یہاں تمام لوگوں نے باری باری اختر شیرانی کا منہ دیکھا۔ اس عمل میں کافی دیر لگی۔ اس کے بعد تابوت کو بند کر کے coffin لیجانے والی گاڑی میں رکھ کر میانی صاحب کے قبرستان پہنچے۔ دفن سے پہلے آخری رسمِ منہ دکھائی دی۔ اس کے بعد تدفین کا عمل شروع ہوا اور اختر شیرانی کو منوں مٹی میں دفن کر دیا گیا۔ داؤد رہبر اگر جا کر دیکھنا چاہیں تو آج بھی اختر شیرانی کی قبر میانی صاحب کے قبرستان میں موجود ہے، جس پر ان کے نام کا کتبہ بھی لگا ہوا ہے۔

میرا خیال ہے کہ مظہر شیرانی کے ٹھوس دلائل، باریک بینی کے ساتھ تجزیے اور حقائق کے بیان کے بعد اور میرے اس eye-witness بیان کے بعد داؤد رہبر کی پوری کہانی سوائے ''کہانی'' کے اور کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ میرا مشورہ ہے کہ اللہ کے سامنے جوابدہ ہونے سے پہلے، داؤد رہبر کو اس دنیا میں ہی اعترافِ گناہ کر لینا چاہیے۔ اس سے ان کے مابعد الموت مواخذے میں بھی کافی کمی آ جائے گی اور لوگوں کو بھی اندازہ ہو جائے گا کہ ان کا ضمیر ابھی مردہ نہیں ہوا ہے۔

نیّر آپ کو دعائیں لکھوا رہی ہیں۔

دعا گو۔۔۔ آپ کا ذہانت
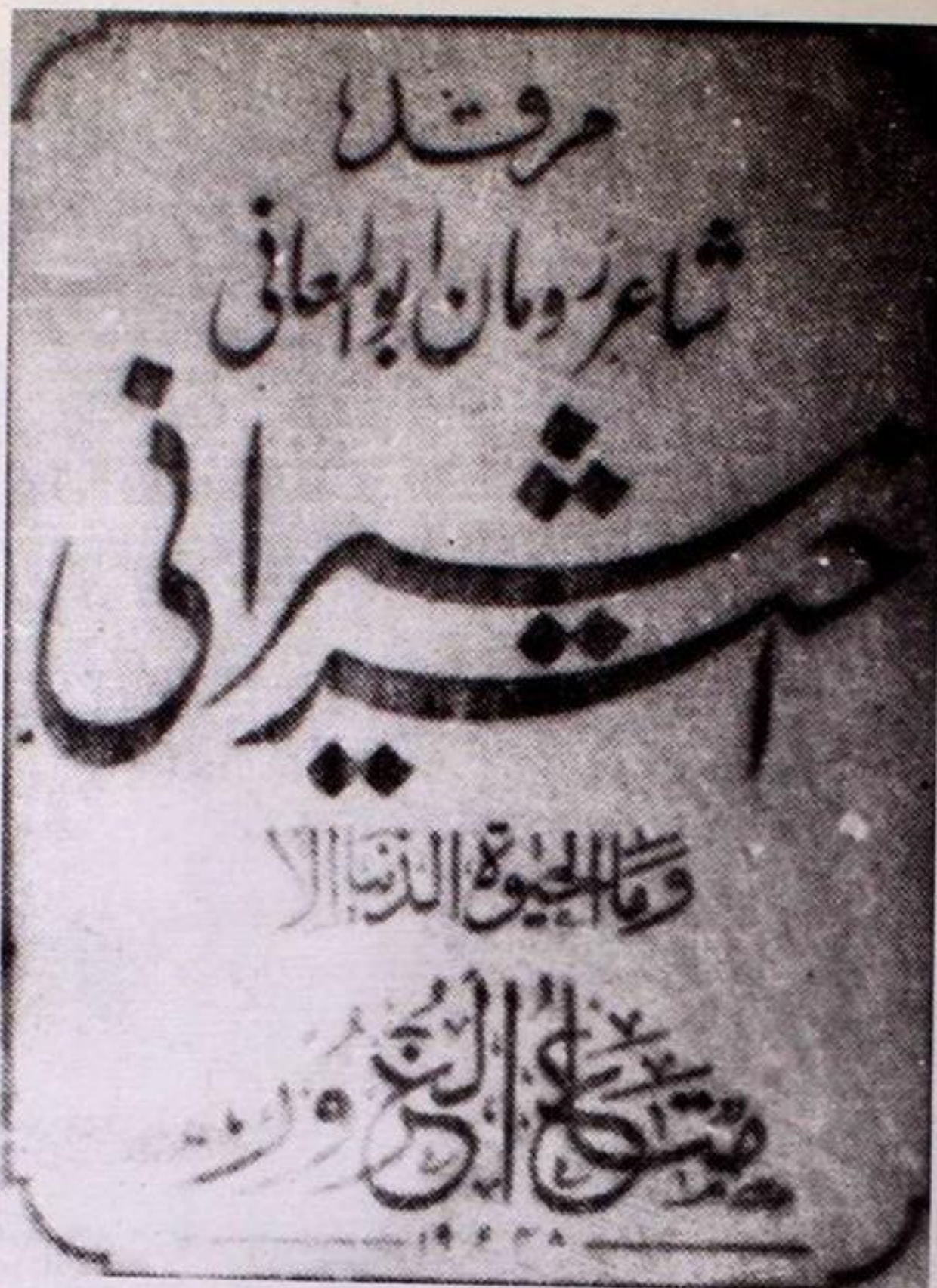
لاہور کے قبرستان میانی صاحب میں علامہ عبداللہ منہاس کی قبر سے سات میٹر جانب مشرق سڑک کے پار احاطۂ زینت بیگم کے اندر شاعر رومان محمد داؤد اختر شیرانی کی آخری آرام گاہ ہے۔ ان کے لوح مزار پر اندر کی جانب یہ عبارت کندہ ہے:

خواب گاہ حضرت ابوالمعانی اختر شیرانی مرحوم

دامان خرابہ زار میں ہے
اک شاعر نوجواں کی تربت

لوح کے باہر کی جانب یہ عبارت مرقوم ہے:

مرقد
شاعر رومان ابوالمعانی
اختر شیرانی
وماالحیوۃ الدنیا الا
متاع الغرور
۱۹۴۸

خورشید رقم

(اقتباس از خفتگانِ خاکِ لاہور)

تحقیق کے
آئینے
میں
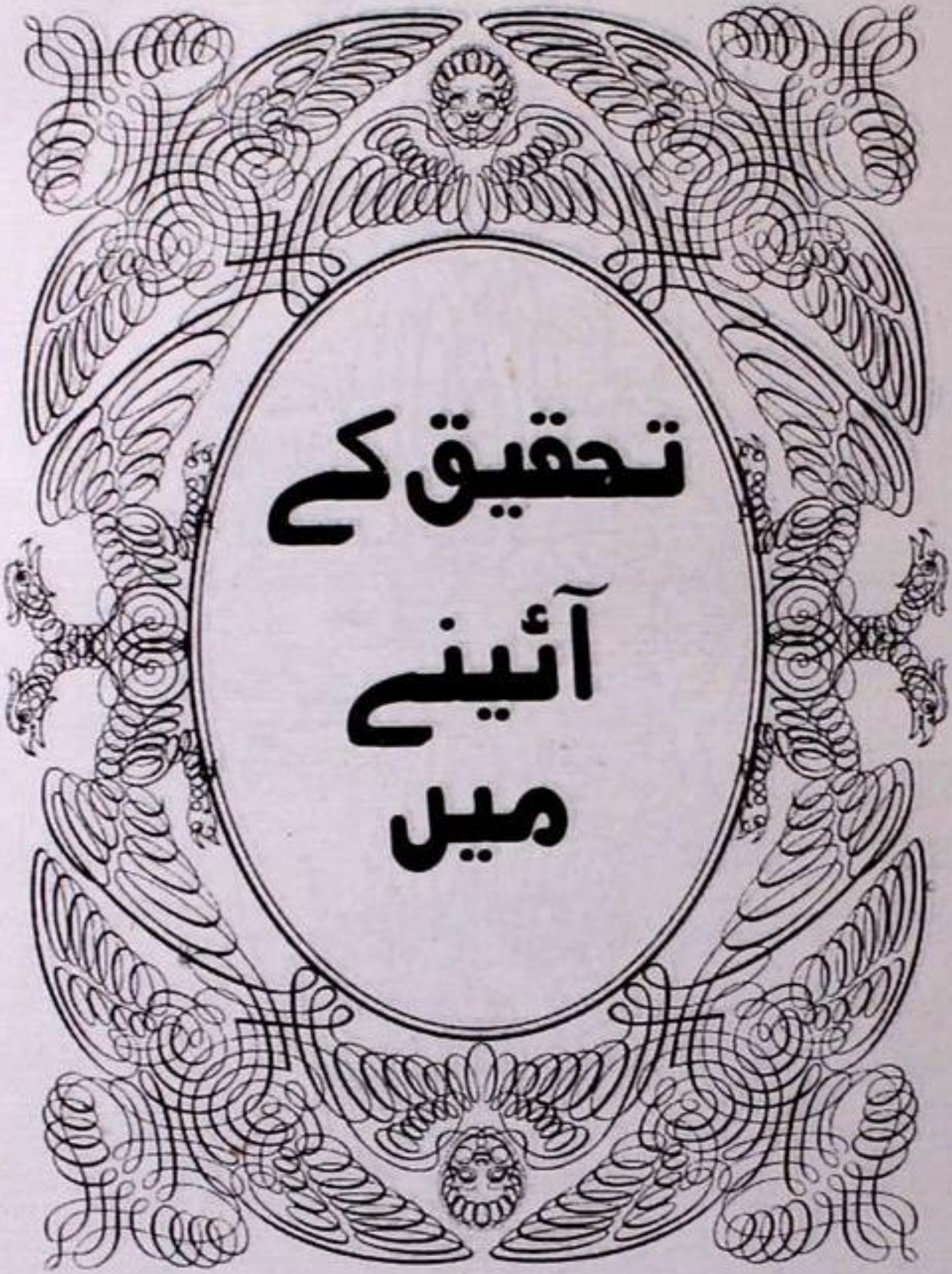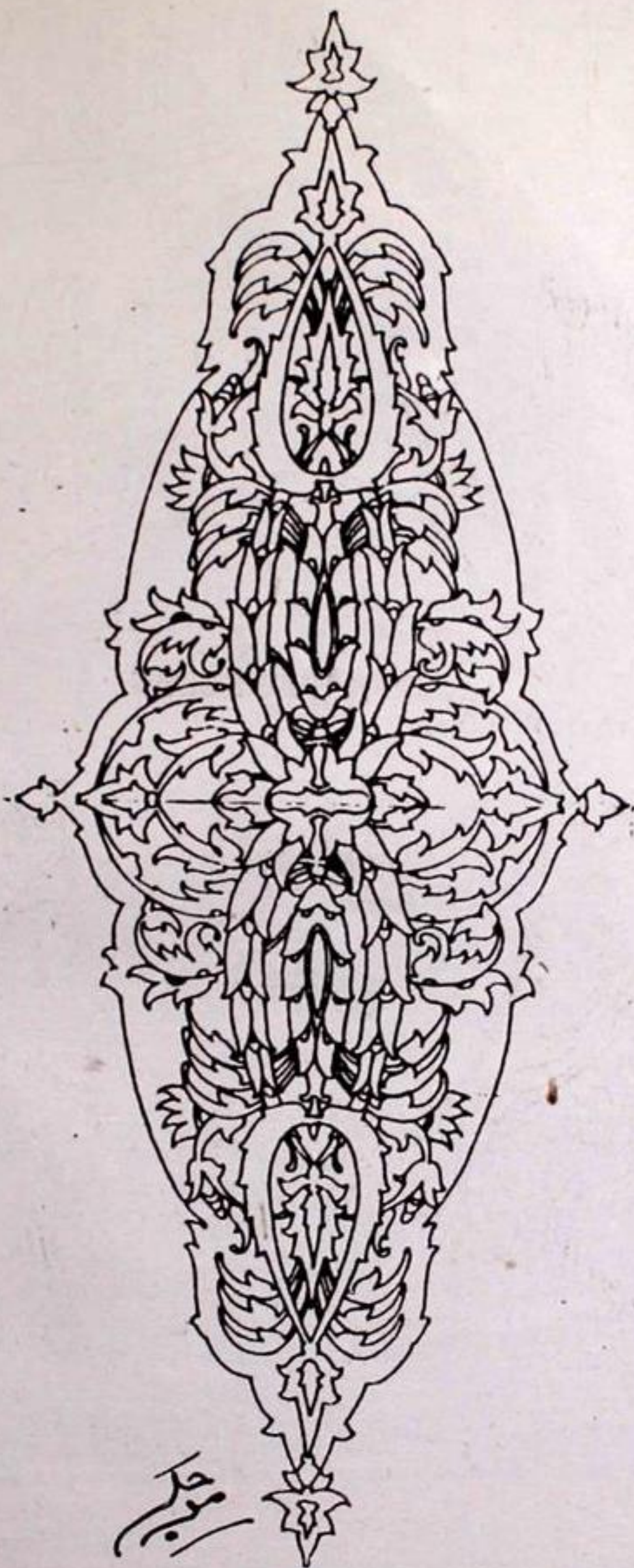
ظفر علی راجا

خط اور فنِ خطاطی کی مختصر تاریخ

(دوسرا حصہ)

پشاور میں خطاطی کے آثار

مغلیہ دور کے آخری بادشاہوں کے عہد میں خطاطی کا فن دہلی اور دوسرے اہم شہروں سے نکل کر ہندوستان کی دور دراز ریاستوں اور علاقوں تک پھیل چکا تھا۔ ان علاقوں میں موجودہ صوبہ سرحد، کشمیر، سندھ، پنجاب اور بہاولپور وغیرہ شامل ہیں۔ پشاور کے قدیم خطاطین میں میاں محمدی پشاوری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ میاں محمدی نے اٹھارویں صدی کے اوائل میں خطاطی کی تعلیم و تربیت کیلئے ایک ادارے کی بنیاد رکھی اور اس اولین ادارے میں داخلے لینے والے طلباء کو خطاطی، خوش نویسی اور نقاشی کا فن سکھایا۔ اس طرح یہاں نامور علماء اور فضلاء کی کتب زیور کتابت سے آراستہ ہوئیں۔ اس ادارے کے ایک نامور خطاط کا نام گل احمد پشاوری ہے۔ یہ فن کار خط نستعلیق اور خط نسخ دونوں میں یکساں مہارت کے ساتھ ساتھ زود نویسی میں کمال رکھتا تھا۔ گل محمد پشاوری کے قلم سے لکھے ہوئے ''دیوانِ نجیب'' کے دو نسخے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک پر کتابت کی تاریخ 17 ربیع الاول 1178ھ اور دوسرے پر اسی سال کے ماہ صفر کی تاریخ درج ہے۔ جس سے اس کی زود نویسی کا اندازہ ہوتا ہے۔ گل محمد پشاوری کے تحریر کردہ ''دیوان سکندر خان'' اور ''دیوان مصری خان'' بھی پشتو اکیڈیمی پشاور یونیورسٹی میں موجود ہیں جن پر خوبصورت خطاطی کے ساتھ ساتھ دیدہ زیب نقش و نگار بھی بنائے گئے ہیں۔ اسی طرح گل محمد پشاوری نے سرحد کے شہرہ آفاق شاعر رحمن بابا کا دیوان کشمیری کاغذ پر اس انداز سے سپرد قلم کیا کہ خطاطی کے گرد خوبصورت نقش و نگار سے مزین حاشیوں کے علاوہ

بہت سی تصاویر بھی نفس مضمون کے ساتھ شامل کیں۔ خط نستعلیق کا لکھا ہوا یہ نایاب نسخہ آج کل افغانستان میں کابل کے سرکاری کتب خانے کی زینت ہے۔ گل محمد پشاوری کا تفصیلی تذکرہ افغانستان کے عزیز الدین وکیلی کی کتاب ''ہنر خط در افغانستان'' میں درج ہے۔

زین الدین پشاوری اسی زمانے کا ایک اور ممتاز خطاط ہے۔ یہ گل محمد پشاوری کا ہم عصر تھا۔ لیکن اس نے خطاطی کی تعلیم کابل کے بجائے ہندوستان کے نامور خطاطوں سے حاصل کی تھی۔ وہ خط نسخ اور نستعلیق دونوں کا ماہر تھا۔ زین الدین پشاوری نے امیر فیضی طلب خان کی فرمائش پر خوبصورت خط نستعلیق میں دیوان یونس کی کتابت کی تھی۔ اس پر 1176ھ سن کتابت درج ہے۔ دیوان یونس کا یہ نسخہ آج بھی کابل کے سرکاری کتب خانے میں گل محمد پشاوری کی مخطوطہ کتب کے پہلو بہ پہلو دیکھا جا سکتا ہے۔ اس زمانے کے تیسرے قابل ذکر خطاط کا نام مولانا غوث محمد پشاوری ہے۔ یہ شخص عالم فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ خطاطی اور حاشیہ کاری کا ماہر تھا۔ اپنے روحانی پیر کے کہنے پر اس نے دل کش حاشیوں کے درمیان قرآن مجید کی کتابت مکمل کی۔ یہ منفرد کام اس نے 1189ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ مولانا غوث محمد کا انتقال پشاور میں ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔

اٹھارویں صدی کے اوائل میں میاں محمدی پشاوری نے خطاطی کی تعلیم و تربیت کیلئے ایک باقاعدہ ادارے کی بنیاد رکھی۔ گل محمد پشاوری اسی ادارے کا تربیت یافتہ خطاط تھا

مغلیہ عہد کا زوال اور خطاطوں کی ہجرت

ارض ہندوستان کے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے زوال کے بعد خطاطی کا دبستان دہلی سرکاری سرپرستی سے بتدریج محروم ہوتا چلا گیا۔ دربار دہلی سے وابستہ بہت سے خطاطین نے بھارت میں دوسری مسلمان ریاستوں کا رخ کیا اور وہاں کے مقامی امراء اور نوابین کی سرپرستی میں فن خطاطی کو زندہ رکھنے کی مساعی کا آغاز کیا۔ 1857ء اور اس کے فوراً بعد کے زمانہ میں خطاطی کے حوالے سے تباہ شدہ دہلی میں جن خطاطین کے کام کا سراغ ملتا ہے۔

ان میں مرزا عباد اللہ بیگ ابن مرزا عبد اللہ بیگ، حافظ سید امیر الدین، محمد جان فرزند میاں محمد عاشوری، میر امام علی، میر جلال الدین ابن امام علی، شنکر ناتھ کشمیری، سید محمد ناصر وزیر اور سید حیدر حسین خان وغیرہ شامل ہیں۔ مرزا عباد اللہ بیگ نے بچپن ہی میں بہادر شاہ ظفر دور کے ممتاز ترین خطاط میر پنجہ کش کی شاگردی اختیار کر لی تھی۔ بعد ازاں اس نے مسلسل مشق کی بنا پر خوش نویسی میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ اسے ''زمرد رقم'' کا خطاب دیا گیا۔ 1857ء کے کچھ ہی عرصہ بعد عباد اللہ بیگ نے حالات کو ناموافق پا کر پٹیالہ کی جانب ہجرت کی، اور ریاست پٹیالہ میں دوبارہ سے منسلک ہوگیا، اور وہیں وفات پائی۔ ان کی اولاد میں مرزا محمود نے خطاطی میں نہ صرف مہارت حاصل کی۔ بلکہ خوش نویسی کے فن پر ایک کتاب بھی سپرد قلم کی۔ حافظ سید امیر الدین بھی میر پنجہ کش کے شاگردوں میں سے تھا۔ اس کو خط نسخ اور خط نستعلیق دونوں میں بیک وقت کمال حاصل تھا۔ اس کی لکھی ہوئی دو وصلیاں سید یوسف بخاری (مصنف کتاب ''خطاطی اور ہمارا رسم الخط'') کے پاس تھیں جو انہوں نے حکومت پاکستان کو عجائب گھر کی زینت بنانے کیلئے پیش کی تھیں۔ سید یوسف بخاری کے والد سید حامد خود بھی خط نسخ کے ماہر تھے۔ آپ سید محمد امام جامع مسجد دہلی کے فرزند ارجمند تھے۔ قلم کی روانی اور تحریر کا حسن توازن،

نمونہ خطاطی سید حامد بن سید محمد

یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ

مُّبِيْنٌ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ قَالَ مَنْ يُّحْيِ

الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَا

ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ سید محمد ناصر وزیر ہندوستان کے مشہور شاعر خواجہ میر درد کے نواسے تھے۔ انہیں بھی خط نسخ اور نستعلیق تحریر کرنے میں مہارت حاصل تھی۔ سید حیدر حسین شاہ، سید حیدر علی کے فرزند تھے۔ عربی اور فارسی کے عالم ہونے کی ساتھ ساتھ خط نسخ اور خطِ گلزار بہت دل کش نداز میں لکھتے تھے۔ مغل عہد میں ان کے والد شاہی توپ خانہ میں داروغہ ہوا کرتے تھے۔ خطاطی کے دبستان دہلی کی ویرانی پر سید حیدر حسین خان ریاست بیکانیر چلے گئے جہاں بطور مہتمم بندوبست محکمہ مال میں ملازمت اختیار کر لی۔ میر امام علی پیشہ کے لحاظ سے حکیم تھے لیکن خطِ نسخ میں خوبصورت خطاطی میں انہیں امتیاز حاصل تھا۔ ان کے علاوہ مرزا احمد یار بیگ نسخ میں استادی کے درجہ پر فائز تھے۔ مرزا عبدالرزاق نستعلیق کی خطاطی میں ممتاز تھے۔ جبکہ سید رحمت علی خطِ نسخ و نستعلیق دونوں میں یکساں مہارت کے ساتھ لکھتے تھے۔ غیر مسلم اہل فن میں راجہ ناگر مل کے خاندان کے چشم و چراغ راجہ امید سنگھ اور راجہ شیر سنگھ نے خطاطی کی تربیت رائے پریم ناتھ سے حاصل کی اور نام کمایا۔ محمد حفیظ خان۔ کے شاگرد منشی چھمن سنگھ اور پنڈت چھمی رام بھی اپنے اپنے زمانے میں مشہور خطاط رہے۔ ان کے علاوہ کنور پریم کنور، راجہ نند رام، منشی خوش وقت رائے وانگی، لالہ درگا پرشاد اور شنکر نوساری نے بھی خطاطی کے میدان میں اپنی یادیں چھوڑی ہیں۔ لیکن ان کے تفصیلی حالات زندگی اور نمونہ ہائے فن کی تلاش ابھی کسی محقق کی نگاہ التفات کے انتظار میں ہے۔

مغلیہ دور حکومت کے خاتمے اور سلاطین دہلی کے زوال کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی انگریز حکومت میں اسلامی خطاطی جیسے فن لطیف کی سرپرستی کی روایت مفقود ہوتی چلی گئی۔ عربی اور فارسی زبانوں کی سرکاری سطح پر نہ صرف یہ کہ پذیرائی ختم کر دی گئی بلکہ لارڈ ہارڈنگ کی تحریک پر عربی اور فارسی میں تعلیم یافتہ افراد پر سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ اس اقدام سے عربی فارسی زبانوں کے ماہرین، علماء، فضلاء اور خطاط اقتصادی بحران اور وقت کی ناقدری کا شکار ہو کر رہ گئے۔ ان حالات میں ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی مسلم ثقافت کی آئینہ دار متعدد ریاستوں میں قائم خطاطی کی روایت اور تاریخ نے اہمیت اختیار کر لی۔ اور دہلی میں فروغ پانے والی خطاطانہ سرگرمیوں کی چکاچوند نے جن جن ریاستوں کی تاریخ خطاطی کو نقادان فن کو نگاہوں میں تفصیل سے نہیں آنے دیا تھا، وہ توجہ کا مرکز بننے لگیں لیکن ان ریاستوں کا ذکر کرنے سے قبل دربار لکھنو کا ذکر ضروری ہے۔

انگریز حکومت نے اسلامی خطاطی اور عربی فارسی زبانوں کی سرکاری سرپرستی ختم کر دی۔

مغل سلطنت کے عہد زوال میں اودھ کے علاقے کے وزیر اودھ نواب غازی حیدر الدین خان نے 1029ھ میں اپنی علیحدہ بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد دہلی کے حالات سے دل برداشتہ ہو کر فن کار اور خطاط لکھنو کی طرف نقل مکانی کرنے لگے۔ اودھ کے حکمران نواب جلال الدین حیدر شجاع الدولہ (1166-1188ھ) 22 سال اقتدار میں رہا اس دور میں مسلمان فنکاروں کے ساتھ ساتھ غیر مسلم خطاطین کی بھی حوصلہ افزائی کی گئی۔ منشی چندر بھان دہلوی اس زمانے کا شہرت یافتہ خطاط تھا۔ اس نے خط نستعلیق استاد ویلمی سے جبکہ خط شکستہ کفایت خان سے سیکھا۔ اس کی تحریر کی دل کشی قابلِ دید ہوا کرتی تھی اس کی مخطوطہ کتاب ''چہار چمن'' اس کے فن کا شاندار نمونہ تصور کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ لکھنو کے دبستان خطاطی میں منشی تیج بھان دہلوی کا نام بھی اہم خطاطوں میں شامل ہے۔ منشی تیج بھان نے بھی استاد ویلمی سے خطاطی کی تربیت حاصل کی۔ منشی چند بھان اور منشی تیج بھان خوبصورت انداز میں وصلیاں تحریر کیا کرتے تھے۔ ان کی لکھی ہوئی وصلیاں اب تک لکھنو میں مختلف مقامات پر دیکھی جا سکتی ہیں۔

نواب آصف الدولہ نے اپنے دور اقتدار (1188-1212ھ) میں فن خطاطی کے فروغ میں خصوصی دلچسپی لی اور دہلی سے آنے والے نامور خطاط حافظ نور اللہ کی نہ صرف زبردست پذیرائی کی بلکہ اسے دربار کے دفتر انشاء و مراسلات کا افسر اعلیٰ بھی مقرر کیا۔ نقادان فن حافظ نور اللہ کو جادو نگار خطاط کے نام سے بھی یاد کرتے تھے۔ اس کی لکھی ہوئی عام سی وصلیاں بھی ایک ایک اشرفی میں فروخت ہوتی تھیں۔ حافظ نور اللہ نے نواب آصف الدولہ کو پیش کرنے کیلئے اس دور کا مقبول عام مرثیہ ہفت بند کاشی دیدہ زیب انداز میں تحریر کیا تھا۔ نواب سعادت علی خان نے گلستان شیخ سعدی کو مخطوط کرنے کی فرمائش کی تو حافظ نور اللہ نے مطلوبہ قلمی نسخہ تیار کرنے کیلئے ہزار سے زیادہ قلم، ایک سو قلم تراش اور 80 گڈی کاغذ طلب کیا۔ (یاد رہے کہ ایک گڈی کاغذ آج کل کے ایک رم کے برابر شمار کیا جاتا تھا۔) خواجہ سعادت علی خان نے یہ تمام سامان مہیا کر دیا۔ تو حافظ نور اللہ نے گلستان سعدی کی نستعلیق خطاطی کا کام آغاز کیا لیکن ابھی اس نسخے کے سات ابواب ہی تحریر ہوئے تھے کہ قضاء کا بلاوا آ گیا۔ آٹھواں اور آخری باب مرحوم خطاط کے فرزند حافظ ابراہیم نے مکمل کر کے یہ نسخہ نواب صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ حافظ ابراہیم کا لکھا ہوا یہ آٹھواں باب اپنے والد کی طرز تحریر سے اس قدر مشابہ تھا کہ نقادوں کو دونوں میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا۔ حافظ ابراہیم نے بعد ازاں خط نستعلیق کو مزید سنوارا اور حروف کے دائروں کو نئی اختراع کا تجربہ کیا۔ اس زمانے میں خط نستعلیق میں حروف

ا ب ت ث ج ح خ د ذ ر ز س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک گ ل م ن و ہ ی

هر که آموزد ادب گردد ادیب

بکوشید تا جامهٔ نیک بپوشید

فخر بشر آری همه از فضل و کمالست

ز دانش به اندر جهان هیچ نیست

دور اندیش همواره بیدار است

بز دوستی در خور خویش بگیر هم

هر که ناشایسته گوید ناشایسته شنود

کای نور چشم من بجز از کشته ندروی

جهل خوابست و علم بیداری همه

خط نستعلیق

خط نستعلیق کی ایک خوبصورت مشق

کے دائرے بالکل گول ہوا کرتے تھے۔ حافظ ابراہیم نے پہلی مرتبہ بیضوی دائروں کو رواج دیا اور دائروں کو قدرے بائیں جانب جھکاؤ کے ساتھ تحریر کیا۔ نقادوں نے اس جدت کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور دوسرے خطاطوں نے اس روش کو تیزی سے اپنا لیا۔ حافظ ابراہیم کے بہت سے شاگردوں میں سے منشی ہادی خان اور منشی منسارام کشمیری نے عوامی مقبولیت کا اعزاز حاصل کیا۔ حافظ نور اللہ نے لکھنؤ کی مسجد آصفیہ کے محراب اور کنویں پر قطعات تحریر قم کئے تھے جو آج بھی اس تاریخی مسجد میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ حافظ نور اللہ کے شاگردوں میں اس کے بیٹے حافظ ابراہیم کے علاوہ وجیہہ الدین، محمد عباس اور سرب سنگھ دیوانہ کو فن خطاطی کے استاد تسلیم کیا جاتا ہے۔

مشہور عالم خطاط آغا عبد الرشید ویلمی کے ایک اور شاگرد قاضی نعمت اللہ لاہوری نے نواب آصف الدولہ کے دربار سے شہرت حاصل کی۔ اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی مفردات اپنے زمانے ہی میں اس کی مقبولیت کا حوالہ بن گئی تھیں۔ قاضی نعمت اللہ لاہوری کے شاگردوں میں مولوی محمد اشرف اور مولوی قلی احمد قابل ذکر ہیں۔

حافظ ابراھیم نے خط نستعلیق میں پہلی مرتبہ بیضوی دائروں کو رواج دیا اور پھر حروف کے دائروں کو قدرے بائیں جانب جھکاؤ کے ساتھ تحریر کرنا شروع کیااس جدت کو ہم عصر خطاطوں نے تیزی سے اپنا لیا۔

نواب آصف الدولہ کے دربار کے معروف ترین طغرا نویس کا نام میر عطا حسین ہے۔ میر عطا حسین اٹاوہ کے خطاط محمد باقر خان کا بیٹا تھا۔ اپنے باپ سے خطاطی کی تربیت حاصل کرنے کے بعد یہ لکھنؤ آیا تو جنرل سمتھ نے اس کی فنی صلاحیت کو بھانپ کر اسے اپنے ہاں میر منشی بھرتی کر لیا۔ اس کے بعد میر عطا حسین نے نواب آصف الدولہ کے دربار تک رسائی حاصل کی اور نواب کی دعوت پر مستقل طور پر دربار سے وابستہ ہو گیا۔ میر عطا حسین ہی وہ خطاط ہے جس نے سب سے پہلے قصہ چہار درویش کو فارسی سے اردو میں منتقل کیا اور اسے نوطرز مرصع کا نام دیا۔ یہ کتاب 1776ء میں تحریر کی گئی تھی۔ نواب آصف الدولہ اور نواب سعادت علی خان کے بعد نواب واجد علی شاہ کے دور میں منشی عبد الحئی فن خطاطی میں نمایاں مقام کا حامل دکھائی دیتا ہے۔ یہ باضابطہ طور پر دربار سے وابستہ تھا اور 1856ء میں جب انگریز طالع آزماؤں نے نواب واجد علی شاہ کو اقتدار سے محروم کر کے کلکتہ میں نظر بند کر دیا تو منشی عبد الحئی اس آزمائش کی

گھڑی میں نواب کے ساتھ رہا۔ منشی عبدالحئی کے شاگردوں کا ایک طویل سلسلہ موجود تھا۔ جن میں سے منشی امیر اللہ تسلیم نارنوی، منشی علی میر اور منشی عبدالطیف کے علاوہ میر عقیل احمد بلگرامی وغیرہ کے نام شامل ہیں منشی عبدالحئی اور ان کے شاگردان رشید کی خطاطانہ روش کے بعد لکھنو کی تاریخ کتابت میں منشی شمس الدین کا نام ممتاز نظر آتا ہے۔ منشی شمس الدین نواب آصف الدولہ کے دربار سے منسلک حافظ نور اللہ کے باصلاحیت فرزند حافظ ابراہیم کے نامور شاگرد منشی ہادی علی لکھنوی کا شاگرد تھا۔ وہ 1835 میں پیدا ہوا اور منشی ہادی علی سے نستعلیق خطاطی میں تربیت کے بعد اتنی مہارت حاصل کی کہ اعجاز رقم کا خطاب پایا۔ شمس الدین اعجاز رقم کو خطاطی کے دبستان لکھنو کے دور جدید کا بانی بھی کہا جاتا ہے اس نے خط نستعلیق اور نسخ کو نئی شان کے ساتھ

یار من

شد آن جان جہان دامن کشان چون از چمن بیرون
روان دادن جان مرغان ز چمن گوئی ز تن بیرون
بجو آئی سوی من چون تن گل از مردن بی تو
روان چون جان ز تن آید من از کفن بیرون

محمد شمس الدین ۹۳ء

لکھنے کی طرح ڈالی۔ اعجاز رقم کے بعد آنے والے خطاطین کی پوری نسل پر اس کے فنی اثرات کی نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ اس باہمت قلم کار نے انگریزی اثر ورسوخ کی وجہ سے فن خطاطی کی ناقدری کے دور میں بھی اسے مقبول بنانے کی جدوجہد کی۔ شمس الدین اعجاز رقم نے فن خطاطی کو عوام میں ازسرنو روشناس کرانے کیلئے تنویر شمس، گلدستہ ریاحین، مرقع نگاریں اور اعجاز رقم نامی کتب کے علاوہ تحریر کو نکھار بخشنے کے ہنر سے آشنائی کیلئے پانچ حصوں پر مشتمل ایک کاپی بک بھی تیار کی۔ منشی شمس الدین کا انتقال 1915ء میں لکھنو میں ہوا اس وقت اس کی عمر 80 برس تھی اسی زمانے میں منشی غلام مرتضی کا نام بھی سامنے آیا۔ جو ویسے تو نستعلیق اور خط شکستہ کا خطاط تھا۔ لیکن اس قدر تیزی سے قلم چلاتا تھا کہ پورے لکھنو میں کوئی دوسرا فن کار زودنویسی میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ پروفیسر سید محمد سلیم نے اس کی زودنویسی کا ایک واقعہ تحریر کیا ہے۔ جس کے مطابق ایک مرتبہ خان آرزو دہلی سے پٹنہ جاتے ہوئے ایک رات کیلئے لکھنو میں قیام پذیر ہوا۔ اس کے رخت سفر میں بیس جزو پر مشتمل کتاب سراج اللغات بھی شامل تھی۔ منشی غلام مرتضی نے خان آرزو سے یہ کتاب بہ غرض مطالعہ ایک شب کیلئے مستعار لی اور رات بھر میں اس کی قلمی نقل تیار کر لی۔ یہ واقعہ اس کی حیران کن زودنویسی کا ثبوت ہے۔ لکھنو کے خطاطین میں ایک خاتون کا نام اور کام بھی سامنے آتا ہے اس خاتون کا نام امراؤ بیگم ہے۔ امراؤ بیگم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک وصلی دستیاب ہوئی ہے جس پر 1262ھ کا سن اس نے اپنے ہاتھ سے تحریر کیا ہے۔ حافظ نور

اللہ کے پوتے اور حافظ ابراہیم کے فرزند حافظ سعید الدین نے بھی نستعلیق اور نسخ خطوں میں زبردست مہارت حاصل کی جو اُن کی شہرت کا سبب بنی۔ دبستان لکھنو سے وابستہ دیگر خطاطوں میں منشی عبدالمجید خریطہ نویس، منشی حامد علی، مولوی محمد اشرف، مولوی قل احمد اور مرزا محمد علی کے نام قابل ذکر ہیں۔ مرزا محمد علی نے گلستان سعدی اور پند نامہ کی خطاطی کی جو بہت مقبول ہوئی۔ مرزا محمد علی کے بہت سے شاگردوں نے بھی نمایاں کام کیا۔ ان میں سے نعمت اللہ، خلیفہ بخش اللہ اور میر نثار علی جیسے ماہرین فن شامل ہیں۔ ان کے علاوہ مرزا احمد طباطبائی۔ کتابت خان ، میر سید علی خان، حاجی قاسم، حافظ محمد خورشید، محمد نصیر الدین بہاؤ اللہ اور علامہ تفضل حسین خان نے بھی اپنی زندگیاں فن خطاطی کیلئے وقف کر رکھی تھی۔ علامہ تفضل حسین خان ایک نامور عالم دین تھے۔ لیکن انہوں نے خطاطی میں مسلسل کوشش کے باعث خطِ نستعلیق اور خط شکستہ میں خصوصی مہارت حاصل کر لی تھی۔ ایک طرف تو یہ تمام فنکار خطاطی کے اسالیب کا پرچم اٹھائے اسے زندہ رکھنے کی کوشش کر رہے تھے اور دوسری طرف کتابت کا مستقبل نئی جدتوں اور مشینی طریقوں کے انقلابی زمانے میں داخل ہو رہا تھا۔ 1235ھ/1820ء میں مولوی واحد الدین بلگرامی اور شیخ احمد یمنی نے نواب غازی الدین حیدر کی معاونت سے لکھنو میں اولین چھاپہ خانہ قائم کیا۔ اس کا نام مرتضوی مطبع رکھا گیا۔ اس پریس سے جو پہلی کتاب شائع ہوئی اس کا نام لغت ہفت اقلیم تھا۔ جلد ہی نواب غازی الدین حیدر سے اختلافات کی بناء پر یہ پریس بند ہو گیا۔ لیکن بعد ازاں 1825ء میں مولوی واحد الدین کے پوتے ظہیر بلگرامی نے ایک علیحدہ چھاپہ خانہ مطبع سلطانی کے نام سے قائم کر دیا۔ جس میں کچھ ہی عرصہ بعد لیتھو طریقے سے چھپائی ہونے لگی۔ اس کے بعد 1830ء میں مسٹر آرچر اور منشی نول کشور نے لکھنو میں اپنے چھاپہ خانے لگائے۔ ان چھاپہ خانوں کی کتابیں خط نستعلیق میں ہوا کرتی تھیں۔ جن کی کتابت کیلئے ماہر خطاطین کی خدمات مستعار لی گئیں تھیں۔ مطبع سطانی لکھنو اور مطبع مرتضوی کے ساتھ منشی امیر اللہ تسلیم نارنوی اور منشی عبدالحیٔ جبکہ مطبع صفدری میسور نے محمد عبداللہ شریف، مسلم ایجوکیشن پریس علی گڑھ نے مولوی نذیر الدین قریشی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے علی محمد سپہر رقم، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ نے سید ابو طاہر زیدی اور لئیق حسن، مطبع کریمی بمبئی نے سید ناظم حسین رضوی، مطبع مفید دکن نے شاہ محمد حسین بن حسن کی خدمات حاصل کیں۔ شاہ محمد حسین کا انتقال 1311ھ/1894ء میں ہوا۔ اس طرح ان لوگوں نے جہاں خطاطی کی قدیم طرزوں یعنی خط نسخ، خط ثلث، خط دیوانی، خط شکستہ، خط کوفی اور خط غبار وغیرہ کو مزید سنوارا وہاں خطاطی کو نئے زمانے کی ضروریات سے ہم آہنگ کرنے کیلئے ایک نئے کردار کا آغاز بھی کیا۔

خط دیوانی کے دو شہکار

اس نئے کردار میں چھاپہ خانوں کی فنی ضروریات کے پیش نظر خطاطی کے فن میں نئی اختراعات بھی شامل تھیں۔ اس زمانے میں بہترین چھپائی لیتھو طریقے سے ہوتی تھی۔ اس طریقے کے تحت پہلے ایک مخصوص کاغذ پر قلم سے کتابت کی جاتی تھی۔ پھر اس کتابت کی چھپائی پتھر پر اتاری جاتی تھی۔ اس عمل میں تحریر الٹی ہو جاتی تھی۔ پھر اس پتھر سے حسب منشا سینکڑوں یا ہزاروں کاغذوں پر اس تحریر کو چھاپہ جاتا تھا۔ اس عمل میں یہ تحریر پھر سیدھی ہو جاتی تھی۔ پتھر پر الٹی تحریروں میں اغلاط کی نشان دہی ہونے پر ان کی اصلاح کیلئے الٹی تحریر کے ماہرین کی ضرورت نے جنم لیا۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کیلئے تھوڑے ہی عرصہ بعد لکھنو میں ایسے خطاط سامنے آئے جو خطاطی کے پورے اصول وضوابط کے مطابق پتھر پر الٹی کتابت اس مہارت کے ساتھ کر لیتے تھے کہ مخطوطہ تحریر کے حسن اور دل آویزی میں فرق بھی نہ آئے اور چھپائی کے بعد الٹی یا سیدھی تحریر کی تمیز بھی نہ ہو سکے۔ اس کے بعد خطاطین نے لیتھو چھپائی کیلئے مخصوص کاغذ پر سیدھی تحریر کی ضرورت کو بھی ختم کر دیا۔ اور پورے لوازمات کے ساتھ پتھر پر براہ راست الٹی تحریر لکھنے کی طرح ڈالی۔ اس فن میں منشی سید علی حسن کا نام سب سے نمایاں ہے۔ مولوی شرر موحوم کیلئے منشی تقی حسین نے پتھر پر خط معکوس یعنی الٹی خطاطی کا بیڑہ اٹھایا اور بطریق احسن نبھایا۔ لکھنو کے ان معکوس خطاطین کے فن کی انفرادیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ دوسرے شہروں میں قائم چھاپہ خانوں کے مالکان لکھنو کے خطاطین سے پتھر پر معکوس کتابت کروا کے انہیں اپنے شہروں میں لے جاتے تھے اور اپنی مقصد برداری کیلئے خطاطین کی ناز برداریاں اور تنک مزاجی کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے تھے۔

دبستان لکھنو کی روایت سے منسلک دو اور خطاطوں کا تذکرہ بھی یہاں ضروری ہے ان کے نام شیخ ممتاز حسین جونپوری اور قاضی حمید الدین ہیں۔ قاضی حمید الدین فنی حلقوں میں فرفر رقم کے لقب سے جانا پہچانا جاتا تھا۔ جونپور ان دنوں خطاطی کے اساتذہ کی وجہ سے فنی دنیا میں عزت کے ساتھ دیکھا جاتا تھا۔ جونپور کی یہ عزت خط نستعلیق کے اساتذہ شیخ محمد حسین، شیخ زائر حسین، شیخ خورشید علی اور سید محمد باقر جبکہ خط نسخ کے استاد شیخ حشمت علی جیسے نابغہ روزگار فنکاروں کی مرہون منت تھی جسے بعد ازاں شیخ ممتاز حسین منشی غلام مرتضی اور قاضی حمید الدین

لیتھو چھاپہ خانوں کے قیام کے بعد لکھنؤ میں ایسے خطاط سامنے آئے جو خطاطی کے پورے اصول و ضوابط کے مطابق پتھر پر الٹی کتابت کے ماہر تھے۔

جیسے ماہرین نے بام عروج تک پہنچایا۔ شیخ ممتاز حسین 1881ء میں پیدا ہوا اور شیخ محمد حسین اور شیخ زائر حسین سے خط نستعلیق کی تربیت حاصل کی اس کے بعد اپنی تحریر میں مزید نکھار اور پختگی لانے کیلئے سید محمد باقر جونپوری کی صحبت اختیار کی اور خط نسخ شیخ حشمت علی جونپوری سے سیکھا۔ شیخ ممتاز نے خط نستعلیق اور نسخ میں مہارت حاصل کرنے کے بعد خطِ شکستہ اور خط شفیعا کی مشق اس تسلسل سے کی کہ ان سب خطوں کا استاد کہلایا۔ شیخ ممتاز حسین جونپوری نے ''خط واملاء'' کے عنوان سے ایک کتاب بھی تحریر کی تھی جس پر یو۔ پی (بھارت) کی حکومت نے اسے خصوصی انعام سے نوازا۔ شیخ ممتاز حسین نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ لکھنو میں گزارا۔

قاضی حمید الدین ضلع ایٹہ کے علاقہ مارہرہ سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ خطِ نسخ کے ساتھ ساتھ انگریزی خط بھی نہایت دل کش انداز میں لکھ لیتا تھا۔ لمبی لمبی عبارتیں تیز رفتاری سے ایک توازن کے ساتھ لکھنے میں اسے مہارت حاصل تھی اس فنی مہارت کے سبب اسے فرفر رقم کا لقب دیا گیا۔ اس طرح خطاطی کی دنیا میں یہ فن کار قاضی حمید الدین فرفر رقم کہلایا۔ فرفر رقم شاعر بھی تھا۔ ''تاریخ خط وخطاطین'' میں اس کا ایک شعر نقل کیا گیا ہے جس میں وہ اپنی تیز نویسی پر نازاں دکھائی دیتا ہے۔ شعر کچھ یوں ہے

مارہرہ کے خطاط قاضی حمید الدین کو لمبی لمبی عبارتیں تیز رفتاری سے ایک توازن کے ساتھ لکھنے میں مہارت حاصل تھی جس کے سبب اسے فرفر رقم کا لقب دیا گیا۔

قسمت پہ اپنی ناز نہ کیوں کر ہو اے حمید
رف رف، پلٹ کے دیکھ کہ فرفر رقم ہوں میں

سر جان شور گورنر ایسٹ انڈیا کمپنی نے سلاطین دہلی سے بغاوت کرنے پر بالآخر نواب سعادت علی خان کو اودھ کا بادشاہ تسلیم کر لیا تھا۔ لیکن دہلی کے تخت پر قبضہ مضبوط کرنے کے بعد انہیں اودھ کے بادشاہ کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ لہذا نواب واجد علی شاہ کے دور حکومت تک آتے آتے انکی قوت برداشت جواب دے گئی۔ انہوں نے واجد علی شاہ کو معزول کر کے اودھ کی مکمل حکمرانی اپنے ہاتھ میں لے لی اور نواب غازی الدین حیدر (1814ء تا 1827ء) کے بے اختیار دور حکومت کا آغاز ہوا اس دور میں جان گل کرائسٹ نے کلکتہ میں پہلا چھاپہ خانہ قائم کیا اور خطاطی یا کتابت کی جگہ ٹائپ نے رواج پکڑنا شروع کیا۔ کلکتہ میں پہلے چھاپہ خانے کے

الٓمّٓ ١ البقرة ٢

قال انه يقول انها بقرة لا ذلول تثير الارض ولا
تسقي الحرث مسلمة لا شية فيها قالوا الٰن جئت
بالحق فذبحوها وما كادوا يفعلون ﴿ع﴾ واذ قتلتم نفسا
فادّٰرءتم فيها والله مخرج ما كنتم تكتمون ﴿ع﴾
فقلنا اضربوه ببعضها كذٰلك يحي الله الموتٰى ويريكم
اٰيٰته لعلكم تعقلون ۞ ثم قست قلوبكم من بعد ذٰلك فهي
كالحجارة او اشد قسوة وان من الحجارة لما يتفجر
منه الانهٰر وان منها لما يهبط من خشية الله وما الله
بغافل عما تعملون ۞ افتطمعون ان يؤمنوا لكم وقد كان
فريق منهم يسمعون كلٰم الله ثم يحرفونه من بعد ما عقلوه و
هم يعلمون ۞ واذا لقوا الذين اٰمنوا

ربع [illegible]

خط نسخ میں ایک قرآنی صفحہ

رُو بہ عمل آنے کے بعد دہلی، بمبئی اور ہندوستان کے دوسرے بڑے شہروں میں بھی پریس لگائے جانے لگے۔ ان چھاپہ خانوں کے توسط سے شائع ہونے والی کتب کے ابتدائی مسودہ جات خطاط تحریر کیا کرتے تھے۔ اس طرح ناموافق حالات کے باوجود خطاطی اپنا وجود برقرار رکھنے میں کامیاب رہی۔ خطاطوں کی سرپرستی میں منشی نول کشور (لکھنو) کا چھاپہ خانہ بطور خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس چھاپہ خانہ سے جو نامور خطاط منسلک ہوئے ان میں منشی اشرف علی، منشی امیر اللہ تسلیم، منشی کالکا پرشاد منشی درگا پرشاد موجد، منشی گوبند پرشاد فضا اور منشی شمس الدین اعجاز رقم جیسے لوگوں کے نام شامل ہیں اس طرح ناقدری کے اس دور میں سید محمد علی رضوی، مرزا محمد علی، الحاج محمد علی، الحاج محمد مکسی نے بمبئی میں۔ منشی ممتاز علی، نزہت رقم، حامد علی بخاری مرصع رقم وغیرہ نے دلی میں۔ مومن حسین صفی نے میرٹھ میں جبکہ منشی محمد قاسم نے لدھیانہ میں فن خطاطی کو زندہ رکھنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اسی دور کے ایک اور خطاط منشی محمد الدین کا تذکرہ بھی یہاں ضروری ہے۔ منشی محمد الدین، ضلع گوجرانوالہ کے علاقے جنڈیالہ سے تعلق رکھنے والے مولوی نظام الدین کا بیٹا تھا۔ اس خاندان نے دہلی میں مستقل رہائش اختیار کرلی تھی۔ مولوی نظام الدین کا خاندان دو تین سو سال سے خطاطی کے پیشے سے منسلک تھا۔ منشی محمد الدین خط نسخ اور نستعلیق دونوں میں استادی کے درجے پر فائز تھا۔ اس نے ایک ایسا نادر نسخہ قرآن تیار کیا تھا۔ جس کے ہر سطر ''الف'' سے شروع ہوتی تھی۔ اسی طرح ایک دوسرے قرآن کی خطاطی اس انداز میں کی تھی کہ اس کی ہر سطر لفظ ''ک'' پر ختم ہوتی تھی۔ منشی محمد الدین کو خطاطی کے حوالے سے ایک اور منفرد اعزاز حاصل ہے۔ 1932ء میں خانہ کعبہ کا غلاف تاریخ میں پہلی مرتبہ ہندوستان کے شہر دہلی میں تیار ہوا تھا۔ اس غلاف کے کپڑے پر قرآنی آیات کی خطاطی کی سعادت منشی محمد الدین کے قلم کو حاصل ہوئی تھی۔ منشی محمد الدین نے 1943ء کے دوران دہلی ہی میں وفات پائی۔ اس کی اولاد میں سے اس کی بڑی لڑکی فاطمہ الکبریٰ اور بیٹے حافظ محمد یوسف دہلوی نے اپنے والد کی فنی وراثت کو نہ صرف پوری ذمہ داری کے ساتھ فروغ دیا بلکہ حافظ محمد یوسف دہلوی کو تو فن خطاطی میں مسلم الثبوت امام کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ برصغیر پاک وہند کے پڑوسی ملک افغانستان میں بھی تقریباً اسی زمانے کچھ نئے اور صاحب کمال خطاطوں نے شہرت حاصل کی جنہوں نے خطِ کوفی، خطِ نسخ اور خطِ نستعلیق کو افغانستان میں فروغ دیا۔ ان میں فیض احمد افغانی، سلطان محمد خندان، اسماعیل افغانی، داؤد اطیسنی، تاج محمد افغانی اور اشبارا جیسے لوگ شامل ہیں۔ افغانستان

جان گِل کرائسٹ نے کلکتہ میں برصغیر کا پہلا چھاپہ خانہ قائم کیا۔ تو خطاطی کی جگہ ٹائپ نے رواج پکڑنا شروع کیا۔

خط کافی میں مرصع خطاطی
کا ایک دلکش نمونہ
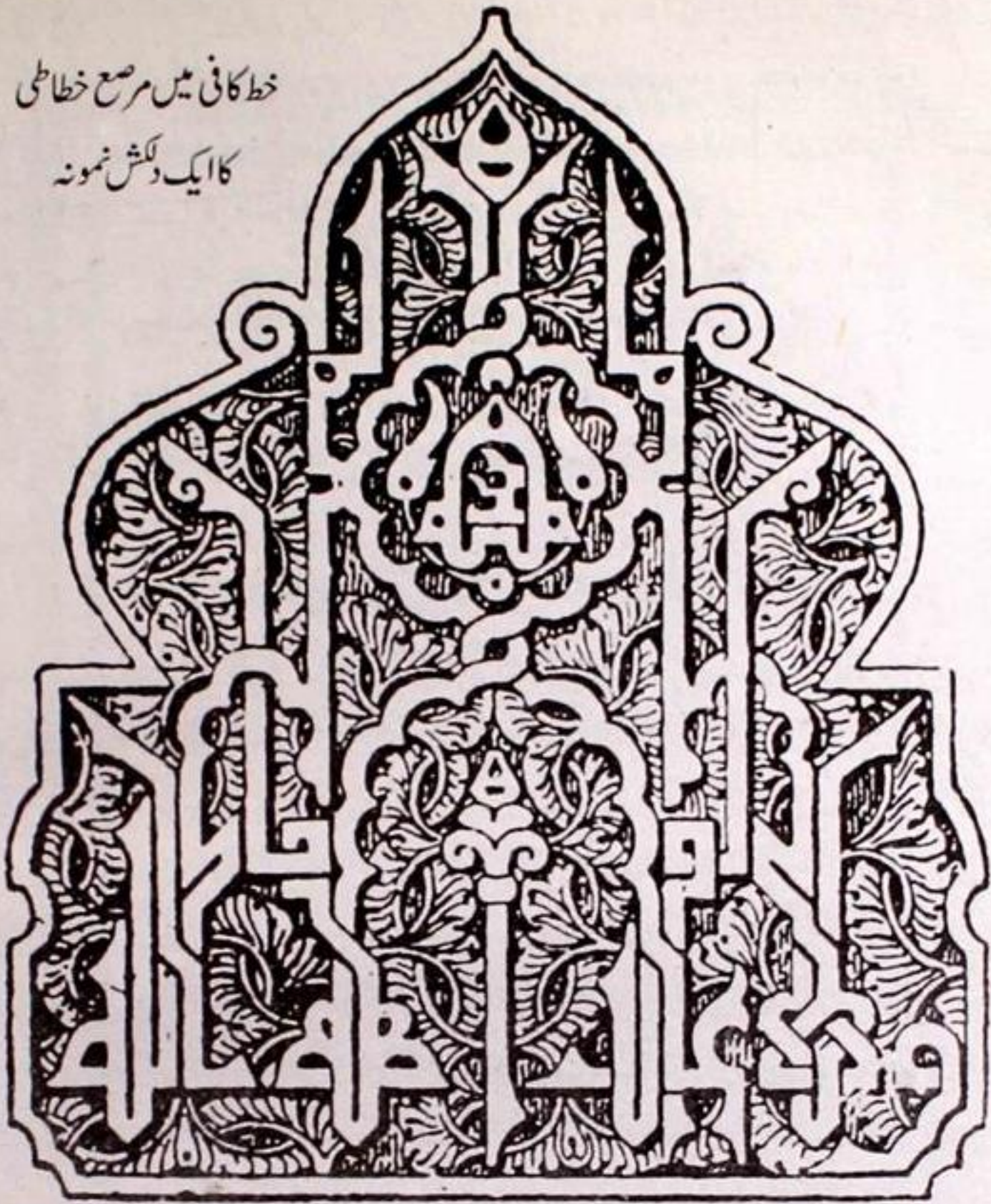
میں مذکورہ بالا مرد خطاطین کے پہلو بہ پہلو ایک خاتون کا اصل نام تو افغانی روایت کے مطابق سامنے نہیں آ سکا لیکن یہ خاتون خطاط حلقوں اور عوامی سطح پر زوجہ عبد القدوس خان افغانی کے عرفیت سے مشہور ہوئی اور 1986ء تک حیات تھی۔

انگریزوں کے ہاتھوں شاہان اودھ کے خاتمے کے ساتھ ہی خطاطی کا دبستان لکھنو بھی اپنی مرکزیت قائم نہ رکھ سکا۔ اور لکھنو سے وابستہ بہت سے فن کاروں اور خطاطوں نے ہندوستان کی دوسری ریاستوں کا رخ کیا۔ جن ریاستوں میں خطاطین کی فنی صلاحیتوں کی حوصلہ افزائی کی۔ ان میں ریاست حیدر آباد، رام پور، بھوپال، ٹونک، جے پور، الور اور پٹیالہ قابل

ذکر ہیں۔ رام پور میں خطاطی کے حوالے سے جو شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہیں اس کا نام میر احمد حسن بن سید علی حسینی ہے۔ یہ لکھنو کا باشندہ تھا لیکن نواب کلب علی خان کے دور میں لاہور چلا آیا تھا۔ لاہور میں اس نے میر عرض علی اور مولوی الٰہی بخش سے خط نستعلیق کی تعلیم حاصل کی۔ اور پھر رام پور منتقل ہو گیا۔ ایک مرتبہ ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ منٹو نے 1897ء سے کچھ پہلے رام پور کا دورہ کیا تو احمد حسن کی تحریریں دیکھ اس نے یقین نہ کیا کہ یہ تحریریں ہاتھ سے لکھی ہوئی ہیں۔ اتفاق سے احمد حسن اس کتب خانے میں موجود تھا۔ اس نے کھڑے کھڑے ویسی ہی تحریر لکھ کر گورنر جنرل کو حیرت زدہ کر دیا نواب رام پور نے کشمیر سے آغا غلام رسول کاشمیری اور آغا محمد حسن کشمیری کو بھی اپنی ریاست میں ملازمت دی یہ دونوں خط ثلث او خط نسخ ماہرین میں شمار ہوتے تھے۔

ریاست حیدر آباد کے مشہور خطاطوں میں مرزا احمد علی، الحاج قاضی محمد یعقوب علی، کرنل قاری بسم اللہ بیگ مصحف قلم، قاری خواجہ محمد احمد نادر قلم، سید نادر علی قندھاری، سعید جہاں بیگم، سید رقم اور امتہ العزیز ساجدہ بیگم کے نام قابل ذکر ہیں، مرزا محمد علی ریاست حیدر آباد کے چیف اکاؤنٹس آفس میں ملازم تھا۔ اور اپنے وقت کا مشہور خطاط تھا۔ مرزا محمد علی نے نواب حیدر آباد کی جوبلی کے موقع پر 1906ء میں ''تذکرہ خوش نویساں'' کے زیر عنوان ایک کتاب لکھ کر نواب صاحب کو پیش کی تھی۔ جس میں معاصر خطاطوں کے حالات کا احاطہ کیا گیا تھا۔ یہ کتاب زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکی البتہ اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد دکن میں اب تک موجود ہے۔ ریاست حیدر آباد کے دوسرے اہم خطاط قاضی محمد یعقوب علی کی وجہ شہرت ان کی تحریر کردہ وصلیوں اور قطعات کے علاوہ اس دور کی تعمیر شدہ عمارات ہیں۔ جن میں قاضی محمد یعقوب کے تحریر کردہ کتبات آج بھی فنی کمال کی گواہی دے رہے ہیں۔ ریاست بھوپال کے نامور خطاطوں میں مولانا ذوالفقار احمد، میر قاسم علی۔ محمد نبی خان شامل ہیں۔ مولانا ذوالفقار احمد نواب صدیق حسن خان (1307ھ) کے مصاحب تھے۔ سلطان جہاں بیگم نے انہیں ان کی علمیت سے متاثر ہو کر صدر العلماء کے خطاب سے نوازا تھا۔ مولانا اعلیٰ درجہ کے خطاط تھے۔ ان کے ہاتھ کی

گورنر جنرل لارڈ منٹو کو یقین نہ آیا کہ یہ تحریریں انسانی ہاتھ سے لکھی ہوئی ہیں۔ احمد حسن نے کھڑے کھڑے ویسی ہی تحریر لکھ کر اسے حیران کر دیا۔

لکھی ہوئی ایک وصلی کراچی کے نیشنل میوزیم میں دیکھی جا سکتی ہے۔ میر قاسم علی بھی اس دور کا ماہر خطاط ہونے کے ساتھ ساتھ والئی بھوپال نواب شاہ جہاں بیگم کا استاد بھی تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے ایک طغری میں شاہ جہان بیگم کا نام بھی شامل کیا ہے اس کا یہ نمونہ تحریر بھی مولانا ذوالفقار کی وصلی کے ساتھ نیشنل میوزیم کراچی میں موجود ہے محمد نبی خان ابن سردار محمد خان وکالت کے پیشے سے منسلک تھا اور بھوپال کی عدالت میں فرائض انجام دیتا تھا۔ وکالت کے ساتھ ساتھ اسے شاعری اور خطاطی سے بھی دل چسپی تھی۔ محمد نبی خان نے مولوی سلام اللہ خان اور میر عوض علی سے خطاطی کی باقاعدہ تربیت اور جلی وخفی دونوں طرزوں میں لکھنے پر عبور حاصل کیا۔ محمد نبی خان بڑھاپے کے آخری ایام تک پوری گرفت کے ساتھ خطاطی کا کام کرتا رہا۔ احترم الدین شاغل کی کتاب صحیفہ خوش نویساں اردو (علی گڑھ 1958ء) کے مطابق 1929ء تک محمد نبی خان کے مصروف کار رہنے کے آثار ملتے ہیں یاد رہے کہ محمد نبی خان کا بھی آبائی وطن رام پور تھا۔ رام پور کا ایک طبیب اور خطاط سید اصغر علی (پیدائش 1852ء) ریاست ٹونک میں نامور ہوا اس کا خاندانی پیشہ تو حکمت تھا لیکن قیام رام پور کے دوران اس نے سید نادر علی قندھاری نادر قلم سے خطاطی کی تعلیم حاصل کر لی تھی۔ ریاست ٹونک کی ریاستی کونسل میں اسے خریطہ نویس کے عہدہ پر ملازم رکھا گیا۔ جہاں یہ معتمد اعلیٰ کے طور پر فرائض سر انجام دیتا تھا۔ ریاست پٹیالہ میں جنگِ آزادی 1857ء کے بعد جس خطاط کے آثار موجود ہیں اس کا نام مرزا عباد اللہ بیگ ہے۔ مرزا عباد اللہ نے دہلی کے مشہور خطاط سید محمد امیر رضوی پنجہ کش سے خطاطی کی تربیت حاصل کی تھی۔ جنگ کے بعد جب دہلی میں شرفاء کے اقتصادی حالات دگرگوں ہو گئے۔ تو مرزا عباد اللہ سکھ ریاست پٹیالہ میں آباد ہو گیا۔ یہاں بطور خطاط اسے عزت اور کام دونوں میسر آئے۔ مرزا عباد اللہ بیگ کو زمرد قلم کا خطاب بھی حاصل تھا۔ اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک وصلی دہلی کے عجائب گھر میں موجود ہے۔ خطاطین دہلی کے ضمن میں بھی مرزا عباد علی کا ذکر ہو چکا ہے۔ میر پنجہ کش کا ایک اور شاگرد سارست برہمن دہلی کو خیر آباد کہہ کر ریاست جے پور میں منتقل ہو گیا تھا۔ جہاں اسے پہلے انگریز ریذیڈنسی جے پور اور بعد ازاں ریاست جے پور میں باضابطہ طور پر ملازم رکھ لیا گیا۔ سارست برہمن نے جے پور میں خطاطی کے فن کو فروغ

> **محمد نبی خان وکیل تھا لیکن اسے خفی اور جلی دونوں طرزوں میں لکھنے پر عبور حاصل تھا۔ اس نے بڑھاپے کے آخری ایام تک خطاطی کا کام جاری رکھا۔**

دیا۔ اور بہت سے لوگوں کو اس فن کی تعلیم دی۔ اس کے مشہور شاگردوں میں منشی پنالال اور احسان علی قابلِ ذکر ہیں۔ سارست برہمن کا انتقال 1867ء میں ہوا خطاطی میں اہم کام کے حوالے سے احترام الدین شاغل جے پور کا ایک اور اہم نام ہے۔ یہ 1896ء میں جے پور ہی میں پیدا ہوا۔ 1917 میں پولیس میں بھرتی ہوا۔ اور 1948ء میں بطور کوتوال ریٹائر ہوا۔ شاعری، خطاطی، تصنیف و تالیف اس کے خاص شوق تھے۔ دوسری کتابوں کے علاوہ اس نے ایک کتاب صحیفہ خوش نویسیاں سپرد قلم کی تھی۔ جس میں خطاطوں کے حالات مستند تحقیق کے بعد جمع کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب 1963ء میں زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہے۔

ریاست الور کی تاریخ پر خطاطی کے حوالے سے نظر ڈالی جائے تو منشی رحیم اللہ کا نام ابھر کر سامنے آتا ہے۔ یہ فن کار مرزا ارمنی دہلوی کا شاگرد تھا۔ خطاطی میں آغا عبدالرشید ویلمی کے طرز پر اس مہارت سے لکھا کرتا تھا۔ کہ لوگ اس کی وصلیوں کو آغا عبدالرشید کی لکھی ہوئی وصلیوں کے طور پر فروخت کر دیتے تھے۔ زود نویسی کا یہ عالم تھا کہ اس نے ایک بار صرف ایک رات میں پوری گلستان سعدی کی کتابت مکمل کی تھی۔ ریاست الور میں اس کی وصلیاں کئی جگہ موجود ہیں۔ جبکہ ایک وصلی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ایک کراچی کے نیشنل میوزیم میں رکھی ہوئی ہے اس کے شاگردوں میں صوفی ابرار علی کا نام ممتاز ہے۔ جس کے پاس منشی رحیم اللہ کی تحریروں کا ذخیرہ جمع تھا۔ 1947ء میں صوفی ابرار علی کا پورا خاندان شہید کر دیا گیا اس غارت گری میں یہ فنی ذخیرہ بھی برباد ہو گیا۔

سندھ میں خطاطی کا دورِ ثانی:

قبل ازیں بیان ہو چکا ہے کہ محمد بن قاسم نے 93ھ میں سندھ کا بڑا علاقہ فتح کر کے یہاں ایک مسلمان حکومت کی بنیاد رکھی۔ محمد بن قاسم کے دور میں خطِ کوفی بلادِ عرب کا مقبول خط تھا۔ اس لئے سندھ میں اسلامی خطاطی کا آغاز خطِ کوفی ہی سے ہوا۔ اور پھر اسلامی خطاطی کا یہ دور یہاں مسلمانوں کے زمانہ اقتدار پر محیط ہوتا چلا گیا جو کسی نہ کسی مشکل میں تقریباً 197 سال تک پھیلا ہوا ہے۔ خط کوفی میں ہندوستان کی ماہرین کی جدت طبع کا اندازہ اس امر سے لگایا

محمد بن قاسم کے دور میں خطِ کوفی بلادِ عرب کا مقبول خط تھا۔ اس لئے سندھ میں اسلامی خطاطی کا آغاز خطِ کوفی ہی سے ہوا۔

کا سکتا ہے کہ برصغیر میں خط کوفی کی کم از کم 88 مختلف طرزوں کے آثار اور نمونہ جات دریافت کیے جا چکے ہیں۔ اسی دوران خط کوفی کی نسبت خط نسخ اور خط ثلث مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ جس کا ثبوت جام نظام الدین ٹنڈو کے وزیر دریا خان کے مقبرے پر نصب کتبے سے ملتا ہے یہ

خط کوفی کی مختلف 88 طرزوں میں لکھا ہوا ایک ہی لفظ برصغیر کے مسلمان خطاطوں کی مہارت فن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

کتبہ خط ثلث میں ہے اور اس پر 895ھ کا سن درج ہے۔ یہ کتبہ اس عہد کے مشہور خطاط قطب الدین محمود کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ سندھ میں خطاطی کے ارتقاء کا دور ثانی ایرانی فاتحین کی آمد کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ ایران میں قندھار کے حاکم ذوالنون بیگ کے بیٹے شاہ بیگ نے 926ھ /1519ء میں سندھ اور بلوچستان کو فتح کر کے اپنا اقتدار قائم کرلیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا شاہ حسن بادشاہ بنا۔ جو 962ھ تک حکمران رہا۔ ایرانی حکمرانوں کے زیر اثر خطاطی کے دبستان ہرات سے وابستہ بہت سے علماء اور خطاطین کی سندھ میں آمد اور کام کے آثار سامنے آتے ہیں۔ شاہ بیگ نے جب ٹھٹھہ کا علاقہ فتح کیا تو اس کی فوج ٹھٹھہ شہر میں لوٹ مار کی تیاریوں میں مصروف ہوگئی تو شاہ بیگ کے ایک مصاحب حافظ عبد الرشید نے شاہ بیگ کو قائل کر کے ٹھٹھہ یہاں کے باسیوں کو تباہی اور لوٹ مار سے بچایا۔ حافظ عبد الرشید صدیقی خط نسخ کا

شاہ بیگ کے ایک مصاحب اور خط نسخ کے ماہر خطاط حافظ عبد الرشید نے شاہ بیگ کو قائل کر کے ٹھٹھہ شہر اور یہاں کے باسیوں کو تباہی اور لوٹ مار سے بچایا۔

ماہر تھا۔ بعد ازاں حافظ عبد الرشید کے بیٹے عبد الرحیم صدیقی نے بھی خطاطی ہی کو اپنا پیشہ بنایا۔ اور خطِ نسخ کے ساتھ ساتھ خطِ ثلث کی کتابت میں بھی مہارت حاصل کی عبد الرحیم کے ہاتھ سے لکھے ہوئے کتبات ابھی تک ٹھٹھہ میں مکلی کے قبرستان میں موجود ہیں۔ ہرات سے سندھ آنے والے ایک اور نامور خطاط کا نام شیخ بایزید پورانی ہے۔ یہ نستعلیق کا نامور خطاط تھا اور اس نے اس خط کے موجد اظہر علی تبریزی سے براہ راست تربیت حاصل کی تھی۔ بعد ازاں ہرات سے ہجرت کر کے ٹھٹھہ کو اپنا وطن بنالیا اور یہیں 963ھ میں وفات پائی۔ ایران میں جامع مسجد بخارا کے کتبات شیخ بایزید پورانی ہی کے فنِ خطاطی کا شاہکار ہیں۔ ایک اور خطاط سید عبداللہ الحسینی ملتانی کا ٹھٹھہ میں کتابت شدہ نسخہ گلستان برٹش میوزیم لندن میں شائقین خطاطی کی دل بستگی کیلئے رکھا گیا ہے۔ سید عبداللہ الحسینی ملتان کو ''نازک رقم'' کے خطاب سے بھی نوازا گیا تھا۔ ایک اور خطاط حسن بن رکن الدین کو بھی اسی دور میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسے بھی کتبہ نویسی میں خاص مقام حاصل تھا۔ ٹھٹھہ کے ایک حکمران عیسیٰ ترخان نے اپنا مقبرہ اپنی زندگی ہی میں بنوالیا تھا۔ اس مقبرہ پر قرآن مجید کی آیات کی خطاطی حسن بن رکن الدین نے کی تھی۔ عیسیٰ ترخان کا انتقال 1565ء میں ہوا اس کی قبر کا کتبہ بھی حسن رکن الدین کا تحریر کردہ ہے اس کتبے پر خطاط کا نام بھی

کندہ ہے۔ 999ھ/1577ء کو اکبر بادشاہ کی افواج نے سندھ کو فتح کر لیا۔ ان افواج کے ہمراہ نسخ اور نستعلیق کا نامور خطاط محمد معصوم بھکری بھی تھا۔ اس زمانہ میں تعمیر کردہ سکھر کے منیارہ پر معصوم بھکری کی تحریریں آج بھی دعوت نظارہ دے رہی ہیں۔ معصوم بھکری نے طویل عمر پائی اور عہد جہانگیری میں بھی اعلیٰ عہدے پر فائز رہا اس کا انتقال 1019ھ میں ہوا۔ ترخان عہد کے خطاط حسن بن رکن الدین کی عزت و توقیر مغل دور میں بھی قائم رہی اور اکبر اعظم سے لے کر شاہ جہان کے عہد حکومت تک یہ خطاط فنی خدمات میں ممتاز رہا۔ حسن بن رکن الدین نے ٹھٹہ کی مشہور شاہ جہانی مسجد کا ایک دلکش کتبہ تحریر کیا تھا جو آج بھی اس فن کار کی یاد تازہ کرتا ہے۔ مسجد شاہ جہانی کے حوالے سے سید علی بن عبد القدوس اور طاہر بن حسن نسیانی اور بمبو بن حسن کے نام بھی قابلِ ذکر ہیں۔ طاہر بن حسن نسیانی نے ترخان خاندان کی تاریخ بھی لکھی تھی۔ یہ ہفت قلم خطاط تھا۔ مسجد شاہ جہانی میں اس کے اور اس کے بھائی بمبو بن حسن کے لکھے ہوئے کتبات
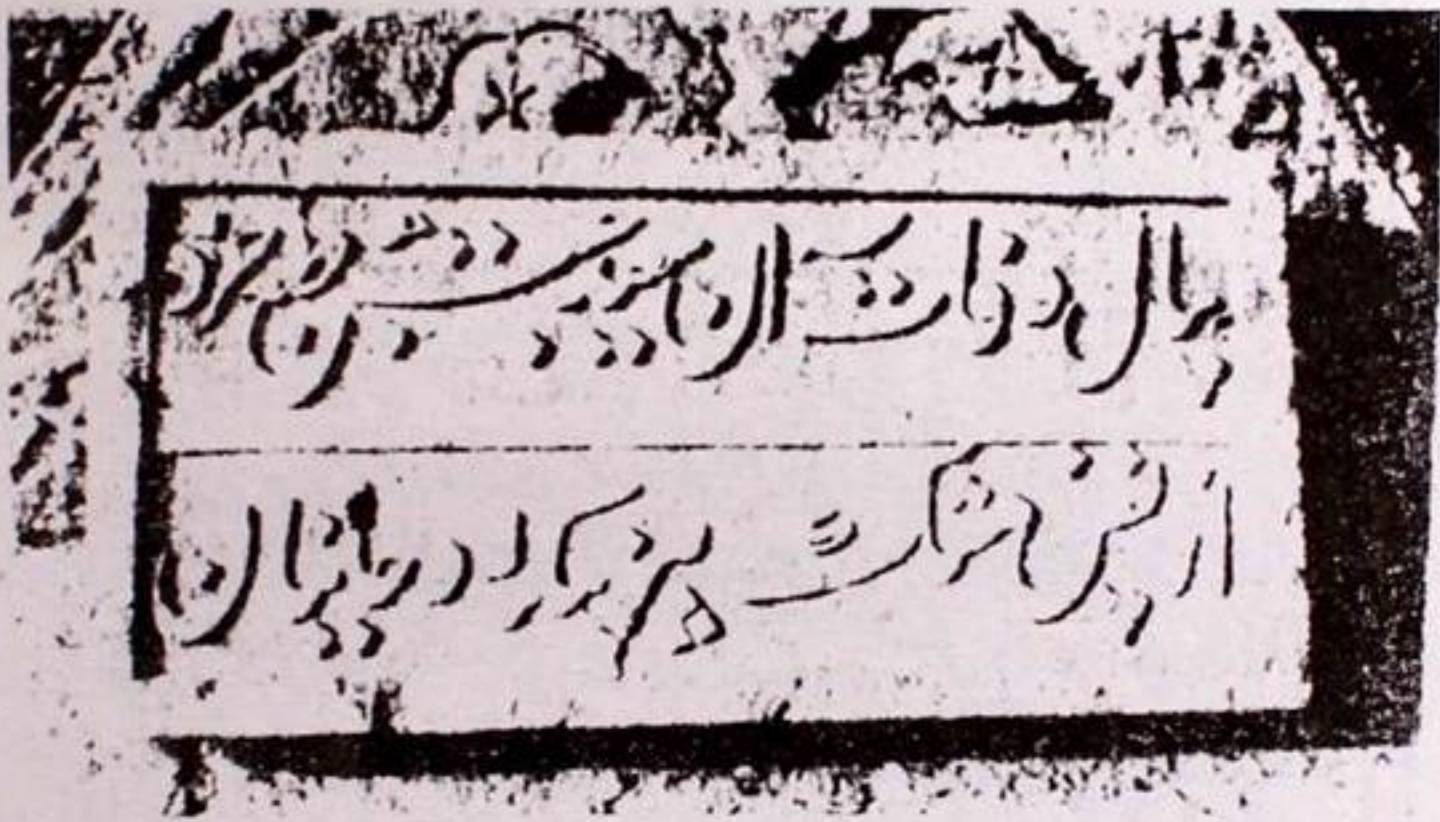
ٹھٹہ کی مسجد شاہ جہانی پر لگے کتبات میں سے ایک دلکش نمونہ

موجود ہیں سید علی بن عبد القدوس نے شاہ جہان اور اورنگزیب عالمگیر کے ادوار میں وفات پائی یہ خط ثلث اور نستعلیق کا ماہر تھا طغریٰ نویسی میں کمال رکھتا تھا۔ بعض روایات میں اسے بھی ہفت قلم خطاط کہا گیا ہے مسجد شاہ جہانی میں اس کے بھی ہاتھ کا لکھا ہوا ایک کتبہ موجود ہے۔ جس پر 1114ھ/1702ء کا سال درج ہے۔ سید علی بن عبد القدوس کے شاگردوں میں خواجہ میر شریف، سید میر محمد، مخدوم الیاس اور میاں حبیب اللہ کے نام شامل ہیں۔ شاہ جہانی عہد میں شیخ عبد الواسع کو سندھ سے تعلق رکھنے کے باوجود دہلی دربار تک رسائی حاصل تھی۔ شاہ جہاں کے

متعدد فرامین پر شیخ عبدالواسع کی تحریر کے ثبوت ملتے ہیں۔ شیخ عبدالواسع خطاط ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب بھی تھا۔ اس کے سات بیٹے تھے۔ عبدالسمیع، عبدالشکور، عبدالغفور، عبدالحق، عبدالروؤف، محمد معین اور محمد شریف، یہ ساتوں کے ساتوں اپنے باپ کے شاگرد اور مقبول خوش نویس تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر نے احمد یار یکتا نامی ایک صاحب فن کو ٹھٹھہ کا حاکم مقرر کیا۔ احمد یار کے والد اللہ یار خان لاہور، ملتان اور ٹھٹھہ کے حاکم رہ چکے تھے۔ ٹھٹھہ کا حاکم ہونے کے ساتھ ساتھ احمد یار خطِ نسخ میں اعلیٰ درجے کی کتابت کرتا تھا اس نے اس خط میں ایک قرآن مجید کی خوبصورت انداز میں خطاطی کی اور اپنے زمانے کے معزز بزرگ سید عبدالجلیل بلگرامی کی خدمت میں پیش کیا۔ احمد یار شاعری بھی کرتا تھا۔ اور بطور شاعر اپنا تخلص یکتا لکھا کرتا تھا۔ آخر کار کلہوڑا خاندان (1700-1783ء) نے مغل اقتدار کا خاتمہ کر کے عنان حکومت خود سنبھال لی۔ کلہوڑا دور حکومت میں محمد وارث کی خطاطی نے شہرت حاصل کی۔ یہ شخص خطاط بھی تھا اور ایک صاحب کمال مصور بھی۔ محمد وارث نے سیف الملوک، بدیع الجمال کی رومانی داستان پر مبنی ایک مصور نسخہ تیار کیا تھا۔ جس میں 65 خوبصورت تصاویر شامل تھیں۔ یہ نسخہ محمد وارث نے امیر کلہوڑا کیلئے نستعلیق خط میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچایا تھا۔ اس نسخے پر یکم اکتوبر 1775ء کی تاریخ درج ہے یہ دل کش مصوری اور خوبصورت خطاطی کا شاہکار آج بھی لندن میوزیم میں موجود ہے۔ 1783ء میں ٹالپر خاندان نے کلہوڑا خاندان کے اقتدار کا خاتمہ کر کے حکمرانی سنبھال لی۔ اور حیدر آباد کو حکومت کا مرکز بنا دیا۔ اس طرح سندھ بھر میں پھیلے ہوئے خطاط اور علماء اور فن کار حیدر آباد کا رخ کرنے لگے۔ حیدر آباد کے اس زمانے میں عبداللہ قندھاری نے خط نستعلیق میں مہارت حاصل کی اور وسیع شہرت کا مالک بنا۔ میر کرم علی والئی سندھ کے فارسی دیوان کی کتابت عبداللہ

> سید علی بن عبد القدوس نے اورنگزیب عالمگیر کے دور میں وفات پائی یه خط ثلث اور نستعلیق کا ماہر تھا طغریٰ نویسی میں کمال رکھتا تھا۔ بعض روایات میں اسے بھی ہفت قلم خطاط کہا گیا ہے۔
> مسجد شاہ جہانی کے کتبات سید علی اور اُس کے بھائی بمبو بن حسن نے لکھے تھے۔ جو طغری نویسی میں کمال رکھتا تھا۔

قندھاری ہی کے قلم کا نتیجہ ہے۔ مطلا کاغذ پر مذکورہ دیدہ زیب نستعلیق خطاطی 1832 میں مکمل ہوئی۔ یہ تاریخی نسخہ شکارپور میں پروفیسر لطف اللہ بدری کے ذاتی خانے کی زینت ہے۔

کشمیر میں خطاطی کے اہم نام

کشمیر میں خطاطی کی تاریخ خاصی قدیم ہے۔ ڈاکٹر صابر آفاقی نے لکھا ہے کہ اس وادی میں فارسی اور اسلامی رسم الخط کا آغاز آٹھویں صدی ہجری میں ہوا۔ 725ھ میں ترکستان سے نقل مکانی کر کے ایک صوفی بزرگ سید شریف الدین بلبل شاہ سری نگر میں آبسے۔ شرف الدین صوفی ہونے کے علاوہ ایک مستند محدث اور ماہر خطاط بھی تھے۔ ایک روایت کے مطابق وہ خط کوفی اور خط نسخ کو مرصع انداز میں تحریر کرنے کا ہنر جانتے تھے ان کی تعلیمات سے متاثر ہو کر

لکڑی کے ٹکڑے پر آرائشی خطاطی کا ایک نادر شاہکار

کشمیر کے ہندو راجہ نے اسلام قبول کرلیا اور سلطان صدر الدین کا اسلامی نام اختیار کیا۔ سلطان صدر الدین اور صوفی شریف الدین کی مساعی کے سبب کشمیر میں عربی رسم الخط متعارف ہوا۔ 775ھ میں سلطان زین العابدین (اعجاز راہی نے اپنی مرتبہ کتاب ''تاریخ خطاطی'' میں اس بادشاہ کا نام سلطان زین الدین بڈھ شاہ لکھا ہے) نے وسط ایشیا کے خطاطین کو کشمیر آنے کی ترغیب دی۔ سلطان کی دعوت پر بہت سے خطاط ہرات اور دوسرے شہروں سے نقل مکانی کر کے کشمیر میں آبسے۔ ان صاحبان کمال کی کاوشات کے نتیجے میں وادی جنت نظیر میں کاغذ سازی کا آغاز ہوا۔ رفتہ رفتہ کشمیری کاغذ اپنی نفاست اور عمدگی کے باعث پورے ہندوستان میں مقبول ہوگیا۔ سلطان زین العابدین نے اپنے دور حکومت میں ''دار العلوم'' کے نام سے ایک باقاعدہ ادارے کی بنیاد رکھی تاکہ علوم وفنون کی عوامی سطح پر توسیع و اشاعت ہوسکے۔ دار العلوم کے نصاب میں خطاطی کو ایک مستقل مضمون کی حیثیت حاصل تھی۔ سلطان زین العابدین کے زمانے میں ملا جمیل کا نام ایک صاحب طرز خطاط کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اس کے تحریر کردہ کتبات آج بھی کشمیر کی مختلف مساجد اور مقبروں کی زینت ہیں۔ تاجکستان کے دار الحکومت دوشنبہ میں سید علی ہمدانی کی تصنیف ''ذخیرۃ الملوک'' کا ایک نسخہ موجود ہے جس پر سن کتابت 877ھ درج ہے۔ اس نسخے کی کتابت بھی ایک کشمیری خطاط کی مرہون منت ہے۔ سلطان حسین شاہ (971-978ھ) کے دور میں ایران سے ایک ماہر خطاط میر علی کشمیر میں آکر آباد ہوا۔ میر علی خطِ تعلیق اور خطِ نستعلیق کے علاوہ دیگر طرزوں میں بھی خطاطی جانتا تھا۔ کشمیر کی تاریخ خطاطی میں میر علی کو پہلا ہفت قلم خطاط کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ میر علی نے خطاطی کی تعلیم کو بھی فروغ دیا۔ اس کے مشہور شاگردوں میں میر حسن کاشمیری اور علی جو کشمیری کے نام ممتاز ہیں۔ خطِ نستعلیق کی کتابت میں میر حسن کاشمیری نے خاص مہارت حاصل کی اور اس کے فن کی شہرت کشمیر سے نکل کر ہندوستان تک پھیل گئی۔ علی جو کشمیری نے اپنے استاد سے خطاطی کی مختلف طرزوں میں تربیت حاصل کی اور خود بھی استاد کی طرح ہفت قلم کہلایا۔ علی جو کشمیری نے خطِ نسخ اور خطِ ثلث میں

کشمیر کی تاریخ خطاطی میں میر علی کو پہلا ھفت قلم خطاط کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ خطِ نستعلیق کی کتابت میں میر حسن کاشمیری نے خاص مہارت حاصل کی اور اس کے فن کی شہرت کشمیر سے نکل کر ھندوستان تک پھیل گئی۔

قرآن کی خطاطی کر کے ان خطوط کو کشمیر میں مقبول بنایا۔ بعد ازاں مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر کا ایک عزیز مرزا حیدر دوغلت، کاشغر اور بدخشاں کے ساتھ کشمیر پر بھی اپنا اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے زمانہ میں کشمیر میں شال سازی، کاغذ سازی، خطاطی، مصوری، موسیقی اور لکڑی پر فنکارانہ کام نے نمایاں ترقی کی۔ آخر 994ھ میں جلال الدین اکبر نے کشمیر کو فتح کر کے مغل سلطنت میں شامل کر لیا۔ مغلوں کے زیر اثر کشمیر میں خطِ نستعلیق نے خصوصی مقبولیت حاصل کی اور مراسلت، کتابت کے ساتھ ساتھ عمارات پر بھی خطِ نستعلیق میں کتبات وغیرہ لکھے جانے لگے۔ اکبر کے دور میں خطاطی کے حوالے سے شیخ حسن گناتی نے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ خطاطی کا فن شیخ حسن کے پورے خاندان میں کئی نسلوں تک امتیاز کا باعث رہا۔ کشمیر کا ایک اور قابل فخر خطاط ملا باقر کشمیری ہے۔ مغل بادشاہ شاہ جہان نے اس کی فنی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر اسے اپنے دربار سے منسلک کر لیا تھا اور ہفت قلم کا اعزاز بخشا تھا۔ ملا باقر کشمیری خطِ نستعلیق کے علاوہ خطِ شکستہ تحریر کرنے میں بھی خصوصی مہارت رکھتا تھا۔ اس کے شاگردوں میں حسین کشمیری، طالب کشمیری، حسین بخش مدور اور محمد مراد زریں رقم نے تاریخ خطاطی میں اپنے نقوش چھوڑے ہیں، محمد مراد اور حسین کاشمیری سنگ تراشی کے بھی ماہر تھے۔ ان دونوں کے لکھے ہوئے متعدد کتبات اب بھی کشمیر میں موجود ہیں۔ محمد حسین کشمیری، مولانا عبدالعزیز کا شاگرد تھا جو خود ایک استاد خطاط تھے۔ محمد حسین کشمیری نے خطاطی میں اتنی مشق کی کہ اس فن میں اپنے استاد سے بھی آگے نکل گیا۔ الفاظ کے مدات اور دائروں کی خطاطی میں وہ ایک دل کش توازن قائم رکھتا تھا اور اس تیزی سے لکھتا تھا کہ سبک رفتاری سے حرکت کرتی ہوئی اس کی انگلیوں پر کسی مشین کا گمان ہونے لگتا تھا۔ محمد حسین کشمیری کا لکھا ہوا ''آئین اکبری'' آج بھی برطانیہ کے ایک کتب خانے میں موجود ہے۔ محمد مراد کو کشمیری میں فرد یگانہ اور زریں قلم جیسے ناموں سے یاد کیا جاتا تھا۔ محمد مراد کا ایک بھائی حسن بھی خطاطی میں نمایاں مقام کا حامل تھا اور بادشاہ کی جانب سے اسے بھی زریں رقم اور شیریں قلم جیسے خطابات سے نوازا گیا تھا اس کے قلم سے نکلا ہوا قصہ یوسف زلیخا کا ایک نسخہ تہران کے شاہی کتب خانے میں موجود ہے۔ گیارھوں صدی میں استاد حیدر کشمیری اور اخوند بہاؤالدین ماہر خطاطین میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے ہم عصروں میں ہدایت اللہ زریں رقم کو محمد حسین کشمیری کا مقلد سمجھا جاتا ہے۔ اسے طرز نستعلیق میں استاد کا درجہ حاصل تھا اس کا انتقال 1118ء میں ہوا۔ محمد حسین کشمیری کے فرزند محمد علی کشمیری کو بھی خطِ نستعلیق کے اساتذہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کا خطاب زریں رقم تھا۔ محمد علی کشمیری نے اپنا فنی ورثہ آگے اپنے بیٹے محمد جعفر کشمیری کو منتقل کیا۔ جعفر کشمیری کو بارھویں صدی کے کشمیر کا ایک بے مثال خطاط

خط شکستہ میں ایک قدیم تحریر
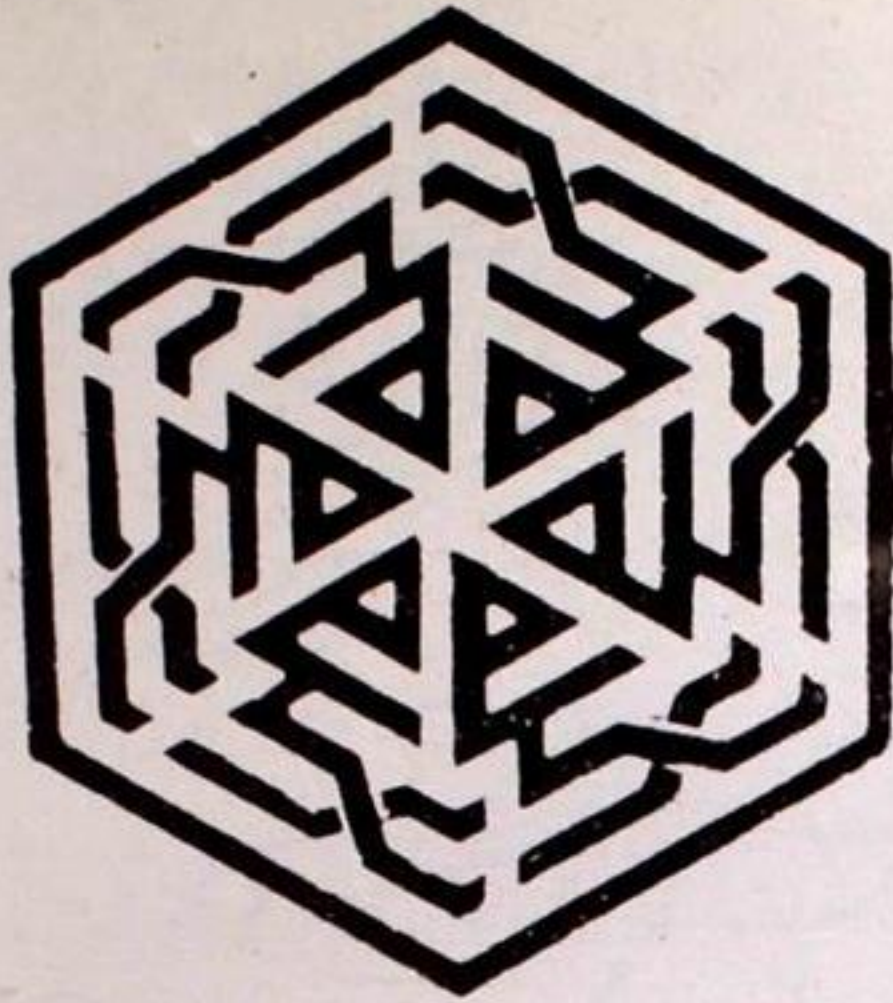
تصور کیا جاتا ہے۔ بارھویں صدی کے ابتدائی عشرے ہی میں برخوردار ابن محمود ترکمان کی تخلیق کردہ اخلاقی کہانیوں کے مجموعہ ''محبوب القطب'' کی کتابت بھی کشمیر ہی میں مکمل کی گئی تھی۔ کتاب کے صفحہ اول پر درج ہے کہ اس مجموعہ کی کتابت ربیع الثانی 1112ھ (1700ء) میں کشمیر میں تکمیل پذیر ہوئی تھی

اقلیدسی کوفی شش پہلو کی خوبصورت خطاطی

۔ یہ کتاب ایک عرصہ تک امیر بخارا کے کتب خانے میں موجود رہی۔ اسی طرح ''مطلع السعدین'' اور ''مجمع البحرین'' کے دو قلمی نسخوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں نذر محمد فرغانی نامی ایک شخص نے کشمیر سے خریدا تھا۔ اس کے بعد محمد ابراہیم اور میر کمال الدین نے نستعلیق خطاطی میں نام پیدا کیا۔ ان کے علاوہ کشمیر کے ایک ممتاز شاعر حسن کشمیری کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ اسے خطاطی میں خصوصی مہارت حاصل تھی۔ 1166ء کے بعد کشمیر سے تعلق رکھنے والے خطاط عبدالکریم قادری کا کام دہلی سے کابل تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کا خط منشیانہ طرز کا تھا اور درباری خط و کتابت اس کے فرائض میں شامل تھی۔ عبدالکریم قادری کا ایک بھتیجا عبدالقادر نہ صرف خطاطی میں خاص درک رکھتا تھا بلکہ حاشیہ بندی کا استاد مانا جاتا تھا بطور زودنویس بھی اس کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے چار سو صفحات پر مشتمل فقہ کی کتاب ''درۃ الزمان'' اپنے قلم سے مکمل کی تھی۔ اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئی خطاطی کے نمونے دہلی اور کابل میں موجود ہیں۔ کشمیر کے ایک ممتاز نواب عبدالاحد کا بھتیجا ابوالبرکات بھی خطاطی اور انشاء پردازی میں استادی کے درجہ پر فائز تھا۔ خطِ شکستہ بھی خوب لکھتا تھا۔ مشہور خطاط راجہ بہادر گوسائیں اسی کا شاگرد تھا۔ استاد اور شاگرد جیسی خطِ شکستہ میں نفیس خطاطی کشمیر بھر میں کسی خطاط کے حصے میں نہیں آئی۔ اورنگ زیب عالمگیر کی بیٹی زیب النساء نے، جو خود بھی صاحب

کمال خطاط تھی، کشمیر میں ایک دیوانی دفتر بطور خاص قائم کیا تھا۔ جہاں شائقین فن اپنی قلمی مہارت کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ اپنے دور کے ممتاز عالم دین اور خطاط محمد شفیع اس دفتر دیوانی کے انچارج تھے۔ بارھویں صدی کے خطاطین میں یعقوب محمد بن مراد کشمیری بھی قابل ذکر ہے اس کے والد مراد کشمیری کی فنی مہارتوں کا ذکر سطور بالا میں ہو چکا ہے یعقوب محمد نے اپنے پیش رو خطاطین کی طرح نسخ اور نستعلیق میں تربیت کے علاوہ خطِ کوفی میں اتنی مشق کی کہ یہی طرز خطاطی اس کی شہرت اور پہچان کا سبب بن گئی۔ یعقوب محمد بن مراد نے اس فن پر ایک باقاعدہ کتاب بھی تصنیف کی تھی۔ اس کے بعد خطاطی کے فن میں نمایاں مقام حاصل کرنے والوں میں حافظ عبداللہ فتح کدی، خواجہ اکبر عالم، سید محمد رضا مشتاق کشمیری، حبیب اللہ دلو، خوش دل محمد رسول صاحبان طرز خطاط تسلیم کیے جاتے ہیں بارھویں صدی کے آخری عشروں میں حافظ عبد الوہاب کا نام ممتاز ہے۔ یہ خطِ نستعلیق کا ماہر تھا اس کے علاوہ خطِ نسخ بھی بہت خوبصورتی اور نفاست سے لکھتا تھا۔ اس نے اپنے قلم سے خطِ نسخ میں ایک یادگار قرآن رقم کیا تھا۔ اس نسخے پر 1179ھ سن کتابت درج ہے۔ یہ نایاب قلمی نسخہ قندھار میں احمد شاہ ابدالی کے مزار پر شائقین کی زیارت کیلئے رکھا ہوا ہے۔ تیرھویں صدی کی اولین چوتھائی میں محمد منور کشمیری کا نام ابھر کر سامنے آتا ہے اس کا شوق نت نئی جدت پسندی کا مظہر تھا۔ اس نے ایک ایسی نئی روشنائی تیار کی تھی جس میں رنگین اور قیمتی پتھروں کا سفوف شامل تھا محمد منور کشمیری نے اس روشنائی سے ایک حمائل شریف کی خطاطی کی اور اس کے ہر صفحے کو آب زر سے چمکایا۔ اس منفرد اور دیدہ زیب حمائل شریف کی کتابت 1224ھ میں مکمل ہوئی۔ اس کا اصل نسخہ ملتان میں گردیزی خاندان کی تحویل میں ہے۔ تیرھویں صدی ہجری ہی میں آغا غلام رسول کی کشمیر میں خطاطی کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ آغا غلام رسول قرآن کا ایک نامور خطاط تھا اور رام پور کے نواب کلب علی خان کا ملازم تھا لیکن وہ سال کا نصف حصہ کشمیر میں گزارتا تھا اور یہیں خطِ نسخ میں قرآن کی خطاطی کا کام کرتا تھا۔ اس کا انتقال 1295ھ/1878ء کو ہوا اس کے بعد اس کے ایک بیٹے آغا محمد علی اور پھر ایک پوتے آغا مرزا محمد حسین نے خطاطی میں اپنی الگ پہچان کروائی۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے دوران کشمیر میں خطاطی کا فن عروج پر رہا۔ اور اس عرصہ میں نہایت اہم کتب کی خطاطی اس وادی کے حصہ میں آئی۔ لینن گراڈ روس اور ازبکستان کے کتب خانوں میں

خطاط محمد منور کشمری نے رنگین اور قیمتی پتھروں کے سفوف سے ایک نئی روشنائی تیار کی تھی۔

محرم بحریم سر لی مع اللہ علیست

در پیشہ قدرت اسد اللہ علیست

آن دست کہ از پردہ اسرار نمود

انگشت نما شد کہ ید اللہ علیست

امام ویردی کے ہاتھ کا لکھی ہوئی ایک خوبصورت فارسی رباعی

دیوان حافظ، دیوان سعدی اور دیوان جامی کے کشمیر میں خوبصورت کتابت شدہ نسخے آج بھی موجود ہیں۔ انیسویں صدی میں کشمیری خطاطین کے تیار کردہ ان کے نسخے اور نادر کتب پورے وسط ایشیاء تک مقبول رہے۔ محمود کشمیری کی مخطوطہ مثنوی مولانا روم بھی ابھی تک تاجکستان کے ادارہ اورینٹیل سٹڈیز کے کتب خانے میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں ایک اور کتاب ''انصاب صلح'' کا ایک قلمی نسخہ بھی موجود ہے۔ اس کتاب کا خطاط بھی ارض کشمیر کا فرزند تھا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں شنگر ناتھ کشمیری نے دہلی میں حافظ ابراہیم کے شاگرد منشی مند سارام کشمیری نے لکھنو میں، جبکہ آغا غلام رسول کشمیری اور آغا محمد حسن کشمیری ریاست رام پور میں خطاطی کے جوہر دکھائے اور دیار غیر میں اپنی اہمیت منوائی۔

کشمیر میں سکھ راج کے دوران اگرچہ اسلامی طرز خطاطی کی سرپرستی میں کمی آ گئی تھی اور حالات بھی پہلے جیسے موافق نہ تھے۔ اس کے باوجود بہت سے اہل علم وفن نے اسلامی علوم اور خطاطی کے چراغ روشن رکھے۔ اس دور میں جن خطاطین نے اس فن کو زندہ رکھا ان میں مراد

> **خلیفہ محمد حسین کے بارے میں یہ روایت مشہور ہے کہ مشکل سے مشکل لفظ اس کے قلم کی نوک پر پانی ہو جایا کرتا تھا۔**

بیگ، خواجہ عبدالرحمان نقش بندی، مرزا سیف الدین، محی الدین اکمل، میر حبیب اللہ کاملی، وانی بشیر اور عبدالصمد ڈونگی کے نام شامل ہیں۔ راجہ رنبیر سنگھ کے بعد محمد تقی کشمیری اور احمد علی کشمیری نے قرآنی خطاطی کا پرچم بلند رکھا۔ احمد علی کشمیری نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ لاہور میں بھی گزارا۔ اسی طرح کشمیر کے حوالے سے لاہور کے ایک خطاط خلیفہ محمد حسین کا نام بھی اہم ہے۔ خلیفہ محمد حسین نے لاہور کے بعد اپنی زندگی کا زیادہ حصہ کشمیر میں گزارا۔ جہاں وہ مہاراجہ جموں و کشمیر کے دربار سے وابستہ رہا۔ خلیفہ محمد حسین کے بارے میں یہ روایت مشہور ہے کہ مشکل سے مشکل لفظ اس کے قلم کی نوک پر پانی ہو جایا کرتا تھا۔ اپنی اسی فنی مہارت کی بنا پر اسے کشمیر کے روسا اور امراء میں احترام اور مقبولیت حاصل تھی۔ خلیفہ محمد حسین کا انتقال 1937ء میں ارض کشمیر پر ہوا اور اسے جموں کے ایک قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ لاہور سے تعلق رکھنے والے شہرت یافتہ خطاط امام ویردی نے بھی اپنے فنی کام کا ایک حصہ کشمیر ہی میں مکمل کیا تھا۔ گورنر کشمیر نواب شیخ امام الدین خان سے امام ویردی کے گہرے مراسم تھے۔ امام ویردی گورنر کشمیر کے ہاں مقیم رہا۔ امام ویردی کا انتقال انیسویں صدی عیسوی کی آخری دہائیوں میں ہوا۔

لاہور میں اسلامی خطاطی کے آثار و تاریخ:

عروس البلاد لاہور اپنی تاریخ کی روشنی میں برصغیر پاک و ہند کے قدیم ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ علوم و فنون سے محبت اس زندہ دل شہر کے مزاج میں ہمیشہ سے شامل رہی ہے۔ مسلم تاریخ کے حوالے سے بات کی جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ مسلمان بادشاہوں کے ادوار میں لاہور کو کبھی مرکزی دارالحکومت کی حیثیت حاصل نہیں رہی۔ اس کے باوجود اس شہر نے علمی، فنی اور سماجی سطح پر ہندوستان کے مرکزی شہروں جیسی سج دھج قائم رکھی۔ محمود غزنوی کے زمانے سے مغلیہ عہد تک جہاں لاہور کے صوفیاء نے روحانی انقلاب برپا کیا، رفیع الشان عمارات نے دنیا بھر کی توجہ حاصل کی۔ فنکاروں اور موسیقاروں نے عالمی معیار کے کارنامے سرانجام دیئے، وہاں خطاطی کے میدان میں بھی اس شہر کے صاحبان ہنر باقاعدہ خاندانی اور وراثتی تسلسل کے طور پر جانے پہچانے جاتے ہیں۔ لاہور سے تعلق رکھنے والے اہل فن کے علاوہ
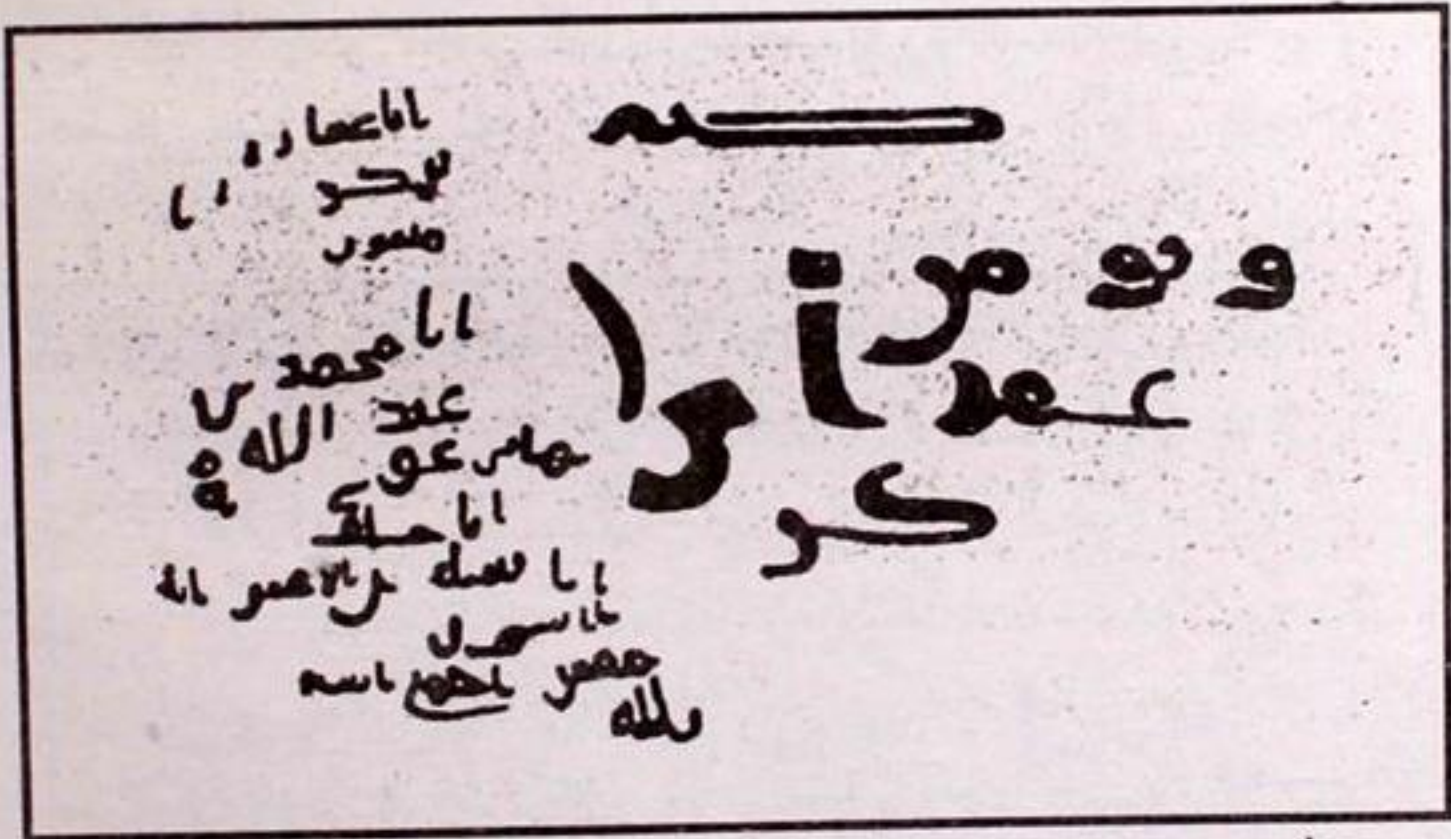
اس تاریخی شہر میں آباد ہونے والے خطاطین نے اسلامی خطاطی کی تہذیب اور ارتقاء میں خصوصی جگر کاوی کا مظاہرہ کیا۔ ان کی جدّت طراز کاوشات کو نقش دوام کا درجہ حاصل ہے۔

لاہور میں اسلامی خطاطی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اس شہر کے حوالے سے جن خطاطین کا ذکر قدیم ترین قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کے نام شیخ محمد اسماعیل اور محمد ادریس ہیں۔ ان خطاطین کے آثار غزنوی دور سے قبل کے ہیں محمد ادریس کا تعلق بصرہ سے تھا۔ چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں عالم دین اور محدث شیخ محمد اسمائیل کی لاہور میں آمد کا پتہ چلتا ہے۔ شیخ محمد اسماعیل

ایک دینی سکالر ہونے کے ساتھ ساتھ فن تحریر اور خطاطی کا علم بھی رکھتے تھے۔ التاریخ الشمس میں اسی زمانے کے لگ بھگ محمد ادریس القصاب البصری کی لاہور آمد کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ محمد ادریس البصری، فن خطاطی کے امام ابن البواب کے شاگردوں میں تھا۔ اور خط کوفی خط نسخ کے علاوہ دوسری طرزوں میں بھی لکھنے پر بھی ملکہ رکھتا تھا۔ اسے ہفت قلم خطاط ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ اسی طرح تاریخ لاہور سے متعلق بعض کتب میں عربی کے ایک خطاط ابوالحسن علی بن عمر کا تذکرہ بھی ملتا ہے چھٹی صدی ہجری کا یہ خطاط، شاعر اور ادیب ہونے

شیخ محمد اسماعیل اور محمد ادریس اکقصاب البصری کع لاہور کے قدیم ترین اسلامی خطاط قرار دیا جاتا ھے۔

کے ساتھ ساتھ محقق اور محدث بھی تھا جبکہ قرآن کی خطاطی کا فن اس کی شہرت کا خاص سبب تھا۔ افسوس کہ تاریخ لاہور کے ان قدیم ترین خطاطین کے بارے میں زیادہ تفصیلات دستیاب نہیں ہیں۔ البتہ اس امر کا سرسری تذکرہ کہیں نہ کہیں ضرور ملتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری سے مغلیہ عہد تک لاہور کے فنی ایوانوں میں خطاطی کا چراغ کسی نہ کسی طور روشن رہا۔

مغل دور میں لاہور کے جن خطاطین کا ذکر تاریخ کی کتب میں جگمگا رہا ہے۔ ان میں محمد حسین لاہوری کا نام ممتاز ہے۔ یہ صاحب فن اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اسے خط نسخ میں خاص مہارت حاصل تھی۔ محمد حسین لاہوری نے قرآن کا ایک نسخہ اس مہارت سے لکھا تھا کہ اس کی ہر سطر واؤ سے شروع ہوتی تھی۔ مکمل نسخہ 130 صفحات پر مشتمل تھا۔ محمد حسین لاہوری کا لکھا ہوا یہ منفرد قرآن آج بھی مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کے کتب خانے کی زینت ہے۔ محمد حسین کا فن خطاطی اس کے بیٹے محمد روح اللہ کے لہو میں بھی شامل تھا۔ تاریخ خطاطی میں اسے محمد روح اللہ لاہوری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ محمد روح اللہ کو خط نسخ کے ساتھ ساتھ باریک نویسی پر بھی عبور حاصل تھا۔ اس کے نامور والد نے تو ایسا قرآن تیار کیا تھا۔ جس کی ہر سطر واؤ سے شروع ہوتی تھی، محمد روح اللہ نے اسی خاندانی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے سفرِ حج کے دوران قرآن کا ایک ایسا نسخہ مخطوط کیا جس کی ہر سطر الف سے آغاز ہوتی ہے۔ یہ پورا قرآن صرف تیس اوراق پر لکھا ہوا ہے۔ لہٰذا یہ نادر نسخہ اس کی باریک نویسی کا بھی شاہکار ہے۔ محمد روح اللہ لاہوری نے 305 صفحات پر مشتمل چھوٹے سائز میں ایک حمائل کی کتابت بھی صرف 50 دن میں مکمل کی تھی۔ جو اس کی زود نویسی کا ثبوت بھی ہے۔ اس حمائل کے حاشیوں

وغیرہ پر مختلف رنگوں کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ محمد روح اللہ لاہوری کی خطاطی سے مزین یہ دونوں نادرونایاب نسخے قاہرہ کے کتب خانے دارلکتب مصریہ میں محفوظ ہیں۔ 1939ء میں مکتبہ ہلال مصر کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والی محمد طاہر کردی کی کتاب ''تاریخ الخط العربی وآرابہ'' میں محمد روح اللہ لاہوری کے ان نایاب نسخوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

مغل دور میں حکمرانی کے چراغ کی آخری ٹمٹماہٹ میں دو اور خطاطین کے نام روشن دکھائی دیتے ہیں۔ محمد افضل قادری لاہوری نے مغل بادشاہ محمد شاہ کا زمانہ (1719-1748ء) دیکھا۔ محمد افضل قادری آقا عبدالرشید دیلمی کے طرزِ خطاطی کا شیدائی تھا۔ اس نے مسلسل محنت سے اپنے خط کو دیلمی کے خط سے اس قدر مشابہہ کرلیا تھا کہ دونوں کے لکھے ہوئے نمونوں میں پہچان کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ محمد افضل قادری کے فنی قدردان اسے آقائے دیلمی ثانی کے لقب سے پکارا کرتے تھے۔ اس نے پنجاب کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے شائقین کو خطاطی کی تعلیم دی۔ اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک خوبصورت وصلی دہلی کے عجائب گھر میں اب بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ مغلوں کے آخری دنوں میں مولانا غلام محمد لاہوری ایک زاہد اور متقی خطاط تھا جو اپنا اور اپنے اہل عیال کی گزربسر صرف قرآن کی خطاطی سے حاصل ہونے والی آمدن سے کیا کرتا تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ غلام محمد لاہوری اس مختصر آمدن کے بھی تین حصے بنایا کرتا تھا۔ ایک اپنے لئے، ایک طلباء کیلئے اور ایک حصہ فقراء کیلئے۔ زندہ دلان لاہور اسے امام گاموں کے نام سے یاد کرتے تھے۔ غلام محمد لاہوری نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دورحکومت میں بھی قرآنی خطاطی کا کام جاری رکھا اور 1829ء میں وفات پائی۔ مولانا غلام محمد لاہوری مسجد وزیر خان کا پیش امام بھی تھا۔ وفات کے بعد اسے مسجد وزیر خان ہی کے باہر دفن کردیا گیا۔

لاہور کی تاریخ خطاطی میں دو اور کاتبوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ ان میں سے ایک کا نام محمد بخش کاتب جبکہ دوسرے کا نام پیر بخش کاتب تھا۔ محمد بخش کاتب رنجیت سنگھ (1799-1839ء) کے دربار سے باقاعدہ وابستہ تھا۔ سکھ دورحکومت میں اس نے درباری کتابت کا بہت کام کیا۔ محمد بخش خطاط ہونے کے ساتھ فن مصوری میں بھی طاق تھا۔ رنجیت سنگھ کی فرمائش پر محمد بخش کاتب شیخ سعدی کی کریما کا ایک دیدہ زیب نسخہ تیار کر کے مہاراجہ سے انعام کا حق دار ٹھہرا تھا۔ محمد بخش کاتب کے برعکس پیر بخش کاتب آزادمنش انسان تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی خواہش کے باوجود اس نے سکھ دربار سے وابستہ ہونا گوارانہ کیا، اور بچوں کو مفت تعلیم دینے کا شغل اختیار کیا۔ اس کا اصل پیشہ اوراق سازی تھا۔ لیکن بعدازاں شوق کی بناپر اس نے خطاطی میں مہارت حاصل کی اور خط نسخ اور نستعلیق کا استاد مانا گیا۔ اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی

متعدد وصلیاں پنجاب میں مختلف جگہوں پر موجود ہیں۔

کشمیر میں خطاطی کے حوالے سے شہرہ آفاق خطاط امام ویردی کا سرسری ذکر کیا گیا ہے۔ امام ویردی کی اصل پہچان لاہور کی فنی فضا کی مرہون منت ہے۔ امام ویردی حقیقت میں ایرانی نسل تھا۔ لیکن اس کے والدین وہاں سے کابل چلے آئے تھے۔ امام ویردی کابل ہی میں پیدا ہوا۔ کابل سے کشمیر اور کشمیر سے لاہور منتقل ہوا۔ امام ویردی جب سن شعور کو پہنچا تو ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا سورج غروب ہو چکا تھا۔ کشمیر میں ملازمت اور خطاطی کے جوہر دکھانے کے بعد امام ویردی مستقل طور پر لاہور آ گیا۔ وہ ایک مستند عالم دین، صاحب طرز ادیب اور ہفت

مقصود کاخ و حجرہ و ایوان انگاشتن
کاشانہ ای سر بفلک بر افراشتن

1846ھ میں امام ویردی کا تحریر کردہ ایک نستعلیق کتبہ

قلم خطاط تھا۔ خاص طور پر نستعلیق لکھنے میں اس کے قلم کا ثانی اس کے اپنے زمانے اور بعد میں بھی دور دور تک دکھائی نہیں دیتا۔ خطاطی کے علاوہ امام ویردی کو کندہ کاری اور نقاشی میں بھی مہارت حاصل تھی۔ وہ پتھر پر خود کتابت کرتا تھا اور بعد ازاں خود ہی حروف کو کھود کر کندہ کاری کیا کرتا تھا۔ پتھر پر لکھنے کا اسے اس قدر شوق تھا۔ کہ قلم اور روشنائی لے کر لاہور کی مساجد میں چلا جاتا کرتا تھا۔ اور ان کی دیواروں اور وہاں لگی ہوئی سنگ مرمر کی سلوں پر خطاطی کی مشق کیا کرتا تھا۔ نواب قزلباش سے بھی اس کے خاص مراسم تھے۔ سوتر منڈی لاہور میں واقع قزلباش حویلی کی دیواروں پر مختلف رنگوں سے لکھے ہوئے کتبات آج بھی امام ویردی کی فنی پختگی کی

شہادت دیتے ہیں۔ اسی طرح جب نواب شیخ امام الدین نے سوتر منڈی میں مسجد تعمیر کی تو اس کی پیشانی پر امام ویردی سے کچھ اشعار کندہ کروائے تھے۔ اسی نواب امام الدین اور ان کی والدہ مرحومہ کی قبروں پر بھی امام ویردی کے لکھے ہوئے کتبات نصب ہیں جو قبرستان بی بی پاک دامن اور احاطہ دربار داتا صاحب میں مرحومین کی قبر پر لگائے گئے تھے۔
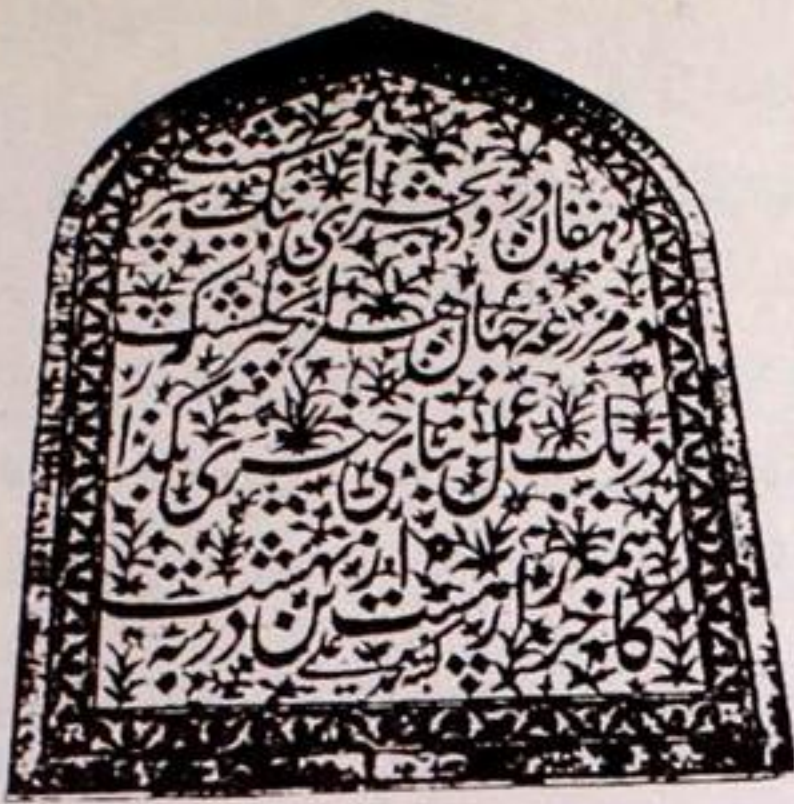
پتھر پر نستعلیق آرائشی خطاطی

قزلباش خاندان کی قائم کردہ امام بارگاہوں میں لکڑی کے بڑے بڑے قطعات پر خطاطی کے نمونے امام ویردی کی فنی صلاحیتوں کے گواہ ہیں۔ امام ویردی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی بہت چیزیں ان کے ایک شاگرد سید احمد کے پاس محفوظ تھیں۔ ایک موقع پر لاہور کے ناظر تعلیمات کرنل ہال رائیڈ نے یہ فن پارے دیکھے تو ان کی فنی خوبیوں پر حیران رہ گیا۔ اس نے یہ تمام شاہکار انگلستان بھجوا دیئے۔ جہاں انہیں کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا۔ شائقین خطاطی نے اس مجموعے کو ہاتھوں ہاتھ خرید لیا۔ شار حویلی لاہور میں بھی جلی قلم میں بڑے سائز کی تحریریں امام ویردی کی یاد دلاتی ہیں۔ جلی خط میں نستعلیق لکھنے میں اسے جو ملکہ حاصل تھا وہ اسی کا حصہ ہے۔ امام ویردی نے ایک انچ موٹے قلم سے گلستان کی جلی خطاطی کی تھی جو ایک نادر و نایاب نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ امام ویردی کی فنی جدت طرازی کی ایک مثال ''خطِ ناخن'' میں اس کی خوبصورت خطاطی ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے ''فن خطاطی'' کے زیر عنوان ایک کتاب مرتب کی تھی جو عجائب گھر کے زیر اہتمام 1874ء میں شائع ہوئی۔ اس میں ناخن نگاری کی ابتدائی تاریخ بیان کرتے ہوئے انکشاف کیا گیا ہے کہ گورنمنٹ سکول کے چودہ سالہ طالب علم سید دلاور شاہ نے، جو لاہور کے ایک رئیس اور طبیب کا فرزند تھا، اپنے ذہن رسا سے ایک موشگافی کی اور اپنے ناخن سے کاغذ پر انگریزی حروفِ تہجی ابھار کر لیفٹیننٹ گورنر کو پیش کیے۔ اس نرالی کاوش کا دیکھ کر ڈائریکٹر مدارس پنجاب کیپٹن فلر نے کہا کہ یہ طریقہ تحریر بصارت سے محروم

لوگوں کیلئے بہت مفید ثابت ہو سکتا اور وہ شروع سطر پر انگلی رکھ کر حروف کی ساخت کو محسوس کرتے ہوئے اور عبارت کے آخر تک پھیرتے ہوئے اسے پڑھنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں، بعد میں اسی خیال سے فیض یاب ہوتے ہوئے اہل یورپ نے نابینا لوگوں کیلئے بریل سسٹم کے تحت کتابیں چھاپنے میں کامیابی حاصل کی۔ جس میں ابھرے ہوئے حروف تحریر ہوتے ہیں اور جن پر انگلی پھیر کر بے بصر افراد انہیں پڑھ کے علم حاصل کر سکتے ہیں۔ امام ویردی نے اس ہنر کو فن خطاطی میں آزمایا جبکہ سمبڑیال ضلع سیالکوٹ کے ایک خوش نویس مصطفیٰ خان نے دو مکمل کتب محمود نامہ اور پند نامہ حکیم لقمان خطِ ناخن میں تحریر کر دیں۔ اس طرح کچھ اور صاحبان فن بھی اس خط کی طرف متوجہ ہوئے۔ خطِ ناخن میں لکھی ہوئی ایک اور کتاب پند نامہ سعدی (کریما) ریاست الور راجستھان کے عجائب گھر میں موجود ہے۔ یہ کتاب بڑے بڑے سائز کے موٹے کاغذ پر جلی خط میں ناخن سے ابھارے ہوئے خوشنما حروف میں تحریر کی گئی ہے۔ یہ نسخہ ریاست الور کے حکمران مہاراجہ بنے سنگھ کے دور حکومت میں 1840ء کے درمیان مکمل ہوا۔ اس نادر
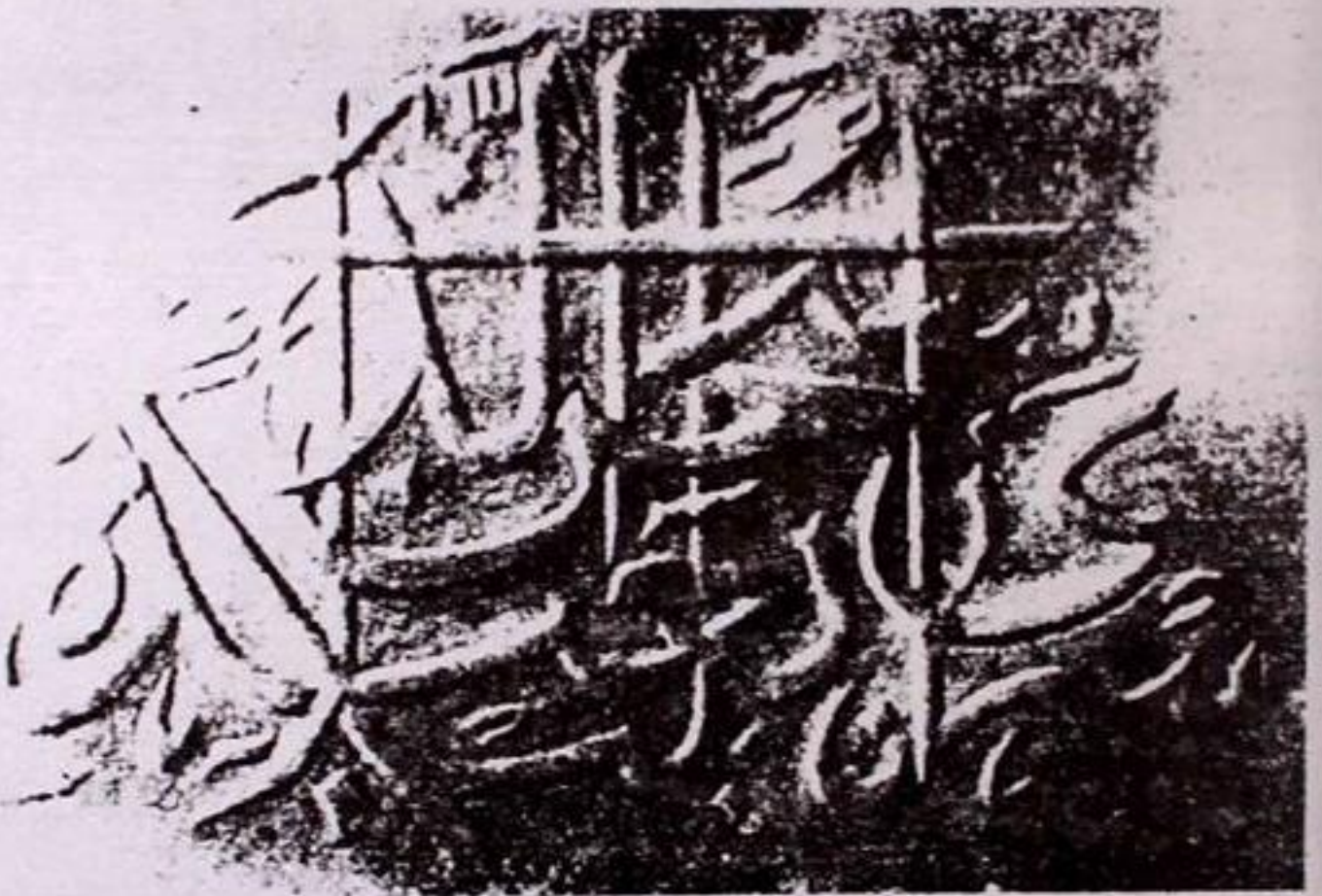
خط ناخن میں ایک تحریر

اور نایاب نسخے پر بدقسمتی سے اسے تخلیق کرنے والے خطاط کا نام درج نہیں ہے۔ خطِ ناخن میں نہ تو روشنائی استعمال ہوتی ہے اور نہ ہی قلم سے خطاطی کی جاتی ہے بلکہ انگوٹھے اور انگلی کے ناخنوں سے کاغذ پر الفاظ ابھارے جاتے ہیں۔ 1884ء میں اس عجیب و غریب طرز خطاطی کی ایک باقاعدہ نمائش لاہور کے عجائب گھر میں منعقد ہوئی۔ اس نمائش میں مصطفیٰ خان کی کتب کو

اول اور امام ویروی کے مخطوطات کو دوسرے انعام کا حق دار ٹھہرایا گیا۔

امام ویروی کے شاگردوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ رائے صاحب منشی گلاب نے ان کاتبوں کے لیے پانچ روپیہ ماہانہ وظیفہ کا اعلان کیا تھا جو امام ویروی سے فن خطاطی کی تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔ امام ویروی کے نامور شاگردوں میں میاں علی بخش اور شیخ احمد جوہر کے نام شامل ہیں۔ امام ویروی نے 19 فروری 1880ء کو لاہور میں داعی اجل کو لبیک کہا اور اس نابغہ روزگار خطاط کو میکلوڈ روڈ کے قبرستان میں آسودہ خاک کیا گیا۔ لاہور کے جدید خطاطین کے ہاں آج بھی امام ویروی کے فنی اثرات کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ مولانا افضل الدین صحاف بھی اسی دور کا ایک معروف خطاط تھا۔ یہ خطِ نسخ و نستعلیق دونوں میں یکساں مہارت رکھتا تھا اور قرآن کی خطاطی کے لیے معروف تھا۔ قرآن کی خطاطی میں انفرادیت کے باعث ہی اسے صحاف کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ فضل الدین صحاف کی لکھی ہوئی ایک حمائل لندن سے شائع ہوئی تھی۔ اس کا بیٹا محمد بخش بھی قرآن کی خطاطی میں مہارت رکھتا تھا۔ (یاد رہے کہ یہ پنجاب یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر علامہ علاو الدین صدیقی کا دادا تھا) اس نے اپنے مخطوطہ قطعات کا ایک مجموعہ کتابی صورت میں شائع کیا تھا۔ محمد بخش نے 1900ء کے لگ بھگ لاہور ہی میں وفات پائی۔

مولوی سید احمد کی لکھی ہوئی وصلیوں کو شہر لاہور میں طبع ہونے والی اولین وصلیوں کا اعزاز حاصل ہے۔

امام ویروی کے مضافاتی شاگردوں میں چوہڑکانہ شیخوپورہ کے شیخ احمد چوہڑکانی کا نام قابل ذکر ہے۔ اس نے امام ویروی کی طرز پر نستعلیق خطاطی میں مہارت حاصل کی۔ شیخ احمد محکمہ بندوبست اراضی میں ملازم تھا۔ ملازمت سے فراغت کے بعد تحصیل بازار بھاٹی دروازہ کے قریب ایک مسجد میں امامت کے فرائض سرانجام دینے لگا اور عمر کے آخری ایام تک امامت اور خطاطی کے ذریعے اپنے فن اور علمیت کا فیض عام رکھا۔ مغل کوچہ حویلی کی امام بارگاہ میں لگے ہوئے بہت سے قطعات شیخ احمد چوہڑکانی کے فن خطاطی کی آج بھی گواہی دیتے ہیں۔ اسی طرح لاہور کے قریبی علاقے ایمن آباد کے مولوی سید احمد کو بھی امام ویروی کے نامور شاگردوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ سید احمد کا سرسری ذکر اوپر کی سطور میں بھی ہو چکا ہے۔ مولوی سید احمد ایمن آبادی کا زیادہ تر قیام چوک متی کے ڈیرہ کاتباں میں رہتا تھا۔ لہٰذا خطاطی سیکھنے کے شوقین اسی ڈیرے کا رخ کرتے تھے۔ اس ڈیرہ کاتباں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ

بیسویں صدی عیسوی کے تمام مشہور خطاطین کا فنی شجرہ کسی نہ کسی واسطے سے چوک متی کے اس ڈیرہ تک آ پہنچتا ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے۔ مولوی سید احمد کی لکھی ہوئی وصلیوں کو شہر لاہور میں طبع ہونے والی اولین وصلیوں کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ مولوی سید ایمن آبادی کے فرزند خلیفہ غلام محمد بھی اپنے والد کے ساتھ امام ویروی کے ہاں جایا کرتا تھا۔ امام ویروی اسے شفقت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ امام کے فن سے متاثر ہو کر خلیفہ غلام محمد نے بچپن سے ہی امام ویروی کے انداز میں خطاطی شروع کر دی تھی بعد ازاں اس فن میں ان کی شہرت پھیلنے لگی لیکن عین جوانی کے عالم میں اس کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا اس طرح لاہور کے اس عہد کا فنی منظر نامہ ایک جوہر قابل سے محروم ہو گیا۔ مولوی سید احمد کا دوسرا فرزند خلیفہ نور احمد البتہ خطاطی کے فن میں استادانہ درجے تک پہنچا۔ یہ ایک سبک رفتار خطاط تھا۔ تیزی میں لکھتے ہوئے الفاظ کا توازن اور تناسب برقرار رکھتا تھا۔ لکھنے سے قبل بہت سی قلمیں تیار کر کے اپنے سامنے رکھ لیتا تھا۔ سبک رفتاری سے لکھتے ہوئے جو قلم ساتھ نہ دے اسے فوراً تبدیل کر لیتا تھا لیکن کیا مجال کہ طرز تحریر یا خط میں کوئی فرق آئے۔ خلیفہ نور احمد کا انتقال 1915ء میں ہوا۔ خلیفہ نور احمد نے اپنے بھائی غلام محمد کے بیٹے خلیفہ محمد حسین کو اپنا شاگرد بنا کر اپنی زندگی ہی میں اپنی فنی وراثت انہیں منتقل کر دی تھی۔ خلیفہ محمد حسین کے دادا مولوی سید احمد بھی چونکہ اپنے وقت کے نامور خطاط

حاجی دین محمد نے ”کرنال شاپ“ کا ایک بورڈ لکھا تھا جسے بعد ازاں انارکلی بازار کی ایک دیوار پر آویزاں کیا گیا۔ اس اشتہاری بورڈ پر لکھے ہوئے حرف ”پ“ کی لمبائی 35فٹ تھی۔

تھے اس لیے خلیفہ محمد حسین نے اس خاندانی ورثے میں مزید اضافے کئے بلکہ لاہور تا کشمیر ایک صاحب کمال خطاط کے طور پر اسے احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مشکل الفاظ کو سبک رفتاری اور خوبصورتی کے ساتھ لکھنے میں اسے خصوصی مہارت حاصل تھی۔ خطاطین کشمیر کے باب میں بھی خلیفہ محمد حسین کی فنی خوبیوں کا مختصر ذکر کر چکا ہے۔ ان کا سن وفات 1937ء ہے۔ خلیفہ محمد حسین کے دادا سید احمد کے شاگردوں میں میاں عبدالغنی کا نام بھی شامل ہے۔ خطاطی کا فن سیکھنے کے بعد میاں عبدالغنی، رائے صاحب منشی گلاب سنگھ کے چھاپہ خانہ سے منسلک ہو گیا تھا۔ جہاں اس نے سینکڑوں درسی کتب کی کتابت کا کام سرانجام دیا۔ کتب کی صاف ستھری نستعلیق کتابت ان کی شہرت کا سبب بنی۔ خطاطی کی دنیا میں میاں عبدالغنی، میاں نتھو کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے

نامور شاگردوں میں حاجی دین محمد کا نام سرفہرست ہے۔ ایک روایت کے مطابق امام ویردی کے شاگرد سید احمد کے بیٹے خلیفہ نور احمد نے اپنے باپ سے خطاطی کی تربیت حاصل کرنے کے بعد میاں نتھو سے بھی کسب فیض کیا تھا۔ میاں نتھو کا شاگرد حاجی دین محمد جلی انداز میں خط نستعلیق کی لکھائی کیلئے مشہور ہوا۔ 1910ء کے لگ بھگ بادشاہی مسجد لاہور کے صحن میں بیٹھ کر اس نے خطِ نستعلیق میں ''کرنال شاپ'' کا ایک بورڈ لکھا تھا جسے بعد ازاں انارکلی بازار کی ایک دیوار پر آویزاں کیا گیا۔ اس اشتہاری بورڈ پر لکھے ہوئے حرف ''پ'' کی لمبائی 35 فٹ تھی۔ اس نسبت سے حروف کی موٹائی بھی خاصی جلی تھی۔ عبدالغنی نتھو کا یہ فنی کارنامہ ایک مدت تک زندہ دلان لاہور کی قدر شناس نظروں کا مرکز رہا۔ میاں نتھو کے شاگردوں میں ایک ہندو خطاط منشی ستیارام کی فنی ریاضت بھی قابل ذکر ہے۔ منشی ستیارام خطِ نستعلیق بہت نفیس انداز میں لکھتا تھا۔ اس کی نفاست تحریر کا شہرہ لاہور سے باہر تک پھیلا ہوا تھا۔

مولانا الطاف حسین حالیؔ

کی ایک نایاب تحریر

مولانا حالی نے یہ تقریظ کتاب ''علم الشطرنج'' پر لکھی تھی۔
یہ کتاب منشی راجا بابو دہلوی نے پٹیالے سے 1901ء میں
شائع کی تھی۔ اب تک یہ تقریظ کسی مجموعے میں شائع نہیں
ہوئی۔ اس نایاب تحریر کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ
مولانا کو شطرنج کے کھیل سے کتنی دلچسپی تھی۔

(ادارہ)

ھوالقدیر

تقریظ از قلم اعجاز رقم. شاعر بے مثال سخنور باکمال سعدی ہند
جناب مولانا مولوی الطاف حسین صاحب حالی پانی پتی۔

علم الشطرنج

مصنف منشی راجا بابو صاحب دہلوی
(خلف الرشید ماسٹر چھستی لال صاحب مرحوم ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم ریاست پٹیالہ)

اس کتاب کو بقدر ضرورت میں نے مختلف مقامات سے دیکھا۔ اگرچہ میرا یہ منصب نہیں ہے کہ ایک ایسی کتاب کی نسبت، جس کا موضوع فن شطرنج بازی ہو، اس کے مضمون کی حیثیت سے کچھ چون و چرا کرسکوں۔ کیونکہ یہ درحقیقت ایک ماہر مشاق شاطر کا کام ہے جو اس فن میں ید طولیٰ رکھتا ہو۔ لیکن چونکہ یہ کتاب اردو زبان میں لکھی گئی ہے اس لیے ہر شخص جو اردو زبان کو سمجھ سکتا ہے وہ کم سے کم اس بات کا حق رکھتا ہے کہ مصنف کی طرز تصنیف و طرز بیان یا کتاب کے مفید و غیر مفید ہونے کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرے۔

جہاں تک مجھ کو معلوم ہے آج تک کوئی کتاب ہماری زبان میں شطرنج پر ایسی جامعیت کے ساتھ نہیں لکھی گئی، اور اس فن کے متعلق اس قدر معلومات کا ذخیرہ عام ہندوستانیوں کے واسطے کبھی جمع نہیں کیا گیا۔ ممکن ہے کہ بعض ہموطن اس کتاب کے مفید ہونے میں تامل کریں۔ مسلمان تو اس وجہ سے کہ ان کے مذہب میں لہو و لعب میں مشغول ہونا ممنوع ہے اور واس وجہ سے کہ جن لوگوں کو اس کا لپکا پڑ جاتا ہے وہ اکثر اپنے ضروری اور بڑے بڑے فرائض کو شطرنج پر قربان کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ان کو اپنے کھانے پینے بلکہ اپنے آپے کی بھی خبر نہیں رہتی۔ لیکن لعب کا اطلاق ان کھیلوں پر ہوتا ہے جو کسی عمدہ مقصد کے لیے نہیں بلکہ صرف تضیع اوقات کے طور پر کھیلے جاتے ہیں۔ پس شطرنج اگر خاص خاص اوقات میں اس غرض سے کھیلی جائے کہ مآل اندیشی اور تدبر کی عادت پڑے اور دماغ میں سوچنے اور غور کرنے کا ملکہ پیدا

ہو تو ہرگز لعب میں شمار نہیں ہو سکتی۔ اس کے سوا کوئی کام صرف اس وجہ سے مذموم نہیں ٹھہر سکتا کہ بعض اشخاص اس کو بری طرح کرتے ہیں۔

کتاب کا مطالعہ جو بالاتفاق ایک نہایت مفید اور عمدہ مشغلہ ہے، وہ صرف اس وجہ سے قابلِ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ بعضے لوگ اسی کے ہو رہتے ہیں اور تمام دینی و دنیاوی کاموں کو مطالعہ کے شوق پر قربان کر دیتے ہیں۔ اس کتاب کی نسبت صرف اس قدر لکھنا کافی ہے۔ جو کچھ اس کے متعلق لالہ جیون لال صاحب منیجر امپیریل بک ڈپو چاندنی چوک بازار نے اپنے اشتہار میں لکھا ہے اس میں سر مو مبالغہ نہیں کیا گیا بلکہ جس طرح عمدہ کتابوں کے اشتہارات میں بہ سبب اختصار کے ان کتابوں کی اصل خوبیاں پوری پوری بیان نہیں ہو سکتیں، اسی طرح صاحب منیجر امپیریل بک ڈپو کا اشتہار کتاب معلم الشطرنج کی بہت سی خوبیاں بیان کرنے سے قاصر رہا ہے۔ لیکن اس کتاب میں ایک بات کی کسر معلوم ہوتی ہے۔ یعنی جبکہ اس میں بہت سے یورپین شاطروں کے کمالِ شطرنج بازی کا ذکر جا بجا کیا گیا ہے تو مقتضائے مقام یہ تھا کہ ہندوستان کے نہایت نامور اور باکمال شاطروں کا بھی کسی قدر تذکرہ کیا جاتا۔ خصوصاً انیسویں صدی کے مشہور شاطر مثل کرامت علی خاں و مرزا رحیم الدین حیا و امام علی خاں وغیرہم ضرور اس بات کے مستحق تھے کہ جو کتاب ہندوستان کی زبان میں ایک ہندوستان ہی کے ایجاد کیے ہوئے کھیل پر لکھی جاتی اس میں ان کی خاص خاص بازیوں اور نقشوں کا ذکر کیا جاتا۔ لیکن حق یہ ہے کہ ہمارے لٹریچر میں کوئی ذریعہ ایسا موجود نہیں ہے، جس سے ہندوستانی شاطروں کی کسی بازی یا کسی نقشے کا سراغ لگانا ممکن ہو، جو شاطر مر گیا اس کی بازیاں اور اس کے نقشے بھی اس کے ساتھ مر گئے۔ البتہ ہمارے عزیز دوست راجا بابو صاحب نے اردو لٹریچر میں ایک ایسی مثال قائم کی ہے کہ اگر اس کی پیروی کی گئی تو ہمارے آئندہ شاطروں کے عمدہ عمدہ نقشے آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ رہ سکیں گے۔

دلی میں عبدالحکیم نامی ایک مشہور غائب باز تھا جس کو ہم نے خود حاضر و غائب دونوں طرح کھیلتے دیکھا ہے۔ اس کی نسبت یہ بات مشہور تھی کہ وہ حاضر بازی میں تو مات بھی ہو جاتا ہے مگر غائب بازی میں کبھی مغلوب نہیں ہوتا۔ لیکن افسوس ہے کہ آج اس کی ایک بازی کا نقشہ بھی کسی کو یاد نہیں۔ اسی لیے جیسا کہ راجہ بابو صاحب نے اکثر کتاب میں تصریح کی ہے، اس ملک میں فن شطرنج بازی روز بروز تنزل کرتا جاتا ہے۔ شاید بعض نکتہ

چین اس جدید تصنیف پر ریمارک کریں کہ اگر فن شطرنج بازی کو غیر مفید تسلیم کر لیا جائے تو بھی اس موضوع پر کتاب لکھنا اس وقت زیبا تھا جبکہ ہمارا لٹریچر اور ہماری زبان تمام ضروری علوم و فنون سے مالا مال ہو جاتی اور مصنفین کے لیے کوئی میدان اس کے سوا باقی نہ رہتا کہ کھیلوں اور بازیوں کے قواعد منضبط کر کے ان کو کتابوں کے لباس میں جلوہ گر کریں۔ اس قسم کا اعتراض اس کتاب پر کیا گیا تھا جو حال ہی میں فرانس اور پروشیا کی جنگ کے بیان میں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی گئی ہے۔ اگرچہ یہ اعتراض ترجموں کی نسبت ایک حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ مترجم مختلف مضامین میں سے جس مضمون کو سب سے مقدم اور ضروری سمجھے، ترجمہ کے لیے انتخاب کر سکتا ہے۔ مگر اوریجنل تصنیف کے لیے کسی مضمون کا اس طرح انتخاب کرنا ممکن نہیں، کیونکہ ایسی تصنیف اسی مضمون پر سر انجام ہو سکتی ہے جس پر مصنف نے کم و بیش کمال حاصل کیا ہو اور اس کی ممارست میں ایک معتدبہ حصۂ عمر صرف کیا ہو۔ پس درحقیقت ایک اوریجنل مصنف کا یہ کام نہیں ہے کہ جو مضمون ملک کے لیے سب سے زیادہ ضروری اور مفید ہو اس پر خواہی نہ خواہی طبع آزمائی کرے، بلکہ براہ راست اس کا کام یہ ہے کہ جس فن میں اس نے کمال حاصل کیا ہے اس میں جو کچھ تجربہ اور معلومات اس نے بہم پہنچائی ہو، اس کو قدیم مصنفوں کی معلومات میں شامل کر کے اس سے ملک کو مستفید کرے۔

ہم کو امید ہے کہ راجہ بابو صاحب کی کتاب "معلم الشطرنج" ان تصانیف کے لیے جو آئندہ اس فن پر خاص کر اردو زبان میں لکھی جائیں گی بمنزلہ اساس اور بنیاد کے ہو گی اور جتنی عمارتیں اس بنیاد پر چنی جائیں گی ان کے بانی ہونے کا حق ہمارے لائق مصنف کو ہو گا۔

راقم

خاکسار الطاف حسین حالی

از پانی پت (۱۹۰۱ء)

رابعہ عرفان

اسد محمد خان کی گیت نگاری

جدید گیت نگاروں میں ایک اہم نام اسد محمد خان کا بھی ہے۔ اگرچہ انھوں نے زیادہ گیت نہیں لکھے مگر تعداد میں کم ہونے کے باوجود ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے کل گیت سو کے قریب ہیں جن میں سے ۵۱ گیت ان کی کتاب ''رکے ہوئے ساون'' میں شامل ہیں۔ ان کا کہنا ہے:

''جو بھی دکھانے کے لائق ہے بس اتنا ہی ہے''

''رکے ہوئے ساون'' ان کے گیتوں کی واحد کتاب ہے۔ اپنی کتاب کے دیباچے میں وہ خود لکھتے ہیں:

''گیت میری پہلی محبت ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ پہلی محبتیں زیادہ دیر تک نہیں چلتیں۔ مجھے بھی باحسرت و یاس لوٹنا پڑا۔ میں نے گیت لکھنا چھوڑ دیا''

اسد محمد خان کے گیتوں میں روایتی گیت کی تمام خصوصیات نظر آتی ہیں۔ ان کے گیتوں میں وہی انفرادی رنگ موجود ہے جو نظم میں ان کو ممتاز کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے گیتوں میں جدت کے ساتھ ساتھ روایت کا خوبصورت امتزاج بھی ملتا ہے۔

گیت کی عام روایت کے مطابق ہر گیت میں عشق و محبت کا حوالہ شامل ہوتا ہے اور ان میں عورت اپنے عشق کا اظہار کرتی ہے۔ اسد محمد خان کے گیتوں کا مطالعہ کریں تو ہمیں یہ روایت شاندار طریقے سے نظر آتی ہے۔ چنانچہ ان کے گیتوں میں عورت کی زبانی اظہارِ عشق کیا گیا ہے۔ مگر لطف کی بات یہ ہے کہ اظہار سوقیانہ خیالات و جذبات کا حامل نہیں بلکہ اس اظہار میں ایک خاص قسم کی پاکیزگی اور لطافت کا حسن جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً اپنے ایک مشہور گیت میں لکھتے ہیں:

تم سنگ نیناں لگے　مانے نیں جیا را
پیا پیا بولے پیا　من کا پپیہارا
اتنا بتا دو کاہے مٹ گئی بندیا
تم ہی کہو نا پیا کٹ گئی نندیا

گیت میں ان کے ہاں یہ انفرادیت بھی ہے کہ مرد کی طرف سے بھی عشق کا اظہار ملتا ہے مگر اس اظہار کے بیان میں وہ کہیں بھی گیت کا حسن مجروح کرتے دکھائی نہیں دیتے اور یہی خوبی ان کے گیتوں کے حوالے سے ان کے پختہ شعور کی نشاندہی کرتی ہے۔

ان کے گیتوں کے زیادہ تر موضوعات عشقیہ ہی ہیں جن میں وہ ملن، جدائی اور انتظار وغیرہ کی کیفیات کو بیان کرتے ہیں اور ان کیفیات کے بیان میں وہ عاشق کے دلی جذبات اور حالت کا نہایت خوبصورتی سے اظہار کرتے ہیں اور جذبات کی یہی بہترین عکاسی گیت کو ایک نیا رنگ اور دلکشی بخشتی ہے۔

ان کے زیادہ تر گیتوں میں انتظار کی کیفیت نہایت پرسوز انداز میں بیان کی گئی ہے۔ اور یہ کیفیت ایک ادبی چنگاری کی طرح رفتہ رفتہ سلگ کر میٹھے میٹھے درد اور ایک کسک کا احساس اُجاگر کرتی ہے مثلاً:

موہے بدری کی گھن گھن مار گئی
موہے پایل کی چھن چھن مار گئی
آ جا آ جا رے جیون ہار گئی

ان کے گیتوں میں جدائی کے کرب کے ساتھ ساتھ خوشی کے جذبات کا اظہار بھی ملتا ہے۔ جب وہ اپنے گیتوں میں وصال کی کیفیت کو بیان کرتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ جیسے روح نشہ وصال میں سرشار ہے۔

اسد محمد خان کے گیتوں میں مقامی رنگ پوری فضا پر چھایا ہوا ہے۔ ان کے ہاں ہمیں بہار و خزاں کے منظر ملتے ہیں۔ وہ برسات، بسنت کو بھی اپنے گیتوں کا موضوع بناتے ہیں۔ انھوں نے پورے فنی شعور کے ساتھ مقامی رنگ کو اپنے گیتوں میں بیان کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی گیتوں میں کافی وسعت پیدا ہوگئی ہے۔

ان کے گیتوں میں ساون کے موسم میں انتظار کی کیفیت کا بیان بڑے دلِ سوز انداز میں ملتا ہے اس کے علاوہ بسنت کے تہوار میں بہار کا موسم جھولے، کلیوں، بادلوں اور ٹھنڈی ہوا وغیرہ کا ذکر روح کی اتھاہ وادیوں کو شاداب کر دیتا ہے۔

ان کے گیتوں میں ناامیدی حسرت و یاس کے مضامین بہت کم ملتے ہیں بلکہ ایک پُراعتماد امید کا لہجہ ان کے گیتوں میں ہمیں جگہ جگہ دکھائی دیتا ہے۔

سورج بڑھے یا آندھی آئے دیا جلائے رکھنا
گھر کی خاطر سو دکھ جھیلیں گھر تو آخر اپنا ہے

اسد محمد خان کو منظر نگاری خصوصاً مناظرِ فطرت کی لفظی تصویر کھینچنے پر قدرت حاصل ہے۔ وہ

اپنے خوبصورت لفظوں کی مدد سے مناظر کی رنگا رنگ تصویریں بناتے ہیں۔

اسد محمد خاں اپنے گیتوں میں وطن پرستی کے حوالے سے بھی اپنے جذبوں کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے گیتوں میں محبت کا جذبہ وطن کی محبت میں ڈھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ وہ اپنے گیتوں میں وطن کی مٹی سے والہانہ محبت کا اظہار کرتے ہیں مثلاً انھوں نے ایک گیت میجر سید اقبال جواد شہید کے نام لکھا ہے اور اس میں ان کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ بعض اوقات وطن پرستی کے جذبات کا بیان شدت اختیار کر لیتا ہے اور دعائیہ رنگ میں ڈھلتا ہو انظر آتا ہے۔ ان کا ایک معروف گیت ہے:

زمین کی گود رنگ سے امنگ سے بھری رہے
خدا کرے سدا یہ روشنی رہے
دلوں میں کوئی خواب تھا بسا ہوا
نظر میں اک گلاب تھا چھپا ہوا
عجب بہار میں کھلا وہ پھول ماہتاب کا
یہ تازگی یہ زندگی یہ چاندنی
خدا کرے سدا یہ چاندنی رہے

فنی معیارات کی روشنی میں اگر ہم اسد محمد خاں کے گیتوں کا جائزہ لیں تو ان کے ہاں ہمیں کہیں طوالت نہیں ملتی نہایت مختصر مگر پُر تاثیر الفاظ کے ساتھ انھوں نے اپنے گیتوں میں جذبات کی خوبصورت عکاسی کی ہے۔ وہ جذبات کے بیان میں نہایت دھیما لہجہ اپناتے ہیں جس سے گیت میں حسن پیدا ہوتا ہے اور یہی اختصار ان کے گیتوں کی کامیابی کا ضامن ہے کیونکہ بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ طوالت کتنی ہی حسین و خوبصورت کیوں نہ ہو تاثیر کو مجروح کرتی ہے۔

ان کے گیتوں کی ایک اور خوبی ان کا صوتی آہنگ اور گھلاوٹ ہے۔ اس کے لیے انھوں نے لفظی تکرار سے کام لیا ہے۔ وہ ایسے ہم آواز الفاظ استعمال کرتے ہیں جن سے موسیقی پیدا ہوتی ہے۔ یہی موسیقیت اور ترنم گیت کا بنیادی خاصہ ہے۔ انھوں نے صوتی ہم آہنگی کے لیے برج بھاشا اور مقامی بولیوں کے الفاظ یکساں سطح پر استعمال کیے ہیں۔ وہ مترنم بحریں اور مترنم الفاظ کا استعمال کر کے گیت کے حسن کو دوبالا کر دیتے ہیں۔

ان کے گیتوں میں ہندی لفظیات کا غلبہ ہے۔ اگر چہ یہ الفاظ دیکھنے میں عام فہم ہیں لیکن بعض جگہ روایت کا پس منظر جانے بغیر ان کے گیت کو سمجھنا دشوار لگتا ہے۔ مثلاً ان کا گیت ''میں وندھیا چل کی آتما'' ایسا گیت ہے جس کو سمجھنا عام فہم قاری کے لیے دشوار ہے لیکن اس بات میں شک نہیں کہ ان ہندی الفاظ کا استعمال زیادہ فنی شعور اور شاعرانہ فنکاری کا حامل ہے۔

اپنے گیتوں میں وہ موقع محل کے مطابق ہی تشبیہات اور استعارات کا استعمال کرتے ہیں۔
جس سے ابلاغ میں قطعی رکاوٹ نہیں آتی اور گیت کا حسن اور تاثیر دونوں دوبالا ہو جاتے ہیں۔

بحیثیت مجموعی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسد محمد خاں کے ہاں گیت نگاری کے دو موضوعات نمایاں ہیں۔ پہلا وطنیت کا جذبہ اور دوسرا رویہ ثقافتی رنگوں کی عکاسی کا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں عورتوں کے جذبات کی عکاسی، ملن، جدائی، انتظار اور درد کی شدت نظر آتی ہے۔ انھوں نے گیتوں کے ڈکشن اور عروضی سانچوں کے ساتھ ساتھ ان میں مقامی رنگ و آہنگ کو سمونے کی کوشش کی ہے۔ انھی کوششوں کی بدولت انھوں نے گیت نگاری کے دائرے میں وسعت پیدا کی۔

فنی طور پر ان کے ہاں خیال ریزی کے بجائے ایک خاص تسلسل، آمد اور جذبے کے انفرادی خدو خال واضح طور پر محسوس ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنے گیتوں میں نئے تجربوں کو اہمیت دی۔ گیت کو ایک رسمی اظہار بنانے کے بجائے اس میں تنوع اور زندگی کے رنگ بھرنے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ ٹیپ کے مصرعوں اور بعض دوسرے مصرعوں کے ٹکراؤ سے انھوں نے گیتوں میں صوتی آہنگ پیدا کیا۔

اس مختصر سے جائزے کے بعد یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اگرچہ انھوں نے چند گیت لکھے ہیں مگر یہ چند گیت بھی اپنے موضوعاتی اور فنی خصوصیات کے حوالے سے نہایت اہم ہیں اور ان کی شاعری میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ انھی خصوصیات کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ بلاشبہ ان کو اردو کے اچھے گیت نگاروں میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

•◆•◆•◆•◆•◆•◆•◆•◆•◆•◆•◆•◆•◆•

ڈاکٹر روبینہ ترین

اُردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ۔ ماہ لقا بائی چندا

اُردو شعروادب کی تاریخ میں دکن کو ادبی آثار شناسی کے سبب فوقیت حاصل رہی ہے۔ تاریخی لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ وہ سرزمین ہے جہاں اُردو ادب کے جنم یا پتسمہ لینے کی مضبوط شہادتیں ملتی ہیں۔ چھٹی صدی ہجری سے ہی اس علاقے میں صوفیائے کرام کے ورِدِ زبان بن جانے والے فقروں سے جس بولی ٹھولی کا آغاز ہوتا ہے وہ بالآخر ساتویں صدی ہجری کے آخر تک ایک زبان کا تشخص اُبھارنے لگتے ہیں۔ اگر چہ ایسی کوئی باقاعدہ ادبی تخلیق اس عرصے میں نہیں ملتی لیکن یہی زبان آٹھویں صدی ہجری میں تخلیقی اظہار کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ دکن میں بہمنیہ سلطنت (۷۴۷ھ) کے آغاز کے ساتھ ہی نہ صرف اس علاقے کی تہذیب و معاشرت میں تبدیلی آئی بلکہ اس عہد کا ادب بھی زمینی مہک اور اشرافیہ کے جمالیاتی احساس کے امتزاج کا آئینہ دار دکھائی دیا۔

اس پر اب اتفاق ہونے لگا ہے کہ دکن اُردو شعروادب کا اوّلین مرکز رہا ہے۔ البتہ وہاں اُردو مثنوی اور غزل کے جو چند ابتدائی اور اہم شعرا تھے انہی کے تاریخی روایت میں محض انہی کے حوالے سے تخلیقی فضا کا پورا احساس نہیں کیا جاسکتا، دکن محض بہمنیہ دَور یا قطب شاہی و عادل شاہی حکمرانوں تک ہی شعروادب کا مرکز نہ تھا بلکہ آنے والے دَور میں بھی اس علاقے میں شعروسخن کی محفلیں برپا رہیں۔ یہ علاقہ ولی جیسا کوئی اور بڑا شاعر تو پیدا نہ کرسکا البتہ اس علاقے کو یہ خصوصیت رہی کہ یہاں خواتین بھی شعروسخن کی دنیا میں اپنی تخلیقات کے ذریعے شامل رہیں اور پھر اُردو کی پہلی شاعرہ تو نہیں لیکن پہلی صاحب دیوان شاعرہ ماہ لقا چندا بائی (۱۱۸۱ھ تا ۱۲۴۰ھ) کا تعلق اسی سرزمین سے ہے۔ سلاطین بہمنیہ شاہی و عادل شاہی کی طرح سلطنت آصفیہ کے دَور نے بھی اُردو کی ترقی میں بھرپور حصہ لیا۔ ان کے عہد میں نہ صرف بڑے بڑے شعرا پیدا ہوئے

جنہوں نے نظم ونثر کی کتابیں تصنیف کیں بلکہ دکنی شعرا کے تذکرے لکھنے کی بھی ابتدا ہوئی اور اسی دور میں ہی دکنی شعرا اور ادیب حیدرآباد میں جمع ہو گئے۔ یہی وہ دور تھا جب یہاں کی شاعرات کا ذکر تذکروں میں ہونے لگا اگرچہ یہ تذکرہ بہت کم ہی ہوتا لیکن کہیں کہیں شاعرات کے نام آنے لگے۔ اُردو کی پہلی خاتون شاعرہ اس دور میں ماہ لقا چندا تھی ☆[1] جن کا دیوان ۱۲۱۳ھ مطابق ۱۷۹۸ء میں مرتب ہوا۔ اس کا اصل نام چندا بائی خطاب مہ لقا اور تخلص چندا تھا۔

اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ ماہ لقا چندا بائی کا تعلق براہِ راست دکن سے نہ تھا ☆[2]۔ اس کے والد نواب بسالت خان بہادر، مرزا سلطان نظر کے چھوٹے بیٹے تھے۔ مرزا سلطان نظر اور اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد دربار میں مختلف مناصب پہ فائز رہے، انھیں پہلے مغل شہزادے اعظم شاہ (۱۷۰۷ء) نے صلابت خاں کا خطاب دیا بعد میں مرزا سلطان نظر نے جب معظم شاہ (۱۱-۱۷۰۷ء) کی ملازمت اختیار کی تو اُس نے انہیں بسالت خان کا خطاب دیا۔ جہاندار شاہ (۱۳-۱۷۱۱ء) اور پھر فرخ سیر (۱۹-۱۷۱۳ء) کے زمانے تک بھی حکومت میں شامل رہے۔ اسی زمانے میں (۱۱۲۷ھ) داؤد خان، ناظم مملکت دکن نے

☆۱ بحوالہ ا۔ محی الدین قادری زور، ڈاکٹر، ''داستان ادب حیدرآباد''، ادارہ ادبیات اُردو، حیدرآباد، ۱۹۵۱ء، ص ۹۸۔

ii۔ محی الدین قادری زور، ڈاکٹر، ''تذکرہ مخطوطات''، جلد سوم، مطبوعہ دہلی، ۱۹۸۳ء، ص ۱۳۰۔

iii۔ حکیم فصیح الدین رنج، ''بہارستان ناز'' (تذکرہ شاعرات)، مرتبہ خلیل الرحمن داؤدی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۱۲۷۔

اب تک اُردو ادب کی تاریخ میں ماہ لقا بائی چندا کو ہی اُردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ سمجھا جاتا ہے لیکن نصیر الدین ہاشمی کے ایک مضمون ''اُردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ لطف النساء امتیاز کا دیوان اور مثنوی گلشن شعرا'' میں لطف النساء بیگم امتیاز کو پہلی صاحب دیوان شاعرہ کہا گیا ہے۔ اس کے مطابق ''پہلی صاحب دیوان شاعرہ لطف النساء امتیاز قرار دی جانی چاہیے کیونکہ اس کا دیوان ۱۲۱۲ھ میں یعنی چندا کے دیوان سے ایک سال پہلے مرتب ہوا۔'' مگر نصیر الدین ہاشمی نے واضح طور پر اس کا کوئی ثبوت فراہم نہیں کیا۔ حوالے کے لیے ملاحظہ فرمایئے:
''دکھنی قدیم اُردو کے چند تحقیقی مضامین''، مطبوعہ دہلی، ۱۹۶۳ء، ص ۱۷۶۔

☆۲ چندا کے جد امجد مرزا محمد یار قوم چغتہ برلاس کا تعلق بلخ سے تھا جو شاہ جہاں کے عہد میں ہندوستان آئے اور شاہی ملازمت اختیار کی اور ہندوستان میں ہی شادی کی جہاں ان کا بیٹا مرزا سلطان نظر (جو کہ ماہ لقا چندا کے دادا تھے) پیدا ہوا۔ غلام صمدانی خان گوہر لکھتے ہیں کہ ''میرزا سلطان نظر المخاطب بسالت خان نامداران روزگار و امرائے باوقار سے تھے۔ جو از روئے نسب چندا بی بی المخاطب ماہ لقا بائی کے جد اعلیٰ ہوتے ہیں۔'' (حیات ماہ لقا، ص ۱۹)

بغاوت کی تو اس کی سرکوبی کے لیے امیر الامراء حسین علی خاں کے ساتھ مرزا سلطان نظر دکن روانہ ہوئے جہاں داؤد خاں اور مرزا سلطان نظر دونوں مارے گئے۔ مرزا سلطان نظر کے دو بیٹے تھے اُن میں سے ایک بیٹے نواب بسالت خان بہادر آصف جاہی بخشی صرفِ خاص کا نام بہادر خان تھا۔ ''مآثر الامرا'' میں لکھا ہے کہ

> ''اس کے (سلطان نظر کے) بڑے لڑکے کا نام میرزا حیدر تھا جو حسین علی خاں کی مدد سے اپنے باپ کے بعد بخشی مقرر ہوا۔ سادات کے زوال کے بعد عہدہ چھوڑ کر گوشہ نشین ہو گیا۔ اس کا دوسرا لڑکا جسے باپ کا خطاب بسالت خان ملا تھا، آصف جاہ کے ہمراہ تھا۔ محرر اوراق (شاہنواز خان) نے اس کو دیکھا ہے۔ اس کے دو لڑکے تھے جو قلیل منصب جاگیر میں زندگی گزارتے تھے۔''(۱)

ماہ لقا چندا سلطان نظر کے دوسرے بیٹے کی اولاد تھی۔ چندا کے والد کی طرح اس کی والدہ کا تعلق بھی براہِ راست دکن سے نہ تھا اس کے نانا محمد حسین قصبہ بار بہ سے محمد شاہ (۴۸-۱۷۱۹ء) کے عہد میں دہلی آ گئے تھے۔ محمد حسین فطرتاً عیش پسند اور فضول خرچ تھے۔ احمد آباد گجرات کے ناظم نے انہیں کروڑ گیری پر مامور کیا تو اپنے مزاج کے مطابق اُنہوں نے خوب خرچ کیا، یہاں تک کہ سرکاری خزانہ کو بھی استعمال میں لے آئے جب ناظم گجرات کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے جانچ پڑتال شروع کر دی چنانچہ محمد حسین اپنی بیوی بچوں کو چھوڑ کر واپس اپنے وطن (قصبہ بار بہ) فرار ہو گئے، ناظم گجرات نے ان کے بیوی بچوں کو نظر بند کر دیا۔ حالات سے تنگ آ کر اُن کی بیوی موقع ملتے ہی بچوں سمیت جنگل کی جانب فرار ہوئی اور پھر وہاں سے قصبہ دیولیہ پہنچی جہاں بھگتیوں کے ساتھ کچھ عرصہ قیام کیا۔ چندا بی بی ☆ خوب صورت تھی اور حسین بیٹیوں کا ساتھ تھا۔ ایسے میں زندگی بسر کرنے کے لیے انہوں نے بھگتیوں سے گانے بجانے کا کام سیکھ لیا، چنانچہ جلد ہی پورے علاقے میں ان کے حُسن اور گانے بجانے کی شہرت ہوئی تو قصبہ دیولیہ کے حاکم راجہ

☆ ماہ لقا چندا بائی کی نانی۔

سالم سنگھ ولد پرتاب سنگھ نے انہیں مکان اور دیگر ضروریاتِ زندگی فراہم کیں اور ساتھ ہی چندابی بی کی بیٹی میدہ بی بی سے شادی کی جس سے اس کی بیٹی مہتاب بی بی پیدا ہوئی لیکن راجہ سالم سنگھ کی رانی کے ہاتھوں تنگ آ کر چندابی بی کی وفات کے بعد میدہ بی بی اپنی دوسری بہنوں اور بھائیوں کے ساتھ فرار ہو کر ۱۱۶۱ھ میں صوبہ مالوہ کے راستے دریائے نربدا عبور کر کے دکن کی جانب روانہ ہوئیں جہاں میدہ بی بی کے علاوہ دوسری بہنوں نے گانے بجانے کو ذریعہ معاش بنایا جب کہ میدہ بی بی نے بسالت خان سے نکاح کیا اور ان کے ہاں ایک بیٹی کی پیدائش ہوئی جو کہ ماہ لقا چندا بائی کے نام سے مشہور ہوئی۔ غلام صمدانی خاں گوہر 'حیات ماہ لقا' میں لکھتے ہیں کہ

''۲۰ ذی قعد ۱۱۸۱ھ روز دوشنبہ کو جب آفتاب عالم تاب دو نیزے برابر آیا ساعت قمر میں ایک ماہ پیکر حور منظر لڑکی تولد ہوئی مورخ کا بیان ہے کہ تولد کے وقت اتنی روشنی ہوئی کہ حجرہ منور ہو گیا۔'' (۲)

چندا کی تاریخ پیدائش کے متعلق بھی مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔ نصیر الدین ہاشمی نے اس کا سنہ پیدائش ۱۱۷۸ھ (۳) بتایا ہے مگر شہادت اور استناد مفقود ہیں 'تجلیات ماہ لقا' جوہر بیدری کا اصل ماٰخذ ہے اس میں سنہ پیدائش ۱۱۸۱ھ بتایا گیا ہے جب کہ غلام صمدانی خاں گوہر نے بھی اسی کی تائید کی ہے۔ ماہ لقا چندا کی پیدائش کی بہت خوشیاں منائی گئیں۔ اس کی بڑی بہن مہتاب بی بی☆ کے ہاں اولاد نہ تھی اس لیے چندا کو پرورش کے لیے اس کے سپرد کیا گیا۔ غلام صمدانی خان گوہر لکھتے ہیں کہ

''چونکہ صاحب جی صاحبہ (مہتاب کنور بائی) محل احتشام

☆ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور اختر حسین اختر نے مہتاب بی بی کو چندا کی خالہ قرار دیا ہے جو کہ درست نہیں۔ خاندانی حالات و واقعات سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ دونوں بہنیں تھیں۔ جوہر بیدری نے بھی ''تجلیات ماہ لقا'' میں جہاں کہیں مہتاب بی بی کا ذکر کیا ہے اس کو چندا کی ''خواہر کلاں'' ہی لکھا ہے۔ حوالے کے لیے ملاحظہ فرمایئے:

i۔ نصیر الدین ہاشمی، ''دکن میں اردو''، ص ۴۱۵۔

ii۔ محی الدین قادری زور، ''داستان ادب حیدرآباد''، ص ۷۸۔

iii۔ اختر حسین اختر، مضمون بعنوان ''ماہ لقا بائی چندا کی شاعری''، ص ۹۸۔

جنگ رکن الدولہ بہادر کے بطن سے کوئی اولادِ نرینہ موجود نہ
تھی اس لیے راج کنور بائی نے چندابی بی کو صاحب جی صاحبہ
کے آغوش فرزندی میں دے دی اور خود عبادت و خدا طلبی میں
مشغول ہوئی۔ اگرچہ میدابی بی (راج کنور بائی) کا نام بحسب
سرنوشت کسبیوں کی فہرست میں شامل ہوگیا تھا لیکن والا گہری
اور نجابت فطری کے باعث ہمیشہ نجیب پروری اور قدردانی
کرتی رہتی تھی۔'' (۴)

میدہ بی بی نے خود کو دنیاوی معاملات سے کنارہ کش کرلیا۔ ۱۲۰۷ھ/۹۲-۱۷۹۲ء میں اس کا انتقال ہوا تو اسے کوہ مولا علی میں سپردِ خاک کیا گیا جہاں چندا نے مقبرہ تعمیر کروایا (جو آج بھی موجود ہے) ہر سال عرس کا اہتمام کیا جاتا اس موقع پر ماہ لقا چندا مشاعرے بھی کرواتی۔

مہتاب بی بی نے ماہ لقا چندا کی تعلیم و تربیت کا خصوصی اہتمام کیا۔ فارسی اور عربی زبان کے علاوہ اس عہد کے مروجہ علوم کے ساتھ ساتھ موسیقی اور گھڑ سواری کی تربیت بھی لی۔ پندرہ برس کی عمر میں ماہ لقا کو نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی (۱۱۴۶ھ-۱۲۱۸ھ) نے اپنی سرپرستی میں لے لیا جو چندا کے حسن اور سیرت سے بہت متاثر تھے۔ وہ چندا کو اتنا چاہتے تھے کہ ہر پل اپنے ساتھ رکھتے یہاں تک کہ سفر اور مہمات میں بھی وہ ان کے ساتھ شریک ہوتی ☆[1]۔ نواب آصف جاہ ثانی چندا کی خوش مزاجی، موسیقی میں مہارت اور انفرادیت کی وجہ سے اس کے ساتھ محبت سے پیش آتے تھے چنانچہ مہم پانگل ☆[2] (۱۲۱۷ھ) سے واپسی پر ایک شاندار جشن کا اہتمام کیا گیا اور تمام رؤساء و امراء کو خطابات سے نوازا گیا اس موقع پر چندا کو بھی ''ماہ لقا بائی چندا'' کا خطاب عطا ہوا۔

''تمام امرا و منصب دار خطاب و منصب عالم و نقارہ سے
سرفراز و ممتاز کیے گئے اور بمناسبت نام کے چندابی بی کو ماہ لقا
بائی کا خطاب اور نوبت و گھڑیال (جو لازمہ منصب داری

☆۱ تاریخ کی تمام کتب سے بھی اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ چندا مہم کولاس (۱۱۹۴ھ) معرکہ نرمل (۱۱۹۷ھ) اور مہم پانگل (۱۲۱۷ھ) میں نواب کے ساتھ رہی۔

☆۲ پانگل حیدرآباد کے جنوب میں تقریباً ۹۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

ہے) سے سرفراز فرمایا۔ چنانچہ عطائے نوبت کی تاریخ ایک صاحب نے حسب ذیل لکھی ہے۔ قطعہ

نوید آمد بعالم مہ لقا را نوازش کرد از نوبت شہنشاہ
ترانہ ساز سالش گفت ناہید "بلند آوازہ نوبت باد دلخواہ"

(۱۲۱۷ ہجری)

ماہ لقا طبعاً خوش مزاج، شوخ و شریر، لطیفہ گو، حاضر جواب تھی جس کی وجہ سے وہ ہر لمحہ نواب کو خوش رکھتی تھی۔ چندا کی موجودگی میں غم یا فکر کی کیفیت نواب پر طاری نہ ہوتی تھی اور پھر علم موسیقی کی وہ ماہر تھی غرض وہ تمام لوازمات جو خوش وقتی کے لیے ضروری ہو سکتے ہیں وہ تمام ماہ لقا میں موجود تھے۔ ماہ لقا بائی کی گفتگو، طور طریق اور فن رقص کو دیکھ کر سکندر جاہ فرماتے تھے کہ

"مانند ماہ لقا بائی دیگرے بہ ایں کمالات پیدا شدن مشکل است" (۵)

یہ صرف بادشاہ وقت کی ہی رائے نہ تھی بلکہ اس وقت کے امراء و رؤسا کی کوئی محفل ایسی نہ تھی جو چندا کے بغیر مکمل سمجھی جاتی۔ جن امراء کی صحبت میں چندا رہی ان میں غلام سید خان نواب ارسطو جاہ، ابوالقاسم میر عالم اور راجہ چندو لعل شاداں جیسے بڑے نام شامل ہیں۔

میر عالم (۱۱۶۶ھ تا ۱۲۲۳ھ) جو فارسی پر مکمل عبور رکھتے تھے، وہ چندا کی خوش مزاجی کے علاوہ اس کی خوبصورتی کے بھی مداح تھے۔ چنانچہ انہوں نے "ماہ لقا" پر ایک طویل مثنوی "سراپا" لکھی۔ ان کی اس فارسی مثنوی کے چند اشعار یہ ہیں:

اے ماہ سپہر آشنائی سر تا پائے تو دل رُبائی
اے مُردم دیدۂ محبت سر تا قدمت طلسمِ الفت
اے ماہ لقائے ماہ پیکر اے ماہ جبیں ماہ منظر

(۶)

چندا، راجہ راؤ سبھا☆ کی ملازمت میں بھی رہیں انہی کی عنایت سے ہی چندا کا دیوان

☆ راجہ راؤ سبھا کا تعلق دکن کی متمول ترین ہستیوں میں ہوتا ہے۔

مرتب ہوا تھا۔ شفقت رضوی لکھتے ہیں کہ

''چندا کا دیوان ۱۲۱۳ھ مطابق ۱۷۹۸ء مرتب ہوا (نصیر الدین ہاشمی نے ۱۲۱۳ھ مطابق ۱۷۶۱ء لکھا ہے۔ عیسوی سنہ درست نہیں ہے) دیباچے میں صراحت کی گئی ہے کہ عہد نظام الملک آصف جاہ نظام الدولہ میر نظام علی خان میں کہ سنہ ثالث عشرہ ماتین بعد الف تھا، مدار المہام، غلام سید خاں، سہراب جنگ، معین الدولہ، مشیر الملک، اعظم الامراء، نواب ارسطو جاہ کا زمانہ تھا کہ ماہِ منیرِ فلک انبساط، برجیسِ منور، برجِ نشاط، نازنینِ چار بالشِ رعنائی المخاطب ماہ لقا بائی، مہاراج معالی المراتب، علومنزلت و مرتبت، ذی شوکت وحشمت، والا اتبار عالی مقدار راجہ راؤ رنبھا بہادر کے سررشتۂ ملازمت میں تھی کہ راجہ نے حکم دیا کہ اس کے دیوان کو سید نصیر الدین خاں المتخلص قدرت مرتب کریں۔ چنانچہ حسب الحکم قدرت نے دیوان ترتیب دیا اور چندا کی فرمائش پر نو ورق کا دیباچہ تحریر کیا۔ یہ دیوان دورانِ رقص چندا نے ۱۸ اکتوبر ۱۷۹۹ء کو سر جان مالکم کی نذر کیا تھا، جو اَب انڈیا آفس لائبریری میں زیرنشان (۲۱۸) محفوظ ہے۔ اس کے ۱۳۴ اوراق ہیں سائز ۱/۲ ۹ × ۱/۲ ۵ ہے۔ ''ھو اللطف اعظمی'' ترتیب دیوان کا مادۂ تاریخ ہے۔ اس میں ۱۲۵ غزلیں ہیں۔'' (۷)

شفقت رضوی نے جو دیوان کا مادۂ تاریخ لکھا ہے وہ درست نہیں کیوں کہ اس کے مطابق سنِ تصنیف ۱۱۸۲ھ بنتا ہے اور ۱۱۸۱ھ چندا کا سنِ ولادت ہے۔ ممکن ہے اس میں کوئی حرف رہ گیا ہو اور ویسے بھی عربی قاعدے کے مطابق 'ھو اللطف الاعظمی'، ہونا چاہیے۔ اگر ہم اسے صحیح مان لیں تو اس کے مطابق ۱۲۱۳ھ بنتا ہے اور چندا کے محققین نے بھی اسی کو دیوان کا سنِ

ترتیب قرار دیا ہے۔

چندا کے آخری قدر دان راجہ چندولعل تھے جو اس کی بہت عزت کیا کرتے تھے۔ اُردو کے بہت بڑے شاعر تھے اور شاداں تخلص کرتے تھے۔ چندولعل کو اس مقام تک پہنچانے میں چندا کی کاوش شامل تھی۔ اس ماحول کے اثرات کی وجہ سے چندا کو علم وفضل سے خاص دلچسپی تھی۔ اس کے کتب خانہ میں مختلف علوم کی کتابیں موجود تھیں۔ نظم ونثر کی جس نئی کتاب کا ذکر سنتی فوراً اس کی نقل اپنے کتب خانہ کے لیے تیار کروالیتی تھی۔ اس کام کے لیے وہ بہت سے ملازم رکھتی تھی۔ اس بارے میں ڈاکٹر محی الدین قادری، زور لکھتے ہیں:

> ''چندا کے دولت خانے پر جوہر بیدری نے دیکھا کہ وہ اکثر تاریخی کتابوں کے مطالعے میں وقت صرف کرتی تھی اور خاص کر روضۃ الاولیا حبیب السیر اس کو زیادہ پسند تھے۔'' (۸)

وقت کے ساتھ ساتھ چندا کے شوق میں اضافہ ہوتا گیا۔ علم سے رغبت اور دلچسپی کے نتیجے میں ہی اس نے جوہر بیدری سے تاریخ دکن لکھنے کی فرمائش کی اور کہا کہ

> ''کیوں نہ آپ بھی میرے نام پہ ایک باتصویر تاریخی کتاب قلم بند کریں جس میں خاص طور پر آصفی خاندان اور ان کے امراء وارباب کمال کے حالات درج ہوں۔'' (۹)

اس کتاب کی تکمیل ۱۲۳۳ھ میں ہوئی۔ چندا کے نام کی مناسبت سے اس کا نام ''ماہ نامہ''☆ رکھا گیا۔ اس کتاب میں حمد ونعت کے بعد چندا کے حالات بھی لکھے گئے ہیں۔ یہ چودہ ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ جوہر بیدری نے کتاب نہ صرف اس کتب خانہ میں بیٹھ کر لکھی بلکہ اس کتب خانہ میں موجود کتب سے استفادہ بھی کیا۔ اس کتاب کی تیاری میں غلام حسین جوہر بیدری نے جن کتابوں سے مدد لی ان میں روضۃ الاولیہ، روضۃ الاحباب، نورس نامہ، تاریخ فرشتہ، اقبال نامۂ عالمگیر، شاہ نامہ، حبیب السیر، شاہجہاں نامہ وغیرہ شامل ہیں۔ یہ تمام کتابیں چندا کے کتب خانے میں موجود ہیں۔

☆ اس کتاب کا ایک نسخہ ادارہ ادبیات اُردو حیدرآباد دکن میں محفوظ ہے۔ جس میں صرف آٹھ ابواب ہیں۔

چنداکوئی معمولی عورت نہ تھی۔ اس کو قدرت نے ظاہری خوب صورتی کے ساتھ ساتھ خوش آوازی سے بھی نوازا تھا۔ اس قدرتی صلاحیت کے علاوہ موسیقی کا شوق بھی رکھتی تھی۔ مہتاب بی بی نے کم عمری سے ہی اس کو موسیقی کی تعلیم دلوائی تھی۔

چنداؔ شعروشاعری کا اچھا ذوق رکھتی تھی۔ وہ اپنی تخلیقی فطرت اور جمالیاتی ذوق کی مناسبت سے شعر کہا کرتی تھی، اسے جو ماحول میسر تھا اس میں رات دن علم وادب کے چرچے اور شعروسخن کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ ایسے میں اس کا شاعری سے لگاؤ فطری امر تھا۔ شعروشاعری میں اصلاح دینے کے حوالے سے کچھ محققین نے اسے اُس عہد کے شاعر محمد خان ایمانؔ کا شاگرد بتایا اور کچھ نے نواب میر عالم کا۔ قدرت اللہ قاسم نے شاید پہلی مرتبہ چنداؔ کو ایماںؔ کا شاگرد کہا، وہ لکھتے ہیں:

"دیوانے حروف مشتمل بیشتر از انواعِ سخن دار دعروسانِ فکر خود از نظرِ (بیشتر) محمد خاں ایماںؔ می گزارد" (۱۰)

بعد کے بہت سے تذکرہ نویسوں نے اسی حوالے سے ماہ لقا چنداؔ کو ایماںؔ کا شاگرد بتایا ☆ جب کہ غلام صمدانی خاں گوہرؔ نے چنداؔ کا جو دیوان مرتب کیا ہے اس کے سرورق کی اس عبارت سے کہ ماہ لقابائی چنداؔ از نواب میر عالم مدار المہام، ظاہر ہوتا ہے کہ وہ میر عالم کی شاگرد تھی خود میر عالم نے بھی اس بات کا اظہار کیا ہے کہ چنداؔ اُن کی شاگرد رہی۔

بہر طور اسے اپنی شاعری اور شخصیت کے حوالے سے بہت شہرت نصیب ہوئی۔ چنداؔ نے اپنا دیوان خود مرتب کیا۔ جس میں 125 غزلیں ہیں۔ اس کے دیوان کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ (حیدرآباد دکن) میں ہے۔ دوسرا نسخہ مولوی عبدالحق کی لائبریری میں ہے جب کہ غلام صمدانی خاں گوہرؔ نے اس کا دیوان اور حالات زندگی 'حیات ماہ لقا' کے عنوان سے ۱۳۲۴ھ میں مطبع عام دار الشفاء حیدرآباد دکن سے شائع کیا تھا۔

☆ ملاحظہ فرمایئے:- (i) جفا عبدالحئی۔ تذکرہ شمیم سخن، ص ۸
(ii) اختر حسین اختر۔ مضمون "ماہ لقابائی چنداؔ کی شاعری" مشمولہ مجلۂ عثمانیہ، ص ۱۶۷
(iii) نصیر الدین ہاشمی۔ دکن میں اردو، ص ۲۱۵
(iv) محی الدین قادری زور۔ داستان ادب حیدرآباد، ص ۹۹

۱۹۹۰ء میں مجلس ترقی ادب لاہور سے 'دیوان مہ لقا بائی چنداؔ' شائع ہوا جس کا مقدمہ شفقت رضوی نے لکھا اور اس میں شیر محمد خاں ایماںؔ کی مسدس در تعریف ماہ لقا بائی، مثنوی 'در وصف سراپائے ماہ لقا بائی' از میر عالم بہادر کے علاوہ مثنوی 'در وصف سراپا' از غلام حسین خاں جوہرؔ بیدری بھی شامل ہیں۔

چنداؔ جن اساتذہ سے اصلاح سخن لیتی رہی یا جن اصحاب سخن کی محفلوں میں شریک رہی ان کے یہاں بھی اس کا ذکر ملتا ہے تو وہ اس کے حسن و جمال کا اعتراف اور اس کے عشق میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں یا کم از کم اس کا دعویٰ کرتے ہیں۔ انھوں نے کہیں بھی اس کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف نہ کیا۔ 'مسدس در تعریف ماہ لقا بائی' میں شیر محمد خاں ایماںؔ لکھتے ہیں کہ:

نوش دہن ہے اس کا بہ از چشمۂ حیات
ہر ایک بات کیوں نہ ہو اس کی تر از نبات (ص ۵۹)

ایماںؔ چنداؔ کے لیے جس قسم کے جذبات رکھتے ہیں، مسدس میں اس کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

میں جیسے اُس کے حسن کا دیوانہ ہو گیا
ویرانہ دل کا رشک پری خانہ ہو گیا
از بس شراب شوق سے مستانہ ہو گیا
عالم کے بیچ قصہ و افسانہ ہو گیا
چرچا جو میرے عشق کا جنگل میں چل پڑا
زانو پہ ہاتھ مار کے مجنوں اچھل پڑا (ص ۶۱)

ایک اور مقام پر دیکھیے

انداز وہی سمجھے مرے دل کی آہ کا
زخمی جو کوئی ہوا ہو کسو کی نگاہ کا (ص ۶۲)
تد اُس بہشت رو سے یہ خلط بہم کیا
جد برسوں ہم نے سورۂ یوسف کو دم کیا (ص ۶۲)

ایمان آدمی کو کچھ اک درد خوب ہے
یعنی سرشک سرخ و رخِ زرد خوب ہے
لب پر ہر ایک صبح ، دمِ سرد خوب ہے
پیدا کرے جو سوز وہی مرد خوب ہے
ہووے نہ ملکِ عشق سے کم رسمِ داغِ دل
روشن رہے ہمیشہ الٰہی! چراغِ دل (ص ٦٣)

شیر محمد خاں ایمان کی طرح میر عالم نے بھی چندا کے لیے جو فارسی مثنوی لکھی اس میں چندا کے حسن کی توصیف اور اس سے محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے

دل نقش نگین خاتمی شد
انگشت نمائی عالمی شد (ص ٧٠)

ای روی تو رشک ماہ و خورشید
آغوش تو صبح زای امید

ناف تو چو چشمہ حیا پاک
گرداب نگاہ چشمِ بے باک (ص ٧١)

آں ناز فروش گرم جوشی
تا کجا رسم وفا فروشی

در عین وفا تو بے وفائی
در وقت جفا تو دل ربائی (ص ٧٤)

آں دوستی تو بہ سخن من
راہ کوی تو رہزنِ من

اول تو راہ وفا کشادی
در صد دلم قدم نہادی

عمر بہ میین من نشستی
دل با دگر چو من نہ بستی (ص ٧٥)

من بسم و جانِ من تو باشی
ہم روح و روانِ من تو باشی
بیماری تو شفائی جانہا است
غم خواری تو دوائی جانہا است (ص ۸۰)
راز کہ بگوشِ دل شنیدی
رازی کہ عیاں بچشم دیدی
پنہاں پنہاں بگوش آں ماہ
القصہ بگو و قصہ کوتاہ (ص ۸۱)

غلام حسین خاں جوہر بیدری نے بھی چندا کی شان میں ''مثنوی در وصف سراپا'' لکھی لیکن اس کا انداز ایمان یا میر عالم کی طرح نہیں بلکہ اس تعریف کے بدلے میں انعام کی توقع زیادہ ہے۔ مثنوی کے آخری حصے کے اشعار جوہر کی اس خواہش کی جانب اشارہ کرتے ہیں

محمود امید احمرش داد
لک کردہ نقرہ اش فرستاد
من ہم پئی نام و یادگاری
از بہر بقائے فیض جاری
در سلکِ سخن گہر بسفتم
از دل بسی آفریں شنفتم
شاہ نامہ بنام شاہ محمود
مہ نامہ بنام ماہ مسعود (ص ۸۹)

اب رہی یہ بات کہ خود چندا نے نواب میر عالم کو ہی اپنا استاد کیوں تسلیم کیا اور ایمان جیسے شخص کے اس دعوے کی تصدیق کیوں نہ کی کہ چندا نے اصلاح سخن کے لیے باقاعدہ اس سے استفادہ کیا؟ اس سوال کا جواب وہ نوابی کلچر اور تہذیبی تناظر فراہم کرتا ہے، چندا کی پیشہ ورانہ اور طبقاتی مجبوری تھی کہ وہ شاگردی کے لیے کسی طاقتور سے اپنی نسبت کے اعلان میں فخر محسوس کرے۔ چندا محض شاعرہ نہ تھی اس کا فن طاقت وروں سے منسوب ہونے کے لیے مجبور بھی تھا۔

اس لیے ممکن ہے کہ محمد خان ایمان کے مقابلے نواب میر عالم کی شاگرد کہلوانے میں اسے بالائی طبقے میں پذیرائی کے امکانات زیادہ نظر آتے ہوں اور ظاہر ہے کہ ایمان اور نواب میر عالم میں اس اعتبار سے بہت تفاوت تھا مگر یہ بات بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ جو فارسی مثنوی نواب میر عالم کی چندا کی توصیف میں دیوان کا حصہ ہے، وہ شعری محاسن اور تجربے کے اخلاص اور سچائی کے لحاظ سے ایمان کے توصیفی و تقریظی اشعار سے بہتر ہے۔

ماہ لقا چندا کے دیوان کی ترتیب حسب دستورِ زمانہ ہے۔ اس میں ردیف الف سے ی تک کی غزلیں ہیں اُس نے صرف غزلیں ہی لکھیں۔ ۱۲۵ غزلوں پہ مشتمل اس دیوان میں ہر غزل پانچ اشعار کی ہے کہ ان میں سات غزلوں کے سوا ہر غزل کے مقطع میں حضرت علیؓ کی مدح کی گئی۔ ہر غزل کے پانچ اشعار اور پھر پانچواں شعر حضرت علیؓ کی نسبت سے ہونا، حضرت علیؓ سے چندا کی محبت و عقیدت بھی ہے اور شیعت سے لگاؤ بھی۔ چند مقطعے ملاحظہ فرمایئے:

چندا کو تم سے چشم یہ ہے یا علی کہ ہو
خاکِ نجف کو سرمۂ ابصار دیکھنا (ص ۹۶)

نہ چندا کو طمع جنت کی نے خوفِ جہنم ہے
رہے ہے دو جہاں میں حیدرِ کرار سے مطلب (ص ۹۸)

چندا جو دیکھے یا علی کعبے سے تا نجف
راہِ خدا میں اُس سے نہیں کچھ صواب خوب (ص ۱۰۰)

گنجِ کرم سے بخشیے مولا کچھ اس قدر
چندا کو ہو نہ پھر کسی زردار کی تلاش (ص ۱۲۱)

یوں حضرت علیؓ سے محبت و عقیدت کی جھلک اُس کی سات کے سوا ہر غزل کے مقطع میں دکھائی دیتی ہے۔ ارباب نشاط کی زندگی میں عقیدے کا ادعا نفسیاتی اعتبار سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ چندا بھی اپنے وجود اور فن سے غیر مسلموں کو بھی خوشہ چینی کا موقعہ دیتی ہوگی مگر مذہب ایک ثقافتی مظہر کے طور پر اس کے تخلیقی وجود پر بڑا گہرا رنگ لیے ہوئے ہے کہ تمام غزلوں میں پانچ اشعار کا ہی اہتمام کرنا پنجتن سے اپنے لگاؤ کا عہد ہے اور پھر مندرجہ ذیل سات مقطعوں کے سوا ہر ہر غزل کے مقطع میں حضرت علیؓ کا ذکر کرنا ایک طرف تو نجات طلبی کے لیے داخلی دلاسہ ہے اور

دوسری طرف اس کے اضطراب اور انتشارِ وجود میں مرکزیت کا ویسا حوالہ ہے جیسا میرا بائی کے بھجنوں میں شری کرشن کو معبود اور محبوب بنانے کی والہانہ طلب۔

شعبدہ بازی سے اپنے در گزر اے مست ناز
وصل کے وعدے میں حیلہ خوش نہیں تدبیر کا (ص ۹۳)

ثابت قدم ہے جو کوئی چندا کے عشق میں
صف میں وہ عشق بازوں کے سالار ہی رہا (ص ۹۵)

چندا کو دیکھنے کی جو خواہش کرے کوئی
رکھتا ہو وصف اپنے میں وہ عز و جاہ کا (ص ۹۵)

مدعا چندا کا ہے یہ اب ارسطو جاہ سے
فیل و زر بخشش تو کی جاگیر کا بھی ہو شمار (ص ۱۱۸)

سدا پلتے ہیں چندا سے ہزاروں جس کے سائے میں
نظام الدولہ و شاہِ دکن ہے رستمِ دوراں (ص ۱۲۹)

دستِ خدا سے مانگ لے چندا بصدقِ دل
تو جان لے قبول مناجات ہوگئی (ص ۱۵۱)

دیا جو شرط تھی بخشش کی تس پر بھی ہر اک دم میں
یہ رنگِ مہر ہے چندا پہ جس کی جلوہ فرمائی (ص ۱۵۳)

- اس کے دیوان کی پہلی غزل حمدیہ ونعتیہ ہے کہ جس میں وہ کہتی ہے کہ

کہاں طاقت ہے راہِ حمد میں جو ہو زباں گویا
کہ یاں جز عجز و خاموشی نہیں ہے یک جہاں گویا
نہ ہو نعتِ محمد میں کسی سے محفل آرائی
بجا رکھ ہرزہ گوئی سے زباں کو شمع ساں گویا (ص ۹۳)

اسی طرح کے چند اور اشعار بھی ہیں جن میں مذہب سے لگاؤ بھی ہے اور تصوف و معرفت کے مضامین بھی

غور کیجئے تو یہی پُرنور جمادات و نباتات

نہ ترے جلوے کا ہے ذات بشر میں خوطہ (ص ۱۴۱)

ادا شرط عبادت ہو سکے ہے کب بھلا اس کی

خودی کو اپنی جب بھولے خدا کی یاد کو پہونچے (ص ۱۴۷)

یہ غالباً اُس زمانے کا روایتی انداز تھا جسے چندا نے اپنایا۔ نہ صرف اخلاق و تصوف سے متعلق چند اشعار لکھے بلکہ اپنے عہد کی اُن شخصیات کے بارے میں بھی اظہارِ عقیدت کیا ہے کہ جن کی بدولت اُسے عیش و آرام اور آسودگی میسر تھی۔ خاص طور پر نظام الملک آصف جاہ ثانی اور نواب ارسطو جاہ جو نہ صرف اُس کے چاہنے والے تھے بلکہ زندگی کی تمام تر سہولیات بہم پہنچاتے رہے۔ ارسطو جاہ کی تعریف میں اُس نے دو غزلیں لکھیں۔ وہ لکھتی ہے کہ

ارسطو جاہ فرخ نژاد اہل عالم ہے

کہ جس کے فضل و بخشش کا جہاں میں ہے علم برپا (ص ۹۷)

آصف جاہ کی شان میں تو اس سے بھی بڑھ کر عقیدت کا اظہار ہے اور کئی مواقع پر

مہیا دور میں جو عیش ہے تیرے سدا شاہاں

نہ جم سے بھی ہوا تھا اس قدر نوروز کا ساماں

سدا پلتے ہیں چندا سے ہزاروں جس کے سائے ہیں

نظام الدولہ شاہ دکن ہے رستمِ دوراں (ص ۱۳۸)

ایک اور موقع پر لکھا کہ

خضر کی عمر ہو اُس کی، تصدق سے ایمہ کے

نظام الدولہ آصف جاہ جو سب کا مسیحا ہے (ص ۱۵۴)

ماہ لقا چندا کا زیادہ تعلق تو مردوں سے رہا۔ وہ محفلوں کی عورت تھی لیکن اس کے باوجود چندا کے پورے دیوان میں کسی مرد کی تعریف میں اشعار نہیں ہیں۔ وہ حسین عورت تھی اس کے چاہنے والے بھی بہت تھے اور پھر اس ریاست کے معزز امراء اس کے عاشق اور مداح تھے، ایسے میں اُس کے اندر خود پرستی کے جذبات کا پیدا ہونا فطری امر تھا اور ساتھ ہی احساسِ برتری بھی

چندا کو دیکھنے کی جو خواہش کرے کوئی

رکھتا ہو وصف اپنے میں عز و جاہ کا (ص ۶۵)

اپنی شخصیت کی جاذبیت اور ذاتی حسن کا احساس اس میں ایسا غرور پیدا کرتا ہے کہ اس پر وہ نہ صرف ناز کرتی ہے بلکہ اسے ہمیشہ قائم و دائم بھی دیکھنا چاہتی ہے۔ حضرت علیؑ سے دعا کے علاوہ اس خواہش کا اظہار وہ اس طرح کرتی ہے

گرمی وہ ہوئے حسن میں چندا کے یا علیؑ

جلوے کو اس کے دیکھ کے بس لوٹ جائے برق (ص ۱۲۹)

چندا کے بارے میں اختر حسین اختر کی رائے ہے کہ

''اس کے اشعار زیادہ تر اس کے ذاتی حالات و خیالات کے آئینہ دار ہیں اس کی غزلوں سے اس کے قلبی واردات اور ذہنی تاثرات کی نفاست اور علویت ظاہر ہوتی ہے اور وہ سراسر ایک عورت کا کلام معلوم ہوتا ہے۔ اس عورت کا جو حسن و شباب کے نشے میں چور اور اپنی فاتحانہ قوتوں پر مغرور ہے لیکن جس کا دل سچی اور دائمی محبت کا پیاسا ہے اور جس کی روح ایک ابدی اور لازوال سکون کی متلاشی ہے جس کا اظہار وہ بار بار اپنے مقطعوں میں کرتی ہے۔ مبتذل جذبات اور عامیانہ خیالات سے اس کی شاعری کا دامن پاک ہے کہیں کہیں شوخی اور عریانی ہے تو برائے نام۔'' (۱۱)

لیکن مجھے اس رائے سے اختلاف ہے کہ چندا نے اپنی شاعری میں ذاتی حالات بیان نہیں کیے، وہ ایک تخلیقی فن کارہ تھی مگر اس کی شاعری میں عورت ہونے کا احساس زیادہ نہیں اُبھرتا۔ اس عہد کی شعری روایت کے مطابق اس نے محبت کے جذبات کا اظہار بھی کیا۔ البتہ چندا کے یہاں ایسے اشعار کی معنویت بڑھ جاتی ہے۔ عموماً اردو شاعری میں مرد کی محبوب عورت ہے۔ اس لیے اظہار عشق اور وصل کی لذت کو وہی بیان کرتا ہے لیکن عورت خود اس احساس کو کیسے بیان کرتی جب کہ وہ خود محبوب بھی ہو۔ چندا نے عشق کی ان کیفیات سے زیادہ معاملات کو بیان کرنے میں جھجک محسوس

نہیں کی کہ یہ شعری و تہذیبی روایت کا حصہ تھے مگر چندا کے ذریعے اظہار غیر رسمی محسوس ہوتا ہے کیونکہ عورت کی زبان سے ایسے اظہار کو معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے

بوسہ بھی کوئی مانگے تو دے جان کی خیرات
خاطر کو نہ رنجیدہ کرائے ماہ کسی کی (ص ۱۴۸)

ہم جو شب کو ناگہاں اُس شوخ کے پالے پڑے
دل تو جاتا ہی رہا، اب جان کے لالے پڑے (ص ۱۵۰)

کب تک رہوں حجاب میں محروم وصل سے
جی میں ہے کیجئے پیار سے بوس و کنار خوب
شب کو بغل میں تنگ تھا وہ بے حجاب خوب
دیکھوں ہوں صبح آئینہ میں آب و تاب خوب (ص ٦٩)

کٹی ہے ہجر کی شب، اب ہے وصلِ یار کا دن
خدا نے ہم کو دکھایا ہے پھر بہار کا دن
اٹھا بغل سے تو اے ماہ رو مرے تب سے
نہ پوچھ کیونکر کٹا تیرے بے قرار کا دن

شب کو ہماری ان کی ملاقات ہو گئی
شکرِ خدا کہ ہم پہ عنایات ہو گئی
آتے ہی میں نے اس کے کیا نذر نقدِ دل
مہمان کی ہر طرح سے مدارات ہو گئی (ص ۱۵۱)

اس کی شاعری میں مستی ہے، شوخی ہے اور رنگینی بھی۔ یہ رنگ اس کی حقیقی زندگی کا حصہ ہیں۔ اس کے حسن اور اداؤں کے سینکڑوں مداح ہیں، وہ جانتی ہے اور اسی لذت میں سرشار بھی

شاہ و گدا تو دنگ ہوئے تیرے رقص پر
عاشق ہے نیم جان، نئی لے سے تان بھر (ص ۱۱۷)

کسریٰ سے لے کر آج تلک چشم دہر میں
دیکھا نہ تجھ سا اور کوئی اہلِ جاہ شوخ (ص ۱۱۰)

اپنی سالگرہ کے موقع پر غزل میں خود سے اس طرح مخاطب ہے

ہو تری عمر خضر ماہ جمال　　یوں ہی تری گرہ ہو سال بہ سال
رشتہ تار دمِ مسیحا ہو　　ہو مبارک تجھے یہ فرخ فال
پنجتن تجھ پہ ہوں کرم گستر　　اور اللہ کا رہے افضال
شش جہت میں ہے شہرۂ بخشش　　کہاں حاتم میں ایسے تھے افعال

(ص ۱۳۲)

اپنے حسن و جمال کے لیے خراج طلبی اور شہرت کی تمنا چنداؔ کے اندر بہت زیادہ تھی۔ اپنے عہد کی متمول عورت تھی، چاہنے والے بے شمار تھے اور وہ بھی اس کے عہد کی نامور شخصیات، اس کے باوجود خود کو مذہبی حوالے سے بھی نمایاں کرنے کے لیے کبھی اس نے عاشور خانہ تعمیر کروایا اور اپنے قائم کردہ عاشور خانے میں علم ایستادہ کرایا وہاں روزانہ مجالس برپا ہوتیں۔ حضرت علیؑ کے عرس کے موقع پر دو چار روز کھانا تقسیم کرواتی، فقرا میں رقم تقسیم کرتی۔ ماہ رجب میں وہ جشن حیدر مناتی ۱۱ ربیع الاوّل کو حضرت سیّد عبدالقادر جیلانیؒ کی نیاز کا اہتمام کرتی۔ حیدرآباد دکن میں 'کھٹ درن' کے نام سے زمانہ قدیم سے ایک میلہ منعقد ہوا کرتا تھا۔ چنداؔ اس میں بھی بہت دلچسپی لیتی۔ شفقت رضوی لکھتے ہیں کہ

> ''میلے کے موقع پر فقراء، حفاظ، قراء اور مشائخ دور دور سے آتے چنداؔ کی ان میں سے ہر ایک فرد کے لیے نام بہ نام ایک سیر مٹھائی بھجوائی جاتی۔ میلے کے دوسرے دن تمام فقرائے آزاد، قادری و چشتی و رفائی مدعو ہوتے اور ان کے لیے پُرتکلف ضیافت کا اہتمام ہوتا۔ اسی روز سو سو کوس کے فقیر جمع ہوتے تیسرے دن مساکین و معذورین جمع ہوتے جن کی تعداد ستر بہتر ہزار ہوتی۔'' (۱۲)

چنداؔ کو علم و ادب سے دلچسپی کے ساتھ ساتھ تعمیرات کا شوق بھی تھا لیکن ایسی تعمیرات کا تعلق اس کے مذہبی عقیدے یا جذباتی لگاؤ سے تھا۔ اس نے کوہِ مولا علیؑ کے دامن میں اپنی والدہ کا

مقبرہ تعمیر کروایا جہاں ہر سال باقاعدہ عرس منایا جاتا، وہ خود اس میں شرکت کرتی۔ جامعہ عثمانیہ کی زمین بھی چنداؔ کی ملکیت تھی جو مقطعہ اڈی کمیٹ کہلاتا تھا۔ ایک مسجد خوشحال خاں کلاونت کے نام سے ''خوشحال خاں کی مسجد'' بنوائی جو اپنی عمر کے آخری حصے میں اس کے پاس رہے۔ وہ چنداؔ کی موسیقی کی محفلوں میں شرکت کرتے تھے اور کبھی کبھی فن کے بارے میں مشورہ بھی دیتے۔ اس کے بدلے چنداؔ ان کے تمام اخراجات کی کفیل رہی۔ اس نے اپنی زندگی میں ہی اپنا عالی شان مقبرہ تعمیر کروایا۔

''زمانۂ حیات میں اس نے اپنے لیے ایک عالی شان مقبرہ مع مسجد و دیگر عمارات کوہِ مولا علیؑ کے دامن میں دو لاکھ روپے کے صرفے سے اپنی نگرانی میں تعمیر کروایا تھا، جو اس کی ماں کے مقبرے سے متصل ہے۔ بارگاہِ مولا علیؑ کا پختہ دالان، اس کے راستے میں حوض موسومہ 'فی سبیل اللہ' بھی اس کی یادگار ہے۔'' (۱۳)

۱۲۴۰ھ☆ میں ماہ لقا نے وفات پائی۔ اس کے مقبرہ پر یہ شعر درج ہے:

ہاتف غیبی ندا داد بتاریخ

راہیِ جنت شد ماہ لقائے دکن

۱۲۴۰ھ (۱۴)

☆ ماہ لقا کا سنہ وفات ۱۲۳۶ھ بھی لکھا گیا ہے لیکن تحقیق کے مطابق اس کا سنہ وفات ۱۲۴۰ھ بنتا ہے جو کہ اس کے مقبرہ پر بھی درج ہے، ملاحظہ فرمائیے:

(ا) 'حیات ماہ لقا' از غلام صمدانی خاں گوہر، ص ۴۹

(اا) 'دکن میں اردو' از نصیر الدین ہاشمی، ص ۹۰۔

حوالہ جات

۱۔ شاہنواز خان، ''مآثر الامراء''، اردو ترجمہ از ڈاکٹر ایوب قادری، ص ۴۵۶۔

۲۔ غلام صمدانی خاں گوہر، ''حیاتِ ماہ لقا''، دار الشفا، حیدرآباد دکن، ۱۹۰۶ء، ص ۲۰۔

۳۔ i۔ نصیر الدین ہاشمی، ''خواتین دکن کی اُردو خدمات''، مکتبہ ابراہیمیہ، ۱۹۴۰ء، ص ۲۳۔

ii۔ نصیر الدین ہاشمی، ''دکن میں اُردو''، ۱۹۸۵ء، ص ۴۷۸۔

iii۔ محی الدین قادری زور، ڈاکٹر، ''داستانِ ادب حیدرآباد''، ادارہ ادبیاتِ اُردو، حیدرآباد، ۱۹۵۱ء، ص ۹۵۔

۴۔ بحوالہ 'حیات ماہ لقا'، ص ۲۱۔

۵۔ ''اختر حسین اختر۔ ماہ لقا بائی چندا'' مشمولہ مرقع سخن، ص ۸۶، جلد اوّل (مرتبہ) ڈاکٹر محی الدین قادری زور، حیدرآباد، ۱۹۳۵ء

۶۔ محی الدین قادری زور، ڈاکٹر، ''داستانِ ادب حیدرآباد''، ص ۹۴۔

۷۔ شفقت رضوی (مرتبہ)، ''دیوان ماہ لقا بائی چندا''، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۴۵-۴۴۔

۸۔ محی الدین قادری زور، ڈاکٹر، ''تذکرہ مخطوطات''، جلد سوم، ص ۱۱۸، دہلی، ۱۹۸۴ء۔

۹۔ ایضاً۔۔ غلام حسین خاں بیدر کے رہنے والے تھے، دکنی ادب کے مورخ اور آصفی خاندان کے موروثی منصب دار تھے۔ ۱۱۹۰ھ میں غلام سیّد خاں ارسطو جاہ کے میر منشی مقرر ہوئے مختلف جنگی مہمات میں ان کے ساتھ رہے اس دوران چندا سے بھی تعارف ہوا۔ پھر کچھ عرصہ گوشہ نشینی اختیار کی اور اسی دوران فارسی شاعری کرتے رہے۔ حیدرآباد میں مہاراجہ چندولعل کے دربار میں مرزا بیدل کے رنگ میں ایک اردو قصیدہ اور مخمس پیش کرنے پر درباری شعرا میں شامل ہو گئے۔ ۱۲۲۵ھ میں ان کی ملاقات چندا سے دوبارہ ہوئی تو جوہر کی چندا کے محل تک رسائی ہوئی کچھ عرصہ بعد دوبارہ بیدر لوٹ گئے اور پھر ۱۲۲۸ھ میں چندولعل کے بیٹے کی شادی پر آئے تو ایک تہنیت نامہ پیش کرنے کے علاوہ اپنی تصنیف تحفۃ الہند راجہ کو پیش کی جس میں ہندوستان اور دکن کے

بادشاہوں اور راجاؤں کے احوال درج ہیں۔ ماہ لقا چندا نے محل میں دوبارہ جانا شروع کیا تو چندا کی فرمائش پر جوہر نے یہ تالیف مکمل کی اصل نسخے میں تصاویر بھی تھیں مگر اس کاب کے تین دستیاب نسخوں میں سے کسی میں بھی تصاویر نہیں ہیں ان تین مخطوطات میں ادارۂ ادبیات اردو میں وہ ماہ نامہ رٹش میوزیم میں تاریخ دل افروز اور ذخیرۂ عبدالحق میں 'تجلیات ماہ لقا' کے نام سے موسوم ہیں۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمایئے دیوان مہ لقابائی چندا از شفقت رضوی، ص ۳۰-۲۹)

۱۰- قاسم، قدرت اللہ۔ ''مجموعہ نغز'' (مرتبہ) حافظ محمود شیرانی نیشنل اکادمی دریا گنج، دہلی ۱۹۷۳ء، ص ۱۷۱

۱۱- 'ماہ لقابائی چندا کی شاعری' ص ۱۶۴

۱۲- 'دیوان ماہ لقابائی چندا' ص ۳۴

۱۳- 'دیوان ماہ لقابائی چندا' از شفقت رضوی، ص ۳۳

۱۴- ایضاً، ص ۳۹

رؤف نیازی، کراچی

عذرا اصغر کا ''گدلا سمندر'' اور اجلا روپ

عذرا اصغر دل کے رشتے کے علاوہ تین افسانوی مجموعے ''پت جھڑ کا آخری پتہ'' ''برگد کا تنہا دکھ اور ''بیسویں صدی کی لڑکی'' اردو ادب کو دے چکی ہے۔ وہ ''مشرق و مغرب کے سیاسی افکار'' نامی کتاب کی مؤلفہ بھی ہے۔ گدلا سمندر، اس کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس میں بیس افسانے شامل ہیں۔ ان ہی افسانوں کا مطالعہ پیش نظر ہے۔

کسی خیال، جذبے یا فضا کو بنیاد بنا کر افسانہ لکھنا قدرے جدید رویہ ہے۔ اردو میں Plot Less کہانیاں لکھنے کی ابتدائی کوششوں میں کرشن چند کا نام سرفہرست ہے۔ ''گدلا سمندر'' عذرا اصغر کا ایک ایسا ہی افسانوی مجموعہ ہے جس میں وہ کسی سیاسی نظریاتی بوجھل پن سے آزاد رہ کر روز مرہ زندگی کی کسی ایک جہت کسی ایک جذبے یا کسی ایک خیال کو اپنی تخلیقی قلم رو میں شامل کرتی دکھائی دیتی ہے۔ عموماً وہ ان جذبات اور احساسات کو لفظ و معنی کا پیکر عطا کرتی نظر آتی ہے جو کسی فرد کا ذاتی اور انفرادی مشاہدہ ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر اس کے افسانوں کی اساس، ذاتی مشاہدہ ہے۔ اس کی حسیت کا کمال یہ ہے کہ ذات کے گنبد سے جو صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے وہ اسے اپنے سماجی اور تہذیبی رشتوں سے منقطع نہیں کرتی۔ وجود کا لاشہ کندھے پر اٹھائے سماج کی اندھی گلیوں میں نہیں بھٹکتی۔ وہ وقت اور حالات سے شاکی تو نظر آتی ہے مگر اپنی داخلیت سے خارجیت کو بدلنے کی بجائے خود کو خارجیت سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتی دکھائی دیتی ہے۔ اور یہی زندگی کا وہ مثبت پہلو ہے جو اس کی روشن خیالی اور رجائیت پسندی کا استعارہ ہے۔

''گرہ'' نامی افسانے میں تخلیق کار نے اس حقیقت کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے کہ شوہر کیسا ہی نیک اور شریف کیوں نہ وہ دوسری عورت کیلئے ہمیشہ اس کے دل میں نرم گوشہ

موجود رہتا ہے۔ دوسری اہم بات یہ کہی ہے کہ جذبے جب تک اظہار سے نہ گذریں تشنگی باقی رہتی ہے۔ میاں بیوی کی تعلقات میں محض جذباتی آسودگی کافی نہیں۔ زوجین کا باہمی اعتراف محبت خود اعتمادی اور سرشاری بخشتا ہے۔ یقیناً یہ ایک نفسیاتی گرہ ہے۔ قول وفعل کی مطابقت ہی راست بازی اور شخصیت سازی میں اہمیت رکھتی ہے۔ ''گرہ'' کی ہیروئین محبت اور میٹھے بولوں کی متلاشی نظر آتی ہے۔ اسے کیرن ہارنی کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو وہ احساس کمتری میں مبتلا نظر آتی ہے۔ اگر لاکاں کی تحلیل نفسی کو پیش نظر رکھیں تو افسانے کے مرکزی کردار کے توسط سے ہم اس قلم کار تک پہنچ سکتے ہیں جو پکی عمر کی ایک باشعور خاتون ہے۔ جو دادی اور نانی کے ابتدائی ادوار میں ہے۔ ایک طرف اس کی تقسیم در تقسیم ہوتی چاہت واپنائیت ہے ہے دوسری طرف چالیس پچاس سالہ عصری حسیت ہے جس نے اس کی قوت مدرکہ کو داخلیت کی سان پر چڑھا کر تیز تر کر دیا ہے۔ وہ صورت حال سے سمجھوتا اور حقائق کو تسلیم کرنے کی اپنی سی جدوجہد کرتی نظر آتی ہے۔

جعلی پیر وفقیر معاشرے میں داغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان نام نہاد پیروں اور فقیروں کے کرتوتوں سے ہم سب ہی اچھی طرح واقف ہیں۔ اس کے باوجود المیہ یہ ہے کہ ہم بار بار دھوکہ کھاتے ہیں۔ جنہیں اوصاف وکردار کے اعتبار سے آکاش کی طرح بلند و بالا ہونا چاہیے تھا۔ وہ قعر مذلت میں گرے ''پاتال'' کی مثال ہیں موضوع اگرچہ پرانا ہے پیشکش بھی کسی خاص انفرادیت کی حامل دکھائی نہیں دیتی لیکن جب تک ہمارے معاشرے میں ایسے لوگ موجود ہیں وہ موضوع سخن بنتے رہیں گے۔ ''پاتال بھی ایک ایسی ہی کہانی ہے اس میں تخلیقیت سے زیادہ وضعت کا عنصر دکھائی دیتا ہے۔

''گدلا سمندر'' کی تیسری کہانی ''کھلونا'' ہے زندگی بسر کرنا ایک ہنر اور سلیقہ ہے زندگی کی گوناں گوں غیر ضروری یا کم اہم مصروفیات میں ادھر ادھر الجھائے رکھتی ہیں یہاں تک کہ زندگی کی شام آجاتی ہے تو ہمیں ضروری اور ادھورے کام یاد آتے ہیں۔ اب سوائے تاسف کے کچھ باقی نہیں بچتا۔ ''کھلونا'' اسی تاسف کا خوبصورت بیانیہ ہے۔ کہانی کارقاری کا کہیں بھی یہ احساس نہیں ہونے دیتا کہ وہ سبق آموزی کے کئی پہلو لے کر قاری کے دل میں اترنا چاہتا ہے۔ خلق پارہ غیر محسوس طور پر ہمیں یہ ابلاغ کراتا ہے کہ کامیاب اور کامران زندگی کیلئے باقاعدہ منصوبہ بندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں اس کا اہتمام تو کجا احساس تک نہیں ہوتا۔ بین السطور تخلیق کار یہی پیغام دیتا نظر آتا ہے کہ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے اس کی قدر کرو۔ زندگی بھی گئے وقت کی طرح پھر ہاتھ نہیں آتی۔

''خوف کی چادر میں لپٹی بستی'' ایک استعاراتی کہانی ہے۔ یہ ایک انسان دوست،

متمدن اور درد مند قلم کار کا ظلم اور وحشت کے خلاف مزاحمت اور احتجاج بھی ہے۔ یہاں ''بستی'' کسی ایک مخصوص مقام سے عبارت نہیں ہے۔ بلکہ پوری دنیا سے مراد ہے۔ انسانیت کی تاریخ میں بربریت کا باب کتنی بار تحریر ہوا کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ پورس کی بے بسی اور حسین کی مظلومیت کو ستلج و بیاس، دجلہ و فرات کے کنایوں سے ظاہر کیا گیا ہے۔ ہٹلر کے جنگی جنوں اور ہیروشیما، ناگاساکی کی ایٹمی تباہ کاریوں کی طرف بھی اشارہ موجود ہے۔ گھروندوں سے کالونیوں بنانے کا استعارہ استعماریت کی نشان دہی کرتا ہے اور برصغیر میں Colonialism کے دور کی یاد تازہ کرتا ہے۔ تخلیق پاکستان اور سقوط ڈھاکہ کا بھی تذکرہ نام لیے بغیر کیا گیا ہے اور پھر ''چنگیز خان'' کے حوالے سے پاکستان میں آمریت کے ظلم و تشدد بھی یاد دلائے ہیں۔ ''ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔۔۔'' کا استعارہ پنجاب میں ۱۹۵۳ء میں اور پھر پورے ملک میں بالترتیب ۱۹۵۸ء، ۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۷ء کے مارشل لائی ادوار کی یاد دلاتا ہے۔ افسانے میں پاکستان کے چار عشروں کا ذکر ہے۔ غالباً یہ افسانہ ۸۵۔۱۹۸۴ء کے لگ بھگ لکھا تھا جب ضیاء کا تاریک دور تھا۔ اسی لیے کہانی کار نے اپنی اسلوب ہونے کے باوجود افسانے کی تفہیم و ترسیل میں کوئی دشواری پیدا نہیں ہوتی۔ یہ کہانی کار کی بڑی کامیابی ہے۔

عورت صرف ہمارے معاشرے ہی میں نہیں یورپ اور امریکہ کے متمدن اور ارتقاء پذیر تہذیب میں بھی زیر دست اور مفتوحہ تصور کی جاتی ہے۔ نسوانیت (Femininsm) کے جدید بانیوں میں سائمن بواری (Simon Beaduviri) کی کتاب Le Deuxime Sexe-1949 (انگریزی ترجمہ۔The Second Sex) 1961ء میں بڑا کردار ادا کیا۔ بیٹی فریڈن Betty Friedan کی The Feminine Mystique نے بھی عورتوں کے کردار اور اہمیت کو اجاگر کرنے کے لئے کلیدی کردار ادا کیا۔ یہ ۱۹۶۶ء کی بات ہے کہ فرائیڈن نے دوسری خواتین کے ساتھ مل کر NOW (National Organization for Women) کی بنیاد رکھی۔ اس کے فوراً بعد امریکا اور یورپ میں خواتین کی بیشمار تنظیموں کا جال بچھ گیا۔ جنہوں نے خواتین کے حقوق اور اس کے تحفظ کیلئے مطالبات شروع کر دیئے۔ ''شکار اور شکاری'' نامی افسانہ مرد کی روایتی بالادستی کے نظریئے کو توڑتا، عورت کی جارحانہ اور مرد کو مدافعانہ انداز اپنانے پر مجبور کرتا دکھائی دیتا ہے۔ عورت کے حقوق کی بازیابی اور عزت نفس کی بحالی کیلئے عذرا اصغر کا یہ بیانیہ اگرچہ اونٹ کے منہ میں زیرہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر پینترا بدل کر حملہ کرنے کا یہ انداز خواتین میں بیداری کا اشاریہ بھی ہے۔

''وہ۔ میں اور وقت'' آج کے اس مہنگائی کے دور میں ہر متوسط گھرانے کی کہانی ہے۔ سفید پوشی کا بھرم اور آبرومندانہ زندگی کی خوشیوں کیلئے انسان کو اپنی خوشیوں کی قربانی دینی پڑتی

ہے۔ حالات کا جبر اور وقت کا دباؤ بسا اوقات انسان کو پیس کر رکھ دیتا ہے۔ ایسے ہی ناقابل گرفت لمحوں میں عورت کے بڑے پن اور ایثار کا تاثر آمیز اظہار اس افسانے میں نظر آتا ہے۔ ایک وفا شعار بیوی۔ ایک ایثار پسند ماں۔ ایک فرمانبردار بہو اور ایک قابلِ احترام بھابھی۔ عورت کی شخصیت کے کئی پہلو ہے۔ ہر پہلو دوسرے پہلو سے روشن تر۔ سراپا ایثار۔ بھرپور شخصیت خوشیاں بانٹنے والے ایسے ہی کردار کسی مثالی معاشرے کی تشکیل میں ممد و معاون ہوا کرتے ہیں۔ مشرقی تہذیب روایات کا نمائندہ کردار، اس افسانے کا مرکزی کردار ہے۔ یہ تخلیق کار کے سماجی شعور اور ہماری ضرورتوں سے پوری طرح ہم آہنگ دکھائی دیتا ہے۔ اس کے باوجود سوچنا یہ ہے کہ کہیں یہ ایسا ڈسکورس تو نہیں جو ون وے ٹریفک تشکیل دے رہا ہو؟

سماجی اونچ نیچ اور طبقاتی تقسیم کی جھلک ''جھڑی بیری کا بیر'' افسانے میں پوری طرح نظر آتی ہے۔ معاشرتی اقدار کا کڑا پہرا انسانی جذبات کو کچل کر رکھ دیتا ہے۔ فرد اور معاشرے کی دائمی کشمکش میں شکست اکثر فرد ہی کو ہوا کرتی ہے لیکن وقت کا پھاہا دھیرے دھیرے زخموں کو مندمل کرتا ہے۔ نا آسودہ جذبوں کی ایسی بے شمار کہانیاں ہمارے اردگرد پھیلی پڑی ہیں۔

علاقائی نسلی یا گروہی عصبیتیں بالآخر مفادات کے ٹکراؤ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ جھوٹا احساس تفاخر جنگی جنوں کو ہوا دیتا ہے۔ سامراجی قوتوں نے اپنے مذموم مقاصد اور مفادات کی تکمیل کیلئے دنیا کے بڑے حصے کو بدامنی، انتشار، جنگ اور موت وادی میں دھکیلا ہے۔ خلیجی ممالک میں امریکی مداخلت اسی حقیقت کا شاخسانہ ہے۔ ایک حساس، امن پسند اور انسان دوست فن کار ہونے کے ناتے عذرا اصغر ''کفن کے تھیلے'' لکھ کر سامراج کی استحصالی قوتوں کا مکروہ چہرہ ہمارے سامنے لاتی ہے۔

''بلند پرواز مخلوق'' کا بنیادی خیال دولت کا حصول ہے۔ عزت و ناموس کی لاج بے معنی بات بن کر رہ گئی ہے۔ بورژوا تہذیب کی یہ ذہنیت قیام پاکستان اور مقاصد پاکستان سے متصادم ہے۔ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم نے سماجی تفاوت کو بڑھا دیا ہے۔ ہر شخص غیر اخلاقی اور غیر سماجی رویے اپنا کر زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ اس کا احساس کمتری کم ہو سکے۔ کیا ہمارا یہ قومی رویہ واقعتاً ترقی پسندی کی ذیل میں آتا ہے؟ یہی سوال عذرا اصغر نے اٹھایا ہے۔ اس کا جواب دینے کیلئے بہت زیادہ عالم فاضل ہونا ضروری نہیں۔ صرف ایک دردمندانہ احساس کافی ہے۔

''چھبیس برسوں پر جھولتا پل'' ہماری اپنی کہانی ہے۔ اس کے سب کردار اور چہرے ہمیں اپنے اور مانوس سے لگتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ انسان کے حالات میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے رویوں میں فرق آتا ہے۔ لیکن نیکی، سچائی اور خوبصورتی کا معیار نہیں بدلتا۔ یہ عزت

نفس کی پاس داری کی کہانی ہے۔ یہ محبتوں اور چاہتوں کا خلاقانہ اظہار ہے۔

کتے کی روایتی وفاداری کا تذکرہ ہے۔ ''رفاقت کا سفر'' انسان کے مرنے کے بعد بھی کتے کی طرف سے جاری رہتا ہے۔ انسان کی انسان سے بے توجہی اور لاتعلقی پر طنزیہ اظہار ہے۔ انسانوں کے مقابلے میں جانوروں کا زیادہ غم خوار، مونس و دم ساز ہونا انہیں قابل التفات بناتا ہے۔

''بارود کی بو'' کراچی کے معروضی حالات کے پس منظر میں لکھا گیا افسانہ ایک حساس دل اور انسان دوست شخص کی ہم نفسوں سے محبت کا امین ہے۔ زبان، رنگ و نسل کی عصبیتیں کیوں زور پکڑ گئیں۔ اس نکتہ پر بھی غور ہونا چاہیے۔ نفرتوں کی آگ ٹھنڈا کرنے کیلئے ان اسباب کو مٹانا اور ختم کرنا ہوگا جو ان نفرتوں کا اصل سبب ہیں۔ دانشور، سیاستدان، علماء اور قلم کار محبتوں کا پرچار کرتے نہیں تھکتے مگر نفرتوں کے اسباب و علل کی طرف سے دیدہ و دانستہ خاموشی اختیار کیے رکھتے ہیں۔ یہ خاموشی مجرمانہ غفلت اور قومی مفادات سے لاتعلقی کے مترادف ہے۔ سقوط ڈھاکہ اپنے پورے پس منظر کے ساتھ ہمارے سامنے ہے۔ پاکستان کیوں اور کیسے بنا؟ اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ پاکستان کس طرح اور کیسے قائم رہ سکتا ہے؟ ایک سماجی وقائع نگار کی حیثیت سے ایک افسانہ نویس سے یہ توقع بے جا نہیں کہ وہ حقائق و تخیل کی چاشنی میں ڈبو کر پیش کرے۔ جو لوگ بوسنیا، چیچنیا، فلسطین، کشمیر اور افغانستان کیلئے فکر مند ہوتے ہیں انہیں کراچی جلتا ہوا کیوں نظر نہیں آتا؟ وہ کراچی کے لیے کیوں نہیں کڑھتے؟ کیا وہ یہاں بھی کسی جنیوا کیمپ اور ریڈ کراس کے آپریشن کا انتظار کر رہے ہیں۔ وقت کا تقاضا ہے کہ دانش ور اور قلم کار روم جلنے سے پہلے سلگتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کر دیں۔ عذرا اصغر اسی تاثر کو اجاگر کرتی نظر آتی ہیں۔

محبت کی سرشاری اور چاہے جانے کا سرور ''بازیافت'' کا بنیادی نکتہ ہے۔ انسان ہر عمر میں محبت اور توجہ کا محتاج ہوتا ہے۔ محبت اور چاہت کا احساس زندگی کو پر جوش اور بامعنی بنا دیتا ہے۔ ''بازیافت'' میں عمر رسیدہ خاتون کو جب جوانی کے دنوں کا دوست ملتا ہے اور وہ اپنی چاہت کا اعادہ کرتا ہے تو خاتون کے چہرہ سے زندگی بھر کا تھکان دور ہو جاتی ہے۔ بوڑھوں سے تجدید محبت ان کی کارکردگی میں اضافہ کا سبب ہوتی ہے۔ Pshchopathy کا عمل ہے۔

''دفینہ'' ہمارے عہد کی اس سوچ کی کہانی ہے جس میں کسی مال دار خاتون سے شادی کا مطلب لاٹری کا نکل آنا لیا جاتا ہے۔ زیادالعمر افراد کی شادیوں کو ٹھرک اور رنگین مزاجی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ زیادالعمر افراد میں احساس تنہائی کو کم کرنے کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے تاکہ باہمی رفاقتوں کے ذریعے وہ سماج پر بوجھ نہ بنیں۔ ایسے جوڑوں کی حوصلہ شکنی کے

بجائے حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔ عوامی سماجی شعور کی تحریر و تقریر سے تربیت کی جانی چاہیے مگر زیر نظر افسانہ ضرورت کو پورا کرتا نظر نہیں آتا۔

ایک بے اولاد عورت اپنے ہاتھوں سے سوکن بیاہ کر لاتی ہے تاکہ شوہر کو اولاد کا سکھ میسر آسکے۔ ''ایثار'' نامی افسانے کی یہ کہانی غیر فطری تو ہو سکتی ہے غیر ممکن نہیں۔ دوسری طرف سوکن امید سے ہوتے ہی شوہر سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ پہلی کو علیحدہ کر دے۔ تخلیق کار نے ایثار و قربانی، تنگ دستی اور خود غرضی کی دو انتہاؤں کو پیش کر کے عورت کے خبث دونوں کی کسی تمہید یا تفسیر کے بغیر کھول دیا ہے۔ کرداروں کا یہ تقابلی مطالعہ فن کارانہ حسن کا حامل ہے۔

ہمارے معاشرے میں لڑکی کی پیدائش کو جس بے وقعتی اور تحقیر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ ان کم نصیب بچیوں سے ذات کا اثبات چھین لیتا ہے۔ وہ عمر بھر ناپسندیدگی اور unwanted کے احساس میں سلگتی اور دھواں دیتی رہتی ہیں۔ ایک ایسے ہی غیر منصفانہ اور غیر انسانی رویے کی چبھتی ہوئی کہانی ''عشق غابہ'' نظر انداز (neglect) کیے جانے کا خوف انسان سے خود اعتمادی اور یقین کی دولت چھین کر انہیں سماج کا عضوے معطل بنا دیتا ہے۔

نفسانی خواہشات بالخصوص جنسی آسودگی زندگی کی ایک ضرورت اور حقیقت تو ہے مگر یہی سب کچھ نہیں ہے۔ ''اشارہ اور نفسیات'' میں جوان بچوں کی ماں جنسی نا آسودگی کا شکار دکھائی دیتی ہے۔ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرنے والی یہ خاتون اپنے منہ بولے بیٹے سے نکاح پڑھوا لیتی ہے۔ عورت کے اس اقدام سے سماجی سطح پر تہلکا مچ جاتا ہے لیکن اگر بنظر غائر دیکھا جائے منہ بولے رشتے کوئی معنی اور مفہوم نہیں رکھتے۔ نکاح پڑھوانا کوئی غیر شرعی فعل نہیں ہے۔ بغیر نکاح کے رہنا تشویش ناک ہو سکتا تھا۔ جب مرد اپنی نواسیوں اور پوتیوں کی عمر کی ایک لڑکی سے رشتہ مناکحت میں منسلک ہو سکتا ہے تو عورت اپنے بیٹے کے عمر کے لڑکے سے نکاح کیوں نہیں پڑھوا سکتی۔ یہ سب وہ سوال ہیں جنہیں قلم کار نے قاری کے سوچنے کیلئے چھوڑ دیا ہے۔

''گدلا سمندر'' وہ افسانہ ہے جو اس مجموعے کا نام بھی ہے۔ پانی حیات کی بنیادی اکائی ہے۔ اور سمندر اس کا سب سے بڑا مظہر۔ لہٰذا ''گدلا سمندر'' کجلائی ہوئی زندگی کی طرف استعارہ ہے۔ افسانہ اپنی ظاہری سطح پر ماحولیاتی آلودگی اور اس کے حیات کش مضمرات کو زیر بحث لاتا ہے اس کی باطنی تہہ میں وہ ہلاکت خیزیاں اور تباہ کاریاں منہ کھولے کھڑی ہیں جنہیں خود انسان نے متعارف کرائے ہے۔ اس جہان رنگ و بو کی حیات آفریں، پر سکون اور رنگین فضا کو مسموم مہلک اور حیات کش بنا کر انسان کے خلاف سازش کی ہے یہی ہمارا المیہ ہے کہانی کار کو انسان کا مستقبل مخدوش نظر آ رہا ہے۔ انسانیت کی بقاء کیلئے یہ گہرا تفکر، گھمبیر احساس اسے انسان دوست کا اعزاز بخشتا نظر آتا ہے۔

ہجرت اور نقل مکانی کے حوالے سے جانی مالی نقصان، ثقافتی اور تہذیبی تصادمات، سماجی اور معاشی مشکلات وغیرہ کے بارے میں بے شمار لٹریچر موجود ہے۔ مکینوں کے ہٹنے سے خود مکان پر کیا بیتتی ہے اس کیفیت کا حال ''زندگی اور سفر'' میں بیان کیا گیا ہے۔ ''حامد منزل'' جب ''گپتا بھون'' میں تبدیل ہوتی ہے تو سماجی اور تہذیبی رشتوں ناتوں اور روابط میں کیا تبدیلیاں آتی ہیں۔ ''حامد منزل'' ایک جیتا جاگتا، مرکزی اور فعال کردار اپنا کر اپنی سابقہ، موجودہ اور آئندہ حیثیت کا جائزہ لیتا ہے۔ تو ذہن یک بارگی سایمن ڈی بوائر کی "She came to stay" کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ جو بے جانوں کو جان اور بے زبانوں کو زبان عطا کرتا ہے۔ ''حامد منزل'' Personification کی اچھی مثال ہے۔

کتاب میں شامل آخری افسانے کا نام ہے ''رستہ رستہ یاد کھڑی ہے'' بیٹے کے بنائے ہوئے نئے اور بڑے گھر میں آ کر اسے اپنا بچپن یاد آ جاتا ہے جب وہ وسیع وعریض حویلی میں رہا کرتی تھی۔ مدتوں بعد اسے پھر من چاہا بڑا گھر ملا تھا۔ مکان کو دیکھ کو اس کے وجود میں سرخوشی اور توانائی کا احساس جاگ اٹھتا ہے۔ مگر اگلے ہی لمحے بہو کا اس کے بیٹے سے تخاطب اسے اس حقیقت سے آگاہ کرتا ہے کہ وہ گھر اس کا نہیں ہے۔ بہو کا اجنبی اور سرد لہجہ اس کے فخر وانبساط کو حسرت ویاس میں بدل دیتا ہے۔ ہر چند وہ سوچتی ہے کہ بیٹا بھی اس کا سرمایہ ہے مگر اس مایۂ خویش پر بہو کا تصرف اسے ایک بار پھر بے گھری کیا احساس میں دھکیل دیتا ہے۔ فن کار نے بڑی چابک دستی کے ساتھ اس خیال کو اجاگر کیا ہے کہ ہم اپنی خواہشات کے حصار میں زندہ رہتے ہیں۔ زندگی سے خواہشات اور امیدیں نفی کر دی جائیں تو ایک پل بھی جینا دوبھر ہو جائے۔ لمحہ موجودگی چبھن اور کسک کو ہم ماضی کو خوش گوار یادوں کے سہارے برداشت کرتے اور دکھ کو بھلانے کی کوشش کرتے ہیں بوڑھے اور کم فعال افراد اپنی خوبصورت یادوں کو ہی جینے کا سہارا بناتے ہیں کو وہ نئی دنیا تخلیق کرنے پر قادر نہیں رہتے۔

''گدلا سمندر'' میں شامل افسانے موضوعاتی اعتبار سے تنوع کے حامل ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر داخلی اور نفسیاتی محسوسات کی گرہ کشائی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ موضوعات عالمی حیثیت کے حامل ہیں۔ مثلاً جنگ اور امن ہجرت دہشت گردی جمہوری اقدار خواتین کے حقوق، افراط زر یا مہنگائی، ماحولیاتی آلودگی وغیرہ۔ ان کے بیشتر افسانوں کا مرکزی کردار ایک معمر خاتون ہے۔ عذرا کے افسانوں میں ان کا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ، سماجی رشتوں اور ناتوں اور عصری شعور کے ساتھ جڑا نظر آتا ہے۔ زبان سادہ اور بے داغ ہے۔ نت نئی تشبیہات اسلوب کی دل کشی میں اضافہ کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ کم سے کم لفظوں میں افسانے کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ ان کا بیان بوجھل مباحث اور دانش ورانہ Statements سے مبرا

ہے۔ ہر چند کہ ان کے افسانوں سے اس کی نفسیات کے موضوع میں دلچسپی کا اظہار ہوتا دکھائی دیتا ہے مگر وہ نفسیاتی یا علمی نکات سے قارئین کو مرعوب یا متاثر نہیں کرتیں۔ ان کے مختصر اور موثر افسانے ہمیں ایک ایسے قلم کار کی داخلی اور ذہنی ترجیحات سے متعارف کراتے ہیں جو ذات سے کائنات کی طرف مائل بہ پرواز نظر آتا ہے۔ مگر یہ پرواز عمودی نہیں افقی ہے۔ وہ زمین اور اہل زمین سے اپنا رشتہ منقطع کر کے کسی خیالی دنیا کی تشکیل کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ وہ اپنے بعض افسانوں میں زمان و مکان کی قیود سے اٹھ کر بلند ہونے کا متمنی تو نظر آتا ہے۔ مگر قصہ زمین برسرزمین کی بیڑیاں اسے زیادہ اوپر اٹھنے نہیں دیتیں۔ وہ نامعلوم کے کھوج میں زیادہ سے معلوم سے مانوس نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناسٹلجائی کیفیات کا اظہار اس کے یہاں عام ملتا ہے۔ عذرا اصغر کے افسانے اپنی جذبات نگاری کے اختصاص کی وجہ سے فہم و شعور سے زیادہ ہمارے حسی تلازمات کا متاثر کرتے ہیں اور یہی اس کا اعزاز ہے۔

داستان طرازی

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ

خبردار

جملہ حقوق بحق ملاح محفوظ ہیں

غلام عباس
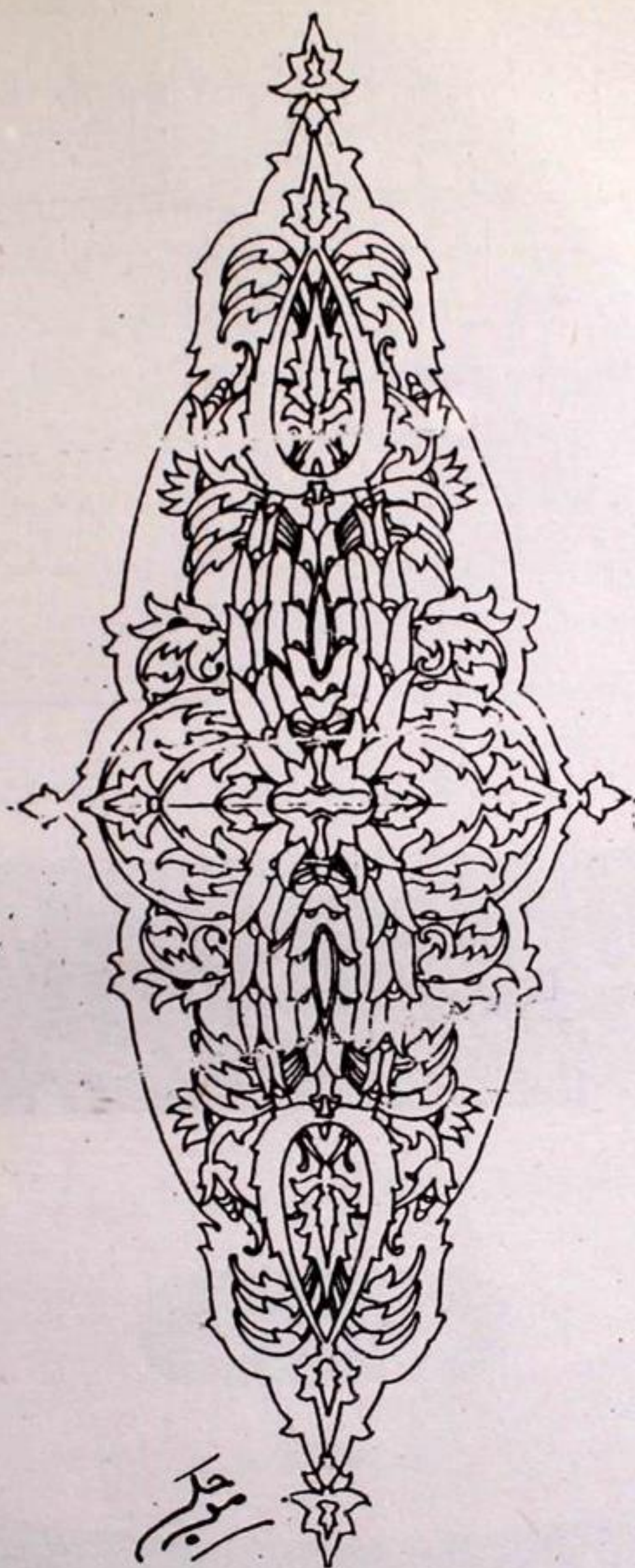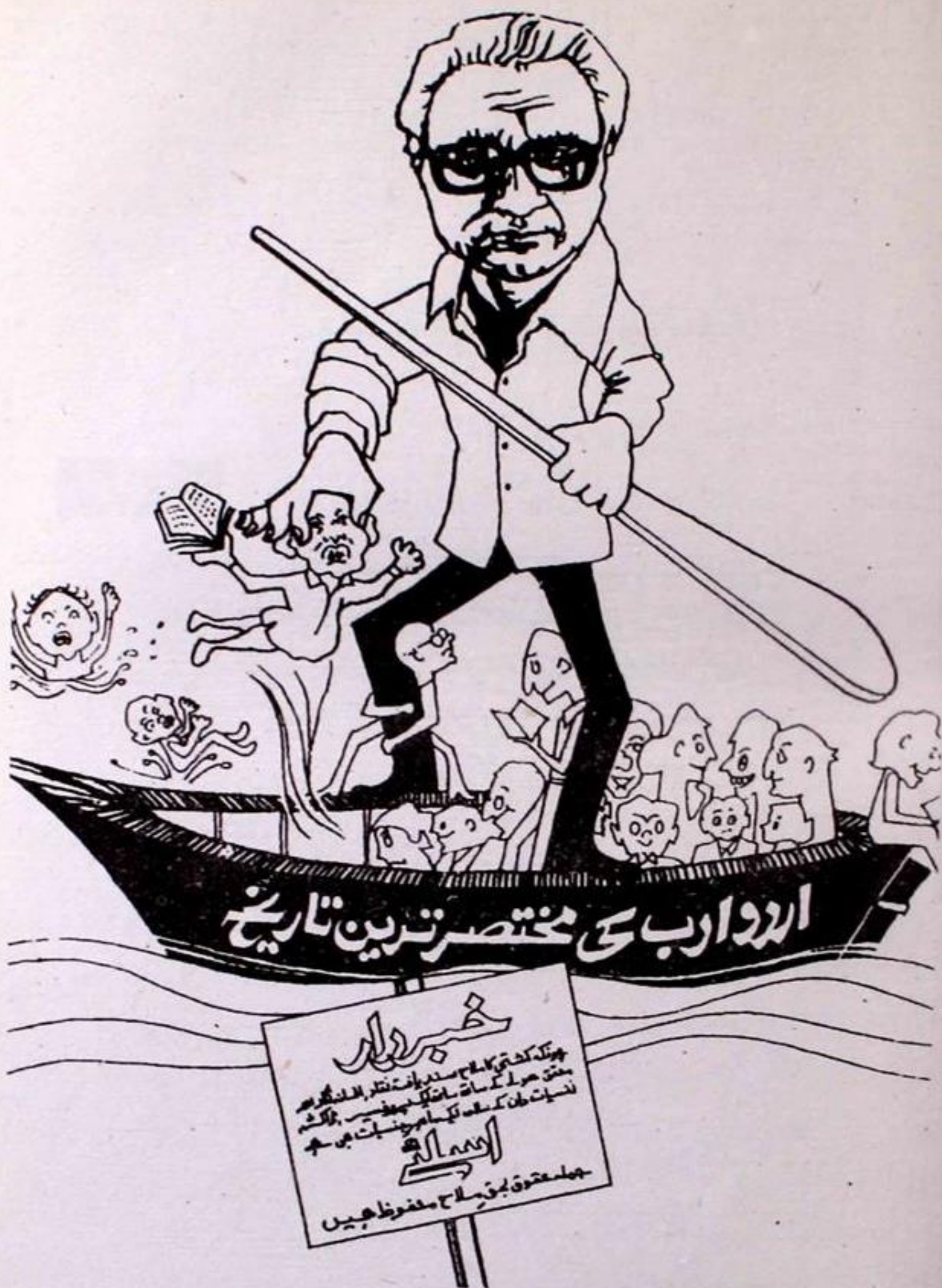
افسانہ نگاری ادب کی سب سے زیادہ آسان صنف ہے۔ ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی جو صرف خط لکھنا جانتا ہو، تھوڑی سی کوشش سے افسانہ لکھ سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ یہ جانتا ہو کہ زندگی کی حقیقتوں کو کم سے کم لفظوں میں کس طرح پیش کیا جا سکتا ہے اور افسانہ نثر کی تمام اصناف میں اسی لیے برتری رکھتا ہے کہ وہ چند صفحات میں لکھا جا سکتا ہے اور زندگی کی حقیقت کو پیش کر سکتا ہے۔

انٹرویو روزنامہ جنگ کراچی، ۱۰ جولائی ۱۹۷۸ء

ڈاکٹر سلیم اختر، لاہور

آئس برگ

میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں؟

چار برس کے تخلیقی تعطل کے بعد افسانہ "بلّی" مکمل کر لینے کے بعد یہ سوچ لازم تھی کہ اتنے برس تک کوئی افسانہ کیوں نہ قلم بند کر پایا، یہی وجہ سمجھ میں آئی، کوئی موضوع نہ تھا، کوئی تھیم نہ تھی، کچھ کہنے کو نہ تھا ـــــ یہ سب کیوں نہ تھا، اس لیے کہ ذہن ان سے قاصر رہا لیکن ذہن کیا ہے؟ جسے افسانہ نہ سوجھا، میں مجبور رہا اور افسانہ نہ لکھ پایا؟ ـــــ اس کے جواب میں اک لمبی چپ!

ذہن کی یہ لمبی چپ میرے لیے ہی نہ تھی بلکہ ہر وہ شخص اس سے دوچار ہوتا رہا ہے جس کا ذہن کی تخلیقی فعلیت سے کسی نہ کسی صورت میں تعلق رہا ہے، ذہن کی وہ تخلیقی فعلیت تخلیقی عمل، تخیل، تصور، اسلوب اس کا جمال اور جمالیات جس کے مظاہر ہیں۔

میں ایم-اے/ایم فل (اردو) کی کلاس کو تخلیق، تخلیقی عمل اور تخیل وغیرہ کا عمل اپنی مثال سے سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں شاعری کی تاریخ بیان کر سکتا ہوں، نہ صرف یہ کہ شعر کی اچھی تشریح کر سکتا ہوں بلکہ بعض اوقات شاعر کے مقابلہ میں اس کے اشعار کی اس سے بہتر تشریح بھی کر سکتا ہوں، تحسین شعر کے ضمن میں اس کی فنی لطافتیں بھی سمجھا سکتا ہوں لیکن خود شعر نہیں کہہ سکتا اس کا مطلب ہوا کہ مجھ میں کوئی ایسا خلا ہے جسے شعر پُر نہیں کر پاتا۔ اس مثال سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ تخلیق کا علم سے کوئی خاص تعلق نہیں ورنہ ہر ایم اے اردو شاعر بھی ہوتا۔ کیا وجہ ہے کہ میری شخصیت میں شاعری کا سوتہ نہیں اور شاعر اس کا حامل ہے۔ کیوں میں محض شعر فہم ہوں؟ اقبال، غالب میر، آتش، مصحفی، ولی ہر روز کیوں جنم نہیں لیتے؟

اس سوال اور اس کے تشفی بخش جواب کے فقدان کی وجہ سے قدیم زمانہ میں تخلیق اور تخیل مافوق الفطرت، پُر اسرار اور کسی حد تک طلسمی سمجھے جاتے رہے ہیں، افلاطون نے "MUSES" کو فن اور فنون لطیفہ کی سرپرست دیویاں قرار دے کر ان کی پیدا کردہ ربانی دیوانگی (Divine

(Madness) کو باعث تخلیق قرار دیتے ہوئے اس امر پر بطور خاص زور دیا کہ کوئی شخص بھی علم، مطالعہ کے بل بوتے پر تخلیق کار نہیں بن سکتا۔ ہندوؤں کے ہاں میوز کی متبادل تخلیق، موسیقی، اور خطاطی کی سر پرست دیوی سرسوتی ہے۔ اسی انداز پر دنیا بھر میں فنونِ لطیفہ اور تخلیق نو اساطیری تناظر میں سمجھا جاتا رہا ہے مسلمانوں میں بھی شعرا تلمیذ رحمان سمجھے جاتے ہیں۔

پکاسو نے بڑی دلچسپ بات کی کہ جس طرح مسلمان نماز کے لیے مسجد میں جاتے ہوئے اپنی جوتیاں مسجد کے باہر اتار دیتے ہیں اسی طرح فن کے معبد (مصوری مراد ہے) میں داخل ہوتے وقت اپنی ذات کو باہر چھوڑ دینا چاہیے۔

ذہن، ذہانت، تخلیقی عمل کا تعلق دماغ سے ہے ہر چند کہ یہ دماغ کے اعضاء نہیں، ادھر دماغ کا تجزیاتی مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ دماغ کا دایاں حصہ جسم کے اقدام اور زندگی کے عملی پہلو کنٹرول کرتا ہے جبکہ بائیں حصے کا تخلیق، فنون لطیفہ، تحیّر آمیز احساسات اور مخفی علوم سے تعلق ہے لیکن ہم ہنوز بھی اس امر سے لاعلم ہیں کہ دماغ میں ایسا کون سا غیر مرئی اینٹنا نصب ہے جس کی مدد سے آتے ہیں غیب سے مضامین تو دماغ کیسے ان کے ناقابل فہم سگنلز موصول کر کے قابل فہم زبان اور دلکش اسلوب میں انھیں Decode کر لیتا ہے؟

میرے لیے غیب حرف نثر تک محدود ہے کسی اور کے لیے شعر تو کسی کے لیے رنگ ــــــ جبکہ اکثریت اس فیض سے محروم رہتی ہے۔ میں جب کسی رسالہ کے مدیر کو اپنا افسانہ ارسال کرتا ہوں تو لکھتا ہوں کہ افسانہ ''سرزد'' ہو گیا، جیسے گناہ سرزد ہوا ہو اس میں اتنی سی ترمیم کی جا سکتی ہے کہ بُرا افسانہ گناہ ہے اور اچھا افسانہ فیض کے اسباب میں سے ایک۔

کولمبیا پکچرز کے ٹریڈ مارک کی مشعل بردار حسینہ کی مانند تخلیق کار بھی، جادۂ زیست پر، چراغ بلند کیے بلکہ زیادہ بہتر تو یہ کہ ہتھیلیوں ہی کو چراغ بنائے، خلق کی بصیرت میں اضافہ کرتا ہے اس لیے تخلیق بھی کارِ ثواب ہے، اگر تخلیق کار یدِ بیضا سے بطریق احسن کام نہ لے تو پھر وہ بھی اور اس کی تخلیق کاذب قرار پائے گی۔ کاذب تخلیق گناہِ کبیرہ ہے۔

ان نظریاتی مباحث سے قطع نظر، جب اپنا تجزیاتی مطالعہ کرتا ہوں تو خود کو "Precoscious" پاتا ہوں یعنی ایسا شخص جس کی حِسیّات نے قبل از وقت انگڑائی لی، بلا اشتعال عذودوں نے اُس وقت کارروائی کا آغاز کر دیا کہ ہنوز کارروائی کا جواز نہ تھا۔ اعصابی تناؤ اس عمر میں شروع ہو گیا جب نہ اعصاب کا علم تھا اور نہ ہی ان کے تناؤ کے نتائج کا شعور جبکہ ہیجانی تموّجات آتش بہ داماں ثابت ہوئے۔

خارجی طور میں خاموش طبع اور جھجکا بلکہ ٹھٹکا سا مگر دل و دماغ میں مِنی حشر!

ان سب کا توڑ لفظ میں تلاش کیا۔ میں محنتی کے برعکس بدشوق طالب علم رہا ہوں (عمر بھر)

نصاب کی کتابوں سے کبھی بھی رغبت نہ رہی جبکہ ادبی مطالعہ کم عمری ہی میں شروع ہو چکا تھا کس نوعیت کا؟ آٹھویں جماعت میں کرشن چندر، منٹو، عصمت، ندیم، بیدی، عزیز احمد کا مطالعہ کر رہا تھا، فکشن کے ساتھ ساتھ نان فکشن کا مطالعہ بھی رہا، سمجھتا یا نہ سمجھتا مگر ہر طرح کی کتابیں پڑھتا۔ میرا مطالعہ محیط بے کراں کے برعکس جوئے کم آب سہی مگر اس کا ایک کنارہ فکشن کا تو دوسرا نان فکشن کا ـــــ یوں ان دیکھے جہانوں کی سیاحت کا آغاز ہوا یہ تھا دن سپنوں اور فینٹسی کا جہان جس میں تخیل و تصور رنگ آمیزی کرتے۔ فینٹسی کب تصور میں تبدیل ہو جاتی اور تخیل کیسے لفظ کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے اس ضمن میں وثوق سے یہ کہنا آسان نہیں سوائے اس کے کہ یہ لیلا ذہن رچاتا ہے اور تخلیق اس لیلا کا چمتکار ہے۔

اس تناظر میں اپنی بات کروں تو صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ بس لکھ سکتا ہوں مگر یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں کسی غیر معمولی ذہنی کیفیت کے زیرِ اثر دل کے کیف، اعصاب کی مستی اور ذہن کی سرشاری کے عالم میں لکھتا ہوں، ایسا نہیں لیکن اتنا لکھنے کے باوجود میں نے مصنوعی ذرائع سے کبھی بھی تحریک پیدا نہیں کی، میں تو سگریٹ بھی نہیں پیتا شراب کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، میرا سب سے بڑا نشہ کافی تھی جو بلڈ پریشر کی وجہ سے چھوڑی تو شوگر کی وجہ سے چائے۔ لکھنے کی تحریک باطنی ہے، خارجی طریقوں سے اسے آلودہ نہ کرنا چاہیے۔

تخلیق کے ضمن میں لاشعوری محرکات کا قائل ہونے کے باوجود بھی میرے لیے تحریر و تخلیق شعوری اعمال سے بھی مشروط ہیں۔ مطالعہ اور مشاہدہ سے حاصل کردہ معلومات و کوائف کی ذہن میں بازگشت تحت الشعور کے باعث ہی لیکن اس مواد میں ترمیم و تنسیخ یا رد و قبول شعوری تنقیدی حس پر مبنی ہوتا ہے۔ تحریر کے اختتام کے بعد نظر ثانی، ایڈیٹنگ، کانٹ چھانٹ، اضافہ یہ سب شعوری عمل ہے۔

۱۹۴۹ء میں اولین مطبوعہ افسانے سے لے کر تازہ افسانہ ''بلی'' تک میں نے کثیر تعداد میں افسانے نہ لکھے۔ ابتدائی مشق کے درجن بھر افسانے مسترد کر دیے۔ جب ۲۰۰۴ء میں افسانہ کی کلیات ''نرگس اور کیکٹس'' چھپی تو ناولٹ ''ضبط کی دیوار'' اور ۱۰۷ افسانوں پر مشتمل تھی۔ میں اس لحاظ سے خود کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ میری توقع سے بڑھ کر تنقیدی پذیرائی ہوئی انگریزی، ہندی، ترکی، بنگلہ، آسامی اور پنجابی زبانوں میں ان کے تراجم ہوئے، جبکہ ضبط کی دیوار کے پاکستان بھر میں چار اور ایک ایڈیشن بھارت میں چھپا ہندی اور عربی میں اس ناولٹ کا ترجمہ کیا جا چکا ہے۔

ایک اعتراف! میں جس سہولت اور تیز قلمی کے ساتھ تنقید لکھ لیتا ہوں افسانہ اتنی تیزی سے نہیں لکھ پاتا۔ موضوع، تھیم، کردار، واقعہ کسی سخت گیر استاد کی مانند کان پکڑ کر، کسی غیر مرئی چھڑی

سے ہانک کر، ہاتھ میں زبردستی قلم تھما دے، تب ہی افسانہ لکھا جاتا ہے۔ ذہن میں آنے والی ہر بات یا تھیم پر میں نے اضطراری طور پر یا فوری ردعمل کے تحت کبھی بھی افسانہ قلم بند نہیں کیا اور یہ پابندی بھی خود ساختہ ہے کہ سال میں ایک دو سے زیادہ افسانے نہیں لکھنے، لکھنے کے مقابلہ میں نہ لکھنے کا رویہ دن بدن تقویت حاصل کرتا جاتا ہے۔

میں افسانہ پر کہیں زیادہ محنت کرتا ہوں شاید ہی کوئی ایسا افسانہ ہو جس کے پہلے ڈرافٹ سے میں، میں مطمئن ہوگیا، افسانہ کئی ڈرافٹس کے بعد مکمل کرتا ہوں۔ میں افسانہ کی اس بے رحمی سے کانٹ چھانٹ کرتا ہوں گویا یہ میرا نہیں بلکہ دشمن کا افسانہ ہو۔

میرے نزدیک افسانہ کی ابتدائی اور اختتامی سطریں بے حد اہم ہیں۔ قاری کو متوجہ کر کے مائل بہ مطالعہ کرنے کے لیے آغاز کی سطریں اور اس کے ذہن میں افسانے کے تاثر کے کلی ابلاغ کے لیے اختتامی سطور خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔ دلچسپ اختتام کے لیے موپساں، او ہنری اور منٹو کی مانند پنچ لاین لازم نہیں لیکن افسانہ اگر یوں ختم کیا جا سکے تو افسانہ میں تحیر کی اضافی کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض افسانوں میں مَیں نے بھی ایسا کیا ہے۔

عنوان افسانہ کی دکان کا سائن بورڈ ہوتا ہے۔ میں اس پر خصوصی محنت کرتا ہوں اگرچہ افسانہ مع عنوان ذہن میں وارد ہوتا ہے لیکن یوں بھی ہوتا ہے کہ افسانہ کے حلق میں عنوان مچھلی کے کانٹے کی طرح سے اٹک جاتا ہے۔

یہ تو ہوا افسانہ کی کرافٹ کا خارجی عمل جو سراسر شعوری ہوتا ہے مگر وہ عمل کون سا ہے جو فرد کو کردار، واقعہ کو کہانی میں تبدیل کر دیتا ہے یوں کہ الفاظ لو دینے لگتے ہیں۔ عمر بھر کی افسانہ نگاری کے باوجود بھی ۲×۲=۴ کے انداز پر تخلیقی عمل کی کارفرمائی سمجھائی نہیں جا سکتی —— مثال پیش ہے:

میرے جن افسانوں کا بطور خاص نوٹس لیا گیا ان میں ''چالیس منٹ کی عورت'' بھی ہے یہ بالکل حقیقی ہے۔ غالب سیمینار میں شرکت کے بعد میں دہلی سے لاہور آ رہا تھا ساتھ کی نشست پر بیٹھی عورت نے آغاز گفتگو کیا اور چالیس منٹ کی فلائیٹ میں اس نے جیون کتھا سنا دی۔ افسانہ میں مَیں نے دورانِ سفر کی تمام باتیں ایڈیٹنگ کے بغیر لکھ دیں صرف چند اختتامی سطریں میری ہیں جو اس عورت کو کردار اور واقعہ کو افسانہ بنا دیتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ اختتامی سطریں میں نے اور کسی طرح سے کیوں نہ لکھیں۔ میں افسانہ کا خالق تھا جس طرح کا چاہتا اختتام کر سکتا تھا، ایک خاص انداز ہی میں افسانہ کیوں ختم کیا؟ میں اس کی وضاحت سے قاصر ہوں۔

بیانیہ میں قلم بند کیا گیا ''چالیس منٹ کی عورت'' واضح اسلوب میں قلم بند ہوا نہ علامت نہ استعارہ نہ ابہام اس کے برعکس ''پھن پھول'' جس نے پڑھا، اس نے وضاحت چاہی۔

اس افسانے نے مجھے بہت تنگ کیا، لکھا، کاٹا، پھر لکھا پھر کاٹا —— حتیٰ کہ سوچا یہ افسانہ نہ لکھ پاؤں گا چنانچہ اسے ذہن بدر کر دیا کئی ماہ بعد تاریک رات میں جس طرح برق کی چمک لحظہ بھر کو منظر اجاگر کر دیتی ہے بالکل اس طرح لمحہ بھر میں افسانہ آئینہ ہو گیا —— کیوں؟

میرے لاتعلق ہو جانے کے بعد تحت الشعور اس پر کسی اسائنمنٹ کی طرح ہوم ورک کرتا رہا حتیٰ کہ ایک پلیٹ میں رکھ کر تیار افسانہ پیش کر دیا۔

صوفی نہ ہوتے ہوئے بھی میں نے خارج کے بجائے باطن میں زندگی بسر کی اور سائنس دان نہ ہوتے ہوئے بھی دل کے بجائے ذہن کا بندہ بننے کو کوشش کی۔ میری معلمانہ زندگی، تنقیدی مسائی، نفسیات سے شغف، بطور شوہر اور باپ کے کردار کی کامیاب ادائیگی سے کوئی بھی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ میں آئس برگ کی مانند ہوں جس کا بہت تھوڑا حصہ آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے جبکہ سارا آئس برگ آبی نقاب اوڑھے زیرِ آب ہوتا ہے۔ اسے اس مثال سے سمجھئے کہ میرے قریب ترین احباب کو بھی اس کا علم نہیں کہ مجھے مافوق الفطرت، جادو، اساطیر اور مخفی علوم سے کتنی دلچسپی ہے۔ اسی بنا پر آپ بیتی ''نشانِ جگر سوختہ'' نے سب سے زیادہ میرے قریبی دوستوں کو حیرت زدہ کیا۔

اساطیر اور مخفی علوم سے وابستہ مطالعہ تنقید میں تو ظاہر نہ ہوا مگر بعض افسانے اس کی بنا پر ممکن ہو سکے اس ضمن میں ان افسانوں کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ''سائے کی طرح ساتھ پھریں''، ''پکار''، ''من آتما''، ''اماوس''، ''پھن پھول''، ''بلّی''، ''تیرھواں برج''، ''قفسِ رنگ''، ''جنم روپ''، ''کرو دکشنا'' اور ''موہنی''۔

میرے افسانوں پر قلم اٹھانے والوں نے صرف جنس اور نفسیات کے حوالہ سے لکھا (اچھا لکھا) لیکن کسی کی بھی اساطیری اور مافوق الفطرت موضوعات پر مبنی افسانوں کی طرف نگاہ نہ گئی۔ معاصر افسانہ نگاروں میں سے شاید ہی کسی نے اساطیر، جادو، ابلیس پرستش، ویمپائر پر اتنے افسانے لکھے ہوں گے —— ان افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ کرنے والے نقاد کا ہنوز منتظر ہوں۔

موت سے کس کو رستگاری ہے —— کے رویہ کے برعکس میں موت کو تعمیری اور تخلیقی عمل سمجھتا ہوں یہ تین افسانے اس رویہ کے مظہر ہیں ''مٹی کا قرض''، ''کوہِ بے اماں'' اور ''جرسِ غنچہ''۔

جہاں تک افسانہ نگار کے معاشرتی فرائض حسن و صداقت کی اقدار کی پاسداری باالفاظ دیگر کمٹمنٹ کا تعلق ہے تو افسانہ نگار کو انھیں اپنے افسانہ کے گلے کا ہار بنانے کی ضرورت نہیں، مشک آنست کہ خود ببوید کے مصداق افسانہ نگار کے باضابطہ اعلان اور منشور کی بجائے ان سب کا مظہر اس کا افسانہ ہونا چاہیے اگر افسانہ انسانیت، معاشرہ، اقدار و معیار یا مزاحمت پر مبنی ہے تو افسانہ نگار کے برعکس افسانہ کی سطر سطر سے اس کا اعلان ہونا چاہیے۔ کمٹمنٹ کی پیدا کردہ مزاحمت یا

عدم مفاہمت بذات خود انعام ہے، پلاٹ، عہدہ، کیش، مراعات، کرسی سے اسے داغدار نہ کرنا چاہیے۔

سرکاری ملازم ہوتے ہوئے بھی میں نے عہدِ ضیاء کے جبر، تعزیرات، حرف و سوچ پر پہروں اور احتساب کے بارے میں مقدور بھر لکھا لیکن جب پیپلز پارٹی کی حکومت بنی تو قلم کی قیمت وصولنے کے لیے مزاحمت کی وردی پہن کر اسلام آباد کے چکر نہ لگائے۔ عہد احتساب میں علامت، تمثال اور استعارہ کا سہارا لے کر میں نے یہ افسانے قلم بند کیے۔ ضیاء الحق کے بارے میں ''ظلِ ہما'' اسلامائزیشن کے بارے میں ''کھجوروں کا موسم'' بھٹو کی پھانسی پر ''زنجیر''، ''اختتام''، ''عذاب میں گرفتار بستی'' اور ''جس رات ستارے ٹوٹے'' معاشرہ میں اجتماعی خوف کے موضوع پر ''نادیدہ'' اور ''بستی'' اور ''پانچویں کھونٹ'' آمریت اور اقتدار کی سازش کے تناظر میں ''تذکرہ اشجار'' اور ''بلندی کی حد'' لکھے جبکہ پاکستان کی موجودہ صورتِ حال کے بارے ''سانتا کلاز کا زوال'' اور ''بے چراغ بستی کا چراغ'' قلم بند کیے۔

بڑا ہی بدقسمت ہے وہ ادیب جو خود کو منڈی کی جنس بنا کر اپنے لفظ کی قیمت وصولتا ہے ہر چند کہ وہ خود کو کامیاب بلکہ بے حد کامیاب ہی کیوں نہ سمجھتا ہو مگر وہ بے ضمیری کی موت مر چکا ہوتا ہے یہ الگ بات کہ اس کے انتقال کی خبر اس تک نہ پہنچی ہو— باغ تو سارا جانے ہے!

استعارہ، تشبیہ، تمثال، تخیل، تصور اور ان سب کی امین تخلیق نیلامی کا مال نہیں، اس امر کے باوجود کہ ہمارا پاکستان نیلام گھر میں تبدیل ہو چکا ہے۔

میرا تصورِ حیات میرے طرزِ عمل سے واضح ہے۔ وہ طرزِ عمل افسانہ بھی جس کا ایک جزو ہے۔

آخری بات!

اگرچہ قطرۂ شبنم نہ پاید برسرِ خاری
معنم آں قطرۂ شبنم بہ نوکِ خاری رقصم

ڈاکٹر سلیم اختر

بلی

مہا پجاری کڑاہ کے سامنے، بت بنا، کھولتے تیل میں دھمال ڈالتے بلبلوں کو پلک جھپکائے بغیر تکے جارہا تھا۔ وہ ان کے نرت کی گپت بھاشا پڑھنے کی کوشش کررہا تھا۔ بے تاثر چہرہ پر وقت کی دھول جھریوں کی صورت میں جمی، اندر دھنسی بے رنگ آنکھیں نظر کے پنچھی کے اجڑے گھونسلے، سوکھے شریر پر بالوں کی کائی اور اس پر جینو۔

گرو کے چیلے، مندر کے داس، دیوداسیاں اور بستی کے کُل لوگ ہاتھ باندھے نظریں جھکائے، دائرہ بنائے۔ پیچھے درختوں پر پکھیر و گردنیں ٹیڑھی کئے منظر کے خاموش پہرہ دار، چھتنار میں گول زرد آنکھوں اور دودھاری زبان سے سن گن لیتا کوڑیالہ۔

مہاپجاری کے ساتھ سانس رو کے راجہ،

کلجگ سے بھی گھور کلجگ، مہا کال، ایسی درگھٹنا نہ دیکھی نہ سنی۔

پوتر لوگوں کی اس بستی میں وددان بستے تھے۔ پُرشوں کا تن صاف باہر سے بھی اور بھیتر سے بھی، استریاں پوترتا کی دیویاں، کنیائیں چلتیں تو کولہے ہلنے نہ پاتے۔ کوبال بھولے بھالے، سیوک لوگ پردیسیوں کی رَکشا کرتے۔ راہ چلتوں کے چَرن چھُوتے۔ دیوتاؤں اور دیویوں کی پرشن کرنے کیلئے دان اور بلیدان میں مگن۔ بستی کے چاروں اُور گھنا بن جس کی بلندی آتما، اس بن کے بیچ جھیل جس کا فیروزی پانی پوترتا میں گنگا جل، اس جل سے روگیوں کے روگ دور ہوتے۔ ہزار یاتری اشنان کرتے، اس جھیل کی تہہ سے کبھی کبھی خود بخود موتی اچھل کر باہر آجاتے جنہیں بڑے چاؤ سے جمع کر کے مالا بنا کر مہامَیا کے گلے کی شوبھا بڑھائی جاتی۔ اس

مگر پرجا کب مانتی، ان کیلئے تو راجہ پربھو تھا، جتنی بھی سیوا کی جائے کم تھی۔

بستی اور اس بستی جیسی انیک بستیوں کا راجہ، پُرشوں کا پُرش، مہاگنی، ودھوان پر جا کیلئے پورتر تا کا چتر، دیوتا سمان بلکہ پرمیشور۔ پر جا اس سے خوش، بے حد خوش، اتنی خوش کہ خوشی کے اظہار کیلئے کبھی لب کشا نہ ہوتے۔ مبادا جیبھ پر خوشی کا شبدھ آنے سے خوشی بے اثر نہ ہو جائے۔ پر جا کو پتا سمان راجا سے گھور پیار تھا اتنا کہ بغیر طلب کئے راجہ کو اپنی فصلوں کی کٹائی، پھلوں کی کمائی اپنی لگائی سب راجہ کے قدموں کی بھینٹ چڑھا دیتے۔ وہ سویکار کر لیتا تو نہال ہو جاتے۔ ہر چند کہ راجہ سیس نوا کر، ہاتھ باندھ کر، نمستے کرتے ہوئے یہ سب لینے سے انکاری ہوتا مگر پر جا کب مانتی، ان کیلئے تو راجہ پربھو تھا، جتنی بھی سیوا کی جائے کم تھی۔ بعض پُرش تو راجہ سے اتنا پیار کرتے تھے کہ آشیر باد حاصل کرنے کیلئے پیاری دھرتی، اچھوتی کنیا یا پھر نئی بیاہتا، راجہ کی سیوا کیلئے ارپن کرتے، راجہ ایسی بھینٹ لینی پسند نہ کرتا تھا مگر وہ اپنے اس پربھو کے سامنے زاری کرتے، بنتی کرتے کہ یہ سب سویکار کر لو، ورنہ جان دے دیں گے۔

پرتھوی میں اس راجہ، اس کے راجیہ اور اس کی پر جا کا چرچا تھا۔ برے راجہ کی پر جا ان سورگ باسیوں سے جلتی اسی لئے اس کے راجیہ کا نام بھی سورگ پڑ گیا اور اتہاس لکھنے والوں نے بھی یہ لکھ دیا اگر پرتھوی میں کہیں بھی سورگ ہے تو وہ یہی ہے، یہی ہے، یہی ہے،

گرو کی چیلے، مندر کے داس، دیوداسیاں اور بستی کے کل لوگ ہاتھ باندھے نظریں جھکائے، دائرہ بنائے، پیچھے درختوں پر پلیر و گردنیں ٹیڑھی کئے منظر کے خاموش پہرہ دار، چتنار میں گول زرد آنکھوں اور دودھاری زبان سے سن بن لیتا کوڑیالہ

پوتر لوگوں کی اس بستی میں ودوان بستے تھے۔ پُرشوں کا تن صاف باہر سے بھی اور بھیتر سے بھی، متر یار پوترتا نی دیویاں کنیائیں چلتی تو کولہے ہلنے نہ پاتے بال بھولے بھالے، سیوک لوگ پردیسیوں کی رَکشا کرتے۔ راہ چلتوں کے چرن چھوتے۔ دیوتاؤں اور دیویوں کی پرشن کرنے کیلئے دان اور بلیدان میں مگن۔ بستی کے چاروں اور گھنا بن جس کی بلندی آتمار، اس بن کے بیچ جھیل جس کا فیروزی پانی پوترتا میں گنگا جل، اس جل سے روگیوں کے روگ دور ہوتے۔ ہزار اشنان کرتے اس جھیل کی تہہ سے بھی کبھی خود بخود موتی اچھل کر باہر آ جاتے جنہیں بڑے چاؤ سے جمع کر کے مالا بنا کر مہامیا کے گلے کی شوبھا بڑھائی جاتی۔ اس بستی اور اس بستی جیسی انیک بستیوں کا راجہ، پُرشوں کا پُرش، مہاگنی، ودھوان جانے کیلئے پورترتا کا چتر، دیوتا سمان بلکہ پرمیشور۔ پر جا اس سے خوش، بے حد خوش، اتنی خوش کہ خوشی کے اظہار کیلئے کبھی لب کشا نہ ہوتے۔ مبادا جیبھ پر خوشی کا شبدھ آنے سے خوشی بے اثر نہ ہو جائے۔ پر جا کو پتا سمان راجا سے گھور پیار تھا اتنا کہ بغیر طلب کئے راجہ کو اپنی فصلوں کی کٹائی، پھلوں کی کمائی اپنی لگائی سب راجہ کے قدموں کی بھینٹ چڑھا دیتے۔ وہ سویکار کر لیتا تو نہال ہو جاتے۔ ہر چند کہ راجہ سیس نوا

کر، ہاتھ باندھ کر، نمستے کرتے ہوئے یہ سب لینے سے انکاری ہوتا مگر پرجا کب مانتی۔ ان کیلئے تو راجہ پربھو تھا، جتنی بھی سیوا کی جائے کم تھی۔ بعض پرش تو راجہ سے اتنا پیار کرتے تھے کہ آشیرباد حاصل کرنے کیلئے پیاری دھرتی، اچھوتی کنیا یا پھر نئی بیاہتا، راجہ کی سیوا کیلئے ارپن کرتے، راجہ ایسی بھینٹ لینی پسند نہ کرتا تھا مگر وہ اپنے اس پربھو کے سامنے زاری کرتے، بنتی کرتے کہ یہ سب سوئیکار کرلو، ورنہ جان دے دیں گے۔

پرتھوی میں اس راجہ، اس کے راجیہ اور اس کی پرجا کا چرچا تھا۔ بڑے راجہ کی پرجا ان سورگ باسیوں سے جلتی اسی لئے اس کے راجیہ کا نام بھی سورگ پڑ گیا اور اتہاس لکھنے والوں نے بھی یہ لکھ دیا اگر پرتھوی میں کہیں بھی سورگ ہے تو وہ یہی ہے، یہی ہے، یہی ہے!

راجا کہ پرجا کا پتا تھا تو پرجا سے ویسا ہی سلوک کرتا جیسا پتا اپنی سنتان سے، جس طرح کوئی بھی پتا اپنے بچوں کو بگڑتے اور سے برباد کرتے نہیں دیکھ سکتا اس طرح راجہ بھی یہ پسند نہ کرتا کہ لوگ فضول کاموں اور گندے مشاغل میں پڑ کر برے بن جائیں۔ برے، نکمے، خراب، گندے اور گھناؤنے کاموں سے دیوتا ناراض ہوتے ہیں۔ شریر میلا اور آتما گندی، اسی لئے اس نے راج میں کویتاؤں، چترکاری، راگ، ناچ، میلوں اور کھیلوں پر پابندی لگادی، اس میں بڑے گن تھے کہ یوں نہ تو سے برباد ہوگا اور نہ ہی بدھی، نہ شریر برباد ہوگا اور نہ ہی آتما۔ پرجا نے یوں بچایا گیا سے پتا سمان راجہ کی خدمت میں گزارے جانے پر خوشی خوشی یہ سب برداشت کیا۔

چندے یہی رہی تو حال یہ ہوگیا کہ سارے راج میں نہ کہیں سرجاگتے نہ شبد چہچہاتے، نہ رنگ نہ ان کی لیلا، نہ ناچ نہ اس کی مدھرتا، نہ کویتا نہ اس کے کارن کھلی آنکھ کے سپنے، اب دادی اور نانی رات کو بچوں کو لوری نہ سناتیں۔ سرائے میں اترے مسافروں کی رات کو الاؤ کے گرد کتھاؤں سے تواضع نہ ہوتی۔ پیا اب سندری کو پریم رس میں ڈوبے گیت نہ سناتا کہ یہ اپوترتا تھی، اپرادھ تھا۔

نہ جانے کیا کارن تھا کہ متر یار ایک دوسرے سے روٹھے سے رہنے لگے، کوئی بات نہ ہوتی مگر پھر بھی جھگڑنے لگتے، جیون بدمزہ سا، نہ پاپ نہ پن، بس یودھ ہی یودھ، بے کارن دھبدھا سی، مگر یہ چند سرپھروں کی وجہ سے تھا۔ جن کے ساتھ ویسا ہی سلوک ہوا جیسا کہ ان جیسے پاگلوں سے ہونا چاہیے۔ جب بندھی دانوں میں جگہ کم پڑی تو پاگل خانہ پیالہ کی طرح بھرنے بلکہ چھلکنے لگا۔

سورگ میں ناگ کا کیا کام؟

اور پھر انہونی!

جب پو پھٹے مہا پجاری مندر میں آیا تو یہ دیکھ کو اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے گویا باہر ابل پڑیں۔ مہامیّا کے گلے سے سچے موتیوں کی تمام مالائیں غائب، یہی نہیں بلکہ جمکیلی چاندی کے جو زیورات مہامیّا کو جگمگاتے تھے اب غائب تھے۔ مہا پجاری غش کھا کر گر نہ پڑا تو صرف اس لئے کہ وہ مہا پجاری تھا کچھ بھی ہو جائے مگر مہا پجاری غش کھا کر گرا نہیں کرتے۔

گھور اپنائے!

ایک اور مندر کا پجاری پھٹی آنکھوں سے کنواریوں کو سندرتا اور بانجھ استریوں کو بچہ دینے والی دیوی کو بے لباس دیکھ رہا تھا جس کے لکڑی کے سپاٹ سینے پر زرد رنگ کے دو بڑے دائروں کے بیچ سرخ رنگ کے چھوٹے دائروں کے درمیان سیاہ بندیا، اف! پجاری درد سے کراہا، دیوی کی یونی مٹی سے بھری تھی۔

مہا پاپ!

تیسرے مندر کے ہلدی جیسی رنگت والے پجاری کا نکلا سر پسینے سے بھیگا تو غلط نہ تھا کہ وہ جو دیکھ رہا تھا ایسا تو کبھی نرک کتھاؤں میں بھی نہ سنا گیا تھا، کمزور مردوں کو شکتی مان بنانے والے دیوتا کا لنگم کاٹ ڈالا گیا تھا مُنا دیوتا جسے بانجھ عورتیں چومتیں آنکھوں سے لگا لیتیں، جیبھ سے محسوس کرلیتیں، کاٹھ کے اس کھلونے کی مانند تھا جسے لاپرواہ بالک نے اکتا کر پھینک دیا ہو۔

مہا میّا کے گلے سے سچے
موتیوں کی تمام مالائیں
غائب تھیں

راجہ پر جا تراہ تراہ کر اٹھی۔

یہ کون ادھرمی تھا جو دیوتاؤں اور دیویوں کا یوں اپمان کر رہا تھا۔ کوئی بڑی بپتا آنے والی ہے، کوئی بڑی تباہی، باڑ، قحط، بھونچال، کچھ نہ کچھ ہونے کو ہے، مگر کیا؟

راجہ نے مہا پجاری کو ہون کا پربندھ کرنے کا کہا تاکہ جو کا اپمان ہوا ہے اس کا اپائے کیا جائے۔

ہاتھی ڈبا وَ کڑاھ اتنا پرانا تھا کہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ کتنا پرانا ہے۔ منوں لکڑیاں جلا کر منوں تیل کھولایا جاتا اور کھولتے تیل کے بلبلے چھبیہ بن کے ہر طرح کے بھید کھول دیتے۔ یہ ہاتھی ڈباوَ کڑاھ کبھی کبھی استعمال ہوتا تھا کسی بہت ہی بڑی درگھٹنا کیلئے یا پھر راجہ کیلئے یا راجہ کی سنتان کیلئے۔ بستی کے باہر، کھلے میں گویا جلتے جنگل کے اٹھتے بل کھاتے لہراتے شعلوں پر کڑاھ تیل سے بھر دیا جاتا اور پھر ٹھنڈا ہو جانے پر تیل بستی کے سورگ گھروں میں شردھا اور پوترتا کیلئے لے جایا جاتا کہ اُس تیل کی شکتی سے گھر سے بلائیں اور بیماریاں دور رہیں، نہ ہی جادو

ٹونے کا اثر ہونے پاتا اور اب اسی کڑاھ کے سامنے مہا پجاری آسن جمائے بیٹھا مسلسل منتر پڑھے جا رہا تھا، کھولتے تیل پر نظریں جمائے من میں منتروں کی شکتی اتار رہا تھا جواب آنے میں اتنی دیر، عجیب دھبد ھا سا تھا۔

مہا پجاری کے ساتھ راجہ بھی تناؤ کے عالم میں، دھوپ میں سنہری مکٹ دمک رہا تھا۔ گھنی مونچھوں نے ہونٹ چھپا رکھے تھے، اندر من کانپ رہا تھا، مگر باہر سے شانت راجہ تھا۔ اس لئے وہ اپنا خوف پرجا پر ظاہر نہ کر سکتا تھا کافی سے زیادہ سومرس پی کر خود کو مضبوط بنایا تھا پھر بھی یوں محسوس ہوتا تھا کہ دل پسلیاں توڑ کر اچھل کر باہر آجائے گا بلبلوں کے ساتھ نرت میں شامل ہو جائے گا۔

مہا پجاری گھبرا کر پیچھے ہٹا، راجہ نے بھی جھک کر دیکھا مگر مہا پجاری جو دیکھ رہا تھا، راجہ نہ دیکھ سکتا تھا، دھیرے دھیرے بلبلے نرت کے دائرے سمیٹ رہے تھے، حیرت سے پھٹی آنکھوں نے دیکھا کہ بلبلے مل کر چھبیہ بنا رہے تھے۔

مہا پجاری نے راجہ کو بتایا کہ راجیہ میں کوئی ایسا پاپی ہے جس کے پاپوں کے کارن دیوتا سخت ناراض ہیں۔ دیوتاؤں اور دیویوں کے ساتھ جو کچھ کیا گیا وہ کسی پرش کا کام نہیں بڑے سے بڑا ناستک بھی اتنا بڑا اپرادھ نہیں کر سکتا۔

''تو''؟ راجہ نے پوچھا

''یہ تو۔۔۔'' مہا پجاری کی زبان رک گئی۔

''پجاری جی جیسے بھی ہو آپ آنے والی درگھٹنا سے بچنے کا پربندھ کریں''

''بلی'' مہا پجاری نے اس لہجہ میں کہا کہ راجہ لرز گیا

بلی یا تو اس کنیا کی دی جاتی تھی جس کی نتھ میں موتی نہ پرویا گیا ہو یا تازہ جنم لئے بچے کی یا کسی بڑے پرش کی۔۔۔

''بلی'' راجہ نے یوں دہرایا گویا اس شبد کا ذائقہ محسوس کر رہا ہو ''ٹھیک ہے'' راجہ نے آگیا دی ''مگر بلی کیلئے کون پربندھ کرے گا، بلی آئے گی کہاں سے''

''راجہ جی اگرچہ میں نے آج تک بلی کا پربندھ نہیں کیا پرنتو بھوج پتروں کے انوسار ابلتے تیل کے بلبلے اشارہ کر دیتے ہیں کہ بلی کیسی ہونی چاہیے ساری پرجا ہون کے وقت موجود رہے تاکہ جس کی طرف اشارہ ہو اسے تیل کے کڑاھ میں ڈال دیا جائے''

جب بندھی دانوں میں جگہ کم پڑی تو پاگل خانہ پیالہ کی طرح بھرنے بلکہ چھلکنے لگا۔

''ایسا ہی ہوگا''

مہا پجاری اور راجہ سانس روکے، نیچے جھکے کھولتا تیل دیکھ رہے تھے۔ جہاں اب بلبلے واضح صورت اختیار کر رہے تھے۔ ہاں بلبلے بچے میں تبدیل ہو رہے تھے، بچے کی صورت واضح ہوتی جا رہی تھی۔ راجہ لرز گیا، بچے کی صورت جانی پہچانی سی تھی۔ یاد آ رہا تھا یہ اس بچے جیسے تھے جو سنگھاسن کے دعوی دار بھائی کے ہاں پیدا ہوا تھا، باپ بیٹا دونوں راجہ کے ہاتھوں میں مرے تھے۔ ہاں! ہاں! ایسا گول مٹول پیارا اور گپلو سا بچہ، آنکھیں مل کر راجہ نے دوبارہ کڑاہ میں جھانکا جہاں بلبلے دائروں میں تقسیم ہو رہے تھے چھوٹے دائرے میں بچے کا کٹا سر اور بڑے دائرے میں کٹا دھڑ۔ مہا پجاری یہ سمجھ نہ پایا کہ راجہ کا شریر کیوں کانپ رہا ہے۔

راجہ کو تیل خون میں تبدیل ہوتا نظر آ رہا تھا۔ گردن اور دھڑ اب مل رہے تھے جسم بن رہا تھا۔

پھر سب کچھ ایک چھن میں ہو گیا۔ ایسا چھن جس میں سے مر کر دوبارہ جنم پاتا ہے۔ بچے کی آنکھیں کھل رہی تھیں اور ساتھ ہی بند مٹھی بھی۔ بچہ اچھلا اور کڑاہ میں سے نکل کر راجہ کے سامنے آنے تک وہ بلوان بن چکا تھا اس نے کسی بچے کی طرح لرزتے راجہ کو بازوؤں میں لیا اور اسے لے کر ابلتے کڑاہ میں کود گیا۔ بلبلوں کا نرت جاری رہا۔

☆☆☆☆☆

محمد سعید شیخ، لاہور

لمبی جدائی

انتظار کی شدت جب اس کی برداشت سے باہر ہوگئی تب وہ اپنے گھر سے نکلی اور سمندر کے کنارے پانی میں پڑے بڑے پتھر کے اوپر آ کھڑی ہوگئی جس کا کچھ حصہ پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ جو کنارے سے ایک ڈیڑھ قدم کے فاصلے پر تھا اس طرف رُخ کر کے وہ کھڑی ہوگئی جدھر سے اس جہاز کے آنے کی خبر تھی جس میں اُس کے محبوب اُولے نے آنا تھا۔ جنگ کو ختم ہوئے کئی مہینے گزر چکے تھے دشمن اُن کے ساحلوں، سمندروں کو خالی کر کے جا چکا تھا۔ اور وہ فوجی جوان سب واپس آ چکے تھے جو جہازوں پر سوار ہو کر دشمن کے خلاف لڑنے گئے تھے اپنے ملک کی آزادی کے لئے۔ جنگ میں جو نوجوان مارے گئے تھے اُن کے نام بار بار اخباروں میں چھپ چکے تھے ان میں اوُلے کا نام نہیں تھا اس نے ایک ایک نام پڑھا تھا۔ فوجیوں کے دفتر جا کر پتا کیا تھا۔ اُولے کا نام کسی لسٹ میں نہیں لکھا تھا اسی لئے کھاری کی اُمید زندہ تھی اُولے کے واپس آنے کا اُسے اسی لئے شدت سے انتظار تھا۔

وہ گھر میں تھی تو اُسے ہر پل کسی آہٹ کا، کسی دستک کا انتظار رہتا تھا۔ ایک مدت سے اس کے کان کسی دستک پر لگے تھے جسے اُس کی سماعت نے فورا پہچان لینا تھا۔ اور پھر جب انتظار کی یہ شدت اس کی برداشت سے باہر ہوگئی تب وہ گھر سے نکل آئی اور خواب کی سی حالت میں چلتی وہ ساحل پر آ گئی اور اس پتھر پر چڑھ کر کھڑی ہوگئی اور دور رات کی خاموشی میں پھیلے سمندر کے سینے پر دور سے تیرتے آتے کسی جہاز کی روشنیاں تلاش کرنے لگی جس کے عرشے پر اُولے اُسے دیکھتا ہوگا ساحل پر پانی میں پڑے پتھر کے اوپر کھڑے انتظار کرتے اُسے دیکھتا ہوگا۔ شروع شروع میں صبح سویرے ساحل پر پہنچ جاتی تھی پھر رات کو بھی وہاں جا کر کھڑی ہونے لگی انتظار کرنے لگی

ایک مدت سے اس کے کان کسی دستک پر لگے تھے جسے اُس کی سماعت نے فوراً پہچان لینا تھا۔

جب وہ گھر لوٹ آتی تو اپنے بستر پر بھی وہ بے چین رہتی بند آنکھوں سے وہ سمندر کو دیکھتی رہتی۔ پھر اس خیال سے پریشان ہونے لگی کہ کہیں اگر وہ اس کی غیر موجودگی میں آگیا تو اُسے ساحل پر سمندر کے کنارے انتظار کرتا نہ دیکھ کر کتنا پریشان ہوگا۔ جو کوئی بھی اُسے سمندر کی جانب جاتے دیکھتا تو ضرور پوچھتا آگیا تیرا اُولے۔؟

''بس آنے ہی والا ہے۔ آج نہیں تو کل۔ مجھے پتا ہے وہ ضرور آئے گا یہ دل گواہی دیتا ہے وہ بڑے اعتماد سے جواب دیتی کہ اس کا دل گواہی دیتا ہے اس کا یقین ماند نہیں پڑا مگر دیکھنے والوں نے آہستہ آہستہ پوچھنا بند کر دیا اُسے سمندر کی طرف جاتے دیکھ کر دل ہی دل میں افسوس کرتے مگر کسی میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ اُسے کہہ سکتا۔ نہیں کھاری تمہارا اولے نہیں آنے والا جس نے آنا تھا وہ آچکے۔ کبھی کبھی وہ اپنے کسی جاننے والے کو راستے میں روک لیتی اور اُس کا بازو پکڑ کر اُسے یقین دلاتی۔ جب اولے آئے گا تو میں اُسے تم لوگوں کے پاس لاؤں گی ہم سب اس سے جنگ کے حالات سُنیں گے۔ وہ اپنی بہادری کی داستانیں سُنائے گا وہ ہمیں بتائے گا کہ اس نے کس طرح دشمنوں کو مار بھگایا تھا میں اس کے آنے کی تم سب کو خبر دوں گی۔ تم اُسے بتانا ہماری قوم کو اس پر، اس کی بہادری پر کتنا فخر ہے۔

سورج کا پیلا تھال ہر شام اس کی نظروں کے سامنے سمندر کی گہرائیوں میں اتر جاتا تھا۔

ہاں ہاں ہم ضرور بتائیں گے اُسے سب کچھ بتائیں گے اور یہ بھی کہ تم نے اس کا کتنا طویل انتظار کیا۔ وہ بڑبڑاتی آگے بڑھ جاتی لیکن اس کا انتظار ختم نہیں ہوا یہاں تک کہ وہ وقت کا احساس تک بھول گئی اپنی نظریں دور اُفق پر گاڑے کھڑی رہتی جہاں سمندر اور آسمان آپس میں ملتے تھے اور جہاں سورج کا پیلا تھال ہر شام اس کی نظروں کے سامنے سمندر کی گہرائیوں میں اُتر جاتا تھا اور جدھر سے جہازوں نے شاید راستے بدل لئے تھے۔ وہاں کھڑے کھڑے اس کا سارا وجود اس کے سنہری بال سمندر کی ہوا میں لہلہاتے تھے۔ اس کے لُوں لُوں سے آنکھیں اُگ آئی تھیں جواب جھپکتی نہیں تھیں۔ انتظار اور فراق کی شدت اور کربنائی تہہ در تہہ سمندر کے پانی میں نمک کی طرح اس کے جسم پر چڑھتی گئی۔ دن، رات، صبح، شام، دھوپ، بادل، بارش سب ایک ہی موسم میں بدلتے گئے اور وہ انتظار کے موسم میں مجسم ہوگئی اس کا لباس اس کے جسم

اس کا لباس اس کے جسم کے مسام میں جذب ہو گیا
وہ مجسمہ بن گئی کہانی بن گئی۔

کے مسام میں جذب ہوگیا وہ مجسمہ بن گئی کہانی بن گئی۔ اور پھر جو کوئی ساحل پر آتا وہ اس مجسمہ کو دیکھنے کے لئے آتا۔ اس طرف سے حکام نے جہازوں کی گودی سمندر کے دوسری جانب منتقل کردی اور وہاں جہاں جل پری کا مجسمہ ایستادہ تھا اس کے پاس ساحل کے ساتھ پارک بنا دیا گیا۔ جس کسی کو بھی محبت کے اظہار کی ضرورت محسوس ہوتی اور جو کوئی اپنی کھوئی ہوئی محبت کو یاد کرنا چاہتا وہ اس طرف کو نہیں بھولتا تھا۔

شاید وہ تھک کر پتھر پر بیٹھ گئی تھی اور پھر وقت کے دباؤ سے اس کی دونوں ٹانگیں مل کر اس کا نچلا دھڑ بن گیا تھا اور یہ دھڑ مچھلی کا روپ تھا کمر سے اوپر وہ اب بھی عورت تھی جس کے اندر اب بھی کہیں انتظار کی جوت جلتی تھی اور اس کے اندر روشنی پھیلاتی تھی۔ اس مجسمہ کے آس پاس بیٹھے لوگ محبت کی باتیں کرتے تھے ایک دوسرے سے محبت کا اظہار کرتے تھے جب سمندر کی لہریں اُچھلتی تھیں تو کوئی ایک آدھ لہر اُچھل کر اس پتھر کو اپنی آغوش میں لے لیتی تھی اور جب واپس جاتی تھی تو کھاری کے مجسمے پر قطرے چمٹے رہ جاتے تھے اور پھر ایک ایک کر کے اس کے جسم سے شیشے کے ٹکڑوں کی شکل میں گرتے رہتے تھے۔ موسم کی تبدیلیاں اور سختیاں سہہ سہہ کر اور دھوپ میں جل جل کر اس مجسمے کی رنگت سیاہی مائل سنہری ہوگئی تھی۔ جیسے دھوپ کی تپش میں پک کر گندم کی بالیاں سنہری ہو جاتی ہیں جیسے سبز آموں کا رنگ پک پک کر گرم، پیلا اور میٹھا ہو جاتا ہے انتظار کی شدت اور لذت نے اُسے کھاری سے جل پری بنا دیا تھا انسان سے کہانی بنا دیا تھا۔

☆☆☆☆☆

پروین عاطف، لاہور

اپریشن "سیٹلمنٹ"

بہت پہلے تو جھمرا گاؤں کے اردگرد سوائے سرسبز و شاداب ہریالی اور پانی کی جھر جھر بہتی جھالوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ چھتنارے جامن شہتوت' امرودوں اور پیپل کے پیڑ تو قدرتی تھے کسی نے سوچ' فہم یا پروگرام سے انہیں کبھی گاڑا بھی نہ تھا۔ نہ ہی وہاں کے لوگوں میں سے کوئی بتا سکتا تھا کہ ان ہرے بھرے جنگلوں کے بیچ' پانی کی چھوٹی چھوٹی جھالیں' یا "سوئے" کن پہاڑوں سے اتر کر آئے تھے۔ اس بارے میں سوالات یا بحث مباحثے کی بھی کسی کو ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔

جنگل پار مشرق کی طرف ایک اور گاؤں تھا۔ "کالا" جس کے بارے میں مشہور تھا کہ شروع شروع میں وہ گاؤں ایک بھبھوت ملے کالے سیاہ فقیر نے آباد کیا تھا۔ جس کے نام پہ گاؤں کا نام کالا بن گیا۔ آبادیاں تو دونوں گاؤں کی روز بروز بڑھتی جا رہی تھیں لیکن ایک دوسرے سے مکمل تعاون اور میل ملاقات میں بھی کسی طرح کی کوئی کمی نہ تھی۔ دونوں گاؤں کے بزرگوں کے لکڑی کے پرانے صندوقوں میں کچھ پرانی جائیدادوں کے ملکیتی کاغذات بھی موجود تھے۔ جو یہ ثابت کرتے تھے کہ وہاں کے لوگ پرکھوں سے اپنے اپنے گھروں اور زمینوں کے مالک تھے لیکن زمین یا گھر بیچ کر کسی اور جگہ چلے جانے کا کسی کو کبھی خیال بھی نہ آیا تھا۔ غریبی امیری کی کھینچا تانی سے الگ "جھمرا" اور "کالا" کے لوگ مکمل طور پر مطمئن زندگی گزارتے تھے۔ شہر لاہور ان دونوں گاؤں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ لیکن کام کاج یا کسی خصوصی ضرورت کے علاوہ لاہور جانے کا شوق بہت کم لوگوں کو تھا کبھی شہر جانے کا موقع ملتا تو پرانے لوگ تو وہاں کے رش' دھوئیں' اور بھاگم بھاگ سے توبہ توبہ کرتے واپس آ جاتے تھے۔ ایسی سرسبز و شاداب کھیتوں' باغوں اور درختوں سے گھری آبادیوں کو چھوڑ کر سیمنٹ' اینٹوں سے گھڑے شہر لاہور میں کثافت اور شور کے سوا تھا بھی کیا........

چند پڑھے لکھے نوجوان جو علی الصبح اپنی ملازمت کی مجبوری کے تحت لاہور جاتے واپسی پر اس طرح تھکے ہارے مڑتے جیسے انہیں کسی نے اوکھلی میں ڈال کر کوٹ ڈالا ہو۔

وہ گاؤں ایک بھبھوت ملے کالے سیاہ فقیر نے آباد کیا تھا

پورے جھمرا میں ایک چاچا فضل کریم پھل والا تھا۔ جسے لاہور جا کر پھل بیچے بنا چین نہیں ملتا تھا۔ بال بچہ کچھ بھی نہیں تھا لیکن یہ شوق یا جذبہ اسے چین نہ لینے دیتا کہ پیسے جوڑ کر اپنے تین مرلہ گھر کے اوپر دو کمرے بنا لے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ فضل کریم نیا گھر اس لیے تعمیر کرنا چاہتا تھا کہ ایک اور نکاح کرے......ابھی تک تو بیوی کے فوت ہونے سے پہلے اور بعد میں اگر کوئی اس کی دلی توجہ کا باعث تھا تو وہ اس کے گھر کے آنگن میں کھڑا آم کا پیڑ تھا۔ جو موسم پہ آتا تو وہ اس کے رس بھرے میٹھے آموں سے ریڑھی بھر کر لاہور کی ملحقہ چھاؤنی بیچنے چلا جاتا......اور باقی سال اس کی خدمت میں جتا رہتا۔

فضل کریم کا دوسرا شوق شہر سے سنسنی خیز خبریں اٹھا کر لانا تھا۔ شام کو اپنے آنگن کے پیڑ سے ٹیک لگا کر بیٹھتا تو لوگ اس کے گرد باتیں سننے اس طرح جمع ہوتے جیسے وہ کسی سینما میں آئے ہوں......

''لاہور کے ایک کالج کے باہر لڑکوں نے لڑکی کو چھیڑا تو سپاہیوں نے ڈنڈے مار مار کر کمریں توڑ دیں ان کی......''

''ایک اندھے فقیر کو جانتا ہوں میں چھاؤنی میں جس کی دونوں آنکھیں سلامت ہیں۔''

''بھوک سے تنگ آ کر ایک شخص نے منٹو پارک سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔ وہ چسکے لے لے کر سناتا۔''

وہ اور نوراں ایک دوسرے کو آنکھوں میں اشارے کرتے

اب یہ تو فضل کریم کو یاد نہیں تھا کہ صحن کے وسط میں آم کا پیڑ اس کے پرکھوں میں سے کس نے اپنے ہاتھوں سے لگایا ہو۔ اس کے کسی دیوانے جھونکے نے کہیں سے آم کا بور لا کر وہاں جما دیا۔ بس اسے تو اتنا یاد تھا کہ بنٹے کھیلنے کی عمر سے لے کر چودھویں کی چاندنی رات میں اپنی دلہن کا گھونگھٹ اٹھانے تک یا پھر سگی ماں کا جنازہ اس کی چھاؤں میں رکھنے تک اس کی زندگی کے ان گنت نشیب و فراز اس نے اس گھنے پیڑ کے سائے میں گزارے۔ سر شام جب وہ اس پیڑ کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھتا تو اسے لگتا کوئی اس کی کمر تھپتھپا رہا ہے۔ چرند پرند بھی کنگنی باجرہ کھانے شام کو فضل کریم کے گرد جمع ہو جاتے۔

اپنی بیوی نوراں کی چاہت کا پہلا پہلا پیغام بھی اسے عنفوان شباب میں لکن میٹی کھیلتے ہوئے وہاں ہی ملا تھا۔ شادی کے بعد چاند چودھویں کا ہوتا تو بے بے کی آنکھ لگتے ہی دونوں وہ اور نوراں ایک دوسرے کو آنکھوں آنکھوں میں اشارے کرتے محبتوں کے کھیل رچانے اس پیڑ کی گھنی شاخوں تلے پہنچ جاتے۔ وہ پیڑ اسے اپنی اس پختہ عمری میں بھی ایسے لگتا جیسے اس کے خاندان کا کوئی بزرگ ہو۔ فضل کریم کی زندگی پر گزرنے والی ہر نرمی سختی کا گواہ۔ نوراں کی جوانا مرگ اور بے بے کے چلے جانے کے بعد اسے وہ درخت پہلے سے بھی زیادہ پیارا لگنے لگا تھا اسے لگتا وہ اس کے آنگن میں موجود اس کا سب سے بڑا رازداں تھا۔ فضل کریم کا اپنے گھر کے پیڑ سے لگاؤ کے بارے میں گاؤں کا بچہ بچہ واقف تھا۔

جھمرا اور کالا کی آبادیوں کے کنارے کنارے ایک ہرا بھرا باغ تھا جس کے بیچوں بیچ قدرتی سوئے اور جھالیں بہتی تھیں۔ جن کی نہ کسی کو تاریخ کا علم تھا نہ جغرافیے کا۔ ان کے حسن اور شادابی نے تو لاہور چھاؤنی کے علاقے کو بھی رنگ لگا دیئے تھے۔ برسات زوروں پہ ہوتی۔ کالے بادل اٹھکیلیاں کرتے کہیں دور پار سے آتے تو نہ صرف چھاؤنی بلکہ شہر کے گنجان آباد اندرونی علاقوں سے بھی لوگ نارنگ باغ کی ٹھنڈی تر و تازہ ہواؤں میں پکنکیں منانے چلے آتے......

جامن، آم اور امرود کے پیڑ نارنگ باغ میں کسی نے کب اور کیوں لگائے تھے کوئی کچھ نہ جانتا تھا کالا اور جھمرا کے لوگوں کو تو بس اتنا ہی پتا تھا کہ وہ سارے پیڑ اوپر والا پھلوں سے اس لیے لادتا تھا کہ وہ ان کی موج لوٹیں آپس میں برابر کی تقسیم ہو اور آپسی سانجھ کی گرہیں روز بروز مضبوط ہوتی جائیں۔ ملکیتوں کا لوبھ بھی ان سب کے خون کی گردش نہیں بنا تھا۔

کالا جھمرا کے لوگوں کو تو یہ بھی یقین تھا کہ باغ کے کل چرند پرند مور چنور بھی ان کے اپنے ہی تھے......

لیکن وہاں سے بھی ان کو اگلی ہی صبح نکال دیا گیا

پھر ایسی ہی ایک بھری برسات میں عجیب کچھ ہوا چھاؤنی کے کونوں کھدروں میں آباد وہاں کے کمینوں کی آبادی کو گدھا گاڑیاں بھر بھر کر جھمرا اور کالا کے کناروں پہ آباد ہونے کے لیے بھیج دیا گیا کچھ لوگوں نے تو نارنگ باغ پہنچتے ہی اپنی گدھا گاڑیوں کا سامان وہاں الٹ دیا کہ باغ کی شادابی میں ڈیرہ لگائیں گے لیکن وہاں سے بھی ان کو اگلی ہی صبح نکال دیا گیا کہ باغ کی زمین ان سب کے لیے نہیں تھی۔

جھمرا، کالا کے لوگ گھبرائے انہیں گاؤں کی زمین کا لالچ نہیں تھا۔ بس وہ پرکھوں کے وقتوں کی

ایک ٹھہری ہوئی خصوصی رہن سہن کے عادی تھے۔ انہوں نے اچانک آنے والوں سے وہاں آنے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا وہ صدیوں سے لاہور چھاؤنی کے کونوں کھدروں میں پڑے وہاں کے چھوٹے موٹے کام نبھاتے تھے۔ انہیں چھاؤنی کی امداد کے لیے وہاں برسوں پہلے گوری فوج نے آباد کیا تھا۔ لیکن اب فوج نے حکم دیا ہے کہ چھاؤنی تنگ پڑتی جارہی ہے اس کا پھیلاؤ ازحد ضروری ہے۔ ہندوستان چھاؤنیاں بڑھاتا جارہا ہے۔ ملکی حالات مخدوش ہیں ہندوستان کے مقابلے میں ہمارا خبردار رہنا ضروری ہے۔ ہندو فوج ہر بارڈر پہ کھڑی دانت نکوستی ہے۔ بڑے بڑے گھمسن گھیر اسلحے خریدتے ہیں وہ..... فی الحال ہم سب لوگ جھمرا' کالا چلے جائیں۔ جب حالات بہتر ہوں گے تو پھر ہم سب کو کسی کھلے علاقے میں آباد کر دیا جائے گا۔

فوج کے پاس جس چیز کی سب سے زیادہ کمی تھی۔ وہ وقت تھا۔

جھمرا اور کالا کے لوگ کچھ بھی نہ سمجھے سوائے اس کے کہ وہاں نئے آنے والے لوگوں کو سنبھالا دینا' ان کی مجبوری تھی اور وہ انہیں وہاں بس جانے کی اجازت دینے کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ خواہ وہ تنگ ہوں یا بیزار۔

چاچا فضل کریم پھل والے نے بھی گاؤں میں نئے آنے والوں کی بات کی تصدیق کر دی کہ چھاؤنی کے کناروں پہ اس نے بہت سی جھگیوں اور کواٹروں کو بلڈوزر سے ریزہ ریزہ ہوتے دیکھا ہے اور فوج کے چاک وچوبند سپاہی ہر خالی جگہ پر نئی عمارتوں کی نیویں ڈال رہے ہیں۔ جھمرا کی اکیلی سکھ فیملی نے جو 1947ء کے شدید ترین فسادات میں بھی جان و مال کا ہر خطرہ سہہ کر اپنی جنم بھومی پہ بیٹھی رہی تھی۔ لوگوں کو تسلی دی کہ چھاؤنی پھیلے گی تو کاروبار بڑھے گا فائدہ تو ہمارے ہی نوجوانوں کا ہوگا جو گھر کے نزدیک کام ڈھونڈ سکیں گے۔ سکول اور قریب ہوں گے تو کوئی ہمارے بچوں میں سے بھی چار جماعتیں پڑھ جائے گا۔ پڑھ جائے گا تو ہماری ترقی ہوگی۔

پر ایسا سب ہونے کے لیے تو وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ صبر کے ساتھ انتظار کرنا پڑتا ہے اور فوج کے پاس جس چیز کی سب سے زیادہ کمی تھی۔ وہ وقت تھا۔ پھر ایسا ہوا جس کا کسی کو تصور بھی نہیں تھا ایک روز صبح کا تارا ابھی آسمان پہ دگ دگ دھک رہا تھا کہ صوبیدار خدا یار ایک بڑی فوجی نفری لے کر نارنگ باغ کی طرف آیا اور ایک بڑے مشینی کٹر کے ذریعے باغ کے برسوں پرانے پیڑ جڑوں سے

اکھاڑنا شروع کر دیئے۔ شریہہ اور پیپل کی بات اور تھی گاؤں والوں نے جب دیکھا کہ جامن اور امرود کے پیڑ بھی زمین کے ساتھ زمین ہو گئے ہیں تو پورے گاؤں میں ہاہا کار مچ گئی پھلوں سے لدے ان پیڑوں نے تو نسلوں سے ان کے ہاتھ تھام رکھے تھے تنگی ترشی یا کال میں گھروں میں کبھی رزق کی کمی محسوس ہوتی تو پیڑ انہیں جھولیاں بھر بھر پھل دے دیتے۔

جرگے کے کچھ لوگ احتجاج کرنے صوبیدار کے پاس پہنچے۔ سرکار یہ پیڑ ہماری نسلوں کا تحفظ ہیں ان داتا ہیں ہمارے رحم پر رحم کیجیے تو اس نے کہا وہ صرف حکم کا بندہ تھا اور جو کر رہا تھا اپنے بڑوں کے آرڈر پہ کر رہا تھا۔ حکم ملا سوائے چند ایک پپلوں اور برگد کے۔ باغ میں کوئی پیڑ باقی نہ بچایا جائے میں تو حکم بجا لا رہا ہوں میرا آپ لوگوں سے کوئی لینا دینا نہیں...... سننے میں یہی آیا ہے کہ چھاؤنی پھیل کر بستیوں سے آگے نکل جائے گی...... بہت بڑی ہو جائے گی۔

جھمرا' کالا یا بھاگ پورہ وغیرہ کے گاؤں کے باسیوں کے ساتھ صدیوں سے اسی طرح ہوتا آیا تھا۔ بڑے شہر والوں کا ازل سے ایسا ہی وطیرہ تھا۔ وہ جب کوئی ایسا فیصلہ کرتے جس سے گاؤں والوں کی زندگیاں یا شب و روز اتھل پتھل ہو جائیں تو وہ کبھی سوچتے بھی نہیں تھے کہ ان کے سائے میں آباد گاؤں والوں پر کیا بیتی۔ یا کیا بیتنے والی ہے...... یا وہ فیصلہ کرنے سے پہلے اپنے دیہاتی بھائیوں سے مشورہ کر لیں کہ ہمارے خود کردہ فیصلوں کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔

باغ کی سرسبز و شاداب زمین وہاں کی جھالوں اور ندیوں سمیت جرنیلوں اور بریگیڈیئروں کو اپنے بنگلوں کے لیے درکار تھی اور بس۔ یہ انہوں نے پہلے سے سوچ رکھا تھا کہ گاؤں والے شور مچائیں گے تو دو دو ہزار روپیہ فی خاندان انہیں ادا کر دیا جائے گا اور ہمارے جوتوں کی مضبوط دھمک انہیں خاموش کر دے گی۔ بریگیڈیئر فتح محمد نے گاؤں والوں کے رونے دھونے کی خبر سنی تو روپوں کی تھیلی سمیت وہاں خود آن پہنچے اور دونوں آبادیوں کو اکٹھا کر کے سمجھایا کہ ایک تو چھاؤنی بڑی ہو جانے کی بنا پر ان سب کو ملازمتیں حاصل ہو جائیں گی۔ دوسرے ملک کے دشمن کی طاقت ان کے تصور سے بھی کہیں زیادہ تھی۔ چھاؤنی در چھاؤنی اس نے فوج کی تعداد ایسی کر دی تھی کہ عوام کی حفاظت خطرے میں پڑ چلی تھی۔ ہم ان کا پورا مقابلہ تو نہیں کر سکتے جہاں تک ممکن ہوا' اپنی مدافعت کا سامان کریں گے اس میں آپ ہمارے مددگار اسی طرح ہو سکتے ہیں کہ باغ کی زمین پاک فوج کے حوالے کر دیں اور اگر دشمن یہ سمجھے کہ ہم اس کی اتھاہ ترقی کی خبر سن کر بھی جوں کے توں بیٹھے رہتے ہیں تو وہ مزید شیر ہو جائے گا۔

ہاں! بریگیڈیئر نے اپنا دایاں پاؤں ایک کٹے ہوئے پیڑ کے تنے پر رکھتے ہوئے مہربانی کے لہجے میں کہا۔ جنرل صاحب کا حکم ہے کہ جھالیں اور سوئے جو باغوں کے بیچوں بیچ بہتے ہیں جوں کے توں رہیں گے۔ تا کہ آپ سب کو پانی کی کمی کا احساس نہ ہو۔ اصل میں تو فوجی اپنے گھر انہی جھالوں

کے کنارے تعمیر کرنا چاہتے تھے۔

اس شام جھمرا کے کچھ لوگ بے وجہ کالا کا چکر لگانے گئے اور کالا کے جھمرا لیکن دونوں گاؤں میں عجیب طرح کا تکدر اور چپ چھائی تھی جیسے اچانک کسی پہنچے ہوئے بزرگ کی موت ہو گئی ہو؟ لوگ ایک دوسرے سے بے وجہ پوچھے جا رہے تھے تم ٹھیک تو ہو نا؟

پختہ عمروں کے کچھ مردوں نے اس رات اپنے اپنے گھروں کی کمزور روشنیوں میں اپنے اپنے پرانے صندوقوں میں سے قانونی کاغذات کی کچھ میلی پوتھیاں نکالیں اور کاغذات اوپر نیچے کر کے اپنی اپنی ملکیتوں کے نشانات ڈھونڈنے لگے۔ پر تعلیم یافتہ شخص تو دونوں دیہاتوں میں کوئی بارہ کوس دکھائی نہ دیتا تھا ان حفاظت سے پڑی پوتھیوں سے وہ کیا تلاش کرتے......

اس شام جھمرا کے کچھ لوگ بے وجہ کالا کا چکر لگانے گئے

وہ تو ایک ہفتے بعد جب منیرے لوہار کا بیٹا سیالکوٹ سے مڑا اور انہوں نے اسے اپنے اپنے کاغذات دکھائے تو انہیں علم ہوا کہ کالا اور جھمرا کے باغات سمیت بہت سی زمین ان کے پاس ان کے پرکھوں کی امانت ہے اور جنرل احسان نے اسے اپنی تحویل میں کس قانون کے تحت لیا وہ کچھ نہ سمجھ سکے۔

بس ایک چاچا فضل کریم تھا جو صوبیدار صاحب کی بات دہراتا تسلی کی خاطر ہر ایک کو کہتا پھرتا۔ فوج والے مزید چھاؤنیاں تعمیر کرنے پر مجبور ہیں ملک کو اندر سے بھی خطرہ اور باہر سے بھی جب سے ملک معرض وجود میں آیا ہے دور نزدیک ہمسایوں کے سینوں پر سانپ لوٹتے ہیں۔ اب تم ہی کہو بھائی وہ کونسا مائی کا لعل ہے جو اپنی دھرتی کو خطرے میں دیکھ کر قربانی دینے سے گریز کرے۔ یوں بھی گاؤں والوں کو بے حد تفاخر تھا اپنی فوج پر اپنے لڑکوں سے وہ ہمیشہ یہی کہتے دو چار جماعتیں پڑھ جاؤ تمہیں فوج میں بھرتی کرا دیں۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے دنوں میں باغات کٹے پر اس طرح کہ ہریالی کے کچھ شاداب قطعے اور جھالیں اور نالے جوں کے توں بہتے رہیں اور افسران کے بنگلے ان کے کنارے کنارے تعمیر ہو جائیں۔ بنگلے اور کوٹھیاں جو وہاں دنوں میں کھڑی ہو گئیں ایسی کہ پل بھر تو انسان جانے وقت کی مشین اٹھا کر لے

دو چار جماعتیں پڑھ جاؤ تمہیں فوج میں بھرتی کرا دیں

کسی آنے والی صدی میں لے گئی ہو۔ چھمرا ایسی رنگارنگ کیکوں پیسٹریوں سے ملتی جلتی کہ جانو انسان کسی کیک پیسٹری کی دکان میں گھس گیا ہے تو پھر باری باری یہ بات گاؤں کے کئی دلوں میں آئی کہ خطرے میں گھرے ملکوں کے پاسبان' کیا ایسی ہی طلسماتی فضاؤں میں رہنے کے پابند ہوتے ہیں؟

جھمرا اور جنرل صاحبان کی بستی کا درمیانی فاصلہ تو صرف ایک معمولی سی جھال تھی۔ جس کے اوپر فوج نے لوگوں کے آنے جانے کے لیے لکڑی کے چھوٹے چھوٹے پل تعمیر کر دیئے تھے۔ چاچا فضل کریم اب باغوں سے پھل تو نہیں خرید سکتا تھا۔ بس کا غذات کی جانچ پڑتال کے بعد فوج نے جو تین تین ہزار روپیہ تلافی کے طور پر سب لوگوں میں تقسیم کیے تھے اسی میں سے آٹھ سو ہزار کے پھل ریڑھی پر بھر کر اپنی دہاڑی پوری کرتا۔ باغ نیست و نابود ہونے کی وجہ سے اتنا ہوا تھا کہ دوسری آبادیوں میں پہنچنے کی خاطر اب اسے ریڑھی سمیت کئی گھمن گھیر طویل پگڈنڈیوں میں سے گھوم کر آنا جانا پڑتا تھا......

جھمرا اور جنرل صاحبان کی بستی کا درمیانی فاصلہ تو صرف ایک معمولی سی جھال تھی

جوں جوں ملک میں چھاؤنیاں بڑھتی جاتیں خطرات بھی اندر باہر سے دو چند ہوتے جاتے۔ اسلحے کی اور مزید فوجی نفری کی ضرورت بڑھتی جاتی۔ کالا اور جھمرا کے لوگ تو جیسے باغوں کی کٹائی اور کنکول کی طرح پھیلتی رینگتی چھاؤنی کی وجہ سے بندی خانوں میں بند ہو کر رہ گئے تھے۔ نہ درختوں سے چھن چھن کی آنے والی ترو تازہ ہوائیں نہ چرند پرند مور' چنور کی خوش الحان آوازیں دھوئیں بدبو سے آنکھ او جھل نالوں جھالوں میں صبح و شام نہانا' گانے بجانے' تاش' شطرنج کی محفلیں' گپ بازی...... سب کچھ ہوا ہو گیا۔

ان آبادیوں کے منہ پر تین جنگیں گذر چکی تھیں چھتنارے پیڑوں اور گھنی ہریالیوں نے انہیں اس طرح ڈھانپے رکھا جیسے ماں خطرہ دیکھ کر اپنے بچوں کو ڈھانپتی ہے بیگانے تو بیگانے اوپر اڑتے اپنے جہاز بھی نہ دیکھ سکے نیچے لوگوں کی آبادیاں تھیں۔

جھمرا اور کالا کے لوگوں کے بھانویں تو جیسے کسی نے ان کی زندگی کو اغوا کر کے دھات اور پتھر کے زمانے میں ڈال دیا تھا پھر بھی وہ ایک دوسرے کو تسلیاں دیتے یہی کہتے کہ اعمال کی بھگتن ہے۔ اوپر والے نے ہمیں انعام و اکرام سے مالا مال کیا ہم دو زانو بیٹھ کر ٹھیک طرح سے شکرانہ تک ادا نہ کر سکے اب ہم گمشدہ بچوں کی طرح اپنا ٹھکانہ تلاشتے ہیں۔

صوبیدار تو اپنی وفاداری اور خدمت گاری سے مہینے دو مہینے کے اندر ریٹائر ہونے سے پہلے کپتانی کے بلے اپنے کندھوں پہ لگانے والا تھا۔ایک دن بڑے فوجی ٹرک میں بیٹھ کر جھمرا آ پہنچا۔

ہم لوگوں کی زندگیاں اپنی اپنی پرانی چھتوں سے بندھی ہیں

پنچائیت کا کٹھ کر کے بولا ...... ملک کی قسمت میں چین سکون کہاں بیرونی ہاتھ ہے جو انتہائی پر اسرار طریق سے ہمارے گلی کوچوں تک پہنچتا ہے اور خوفناک نفاق ڈالتا ہے۔ شمالی علاقوں میں آگ روز بروز تیزی سے بھڑک رہی ہے۔ ہمارے جری نوجوان افسران کا ایک بڑا جتھا وہاں طویل عرصے کے لیے جارہا ہے ان کے پیچھے چھوڑے خاندان تنہا ہو جائیں گے۔ جنرل صاحبان کا یہ فیصلہ ہے کہ پوری قوم کے ان رکھوالوں کے خاندانوں کو کسی ایسے علاقے میں رکھا جائے جو جنرل صاحبان اور بریگیڈیئر صاحبان کے بنگلوں کے نزدیک ہو جیسا کہ آپ جانتے ہیں حضرات جنرل صاحبان اور بریگیڈیئر صاحبان قریبی باغوں کے علاقے میں آباد ہیں تو اسی لحاظ سے جھمرا گاؤں کا علاقہ ان بڑے افسران کی کالونی کے نزدیک ترین پڑتا ہے ...... یہ بھی فیصلہ کیا گیا ہے کہ آپ سب کو اپنی ان دو تین مرلہ جگیوں کے بدلے تین تین مرلہ زمین اور تین تین ہزار روپیہ کالا گاؤں کے مشرق میں دی جائے گی۔ کیمپس پر دیکھیں تو یہ زمین......

پھر اس کے بعد پوری پنچائیت اور ان لوگوں میں جو مشاہدے کی خاطر دروازوں کھڑکیوں میں لٹکے تھے بھڑوں کے چھتے کی طرح ایسی نہیں نہیں کا آغاز ہوا کہ صوبیدار بھی ہکا بکا رہ گیا۔

ہم لوگوں کو کسی قسم کی منہ مانگی قیمت یا جنرل صاحب کے تین تین ہزار کی ضرورت نہیں۔ شیخ عنایت اللہ پنچ نے کہا۔

ہم لوگوں کی زندگیاں اپنی اپنی پرانی چھتوں سے بندھی ہیں ...... ہمارے خواب، خواہشیں اور عیش وعشرت وہ یادیں ہیں جو ہمارے بڑوں اور ہماری اپنی ہستیوں سے وابستہ ہیں۔ ہمارے دینوی آرام اور خوشی وہ سانجھ ہے جو ہمیں پرکھوں سے اپنے گاؤں میں میسر ہے۔

بھائیو! پھر بھی ان فیصلوں کو جو جرنیل صاحبان اپنی سمجھ بوجھ سے دور دفتروں میں بیٹھ کر کرتے ہیں جھٹلانا، کسی عام شہری کے بس میں نہیں ہوتا۔ صاحب مہربان آدمی ہے اس نے سوچنے کے لیے تم

یہ سب اس روٹی کپڑا اور مکان کے جھوٹے نعرے کا نتیجہ ہے

لوگوں کو چار دن دیئے ہیں۔ صوبیدار نے کہا اور اپنے بڑے بڑے فوجی بوٹ زمین پر مارتا اپنے یونٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔

جنرل صاحب نے جب جھمرا گاؤں والوں کے ردعمل کے بارے میں بات سنی تو مسکرائے۔ اپنے بریگیڈ کمانڈر سے کہا یار! یہ سب اس روٹی کپڑا اور مکان کے جھوٹے نعرے کا نتیجہ ہے کہ آج چھوٹے سے چھوٹا آدمی بھی ہمیں آگے سے آنکھیں دکھاتا ہے اگر کوئی پریشانی ہے تو ان باسٹرڈ اخبار نویسوں کی جو ییلو (Yellow) جرنلزم کرتے ہیں کونوں کھدروں میں سے سکینڈلز نکالتے ہیں ہمارے یا بے چارے اسمبلی والوں کے یاد ہے جب بے چارا عارف والے کا ایم این اے نذیر ''گھنٹی'' ایم این اے ہوسٹل میں ''نادرہ شریف'' ایکٹریس کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ ان اخبار والے ڈرٹی ڈاگز نے ضمیمے جاری کروا دیئے تھے نذیر گھنٹی کے۔ یار اب تم اس قصے کو وائزلی (Wisely) ہینڈل کرو۔ ہمیں جھمرا گاؤں کی زمین کی اشد ضرورت ہے......

بریگیڈیئر صاحب نے تو پورا معاملہ عقلمندی سے اس طرح سنبھالا۔ کہ ایک عرصہ تو جھمرا سے کوئی رابطہ ہی نہ رکھا پھر پنچائیت کے چند معتبر ممبران کو آنے بہانے اپنے ہیڈ کوارٹر بلا کر تعلقات کی بنیاد ڈالی گاؤں کی نالیاں صاف کروا دیں۔ سرپنچ شیخ عنایت اللہ کی بیٹی کی شادی میں جنرل صاحب بذات خود حاضری دینے پہنچے۔ پھر ان اخبار نویسوں کو ساتھ لیا جو بقول شخصے فوج سے فوائد حاصل کرتے تھے اور جھمرا والے پوری برسات میں یہی سمجھتے رہے کہ آئی بلا ان کے معمولی احتجاج سے ٹل گئی۔ اب ان سے ان کے گاؤں نہیں چھنیں گے۔

صوبیدار کے کندھوں پر کپتانی کے ستارے
سجے ابھی صرف ایک ہفتہ ہوا تھا

اخبار نویسوں اور جھمرا کے سرپنچوں کو آہستہ آہستہ ساتھ ملانا' آپریشن سٹیلمنٹ (Operation Settlement) کا پہلا حصہ تھا۔ دوسرا حصہ اس روز شروع ہوا جس روز لاہور والوں نے بنا کسی مفاد پرست لیڈر ''وزیرستان'' میں فوج کشی کے خلاف ایک انتہائی مکمل ہڑتال کی۔ شہر اس طرح سنسان تھا جیسے وہاں کوئی رہتا ہی نہ ہو...... ذرائع ابلاغ' ہڑتال کے سیاق و سباق میں مگن تھے...... بریگیڈیئر آفندی نے ''کالا'' گاؤں کی مشرقی سمت کے اجاڑ میدانوں میں کچھ فوجی ٹینٹ نصب کروا رکھے تھے......

صوبیدار کے کندھوں پر کپتانی کے ستارے سجے ابھی صرف ایک ہفتہ ہوا تھا۔ اب کی بار اس کی آواز میں ایک نئی طرح کی گھمبیرتا تھی۔ بلڈوزروں کی تعداد بھی پہلے سے دوچند تھی...... چیخم دھاڑ تو جھمرا میں بہت مچا لوگ گاؤں سے ملحقہ قبرستان میں اپنے بزرگوں کی قبروں پر لوٹتے تڑپتے رہے۔ ایک دو نے بلڈوزر اپنے گھروں کی طرف بڑھتے دیکھ کر کنویں میں کودنے اور بلڈوزر کے آگے لیٹنے کی کوشش کی پر کیپٹن صاحب کی نفری نے انہیں اپنے فوجی ٹرک میں لاد کر کالا کے مشرقی علاقے والے فوجی ٹینٹوں میں چھوڑ دیا اس سے پہلے کہ لاہور والے اپنی ہڑتال ختم کر کے گھروں سے باہر نکلتے جھمرا گاؤں کے سارے کچے پکے مکان زمین پر ڈھیر ہونے لگے۔ جھمرا کی ساری آبادی اپنی زندگی ایک پر کاہ سے شروع کرنے کی خاطر تین تین ہزار روپے مٹھی میں دابے اجاڑ بیابان میدان میں نصب ٹینٹوں میں بیٹھی ایک دوسرے کی طرف خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کالا گاؤں کے لوگ اپنے کھانے میں سے آدھا کھانا ان کے لیے لا رہے تھے۔ ان کے چہروں پر بھی اسی خوف کی زردی کھنڈی تھی کہ آگے چل کے فوج کہیں ان کے پیچھے نہ پڑ جائے۔

اندھیرا زیادہ ہو گیا تھا اس لیے تمہارا گھر اور پیڑ کل صبح کٹیں گے

بس ایک فضل کریم پھل والا تھا جو گاؤں کی ساری کارروائی سے بے خبر پھل بیچتا رہا۔ گاؤں واپس پہنچا تو مٹی کے ڈھیروں پہ شام تیزی سے اتر رہی تھی دانت نکوستے جھسمے گارے مٹی کے ڈھیروں پہ بھوتوں کی طرح اتر رہے تھے وہ تو یہ بھی نہیں جانتا تھا جھمرا کی ساری آبادی اس سے پہلے کالا کہ مشرقی میدان میں شفٹ کر دی گئی تھی۔

پورے گاؤں میں ایک نیم پختہ مسجد ڈاکخانہ اور فضل کریم کی ادھ گری چار دیواری کے سوا کچھ بھی باقی نہ بچا تھا۔ ڈاکخانہ اور مسجد کے بارے میں بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے کوئی خاص آرڈر نہ ملا تھا۔ فضل کریم کی کوٹھڑی پر بل ڈوزر اگلی صبح پھرنا تھا۔ مشینوں کو رات بھر کھڑا کرنے کی خاطر کسی چار دیواری کی ضرورت تھی۔ صوبیدار نے جواب کپتانی کے بلے اپنے کندھوں پر سجا چکا تھا کل مشینری بلڈوزر کرین (Crane) وغیرہ فضل کریم کے خالی مکان کی چار دیواری میں گھسیٹ کر رکھ دیئے۔ مشینری اندر گھسیڑنے کی دھینگا مشتی میں فضل کریم کے آنے سے پہلے اس کے صحن کی تین دیواریں مسمار ہو چکی تھیں۔

فضل کریم ریڑھی لے کر گھر میں گھسا تو یہ دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی کہ اس کے پیارے راز داں درخت کی بہت سی کومل شاخیں زمین پر ڈھیر ہیں اور لوہے کے بے ڈھنگے کرین کے بڑے بڑے فولادی بازو چڑیل کی طرح اس سے لپٹے ہوئے ہیں اپنے گھر کی مٹی بھری ہوا میں فضل کریم کو کسی کی سسکیوں کی آواز سنائی دے رہے تھی ...... جیسے اس کی بیوی نوراں اور اس کی ماں کی روحیں تڑپ کر قبروں سے باہر نکل آئی ہوں۔

فضل کریم مولوی عارف کے پاس بھاگا۔ یہ سب کیا ہوا؟؟ پورا گاؤں؟؟ کہاں گیا؟؟

ہونی آتی ہے تو کبھی پوچھ کر نہیں آتی ...... اندھیرا زیادہ ہو گیا تھا اس لیے تمہارا گھر اور پیڑ کل صبح کٹیں گے۔ پیڑ؟ پیڑ کیوں؟؟ اس کی چھاؤں تو سب کے لیے ہے؟

میں نے تو ان لوگوں سے کہا تھا فضل کریم اس پیڑ سے بے حد محبت کرتا ہے۔ صوبیدار کہتا تھا ہم یہ پیڑ کاٹ کر اس کی ریڑھی میں رکھ دیں گے جہاں چاہے لے جائے۔

لیکن پھر وہ رات بھر اس پیڑ کے تنے سے لگ کر بیٹھا رہا وہ میری زندگی اس طرح تباہ نہیں کر سکتے۔ اس پیڑ کے سوا اس دنیا میں میرا کوئی نہیں۔ شریک حیات نوراں یاروں بیلیوں کے جھتے ...... نوراں کی بیماری۔ بے بے کا جنازہ۔ کسی نے جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے گزرے وقتوں کی ''سی ڈیاں'' چلا دی تھیں۔ وقت کے سارے تاگے انجل گنجل ہو گئے تھے ...... کبھی نوراں اور وہ چاندنی رات میں پیپل کے اردگرد بھاگتے اسے دکھائی دیتے کبھی وہ چھوٹے سے لڑکے کے روپ میں پیڑ تلے بنٹے کھیلتا ...... اور اب صوبیدار کہتا تھا کہ اس اپنے گھنے پیڑ خاندان کے سب سے بڑے بزرگ کا جنازہ اپنی پھل والی ریڑھی میں لاد کر لے جاؤ ...... کہاں؟؟ ...... تن تنہا اسے کاٹ کر کہاں لے جاؤں۔ کہاں؟؟ وہ تو زندہ ہے میرے ہر سانس کے ساتھ سانس لیتا ہے ...... صوبیدار کیسے سمجھ سکتا ہے؟؟ کیسے جان سکتا ہے کہ پیڑ بھی ہماری طرح سانس لیتے ہیں۔ سنتے ہیں۔ سمجھتے ہیں دکھتے ہیں خوش ہوتے ہیں۔ ساتھ کھیل کر بڑے ہوتے ہیں۔ بزرگوں جیسا سایہ بنتے ہیں۔ کیسے؟ کیسے سمجھا سکوں گا میں اسے۔

اپنی کارکردگی پر شاباش وصولتا صوبیدار اپنی نفری سمیت علی الصبح فضل کریم کی جھگی پہنچا تو اس نے دیکھا پھل والا فضل کریم اپنی پگڑی گلے میں ڈال کر پیڑ کی سب سے اونچی شاخ پر لٹکا تھا ...... بعد میں وہ کئی دن سوچتا رہا آخر کیوں؟؟ آخر کیوں بوڑھے پھل والے شخص کے گھر میں کوئی گھر والے بھی نہ تھے۔ وہ تو ہمیشہ اس پورے اپریشن سیٹلمنٹ (Settlement) میں ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کرتا رہا۔ درخت کی ٹہنی پر لٹک کر اس نے جان کیوں دے دی آخر کیوں؟؟

☆......☆......☆

بشریٰ رحمن، لاہور

استصواب

آپا جی۔ ملک صاحب اور چودھری صاحب آئے ہیں۔

نوکرانی نے اندر آ کر اطلاع دی.......

ریفریجیٹر میں سلیقے سے پھل لگاتی ہوئی طیبہ خاتون نے سر اٹھایا اور پوچھا۔

ساتھ کون کون ہے.......

جی وہ تو کوئی دس بارہ بندے لے آئے ہیں۔نوکرانی نے جواب دیا۔

اچھا...... کہہ کر طیبہ خاتون نے فرج کا دروازہ بند کر دیا۔اور بولی۔

ان کو بیٹھک میں بٹھاؤ۔ میں آ رہی ہوں۔اپنے دوپٹے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے جیسے اسے کچھ یاد آ گیا۔

جلدی سے بولی......

ثمینہ ادھر آؤ...... پھر آواز ذرا آہستہ کر کے کہنے لگی۔ بندے گن لینا اور اتنی ہی بوتلیں کھول کے ٹرے میں لگا کے اندر لانا......اور دیکھ گلاس چھلکتے ہوئے نہ ہوں۔

جی اچھا جی اچھا...... کہتی ثمینہ باہر دوڑی گئی۔

طیبہ خاتون اپنے آپ کو چادر سے لپیٹے ہوئے جب بیٹھک میں داخل ہوئی تو بیٹھک میں اس کے بیٹھنے کی کہیں جگہ نہیں تھی...... پندرہ آدمی پہلے ہی پھنس کر بیٹھ چکے تھے۔

وہ سب احتراماً کھڑے ہو گئے۔

آپا جی آپ ادھر بیٹھیں۔

آپا جی آپ یہاں بیٹھیں......

بیٹھک میں اس کے بیٹھنے کی
کہیں جگہ نہیں تھی

ہر کوئی اپنی جگہ آفر کر رہا تھا۔

مگر طیبہ خاتون فوراً باہر نکل گئی اور سامنے برآمدے میں بڑا ملفوف موڑھا اٹھا کے اندر لے آئی۔ دروازے کے پاس ڈال کے وہیں بیٹھ گئی۔

تشریف رکھیے...... اس کے کہنے پر سب پھر بیٹھ گئے۔

تھوڑے سے توقف کے بعد ملک اللہ نواز بولے۔

آپا جی...... آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے۔

ملک صاحب۔ طیبہ خاتون نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ میں نے تو آپ کو اپنا فیصلہ بتا دیا تھا۔

میں اس کام کے نہ اہل ہوں نہ حامی ہوں۔

یہ کیا کہہ رہی ہیں آپا جی۔ ہم نے تو آپ کا نام اپنے پارٹی لیڈروں سے منظور بھی کروالیا ہے۔ چودھری عبدالغفور گھبرا کر بولے۔

چودھری صاحب۔ میں آپ سب کی ممنون ہوں کہ آپ میری بڑی عزت افزائی کر رہے ہیں۔ مگر شروع دن سے آپ سب سے یہی کہہ رہی ہوں۔ مجھے سیاست کا کوئی تجربہ نہیں۔ میں ایک گھریلو عورت ہوں۔ نہ مجھے سیاست میں آنے کا کوئی شوق ہے۔

رانا صاحب! آپ کیوں مجھے سیاست کی غلاظت میں گھسیٹنا چاہتے ہیں۔

دیکھو بی بی...... سردار ظفر اللہ بولے۔ ہماری نظر میں اس وقت آپ قابل ترین خاتون ہیں۔ گھریلو عورت ہونے کے ساتھ ساتھ آپ نے زندگی بھر تعلیم و تدریس کا کام کیا ہے...... کئی نسلیں آپ کے ہاتھوں سے نکلی ہیں۔ آپ کی پوری زندگی کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے ہے۔ آپ جیسی اعلیٰ کردار کی عورتوں کو اسمبلیوں میں جانا چاہیے اور یہ بھی ایک قومی خدمت ہے۔

سردار صاحب! آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ مجھے سکون سے اپنا کام کرنے دیں۔ وہ بھی تو قومی خدمت ہی ہے۔

تو گویا آپ اپنی پوری برادری کو مایوس کر رہی ہیں۔ یہ بھی تو سوچیں اس حلقے سے ہم آپ کا نام دے چکے ہیں۔

رانا صاحب! آپ کیوں مجھے سیاست کی غلاظت میں گھسیٹنا چاہتے ہیں۔

یہ کیا کہہ رہی ہو بیٹی! شاہ صاحب جوان سب میں بزرگ تھے بولے۔ میری ساری زندگی سیاست میں گزر گئی ہے۔ کوئی بھی پیشہ یا کام غلیظ نہیں ہوتا۔ ہاں جب غلیظ لوگ اس میں آ جاتے ہیں تو اپنی ذات کی غلاظت بھی لے آتے ہیں۔ اگر شرفاء اور نجیب الطرفین لوگ ادھر آنے سے انکار کریں گے تو سیاست غلاظت سے چھٹکارا کیسے حاصل کر سکے گی۔ تعلیم یافتہ اور تجربہ کار لوگ اس طرف نہیں آئیں گے۔ تو پھر چور اچکے از خود راستہ بنا لیں گے۔

آپ ٹھیک فرما رہے ہیں شاہ جی...... طیبہ خاتون نے چادر کو سر پر جماتے ہوئے کہا......

مگر میرا خیال ہے۔ میں سیاست کے لیے موزوں نہیں ہوں۔

آپا جی...... طارق ڈوگر جو خود پروفیسر تھا۔ ایک دم بول اٹھا......

میں تو خدا لگتی کہوں گا۔ آج اگر آپ غور فرمائیں تو اس قسم کی نااہلیت اور غلاظت آپ کو ملک کے ہر شعبے میں نظر آئے گی۔ کونسا محکمہ ہے جس کی کرسیوں پر نااہل اور سفارشی لوگ نہیں بیٹھے ہوئے بیوروکریسی سے لیکر سیاست تک' تجارت سے لے کر صحافت تک' اور تو اور جو محکمہ کردار سازی اور انسانیت شناسی کے لیے بنایا گیا تھا۔ آج اس میں سے تعفن اٹھ رہا ہے۔ میری مراد محکمہ تعلیم سے ہے۔ آپ بھی تو اس محکمے سے وابستہ رہی ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہے پچھلے پچاس سالوں میں تعلیمی نظام کس طرح رو بہ زوال ہوا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر شعبہ زندگی کے لیے یہیں سے انسان تیار کر کے بھیجے جاتے ہیں۔ توقع یہی کی جاتی ہے اور کوشش بھی یہی کی جاتی ہے...... اگر یہی محکمہ ٹھیک رہے۔ تو سارا نظام ٹھیک چلتا رہے گا۔ مگر اس کے باوجود اسی بدنام محکمے سے بہترین لوگ نکل ہی آتے ہیں۔ جو جہاں جا بیٹھتے ہیں۔ وہیں اجالا ہونے لگتا ہے۔

آپا جی! دنیا میں سارے لوگ نیک پاک اور پارسا نہیں ہوتے اس دنیا میں اچھے اور دیانتدار لوگ کم ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی بہت اچھے محب وطن اور اصول پرست لوگ ہر محکمے میں پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ ان کی تعداد کم ہے۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ ایسے لوگوں کی وجہ سے پاکستان چل رہا ہے اور انشاءاللہ قائم رہے گا۔ اسی لیے تو ہم آپ کی منتیں کر رہے ہیں۔ آپ آئیں گی تو کچھ نہ کچھ تبدیلی تو ضرور آئے گی۔

آپا جی! دنیا میں سارے لوگ نیک پاک اور پارسا نہیں ہوتے

طارق ڈوگر کی تقریر سن کر طیبہ خاتون گھبرا گئی۔ یہ تو اچھا ہوا کہ ثمینہ اسی وقت بوتلوں کی ٹرے

پکڑے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی ...... اوہو! اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ کہہ کر سب نے باری باری گلاس اٹھا لیے۔ اور پینے لگے۔

طیبہ خاتون کو اپنا دفاع کرنے کا موقع مل گیا۔

بولی۔

میری نظر میں اس شہر کی کئی اعلیٰ تعلیم یافتہ بڑے گھرانوں کی خواتین ہیں۔ میں آپ کو ان کے نام اور پتے بتا سکتی ہوں۔ ذرا ان سے بھی مل لیں۔

مطلوب ڈھلوں جھٹ بولے ......

آپا جی' شہر میں عورتوں کی کمی نہیں ہے۔ باہر نکل کر دیکھیں جب سے الیکشن کا اعلان ہوا ہے طرح طرح کی عورتیں' کیسی کیسی سفارشیں لیے نکل پڑی ہیں ...... لیکن ہم سب شرافت کی سیاست پر یقین رکھتے ہیں۔ ہمارا مقصد ہے کہ جس عورت نے' کسی بھی صورت میں اپنے وطن کی تھوڑی بہت خدمت کی ہو وہی سیاست میں آئے ...... محض فیشن کے طور پر نہ آئے۔

اچھا یہ سب ٹھیک ہے۔ جو آپ کہہ رہے ہیں۔ مگر میرے بھائیو! میں تو سیاست کی الف ب سے بھی واقف نہیں۔ حتیٰ کہ مجھے تو اخبار پڑھنے کا بھی شوق نہیں ہے ...... کل کلاں کو آپ کہیں گے ......

آپا جی ...... چودھری عبدالغفور پھر بولے۔

سیاست سیکھنے کے لیے کوئی سکول نہیں ہوتا۔ یہ وہ قاعدہ ہے جو اسمبلی کی کرسی پر بیٹھ کر ہی پڑھا جاتا ہے۔ وہاں ہر روز تجربے کا ایک روز ہوتا ہے۔ ہم سب نے بھی اسی طرح سیاست سیکھی ہے ...... اور پھر قدم قدم پر راہنمائی کو ہم جو آپ کے ساتھ ہیں ......

طیبہ خاتون نے سر جھکا لیا اور زمین کی طرف دیکھنے لگی۔

پچھلے ایک مہینے سے یہی کچھ ہو رہا تھا۔ مگر وہ برابر انکار کیے جا رہی تھی۔ وہ اپنی موجودہ زندگی کی روش اور اپنے کام سے مطمئن تھی ...... صاف انکار کے باوجود اتنے معزز لوگ ہر دوسرے دن ان کے گھر آ جاتے تھے ...... اور اس کا ذہن تھا کہ آمادہ ہی نہیں ہو پاتا تھا ......

انکل جی! آپ صاف صاف بات کیوں نہیں کرتے ایڈووکیٹ فیصل عبداللہ کھڑا ہو گیا اور بولا۔

آپا جی! ہماری پارٹی نے آپ کا نام فائنل کر دیا ہے۔ اب انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ پرسوں کاغذات جمع کرانے کی آخری تاریخ ہے۔ آپ مانیں یا نہ مانیں۔ اب یہ ہماری عزت کا سوال ہے۔

کل ہم آپ کے فارم فل کر کے' تصدیق کنندہ اور تائید کنندہ کے دستخط کروا کے آپ کے پاس لے آئیں گے اور پرسوں صبح اللہ کا نام لے کر' نو بجے آپ کے گھر سے جلوس کی صورت میں نکلیں گے اور آپ کو ساتھ لیجا کر کاغذات جمع کروا دیں گے۔

بے دلی سے رات کا سارا کام ختم کر کے طیبہ خاتون نے عشا کی نماز پڑھی اور پھر آ کر سراسیمہ سی اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ ایک گمنام اور سیدھی سادھی زندگی سے نکل کر ایک ہنگامہ پرور عوامی زندگی میں داخل ہونے کے خوف سے ایک غیر یقینی سی کیفیت میں مبتلا تھی۔ اس نے دور پڑا فون اٹھا کے اپنی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ اسے اپنے بیٹے کے فون کا انتظار تھا کیونکہ اس نے صبح اس کی ٹیپ پر پیغام چھوڑا تھا۔

پتہ نہیں کیوں یہ بے یقینی ہر چوراہے پر اس کے سامنے آ کے کھڑی ہو جاتی رہی۔

وہ کسی بڑے گھرانے کی بہو بیٹی نہیں تھی۔

باپ اس کا ایک مشہور اور کاریگر کارپینٹر تھا اور ماں اس کی محلے کے بچوں کو کلام پاک ناظرہ پڑھایا کرتی تھی۔ وہ زیادہ تر کام بیٹھ کر کیا کرتی تھی۔ ایک بار ابلتے ہوئے دودھ کی دیگچی اس کے گھٹنوں پر آ گری تھی۔ اس کا نچلا دھڑ تقریباً ناکارہ ہو گیا تھا۔ اسی لیے یہی ایک بچی تھی۔ طیبہ خاتون نے اپنے گھر میں تواتر کے ساتھ دو آوازیں سنی تھیں صبح دم باجماعت سی پارہ پڑھتے ہوئے بچوں کی آوازیں...... اور ڈھلتی شاموں میں باپ کی آرہ مشینوں کی دھنیں......

پتہ نہیں کیوں یہ بے یقینی ہر چوراہے پر اس کے سامنے آ کے کھڑی ہو جاتی رہی۔

معراج دین نے آٹھ جماعتیں پڑھ کے اپنے آباؤ اجداد کا پیشہ اختیار کیا تھا اور اس پیشے پر نہ صرف فخر کرتا تھا بلکہ محنت بھی بہت کرتا تھا۔ اسی لیے شہر میں اس جیسا کمال فن کسی کے پاس نہ تھا اور شہر کا ہر رئیس اسی سے لکڑی کا کام کروانا پسند کرتا تھا۔ یہ کچی حویلی اسے اپنے باپ سے ورثے میں ملی تھی۔ جس میں ایک شاندار پکا گھر بنانے کے لیے وہ دن رات محنت کرتا رہتا تھا اور دوسرا خواب اس کا اپنی بیٹی طیبہ خاتون کو ڈاکٹر بنانے کا تھا......

وہ فارغ وقت میں بیٹی کو گود میں بٹھا لیا کرتا...... اور زور زور سے باتیں کرتا......

میں اپنی کاکو کو بہت پڑھاؤں گا...... یہ بڑی ڈاکٹر بناؤں گا...... میری بیٹی بہت بڑی عورت بنے گی...... دنیا اس کو سلام کیا کرے گی...... ہے نا؟ ہے نا؟......

ماں کہتی...... پہلے اسے کلام پاک تو پڑھ لینے دے۔

مگر اس کے باپ نے کلام پاک ختم کرنے سے پہلے اسے شہر کے بہترین سکول میں داخل کرا

دیا۔ اس وقت اچھے سکولوں میں داخلے کے لیے سٹیٹس اور سفارشیں نہ کام آتی تھیں۔ طیبہ خاتون کو سکول کی بس لینے آتی۔ صبح کو چھپا تا یونیفارم پہن کے وہ تیار ہو جاتی اور معراج دین اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے گلی کی نکڑ تک لے جاتا۔ بس میں بٹھا کے اس کی بلائیں لیتا اور واپس آ جاتا۔

مگر شام کو ماں زبردستی پکڑ کے چٹائی پر بٹھاتی۔ آموختہ سنتی اور اگلا سبق پڑھاتی۔ یوں جب وہ پانچویں جماعت میں پہنچی تو اس نے قرآن مجید ختم کر لیا اور سارے محلے میں لڈو تقسیم کیے گئے تھے......

ماں نے اسی پر بس نہیں کیا۔ جب وہ فارغ ہوتی۔ اسے تیسویں پارے کی سورتیں زبانی یاد کرانے لگتی......

بابا! میں خون بہتا نہیں دیکھ سکتی۔
میں ٹیکہ نہیں لگوا سکتی

باپ کہتا...... اللہ کی بندی میری بیٹی کو مولویانی نہ بنا۔ اس نے تو ڈاکٹرنی بننا ہے ڈاکٹرنی......

طبعاً طیبہ خاتون ایک سنجیدہ اور پڑھاکو بچی تھی۔ محلے کے امیر، غریب سب بچے ''بیوی جی'' کے پاس قرآن پاک پڑھنے آتے تھے۔ طیبہ ہمیشہ متمول گھرانوں کی خوش پوش لڑکیوں کو سہیلیاں بناتی تھی۔ خود بھی ہمیشہ صاف اور خوشنما کپڑے پہنتی تھی۔ معراج دین اس کی کوئی فرمائش نہ ٹالتا تھا۔ کہتا تھا ایک ہی تو ہماری بیٹی ہے اسے شہزادیوں کی طرح پالوں گا۔ اچھے نمبروں سے ہمیشہ پاس ہوتی طیبہ خاتون کو ایف ایس میں بریک لگ گئی۔ یوں بھی اس نے کئی بار اپنے بابا سے کہا تھا کہ وہ میڈیکل نہیں کر سکتی۔

ایک بار جب وہ دسویں جماعت میں تھی۔ سکول کی ایک لڑکی جھولے سے گر گئی۔ اس کی ٹھوڑی پھٹ گئی۔ طیبہ خاتون نے گرم گرم سرخ سرخ خون نکلتا دیکھا تو بے ہوش ہو گئی۔ زخمی لڑکی کو چھوڑ کر سب لڑکیاں اس کے گرد ہو گئیں۔ تب ہی اس نے کہہ دیا تھا......

بابا! میں خون بہتا نہیں دیکھ سکتی۔ میں ٹیکہ نہیں لگوا سکتی...... مجھے ڈاکٹرنی بننے سے نفرت ہے۔ مگر بابا اسے بھی اس کا بچپنا ہی سمجھتا رہا۔ جب ایف ایس سی میں دو بار فیل ہو گئی...... تو بات بابا کی سمجھ میں آ گئی۔ تب اس نے اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ مگر اتنا ضرور کہہ دیا۔ ڈھیر سارا پڑھ لینا۔ کچھ نہ کچھ ضرور بن جانا...... ورنہ استانی تو ضرور بن جانا۔

معراج دین بھی اب بوڑھا ہو رہا تھا۔ اس لیے اپنے ایک میٹرک پاس بھتیجے کو لے آیا تھا۔ تاکہ اسے اپنا ہنر بھی سونپ دے...... اور کام میں بھی اس کا سہارا لے...... دنوں میں ہی ان لوگوں نے اپنا

ایک فرنیچر کا شوروم کھول لیا۔

طیبہ خاتون نے اچھے نمبروں میں بی اے کر لیا۔ تو اس کے دل میں واقعی ایک آئیڈیل ٹیچر بن جانے کی تمنا جاگی اس نے خواہش کا اظہار کیا تو باپ نے اگلے سال بی ایڈ کرنے کی اجازت دے دی۔

مگر ماں مزید پڑھائی کی مخالفت کرنے لگی۔ وہ اب بستر پر پڑی رہتی تھی۔ پڑھنے والے بچے بھی بہت کم ہو گئے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ اپنی زندگی میں ہی اپنی اکلوتی لڑکی کی شادی کر دے...... پھر وہی ہوا یہ حسرت لیے ایک دن چپکے سے وہ چل دی۔ اس کے چالیسویں پہ معراج دین نے بھری برادری سے مشورہ کر کے اس کا نکاح اپنے بھتیجے فخر دین کے ساتھ کر دیا۔ جب طیبہ خاتون نے بی ایڈ کر لیا تو اس کی شادی بھی ہو گئی۔ فرق پڑا تو اتنا کہ وہ باپ کے گھر سے باہر تو نہ گئی...... مگر باپ نے اور شوہر نے مل کر اس پرانے گھر کو جدید طرز پر تعمیر کر دیا۔ سال بعد ان کے گھر بیٹا پیدا ہوا۔ جس کا نام نانا نے بدر دین رکھا۔ پھر ایک دن کارخانے میں گیلی لکڑیاں چیرتے ہوئے فخر دین کو بجلی کا کرنٹ لگا اور پل بھر میں وہ خاک ہو گیا۔ اس غم نے معراج دین کی کمر توڑ دی سال کے اندر اندر بینائی چلی گئی...... فالج ہوا اور وہ بھی اپنی معیاد پوری کر کے چلا گیا۔

اس غم نے معراج دین کی کمر توڑ دی
سال کے اندر اندر بینائی چلی گئی......

اب ایک معصوم بچے کے ساتھ بڑے لوگوں کے محلے میں طیبہ خاتون تنہا رہ گئی تھی......

مگر باپ کی تربیت کی وجہ سے جلدی ہی اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی۔ پہلے پہل گھر میں ایک ٹیوشن سنٹر ''معراج ٹیوشن سنٹر'' کے نام سے کھول لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ''معراج ٹیوشن سنٹر'' معراج ماڈل سکول فار گرلز بن گیا۔ اور پھر شہر کے اندر اس کی کئی شاخیں کھل گئیں۔ تعلیمی معیار تو اعلیٰ ترین تھا ہی اس نے تعلیم کے ساتھ تربیت اور کردار سازی کا نصاب بھی شروع کر رکھا تھا۔ اس لیے شہر کے لوگ چاہتے تھے ان کی بچیاں طیبہ خاتون کے اداروں سے میٹرک کریں...... اور تو اور اس نے اپنی ماں کی روایات کو قائم رکھتے ہوئے ہر شاخ میں کلام پاک ناظرہ پڑھانے کا الگ شعبہ بنا رکھا تھا...... قوم کی بچیوں میں اس کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ اپنے تجربات اور مشاہدات مضامین کی صورت' اخباروں میں لکھتی رہتی تھی......

اسے سیمیناروں اور مذاکرات میں بلایا جاتا۔ ریڈیو پر بھی لیکچر دینے جاتی۔ جب کبھی گھروں

میں محفل میلاد سجائی جاتی تو اسے بطور خاص بلایا جاتا۔ سیرت طیبہ پر اس کا بیان ایسا سحر انگیز ہوتا کہ محفل پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی...... گویا وہ دیکھتے ہی دیکھتے شہر کی جانی مانی اور بہت ہی محترم شخصیت بن گئی......

ہر نوجوان کی طرح اس کے خوابوں میں بھی امریکہ بس گیا تھا

ایک مشکل مرحلہ اس کی زندگی میں بھی آیا تھا۔ جب اس کا اکلوتا بیٹا بدر دین بی اے کے بعد ضد کرنے لگا کہ وہ کمپیوٹر کی اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ جائے گا۔ ہر نوجوان کی طرح اس کے خوابوں میں بھی امریکہ بس گیا تھا بالآخر وہ اس کی ضد کے آگے ہار گئی اور دو سال پہلے اسے امریکہ بھیج دیا۔ اس وعدے پر کہ وہ تعلیم ختم کر کے پاکستان آ جائے گا۔ اس وقت طیبہ خاتون 44 برس کی تھی۔ اس کی پاکباز اور مقصدی زندگی کا نور اس کے چہرے پر تھا۔ اس کی پارسائی اور عبادت گزاری کی گواہی سارا شہر دیتا تھا۔ اس لیے جب شہر میں ایک نیا غلغلہ اٹھا کہ اب کے باکردار اور شریف لوگ سیاست میں لائے جائیں تو لامحالہ شہر والوں کو نظر انتخاب طیبہ خاتون پر گئی۔

اس نے تو کبھی بھولے سے بھی نہ سوچا تھا کہ کبھی سیاست کی نگری میں جا نکلے گی۔ گھر میں کوئی صلاح کار نہیں تھا اس لیے اسے اپنے بیٹے کے فون کا انتظار تھا۔ سوچ سوچ کے وہ تھک چکی تھی...... کہ فون کی گھنٹی بجی۔ لپک کر اس نے ریسیور اٹھا لیا۔

وہ تو کوئی ہمسائی تھی اور اسے مبارکباد دے رہی تھی کہ عنقریب وہ کونسلر بن جائے گی۔

اس نے بے دلی سے بات کی اور ریسیور رکھ دیا۔

بیٹا! وہ لوگ مانتے نہیں انہوں نے میری زندگی اجیرن کر دی ہے۔

جب وہ تھک ہار کر سو چکی تھی۔ تب اس کے بیٹے کا فون آ گیا۔

بدرو۔ میں کتنی دیر سے تمہارے فون کا انتظار کر رہی ہوں۔

ماں! کام سے آتے ہوئے ذرا دیر ہو گئی اور سناؤ کیا بنا؟

بیٹا! وہ لوگ مانتے نہیں انہوں نے میری زندگی اجیرن کر دی ہے۔

تو کیا ہے ماں...... تم فوراً حامی بھر لو۔ ایسے موقعے زندگی میں بہت کم ملتے ہیں۔ ہماری تو کوئی

سیاسی بیک گراؤنڈ بھی نہیں ...... اس کے باوجود تمہیں ایک گولڈن چانس مل رہا ہے۔ ہمارے ملک میں سیاست دانوں کو برا بھلا کہنے کا رواج زیادہ ہے۔ لیکن دور بیٹھ کر دیکھو تو تمہیں پتہ چلا۔ سیاست دانوں کو باعث عزت سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں یوں بھی بے یقینی اور افراتفری پھیلانے کا فیشن ہو چلا ہے۔ اسی لیے اسمبلیوں کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کب ٹوٹ جائیں گی ...... دو تین سال کی تو بات ہے ماں۔ اب تم انکار نہ کرنا......

بیٹے نے ایک ہی سانس میں لیکچر پلا دیا۔ تو وہ بے بسی سے بولی۔

بدرو! اسمبلیاں ٹوٹنے کے بعد جو بدمزگیاں اور بدنامیاں ہوتی ہیں۔

ماں یہ انہی کے ساتھ ہوتی ہیں جو برا کر کے جاتے ہیں۔ بروں کے نام تو اخباروں میں آ جاتے ہیں کبھی اچھا کرنے والوں کو بھی کسی نے خراج پیش کیا ہے ...... وہ ہمیشہ گمنامی میں چلے جاتے ہیں۔

بیٹے جی! جب اچھا کرنے والوں کو صلہ نہیں ملتا تو ان کے آنے کا کیا فائدہ......

ماں! فضول بحث نہ کرو۔ اگر لوگ یہ کہنا شروع کر دیں۔ دنیا اچھی جگہ نہیں ہے انسان کے پیدا ہونے کا کیا فائدہ......

بیٹا! میں یہاں بالکل اکیلی ہوں۔

سنو ماں! سیاست میں آنا میرا ابھی خواب ہے......

کوئی بات نہیں ماں! اگلے سال میرا کورس ختم ہو جائے گا اور میں تمہاری مدد کرنے پہنچ جاؤں گا۔

سارے کام میں سنبھال لوں گا اور سنو ماں! سیاست میں آنا میرا ابھی خواب ہے...... تم نے آ کر میرے لیے جگہ بنانی ہے۔ تمہیں معلوم ہے ہمارے ہاں خاندانی سیاست نسل در نسل چلتی ہے۔ آخر کسی نہ کسی کے کندھے پر ہاتھ تو رکھنا پڑتا ہے۔ تو شکر کر کے تجھے سارے شہر کا کندھا نصیب ہو رہا ہے۔

بدرو! تو نے مجھے پھنسا دیا ہے۔

نہیں ماں...... میرا مشورہ صائب ہے۔ تجھے میری قسم اب انکار نہ کرنا۔ جلدی سے کاغذات جمع کرا کے مجھے اپنے منتخب ہونے کی خوشخبری سنا۔

چیمبر کے لان میں ایک بہت بڑا ٹینٹ لگا ہوا تھا۔ اندر رنگ برنگی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں صبح کے آٹھ بجے تھے۔ تمام منتخب ارکان کڑکڑاتے کپڑے پہنے ہنستے مسکراتے گپ لگاتے اندر آ کر کرسیوں پر بیٹھ رہے تھے۔ بیرے مشروبات چائے اور ناشتے کا سامان اٹھائے نمودار ہونے لگے۔ ساتھ ساتھ کھانا

پینا بھی چلنے لگا۔ دائیں طرف کونے میں چند خواتین پہلے سے آئی بیٹھی تھیں۔

اتنے میں ایک لیڈر صاحب تشریف لے آئے۔ بڑے اہتمام سے ایک ایک رکن کے پاس جا کر ان سے ہاتھ ملایا۔ بغل گیر ہوئے...... حال احوال پوچھا...... پھر اس جگہ جا کر کھڑے ہو گئے۔ جہاں ایک بلیک بورڈ پڑا تھا۔ بلند آواز سے بولے۔

آج دس بجے خواتین کا الیکشن شروع ہو جائے گا۔ ہماری پارٹی چونکہ اکثریتی پارٹی ہے۔ اس لیے ہم نے بہت سوچ سمجھ کر بارہ خواتین کو نامزد کیا ہے۔ جو ہر طرح سے قابل تجربہ کار اور اس ٹکٹ کی اہل ہیں۔ اب میں پہلے باری باری اپنی بہنوں کا آپ سے تعارف کرا دوں تا کہ وہ پولنگ روم میں جا کر بیٹھ جائیں پھر انہوں نے خواتین کی طرف دیکھ کر کہا۔

مہربانی کر کے آپ باری باری کھڑی ہو کر اپنا تعارف خود کروائیں......

کچھ عورتیں سیاسی کارکن تھیں...... کچھ تجربہ کار تھیں...... اور کچھ بالکل نئی تھیں...... جو کافی نروس ہو رہی تھیں۔ پچھلی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے نمائندے باقاعدہ ہر ایک پر ریمارکس پاس کر رہے تھے اور زور زور سے ہنس رہے تھے......

نہیں یار! دو چار ٹوٹے ٹھیک ہیں......

سب سے آخر میں طیبہ خاتون نے اٹھ کر اپنا تعارف کرایا...... سفید کپڑوں کے ساتھ اس نے سفید چادر اوڑھ رکھی تھی......

پچھلی نشستوں پر کن سوئیاں چل رہی تھیں......

یار کیسا مایوس کن انتخاب ہے......

نہیں یار! دو چار ٹوٹے ٹھیک ہیں......

پر اس بڑھیا کو لینے کی کیا ضرورت تھی...... اس نے طیبہ خاتون کو دیکھ کر کہا۔

کام...... کام...... کام کرنے والی عورتیں بھی تو درکار ہیں......

ابھی عورتوں پر تبصرہ ہو رہا تھا کہ لیڈر صاحب نے عورتوں سے کہا وہ اپنے اپنے پولنگ ایجنٹ کے ساتھ اندر چلی جائیں۔ عورتیں اٹھ کر اندر چلی گئیں۔

پھر لیڈر صاحب نے نمائندگان کو مخاطب کر کے بآواز بلند کہنا شروع کیا۔

معزز ارکان! اب میں آپ کو پولنگ کا طریقہ کار سمجھاتا ہوں۔

دیکھیے یہ ڈائیاگرام ہے۔ اس طرح کا کاغذ آپ کو اندر ملے گا۔ ایک خانے میں امیدواروں کے نام لکھے ہوں گے اس طرح...... انہوں نے اپنی سب خواتین کے نام ان خانوں میں لکھ دیئے...... آپ نے صرف ایک ووٹ نہیں دینا۔ پورے بارہ ووٹ دینے ہیں......

بارہ ووٹ......؟ ارکان چیخے......

جی ہاں! میں آپ کو سمجھائے دیتا ہوں۔ یہ طریقہ انتخاب ہم جرمنی سے لائے ہیں۔ اس میں ایک ووٹ بھی ضائع نہیں ہوتا۔ یہی طریقہ کارسینٹ کے انتخابات میں بھی کام آتا ہے......

ہماری پارٹی کی ساری خواتین جیت کر ہاؤس میں آجائیں گی۔

ہماری ہر امیدوار خاتون کے حصے میں اکیس ووٹ آئیں گے۔ ہم آپ کو ابھی ایک ایک فہرست تقسیم کریں گے جس میں خاتون کے نام کے آگے ان معزز ارکان کے نام ہوں گے جنہوں نے اس خاتون کو پہلا ووٹ دینا ہوگا۔ پہلے ووٹ کے لیے آپ کو اس طرح نمبر 1 لکھنا ہوگا۔ آپ دیکھ لیں نہ آپ اردو میں ایک لکھیں گے نہ ٹک ( ) مارک کریں گے اور نہ کوئی اور نشان بنائیں گے۔ بس جس طرح میں نے لکھا ہے اس طرح 1 لکھنا ہوگا۔ اس کے بعد فہرست کے مطابق اپنی ہی پارٹی کی عورتوں کو بقایا 2، 3، 4 ووٹ دیتے جائیں گے ہر ہندسہ اس طرح لکھا ہوگا۔ جس طرح میں نے بلیک بورڈ پر لکھا ہے۔ ورنہ آپ کا ووٹ ضائع ہو جائے گا۔ مہربانی کر کے احتیاط کیجیے گا۔ اگر کوئی ووٹ بھی ضائع نہ ہوا تو انشاء اللہ ہماری پارٹی کی ساری خواتین جیت کر ہاؤس میں آجائیں گی۔

کیا آپ سمجھ گئے......

جی ہاں...... ارکان بلند آواز بولے...... بعضوں نے یہ بھی کہا...... چودھری صاحب آپ ہمیں سکول کے بچے سمجھ رہے ہیں۔

اس پر قہقہہ بلند ہوا۔ اور سب اٹھ کر اندر جانے لگے۔

الیکشن روم کے باہر منتخب نمائندگان کا میلہ سا لگنے لگا۔ ایک غیر منظم سی قطار آپ ہی آپ بننے لگی۔

اندر سے الیکشن آفیسر نے آواز لگائی تمام کینڈی ڈیٹ (Candidate) اپنے اپنے پولنگ ایجنٹوں کے ساتھ اندر آجائیں۔ ایک خاتون کے ساتھ پورا قافلہ اندر جانے لگا تو آفیسر نے روک

دیا۔ایک امیدوار کے ساتھ زیادہ سے زیادہ دو پولنگ ایجنٹ اندر جا سکتے ہیں......

اچانک صدر دروازے سے ایک شعلہ جوالہ نمودار ہوا......

لائن میں کھڑے ہوئے بعض ارکان کو جلدی تھی۔ وہ پہلے پہلے اپنا ووٹ بھگت کے نکل جانا چاہتے تھے مگر وہ بھی دائروں میں بٹے ہوئے ارکان کی طرح الیکشن میں حصہ لینے والی اور اپنے پولنگ ایجنٹوں کے ساتھ اندر جانے والی خواتین پر کھلا ڈلا تبصرہ کر رہے تھے......

اخباری فوٹو گرافر ہر ہر زاویے سے تصویریں بنا بنا کر کل کے اخباروں کے لیے دلچسپ مواد اکٹھا کر رہے تھے۔

کہ اچانک صدر دروازے سے ایک شعلہ جوالہ نمودار ہوا......

اوئے...... کہہ کر سب متوحش ہو گئے۔

تھی تو وہ خوبصورت اور جوان بھی...... مگر اس نے عجیب فنکارانہ انداز میں اپنی جوانی کے گلدان میں اپنے حسن کے سارے پھول سجا رکھے تھے۔ ہلکے گلاب کے رنگ کا گلابی...... جارجٹ کا سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔ جو بدن کی گلابیوں کا ہمراز لگ رہا تھا۔ اوپر چائنیز سلک کی کالی چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ چائنیز سلک کی خوبی یہ ہے کہ اس کی چادر یا دوپٹہ محض سانس کی گرمی سے مچل مچل جاتا ہے۔ کندھوں پر یا سینے پر ٹکنا اس کا چلن ہی نہیں...... آپ چلتے رہیں...... ہوا چلے نہ چلے وہ سر سر کرتا رہتا ہے...... لٹکتا رہتا ہے...... لپٹتا رہتا ہے...... اڑتا رہتا ہے...... ادھر ادھر آگے...... پیچھے...... اور اگر خیال نہ کریں تو بڑی نرمی سے زمین پر بھی گر سکتا...... اس کے کمر تک لمبے بال گھٹاؤں کا منظر پیش کر رہے تھے۔ ان کے اندر روپہلی سٹریک بجلی کی طرح چمک رہی تھیں۔ سیاہ تیز آنکھوں میں کجلے کی دھار تھی۔ ہونٹوں پر سوٹ کی ہمرنگ لپ سٹک تھی۔ چلتی اس طرح کہ دو ملفوف گنبد اپنے آپ ہلتے دکھائی دیتے۔ دیکھنے والوں کو محسوس ہوتا کہ کائنات ہل رہی ہے...... اس کے دائیں بائیں دو صحت مند جوان تھے۔ جنہوں نے پلندے اٹھائے ہوئے تھے...... اور اسے باقاعدہ ہدایات دے رہے تھے...... ان کے اشارے پر وہ مسکراتی ہوئی سب سے پہلے اس قطار کی طرف بڑھی جو دروازے کے باہر بنی ہوئی تھی۔

ادا سے بال جھٹکے۔ رنگین تصویر والا اپنا بروشر نکال کے قطار میں کھڑے ہوئے پہلے رکن کو دیا......

اس کے کمر تک لمبے بال گھٹاؤں کا منظر پیش کر رہے تھے۔

اور آنکھوں میں التجا بھر کے بولی۔

میں آزاد امیدوار ہوں۔ پلیز مجھے ووٹ دیجیے گا۔ آپ جو کہیں گے میں وہ کروں گی۔

رکن نے گھبرا کر بروشر دیکھا۔ اس پر لکھا تھا......

کہکشاں تابانی۔ بی۔ اے

پلیز ووٹ مجھے دیجیے گا.
میں آپ کی ہر بات مانوں گی.

آگے اس کا پورا بایوڈاٹا لکھا تھا۔ مگر رنگین تصویر کو کون دیکھتا۔ جبکہ رنگین چہرہ اسقدر قریب تھا......
وہ جلدی جلدی ہر رکن کے پاس گئی...... بروشر بھی بانٹتی گئی اور سرگوشی میں اپنی التجا پلیٹ کے ہر رکن کے کان میں پھونکتی گئی......

پلیز ووٹ مجھے دیجیے گا۔ میں آپ کی ہر بات مانوں گی۔

خدا کے واسطے مجھے ووٹ دیجیے گا۔ آپ کا ہر حکم مانوں گی......

پلیز پلیز......

وہ التماس کرتی۔ آنکھوں سے باتیں کرتی فلم کی طرح تیز تیز گزرنے لگی۔

بعض ارکان تو اس طرح پسیج رہے تھے وہ سوچتے کم بخت ووٹ کی جگہ دل مانگے تو پہلے حاضر کریں۔ اتنے میں کمرے کے اندر سے آواز آئی۔

دروازہ بند ہونے کو ہے۔ کوئی کینڈی ڈیٹ باہر رہ گئی ہو تو اندر آ جائے۔

اس کا ایک پولنگ ایجنٹ اندر بھاگا گیا اور گھبرائے ہوئے انداز میں بولا۔

جی کہکشاں جی باہر ہیں......

بلاؤ ان کو...... آفیسر بولا۔ ایک منٹ کے بعد دروازہ بند ہو جائے گا پھر کوئی اندر نہیں آ سکے گا۔

ایجنٹ مصنوعی بوکھلاہٹ لیے دوڑا آیا......

کہکشاں جی...... اندر چلیے...... باقی بروشر میں خود تقسیم کر دوں گا۔

کہکشاں نے نظر بھر کر دیکھا...... لمحے بھر میں یہ قطار لمبی ہو گئی تھی۔ دائروں میں کھڑے ہوئے ارکان بھی خود بخود قطار میں لگ گئے تھے۔ مگر اب اسے اندر جانا تھا۔ اس لیے اس نے باقی بروشر اپنے ایجنٹ کو پکڑوائے اور اندر جانے کے لیے راستہ تلاش کرنے لگی۔ جان بوجھ کر اس نے تنگ راستے کو چنا

لائن توڑ کر دوسری طرف چلی گئی۔ لائن میں بھی کھلبلی مچ گئی۔ کہیں سے ٹوٹی...... کہیں سے بگڑی کہیں سے ٹیڑھی ہوئی...... ہر کوئی اسے اندر جاتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا اور ہر کسی کو وہ اندر جانے سے پہلے متوجہ کرنا چاہتی تھی اس لیے اس نے ایک خودساختہ سی سراسیمگی پیدا کی اور کسی پر گری، کسی کو گرایا...... کسی کے منہ پر سلک کی چادر جا پڑی...... کسی کے کاندھے سے زلفیں لپٹ گئیں...... کسی کو کہنی ماری...... کہیں کنگن بجایا......

معاف کیجیے......

آئی ایم ساری......

پلیز میرا نام یاد رکھیے میں کہکشاں ہوں......

راستہ دیجیے......

پلیز ہائے......

توبہ......

سوری......

گرتی، پڑتی، پھسلتی، پھلاتی بالآخر وہ دروازے کے اندر پہنچ گئی......

اندر پہنچ کر اس نے پلٹ کر دیکھا اور اپنے زخمیوں پر آخری خودسپردگی والی التجائی نظر ڈالی...... اور دروازہ بند ہو گیا۔

گرتی، پڑتی، پھسلتی، پھلاتی بالآخر وہ دروازے کے اندر پہنچ گئی......

باہر ایک پیغام بھری خوشبو سی اڑی......اور پورے چیمبر میں ہلچل مچادی......

زلفوں سے، رخساروں سے، آنکھوں سے، آنچل سے...... بدن کے زاویوں سے، اور مسکراہٹ کی مقناطیسیت سے یوں لگا۔ خالی میخانہ بھر گیا۔ جام کے جام لنڈھ گئے...... اور ساقی آ گیا۔

دور دراز کے دیہاتوں اور پسماندہ ترین چکوک سے ہزارہا ووٹوں سے جیت کر آنے والے نمائندوں کو یکایک حق رائے دہندگی کی اہمیت کا احساس ہونے لگا اور اپنا اپنا ووٹ بہت بیش قیمت لگا۔

پولنگ رات گئے تک جاری رہی۔

صبح اخبارات آئے تو سب سے بڑی خبر یہ تھی ایک آزاد امیدوار کہکشاں تابانی نے سب سے زیادہ ووٹ لیے......

مگر جیتنے والی باقی عورتوں میں طیبہ خاتون کا نام کہیں نہیں تھا۔

☆......☆......☆

ایک گُم شدہ افسانہ نگار

نوید انجم ...... ایک گم شدہ افسانہ نگار

یہ کوئی پینتالیس سال پہلے کی بات ہے کہ اردو افسانہ کے افق پر ایک نیا نام ابھرا...... نوید انجم ...... اس کی اٹھان ایسی تیکھی اور تاثر اتنا بھرپور تھا جس نے اردو ادب کے بڑوں کو بھی اپنی جانب متوجہ کرلیا اور عام قاری پر اتنا گہرا تاثر چھوڑا کہ وہ اس کی اگلی کہانی کے انتظار میں رہنے لگا۔ اردو کے ہر معیاری پرچہ نے اسے اپنے صفحات میں احترام کی جگہ دی۔ اس زمانہ میں ادبی جرائد کافی تعداد میں شائع ہوتے اور پڑھے جاتے تھے۔ اردو افسانہ نے اس سے بجا طور پر بڑی توقعات وابستہ کرلیں۔ مگر کرنا خدا کا یوں ہوا کہ یہ نام جس طرح اچانک ادب کے افق پر نمودار ہوا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اسی طرح اچانک غائب ہوگیا۔ ہماری معلومات کی حد تک اس کا کوئی مجموعہ بھی شائع نہیں ہوا تھا۔ وہ زمانہ کا تا اور لے بھاگی طرز کے مجموعے چھاپنے یا چھپوانے کا تھا بھی نہیں۔

ہم نے بہت کوشش کی کہ اردو کے اس گم شدہ افسانہ نگار کا کچھ سراغ ملے تا کہ اس کے کچھ حالات کچھ تاثرات اس کی تخلیقات کے ساتھ۔ قارئین کے سامنے آسکیں۔ مگر ہماری ہر کوشش ناکام رہی۔ اس سلسلہ میں ہم اپیل ہی کر سکتے ہیں کہ نوید انجم صاحب خود اس تحریر کو پڑھیں تو ہم سے رابطہ کریں یا قارئین میں سے کوئی صاحب ان کے بارے میں کچھ جانتے ہوں تو ہمیں مطلع فرمائیں۔

گم شدہ افسانہ نگار کی بازیافت کا جو سلسلہ ہم نے شروع کیا ہے اس کے لیے اس دفعہ نوید انجم کے تین افسانے ہفت روزہ ''لیل و نہار'' کی مختلف اشاعتوں سے لیے گئے ہیں۔ اردو کا یہ معیاری اور روایت ساز ہفت روزہ پروگریسو پیپرز کی جانب سے شائع ہوتا تھا اور ان دنوں اس کے مدیر اشفاق احمد تھے۔ ان افسانوں کے مطالعہ سے قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ افسانہ نگار کتنی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ موضوع کا انتخاب موضوع کے مطابق پلاٹ کی تعمیر۔ کہانی کے اجزاء کا انتخاب۔ ان اجزا کی ماہرانہ بنت۔ جزئیات کی گہرائی تک پہنچنے کی ژرف نگاہی۔ مشاہدہ کی وسعت۔ کردار نگاری پر ماہرانہ گرفت۔ انسانی نفسیات کا گہرا شعور۔ پلاٹ کے مطابق ماحول کی تعمیر۔ غرض یہ کہ اچھے اور معیاری افسانہ کے لوازمات پر اسے پوری دسترس حاصل تھی۔ ساتھ ساتھ بیان کی پوری قدرت کا حامل تھا۔ زبان وہی استعمال کی ہے جو خالص کہانی کی زبان ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ قارئین ان افسانوں کے ذریعہ اسے تادیر یاد رکھیں گے۔

(مدیر)

نوید انجم

سیپ اور موتی

ہلکی ہلکی پھوار میں کھڑی رضیہ بی اپنے چہرے پر پڑتے ہوئے ننھے منے قطروں سے بڑا حظ اٹھا رہی تھی اور اندر آنگن کے اس طرف اماں جی بیٹھی آلو چھیل رہی تھیں۔ بڑی بوا باورچی خانے میں سے بڑا تھال نکال کر باہر لائی تو اماں نے نظریں اٹھا کر دیکھا اور چھری ایک طرف رکھ کر بازو سے اپنا ماتھا پونچھا۔اے بوا سردیاں بس آئی سمجھو......!

بوا نے تھال نیچے رکھا۔اور کیا بی بی...... دیکھو تو کیسی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اور پھر مڑ کر اس نے رضیہ بی کو دیکھا۔بی تم کاہے کو ادھر بھیگ رہی ہو/ٹھنڈ لگ گئی تو؟

رضیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔بس ذرا سا منہ موڑ کر بوا کو دیکھا اور پھر مسکرا کر آنکھیں میچ لیں۔

بوا اب اماں سے کہہ رہی تھی۔بی بی اب جرا گرم کپڑے صندوقوں سے نکالو اور انھیں ہوا لگاؤ......

ہاں!

اماں جی کو جیسے کچھ یاد...... ارے ہاں...... اس بار نئی رضائیاں بھی تو بنوانی ہیں اور اٹھ کر وہ اندر والے کمرے کی طرف بڑھیں...... رضیہ کے ابو نے اس بار بڑی اچھی قسم کی روئی منگوائی ہے۔

بڑی بوا ان کے پیچھے پیچھے چل دیں۔

رضیہ نے چہرے پر سے بارش کے ننھے ننھے قطرے پسینے کی بوندوں کی طرح دائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے اکٹھے کیے اور آم کے پیڑ تلے جا کر کھڑی ہوئی۔آم کے نیچے کی زمین بالکل خشک تھی۔اس نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر جھکی ہوئی ٹہنی کو ذرا سا ہلایا تو ایک دم پانی کی بہت سی بوندیں ٹپکیں اور مٹی میں جذب ہو گئیں۔

اے رضیہ...... رضیہ! اندر سے اماں کی زور سے آواز آئی۔

کیا ہے...... اس نے ناگواری سے کہا۔

اے بی یہ تم نے روئی نکالی ہے کیا؟...... اماں نرم لہجے میں پوچھ رہی تھیں...... بوری بھری ہوئی

بی تم کاہے کو ادھر بھیگ رہی ہو! ٹھنڈ لگ گئی تو؟

تھی اللہ ماری آدھی بھی نہیں رہی!

لو اور سنو...... رضیہ نے کہا۔ میں نے کیا کرنی تھی روئی!

تو پھر گئی کدھر؟

اے مجھے کیا خبر

اس بار بوا بول رہی تھی...... اوئی بی بی...... بوری تو ساری کھالی ہوگئی۔

رضیہ چڑ گئی۔ بابا میں نے کس کام کو نکالنی تھی روئی...... وہ لے گئی ہوگی منی کی بچی...... وہ جو اپنی گڑیا پتولے بناتی پھر رہی تھی...... اور پھر تیز تیز لہجے میں بولی...... اماں تم سے کہے دیتی ہوں۔ منی کی بچی کی ناک میں نکیل ڈالو...... آوارہ ہوئی پھر رہی ہے مردار...... یہ عمر ہے اب گڑیا سے کھیلنے کی؟

اماں کو معلوم تھا منی کی عمر ابھی گڑیا سے کھیلنے ہی کی تھی پر انھیں روئی کے غائب ہو جانے کا دکھ زیادہ تھا غصے سے سر ہلا کر بولیں۔ سچ کہتی ہو۔ پر وہ ہے کہاں نامراد؟

سہیلیوں سے بیٹھی کھیل رہی ہوگی! رضیہ نے تنگ کر کہا۔

بوا بولی...... میں کہوں یہ سارے بچے کدھر چلے گئے۔ بی بی بارش میں تو انہیں باہر نہ جانے دیا کرو ہے ہے ہوا لگ گئی تو بیمار ہو جائیں گے۔

اماں جی روئی کی بوری گھسیٹتے ہوئے دروازے کی دہلیز تک لائیں اور پھر فرش پر نڈھال سی ہو کر بیٹھ گئیں...... لو دیکھو تو آجکل روئی بھلا ملتی کہاں ہے...... اور ادھر ساری کی ساری خیر سے گڑیوں کی رضائیوں کے لیے ضائع کی جا رہی ہے!

تو اور لاڈ کرو لاڈ! رضیہ جیسے پہلے ہی بچوں سے تنگ ہو رہی تھی۔ میں کہوں پہلے کیا ادھر کم بچے تھے کہ آپا بی نے بھی اپنے جنے ہوؤں کو ادھر لا چھوڑا......

بوا کمر پر ہاتھ دھرے بولی۔ اے بی وہ تو اس لیے چھوڑ گئیں کہ بچوں میں جرا بچے کھوش رہیں گے!

ایک دو بچے ہو جائیں تو مرد کے قدموں میں زنجیریں پڑ جاتی ہیں۔

اماں جی نے غور سے رضیہ کو دیکھ کر کہا۔ بیٹی یوں مت کہو...... اب اللہ تیری گود بھی......

نہ نہ مجھے نہیں چاہیے کوئی بچہ وچہ...... رضیہ نے زچ ہو کر کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اماں جی نے دوپٹے سے آنکھیں پونچھ لیں...... بوا اماں کے قریب سرک آئی۔ ٹھنڈی سانس بھر

کر ہولے سے بولی۔ کھالی گود بھی کیا بری نجر آتی ہے!

اماں نے روئی پہ یوں ہاتھ پھیرا جیسے رضیہ کے سر کے بالوں کو سہلا رہی ہوں۔ سچ کہتی ہو بوا...... اور پھر ان مردوں کی ذات کا اعتبار بھی کیا...... سچ کہتے ہیں بزرگ ایک دو بچے ہو جائیں تو مرد کے قدموں میں زنجیریں پڑ جاتی ہیں۔ پھر وہ ادھر ادھر نہیں دیکھا کرتے......

خیر...... خیر...... اماں جی نے چونک کر کہا رضو کا میاں اللہ کے فضل سے ایسا نہیں۔

وہ تو مولا پاک کا فجل ہے بی بی۔ بوا نے کہا۔ پر دعا کرو اللہ کھوشی دکھائے!

اماں نے دوپٹے سے ناک کی پھننگ صاف کی۔

اتنے میں باہر والا دروازہ زور کی آواز کے ساتھ کھلا اور سارے بچے شور مچاتے اندر آنے لگے۔

اے کدھر پھر رہے ہو کمبختو! اماں نے چیخ کر کہا۔ نہ بارش کی فکر ہے نہ کسی اور بات کی...... یوں آوارہ پھر رہے ہیں جیسے پوچھنے والا کوئی نہیں......

منی چیخ رہی تھی۔ اے اماں دیکھو تو اے دیکھو تو......

اماں نے اس کی طرف دھیان دیے بغیر غصے سے کہا۔ میں کہوں منی...... تو نے یہ ساری روئی کا ستیاناس کر ڈالا!

اری پھینک اسے نالی میں سارے ہاتھ ناپاک ہو گئے......

اے واہ! ہم نے کیا کرنی تھی روئی! منی بولی۔ یہ ساری تو اس نے چرائی!

کس نے ری؟ انہوں نے چونک کر اس ننھی سی چیز پہ نگاہ ڈالی جو منی ہاتھ میں لیے انہیں دکھا رہی تھی اور پھر خوفزدہ ہو کر انہوں نے زور سے چیخ ماری۔ اے چھوڑ اسے کتیا...... یہ کیا اٹھا لائی...... اری پھینک اسے نالی میں سارے ہاتھ ناپاک ہو گئے......

نانی اماں یہ میں نے پکڑا ہے! آپا بی کا بڑا بیٹا مسعود بڑے فخر سے کہہ رہا تھا۔

یہ بھی کوئی کھیل ہے...... پھینک یہ چوہے کا بچہ انھیں بڑی کراہت آ رہی تھی۔

نہیں اماں! منی بولی۔ یہ تو گلہری کا بچہ ہے۔

اے چھی چھی! بوا کا جی متلانے لگا...... چوہیا ہی تو ہے!

اماں نے غور سے دیکھا گوشت کے ٹکڑے کی طرح منی کی ہتھیلی پر وہ پڑی سسک رہی تھی۔ چڑیا

کے بچے کی طرح ننگی کھال پہ نرم نرم روئی کے سے بال تھے اور سر سے لے کر کمر تک گہری نیلی نیلی لکیریں سی تھیں۔ لمبی سی دم پر بھی ابھی پورے بال نہ آئے تھے...... اے یہ تمہیں ملا کہاں سے...... انہوں نے پکار کر کہا۔ اچھا جا مسعود بیٹا اسے وہیں گھونسلے میں جا کر رکھ آؤ......

اس کا گھر تو منی نے توڑ ڈالا......

جھوٹ کہتا ہے اماں یہ تو اچھو نے پکڑا......

نانی اماں اس کے گھر کی ساری روئی ادھر ادھر پھینک کر ناس مار ڈالا......اور بھی تو بچے تھے وہ سب انہوں نے مار ڈالے......بس اک یہی زندہ بچا۔ مسعود سے چھوٹا پو چیخ چیخ کر بتا رہا تھا۔

اے لو مجھے یاد آیا...... تبھی میں روز دیکھتی تھی کہ یہ موئی گلہریاں منہ میں اتی اتی ساری روئی پکڑے بھاگی چلی جا رہی ہیں...... رضیہ بچوں کا شور سن کر وہیں آ گئی تھی اور منی کی ہتھیلی پر سسکتی ہوئی ننھی سی جان کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔

ہے ہے ساری روئی کا ناس مار ڈالا نامرادوں نے اماں جی نے گلہریوں کی سات پشتوں کو کوس ڈالا پر جی ہلکا نہ ہوا۔ جاؤ پھنکوا سے اور ہاتھ خوب مل کر دھونا......

اے واہ...... یہ تو ہم پالیں گے۔ منی نے ہتھیلی کھینچ کر جیسے بچے کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔

اوئی! اماں نے ہولے سے چیخ کر کہا اے میں کہوں اب اسے ہاتھ جو لگایا تو میں روئی کو ناپاک ہاتھ نہ لگانے دوں گی......

اے کیا پلے گا بیچارہ...... مر جائے گا اتا سا تو ہے گوشت کی بوٹی جیسا بوا نے متلاتا ہوا جی ٹھیک کرنے کو نیبو زبان سے لگا رکھا تھا۔

رضیہ نے بڑے جھجھکتے ہوئے منی کی ہتھیلی کو چھوا...... پر یہ پلے گا کیسے؟

مسعود آگے بڑھا...... خالہ مجھے خبر ہے...... ہمارے ایک دوست نے بھی گلہری رکھی ہوئی ہے!

بی میں یہ کھیل یہاں نہ کھیلنے دوں گی...... ہاں! اماں جی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ گھر نہ ہوا چڑیا گھر ہو گیا...... بھلا کوئی گھر میں گلہریاں بھی پالتا ہے!

بوا نے منہ بنا کر کہا۔ ٹھیک کہتی ہو بی بی...... یہ کوئی انگریجوں کا گھر تھوڑی ہے۔ وہ جدھر مس جوناں رہتی تھی نا...... سو اس نے بھی اک گلہری کو پال رکھا تھا...... ہے ہے وہ تو سارا سارا دن کندھے پر اسے بٹھائے ادھر ادھر گھوما کرتی تھی...... پر بی بی وہ تو تھی ہی انگریج کی بچی۔ انہوں کو تو سور بھی حلال ہے! رضیہ نے دلچسپی لی پر بوا وہ اسے گردن پر کاٹ نہ دیتی تھی!

لو اور سنو...... اماں جی نے مارے حیرت کے ناک پر انگلی دھر لی۔

توبہ کرو بی بی۔ بوا نے سر ہلایا۔ بس سارے پنڈے پر پھدکتی پھرتی تھی۔ مس صاحبہ تو اپنے ہاتھ سے اسے کھلاتی پلاتی تھیں۔ کبھی کیک دے رہی ہے تو کبھی دودھ پلا رہی ہے......

لو اور سنو...... اماں جی نے مارے حیرت کے ناک پر انگلی دھر لی۔

مسعود کہہ رہا تھا۔ نانی اماں تھوڑا سا دودھ دو...... ہم اسے پلائیں گے!

میں باز آئی ایسے لاڈ پیار سے...... میرے پاس اس کے لیے دودھ نہیں رکھا...... جا لڑکے اسے کہیں پھینک آ...... بیچاری ممتا کی ماری اس کی ماں دیوانی ہوئی پھر رہی ہوگی۔

پپو رونے لگا۔ نہیں جی...... نہیں جی اسے تو ہم پالیں گے!

رضیہ نے ہولے سے گلہری کا بچہ اپنے دائیں ہاتھ پر رکھ لیا۔ رہنے دو اماں...... آخر حرج ہی کیا ہے۔

واہ جی خوب کہی! اماں نے کہا مجھے تو دیکھ کر گھن آتی ہے!

اسے میں پالوں گی! رضیہ نے بچے کو پیار سے تھپکا اور سارے ننھے منے بچے خوش ہو کر تالیاں بجانے لگے!

اماں جی نے رضیہ کو اس میں دلچسپی لیتے دیکھا تو اک آہ ان کے سینے میں گھٹ کر رہ گئی اور بڑی بوا نے اماں جی کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں...... بی بی یونہی ہوا کرتا ہے...... اور ہولے سے وہ بڑبڑا بھی دیں۔ کھالی گود سکھ چین نہیں لینے دیا کرتی......!

پر اس کا نام کیا رکھیں؟ منی نے پوچھا۔

کیوں بوا......؟ رضیہ نے پوچھا۔ مس جون نے اپنی گلہری کا کیا نام رکھا تھا......

اے وہ...... وہ...... وہ سر کھجلانے لگی۔ موا ایسا ویسا سا نام تھا...... اے وہی ریتھا...... ریتا...... ہاں یہی نام تھا نگوڑی نے رکھا......

یہ لڑکی اس وقت بچوں میں کس طرح گھلی ملی بچہ بنی ہوئی ہے......

اچھا ریتا......! رضیہ نے مزے سے کہا۔ ہاں تو اس کا نام ریتا ہے!

پپو اس قدر خوش ہوا کہ اچھل اچھل کر ہنسنے لگا۔ ریتا...... ریتا...... ریتو ریتو!

اور اماں جی حیرت سے آنکھیں پھاڑے رضیہ بی کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھیں کہ یہ لڑکی اس وقت بچوں میں کس طرح گھلی ملی بچہ بنی ہوئی ہے...... ورنہ جانے اس بدنصیب کو کیا ہوتا تھا کہ بچوں کو

بات بے بات ڈانٹ ڈپٹ دیتی تھی اور بات بھی یوں کرتی تھی جیسے کاٹ کھانے کو دوڑتی ہو...... پر اس گلہری کے بچے نے جانے کیا جادو کیا کہ بیزار بیزار رہنے والی رضیہ اب مسکراتے ہوئے بچوں کے ساتھ باتیں کیے جا رہی تھی۔

بڑی بوا باورچی خانے میں سے ایک پلیٹ میں دودھ لاتے ہوئے سرد آہیں بھرتی رہیں اور اماں جی کے قریب سے گزرتے سے انہوں نے ذرا اونچی آواز میں خدا سے دعا کی کہ وہ اپنی رحمت سے رضیہ بی کی گود بھرے...... یہ ذرا سی اونچی آواز اس لیے تھی تا کہ اماں جی سن سکتیں اور اماں جی نے سن کر بوا جی کو بڑی ہی شکر گزار آنکھوں سے دیکھا۔

میں بتاؤں...... اسے دود کیسے پلاتے ہیں؟ مسعود نے آگے بڑھ کر کہا۔

ہاں جی جس طرح بلی کے بچے کو پلاتے ہیں منی نے کہا۔

ارے نہیں...... اسے یوں دودھ پینا نہیں آتا۔

تو پھر کیسے پلائیں۔ رضیہ نے پوچھا۔

مسعود نے بوری میں ہاتھ ڈال کر ذرا سی روئی نکالی۔ اماں جی چلائیں۔ اے خبردار پہلے ہی ناس مار دیا ہے۔ بس تھوڑی سی چاہیے۔ نانی اماں۔

مسعود نے ذرا سی روئی کو دودھ میں ڈبویا اور دودھ سے لتھڑی ہوئی روئی کی چھوٹی سی بتی گلہری کے منہ کے ساتھ چپکا دی۔

ارے واقعی...... یہ تو دودھ روئی میں سے چوس رہی ہے!

گلہری نہیں رہتا کھو رہتا!

گلہری نے دودھ چوس لیا اور خالی روئی رہ گئی مسعود نے پھر دودھ میں اسے تر کیا اور دوبارہ اس کے منہ کے ساتھ لگا دیا......

رضیہ کو تو جیسے سچ مچ کا کوئی ننھا سا انسان کا بچہ مل گیا تھا......

اسے ہٹاؤ پرے...... اماں جی بولی میرا جی برا ہوتا ہے!

پر رضیہ بچہ بنی ہوئی تھی اور اماں جی کو اس کی خاطر چپ ہو جانا پڑا۔

چند روز یونہی گزرے بچے آہستہ آہستہ گلہری کے ننھے سے بچے سے غافل ہوتے گئے پر رضیہ کو تو

جیسے سچ مچ کا کوئی ننھا سا انسان کا بچہ مل گیا تھا...... یوں اس کی حفاظت کرتی کہ بوا آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتی رہ جاتی اور سچ جانو تو یہ رضیہ کی دیکھ بھال ہی کا نتیجہ تھا کہ چند دنوں میں اس کا جسم ملائم ملائم بالوں سے بھر گیا...... سرخ رنگ کی جلد بھورے رنگ کے بالوں سے ڈھانپی گئی اور نیلی دھاریوں کا رنگ سیاہ ہو گیا۔ زیرہ سی آنکھیں زندگی کی چمک سے معمور ہو گئیں اور پھر تو اس نے جیسے یکدم چولا بدلا اور اس قدر خوبصورت نظر آنے لگی کہ اماں بی نے بھی اس دوپہر پیار سے اسے پشت پر سہلایا۔ اے بی خدا کی قدرت دیکھو...... کیا خوبصورت جانور ہے انہوں نے کہا۔

اب بچوں کو جیسے اس کھلونے بنا چین نہ آتا۔ رضیہ کی آنکھ بچا جھٹ سے وہ اسے آنگن میں لے آتے اور کھیلا کرتے پر جونہی اسے خبر ہوتی وہ بھاگی آتی اٹھا کر اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر دھر دیتی۔ نامرادتم تو اس کو مار ہی دو گے!

واہ خالہ...... ہمیں کھیلنے دو نا...... مسعود نے کہا۔

چل رہے...... میں دیکھ بھال کرتی ہوں اور اب اس کو ہوش آیا ہے۔

پھر وہ اسے فرش پر چھوڑ کر خود ذرا دور جا کھڑی ہوئی اور منہ سے چچ چچ کی آواز کے ساتھ ساتھ ہاتھوں سے چٹکیاں بجا کر اسے اپنے پاس بلانے لگی۔

بوا دانتوں تلے انگلی دابے پاس آن کھڑی ہوئی۔ بی یہ گلہری کی بولی بھی بولنے لگیں!

مسعود سینہ پھلا کر چلایا۔ بوا میں نے خالہ کو گلہری کی طرح بولنا سکھایا ہے!

گلہری نے ادھر ادھر سونگھا اور پھر رضیہ بی کی آواز کی سمت بھاگی آئی۔ قریب آ کر اس نے رضیہ بی کے ہاتھوں کو سونگھا پھر کلائی تک چڑھ آئی۔

میری ریٹا...... میری ریٹا! رضیہ بی خوشی سے نہال ہو گئی۔

بوا نے جلدی سے آنکھیں پلو سے صاف کیں۔ بے اولادی بھی کوئی زندگی ہے...... ہے ہے یہ روگ تو ایسا ہے کہ دنیا بھر کی خوشی ریت کا ذرا بن کر رہ جاتی ہے۔

رضیہ نے اداس ہو کر بوا کی طرف دیکھا اور گلہری کندھے پر بٹھائے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اسی رات باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی اماں کے چہرے پر گہرے فکر کی لکیروں کا اک جال بچھا ہوا تھا۔ بچی کچھی پلکیں جو سفیدی اختیار کر رہی تھیں بوڑھے رخساروں پر لمبے لمبے سائے پھیلا رہی تھیں اور ہونٹوں کے کونے لرز لرز کر رہ جاتے تھے۔

بیٹی کا دکھ ماں کے کلیجے پر چھریاں نہ چلائے تو اور کیا ہو گا۔ بوا نے یوں کہا جیسے خود اپنے دل پر چھویوں کے وار سہہ رہی ہو۔

اے بی لڑکا تو بڑا اچھا ہے پر کب تک یوں چلے گا۔ اس کی ماں بڑا زور دے رہی ہے۔

ہے ہے وہ کیسے اجازت دے...... بھلا کوئی اپنی کھوشی سے سوت کا منہ دیکھے گی؟

بی اتنی ہمت کرے ماں کو صاف کہہ دے دوسرا بیاہ مجھ سے نہ ہوگا...... بوانے غصے سے دست پناہ راکھ جھونکتے ہوئے کہا۔

تو کئی بار کہہ چکا ہے پر مجبور ہو جاتا ہے اور پھر بیوی سے آ کر......

ہے ہے وہ کیسے اجازت دے...... بھلا کوئی اپنی کھوشی سے سوت کا منہ دیکھے گی؟ بوا کو سچ مچ رونا آ گیا۔ اب دیکھ لو...... یہاں بیٹھے ہوئے کتنے مہینے گزر گئے ہیں...... اماں نے رونی آواز میں کہا۔ سچ کہتی ہوں جب اسے اداس دیکھتی ہوں تو میرے کلیجے پر جو گزرتی ہے وہ میں ہی جانتی ہوں...... بیان کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں!

کیا! بوا بولی۔ جرا دیکھو تو گلہری کے بچے کے کیا لاڈ پیار کرتی ہے۔ بچے کو ترس جو رہی ہے!

اماں جی نے آہ بھری۔

اللہ فجل کرے گا! بوانے کہا۔

اماں جی...... اے دیکھو تو یہ تو اب اپنے آپ کھانے لگ گئی ہے! اندر سے رضیہ بی کی آواز آئی۔

اے کون بیٹا؟

یہ میری ریٹا اماں!...... اب تو یہ بڑی ہو گئی ہے!

اماں جی نے اداسی سے نظریں جھکا لیں۔

چند دنوں بعد کی بات ہے۔ اماں جی پھر بوا سے گھسر پھسر کر رہی تھیں اور دوسرے کمرے میں رضیہ بی کمٹی سمائی ویران نظروں سے اپنے میاں کو تک رہی تھی۔

پھر اسی لیے آیا ہے نا! بوانے ناگواری سے کہا۔

اور کیا...... بیوی سے کہتا ہے اپنی خوشی سے اجازت دے ڈال......

واہ رے مولا پاک! تیرے کھیل بھی نیارے ہیں! بوانے آہ بھری۔

باہر آسمان پر کالی گھٹائیں چھا رہی تھیں اور رضیہ کی آنکھیں اندر کمرے میں جل تھل ہو رہی تھیں۔ سر کے کالے بال ہلکی ہلکی ہوا میں لہرا کر اڑتے اور گورے چٹے چہرے پر بکھر بکھر جاتے۔

کتنے روز رہے گا؟

دو تین دن!

اس رات بڑی بارش ہوئی اور رات کے پچھلے پہر جب شوہر کے پہلو سے اٹھ کر رضیہ آنگن میں آئی تو بجلی جلا کر اس نے دیکھا۔ باہر نشیب میں کافی پانی کھڑا تھا......

پانی کی لاکھوں کروڑوں بوندیں بارش کی صورت ٹپکی ہوں گی اور جانے کتنی سیپیوں میں قطرہ آب موتی بن کے رہ گیا ہوگا اس نے سوچا اور ننگے پاؤں گیلی زمین پر بے مقصد ادھر ادھر پھرتے ہوئے اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے پیروں تلے کنکر نہ تھے خالی سیپ تھے...... وہ سیپ جن میں کوئی موتی نہ تھا...... وہ سیپ جن کی کوئی قیمت نہ تھی۔

اور اس لمحے اسے محسوس ہوا جیسے وہ خود ایک سیپ تھی جس میں کوئی موتی نہ تھا اور...... اور یہ سوچتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اس صبح اسے ہلکا ہلکا بخار تھا۔

وہ سیپ جن میں کوئی موتی نہ تھا...... وہ سیپ جن کی کوئی قیمت نہ تھی۔

بخار کی حالت میں اسے بار بار گلہری کا خیال آتا۔

اے وہ بھوکی نہ ہو۔ اس نے اماں جی سے کہا۔

کون؟ اس کے میاں نے پوچھا۔

اے بیٹا...... وہ بچوں نے ایک گلہری کا بچہ پال رکھا ہے! اماں جی نے بتایا۔

گلہری...... چھی چھی! اس نے زمین پر تھوکا۔ یہ بھی کوئی چیز ہے پالنے کی؟

دیکھو تو سہی بڑا کھوبصورت جناور ہے میاں! بوا نے پہلی بار گلہری کی تعریف کی۔ اے لانا تو جرا ادھر مسعود میاں!

مسعود نے ہتھیلی پر اسے بٹھا رکھا تھا اور وہ اپنے اگلے پنجے اٹھائے بالوں بھری دم پھلائے بسکٹ کا ایک ٹکڑا کتر کتر کر کھا رہی تھی۔ منی اور پپو اشتیاق بھری نظروں سے اسے تک رہے تھے۔ ہائے کتنا پیارا لگتا ہے! دیکھو تو ایک مزے دار کھیل بتاؤں مسعود نے کہا اور گلہری کو دم سے پکڑ کر لٹکا دیا۔ دیکھو دیکھو!

اماں جی اور بوا ہائیں ہائیں کرتی رہ گئیں اور گلہری نے سٹپٹا کر سیدھے ہونے کی کوشش کی اور اپنی دم کو پکڑ کر دوہری ہوئی اور یوں سیدھا ہونے کی کوشش میں وہ روئی کا ایک گولا بن کر رہ گئی۔

رضیہ بی نے غصے سے اٹھ کر مسعود کے ایک زور کا تھپڑ مارا اور گلہری کو اٹھا کر اپنے کندھے پر رکھ

لیا۔ مسعود بسور کر فرش پر بیٹھ گیا اور اس کے میاں تھو تھو کرنے لگے۔ بھئی ہمیں یہ جانور بالکل اچھا نہیں لگتا۔

ہاں جی آپ کو بھلا کوئی چیز کاہے کو اچھی لگنے لگی۔

رضیہ بی کی آنکھوں میں آنسو تھے اچھی چیزیں تو دوسری جورو لے کر آئے گی نا!

وہ چپ رہے۔

اماں نے آنکھوں پر پلو رکھ کر منہ پھیر لیا۔

اس رات رضیہ بی نے بڑا ڈراؤنا خواب دیکھا۔ وہ جیسے آم کے پیڑ پر چڑھی ہوئی تھی اور نیچے آنے کی کوئی راہ نہ تھی۔ آم کا پیڑ تھا کہ بڑھتا ہی چلا جاتا تھا اور وہ چڑھتے چڑھتے تھک کر نڈھال ہوگئی تھی۔ دفعتاً اس کے کندھے پر بیٹھی ہوئی گلہری شور مچانے اور چیخنے لگی اور پھر پھدک کر وہ آم کی موٹی ٹہنی پر جا چڑھی...... رضوبی نے اسے روکنا چاہا پر وہ نہ رکی اور اوپر کو چڑھنے لگی پیچھے پیچھے رضوبی اسے رکنے کو کہتی ہوئی چڑھنے لگی اور پھر ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لیا...... تب جیسے گلہری نے رضوبی کے ہاتھ میں کسمسا کر رونا شروع کر دیا اور پھر جیسے وہ نہ جانے کہاں غائب ہوگئی۔ حیران اور پریشان رضوبی نے ہاتھ کھولا تو ہتھیلی پر ایک ننھا سا چمکتا ہوا موتی نظر آیا۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑے رضوبی اس موتی کو گھور رہی تھی کہ وہ ہاتھ سے پھسلا اور گر گیا...... تب جیسے رضوبی آم کے ٹہنے سے موتی کے پیچھے گری اور پھر گرتی ہی چلی گئی منہ سے ایک خوفناک چیخ نکلی تو رضوبی کی آنکھ کھل گئی وہ پسینے میں شرابور ہو رہی تھی اور ان کے پہلو میں سویا ہوا ان کا میاں جاگ کر آنکھیں ملتا ہوا بیزاری سے کہہ رہا تھا کیا ہوا...... ڈر گئیں کیا؟

اس رات رضیہ بی نے بڑا ڈراؤنا خواب دیکھا۔

اس نے منہ پھیر کر تکیے میں سر چھپا لیا اور رونے لگی۔

دو تین روز کے بعد اس کا میاں واپس چلا گیا اور اس کے جانے کے بعد جیسے رضوبی کا دل گلہری سے بھی اچاٹ ہو کر رہ گیا باولی ہو ہو وہ بار بار آم کے پیڑ تلے جا کر بیٹھ جاتی اور اماں جب بلاتیں تو ہوں ہوں کر کے چونک سی جاتی۔ تب پھوا کہتی اے بی کیا بات ہے...... بوا اپنا کھیال تو رکھو......

پر اس روز گلہری کی محبت نے پھر جوش مارا۔

ہوا یوں کہ دو تین دنوں بعد جب اماں جی کے کہنے پر رضو نے اپنے بالوں میں کنگھی کی تو اسے گلہری یاد آئی اتنے دن بچے ہی اسے لیے لیے پھرتے تھے۔ رضوبی نے آنکھ تک اٹھا کر اسے نہ دیکھا

تھا۔ فوراً اٹھ کر لکڑی کا وہ ڈبہ کھولا جس میں گلہری کا روئی سے گھر بنایا گیا تھا اور ڈھکنے میں بہت سے سوراخ کیے تھے کہ تازی ہوا پہنچتی رہے۔ پر جب دیکھا تو ڈبہ خالی تھا۔

رضوبی یوں بیقرار ہوئی جیسے اپنی کوکھ کا جنا بچہ گم گیا ہو......

اماں جی او۔ بوا نے یہ کیفیت دیکھ کر آوازیں دینی شروع کریں۔ اری ہوتنی...... گلہری کدھر ہے ری......

پپو نے بتایا مسعود بھیا جیب میں لیے پھرتے ہیں!

اے لو...... اماں نے کہا اور سنو بھلا یہ بھی کوئی جیب میں رکھنے کی چیز ہے؟

غضب خدا کا! رضوبی نے سینے پر ہاتھ دھر لیا۔ مر نہ جائے گی جیب میں؟

میں کہوں یہ بچے تو اسے مار کر ہی دم لیں گے! بوا نے چیخ کرتے ہوئے کہا۔

رضو نے مسعود میاں کے دو ایک لگائیں پر جب اس کی نیکر کی جیب میں سے گلہری نکلی تو اچھی بھلی تھی...... رضوبی کی جان میں جان آئی۔

مسعود بسور رہا تھا۔ واہ ہم اتنے دنوں سے اسے یوں جیب میں لیے پھرتے ہیں کچھ بھی نہ ہوا اور ہونا بھی کیا تھا یہ مر تو نہ جاتی! ہ

نامراد نے کسر تو نہ چھوڑی تھی مارنے کی! رضوبی نے جیسے سانس روک کر خود سے کہا۔

اس رات خواب میں رضوبی کو گلہری کا جنازہ نظر آیا اور رات کئی بار چونک چونک کر اس نے سسکیاں بھریں اور پھر خود کو جیسے تابوت میں بند مردہ دیکھ کر رضوبی کا جی دہل گیا اور اس رات جب وہ ڈر کر اٹھیں تو انہیں پھر نیند نہ آئی...... بس ساری رات بیٹھی اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر خلا میں تکتی رہی۔ پر اس دوپہر مارے خوشی کے اماں جی کا برا حال تھا اور رضوبی تے کرتے ہوئے بھی مسکرا رہی تھی۔ بوا باورچی خانے میں بیٹھی جیسے انگلیوں کی پوروں پر کچھ گن رہی تھی کہ بچوں کا شور سا مچ گیا۔

بوا نے دروازے میں سے جھانک کر دیکھا اور پھر چلائی۔ اے رضوبی...... میں کہوں ان بچوں نے تو بیچاری ننھی سی جان کو مار کر ہی چھوڑنا ہے......

رضوبی چونک سی گئی پھر ہولے سے اٹھی اور بچوں کے درمیان کھڑے پپو کی ہتھیلی پر سے سہمی ہوئی گلہری کو ہولے سے اٹھا کر اس نے اپنے سینے سے لگا لیا۔

میں کھوں ان بچوں نے تو بیچاری ننھی سی جان کو مار کر ھی چھوڑنا ھے......

اس شام جب سارے بچے باہر کھیلنے کو گئے ہوئے تھے رضو بی نے ڈبہ کھول کر گلہری کو نکال کر دیکھا۔ رضو بی کو یوں محسوس ہوا جیسے گلہری کے بچے کی جگہ ایک نوجوان نئی نویلی بیاہی گئی دلہن بیٹھی اسے تک رہی ہے اور اس کی آنکھیں زندگی کی چمک سے معمور ہیں۔

پلکیں جھپک کر رضو بی مسکرائی تو گلہری نے اپنے دونوں پنجے اٹھا کر ہولے سے اپنا منہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور اس کی ہتھیلی کو سونگھنے لگی۔

رضو بی بڑی دھیمی دھیمی چال چلتی ہوئی آم کے پیڑ کے نیچے آئی اور پھر بڑے اطمینان اور پیار کے ساتھ اس نے گلہری کو آم کے سب سے موٹے ٹہنے پر چڑھا دیا۔ پیڑ کی خوشبو گلہری کے نتھنوں سے اس کے سارے بدن میں یوں کھلی کہ بالوں بھری دم پھول کر ایک پھول سا بن گئی بڑی تیزی کے ساتھ وہ بھاگی اور پتوں کے جھنڈ میں غائب ہوگئی۔

رضو بی مسکراتی ہوئی آنگن کی طرف پلٹ آئی۔

☆......☆......☆

نوید انجم

سورج مکھی

مسعود گلی کا موڑ مڑا ہی تھا کہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔

سامنے کے مکان کا دروازہ پورا کھلا ہوا تھا اور لالی کمر پر اپنے دونوں ہاتھ دھرے دہلیز کے درمیان کچھ اس طرح سے اکڑ کے کھڑی ہوئی تھی کہ اس کے سینے کا ابھار کچھ زیادہ ہی ابھر آیا تھا اور کولہوں پر نظریں آپی آپ ٹک جاتی تھیں۔ اس کے سیاہ بال جن میں ہلکے ہلکے خم بڑے بھلے نظر آتے' کچھ الجھے الجھے سے تھے اور ماتھے پہ بکھری ہوئی لٹیں اس کے تمتمائے ہوئے رخساروں پہ کہیں کہیں سایہ بن کر عجب بہار دے رہی تھیں۔ پر جتنی حسین وہ اس لمحے نظر آ رہی تھی اتنی ہی بدزبانی سے وہ تڑ تڑ گالیاں اور کوسنے دیے جا رہی تھی۔ میرا کیا کہتی ہو' اپنے سور سے مردودے کی طرف تو دیکھو جس کی مومیائی ساری کی ساری تو نے نچوڑ لی...... کتیا! اس نے زور سے زمین پہ تھوک کر کہا اور دائیاں ہاتھ کولہے پر سے اٹھا کر اپنی تنی ہوئی گردن کی پشت پر بالوں کے نیچے رکھ لیا۔

چپ رہ نی گشتیے! جینو تیلن ہڑبڑا کر چلاتی۔ زبان تالو سے کھینچ لوں گی!

ہے ہے بڑی آئی سورنی! اس نے اپنا ہاتھ نچایا۔ مجھے کیا اپنا مرد سمجھ رکھا ہے جو یہ دھونس دیتی ہے؟

چڑیل اپنا خصم کھا گئی اب اور کیا......

بکواس نہ کر حرامزادی۔ ایک تڑاخے کے ساتھ لالی نے بات کاٹی۔ اپنے آپ کو دیکھ ری! میاں کے سامنے غیروں سے آنکھ مٹکا کراتی پھرتی ہے اور وہ بے غیرت ہے کہ آنکھوں سے دیکھتا ہے پر رہتا چپ ہی ہے۔ پھر جلدی سے سانس لے کر بولی۔ ہاں ہاں اس کی زبان جو تو نے گدی سے نوچ پھینکی ہے' کرے بھی تو کیا کرے غریب آنکھوں دیکھے مکھی نگلتا رہتا ہے۔

جینو تیلن کو جب اور کوئی تجربہ کارگر ہوتے نظر نہ آیا تو وہ گلی کے درمیان تقریباً لیٹ گئی اور دھول میں اٹے ہوئے بالوں کو نوچتے ہوئے دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

> **مجھے کیا اپنا مرد سمجھ رکھا ہے جو یہ دھونس دیتی ہے؟**

لالی نے فتح کے جذبے سے آلودہ نظریں اردگرد کھڑے لوگوں پہ ڈالیں اور بائیں ہاتھ کو سینے کے ابھار کے درمیان میں رکھ کر اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ پھر نچلا لب قدرے سکوڑتے ہوئے اس نے سر کے ایک جھٹکے کے ساتھ ماتھے پہ بکھری لٹوں کو پیچھے ہٹایا اور بڑی بے نیازی کے ساتھ دہلیز پر سے قدم اٹھا کر اندر سے دروازہ بند لیا کر۔

مسعود نے بند دروازے کی طرف بڑی نفرت سے دیکھا' پھر گلی کے درمیاں لوگوں کے ہجوم میں روتی ہوئی تیلن کو دیکھنے لگا جو لالی کے کوسنے اور طعنے دہرا دہرا کر بری طرح بلک رہی تھی اور اردگرد بہت سی عورتیں اس پہ جھکی ہوئی اسے دلاسہ دے رہی تھیں۔

میں تو کہوں اس کے منہ ہی نہیں لگنا چاہیے۔ ایک ادھیڑ عمر عورت کہہ رہی تھی۔

اس کی ناک پہ مکھی بیٹھے تو آفت مچا دے۔ اونہہ! بے نادینے کی بیٹی! ایک نے ناک پہ انگلی رکھ کر کہا۔ جیسا باپ بڑا لڑاکا تھا ویسی بیٹی ہے!

وہ ان عورتوں کو بڑبڑاتے چھوڑ' آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اپنے کمرے تک آیا' تالا کھولا اور پھر ایک انگڑائی لے کر جسم ڈھیلا کرتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔

جب سے وہ اس محلے میں آیا تھا روز روز کی لڑائیوں سے مانوس ہو گیا تھا۔ کوئی دن ہی جاتا تھا کہ لالی کی کسی عورت یا مرد سے جھڑپ نہ ہوئی ہو۔ کوئی بات ہو نہ ہو لالی کسی نہ کسی سے جھگڑا ضرور کر بیٹھتی اور پھر وہ وہ گالیاں سناتی اور کوسنے دیتی کہ سننے والا حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہ جاتا۔

بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ہر دم بے باکی سے دیکھنے والے کو گھورنے لگتیں۔

سچ پوچھو تو تھی بڑی حسین...... پر اس کا حسن کچھ اس قسم تھا کہ چمکیلے سیاہ بالوں میں اکثر مٹی رچی بسی ہوتی اور ہونٹوں کی سرخی جس کو دیکھ کر اکثر دھوکا ہوتا کہ اس نے مسی لگا رکھی ہے۔ خون سے مشابہہ معلوم ہوتی۔ چہرے پر دائیں آنکھ کے نیچے ایک بھورا تل اکثر مٹی میں چھپا رہتا اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ہر دم بے باکی سے دیکھنے والے کو گھورنے لگتیں۔ ان آنکھوں پہ جھکی ہوئی پلکیں تو اتنی لمبی تھیں کہ بار بار آنکھ جھپکنے پر آنکھ میں جا پڑتی تھیں اور وہ ایسے میں بڑے دلفریب انداز سے مسکراتی اور اپنی لانبی انگلیوں سے اپنے پپوٹے مسلتے ہوئے اک گالی ضرور نکالتی۔

اس نے پہلی بار لالی کو جب دیکھا تو وہ اپنی پڑوسن سے الجھ رہی تھی۔ وہ دفتر سے واپس آیا تھا اور

تھکا ہارا ابھی اپنے کمرے میں آ کر چار پائی پہ لیٹا ہی تھا کہ شور سن کر اٹھا اور گلی میں نکل آیا۔ وہاں لالی کو اس نے دیکھا جو بری طرح چیختی چلاتی اپنی پڑوسن کو قبر میں ملنے والے عذاب یاد دلا رہی تھی۔

مسعود کو لالی اس لمحے ایک ایسی خونخوار خوبصورت عورت محسوس ہوئی جو اپنے حسن کے جادو سے سب کو دام عشق میں پھانس کر ان کے لہو اور گوشت سے اپنا پیٹ بھرتی ہو۔ یہ خیال اسے کیونکر آیا یہ اسے خود معلوم نہ ہوا۔ بعد میں جب وہ لالی کی گالیوں اور کوسنوں پر لعنت بھیجتا شرمندہ سا ہو کر اپنے کمرے میں لوٹا تو بھی اسے یہ پتا نہ چلا کہ وہ عورت کیا شے تھی اور اس تمام جھگڑے کے درمیان فساد کی وجہ اس کے پلے نہ پڑی تھی۔ کیا یہ عورت بلاوجہ لڑ رہی تھی؟ اس نے سوچا تھا اور اس نے جھنجھلا کر خود سے کہا تھا۔ دیوانی معلوم ہوتی ہے!

وہ تیری مستانی کل دوپہر حسیناں سے گالی گلوچ کر رہی تھی۔

پر وہ دیوانی نہ ہوتے ہوئے بھی دیوانی تھی...... یہ اسے اس روز معلوم ہوا جب وہ سامنے کی گلی کے موڑ پہ پان والے سے پان بنوا رہا تھا۔ لالو نے پان پر کتھا لگاتے ہوئے دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے آدمی سے کہا۔ اوئے یوسفے! تو اسے سمجھاتا کیوں نہیں؟

کیوں لالو؟ یوسف رک گیا اور پھر اپنی چوڑی چکلی چھاتی پھلاتے ہوئے وہ لقے کبوتر کی طرح گنکا۔ کیا گل بات ہے؟

گل بات کیا ہونی ہے۔ وہ تیری مستانی کل دوپہر حسیناں سے گالی گلوچ کر رہی تھی۔ لالو نے پان پر چھالیا رکھی۔ یوسف مسکرایا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ چھوڑ یار کوئی اور بات کر۔

لالو نے ایک آنکھ میچ لی۔ یار تو بڑا خوش قسمت ہے!

قسمت کی بات چھوڑ۔ اپنا اپنا جگرا ہوتا ہے لالو! یوسف نے اپنے دائیں بازو کو دوسرے ہاتھ سے تھپتھپایا۔

مسعود نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ بڑا اکڑیل جوان تھا۔ چہرہ بھرا ہوا جس پہ روشن اور سیاہ آنکھیں بڑی چمک رہی تھیں۔ قد اس کا درمیانہ تھا۔ مسعود نے سوچا۔ اگر یہ شخص ذرا سا لمبا ہوتا تو کیسا لگتا! تب اسے کچھ ایسا احساس ہوا جیسے اگر اس کا قد ذرا سا بھی چھوٹا یا بڑا ہوتا تو وہ شخص اپنی تمام جاذبیت کھو بیٹھتا۔

لالو نے پان والا ہاتھ بڑھایا تو یوسف نے جلدی سے وہ پان لے کر منہ میں رکھ لیا۔ مسعود کا اٹھا ہوا ہاتھ تیزی سے نیچے گر گیا۔

اوہ۔ معاف کرنا باؤ جی! یوسف نے خوش دلی سے کہا۔ یہ پان میں سمجھا لالو نے میرے لیے بنایا ہے۔

لالو ہنسا۔ چل معاف کیا تجھے! پھر مسعود کی طرف دیکھ کر بولا۔ یہ اپنا یار ہے جی۔ بڑا جیالا ہے!

یوسف چلا گیا تو مسعود نے پان کھاتے ہوئے لالو سے پوچھا۔ یہ کون ہے؟

باؤ جی! اس محلے میں رہتا ہے۔ وہ جو ہے لالی...... اجی وہی عورت جو بیوہ ہے!

بیوہ ہے؟ اس نے حیرت سے پوچھا۔

ہاں جی۔ اسی سال خاوند مرا ہے اس کا لالو نے کہا۔ پر اس عورت کو تو جیسے میاں کی موت کا بالکل غم نہیں ہے جی...... دراصل...... اس کی آواز کم ہوگئی۔ دراصل کہتے ہیں وہ شادی لالی کے باپ نے زبردستی کرائی تھی اور جب باپ مر گیا تو بھی لالی کو کوئی غم نہ ہوا۔

یہ عورت جات بھی عجیب شے ہے جی۔ یہ نہ اپنے باپ کے مرنے پہ روئی نہ خاوند کی موت پہ اس کی آنکھ سے کوئی آنسو نکلا اور...... اور...... وہ چپ ہوگیا۔

اور کیا؟ مسعود نے اشتیاق سے پوچھا۔

اللہ ہی جانتا ہے پر کہتے ہیں کہ لالی نے ہی اپنے میاں کو مارا ہے! وہ ہولے سے بولا۔

کیوں؟ اس کے منہ سے آپو آپ نکلا۔

اللہ ہی ٹھیک جانتا ہے جی۔ وہ سانس لے کر تیزی سے بولا۔ پر لالی کے خاوند کے مرنے پر ادھر بڑا فساد ہوا تھا جی۔ پولیس بھی آئی پر کچھ پتا نہ چلا اور تب سے یہ عورت ہر ایک سے لڑتی پھرتی ہے کہتی ہے یہ سب میرے دشمن ہیں!

مسعود چپ رہا۔

یہ عورت جات میں جلن بڑی ہوتی ہے۔

لالو پھر بولا۔ یہ جو اپنا یار ہے نا یوسف؟ یہ لالی کی سگی ماسی کا بیٹا ہے جی۔ دونوں بچپن میں ایک دوجے سے کھیلے ہیں۔ ویسے یہ سب کو معلوم ہے وہ تو اس کی دیوانی ہے دیوانی! اب کل دوپہر کو بھی اسی کی خاطر سیناں سے لڑی تھی!

کیوں؟

لالو نے ایک قہقہہ لگایا۔ یہ عورت جات میں جلن بڑی ہوتی ہے جی۔ سیناں نے کہیں کہہ دیا

یوسف بہت خوبصورت ہے بس وہ لالی کو تو آگ لگ گئی ہے۔ ہے تو کون اسے کچھ کہنے والی۔ پھر ہولے سے بولا۔ باؤ جی دونوں کا بیاہ اب ہونے والا ہے نا!

مسعود نے چونک کر پوچھا۔ تو وہ بیاہ بھی کرنے والے ہیں پھر؟

پھر؟ کیا ہوا باؤ جی؟ لالو نے حیرت سے سوال کیا۔

وہ چونکا اور دل ہی دل میں اپنی اوٹ پٹانگ سوچ پر خود کو ملامت کرتا اپنے کمرے کی طرف آ گیا۔

دوسری صبح جب وہ دفتر جا رہا تھا۔ بڑ والے کنوئیں کے قریب لالی کھڑی تھی اور اس کی کمر میں پیتل کی ایک گاگر تھی جس کے گرد اس کی بانہیں لپٹی تھیں۔ اس نے دیکھا۔ کانچ کی نازک چوڑیاں اس کی بانہوں پر سجی ہوئی تھیں اور جب گاگر کمر سے وہ اتار کر زمین پہ دھرنے لگی تو وہ چوڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر بجنے لگیں۔

مسعود کو دل ہی دل میں لالی سے ایک خوف سا محسوس ہونے لگا اور چور نظروں سے اس نے اس کی طرف دیکھا۔ اسے اپنی طرف بالکل متوجہ نہ پا کر اس نے سکھ کا سانس لیا اور نفرت سے زمین پہ تھوکتے ہوئے وہ تیزی سے اپنی راہ ہو لیا۔ وہ ابھی چوک تک بھی نہ پہنچ پایا تھا کہ اسے لالی کی تیکھی آواز سنائی دی۔ میں نے تیری گردن نہ گھونٹ دی تو نام بدل دینا!

گھبرا کر وہ مڑا۔

لالی نے اپنی ہم عمر ایک عورت کا گلا اپنے ایک ہاتھ سے پکڑ رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک پتھر تھا جو وہ بار بار اس کے سر پہ مارنے کی کوشش کر رہی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے اور مسعود خوفزدہ سا کچھ دیر کے لیے یہ سوچتا کھڑا رہا کہ یہ دیکھتے ہی دیکھتے کس بات پہ لڑ رہی ہے ابھی تو اکیلی تھی اور ابھی وہ اس عورت کے ساتھ مردوں کی طرح دست و گریباں ہو رہی ہے؟

اسے لالی کی چیختی آواز سنائی دی۔ حرامزادی مجھے کہتی ہے خصم مار کے صبر نہیں آیا...... آ میں تجھے ماروں تو میرے دل کو صبر آئے..... آ کتیے!

وہ لاحول پڑھتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

پھر تو وہ تماشا ہوا ہے باؤ جی! کہ کیا بتاؤں!

وہ ہنسنے لگا۔

اس شام لالو کی دکان سے سگریٹ کا ایک پیکٹ خریدتے وقت اسے صبح کی لڑائی یاد آئی تو اس کا جی چاہا اس سے لڑائی کی وجہ پوچھے مگر ہمت نہ ہوئی۔ چپ چاپ پیسے دے کر وہ مڑنے ہی لگا تھا کہ لالو نے چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ دیکھا او۔ بولا۔ باؤ جی صبح کی لڑائی دیکھی؟

وہ یوں مزا لے کر بولا تھا جیسے کوئی بڑا اچھا تماشا دیکھا ہو۔

نہیں۔ کیا بات ہوئی تھی؟

اجی وہ رضو نے صبح لالی کو کنوئیں کے پاس چپ چاپ دیکھا تو مذاق کر بیٹھی کہ بی بی چپ کیوں ہو کیا میاں یاد آرہا ہے...... بس جی اس نے تو لپک کر رضو کا گلا پکڑ لیا اور پھر تو وہ تماشا ہوا ہے باؤ جی! کہ کیا بتاؤں! وہ ہنسنے لگا۔

مسعود خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گیا۔ بے دلی سے اس نے وہ کتاب کھولی جو وہ اپنے کسی دوست سے مانگ کر لایا تھا۔ ناول قدرے دلچسپ تھا اور وہ اس میں منہمک ہو گیا۔

کہانی کا وہ حصہ جہاں ہیرو اور ہیروئن آپس میں ملتے اسے بڑا پر لطف محسوس ہوا اور ایک ایسے ہی حصے میں جہاں اسے بڑی حد تک لذت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے تصور ہی تصور میں ذہن کے پردے پہ ان دو خیالی ہستیوں کو حقیقت بنا رہا تھا کہ اچانک اس کے کمرے کے دروازے پہ دستک ہوئی اور وہ چونک گیا۔ اس نے کتاب پہ نظریں جماتے ہوئے بڑے روکھے لہجے میں کہا۔ کون ہے؟

باؤ جی...... یہ میں آیا ہوں!

کون؟ وہ آواز نہ پہچانا اور پھر بڑی کوفت محسوس کرتے ہوئے اس نے ناول ایک طرف رکھ دیا اور بولا۔ آجاؤ اندر!

دروازہ کھلا اور سرد ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ یوسف اپنی تمام تر مردانہ دلکشی کے ساتھ اس کے کمرے میں آیا اور مسعود کو کچھ دفعتاً ایسے معلوم ہوا جیسے ناول کا ہیرو کتاب کے اوراق میں سے انگڑائی لے کر اٹھا ہو اور اب اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

گھبرا کر اس نے پوچھا۔ کیا بات ہے؟

جی اک خط تو لکھ دینا...... یوسف نے آہستگی سے کہا۔

اس کا دل چاہا صاف انکار کر دے۔ پر منہ سے نکلا۔ کارڈ لکھوانا ہے۔

ہاں جی...... بس یہ کارڈ...... دو منٹوں کا کام ہے! یوسف نے دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے کارڈ کو اس کے سامنے کیا۔ وہ اپنا ایک یار بیلی ہے جی لاہور شہر میں اس کو میں نے لکھا تھا نوکری کوئی ہو تو لکھ بھیجے پر اس کا جواب نہیں آیا۔

پھر؟ اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

یوسف نے جواب میں اس کی چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے بڑی بے تکلفی سے کہا۔ بس باؤ جی کوئی ایسا خط لکھو کہ وہ جواب دیے بغیر نہ رہے 'بس ایسا خط لکھو کہ ادھر خط ملے اور ادھر وہ جواب لکھے!

یہ خطوط لکھنے لکھانے کا سلسلہ ایسا چلا کہ وہ یوسف سے قدرے بے تکلف ہو گیا اور اب تو وہ بھی کبھی کبھار باؤ جی کہہ کر بلانے کی بجائے یار یار کہہ کر بلانے لگا تھا۔ مسعود کا دل کئی بار باتوں کے دوران چاہنے لگتا کہ وہ اسے لالی کو سمجھانے کے لیے کہے۔ وہ ہر ایک سے لڑتی ہے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ پر پھر اپنے اس خیال پر شرمندہ سا ہو کر رہ جاتا۔ آخر وہ اس کی کیا لگتی تھی جو وہ اس کے بارے میں باتیں کرے۔ یوسف کیا سمجھے گا اور وہ یہ سوچتے ہی چپ ہو جاتا...... ہاں اسے کیا پڑی کہ پرائے پھٹے میں بے سوچے سمجھے ٹانگ اڑاتا!

اس دوپہر وہ دفتر سے ذرا جلدی واپس آیا تھا کہ اسے لالی جینو تیلن سے لڑتی نظر آئی تھی اور اپنے کمرے میں آ کر جب وہ ستانے کو لیٹا تو اس کے ذہن میں بار بار اس کا خیال آنے لگا وہ خود اپنے احساسات پہ جھنجھلا گیا۔ آخر اسے کیا...... وہ جو چاہے کرے وہ اسے روکنے والا کون اور پھر اگر اس کی کسی بات پر الٹا وہ اسی کے ساتھ لڑ پڑی تو کیا عزت رہ جائے گی؟

ہاں اسے کیا پڑی کہ پرائے پھٹے میں بے سوچے سمجھے ٹانگ اڑاتا!

وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ یوسف خط لکھوانے آیا...... بس یار اس دفعہ اسے یہ لکھو کہ جلدی سے کسی نوکری کا بندوبست کرے، میں اب بہت دیر یہاں نہیں رہ سکتا۔

لیکن جب تک نوکری نہ ملے وہ تمہارا یار بیچارہ کیا کر سکتا ہے؟ مسعود نے کہا۔

یار کوشش کرے تو نوکری ملے؟ وہ ہنسا پھر جیسے کسی سوچ میں ڈوب گیا اور پھر کچھ دیر بعد سر اٹھا کر بولا۔ اچھا تو میرے یار! تو اسے لکھ ڈال کہ یوسف کہتا ہے میں پرسوں تیرے پاس پہنچ رہا ہوں۔ بس آپ ہی آ کر کوئی نوکری ڈھونڈ لوں گا!

لیکن۔

لیکن کیا؟

مسعود نے ہمت کی۔ وہ لالی...... لالی کیا کرے گی!

اس کی فکر نہ کرو...... میں کچھ روپیہ لے کر آتے ہی بیاہ کر لوں گا۔ تب تک وہ اپنے گھر میں رہے

گی یار! اور پھر کچھ سوچ کر وہ بولا۔ وہ بھی اک مصیبت ہی ہے!

مسعود چپ رہا۔

یار آج پھر لڑی ہے۔ وہ خود سے جیسے بڑبڑایا۔

وہ تیلن ہے نا جینو۔ اس سے...... اس کا جیٹھ مجھ سے شکایت کر رہا تھا۔ میں نے بھی اچھا جواب دیا۔

کیا؟ مسعود نے سانس روک کر پوچھا۔

میں نے کہا اپنی بھرجائی کو سمجھانا تھا۔ کیوں اسے چھیڑتی ہیں اور پھر اچھا ہے لڑتی جھگڑتی ہے آخر کو عورت ہے...... وہ عورت ہی کیا جو لڑے نہ جھگڑے بس بت کی طرح بیٹھی رہے...... وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگا اور پھر بولا۔ پر گھر آ کر میں نے بھی اس کے خوب ہاتھ لگائے۔

تو نے لالی کو مارا؟ اس نے حیرت سے پوچھا۔

تو مجھ سے اب بیاہ جلدی سے کر ڈال نہیں تو میں زہر کھا لوں گی۔

آج کوئی نیا مارا؟ اس نے بھی حیرت سے کہا۔ میری مار کی تو عادی ہو گئی ہے۔ پر آج تو میں نے اسے لال پیلی کر ڈالا...... پر عجب شے ہے یار وہ بھی...... وہ جیسے کچھ سوچ کر مسکرایا اور چپ ہو گیا۔

مسعود چپ چاپ اسے گھورتا رہا۔

یوسف پھر بولا۔ مار کھانے کے بعد مجھ سے بڑے دھیرج سے بولی۔ تو مجھ سے اب بیاہ جلدی سے کر ڈال نہیں تو میں زہر کھا لوں گی۔

مسعود نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اچھا؟

ہاں میرے باؤ! وہ مزے سے بولا۔ اور تجھے پتا ہے؟ وہ میری مار کا کسی کو نہیں بتاتی! یار ویسے لالی جیسی کوئی عورت نہیں' لالی تو لالی ہی ہے!

مسعود ہنس پڑا۔

تیسرے روز مسعود دفتر سے دیر سے آیا اپنے کمرے کا دروازہ کھول رہا تھا کہ سامنے کے مکان کا دروازہ کھلا اور لالی گلی میں نکلی۔ اسے دیکھ کر لالی نے نظریں نیچی کر لیں اور پھر بڑے مدھم لہجے میں بولی۔ سلاماں لیکم!

اس نے گھبرا کر سلام کا جواب دیا۔

وہ......وہ چپ ہوگئی۔ پھر بڑے اداس لہجے میں بولی۔ وہ جاتے وقت سلام کہہ گیا تھا۔

اچھا یوسف چلا گیا؟ اس نے حیرت سے پوچھا۔

لالی نے ہولے سے سر ہلا دیا اور واپس مڑ کر اس نے دروازہ کھولا اور تیزی سے اندر داخل ہوتے ہی اندر سے دروازہ بند کرلیا۔

مسعود کو کچھ ایسا خیال آیا کہ وہ دروازہ بند کر کے رو رہی ہے لیکن اپنے اس عجیب خیال پر اسے حیرت ہوئی اور خود پر دل ہی دل میں ہنستا ہوا وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ اپنے کمرے میں داخل ہوگیا۔

تنگ آکر اس نے کمرے کا دروازہ بند کرلیا اور لحاف اوڑھ کر لیٹ گیا۔

سرہانے سے ناول اٹھا کر اس نے پڑھنا چاہا پر نظریں خود بخود بہک کر کھلے دروازے میں سے ہو کر گلی میں جا پڑتیں اور پھر سامنے کے بند دروازے پہ جا ٹھہرتیں۔ دو ایک بار اس نے سٹپٹا کر دروازے پر سے اپنی نظریں ہٹائیں لیکن کتاب کے اوراق پریشان ہو ہو کر اس کی نگاہوں کا مذاق اڑاتے رہے۔ تنگ آکر اس نے کمرے کا دروازہ بند کرلیا اور لحاف اوڑھ کر لیٹ گیا۔

اتوار کو دوپہر کے وقت وہ ستانے کو لیٹا ہوا تھا کہ آنکھ لگ گئی اور آنکھ جب کھلی تو اسے اپنے دروازے کی دراڑ میں لالی کی چمکتی ہوئی آنکھیں نظر آئیں۔ گھبرا کر وہ اٹھ بیٹھا۔

لالی نے آہستگی سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

مسعود کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کہے۔ اٹکتے ہوئے بولا۔ کیا کیا بات ہے؟

جواب میں وہ چپ رہی صرف دروازہ ہلکے سے دوبارہ تھپتھپا دیا۔

مسعود نے دروازہ کھول دیا۔ وہ نظریں جھکائے بڑی اداسی سے سر کے بالوں پہ اپنے ہاتھ پھیرتی چپ چاپ اس کے کمرے میں داخل ہوگئی اور کمرے کے فرش پہ ایک اینٹ رکھ کر وہ اس پر بیٹھ گئی۔

کیا بات ہے؟ وہ گھبرا رہا تھا۔

اس کا خط نہیں آیا۔ وہ یوں بولی جیسے اگر کچھ نہ بولتی تو آنکھوں میں سے آنسو بہنے لگ جاتے۔

آجائے گا...... آئے گا۔ اس نے سٹپٹا کر کہا۔

کب آئے گا؟ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول کر مسعود کو دیکھا اور بڑی معصومیت سے

بولی۔ آخر کب تک انتظار کروں!

مسعود کو اس پر بڑا ترس آیا تم فکر کیوں کرتی ہو۔ اسے گئے آج ہفتہ ہی تو ہوا ہے۔

ہائے ہفتہ کوئی چیز ہی نہیں۔ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ باؤ جی ہفتے بھر میں تو مردے کا گوشت بھی گل سڑ جاتا ہے۔ جو اس روز میں مر گئی ہوتی جس روز وہ گیا تو آج میری نعش بھی......

کیسی باتیں کرتی ہو لالی! مسعود نے ڈر کر بات کاٹی۔

سچی بات کہہ رہی ہوں جی! وہ اپنے گھٹنوں کے گرد بانہیں کر کے بولی۔ تم اسے لکھ دو جی جلدی سے آجائے نہیں تو میں کچھ کر بیٹھوں گی، ہاں!

مسعود نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ تو یہ سوچ رہا تھا کہ یہ وہی عورت ہے جو بڑی لڑاکی ہے جب لڑتی ہے تو کسی کی سنتی نہیں، اتنی اتنی بڑی گالیاں سناتی ہے کہ انسان شرم سے سر جھکا لیتا ہے اور لڑتے وقت کیسی خونخوار نظر آتی ہے لیکن آج یہی عورت کیسی معصوم، دکھی اور حسین نظر آ رہی ہے۔ اس نے سوچا اگر وہ افسانہ نگار ہوتا تو اس عورت پر ایک دھڑلے کا افسانہ لکھتا۔

وہ چونکا وہ اس کے قریب کھڑی کہہ رہی تھی تم لکھ دو گے نا اسے خط؟

آں...... ہاں ہاں! اس نے کہا اور سر بھی ہلا دیا۔

اچھا میں چلی! وہ دروازے کی طرف مڑی۔ تم اُسے خط ضرور لکھ دینا۔ وہ کہتا تھا باؤ جی کے قلم میں بڑا زور ہے خط لکھے تو جواب بڑی جلدی آتا ہے۔ پھر مڑ کر بولی۔ تم لکھ دو گے نا اسے خط...... میں خود بیٹھ کے لکھواتی پر حاجن میری جان کو رو رہی ہوگی۔ دیر ہوگئی ہے!

حاجن کون؟ اس نے یونہی پوچھ لیا۔

اے وہ جس کے برتن میں مانجنے جاتی ہوں وہ اور دروازہ کھول کر جاتے جاتے پھر مڑ کر کہہ گئی خط ضرور لکھنا۔

تم اسے خط ضرور لکھ دینا۔ وہ کہتا تھا باؤ جی کے قلم میں بڑا زور ہے

تیسرے روز وہ پھر اس کے کمرے میں آ دھمکی۔ کیوں باؤ جی خط لکھا؟ اس نے روتی آواز میں پوچھا۔

مسعود نے گھبرا کر کہا۔ آں ہاں لکھ دیا...... بس جواب آجائے گا! دراصل اس نے خط لکھا تو تھا

لیکن ڈاک میں ڈالنا بھول گیا تھا اور ایسا بھولا تھا کہ اب لالی کے یاد دلانے پر اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

لالی نے اپنے سفید لہنگے پر ہولے سے ہاتھ پھیرا اور پھر اپنا خالی بازو اس کے سامنے کر کے بولی۔ دیکھ میں نے اپنی ساری چوڑیاں اتار دی ہیں جب تک اس کا خط نہیں آئے گا میں چوڑیاں نہ پہنوں گی اور دیکھ اگر اس کا خط پھر بھی نہ آیا تو میں کچھ کھاؤں گی پیوں گی بھی نہیں نہ ہی حاجن کے ہاں کام کو جاؤں گی تو اسے لکھ دے میں بھوکی پیاسی مر جاؤں گی ہاں۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

وہ گھبراہٹ میں کچھ بھی نہ بول سکا۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آ رہا تھا کہ اسے کیسے چپ کرائے ادھر ادھر گھبراہٹ میں دیکھ کر بولا۔ لے لے میں ابھی دوسرا خط لکھے دیتا ہوں تو چپ کر جا!

لالی نے اور زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ باؤ جی وہ بڑا ظالم ہے۔ دیکھ نا وہ میرا ذرا بھی خیال نہیں کرتا ہائے میں اپنا دکھ کسے کہوں' کیسے بتاؤں...... میرا کوئی نہیں ہے اپنا کوئی سجن نہیں۔ اک وہ ہے تو اسے میری بالکل پروا نہیں اس نے ہاتھ ہلا ہلا کر بین کرنے شروع کر دیے۔ ہائے مجھ کرموں ماری کا کوئی نہیں۔ مجھ تتی کا......

لالی...... لالی! وہ بدحواس ہو کر چلایا۔ تو چپ کر جا۔ تو اپنے دکھ مجھے بتا میں اسے خط لکھوں گا!

لالی نے روتے ہوئے اپنی ناک پر ایک ہاتھ رکھا اور حیرت سے بولی۔ باؤ! تو اس کا دوست ہے نا...... ہاں وہ مجھ سے کہتا تھا کہ تو اس کا بڑا پکا یار ہے۔ یہ تو ذرا بتا اس کی آواز سرگوشیوں میں بدل گئی۔ وہ تجھ سے کبھی میرا ذکر کرتا تھا؟

ہائے میں کم بخت تو کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی۔

ہاں...... ہاں! اس نے جلدی سے سر ہلایا۔ کئی بار تیری باتیں کرتا رہا۔

سچ...... وہ خوشی کے مارے تقریباً چیخ اٹھی۔

اس نے سر ہلایا جیسے اگر سر نہ ہلاتا تو سر پہ کوئی بھاری بوجھ آن پڑتا۔

یہ تو بتا کبھی اس نے یہ کہا کہ وہ مجھ سے...... جھینپ گئی۔

مسعود کے چہرے پہ خون کی گرمی بڑھ گئی۔

وہ شرما شرما کر کہنے لگی۔ ہائے میں کم بخت تو کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی۔ اس نے سسکی سی لی۔

اب دیکھو نا یہ محلے والیاں مجھے اس حرامزادے کی موت کا طعنہ...... وہ چپ ہوگئی اور بے بسی سے اسے دیکھنے لگی۔

مسعود ہمت کر کے بولا۔ لالی یہ بتا کیا تجھے سچ مچ اس سے...... میرا مطلب ہے یوسف سے عشق ہے!

عشق؟ لالی بڑبڑائی اور پھر کسی کنواری لڑکی کی طرح شرما کر اس نے سر جھکا لیا اس کے چہرے پہ سرخی کی گہری لکیریں ابھرنے لگیں اور اپنے دائیں ہاتھ کے ناخن وہ اپنے دانتوں سے کاٹنے لگی اور پھر بری طرح شرمانے کے سے انداز میں اس نے ہائے کہا اور تیزی سے اٹھ کر دروازہ کھولا اور گلی میں بھاگ گئی۔

دوسرے روز وہ دفتر سے آرہا تھا کہ لالی اسے اپنے کمرے کے باہر بیٹھی نظر آئی۔ اس نے نیا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا اور قمیض بڑی صاف تھی۔ اس کے بالوں میں مٹی بھی نہ تھی اور چہرہ صاف اور بڑا نکھرا نکھرا تھا۔ آنکھوں کی پلکیں تو کچھ اتنی لمبی دکھائی دے رہی تھیں کہ مسعود نے سوچا کہ اس عورت کے چہرے پر بس پلکیں ہی پلکیں ہیں اگر یہ نہ ہوں تو شاید وہ اتنی حسین نظر نہ آئے۔

وہ اسے دیکھتے ہی چیختی ہوئی اٹھ کے اس کے قریب آئی میں کب سے راہ تک رہی تھی باؤ!

کیوں کیوں؟ وہ گھبرایا۔

اے ہے وہ تیرے دوست کا خط آیا ہے۔ وہ ایک کارڈ اس کے سامنے کر کے بولی۔ لے پڑھ جلدی سے پڑھ۔

ہاں......

وہ اپنے کمرے کا تالا کھولنے لگا مگر وہ چیخی۔ ہائے۔ خط تو پڑھ لے باؤ۔ پھر دھیمے سے بولی۔ تو کیسا دوست ہے کہ اپنے یار کا خط پڑھنے کی بجائے تالے کی فکر کرتا ہے۔

اس نے جلدی سے کہا لالی دوست کا خط آرام سے پڑھنا چاہیے اور تالا کھول کر کمرے میں داخل ہوگیا وہ اس کے پیچھے پیچھے چھلانگیں لگاتی کمرے میں آئی اور زمین پر دھرنا مار کر بیٹھ گئی۔ تو پڑھا لکھا ہے ٹھیک ہی کہتا ہوگا خیر اب آرام سے خط جلدی سے پڑھ ڈال۔

مسعود نے ایک نظر کارڈ پہ ڈالی۔ لکھا ہے...... لالی...... تجھے سلام لکھا ہے لالی!

والیکم سلام! لالی نے سر پہ دوپٹہ اوڑھ کر شرماتے ہوئے کہا۔

اور لکھا ہے کہ میں دو چار روز تک آجاؤں گا نوکری ......

جائے جہنم میں نوکری؟ وہ تیزی سے بولی۔

بس وہ آجائے نوکری کا کیا ہے کہیں بھی مل سکتی ہے پر ...... وہ جھینپ گئی۔

مسعود نے سانس لیا۔ نوکری بڑی مشکل سے ملتی ہے لالی۔ وہ لکھتا ہے کہ نوکری ابھی نہیں ملی۔ پر کوشش کر رہا ہوں اگر مل گئی تو پھر نہیں آؤں گا۔

ہائے میری! اس نے سینے پہ دھپ سے ہاتھ مار کر کہا۔ باؤ جی اسے لکھو جلدی سے واپس آ جائے۔ بس وہ آ جائے۔ ہاں!

اچھا۔ اس نے بغیر سوچے سمجھے کہا۔

اور کیا لکھا ہے؟

نیچے لکھا ہے باؤ جی کو سلام اور آخر میں لکھا ہے جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ میں اگر آ......

ہائے دیکھا۔ وہ تو مجھ کرموں جلی کا ذرا بھی خیال نہیں کرتا!! وہ چہرہ لٹکا کر بولی۔ دیکھ لو اسے پسند ہی نہیں کہ میں اسے خط لکھوں ہائے۔ ہائے میری قسمت!

پاگل مت بن لالی۔ اس نے لکھا ہے کہ میں آ گیا تو خواہ مخواہ خط کی کیا ضرور...... وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے کے سے انداز میں اسے سمجھانے لگا۔

ہائے باؤ، سچ کہتی ہوں۔ تو اپنے دوست کو سمجھا وہ میرا خیال نہیں کرتا۔ وہ چیخی۔ اب میں تجھے کیسے سمجھاؤں میں اس کے بغیر اک پل نہیں رہ سکتی۔ ہائے میرا تو جی چاہتا ہے کہ میں کپڑا بن جاتی عورت نہ ہوتی۔ اس کا پہناوا تو بنتی۔ اس کے ساتھ ساتھ تو رہتی۔ اے میں اس کے پیر کی جوتی ہی بن جاتی...... پر...... وہ ہچکیاں لینے لگی۔ پر اسے میرا بالکل خیال نہیں ہائے میں مر گئی تو مجھے یاد کرے گا۔ پھر کیا فائدہ باؤ!

وہ روتی ہوئی کمرے میں سے چلی گئی۔ وہ حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔

شام کے وقت وہ لالو سے پان لے کر کھا رہا تھا کہ پلکیں جھپکاتی ہوئی لالی وہاں سے گزری۔ اسے دیکھ کر اداسی سے لالی نے اپنا سر جھکا لیا اور چپ چاپ گزر گئی۔

لالو نے منہ کھول کر کہا۔ کیوں باؤ جی یوسف کو خط لکھا؟

یوسف کو...... کیوں؟

یہ لالی ساروں کو کہتی پھرتی تھی کہ باؤ جی کو یوسفے نے خط لکھا ہے اسے کوئی بڑی نوکری مل گئی ہے اور جلدی وہ آنے والا ہے...... کیوں؟

ہاں...... ہاں! اس نے کہا اور تیزی سے واپس ہو گیا۔

دوسری صبح ابھی وہ دفتر جانے کی تیاری کرنے لگا تھا کہ لالی کی دروازے کے باہر سے آواز آئی۔ باؤ...... ذرا دروازہ کھول۔

اس نے قمیض پہنے بغیر دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر آ گئی۔ ہائے باؤ قمیض کیوں اتار لی۔ ٹھنڈ لگ

جائے گی۔ وہ بھی اسی طرح سردی کی بالکل پروانہیں کرتا۔ جانے پردیس میں وہ کیا کرتا ہوگا۔ ہائے میں تو اس کو دیکھنے کو ترس گئی ہوں۔ پھر آہستہ سے بولی۔ آج تو اسے خط ضرور لکھنا۔

اس نے جھنجھلا کر کہا۔ خط کی کیا ضرورت ہے!

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ باؤ تجھے میں اپنا دل کیسے دکھاؤں میں اپنا درد کیسے بتاؤں ارے میرے دل میں تو دکھوں کے وہ وہ ناسور ہیں کہ تو دیکھے تو تیرا دل دہل جائے ارے مجھ دکھیا کو کیوں ستاتے ہو۔

پریشان ہو کر وہ اسے پچکارنے لگا۔ ارے نہیں لالی۔ میں اسے ضرور خط لکھوں گا میں تو یونہی کہہ رہا تھا اری پگلی تو تو یونہی رونے لگی ...... بس وعدہ کرتا ہوں آج ہی خط لکھوں گا۔

لالی نے اپنے سینے پہ دونوں ہاتھ دھر لیے۔ باؤ سچ کہتی ہوں میرا بس چلے تو میں ہوا بن جاؤں اور سانس بن کر اس میں سما جاتی۔ پر کروں کیا میرا بس نہیں چلتا بس اس کے پیار کی آگ میں ہر دم جلتی رہتی ہوں پر اسے مجھ سے اتنا پیار نہیں۔ اسے تو میری پرواہ تک نہیں۔ دنیا میں میرا اب اس کے سوا کون ہے؟

لالی وہ تجھے بہت چاہتا ہے ...... اس نے ناگواری سے کہا ...... تیرا وہم ہے کہ وہ تجھے چاہتا نہیں۔

میں عورت کا ہے کو ہوئی تیل ہوتی تو اس کے بالوں کو سنوارنے کے کام ہی آتی ...... وہ سسکی ...... وہ نہ آیا تو میں مر جاؤں گی۔

مسعود کو اس پہ بے انتہا ترس آیا۔

دو تین روز گزر گئے وہ جب بھی مسعود کو کمرے میں دیکھتی یا خود فارغ ہوتی تو جھٹ سے اس کے کمرے میں آجاتی اور پھر جوں جوں دن گزرنے لگے وہ زیادہ سے زیادہ اس کے کمرے میں بیٹھی یوسف کا ذکر کرتی رہتی ...... باؤ تجھے خبر ہے اسے گوبھی بڑی پسند ہے اور میں تو گوبھی قیمہ بڑے ہی مزے کا پکاتی ہوں ...... ارے ہاں تو بھلا کھانا کدھر کھاتا ہے؟ ہوٹل میں ارے چھوڑ بھلا وہاں بھی کوئی مزے کا سالن ہوتا ہے! یوسف کو ذرا آنے دے پھر دیکھ میں تجھے اپنے ہاتھ کا پکایا ہوا سالن کھلادوں گی۔ ہائے وہ تو میرے ہاتھ کے پکے ہوئے ساگ پہ جان دیتا ہے ...... پھر وہ پلو سے آنکھیں پونچھتی اور کہتی ...... پر اسے یہ تو جانو خبر ہی نہیں کہ میں اس کے بنا جیتے جی مر رہی ہوں ...... ہائے جاؤ اسے خط لکھ جلدی سے آجائے۔

وہ اسے دلاسہ دیتا تو وہ اور روتی۔ مسعود کی سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ یہ عورت چاہتی کیا تھی۔ کیا وہ

اسے تو جیسے یوسف کے پیار میں اک خلا اک تشنگی محسوس ہو رہی تھی۔

یوسف کے پیار سے مطمئن نہ تھی ...... اسے تو جیسے یوسف کے پیار میں اک خلا اک تشنگی محسوس ہو رہی تھی۔

یوسف نے لکھا تو تھا کہ جلدی آؤں گا مگر اس کی یہ جلدی کوئی بیس دن کی مدت بنی۔ جس روز اس کا خط آیا کہ میں کل پہنچ رہا ہوں لالی کا مارے خوشی کے برا حال تھا۔ ہاتھ میں کارڈ لیے وہ لالو پان والے کے پاس پہنچی اسے یوسف کے آنے کا بتایا۔ جینو تیلن سے جھٹ پٹ صلح کر کے اس کے آنے کا ذکر کیا اور سارے محلے میں بھاگتی پھری۔

مسعود شام کے وقت لالو سے پان کھانے گیا تو وہ اسے دیکھتے ہی بولا ...... کیوں باؤ جی وہ آ رہا ہے؟

ہاں! اس نے بے رخی سے کہا۔

لالو ہنسا ...... بس ختم ہوگی بادشاہی؟

مسعود کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا اور بڑے طیش میں آ کر اس نے لالو کی گردن پہ ہاتھ رکھ دیا۔ بات کیا ہے۔

لالو خوفزدہ ہو گیا ...... اوہ باؤ ...... باؤ جی! وہ گڑگڑانے لگا۔ مسعود نے اس کے شانے پہ ایک بھرپور ہاتھ مارا اور پھر اپنے کمرے کی طرف ہو لیا۔

وہ دہلیز پر قدم رکھ رہا تھا کہ دور سے لالی کی آواز آئی ...... کل صبح جب وہ آئے گا تو میں تیرے کمرے میں اسے لاؤں گی باؤ تو اسے ضرور سمجھانا۔ وہ میری قدر نہیں کرتا۔

مسعود نے سوچا کہ وہ فضول غصے میں آیا ہوا تھا۔

ارے میں اپنے یوسف پر اس ایک باؤ کو کیا سینکڑوں باؤوں کو نثار کر دوں۔

یہ عورت کس قدر معصوم تھی یہ عورت یوسف کے پیار میں پاگل ہو گئی تھی اور اس میں لالی بیچاری کا کیا قصور تھا!

ہاں لالی اسے ضرور لانا ...... اس نے آہستہ سے کہا ...... کل اتوار ہے اور میں اپنے کمرے ہی میں موجود رہوں گا۔

لالی نے جھوم کر جیسے انگڑائی لی اور چھلاوے کی مانند اچھلتی کودتی گلی کا موڑ مڑ گئی۔

صبح شور سن کر مسعود جاگ اٹھا۔ کمرے کا دروازہ نیم وا کر کے اس نے گلی میں جھانک کر دیکھا بہت سی عورتیں مرد اور بچے نالی کے گرد جمع تھے اور وہ چیخ چیخ کر گالیاں دے رہی تھی کشتیے تو نے مجھے کیا سمجھا۔ ارے میں اپنے یوسف پر اس ایک باؤ کو کیا سینکڑوں باؤوں کو نثار کر دوں۔

جنیو تیلن چلائی...... آنے دے یوسف کو وہ تیرے کرتوت دیکھے گا تو......

او چپ کر مال زادی! لالی چیخی...... میں تیری طرح تو نہیں کہتے کہ سگے جیٹھ کو پھنسائے پھروں......

مسعود نے کچھ اور نہیں سنا اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا رہا تھا اور کانوں کے پردوں پہ اک شور ٹکریں مار رہا تھا۔

اس نے دروازہ بند کر لیا اور اپنی چارپائی پہ آ کر بیٹھ گیا۔ پتہ نہیں وہ کب تک یونہی بیٹھا رہا مگر جب اسے ہوش آیا تو کوئی اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا مضمحل سا وہ اٹھا۔ دروازہ کھولا تو لالی کھڑی ہوئی نظر آئی۔

مسعود کا دل چاہا اسے غصے سے کہہ دے کہ وہ کبھی اس کے کمرے تک نہ آئے۔ آہستہ سے بولا...... کیا بات ہے لالی؟

لالی دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔

مسعود نے دیکھا۔ لالی نے لال اور پیلے رنگ کی قمیض اور ویسا ہی لہنگا پہن رکھا تھا۔ اس کے بال بڑی اچھی طرح سنوارے ہوئے تھے اور آنکھوں میں بے انتہا چمک تھی۔ ہونٹوں پہ مستی اور آنکھوں کا کاجل اس کے اشتیاق کو ظاہر کر رہا تھا۔ وہ بے حد خوش تھی اور اس کے بازوؤں میں کانچ کی رنگین چوڑیاں بھی ایک دوسرے سے ٹکرا کر اک بلوریں قہقہے کی سی آواز دے رہی تھیں۔

کیا بات ہے؟ اس نے دکھ سے پوچھا۔

اے وہ جنیو چڑیل سے آج میرا جھگڑا ہوا۔ کہنے لگی موئی کہ تجھے اب یوسف کی کیا ضرورت باؤ جو موجود ہے...... حرامزادی! اس نے یکے بعد دیگرے چار پانچ موئی موئی گالیاں دے دیں۔

دیکھ لالی اب تو ادھر مت آیا کر...... مسعود نے کہا۔ یوسف آ جائے گا تو پھر تیرا بیاہ ہو جائے گا اور پھر تو...... تو یہاں مت آنا...... وہ رک رک گیا۔

باؤ! وہ اس کے قریب ہو گئی...... تو مجھے کیا سمجھتا ہے۔ میں تو تیری بڑی عزت کرتی ہوں۔ باؤ تو ہی تو اک میرا ہمدرد ہے اور میرا کون ہے تجھ سے ملی تو میں یوسف کی شکایت کرتی ہوں ارے تو نے میرے لیے کیا کچھ نہیں کیا تو نے میرے دکھ درد کو اپنا سمجھا ہے میں تیرے احسان کو بھول سکتی ہوں ہائے باؤ یوسف کو ذرا آنے دے وہ ان ساروں کو ٹھیک کر دے گا...... پر ہائے باؤ میں کیا کروں جتنا پیار مجھے

اس سے ہے اسے مجھ سے نہیں! وہ پھر اپنا رونا رونے لگی۔

اسی دم دروازہ کھلا اور یوسف کی آواز آئی لالی!

لالی نے مسرت سے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر تیزی سے اٹھ کر دروازہ کھول کر بولی......

یوسف اوئے یوسف آ گیا!

مسعود چپ چاپ رہا۔

یوسف اکڑے ہوئے جسم کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ لالی اس کے سینے کے قریب سر جھکائے خوشی سے بولی...... باؤ تیرا دوست آ گیا۔

مسعود نے بے دلی سے یوسف کو دیکھا...... آؤ...... آؤ!

یوسف اس کی آنکھوں میں آنکھوں ڈال کر کھڑا ہو گیا۔

اوئے باؤ یہ لالو کیا کہتا ہے؟ یہ جنیوتیلن کیا کہتی ہے۔

مسعود نے بے بسی سے لالی کی طرف دیکھا جو اس کا منہ تک رہی تھی۔

یوسف نے کمر پہ ہاتھ رکھ کر اکڑ کر کہا...... تو نے یاری کے پردے میں بڑا حق ادا کیا۔ پھر غصے سے لالی کی طرف دیکھ کر بولا...... اور تو نے میرے پیار کا خوب صلہ دیا لالی......

لالی نے سر جھکا لیا۔

یوسف نے کڑک کر کہا...... چل گھر جا...... خبردار جو اب تو ادھر آئی۔

لالی خاموشی سے سر جھکائے کمرے سے باہر نکل گئی۔

مسعود نے سر اور جھکا لیا۔

گھنٹہ بھر بعد جب مسعود اپنا سامان باندھ رہا تھا اس کے ذہن میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی اور سینے میں ایک طوفان برپا تھا اسے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ایک طوفان تھا اور اپنی ذات پہ خود ہی تباہی مچا رہا تھا۔ اسے کچھ خبر نہ تھی کہ یہ کیا ہوا تھا اور اب کیا ہونے والا تھا جیسے اندھیرے کے اک منجدھار میں ڈوب رہا تھا۔

اٹیچی کیس کو بند کر کے وہ گلی میں کھڑے تانگے میں رکھنے کو دروازے سے باہر جو آیا تو اسے لالی کی آواز سنائی دی۔ ٹھٹھک کر اس نے دیکھا۔ وہ گلی کی نکڑ پہ کھڑی تھی اور ایک عورت سے کہہ رہی تھی...... اے تجھے پتہ ہے یوسف نے میری خاطر باؤ سے لڑائی کی...... ہائے نی میری خاطر...... میری خاطر!

☆......☆......☆

نوید انجم
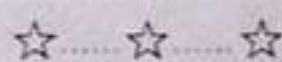
سحر ہونے تک

دولہا!...... دولہا آ گیا! رضیہ نے چیخ کر ہمیں بتایا۔

میں نے خوف زدہ ہو کر سلیمہ کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی اور یوں ہی بیٹھی رہی۔ بس ہلکے سے سرہلاتے ہوئے اس نے سر اور نیچا کر لیا اور مجھے رونا آ گیا...... ہائے! ہائے!

رضیہ برآمدے کی طرف سے بھاگی آئی...... اماں بھی آئیں......

چپ رہ...... میں نے سختی سے کہا۔ پر دوسرے ہی لمحے مجھے اپنے سخت لہجے پہ افسوس ہوا۔ رضیہ دیکھو تو سب مہمان آئے بیٹھے ہیں...... یوں شور نہیں مچاتے...... میں نے خفت مٹانے کو کہا۔

رضیہ نے منہ بنا لیا۔ اے لو...... میں نے کیا کیا؟ بس اک دولہا کے آنے کی خبر ہی تو دی...... آؤنا باجی بھیا تاب کو دیکھیں۔ وہ اپنی ناراضگی دوسرے ہی لمحے بھول گئی اور دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں ملاتے ہوئے بولی۔ سچی باجی تاب بھیا دولہا بنے بڑے اچھے لگ رہے ہیں۔

میں نے سلیمہ کو دیکھا اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا اور مجھے اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں بجھتی ہوئی اک چمک نظر آئی اور میرا دل جانو اچھل کر منہ کو آنے لگا۔ سلیمہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے ہونٹوں پہ زبان پھیری اور مسکرائی پھر ہولے سے اس نے کہا۔ مجھے کیا ہوا ہے؟ یوں اداس کاہے کو ہوتی ہو؟

میرا جی چاہا کہ زور کا ایک تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دوں اور پھر خالہ جی کے سامنے رو رو کر کہوں۔ آپ یہ کیسا ظلم کر رہی ہیں خالہ جی؟ کیوں اپنی بٹی کو اپنے ہاتھوں مار ڈالنے پر تلی بیٹھی ہیں؟ اور اس نامراد بدنصیب سلیمہ کو دو چار اسی طرح لگا کر چیخوں۔ اری کم بخت کیوں منہ کو تالا لگائے بیٹھی ہے؟ منہ سے کچھ بولتی کیوں نہیں...... صاف صاف کہہ دے تو کیوں یوں جان جلے؟ اری بس ذرا سی ہمت کی ضرورت ہے اور پھر...... پھر یوں جی جلانا نہ پڑے گا!

مگر آہ یہ مجبوری...... ہم بدنصیب لڑکیاں منہ سے بھلا کیوں کچھ بولنے لگیں؟ مجھے سلیمہ پہ رہ رہ کر ترس آنے لگا۔ یہ وہی لڑکی ہے نا جو سارے گھرانے میں سب سے زیادہ چنچل، شریر اور ضدی مانی جاتی

میرا جی چاہا کہ زور کا ایک تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دوں

ہے اور آج اسے کیا ہو گیا ہے۔ اس کی ضد اور ہٹ دھرمی کدھر رخصت ہو گئی ہیں!

میرے خیالات کے کچے دھاگے الجھنے کو تھے کہ ٹوٹ گئے...... خالہ جی کمرے میں آئیں اور اپنے مخصوص لہجے میں بولیں...... اچھا تو تم بیٹھی ہو دلہن کے پاس؟...... دولہا نہیں دیکھوگی؟

دیکھ لیں گے...... خالہ جی...... میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا...... اپنے تاب بھائی ہی تو ہیں...... سلیمہ کو اکیلے چھوڑ کر جانے کو جی نہیں چاہتا!

خالہ جی نے بڑھ کر سلیمہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔ بیٹی پرائی ہی ہوتی ہے...... لاکھ جی کو سنبھالو پر پھر یہ نگوڑا ڈولتا ہی رہتا ہے اور باہر جاتے ہوئے انہوں نے پلو سے آنکھیں صاف کیں!

جی ڈولتا ہی رہتا ہے! کسی نے مجھ سے کہا کمرے میں جو خاموشی ابھری تھی اسے کسی نے چیر کر رکھ دیا۔

جی ڈوب رہا ہے! دل منہ کو آنے لگا۔

میں نے جلدی سے دونوں ہاتھ اپنے سینے پہ رکھ دیئے...... ہائے ہائے! یہ دل بھی کیسا ہے۔ ہزاروں کے بھرے بھرائے گھر اجاڑ ڈالے اس دل نے اسی ایک دل نے......!

اور پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے دل کی دھڑکن ایک دم بڑی تیز ہو گئی اور اس دھڑکن کی آواز بالکل اس گھنٹی کی چیخ میں گھل مل گئی جو سہیل باغ کے موڑ پر بجا رہا تھا۔

ہزاروں کے بھرے بھرائے گھر اجاڑ ڈالے
اس دل نے اسی ایک دل نے......!

اوئی اللہ! سلیمہ نے گھبرا کر مجھے اپنی طرف کھینچا...... یہی یہ لوگ دیکھ کر سائیکل نہیں چلاتے!

جی دیکھ کر سائیکل چلاتے ہیں لیکن جب آپ لوگ دکھائی دینے لگتے ہیں تو سائیکل کنٹرول سے باہر ہو جاتی ہے! وہ ڈھٹائی سے بولا۔

بے شرم! سلیمہ نے آنکھیں دکھائیں...... یہ سہیل بڑا بے شرم ہے! دیکھو تو کیسے رعب ڈالتا ہے کیوں؟ اس نے میری طرف دیکھا اور کہا۔ میں ابھی تک سہمی ہوئی تھی...... یہ کم بخت مجھ پہ سائیکل جو چڑھانے لگا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ پاؤں بچ گیا ورنہ میں تو زخمی ہونے لگی تھی۔ چل سلیمہ مامی جان سے اس کی آج شکایت کر ہی دیں کیوں ٹھیک ہے نا۔ میں نے سلیمہ کے کہنی ماری!

کردو...... کس نے روکا ہے! وہ سائیکل کا سہارا لے کر ہمارے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ کوئی ڈرتا ہے؟

جی نہیں کوئی کیوں ڈرنے لگا...... سلیمہ نے منہ چڑایا۔ آج دیکھنا تو سہی۔...... ماموں جان سے ضرور شکایت کروں گی!

میں تو بچی مچی۔ آج ضرور ہی ماموں جان کو کہوں گی۔ میں نے خفگی سے کہا۔ یہ واقعی بڑا بگڑتا چلا جا رہا ہے۔ ابھی کل ہی جب میں تانگے میں رعنا وغیرہ کے ساتھ بازار کو جا رہی تھی تو یہ صاحب اپنے دوستوں کے ساتھ کھڑے ہنس رہے تھے اور میری طرف اشارے بھی......

محترمہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے...... ہم دراصل آپ کی اس سہیلی پر ہنس رہے تھے جس کا ناک لمبا سا ہے! وہ میری بات کاٹ کر بولا۔

مجھے اتنا غصہ آیا کہ خاموش ہو کر رہ گئی۔

اچھا اب جاؤ...... ہمارا سر مت کھاؤ! سلیمہ نے بڑی شان سے مرکا کر کہا میرا جی جل گیا...... یہ بھی عجیب لڑکی ہے ابھی ابھی ڈانٹ رہی تھی اور اب دیکھو تو......

چل گھر چلیں...... اس نے میرا بازو گھسیٹا۔

اماں جی کو کہو آج جی بھر کر بیٹی کو دیکھ لیں...... پھر جانے......

اونھ! یہاں کیا کرنے آئے تھے؟ میں نے چڑ کر پوچھا۔

بس سیر کرنے آئے تھے! وہ بولی پھر ہنسی...... دیکھو صاحب کالی بلی راستہ کاٹ جائے تو تم ہمیشہ واپس ہو جاتی ہو نا؟ تو اب میری سنو جب راستے میں یہ حضرت ملتے ہیں نا تو میں واپس ہو جاتی ہوں...... اس نے سہیل کی طرف اشارہ کیا۔

سہیل نے جھپٹ کر اس کا بازو پکڑنا چاہا تو وہ میرے پیچھے ہو گئی اور چیخی۔ ماموں جان...... اماں...... جی......

اماں جی...... میں چونکی...... سلیمہ میرے پیچھے کھسک کر بیٹھی میرے کانوں میں کہہ رہی تھی۔ اماں جی کو کہو آج جی بھر کر بیٹی کو دیکھ لیں...... پھر جانے......

میں نے پلٹ کر اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ کیوں ایسی باتیں منہ سے نکالتی ہو؟ اور پھر میری آواز حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی اور آنکھیں بار بار ملتے ہوئے میں نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر سسکیاں لینی شروع کر دیں۔

تم کیوں روتی ہو؟ سلیمہ نے میرے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا اور پھر دھیرے سے بولی۔
میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ اب میں نے فیصلہ کرلیا ہے؟

کیا؟ میں نے سانس روک کر پوچھا۔ اب اس نے کیا فیصلہ کیا ہوگا۔ یہ ضدی لڑکی اب نہ جانے کیا کر بیٹھے؟

بتاؤں گی نہیں۔ وہ گھونگھٹ ہی میں بولی۔

کیوں نہیں بتاؤ گی؟ اری تو مجھے نہیں بتائے گی؟

اس کے منہ سے کہلوا ہی لی تھی۔ جب ہم دونوں فوارے کے پاس بیٹھی تھیں اور یہ شرما کر کہہ رہی تھی میں نہ بتاؤں گی۔ وہ کون ہے......بس کہہ جو دیا......نہیں بتاؤں گی......نہیں بتاؤں گی! ہاں!

نہیں بتائے گی؟ تو جا میں پھر نہ بولوں گی...... ہاں! میں نے منہ پھلا کر ادھر پھیر لیا۔

اری سن تو سہی! وہ میرا چہرہ اپنی طرف کرتی ہوئی بولی تجھے خبر تو ہے ہی۔ مجھ سے کاہے کو پوچھتی ہو!

یہ کون ہو سکتا ہے...... میں نے دل میں سوچا اے لو تو میں کوئی غیب کا علم تو جانتی نہیں......تو بتا دے نا!

ہائے! اس نے سینے پہ دوپٹہ کھینچتے ہوئے دلربائی سے کہا۔ ہائے میرے منہ سے نکلوا کر ہی رہو گی کیا؟

اچھا میں سمجھ گئی! میں نے سوچ کر کہا۔ تاب بھیا؟

میں کوئی غیب کا علم تو جانتی نہیں......
تو بتا دے نا!

اری جا...... بڑی آئی سمجھنے والی! اس نے مجھے ہلکے سے دھکا دیا۔ تاب بھلا اس کے سامنے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ اونہہ! مغرور اتنے ہیں کہ مکھی ناک پہ بیٹھنے آئے تو آفت مچا ڈالیں اور پھر مجھ پہ تو یوں رعب ڈالتے ہیں جیسے میں ان کی خالہ زاد بہن نہیں زرخرید غلام ہوں۔ یہ بڑی خالہ بھی پتہ نہیں اپنے بیٹے کو کیوں اتنا چاہتی ہیں......

میں نے تنگ آ کر کہا...... اچھا اچھا تو نعیم تو نہیں؟

میں نے ابھی کل ہی اسے کلاس روم میں دیکھا تھا وہ سلیمہ کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا......!

اونھ! ...... اس نے جلدی سے کہا ...... یہ نعیم بھی کوئی ایسا لڑکا ہے کہ میرے جیسی کوئی لڑکی اسے پسند کرے؟ شکل نہ صورت اور سمجھتے یہ ہیں کہ جیسے ساری دنیا ان پہ فدا ہے ......

تو پھر سعید بھائی، نسیم میاں، عزیز، مشتاق بھائی ہوں گے ...... کیوں؟ ...... میں نے فرفر سب کے نام لے دیے!

پاگل ہوگئی ہو ...... اور گنو نام کوئی رہ تو نہیں گیا؟

تو پھر کون ہے وہ؟ ...... میں چڑ گئی۔

وہ ہنسی۔

میں نے اور زیادہ چڑتے ہوئے کہا ...... سہیل کا نام رہ گیا ہے۔ وہ تو میں نے نہیں لینا، اس سے تو تمہیں دنیا جہاں کا بیر ہے ......

وہ شرمائی ...... ہاں! بیر تو ہے ہی ...... یہ ہے بھی وہی!

ایں؟ ...... میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا ...... نہ تو مجھے بنا رہی ہے ...... سچ بتا ...... سچی سچی!

وہی تو ہے ...... بس کہہ جو دیا! ...... اس نے میرے کندھوں پر سر ٹکا کر آنکھیں موندتے ہوئے کہا ...... وہی ہے ......!

میری سمجھ میں تو خاک نہیں آیا ...... یہ وہی سہیل ہے؟ میں نے منہ بنا کر پوچھا ...... وہی ہے جو روز تمہیں تنگ کرتا ہے اور جس سے روز تم لڑتی جھگڑتی رہتی ہو اور جس نے بقول تمہارے ناطقہ بند کر رکھا ہے اور جو ہمارے گھر میں بلا کسی روک ٹوک کے ......

اور جو ماموں جی کے چہیتے فرزند ارجمند بھی ہیں! ...... اس نے آنکھیں کھول کر شرارت سے کہا اور پھر کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

بھئی میں نہیں مان سکتی!

اری پگلی تو کیا جانے محبت کس کو کہتے ہیں ...... یہ دل کی باتیں کون جان سکتا ہے ...... اس نے آنکھیں موند کر ہلکی سی آہ بھری اور پھر شرم کی ایک سرخی اس کے چہرے پہ دوڑ گئی ...... اور میں یہ سوچنے لگی کہ یہ جھوٹ کہہ رہی ہے ...... مجھے بنا رہی ہے ...... بھلا یہ سہیل کو چاہ سکتی ہے؟ اسی سہیل کو جسے یہ ہر وقت برا بھلا سناتی رہتی ہے اور ...... سچ یہ بڑی عجیب لڑکی ہے ......!

اور پھر اسی شام ہی کی تو بات ہے رضیہ اماں سے فلم دیکھنے کے لیے ضد کرنے لگی تو اماں نے کہا ...... سلیمہ سے کہہ وہ دکھلائے۔

سلیمہ جھٹ سے سامنے آئی ...... ہاں خالہ! مجھے بھی وہ فلم دیکھنی ہے ...... سہیل کے ساتھ چلے جائیں گے! ...... پھر میری طرف دیکھ کر شرارت سے مسکرائی اور پوچھنے لگی ...... تم بھی چلو گی نا ......

سلیمہ کا منہ اتر گیا۔ مجھے سہیل زہر نظر آیا......اونہہ! بڑا ابنا پھرتا ہے!

نا......نہیں!......میں نے گھبرا کر کہا۔

نہیں کیوں؟......وہ ہنسی......دیکھتی ہوں کیسے نہیں چلو گی؟

ادھر رضیہ چیخی......ہاں باجی آپ کو بھی جانا ہوگا......!

میں نے گھبرا کر سہیل کی طرف دیکھا جو ہاتھ میں ریکٹ تھامے بڑے انداز کے ساتھ اسے ہوا میں گھما رہا تھا بھئی پہلے ہم سے تو پوچھ لو کہ ہم جائیں گے یا نہیں؟

تم چلو گے کیوں نہیں......تمہیں تو فلم دکھانی ہوگی! سلیمہ نے بڑی چاہت سے کہا۔

اونہہ! وہ منہ بنا کر بولا۔ میرا آج میچ ہے......میں تو کھیلنے جا رہا ہوں......مجھے کس حکیم نے کہا ہے کہ تمہارے ساتھ فلم دیکھنے بور ہونے چلوں......وہ باغ کی طرف بڑھا۔

سلیمہ کا منہ اتر گیا۔ مجھے سہیل زہر نظر آیا......اونہہ! بڑا ابنا پھرتا ہے!

تو کیا ہم خود نہیں جاسکتیں؟ سلیمہ چیخی۔ ہم ماموں جان کے ساتھ جاسکتی ہیں۔ کیوں ماموں جی......؟

ماموں جی نے سر ہلایا ہاں۔ میں لے چلوں گا!

زور سے سلیمہ بولی اور ماموں جی آپ سے سہیل کی شکایت بھی کرنی ہے......اس نے زور سے کہا لیکن سہیل باہر جا چکا تھا۔ وہ خاموش ہوگئی اور میں نے تعجب سے سلیمہ کو دیکھا۔

کیا بات ہے؟ ماموں جی نے پوچھا۔

کچھ نہیں جی۔ وہ اداس ہوگئی۔

کہونا۔ میں نے کہا۔ بتا دو نا......

نہیں بتاؤں گی۔ وہ مسکرا دی۔ پھر زور سے بولی۔ یونہی چھیڑنے کو کہا تھا......اور پھر مجھ سے آہستہ سے بولی نہیں بتاؤں گی......بس نہیں بتاؤں! اور آج گھونگھٹ کی اوٹ سے وہ مدھم مدھم لہجے میں مجھے کہہ رہی ہے نہیں بتاؤں گی!

مجھے نہیں بتائے گی؟ میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

سرخ دوپٹے کا لمبا سا گھونگھٹ اور بھی نیچے جھک گیا اور مجھے یوں لگا جیسے سرخ خون کسی نے سفید دوپٹہ پہ انڈیل کر سلیمہ کے سر کو ڈھانپ دیا ہو اور پھر ہلکا سا ایک سانس لے کر میں نے نظریں جھکا لیں۔ سہاگ کی سرخی کسی کے ارمانوں کے خون کی لالی بھی بن سکتی ہے۔ میرے تن بدن میں اک آگ سی لگ

گئی اور گھبرا کر میں نے اپنا دوپٹہ پنکھے کی طرح ہلایا اور پھر سلیمہ کے سر پر سے دوپٹہ درست کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ گرمی لگ رہی ہو گی۔

اس نے سر ہلایا۔

میں نے پھر کان میں پوچھا کیا فیصلہ کیا ہے تو نے؟

بتانے والی بات نہیں!

میرا دل دھڑکنے لگا۔ کہیں اس نے یہ فیصلہ تو نہیں کیا کہ نکاح کے وقت انکار کر ڈالے گی......؟ میں نے دھڑکن بڑھتی دیکھ کر بدحواسی سے پوچھا۔ ہاں کرنے کی بجائے انکار تو نہیں کرنے کا سوچا تو نے؟

اس نے گھونگھٹ ہلایا۔ اوں ہوں......

پھر دوپٹہ اٹھا کر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ کوئی بھی تو نہ تھا۔ تنہائی دیکھ کر دوپٹہ سر سے اتار کر اس نے سانس لیا اور پھر بولی پاگل ہو تم...... میں یوں نہ کروں گی!

میں نے پھر کان میں پوچھا کیا فیصلہ کیا ہے تو نے؟

پھر؟

ٹھہر کر بتا دوں گی! وہ خاموش ہو گئی...... دو چار لڑکیاں کمرے میں داخل ہوئیں اور اس نے سر جھکا لیا۔

دلہن کو دیکھنا ہے! ایک نے پاس بیٹھ کر کہا۔

میں نے سلیمہ کی ٹھوڑی کے نیچے سہارا دے کر اس کا جھکا ہوا سر اٹھایا تو اس کی بند آنکھیں دیکھ کر جی آپ ہی آپ رو رو دیا۔ یہ شوخ لڑکی بھی خاندان کی ناک کے آگے منہ میں تالا لگائے کیسے بیٹھ گئی...... ہائے!

ارے...... انہوں نے گالوں پہ تو سرخی لگائی ہی نہیں! ایک لڑکی چیخی۔

لپ سٹک بھی تو نہیں لگی۔

اچھا میں لگائے دیتی ہوں! میں نے دیکھا واقعی سرخی لگانی تو یاد ہی نہیں رہی تھی اور بیچاری سلیمہ کو اتنی ہوش ملی کہاں تھی کہ مجھے سرخی کا کہتی۔

میں نے سنگھار کا سامان دیکھنا شروع کیا اور لبوں پہ سرخی لگاتے ہوئے مجھے یاد آیا۔ اس روز...... ہاں سنیچر کی رات کو جب ماموں جان کے ہاں دعوت تھی اور سلیمہ تیار ہو رہی تھی تو میں نے آئینہ دیکھ کر

اسے کہا۔

ذرا لپ سٹک تو دینا۔

کیوں؟ سلیمہ نے پوچھا اور اپنے ہونٹوں پہ سرخی کی گہری تہہ جمانے لگی۔

لگانی ہے۔ میں نے اپنے ہونٹ دیکھ کر منہ سکوڑتے ہوئے کہا۔

رہنے دو...... ٹھیک ٹھاک ہیں!

اونہہ! ذرا دو تو سہی! میں نے اس کے ہاتھ کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔

نہیں...... یہ نہیں دینے والی۔ اس نے لپ سٹک پرے کر لی۔

کیوں؟

اس روز فلم تو دکھا نہ سکا اور لپ سٹک تحفے میں لے آیا......

بس یونہی...... وہ ادا سے بولی اور میز کے دوسرے دراز کو کھول کر ایک اور لپ سٹک میری جانب بڑھ کر بولی۔ یہ لگا لو...... پھر جھینپ کر بولی۔ وہ تو اس نے مجھے دی ہے!

کس نے؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔ سہیل نے؟

اس نے سر ہلایا۔ گھنگریالے بالوں کی بہت سی لٹیں ماتھے اور کندھوں پہ بکھر کر آ گریں۔

مجھے یقین نہ آیا۔ اونہہ! اس روز فلم تو دکھا نہ سکا اور لپ سٹک تحفے میں لے آیا...... کیسا لڑکا ہے وہ؟

بچپن ہی تو ہے نا...... وہ پیار سے بولی۔ میری طرح ہی تو ہے...... کبھی لڑتا ہے کبھی روٹھتا ہے اور کبھی چیزیں چھین لیتا ہے اور پھر بہت سے تحفے لا دیتا ہے...... سہیل ہے نا...... وہی جو بڑا برا ہے...... وہ بڑے پیار سے لفظ بڑا برا دہرانے لگی۔

تم جانو اور تمہارا سہیل...... میں نے بڑبڑا کر کہا...... دونوں ایک ہی خمیر کے بنے ہوئے دکھائی دیتے ہو!

وہ کھلکھلا کر ہنس دی!

تیار ہو کر ہم برآمدے میں پہنچے تو تاب بھیا۔ اپنی موٹر میں بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ بڑی دیر لگا دی!

اور امی جان ابھی آنے والی ہیں! سلیمہ نے کہا۔ تاب اپنی کلائی پہ بندھی ہوئی گھڑی کی طرف

دیکھنے لگے۔ بیٹھ جاؤ!

ہم دونوں پچھلی نشست پر بیٹھ گئیں۔ سامنے آئینہ کی طرف میری نظر اٹھی تو میں نے تاب جی کا چہرہ دیکھا۔ گول چہرہ سفید رنگ اور پرکشش آنکھوں پہ پلکیں جھکی ہوئیں [illegible] بھرے ہوئے جن میں ہلکی سی سرخی بڑی بھلی نظر آئی اور ہونٹ نیم وا سے...... مجھے وہ بڑے اچھے لگے...... میں نے سلیمہ کے کان میں کہا۔ سہیل سے تو تاب جی لاکھ دفعہ اچھے ہیں!

چل ہٹ! وہ چیخی پھر سرگوشی میں بولی۔ تو کیا جانے!

ماموں جی کے ہاں پہنچے تو میری نظریں سہیل کو ڈھونڈنے لگیں۔ ارے وہ تو میرے سامنے ہی بیٹھا تھا اور میں تھی کہ اسے ادھر ادھر ڈھونڈ رہی تھی جہاں دوسرے نوجوان بیٹھے تھے...... اور یہ تو بڑا سنجیدہ بنا ہوا ہے ماموں جان کے ساتھ۔ سوٹ میں ملبوس اور سچی اس وقت تو وہ بالکل بدلا ہوا نظر آ رہا تھا! کھلتے ہوئے گندمی رنگ پہ اس کی سیاہ بڑی بڑی آنکھیں بڑی بے چینی کے ساتھ سلیمہ کی جانب بار بار اٹھ جاتی تھیں اور سلیمہ کی آنکھیں جیسے چمک رہی تھیں اور اس چمک میں لاکھوں ستارے سے ٹمٹمانے لگتے تھے اور میرا دل ان دونوں کو دیکھ دیکھ کر دھڑکنے لگتا...... یہ معصومیت اور پاکیزگی! دل پہ کیسا اثر کر رہی تھی! اس روز مجھے احساس ہوا کہ وہ دونوں بدل گئے تھے۔ اب وہ اسے چڑانے کی کوشش بھی نہ کرتا تھا اور نہ ہی سلیمہ اس کی بات کاٹ کر اسے غصہ میں لانے کی دانستہ حرکت کرتی تھی اور پھر جب کچھ دیر کے بعد میں نے سلیمہ کو اپنے قریب نہ پایا تو میں چونکی اور میں نے دیکھا کہ سہیل بھی وہاں نہ تھا۔

باجی! آج یہ سلیمہ کتنی اچھی لگ رہی ہے...... ہے نا؟

مجھ سے وہاں نہ رہا گیا اور رضیہ کو آواز دیتی میں سلیمہ کو ڈھونڈنے باغ کی طرف آ گئی۔ وہاں برآمدے میں بڑے بلب کی روشنی تلے میں نے دونوں کو کھڑے دیکھا تو میں جی ہی جی میں ہنسنے لگی! یہ دونوں چپ چاپ کھڑے بس اک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں! مجھے آتا دیکھ کر سہیل چونکا پھر میری طرف بڑھتے ہوئے کہنے لگا۔ باجی! آج یہ سلیمہ کتنی اچھی لگ رہی ہے...... ہے نا؟

میں نے سر ہلایا......

وہ شرما کر مسکرا دی۔ یہ مجھے بناتا ہے!

اس کے ہونٹ...... وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا؟ پھر بچوں کی طرح شرما کر بولا۔ اس کے ہونٹ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ ویسے بھی یہ بہت خوب صورت ہے نا...... کیوں باجی؟

ہائے! اب دلہن کتنی خوب صورت لگ رہی ہے...... لپ سٹک لگانے سے تو کمال ہی ہوگیا؟ سلیمہ کو دیکھتے ہوئے ایک لڑکی نے کہا اور میں نے گھبرا کر لپ سٹک اپنے ہاتھ سے رکھ دی اور پھر ایک سرد آہ بھر کر میں نے چاروں طرف دیکھا بہت سی لڑکیاں اور کچھ عورتیں بھی کمرے میں آ گئی تھیں!

بھئی سب لوگ یہاں سے نکلو کمرے میں حبس ہو رہا ہے اور دلہن کی طبیعت بھی تو ٹھیک نہیں۔ میں نے زور سے کہا۔

رضیہ کمرے کی طرف آئی مولوی صاحب آ رہے ہیں۔

عورتیں اکٹھی ہو گئیں...... میرا جی دھک دھک کرنے لگا اور مولوی صاحب کمرے میں جب آئے تو ابا جان خالو جان! ماموں جان اور کچھ اور لوگ ساتھ دیکھ کر میں نے سر جھکا لیا۔

دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی اور مجھے کچھ سنائی نہ دیا...... بس دھڑکن کی آواز تھی کہ تیز ہوتی جا رہی تھی اور پھر جب میں نے سینے پہ ہاتھ رکھ کر خود کو سنبھالا تو سب چیخ رہے تھے۔ مبارک ہو...... مبارک!

دیکھ لو میں قربان ہو گئی سب کی عزت کے آگے......

میری جان میں جان آئی اور تب خالہ جان کی مدد سے میں نے عورتوں کو کمرے میں سے باہر نکالا اور تنہائی پاتے ہی میں خالہ جان سے لپٹ کر رونے لگی...... وہ مجھے دلاسہ دیتے ہوئے باہر کو چل دیں تو میں نے پلٹ کر سلیمہ کی طرف دیکھا...... گھبرا کر میں نے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی اور اس کی طرف بڑھی...... سلیمہ میری جان!

ہائے باجی! وہ روتے میں کیسے بولتی...... سسکنے لگی۔ دیکھ لو میں قربان ہو گئی سب کی عزت کے آگے......

میری بہن...... میری سلیمہ...... ہچکیوں کے مارے الفاظ منہ سے نکل نہ سکے۔ میں تو سمجھی تھی شائد تو انکار کر ڈالے گی...... آہ یہ تو نے اچھا کیا...... اچھا ہی کیا؟

انکار کرنا ہوتا تو پہلے نہ کر دیتی؟ وہ سسکی۔ مگر میں نے فیصلہ کر لیا ہے!

کیسا فیصلہ میری جان؟ میں نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

تم خود ہی کہتی ہو...... تاب جی بڑے اچھے ہیں وہ بڑے...... وہ ہچکیوں میں بولی۔

میں نے بات کاٹ دی۔ ہاں...... ہاں سلیمہ! وہ بڑے اچھے ہیں...... میں انہیں تم سے بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ تمہیں خوش رکھیں گے تمہیں......

پاگل نہ بنو! میں نے کانپ کر کہا کہیں ایسی غلطی نہ کر بیٹھنا......

تو میں ان سے صاف صاف کہہ دوں گی! وہ عزم سے بولی۔
کیا؟ میں دم بخود ہو کر رہ گئی۔
یہی...... یہی کہ میں سہیل سے محبت کرتی ہوں...... میں جو ماں باپ کے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ ان سے تو کہہ سکوں گی۔ انہیں اپنا سمجھتے ہوئے کہہ دوں گی کہ میں کسی اور کی امانت ہوں...... مجھے طلاق......
شش! میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔
بس میں نے فیصلہ کر لیا ہے...... وہ منہ پر سے ہاتھ ہٹا کر بولی۔ میں تاب سے ساری بات کہہ دوں گی...... میں ان سے التجا کروں گی کہ مجھے آزاد کر دیں...... مجھے سہیل سے محبت ہے۔ سہیل سے......
پاگل نہ بنو! میں نے کانپ کر کہا کہیں ایسی غلطی نہ کر بیٹھنا......
بس اب میں برداشت نہیں کر......
کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا...... میں نے گھبرا کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور اٹھ کر دروازہ کھولا...... باہر اماں اور خالہ جان کھڑی تھیں...... میں کانپنے لگی...... زمین جیسے گھومنے لگی اور میں نے پٹ کا سہارا لے کر بمشکل کہا جی......؟
بھئی دلہن کی رخصتی کو اب دیر نہیں کرنی چاہیے...... اماں جان اندر آتے ہوئے بولیں۔
میں نے اطمینان کی سانس لے کر سلیمہ کی طرف دیکھا وہ خالہ جان کے سینے سے لگی بلک بلک کر رو رہی تھی...... میں نے سر جھکا کر سینے پر ہاتھ رکھا اور عورتوں کی طرف دیکھا جہاں شور مچا ہوا تھا......
دولہا آ گیا...... اندر آ گیا......!
میں نے دیکھا بڑی خالہ جان اپنے بیٹے کو دولہا بنائے! سہارا دے کر عورتوں کے درمیان بٹھا کر چیخ رہی تھیں۔ بھئی اب جلدی جلدی رسمیں ادا کر لو...... میرے بچے کو گرمی بھی تو لگ رہی ہے...... پھر ادھر کو دیکھ کر وہ اٹھیں میں اپنی بہو بیٹی کو تو لاؤں!
دولہا دلہن کو آمنے سامنے بٹھا کر شیشہ دکھایا جانے لگا تو مجھے وہ لمحہ یاد آ گیا جب میں شیشے میں بیٹھی اپنے بالوں میں لہریں سی پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ مجھے منجھلی خالہ کا عکس شیشے میں نظر آیا۔ وہ اپنے ہاتھ میں مٹھائی کی ٹوکری لیے آئی تھیں۔
خالہ جی! تاب بھائی پیچھے پیچھے کمرے میں آتے نظر آئے تو میں نے پلٹ کر دیکھا۔

جالڑ کے تو باہر جا...... ابھی سے پردہ سمجھ! انہوں نے پیار سے تاب جی کو ڈانٹا۔
میں سوچنے لگی...... یہ سلیمہ سے پوچھے بغیر تاب جی سے اس کا رشتہ طے کر رہے ہیں اور یہ کوئی اچھی بات نہیں...... وہ ہے بڑی ضدی بھلا کاہے کو ماننے لگی...... مگر......!
اور میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب سلیمہ نے یہ جان کر مجھے کہا میں اماں کے آگے تو بول لیتی...... پر تم ہی بتاؤ' ابا جان سے کیا کہوں......
اور انہوں نے تو یہ رشتہ......
ہاں! ابا جان نے...... میرے ہی ابا جان نے! اس نے آہ بھری میں چپ ہوں اور چپ ہی رہوں گی!
کب تک؟ میں نے رندھے گلے سے پوچھا۔
وہ بے کیف ہنسی ہنس دی جب تک؟ جب تک پتہ نہیں! وہ بڑبڑائی۔
اور پھر جب ٹپٹا کر میں نے اماں جان سے کہا خالہ بھی عجیب ہیں سلیمہ سے پوچھے بغیر تاب بھائی سے......
وہ میری بات کاٹ کر بولیں تمہیں کیا؟ بیٹیاں ایسی باتوں میں نہیں بولا کرتیں۔ تمہاری بڑی خالہ کا ایک ہی تو بچہ ہے اور چھوٹی خالہ نے تو سلیمہ کے لیے شروع ہی سے اسے پسند کر لیا تھا۔ مگر ہمیں ان باتوں میں دخل نہیں دینا چاہیے......

یہ ضدی لڑکی یقیناً ایسے ہی کرے گی! پھر......
پھر کیا ہوگا......

اپنا سا منہ لے کر میں چپ ہو کر رہ گئی...... ہاں مجھے کیا پڑی...... مگر یہ سلیمہ بڑی ہٹ دھرم ہے...... یہ کوئی نہ کوئی گل ضرور کھلائے گی...... اور اب دیکھو نا...... وہ کیا کہتی تھی...... اس نے ایک فیصلہ کر لیا ہے...... وہ تاب جی سے کہہ دے...... کہ وہ سہیل سے محبت کرتی ہے...... اسے طلاق......
آہ...... آہ! میں نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے...... اور آنکھیں بند کر لیں...... اب کیا ہو گا...... یہ پاگل لڑکی کہیں کہہ نہ دے...... بھلا مرد کب برداشت کر سکتا ہے کہ بیوی پہلی رات بجائے شرمانے کے منہ کھول کے بیٹھ جائے اور بے شرموں کی طرح چیخے کہ مجھے آزاد کر دو...... میں کسی اور سے محبت کرتی ہوں......!

یہ ضدی لڑکی یقیناً ایسے ہی کرے گی! پھر...... پھر کیا ہوگا...... اس کی ضد سے میں واقف ہوں...... اس نے کہا میں ابا کے آگے کچھ نہ بولوں گی...... اور یہ واقعی چپ رہی...... اس نے کہا اب بیاہ ہو گیا مگر اب میں اور برداشت نہیں کر سکتی اب میں تاب سے کہہ دوں گی......

اور یہ میں جانتی ہوں کہ وہ واقعی ایسی ہی ہے...... وہ سچ مچ تاب جی سے کہہ دے گی......! انہیں...... نہیں میں اسے سمجھاؤں گی...... پگلی کیوں پاگلوں کی سی باتیں کرتی ہو...... کیوں اپنی زندگی تباہ کرنے پر تلی بیٹھی ہو......!

بہت سے بکھرے ہوئے خیالات میرے ذہن میں گھومنے لگے۔ سوچ کا دھاگہ الجھتا چلا گیا اور میں آگے بڑھ کر کوشش کرنے لگی کہ کسی طرح سلیمہ کے پاس جا بیٹھوں اور اسے تنہائی میں سمجھانے کی کوشش کروں کہ وہ تاب سے کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے اس کی زندگی تباہی کی طرف بڑھے......

رسمیں ختم ہوئیں...... اور میں کوشش کرتی ہی رہ گئی کہ تنہائی میں اسے سمجھاؤں...... اب تنہائی کہاں ملتی ہے...... اب تو ہر طرف شور ہے...... عورتیں ہیں بچے ہیں جو یادوں کی مانند ہر طرف بکھرے پڑے ہیں!

مجھے نیند نہیں آ رہی ہے...... میں پاگلوں کی طرح چکر پر چکر لگا رہی ہوں......

اور اب چاروں اور سناٹا چھا رہا ہے اور تاریکی بڑھ رہی ہے...... یہ جو ایک دو آوازیں سنائی دے رہی ہیں یہ بھی اب خاموشی میں مل جائیں گی...... یہ ایک لمحہ کا سناٹا کیسا شدید ہے اور اس کے بعد کس زور کی چیخیں سنائی دیں گی...... ہاں ردِعمل کس قدر شدید ہوگا...... مگر نہیں...... نہیں!

مجھے نیند نہیں آ رہی ہے...... میں پاگلوں کی طرح چکر پر چکر لگا رہی ہوں...... نہیں...... میں تو بیٹھی ہوں...... ہاں میں تو کار میں بیٹھی ہوں...... یہ ہم سب کو کہاں لیے جا رہی ہے...... بڑی خالہ کے گھر......

ہاں ٹھیک ہے یہ بڑی خالہ کا گھر ہے!

یہ دیکھو...... شور مچ گیا ہے...... شور!

دلہن...... دلہن آ گئی!

ہاں دلہن آ گئی!

بڑی خالہ تمہیں مبارک ہو...... دلہن آ گئی......

چاندنی دلہن مبارک تاب میاں!

سنو میری رانی...... سلیمہ پیاری ضدی مت بنا...... خاموش رہنا اب تو خاموشی ہی بہتر ہے...... !

توبہ ہے...... یہ نہیں...... ارے یہ نہیں مانتی...... اسے اب کون سمجھائے!

خالہ اماں مجھ سے کہہ رہی ہیں اے بٹی تجھے کیا ہوا؟ اری چل جا کر بہن کو پوچھ کچھ! میں چونکی اور انہیں دیکھنے لگی۔ یہ کیا کہہ رہی ہیں؟

باجی تو سونے ہی لگی تھی...... پچھلی رات سوئی نہیں تھیں نارضیہ مجھے دیکھ کر ہنسی۔

آں...... ہاں...... میں گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

سلیمہ کہہ رہی ہے سر میں درد ہے! بڑی خالہ نے مجھے کہا جا کمرے میں لے جا......

میں دل میں بڑی خوش ہوئی...... تو اب مجھے تنہائی مل جائے گی...... میں اسے سمجھا سکوں گی اور...... ہاں عورتوں کو کہہ دیجیے نا...... دلہن کا پیچھا چھوڑیں...... اب آرام بھی تو کرنے دیں!

میں سلیمہ کو بمشکل تمام عورتوں میں سے اٹھا کر اس کے کمرے میں لائی...... ہاں تو رانی یہ ہے تمہاری خواب گاہ؟

وہ چپ چاپ پلنگ پر بیٹھ گئی۔

میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا سر جھکا ہوا۔ آنکھیں مارے غم کے بند اور ہونٹ سوکھ رہے ہیں...... اور اس روز سہیل کے سامنے یہ ہونٹ کس قدر پیارے لگ رہے تھے۔ سہیل نے کہا تھا اس کے ہونٹ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں اور ویسے بھی یہ بہت خوب صورت ہے نا...... کیوں باجی؟

ہاں...... ہاں!

میں چونک گئی...... وقت کس قدر تیزی سے گزر رہا ہے...... اس کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے کہا۔ سلیمہ......

سلیمہ نے سر جھکایا اور جھکایا اور منہ سے کچھ نہ بولی۔

میری جان اب......

میری بات کسی کی آہٹ نے کاٹ دی۔ گھبرا کر میں نے دروازے کی طرف دیکھا...... تاب جی کھڑے مجھے دیکھ رہے ہیں...... میں گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور بے سوچے سمجھے کمرے میں سے بھاگی...... باہر بڑے کمرے میں سوئی ہوئی عورتوں پہ میرا پاؤں پڑا تو وہ چلائیں۔ کون!

میں نے آنکھیں کھول کر یوں ارد گرد دیکھا جیسے میں بیہوش تھی اور اب ہوش میں آنے کے بعد سوچ رہی ہوں کہ میں کیا کرنا چاہتی تھی اور کیا کر رہی تھی۔

مجھے کچھ بجھائی نہ دیا...... ہر طرف اندھیرا ہے۔ ہر طرف تاریکی ہے اور میں اندھیرے میں نہ

جانے کس طرف بڑھتی جا رہی ہوں...... نہ جانے کس طرف...... یہ کون سی راہ ہے اور میرے قدم کس جانب اٹھ رہے ہیں مجھے کچھ خبر نہیں...... کچھ بھی تو خبر نہیں!

میں دروازے کے باہر کھڑی ہوں۔ یہ دروازہ اندر سے بند ہے اور اس کے کمرے میں...... ایک آتش فشاں بند پڑا ہے جو ابھی پھٹ پڑے گا...... پھر اس کے لاوے میں سب کچھ بہہ جائے گا...... جھوٹی عزت خاندان کی عزت اور خاندان کی ناک کٹ کر ہوا میں اچھلتی پھرے گی اور سلیمہ کے دل میں ابلتا ہوا لاوا اپنے ساتھ سب کو بہا لے جائے گا...... یہ دروازہ بند ہے اور میں ہر آہٹ پر چونک چونک کر ادھر ادھر دیکھ رہی ہوں......!

یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں کیوں اس دروازے کے ساتھ ایسے لگ کر کھڑی ہوں؟ اگر مجھے کسی نے یہاں دیکھ لیا تو۔ تو ہائے! کتنی بدنامی کی بات ہوگی۔ بدنامی!

سلیمہ کے دل میں ابلتا ہوا لاوا اپنے ساتھ سب کو بہا لے جائے گا......

میں بھاگ کر اس طرف آئی ہوں جہاں اماں سو رہی ہیں یہ رضیہ سو رہی ہے اور یہ عورتیں۔ یہ سوئی ہوئی عورتیں ابھی جاگ اٹھیں گی...... ابھی......!

سلیمہ کے منہ سے ابھی وہ الفاظ نکلیں گے جو آتش فشاں پہاڑ کے اگلتے ہوئے لاوے کا باعث بن سکتے ہیں اور پھر تاب جی آگ بگولا ہو کر...... اوہ......

یہ تاریکی...... یہ تاریکی...... اندھیرا...... گھپ اندھیرا! اور میں نہ جانے کہاں ہوں۔ کہاں کھڑی ہوں؟

میری آنکھ کھل گئی۔ مرغ کی آذان...... ارے...... ارے میں کتنی بے خبر ہوں میں یہاں ہی راستے میں بیٹھی بیٹھی سو گئی......!

یہ چیخ! یہ چیخ کی آواز! میں کانپ گئی۔ نہیں یہ تو دروازہ کسی نے کھولا ہے اور دروازہ کھلنے کی آواز تھی...... یہ...... یہ...... دروازہ کھلا ہے۔

میں نے آنکھیں ملتے ہوئے دیکھا۔ تاب جی دروازہ کھول کر باہر نکلے۔ پھر اندر کی طرف مڑے اور پھر انہوں نے پلٹ کر ادھر دیکھا۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے جلدی سے منہ پھیرا اور کمرے میں سے باہر برآمدے کی طرف نکل گئے۔

مسکراتے ہوئے جھینپ کر وہ بولی۔
تاب جی بڑے پیارے ہیں بہت اچھے ہیں......

میرے تن بدن میں سے جان نکل گئی...... مگر میں رہ نہ سکی...... منوں بھاری قدم اٹھاتی میں کمرے میں داخل ہوئی......

سلیمہ! میں نے سرگوشی کی۔

سلیمہ نے آنکھیں کھولیں اور مسکرائی...... وہ بے حد خوش ہے تو کیا تاب جی نے اس کی بات مان لی ہے......

وہ کس قدر معصوم نظر آرہی ہے اور بالکل تروتازہ!

وہ بہت اچھے ہیں...... وہ ہولے سے بولی۔

تو کیا تم نے ساری بات کہہ دی؟

اری پگلی! اس نے کروٹ بدلی۔ چھوڑو ان باتوں کو۔

میں حیرت سے اسے گھورنے لگی۔ تاب بھائی نے کیا...... میں پوری بات نہ کر سکی۔ گلا رندھ سا گیا۔

مسکراتے ہوئے جھینپ کر وہ بولی۔ تاب جی بڑے پیارے ہیں بہت اچھے ہیں......

اور سہیل...... میں نے بے اختیار ہو کر پوچھا۔

اونہہ! ناسمجھی کی باتیں۔ اس نے منہ پھیر کر میرے رخسار پہ ایک چٹکی لی اور دوپٹہ منہ پر رکھ کر مسکرانے لگی......!

☆......☆......☆

مشتاق اعظمی، آسنسول، بھارت

نئ رُتوں کی چاہ

منوج کی آنکھوں میں آسودگی کی چمک کبھی نہیں دیکھی گئی۔ اس کے تھکے چہرے سے اطمینان کا رنگ کب کا غائب ہو چکا تھا۔ تازہ دم رہنے کے لیے بھرپور آمدنی کی ضرورت ہوتی ہے۔

دفتر میں ارشد اُس کے حالات پر کُوھتا تھا، حالانکہ وہ خود ان ہی حالات سے دوچار تھا جن میں منوج گھِرا ہوا تھا۔ دونوں ہی کے اعصاب مضبوط تھے۔ دونوں ہی ذہین تھے۔

ایک دن دفتر سے لوٹتے وقت ارشد کے مُنہ سے بے ساختہ نکلا "یار، ہماری آرزوئیں مچلنا بھول گئی ہیں۔"

"ہاں، لوگوں نے تاج محل تک بنوا ڈالا، آج اسپیس میں جگہ کی بکنگ ہو رہی ہے۔ کروڑوں روپے تجوریوں کے اندر رکھ کر سونے والوں کی کمی نہیں۔ بعض منسٹروں کے یہاں دھان کی کوٹھی میں روپے ملتے ہیں۔ لیکن ہم ایسے ہیں کہ ایک گھروندہ تک نہیں بنوا سکتے" منوج جیسے ابلنے کے لیے تیار تھا۔

"خواہش جب برداشت کی حدود توڑ دے تو راستہ ضرور نکلتا ہے۔"

ہمارے راستے تاریکی میں گم ہیں۔"

"ہمیں نادیدہ طاقت سے دست و گریباں ہونا پڑے گا۔"

"میں نہیں سمجھا۔"

"راہ چلتے نہیں سمجھو گے۔ کہیں اکیلے میں بیٹھ کر موقع ملے تب ڈِسکس کریں گے۔"

اگلے سنیچر کو آفس سے نکلنے کے بعد دونوں ایک پارک میں جا بیٹھے۔

"روپے کمانے کے لیے کوئی اور صورت نکالنی ہو گی۔"

"لیکن.........."

"پہلے میری بات سنو۔ میری بیوی کے خواب ادھورے رہ گئے ہیں۔ بچوں کے چہروں پر

معصومیت کی جگہ محرومی کے سائے ہیں۔ جائز طریقے سے زندگی گزارنے کا اتنا بڑا نقصان ____!؟''

''ناجائز پھر بھی ناجائز ہے۔ غلط مت سوچو۔''

''سوچنے ہی کی تو عادت ہوگئی ہے۔ ورنہ اس کے آگے خلاء ہے۔''

''خلاء ہی رہنے دو''

''پھر ٹھیک ہے۔ ہم چلیں۔''

دونوں نے اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔

کئی ہفتے تک ہوا میں اداسی رہی۔ کچھ غلط کرنے کا احساس اندر ہی اندر دونوں کو کاٹتا رہا۔ ہفتہ مہینہ میں تبدیل ہوگیا۔ پھر دونوں نے فیصلہ کرلیا کہ تنہائی میں بیٹھیں گے۔ وقت طے ہو جانے سے ذہن کا صحرا جل تھل ہوگیا۔ لیکن ادھوری تصویریں رنگوں سے خالی تھیں۔ وجود سے تکان اور روح سے کرب پور پور میں جذب ہوتا رہا۔

''ہماری گفتگو کہاں سے شروع ہو؟''

''جہاں سے محرومی کا دکھ جھیلنے کا حوصلہ ملے۔''

''زندگی کی اذیت ناکی ناقابل برداشت ہے۔ یہ روز روز کا مرنا کیا؟''

''چھوٹی چھوٹی خوشیاں بھی آزمائش بن گئی ہیں۔ رگوں میں زہر پیوست ہوتا جا رہا ہے۔''

''ہاں ذہنی انتشار بڑا قاتل ہوتا ہے۔''

''اس انتشار سے نکلنا ہوگا۔''

''کوئی پلاننگ؟''

''رِسک لینا پڑے گا۔''

''نقشہ کیا ہے؟''

''روشنی کی یلغار سے آنکھوں کو ڈھانپنا پڑے گا۔ ضمیر کو خاکستری دھوئیں مین لپیٹنا ہوگا۔''

''آسمان میں چھید تو نہیں کرنا ہے؟''

''تیز بوچھاریں باہر باہر پڑیں گی۔''

''اور اندر؟''

''اندر کا درخت تنومند رہے گا۔ بشرط یہ کہ.........''

''گھبراہٹ یہیں سے شروع ہوتی ہے۔''

''قدم ہواؤں پر رکھنے سے شعور ذات کی کھنکھناہٹ لطف نہیں دے گی۔''

''سچائی کیا ہے؟''

''اندر کہیں اندھیرے میں جو منی پلانٹ پل رہا ہے اسے ناخنوں سے کھرچنا چاہتا ہوں۔''

''پھر ——؟''

''پھر یہ کہ سورج کی طرف نگاہ کرنا ہوگا۔''

''میں نہیں سمجھا ——''

''وہی کچھ غلط کرنے والی بات۔''

''سوچتا ہوں کہ ہم تو فاختہ بن کر دانہ چگتے رہے ہیں۔ نئی پہچان کے لیے کیا کرنا ہوگا۔''

''اغوا!''

''ارے؟''

''ہاں، اس میں پونجی کو کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بس کوئی ویران سا ٹھکانہ ڈھونڈنا ہے۔ پھر کسی امیر زادے کے بچے کو تاکنا ہے۔''

''خوشبو کو قید کرنے کا ہنر میں نہیں جانتا۔''

''میں بھی تو پہلی بار دانے کے لمس سے آشنا ہو سکوں گا۔''

''اس طرح کی چمکتی دھوپ کی کھلکھلاہٹ بے قابو ٹریفک کی طرح ہوتی ہے۔''

''تم پھر عینک اتار کر منظر دیکھ رہے ہو۔''

''مجھے موہوم سی بھی خوش فہمی نہیں ہے۔''

''میں کیا سمجھوں؟''

''ضمیر کی آواز کو اَن سُنی کرنے کی ہمت نہیں ہے؟ حوصلے میں لرزش کیوں ہے؟''

''سوچا تھا، تم ہم نفس اور غم گُسار بنو گے۔''

''دیکھو، ہم دونوں جس کشتی میں سوار ہیں، اس میں سوراخ مت ہونے دو۔''

گہری سیاہی مائل شام سناٹا بن کر چھا چکی ہے۔ دونوں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور بغیر کچھ کہے ایک ہی سمت روانہ ہو جاتے ہیں۔''

نیلم احمد بشیر۔ لاہور

پردہ اٹھتا ہے

ان دنوں میں اپنی بیٹی عنبر کے پاس امریکی ریاست ورجینیا میں ٹھہری ہوئی ہوں۔ ورجینیا وہ خوبصورت ریاست ہے جہاں ایک زمانے میں کار کی نمبر پلیٹوں پہ لکھا ہوتا تھا۔'' ورجینیا از فارلورز'' .Virginia is for Lovers۔ اب میں نے حالیہ سالوں میں نمبر پلیٹوں پہ ایسا لکھا نہیں دیکھا۔ شاید اسلئے کہ امریکہ کے حالات اتنے بدل گئے ہیں کہ ایسے رومانوی خیالات کا ذکر اب نمبر پلیٹوں پہ کرنا مناسب نہیں رہا۔ اب امریکیوں کو فن اینڈ گیمز کی جگہ دہشت گردی، جنگوں، ڈیزی کٹر حملوں اور مسلم Militants جیسے عوامل سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ ورجینیا چونکہ امریکہ کے کیپٹل شہر واشنگٹن ڈی سی سے جڑی ہوئی ریاست ہے اسلئے اس پُر جمال، پُر وقار، صاف ستھرے شہر کا سنجیدہ کلچر اس پہ بھی چھایا نظر آتا ہے۔ پُر شکوہ عمارات، کشادہ سبز باغات، ٹریفک کے منتظم بہاؤ والا واشنگٹن ڈی سی وہ خوبصورت شہر ہے جہاں سے حاکمِ دنیا کم تر ملکوں کیلئے بدصورت فیصلے صادر کرتے ہیں۔

میری بیٹی عنبر یہاں کے ٹاؤن کرسٹل سٹی کی ایک یونیورسٹی میں ایڈمنسٹریشن جاب کرتی ہے۔ اسے اکثر اپنی اچھی کارکردگی پہ شاباش اور توصیفی اسناد ملتی رہتی ہیں پچھلے دنوں اسکی تنخواہ میں بھی اچھا خاصہ اضافہ کر دیا گیا جس کی وجہ سے وہ بہت خوش ہوئی اور مجھے زبردست ڈنر کھلایا۔ وہ ہمیشہ ہی مجھ پر دل کھول کر پیسے خرچ کرتی ہے، شام کو جب کام سے واپس آتی ہے تو اکثر ہم دونوں ماں بیٹی چہل قدمی کیلئے واشنگٹن ڈی سی کے خوبصورت پارکوں میں نکل جاتی ہیں۔ میں اس اونچی شانوں والے خوبصورت شہر کی سج دھج اور جاہ وجلال کو دیکھ کر ہمیشہ سوچتی ہوں کاش میرے ملک کے شہر بھی ایسے ہی ہوتے۔ کاش ہم نے کشکول سازی کی صنعت کو فروغ دینے کے بجائے سائنس وٹیکنالوجی کی محبت کو اپنا ایمان بنایا ہوتا تو آج یوں پردیسیوں میں بے وطن ہو کر زندگی کرنے پہ مجبور نہ ہوتے۔ پچھلے کچھ دنوں سے ڈی سی شہر میں انڈین فلم سٹارز کے

کاش میرے ملک کے شہر بھی ایسے ہی ہوتے

ایک انٹرٹینمینٹ شو کا بہت چرچا تھا۔ ٹی وی پر اشتہار چل رہے تھے، انٹرنیٹ پہ ٹکٹ بک رہے تھے اور ہر طرف پروموشن پوسٹرز لگے دکھائی دے رہے تھے۔ چار ستمبر کو Temptation 2004 کے نام سے کیا جانے والا یہ شو کافی پرکشش دکھائی دے رہا تھا۔ کیوں نہ ہم بھی یہ مزے دار شو دیکھیں! عنبر نے مجھ سے کہا اور سو سو ڈالر کی دو ٹکٹیں خرید لیں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر بہت خوش تھی۔ کیونکہ میں نے بہت سال پہلے امریکہ میں اسی قسم کا امیتابھ بچن شو دیکھ رکھا تھا کہ تب امیتابھ کا دور تھا۔ وہ جوان تھا اور ہم نوجوان، لیکن اب عرصہ دراز سے اس قسم کا کوئی انڈین شو دیکھنے کا موقعہ نہیں مل سکا تھا۔ لہذا میں نے بھی خوشی خوشی حامی بھر لی کہ اچھا ہے چلتے ہیں مزا رہے گا۔ ہم واشنگٹن ڈی سی کے بڑے سے سٹیڈیم نما ایم سی آئی سنٹر میں ہونے والے اس شو کا بے تابی سے انتظار کرنے لگے اب کوئی مانے یا نہ مانے انڈین فلمیں ہم سب کی زندگی کا حصہ بن چکی ہیں اور ہر گھر میں ذوق و شوق سے دیکھی جاتی ہیں۔ انڈیا پاکستان، نیپال، بنگلہ دیش، یورپ امریکہ جہاں جہاں بھی برصغیر کے لوگ آباد ہیں انڈین فلمیں تفریح کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہیں اور یہی حقیقت ہے۔

انڈین فلمیں ہم سب کی زندگی کا حصہ بن چکی ہیں

اگر میں یہ کہوں کہ ہمارے مغربی ممالک میں رہنے والے لوگوں کے بچوں کو اپنی زبان، تہذیب اور رسم و رواج کی تعلیم دینے میں انڈین فلموں کا بہت بڑا ہاتھ ہے تو کچھ ایسا غلط نہ ہوگا۔ آج انڈین فلمیں بین الاقوامی معیار کے مطابق بنتی اور بین الاقوامی مارکیٹ میں چلتی ہیں۔ ہالی وڈ کے ہم پلہ بالی وڈ سینما نے دنیا بھر میں اپنے مداحین پیدا کر لئے ہیں اور اسی لئے ان کے فلم سٹارز کے شو اتنی کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ اس شو کے مین فنکاروں میں سیف علی خان، پریتی زینٹا، رانی مکرجی، پریانکا چوپڑہ کے نام تھے مگر سب سے زیادہ جس نام کیلئے لوگ شو دیکھنے جا رہے تھے وہ تھا سپر سٹار اداکار شاہ رُخ خان کا، سالہا سال سے مقبولیت کی سیڑھی پہ اوپر ہی اوپر چڑھتے چلے جانے والے شاہ رُخ آج اپنے مداحوں کیلئے نمبرون کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ ان کی اداکاری شخصیت اور فن نے سبھی کو اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ ہم ماں بیٹی اور قریبی شہر بالٹی مور میں رہنے والی میری بھابی فرح تینوں شو دیکھنے کے کیلئے گھر سے نکل پڑے۔ عنبر کا خیال تھا کہ پارکنگ کا مسئلہ ہوگا لہذا ہم لوگ لوکل ٹرین سے سفر کریں تو بہتر ہوگا۔ یہی سوچ کر ہم ٹرین اسٹیشن کی طرف چل دیئے۔ نیو یارک شہر کی نسبت واشنگٹن ڈی سی کی میٹرو ٹرین اور سٹیشن بہت صاف ستھرے اور خوبصورت لگے۔ سٹیشن کی گول چھت اور کنکریٹ میں بنے جیومیٹریکل ڈیزائن کو دیکھتے ہوئے ہم کچھ ہی دیر میں ٹرین میں جا سوار ہوئے جس نے ہمیں ایم

سی آئی سنٹر کے بالکل قریب ہی اتار دیا۔ چند منٹوں کی واک کے بعد ہم لوگ بڑے سے اُس سنٹر کے پاس پہنچ گئے جہاں اکثر نامور امریکی گلوکاروں کی کنسرٹس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ سڑک پہ ہم جیسے بہت سے لوگ جنھیں امریکہ میں دیسی کہا جاتا ہے کا ایک ہجوم تھا جو شو کیلئے آیا ہوا تھا۔ اچھے اچھے کپڑے پہنے بوڑھے بچے، فیشن ایبل لڑکے لڑکیوں سبھی کے چہرے اندر جانے کے خیال سے دمک رہے تھے کوئی کسی کو ہیلو ہائے کہہ کر گلے مل رہا تھے تو کوئی موبائل فون پہ کسی آنے والے دوست کو راستہ سمجھا رہا تھا کہ امریکہ میں کہیں بھی آنا جانا ہو، ہدایات کے بغیر کوئی منزل پہ نہیں پہنچ سکتا۔ ہر طرف رنگ برنگی شلوار قمیض، ساڑیاں، پینٹ شرٹس، کڑھائی والے کرتے پاجامے پہنے شائقین کھڑے نظر آرہے تھے اور خاموش امریکی سنڈے، جاندار دیسی اتوار میں تبدیل ہو چکا تھا۔

ہم تینوں ابھی عمارت کے اندر جانے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھیں کہ یکدم ہماری نظر دو خواتین پر پڑی جو ہال میں جانے کیلئے اِسی طرف آرہی تھیں دونوں کچھ پاکستانی سی لگ رہی تھیں ایک نے دوسری کو سہارا دے رکھا تھا اور وہ لڑکھڑا کر رُک رُک کر چل رہی تھی۔ جیسے ہی وہ ہمارے قریب آئیں فرح دیکھ کر ان کی طرف بڑھی اور ان سے علیک سلیک کرنے کے بعد کہنے لگی۔ باجی یہ سہانہ اور اس کی بھابی ہیں۔

مجھے اپنے کانوں پہ یقین نہیں آیا۔ سہانہ بالٹی مور والی؟ اور یہاں؟ وہ اس حالت میں کیسے بستر سے اٹھ کر آگئی تھی؟ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ سہانہ؟ کیا! سہانہ یہاں آئی ہے؟ مجھے اپنی

سہانہ؟ کیا! سہانہ یہاں آئی ہے؟ مجھے اپنی آنکھوں اور کانوں پہ یقین نہیں آیا

آنکھوں اور کانوں پہ یقین نہیں آیا۔ وہ اس حالت میں کیسے اٹھ گئی تھی؟ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ سہانہ فرح کے شہر بالٹی مور کی رہنے والی تھی جس کے بارے میں فرح دُکھ سے بتایا کرتی تھی کہ وہ کینسر کی آخری سٹیج پر پہنچ چکی ہے ڈاکٹروں نے اس مرض کی تشخیص کے بعد اس کے کئی اندرونی اعضاء کاٹ ڈالے تھے مگر کینسر اُسے چھوڑنے کو تیار نہ تھا اور سارے جسم میں پھیل چکا تھا۔ اسکا علاج بالٹی مور کے چوٹی کے ہسپتالوں میں ہو رہا تھا مگر ڈاکٹر بے بس ہو چکے تھے او رانہوں نے اسے لاعلاج قرار دے کر گھر بھیج دیا تھا۔ ایک مرحلے پہ انہوں نے اس کے کیس کو کینسر سٹڈی کیلئے ریسرچ کالج میں بھیجنا چاہا مگر سہانہ اور اسکا شوہر رضامند نہ ہوئے۔ سہانہ گھر جانا چاہتی تھی کیونکہ چار چھوٹے چھوٹے بچے اس کی راہ تک رہے تھے۔ اس کی حالت بتدریج خراب ہوتی جا رہی تھی۔ کیموتھراپی سے سر کے تمام بال جھڑ چکے تھے مگر سہانہ اللہ سے ناامید نہ

تھی۔ ہر وقت اس کے منہ پہ یہی جملہ ہوتا شاید اللہ تعالیٰ کوئی معجزہ کر دیں۔ سہانہ حوصلہ ہارنے والی لڑکیوں میں سے نہیں تھی لہٰذا وہ ہر وقت زندہ رہنے کی باتیں ہی کیا کرتی تھی۔

فرح بتاتی تھی کہ سہانہ کس قدر زندگی سے بھرپور، شوقین مزاج، ہنسی مذاق کرنے والی ہنگاموں کی دلدادہ لڑکی تھی۔ اسے اچانک ہی اپنے مرض کے بارے میں پتہ چلا تھا۔ اب اسکی زندگی کے دیئے کی لو مدھم ہوتی جا رہی تھی، عمر کی نقدی ختم ہو رہی تھی مگر حسرتیں تھیں کہ بس ایسی کہ ان کا انبار چلا جا رہا تھا۔ انسان کے ارمان کبھی ختم نہیں ہوتے اسکی خواہشات کبھی دم نہیں توڑتیں۔ وہ مشکل سے سانس لیتی تھی مگر پھر بھی گھر میں بچوں کیلئے کھانا بناتی، لڑکھڑاتی ٹانگوں سے ان کے چھوٹے موٹے کام کرتی اور کہتی، جتنے دن اپنے بچوں کے کام آ جاؤں اچھا ہے۔ اپنی بگڑتی ہوئی حالت کو دیکھتے ہوئے اس میں وطن واپس جا کر ماں باپ بہن بھائیوں کو بھی آخری بار ملنے کی شدید خواہش بیدار ہو چکی تھی لیکن وہ پاکستان نہیں جا سکتی تھی کیونکہ اسکے گرین کارڈ کا مسئلہ ابھی التوا میں پڑا ہوا تھا۔ اگر وہ چلی جاتی تو واپس نہ آ سکتی تھی اور واپس وہ ضرور آنا چاہتی تھی۔ گھر بار امریکہ میں تھا اور دوسری طرف اسکے ماں باپ پاکستان میں بے چین تھے کیونکہ امریکن کونسلیٹ سے انہیں ویزا جاری نہیں ہو رہا تھا کہ اب امریکیوں کو تھرڈ ورلڈ کے مسلمانوں پہ اعتبار نہیں رہا۔ ان کی بھرپور کوشش یہی ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے ناپاک قدم امریکہ کی سرزمین سے دور ہی رہیں۔

امریکہ ایک آکٹوپس کی طرح اپنے خوبصورت، سہل پرکشش نظام اور معاشی آسودگیوں میں جب جکڑ لیتا ہے تو اس کی مضبوط ٹانگوں میں پھنس کر انسان بے بس ہو کر اپنے ہاتھ پاؤں چھوڑ دیتا ہے اور واپسی کی سب کشتیاں جلا دیتا ہے۔

سب دوست احباب سہانہ سے ہنسی خوشی فون پہ بات کرتے، اس کی خیریت دریافت کرتے اور ڈرتے اس دن سے جب سہانہ کی جگہ اس کا میاں فون اٹھائے اور کہے کہ اب سہانہ یہاں نہیں رہتی۔ موت ایک وحشی ڈائن کی طرح ہڈیوں کے بالن کے بھڑکتے الاؤ کے گرد قہقہے لگاتی ناچتی پھر رہی تھی اور زندگی ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ سہانہ شاید اپنی زندگی کا آخری تماشہ

امریکہ ایک آکٹوپس کی طرح اپنے خوبصورت، سہل پرکشش نظام اور معاشی آسودگیوں میں جکڑ لیتا ہے

دیکھنے آئی تھی کہ ایک پردہ اٹھنے والا اور ایک گرنے والا تھا۔ ''تم یہاں کیسے! تمہاری طبعیت کیسی ہے!'' فرح نے پیار سے اسکا بازو تھپتھپایا۔ طبعیت نے تو ٹھیک ہونا نہیں، میں نے سوچا کیوں نہ میں بھی کچھ انجوائے کر لوں! اپنے گنجے سر پہ سے پھسلتے دوپٹے کو ٹکانے کی کوشش کرتے

ہوئے سہانہ مسکرانے لگی۔

ہاں تو اور کیا میں نے بھی کہا اسے اگر تمہارا جی چاہ رہا ہے تو شو دیکھنے چلے جاتے ہیں ذرا طبعیت ہی بہل جائے گی۔ ہم تو اپنی سہانہ کو ہر حال میں خوش رکھنا چاہتے ہیں بھئی، سہانہ کی بھابی نے پیار سے اسکے چہرے پہ گرنے والا دوپٹہ ہٹایا اور ہم سب دھیرے دھیرے ہال کے اندر جانے لگے۔ کیا تم اتنی دیر آرام سے بیٹھ لوگی؟، فرح نے پھر اپنی دوست سہانہ سے پوچھا جب تک بیٹھ سکی، بیٹھوں گی، ورنہ پھر اُٹھ کر چل دیں گے۔ اور کیا چلے تو جانا ہی ہے۔ سہانہ کے چہرے پہ پھیکی سی مسکراہٹ کھیلنے لگی اور میرے کلیجے سے ٹھیس اُٹھی۔ ہماری سیٹس ایک دوسرے سے زیادہ فاصلے پہ نہیں تھیں اسلیئے ہم ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے مگر بات نہیں کر سکتے تھے کیونکہ شور اتنا زیادہ تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ روشنی اور آواز کے رنگ برنگ تماشے کو دیکھنے کیلیئے ہماری آنکھیں مشتاق اور دل بے تاب تھے۔

ہم انڈین فلموں کے مقبول ترین فنکاروں کو دیکھنے جا رہے تھے اور میں بھی خوش تھی کیونکہ عمر رسیدہ ہو جانے کے باوجود موقعہ کی مناسبت سے میں بھی بچوں کے ساتھ بچی ہو جاتی ہوں اور بڑوں کے ساتھ بڑی۔ شامل ہو جانے میں ہی عافیت ہے ورنہ وقت کی طرح بچے بھی مجھے پیچھے چھوڑ جائیں گے اور میں اکیلی رہ جاؤں گی۔ بالآخر شو شروع ہو گیا۔ پردہ اٹھا تو حاضرین نے تالیاں بجا کر آغاز پر خوشی کا اظہار کیا۔ سکرین پہ فنکاروں کی شو کیلیئے تیاری کی

ورنہ وقت کی طرح بچے بھی مجھے پیچھے چھوڑ جائیں گے اور میں اکیلی رہ جاؤں گی۔

ویڈیو دکھائی گئی جس سے لوگ وارم اپ ہو گئے اور خوب تالیاں بجیں۔ شو ایک تھیم یعنی انسانی جذبات کے رنگ، کے حوالے سے تشکیل کیا گیا تھا کیونکہ جتنے فنکار سٹیج پہ آتے گئے، ان کے آنے سے پہلے ان کے ساتھ ایک جذبہ کا نام سکرین پہ اُبھرتا اور پھر غائب ہوتا رہا۔

سب سے پہلے آنے والے فنکار ارجن رام پال تھے جن کیلیئے جذبہ رشکِ Envy تجویز ہوا تھا۔ انہیں دیکھا تو واقعی یقین آ گیا۔ کہ ان کیلیئے یہی نام موزوں تھا۔ سبز روشنیوں میں نہاتے ہوئے لانبے قد، کسرتی جسم والے اس نوجوان اداکار کا حسن کسی یونانی دیوتا سے کم نہ تھا۔ حاضرین کی پرزور ستائش اس بات کی کھل کر گواہی دے رہی تھی۔ ارجن نے اپنے چند مقبول فلمی گانوں پر ایک ڈانس گروپ کے ساتھ مہارت سے ڈانس کیا اور مداحوں کی تالیوں کی گونج میں سٹیج سے غائب ہو گیا۔

پردے پہ لکھے ہوئے اگلے جذبے کا نام Passion تھا۔ جیسے ہی یہ ایکٹ شروع ہوا

سارا منظر گلابی گلابی سا ہو گیا اور مدھر دھنیں فضاء میں تیرنے لگیں۔ حاضرین سمجھ گئے کہ پریتی زنتا آرہی ہے لہٰذا انہوں نے اس بھولی صورت کا دل کھول کر استقبال کیا۔ پریتی نے خوبصورت، مختصر جھلملاتے کپڑوں میں اپنے مشہور مقبول گانوں پہ ڈانس کیا اور لوگوں کو دیوانہ بنا دیا۔ اب کی بار جو پردہ گرا تو نئے لفظ کے ساتھ اٹھا۔ Lust لکھا دیکھتے ہی لوگوں کی حس ظرافت بکھرنے لگی اور سب ہنسنے لگے کیونکہ انہیں پتہ چل گیا تھا کی اس جذبے کی نمائندگی کیلئے خوبصورت نوجوان اداکارہ پرینکا چوپڑا اور سیف علی خاں منظر پہ نمودار ہوئے اور اپنی اپنی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کرنے لگے۔ پرینکا نے بہت اچھا گایا اور ڈانس کیا، سیف نے سٹائلش انداز میں گٹار بجائی اور حاضرین سے مخاطب بھی ہوئے۔ لڑکیاں بار بار We love you Saif کہتیں تو وہ بھی فلائنگ کِس پھینک کر جواب دیتے۔ I Love You Too اس سے ہال میں ایکسائٹمنٹ بڑھتی چلی جاتی۔ لوگ خوش ہو رہے تھے۔ تالیاں پیٹ رہے تھے، نعرے لگا رہے تھے۔ پورا ہال ایک بہت بڑے دل کی طرح دھڑک رہا تھا۔ رنگ و روشنی کا ایک حسین احساس تھا جس کی چمک سے آنکھیں چکا چوند ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ رانی مکھر جی سٹیج پہ آئیں تو ان کے مداحوں نے انہیں بھی خوب سراہا اور کئی لوگ ان کے ڈانس کے ساتھ کھڑے ہو کر ڈانس کرتے نظر آنے لگے۔

میں نے کنکھیوں سے سہانہ کی طرف دیکھا وہ عنقریب ایک جیتے جاگتے انسان سے ایک شبیہ میں تبدیل تو ہونے والی تھی۔ مگر ابھی تک کائنات کے نظام میں اہمیت ضرور رکھتی تھی کیونکہ وہ تھی۔ وہ ہونے اور نہ ہونے کے درمیان کے دروازے کو نیم وا کیے بیٹھی تھی اور مشتاق اکھیوں سے باہر گلی میں کھیلے جانے والے تماشہ سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ وہ باغ حیات کی خوشبودار مہکتی روشنیوں سے اپنے لئے نشاط کی چند کلیاں چن کر دامن میں بھر لینا چاہتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وقت کے دریا میں بہتا پانی کبھی کسی کو نہیں دیکھتا۔

سیف علی خان کے بعد پستہ قد والی سانولی سلونی اداکارہ رانی مکھر جی سٹیج پہ آئیں اور کمال فن اور چمکتے ملبوسات کا چمتکار دکھا کر حاضرین کو دیوانہ کر دیا۔ لوگ اس کے ڈانسوں پہ جھوم اٹھے اور خوب تالیاں بجا کر داد دی۔ ان سب فنکاروں کے بعد ہال میں ہر چند لمحے کیلئے مکمل سناٹا چھا گیا۔ سہانہ کی بھابی نے اپنی نند کی طرف دیکھ کر پیار سے پوچھا۔ ہم چلیں تم تھک گئی ہو گی!،، نہیں۔ جتنی دیر بیٹھ سکوں بیٹھوں گی۔ سہانہ دانتوں سے ہونٹ کاٹتے ہوئے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی اور سٹیج پر نگاہیں گاڑ دیں۔ ایک بچہ زندگی کے میلے میں آخری بار گھوم

ایک بچہ زندگی کے میلے میں آخری بار گھوم لینے کے خیال سے خوش تھا

لینے کے خیال سے خوش تھا اور اندھیرے ہال میں دھیمی دھیمی روشنی پھیل جانے کے بعد پردہ اٹھتا نظر آ رہا تھا۔ پردے پہ جیسے ہی لفظ محبت Love لکھا نظر آیا، حاضرین کی آوازیں چیخوں میں تبدیل ہو گئیں کیونکہ انہیں پتہ چل گیا تھا کہ اب ون اینڈ اونلی شاہ رخ خان آ رہے ہیں۔ وہ شاہ رخ خان جس کیلئے وہ کب سے منتظر تھے سہانہ کسمسا کر پہلو بدلنے لگی۔ شاہ رخ کو سٹیج پہ اپنے سامنے دیکھ کر مجھے قدرے حیرت ہوئی کیونکہ سکرین پہ اتنا شاندار رکھنے والا یہ مقناطیسی کشش کا حامل سٹار کافی درمیانی شکل صورت اور قدبُت کا مالک تھا۔ اس کی مقبولیت میں یقیناً اس کی جاندار اداکاری ہر دلعزیز شخصیت کا بھی ہاتھ ہے کیونکہ آج شاہ رخ جیسی محبت کم ہی فنکاروں کو نصیب ہوتی ہے وہ اپنے فلم میں مداحوں کو ایک ایسی دنیا میں لے جاتے ہیں جہاں سب کچھ خوبصورت اور ممکن ہوتا ہے۔ الجھنیں سلجھ جاتی ہیں اور حقیقتیں دھواں ہو جاتی ہیں۔ لوگوں نے تالیاں بجا بجا کر اپنے محبوب اداکار کا سواگت کیا تو اُسی لمحے چھت سے لٹکتے ہوئے دل کی شکل والے سرخ غباروں سے سماں رومانوی سا ہو گیا۔ لڑکے لڑکیوں نے ایکسائٹمنٹ کے مارے چیخیں مارنا شروع کر دیں تو شاہ رخ نے مائک پکڑ لیا اور اپنے مداحوں سے بے تکلف انداز میں باتیں کرنا شروع کر دیں اور باتوں باتوں میں جب کسی بات پہ بے ساختہ انداز میں ماشاللہ کہا تو بہت اچھا لگا۔ حاضرین سے باری باری پوچھتے چلے گئے ممبئی سے کوئی ہے یہاں پنجابی کتنے ہیں اور پھر آخر میں کہا کیا میرے پاکستانی فرینڈز آئے ہوئے ہیں تو سب پاکستانیوں نے زور و شور سے تالیاں پیٹیں جن میں میں بھی شامل تھی۔ اسوقت شاہ رخ مجھے بہت اپنا اپنا سا لگا کہ سنی دیول کے برعکس شاہ رخ پاکستانیوں سے بھی پیار کرتا ہے اور کرنا بھی چاہیئے کیونکہ پاکستانی بھی بڑے شوق و ذوق سے اسکی فلمیں دیکھتے ہیں شاہ رخ خان نے حاضرین میں سے ایک لمبے تڑنگے سردار جی کو سٹیج پہ بلایا تو انہوں نے وفورِ جذبات میں شاہ رخ کو گود میں ہی اٹھا لیا اور پیار سے اس کے ماتھے پہ آتے بالوں سے کھیلنا شروع کر دیا۔ سارا ہال ہنس ہنس کر داد دینے لگا۔ لگتا تھا اس لمحے ساری دنیا خوش تھی اور دکھ نام کے کسی جذبہ سے ناآشنا تھی۔ سہانہ بھی ہنس رہی تھی۔ اسے اس وقت کہاں یاد تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں تماشہ ختم ہو جائے گا، روشنیاں گل ہو جائیں گی اور سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے۔ پیش منظر، پس منظر میں تبدیل ہو جائے گا اور نظام کائنات چلتا رہے گا۔

کیا شاہ رخ کو دیکھنا سہانہ کی کوئی آخری خواہش تھی؟ میرے دل میں اک ہوک سی تھی۔ اپنے ایکٹ کے دوران شاہ رخ خان نے مختلف لوگوں کو سٹیج پہ بلایا اور اپنے ساتھ آئٹم میں شامل کر کے ان سے باتیں کیں، ان کے ساتھ ڈانس کیا۔ میرا شدت سے جی چاہا کہ کسی طرح شاہ رخ خان کو ایک پرچی بجھوا دوں جس پہ لکھا ہو کہ تمہاری ایک فین بستر مرگ سے اٹھ کر آج

تمہیں دیکھنے تمہارے فن کی پذیرائی کرنے کو یہاں تک چلی آئی ہے۔ اس سے ذرا مل لو، اس کے ساتھ بات کر لو۔ اسے کوئی جھوٹی تسلی ہی دے دو، شاید اسطرح اُس کی زندگی کے گِنے چُنے لمحوں میں ایک آدھ لمحے کا ہی اضافہ ہو جائے۔ وقت کی پونجی سے جیب خالی ہو رہی ہو تو ایک لمحہ بھی ایک صدی کے برابر ہو سکتا ہے۔ مگر میں اپنی اس پاگل خواہش کو دل ہی دل میں دبائے بیٹھی رہی کہ سٹیج پہ کھڑے زندگی سے بھرپور دلکش شخصیت والے شاہ رخ خان تک یہ پیغام پہنچانا ممکن نہ تھا۔ لوگوں کی چیخیں، دیوانگی، تالیاں، سیکیورٹی کیلئے لگائے گئے بڑے بڑے آہنی بیریئر اور ہال کا نظم ونسق سنبھالنے والے موٹے موٹے بڑے ڈیل ڈول والے بلیک سیکیورٹی گارڈز۔ ان سب کے ہوتے ہوئے ایک ننھی سی پرچی پہ لکھا ہوا کوئی پیغام اتنے بڑے فنکار تک کیسے پہنچایا جا سکتا تھا؟ کچھ ہی دیر میں منتظمین نے شاہ رخ خان کو ایک لمبے سے پہیے والے سٹینڈ پہ کھڑا کر کے حاضرین کے بالکل قریب سے گزرنے کا موقعہ دیا جس پہ لوگوں نے تالیاں پیٹ پیٹ کر خوشی کا اظہار کیا۔ سہانہ بھی کمزور ہاتھوں سے تالی بجا رہی تھی اور مسکرا مسکرا کر اپنے من پسند اداکار کو دیکھ رہی تھی۔ شاہ رخ لوگوں کے قریب آتا، ہاتھ ہلاتا، فلائنگ کِس پھینکتا، پیار برساتا آہستہ آہستہ واپس چلا گیا۔

> میرا شدت سے جی چاہا کہ کسی طرح شاہ رخ خان کو ایک پرچی بھجوا دوں

اسے پتہ بھی نہیں چلا کہ اسے دیکھ کر دو بجھے ہوئے دیئوں میں زندگی کی کتنی خوبصورت جوت جل چکی ہے۔ اُسے تو بس یہ پتہ تھا کہ اسے اپنے چاہنے والوں کو خوش کرنا ہے۔ انکا دل لبھانا ہے اسلیئے دوبارہ سٹیج پہ نمودار ہوا اور اب کی بار اپنے سب ساتھی فنکاروں کے ساتھ مل کر ڈانس کیلیئے اور ڈائیلاگ بولے۔ اس کے مزے دار چٹکلوں اور شوخ گفتگو سے ہال میں ایکسائٹمنٹ کی سطح انتہا کو چھونے لگی۔ میرا جی چاہا گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخوں اور کہوں شاہ رخ اس لڑکی کو مل لو۔۔۔ وہ جا رہی ہے۔ تمہیں وہ پھر کبھی نظر نہیں آئے گی۔۔۔ کل وہ پتہ نہیں ہو نہ ہو۔۔۔ مگر ہیجانی شور میں میری آواز کیسے سنائی دے سکتی تھی اسلیئے میں خاموش رہی اور بے بسی میرے دل میں پھٹکتی رہی۔ سٹیج پہ زندگی تھرک رہی تھی حاضرین کی رگوں میں بسنے والے خون کی حدت بڑھ رہی تھی اور موت ایک سائڈ پہ بیٹھی کسی کی ختم ہوتی سانسوں کی ریزگاری گن رہی تھی۔

''ارے کوئی ہے جو شاہ رخ کو جائے بتائے'' میرے دل نے ایک اور چیخ ماری اور پھر خاموشی سے شو دیکھنے میں مصروف ہو گئی۔

''کیسی طبعیت ہے سہانہ کی'' تین گھنٹوں بعد شو اختتام پذیر ہو گیا اور ہم سب ہال میں سے باہر نکلنے لگے۔ سہانہ کی بھابی نے اسے تھام رکھا تھا کہ کہیں رش میں اسے ٹھوکر نہ لگ جائے۔

''برا حال ہے۔ چلا بھی نہیں جا رہا لیکن کم از کم میں نے شو تو دیکھ لیا نا۔۔۔ کتنا مزا

آیا۔۔۔'' سہانہ کی مردہ آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

کتنی بار پوچھا چلتا ہے مگر توبہ کریں جی یہ شاہ رخ خان کو چھوڑ کر کہاں جانے والی تھی۔
سہانہ کی بھابی نے پیار سے اس کے بازو کو تھپتھپایا۔ میری نم آنکھیں بھابی کی نم آنکھوں سے ٹکرائیں اور پھر نیچے جھک گئیں۔ یوں جیسے ہم اپنے زندہ ہونے اور باقی رہ جانے پہ شرمندہ اور معذرت خواہ ہوں۔ آخر زندگی پہ صرف ہمارا ہی حق کیوں تھا؟

سہانہ شاہ رخ سے مل نہ سکی اور زندگی سہانہ کو تو کیا ہوا؟ کسی تعلق کو قائم رکھنے یا ثابت کرنے کیلئے، کسی کا کسی سے ملنا ضروری ہوتا ہے؟

☆☆☆☆☆
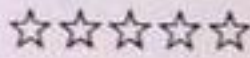
نیاز فتح پوری

سب سے زیادہ عجیب بات (جو غالباً اصول افسانہ نگاری کے بالکل خلاف ہے) میں اپنے اندر یہ پاتا ہوں کہ آج تک میں نے کوئی افسانہ پلاٹ متعین کر کے لکھا ہی نہیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات تو میں اس سے بھی بے خبر ہوتا ہوں کہ زیر تحریر لفظ کے آگے مجھے دوسرا لفظ کیا لکھنا ہے۔ لیکن چونکہ اکثر و بیشتر میرے افسانوں کا آغاز تجزیۂ سیرت Charactisation سے ہوتا ہے۔ اس لیے ابتداً ہی میں کچھ ہلکے سے نقوش دماغ میں ضرور ایسے پیدا ہو جاتے ہیں۔ جو پلاٹ کی تخلیق میں غیر ضروری طور پر معاون ہوتے رہتے ہیں۔

میں افسانہ کیوں کر لکھتا ہوں۔

مرتبہ: یوسف حسن خان

محمد امین الدین، کراچی

آب و دانہ

وہ کام پر جانے کیلئے گھر سے نکلا تو بہت بے چین تھا۔ طبعیت بھی بوجھل اور اداس تھی۔ رات بھی بستر پر کروٹ بدلتے ہوئے گزر گئی تھی۔ نیند پچھلے کئی دنوں سے روپے پیسے کی طرح غائب تھی تنگی ترشی کی دھوپ میں صبر و قناعت کا سائبان تانے رکھنے والی بیوی اب خاصی چڑ چڑی ہو چلی تھی۔ اور بچے بھی باتی بن تیل کی طرح بجھے بجھے سے رہنے لگے تھے۔

وہ کر بھی کیا سکتا تھا کوششوں کے باوجود کام کہیں لگ کر ہی نہیں دے رہا تھا۔ دو دن ملتا چار دن ٹھالا ٹھانٹ بیٹھا رہتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ مارکیٹ کے سب بڑے دکان دار اس کے کام سے ہمیشہ خوش ہوتے تھے۔ وہ نہ صرف وقت پر کام کر کے دیتا بلکہ اچھا بھی۔ اس کے ٹانکوں میں صفائی بہت تھی۔ ایک ایک ستارہ، دبکا اتنی نفاست سے لگاتا کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے۔ سارے لوگ ہنر مندی کی تعریف اس لئے بھی کرتے کہ اسے ڈرائنگ اتارنے پر بھی عبور حاصل تھا۔ پھول، پتیاں، شاخیں تو اس کے ہاتھ میں ایسے جھولتیں جیسے اصلی گلدستہ باریک جارجٹ، سلک یا شیفون پر سجا دیا ہو۔ عام کاری گر دبکا، سلمیٰ، کٹ دانے کے ماہر ہوتے ہیں۔ مگر وہ مشکل کام بھی بڑی آسانی سے کیا کرتا۔ سکویں میں تو کمال کر دکھاتا۔ یوں لگتا جیسے بہت ہی نازک سونے چاندی کے تاروں کی بیلیں کپڑے پر بکھیر دی ہوں۔ موتی یا ستاروں کی ڈالیاں قطار در قطار یوں چلتیں جیسے پاسنگ آؤٹ پریڈ میں پہلے سے آخری فوجی تک ایک ردھم ایک فاصلہ اور ایک ہی سیدھ۔ نہ ذرا ادھر نہ اُدھر۔

یہ تو سب تھا کچھ دنوں سے وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس کے ساتھ آخر ہو کیا رہا ہے۔ جب وہ کوئی ساڑھی، قمیض یا دوپٹہ تیار کر کے دکان دار کے پاس جاتا تو وہ کام میں کوئی نقص ڈھونڈنے کی کوشش کرتا اور ناکامی کی صورت میں ٹرخانے کیلئے ایک دو دن بعد آنے کا کہہ کر

ٹال دیتا۔ وہ مایوس ہو کر آس پاس کی دکانوں پر چلا جاتا۔ اور یہی خواہش کرتا کہ ایک دوپٹہ ہی مل جائے کم از کم دال روٹی کا بندوبست تو ہو۔ لیکن اب تو اکثر لوکل ٹرین کی طرح دوپہر تک گھر خالی لوٹ جانا پڑتا تھا۔

اگلے دن پھر روز کی طرح اُٹھتا۔ روزانہ سب سے پہلے اس کی نگاہ جس چیز پر پڑتی وہ دیوار سے لگا ہوا اڈا تھا۔ جب جب اس پر چم چم کرتا کوئی کپڑا منڈھا ہوا ہوتا اس کی صبح روشن ہو جاتی۔ چائے کا بڑا پیالہ اپنے معدے میں اُنڈیلتا۔ چھت پر جا کر مٹی کے آب خوروں میں پانی اور دانہ بھرتا اور نیچے آ کر دو اسٹولوں کے درمیان اڈا جماتا اور کام سے لگ جاتا۔ یوں بغیر پڑھے ہی اس کی بسم اللہ ہو جاتی۔

مگر اب تو ہر دوسرے تیسرے دن کی صبح جب اس کی آنکھ کھلتی تو اڈا بانجھ عورت کی کوکھ کی طرح خالی دکھائی دیتا۔ لکڑی کے فریم کے سوراخوں سے کوئی شیفون یا جارجٹ کا دوپٹہ تنا ہوا نہ ملتا۔ یہ دیکھ کر اُس کی آنکھیں بھر آتیں۔ اور جب مارکیٹ سے بھی وہ خالی ہاتھ لوٹتا تو رہی سہی کسر بھی پوری ہو جاتی۔

کئی دنوں سے چھت پر رکھے آب خوروں میں نہ وہ پانی بھرنے گیا اور نہ ہی دانہ ڈالنے۔ کبوتر اس نے پالے ہوئے نہیں تھے۔ وہ تو مکان کے پچھواڑے میں پانی کی ٹنکی کے نیچے چند جنگلی کبوتروں نے گھونسلہ بنایا ہوا تھا۔ بس وہ اللہ کی اس مخلوق کا خیال رکھتا تھا۔ چند دنوں سے تنگی سے وہ یہ بھی نہیں کر پایا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ پرندے کہیں نہ کہیں سے دانہ دنکا چگ کر آ ہی جاتے ہوں گے۔ مسئلہ تو اس کے اپنے بچوں کا تھا کہ جو کبوتر نہ تھے کہ ایک ڈال نہ سہی دوسری ڈال پر چگ آئیں۔

ان ہی الجھے خیالوں میں وہ مارکیٹ گیا اور دوپہر تک مایوسی اوڑھے واپس لوٹا۔ آج تو حالت رونے جیسی ہو گئی۔ آنکھوں میں آنسو ایسے لبالب جیسے اب گرے کہ گرے۔ ٹھیلوں بھری فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے نم ناک آنکھوں کے سامنے سارا منظر دھندلایا ہوا تھا۔ بازار نہ رستہ نہ فٹ پاتھ پر کھڑے ٹھیلے اور ریڑھیاں۔ اسے صحیح طرح کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بس روز کا ناپا ہوا رستہ پاٹ رہا تھا کہ اچانک اسے ٹھوکر لگی اسفنج کی چپل سے باہر نکلا ہوا انگوٹھا دکانوں کے آگے بنے ہوئے اُونچے نیچے چبوتروں سے ٹکرا گیا۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

یا اللہ! مجھ پر رحم کر

یہ کہتے ہوئے وہ زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ اور انگوٹھے کو مٹھی میں دبا کر سہلانے لگا۔ اسی

لکڑی کے فریم کے سوراخوں سے کوئی شیفون یا جارجٹ کا دوپٹہ تنا ہوا نہ ملتا۔

اثناء میں آس پاس لوگوں کی بھن بھن سنائی دی پر سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ہاں اس نے یہ محسوس کیا کہ ایک بھاری ہاتھ اس کے سیدھے کندھے پر آ کر رک گیا ہے۔ ہاتھ کے دباؤ سے اس کا کندھا ایک طرف جھکنے لگا۔ پھر چوڑا چکلا ہاتھ اس کے کندھے پر ہر سمت پھیلتا چلا گیا۔ اُسے یوں لگا جیسے بھاری بھرکم ہاتھ کی انگلیاں اور انگوٹھا اس کے شانے کے گوشت اور ہڈیوں کو مضبوطی سے دبوچے ہوئے ہوں اور طاقت سے اُوپر کی طرف کھینچ رہے ہوں۔ اس نے خود کو بالکل بے بس محسوس کیا اور ایک عالم بے اختیاری میں اُٹھتا چلا گیا۔

گدلائی ہوئی آنکھوں میں نہ منظر صاف تھا اور نہ وہ بے بس کر دینے والے کو صحیح طرح دیکھ سکا۔ بس اُسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی اسے دیوار کے طرف کھینچے لے جا رہا ہو۔ اس نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ہاتھ کے دباؤ نے اسے جب بیٹھنے پر مجبور کیا تو وہ بیٹھتا چلا گیا۔

جس طرح دو کانوں کے آگے بنی ہوئی ہوتی ہیں یہ ویسی ہی کوئی سیڑھی تھی۔ انگوٹھے کو ٹھوکر زور سے لگی تھی جس کی وجہ سے جھنجھلاہٹ اب بھی ہو رہی تھی۔ دھندلاہٹ آہستہ آہستہ چھٹنے لگی۔ وہ بھاری ہاتھ والے شخص کو اب دیکھ سکتا تھا۔

یہ کوئی لحیم شحیم عمر رسیدہ شخص تھا جس کے چہرے پر چھوٹی سی سفید داڑھی بھلی لگ رہی تھی۔ اس نے عمر رسیدہ شخص کو دیکھا مگر آنکھیں نہ ملا سکا۔ ان آنکھوں میں کچھ عجیب بات تھی۔ دور تک گہرائی میں اُترتی ہوئی ڈوبتی ہوئی ڈوبتی ڈوبتی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔ اجنبی نے اسے مسکرا کر دیکھا ادھر برابر ہی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ پھر کُرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا۔ یہ منرل واٹر کی چھوٹی مگر خالی بوتل تھی جسے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

وہ ایک معمول کی طرح اُٹھا۔ بوتل لی اور ہوٹل کی طرف چل دیا

جا! برابر والے ہوٹل سے اسے بھر لا

وہ ایک معمول کی طرح اُٹھا۔ بوتل لی اور ہوٹل کی طرف چل دیا۔ اندر کچن کے ساتھ لگے نل سے بوتل کو بھرا اور لوٹ آیا۔ اور پھر ایک معمول ہی کی طرح بوتل اجنبی کے سپرد کر کے وہیں بیٹھ گیا۔ انگوٹھے میں اب درد کم تھا۔ لحیم شحیم اجنبی آنکھیں بند کیے دل ہی دل میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ کچھ دیر اسی کیفیت میں رہنے کے بعد بوتل کا ڈھکن کھولا، پانی میں چند پھونکیں ماریں۔ ڈھکن دوبارہ بند کیا اور بوتل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

روزانہ تھوڑا پانی گھر کے چاروں کونوں پر ڈال۔ خود بھی پی اور بیوی بچوں کو بھی پلا۔

یہ کہتے ہوئے اپنے بھاری بھرکم ہاتھ کا دباؤ اس کے کندھے پر ڈالا اور فٹ پاتھ پر چلتے

ہوئے ہجوم میں گم ہو گیا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا تھا یہ شخص کون تھا۔ کوئی بزرگ۔۔۔۔کوئی عالم۔۔۔۔یا کوئی اور

اور پھر یہ پانی۔۔۔۔جس پر نہ جانے کیا پڑھا گیا تھا۔ پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ کچھ پڑھا گیا تھا کہ نہیں۔ وہ خود تو بے دین بے علم آدمی تھا۔ نہ نماز نہ روزے کا مگر اس لمحے بوتل ہاتھ میں لئے اس کے جسم میں عجیب سا لرزہ طاری تھا وہ چاہتے ہوئے بھی بوتل کو ہاتھ سے نہ چھوڑ سکا اور بدن پر طاری نامعلوم کپکپی اور بوتل کو ساتھ لئے گھر چلا آیا آتے ہی سارا ماجرا بیوی کو سُنایا۔ کبھی کبھار کی نمازی بیوی بولی۔

کوئی بزرگ ہوں گے ورنہ ایسے کون دیتا ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مجھے ہی کیوں دیا۔ میں نے تو ان سے مانگا بھی نہیں تھا۔

کیا پتا! اللہ کے بھید اللہ ہی جانے۔ تمہارا کیا جا رہا ہے۔ تھوڑا تھوڑا چاروں کونوں میں ڈال دو۔ ہو سکتا ہے اس میں ہمارے لیے کوئی بھلائی ہو۔

چل میں تیری بات مان لیتا ہوں۔ بتا کیسے ڈالوں سامنے ایک کونے میں پاخانہ بنا ہوا ہے۔ اگر پانی پڑھا ہوا ہے تو وہاں ڈالنا بے ادبی ہوگی۔ دوسرا کونا چلو مانا ٹھیک ہے لیکن پیچھے بھی یہی حالت ہے۔ وہاں برابر والے خان صاحب کا دن رات سڑتا ہوا پاخانہ ہے۔

ہاں! یہ تو ٹھیک کہہ رہے ہو۔ پھر ایسا کرو کہ چھت پر ڈال آؤ۔ وہاں تو ایسا کچھ نہیں ہے۔

وہ کچھ نہ بولا اور چھت پر چلا گیا۔ اس کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ پانی ڈالے مگر بیوی کی وجہ سے خاموش رہا۔ چھت پر پہنچ کر اس کی کشمکش بڑھ گئی۔ بوتل دیکھ کر اس پر بے زاری طاری ہو رہی تھی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بوتل کھول کر سارا پانی کبوتروں کیلئے آب خوروں میں انڈیل دیا اور مطمئن ہو کر نیچے چلا آیا۔

تھوڑی دیر میں بچے سکول سے آ گئے آتے ہی تینوں بچوں نے اسکول سے ملنے والا نوٹس تھما دیا۔ اس نے اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ انگریزی میں تھا کچھ سمجھ میں نا آیا تو بولا کیا لکھا ہے۔

میڈم نے کہا ہے کہ فیس جمع کروانے کی آخری تاریخ دس ہوتی ہے اور آج تیرہ ہو گئی ہے۔ اگر کل فیس جمع نہیں کروائی تو کلاس میں نہیں بیٹھنے دیا جائے گا۔

اس نے مایوسی سے بچوں اور پھر بیوی کی طرف دیکھا۔ کہنے کیلئے نہ تو اس کے پاس کچھ تھا اور نہ بیوی کے۔ پھر بھی اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

س کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ پانی ڈالے مگر بیوی کی وجہ سے خاموش رہا۔

بے اختیار گردن موڑ کر اپنے کاندھے کو دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر میں پانی حلق میں اُنڈیلتے ہوئے بوتل سامنے آگئی۔ وہ بے چین ہو گیا۔

وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس کا دھیان خود بخود اس طرف کیوں چلا جاتا ہے۔ اس کی نظریں گھر کے چاروں طرف دیواروں پر دوڑنے لگیں۔ کبھی دائیں کبھی بائیں۔ پھر اسے ایسا لگا جیسے کسی نے از خود ٹھوڑی اٹھا کر اوپر کر دی ہو۔ وہ چھت کو تکنے لگا مگر وہاں تو خالی دیواروں سے بھی زیادہ سونا پن چپکا ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر یوں ہی چھت کو تکتا رہا۔ اور پھر گردن نیچے کر لی۔ وہ خالی ذہن لئے صحن میں چلا آیا۔ دیوار سے لگی چارپائی بچھا کر لیٹ گیا اور نہ جانے کب تک یوں ہی لیٹا رہا۔ کچھ جاگتا کچھ سوتا ہوا۔

خالی ذہن اور خالی پپوٹوں پر پتھرائی ہوئی آنکھوں سے آسمان کو تکتے ہوئے وہ وقت سے دامن چھڑا کر نہ جانے کتنی دور کی مسافتوں پر جا نکلا۔ بچپن، کھیل کود، اسکول، پڑھائی سے بھاگنا، ماسٹر اور ابا کے ہاتھوں پٹائی، زردوزی کا کارخانہ، انگلیوں میں دبی باریک سوئی، چھوٹے چھوٹے موتی، چمکتے ستارے، کلابتو، ریشم، دبکے کی لچھیاں، سامنے بیٹھے ہوئے افیم چی استاد کی ادھ کھلی خمار آلودہ مگر سوئی کی نوک کی طرح چبھتی ہوئی نظریں، کاری گروں کا ہنسی مذاق، آخری بدھ کی مٹھائیاں، اماں کا جنازہ، ابا کی ٹی بی، شادی، من موجیاں، بیٹے کی پیدائش، دوسری مردہ بچی، تیسری بیٹی اور پھر ایک اور بیٹی۔

اسے یہ سب ایک کے بعد ایک کر کے یاد آتا جا رہا تھا۔ اور وہ دوڑتی بھاگتی یادوں کی لپک جھپک میں ادھر سے اُدھر ڈول رہا تھا۔ جب آسمان سے چپکے ہوئے سارے منظر صحن میں آگرے تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے صحن بھر پھیلا ہوا آسمان سیاہ چادر اُوڑھے ہوئے تھا۔ جس پر سلور کیش کے تارے جڑے ہوئے تھے۔ بے ترتیب، بے نشان، مگر بہت سارے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسے دن میں سونے کی عادت نہیں تھی مگر آج سو گیا اور کئی گھنٹے سوتا رہا۔

بیوی نے تھوڑے سے چاول سے اُبال رکھے تھے۔ مگر اس کا دل نہیں چاہا۔ بیوی نے اکیلے ہی زہر مار کیا اور کمرے میں چلی گئی۔ وہ صحن میں اکیلا رہ گیا۔ نیند کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ تھوڑی دیر ادھر سے اُدھر یوں ہی نظریں گھماتا رہا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو سیڑھیاں ناپتا ہوا چھت پر چلا آیا۔

اُسے یاد آیا کہ دوپہر کو اس نے بوتل کا پڑھا ہوا پانی کبوتروں کے آب خوروں میں بھر دیا تھا۔ اس کے قدم خود بخود اسی طرح اُٹھ گئے۔ مگر وہ جیسے ہی ان کے پاس پہنچا وہ چونک اُٹھا۔

چاند کی روشنی میں صاف دکھائی دے رہا تھا کہ دونوں آب خوروں کے قریب دو کبوتر بے سدھ پڑے ہوئے تھے اور چودہ اگست کے جھنڈے میں استعمال ہونے والی مضبوط لکڑی ان دونوں کے بالکل اُوپر پڑی ہوئی ہے۔

وہ خوفزدہ ہوگیا اور گھبرا کر نیچے اُتر آیا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ کبوتر اب یقیناً مردہ ہو چکے ہیں۔ اور شاید لکڑی کبوتروں کو شدید ضرب لگانے کیلئے استعمال کی گئی ہے۔ مگر کیسے؟ کس نے ایسا کیا؟ اس کی بیوی بچے؟ مگر اس نے خود ہی جواب دیا وہ ایسا کر ہی نہیں سکتے۔ وہ کچھ گھنٹے سویا ضرور تھا مگر اس بیچ گھر میں کوئی آیا نا گیا۔ پھر یہ سب کیسے ہوا؟ یہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ اس احساس سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔۔۔۔ کچھ ہے۔۔۔۔ کچھ ایسی بات جو مجھے سمجھ میں نہیں آ رہی۔ وہ سوچتا ہوا خوف کی حالت میں کمرے میں آ کر بچوں کے ساتھ دبک گیا اور سونے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

مگر نہ تو اب نیند تھی اور نہ ہی بچپن سے جوانی تک کا کوئی دوڑتا بھاگتا منظر۔ بس کروٹیں بدلتے ہوئے اس نے جیسے تیسے رات گزاری۔ صبح دروازے پر دستک سے وہ چونکا، اُٹھا اور جا کر دروازہ کھولا۔ سامنے مارکیٹ کے ایک بڑے دکان دار کا بیٹا ہاتھ میں بڑا سا تھیلا اُٹھائے کھڑا ہوا تھا۔ اتنی صبح آنے کی وجہ پوچھی تو وہ بولا۔

ملیر کینٹ والے مرزا صاحب کی بیٹی کی شادی ہے۔ بابو نے دلہن کے دس قمیص دوپٹے، پانچ ساڑھیاں ڈیزائین اور مال کے ساتھ یہ دو ہزار بھجوائے ہیں۔ باقی حساب بعد میں کر لیں گے۔ ابھی سے شروع کر دو۔ ان کے اور کپڑے آنے والے ہیں۔ ارجنٹ کام کرنا ہے۔

خالد فتح محمد، گوجرانوالہ، پاکستان

وہ دونوں

وہ دونوں بجھتے ہوئے کوئلوں کو دیکھ رہی تھیں۔ کچا کمرہ ہی ان کی پناہ گاہ تھی۔ وہ کہیں سے لکڑی یا کوئلے لے آتیں اور ان کے بجھ جانے کے بعد بھی انگیٹھی کے گرد بیٹھی رہتیں۔ کمرے میں پڑی واحد ڈھیلی چارپائی پر سونے سے کتراتیں کیونکہ گھسی ہوئی دری اور پھٹا ہوا لحاف انہیں گرم نہیں رکھ سکتا تھا۔ گرمیوں میں وہ باہر سوتیں۔ گلی ان کے گھر کا صحن تھی اور ہر آنے جانے والا ان کی چارپائی کے پاس سے گزرتا۔

بخش نے پھانسی لگنے سے پہلے آخری ملاقات میں انہیں سمجھایا تھا کہ مل جل کر زندگی گزارنا ان کے لیے طاقت کا باعث ہوگا۔ اس نے وصیت کی تھی کہ وہ تینوں دوستوں اور بہنوں کی طرح رہیں۔ سکینہ نے بشیرہ اور اصغری کی طرف سے اس کی خواہش کا بھرم رکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ اصغری ہمیشہ کی طرح نظریں جھکائے بیٹھی رہی جبکہ سکینہ بشیرہ کی نظر میں پوشیدہ جارحیت کو نہ پڑھ سکی۔ بخش کی پھانسی کے تیسرے دن بشیرہ نے دونوں بیٹوں کے ساتھ ان پر حملہ کر دیا۔ وہ دونوں گھر سے بھاگ کر اس کمرے میں آ کر رہنے لگیں۔

وہ ہمیشہ کی طرح اپنے خیالات میں گم تھیں۔ دم توڑتی آگ سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ تین برس سے وہ ایک دوسرے کا سہارا تھیں۔ سکینہ آج بھی کوئلوں میں آگ ڈھونڈتے ہوئے حیرت سے سوچ رہی تھی کہ وہ اس روز اتنے واضح تاثر کو نہ پہچان سکی تھی۔

ٹھنڈ وہم کی طرح کمرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی حتیٰ کہ بلوں میں بھی رینگ جاتی اور چوہے باہر نکل کر ہر سو بھاگنا شروع کر دیتے۔ انہیں ہمیشہ لگتا کہ آدھی رات کے بعد وقت تھم جاتا ہے۔ وہ جب لحاف میں گھستیں تو ایک آدھ چوہا وہاں موجود ہوتا۔ سوتے میں بھی چوہے انہیں اپنی موجودگی سے جگا دیتے۔ اصغری کو چوہوں سے ہمیشہ کراہت ہوتی اور وہ چوہے مار گولیاں چارپائی کے اردگرد پھینک دیتی۔ حسبِ معمول سکینہ کی سوچ شناسا راہوں پر چل نکلی۔ اس نے بخش کو پہلی مرتبہ آٹھ برس پہلے

انہیں ہمیشہ لگتا کہ آدھی رات کے بعد وقت تھم جاتا ہے

دیکھا تھا۔ وہ گلی میں آئی تو بخش ان کے دروازے کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ نظریں ملیں مگر وہ اسے دیکھ کر رکا نہیں۔ بخش کی نظر میں ایسا کانٹا تھا جو سکینہ کے شعور میں پیوست ہو گیا۔ لمبا قد' چمکتی سیاہ آنکھیں' مونچھوں اور کنپٹیوں میں نمایاں سفیدی۔ بخش کی نظر میں برتری اور بے اعتنائی تھی۔ سکینہ ایسی برتری اور بے اعتنائی سے آشنا نہ تھی۔

بخش کا سراپا اس کی نظر میں کھب گیا تھا اور وہ اسے دیکھنے کے لیے گلی میں کئی بار آتی۔ پھر ایک دن اچانک بخش نے اس کے والدین کو پیغام بھجوا دیا۔ اس دن اسے بخش کے متعلق تفصیل معلوم ہوئی۔ وہ خائف بھی ہوئی اور فخر سے اس کی گردن بھی تن گئی۔ بخش کرائے کا قاتل تھا اور پوری تحصیل میں اس کی دہشت تھی۔ وہ جسے چاہتا قتل کر دیتا۔ اس کے خلاف کسی تھانے میں کوئی رپٹ درج نہ تھی۔ حکام سے اس کی شکایت وہی کرتا جسے زندگی عزیز نہ ہوتی۔

سکینہ کو معلوم تھا کہ ان کی شادی نہیں ہو سکتی۔ بخش کا تعلق کم تر ذات سے تھا جبکہ سکینہ کے والدین کا شمار زمین کے چھوٹے مالکان میں ہوتا تھا اور وہ گاؤں کے باعزت لوگ تھے۔ وہ اس سماجی کھائی کو عبور نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے رشتہ دینے سے معذرت کر لی۔ سکینہ کے باپ کو قتل ہونا منظور تھا لیکن وہ غیر برادری میں بیٹی کو نہیں بیاہ سکتا تھا۔ اس دن کے بعد سے بخش ان کے گھر کے سامنے سے دن میں کئی مرتبہ گزرتا۔ سکینہ اور اس کے درمیان مسکراہٹوں اور چست فقروں کا تبادلہ ہونے لگا۔

اس نے اپنے گرد کوئی بند باندھنے کی کوشش نہ کی

سکینہ کو خود پر قابو نہیں رہا تھا۔ اس نے اپنے گرد کوئی بند باندھنے کی کوشش نہ کی۔ وہ بخش سے ملنے لگی۔ اس کے والدین کو خبر ہوئی تو انہوں نے اس کی شادی طے کر دی۔ اس دن وہ زندگی میں پہلی مرتبہ موٹر سائیکل پر بیٹھی تھی۔ بخش اسے اپنے گاؤں لے گیا۔ اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ موٹر سائیکل کے علاوہ دو گھوڑے اور ایک کار بھی بخش کے استعمال میں ہے۔

بشیرہ' بخش کی پہلی بیوی تھی۔ سکینہ کے گھر پہنچتے ہی اس نے کہرام مچا دیا۔ بشیرہ اور اس کے دونوں بیٹے رات گئے تک بخش کے ساتھ جھگڑا کرتے رہے۔ اصغری اور سکینہ اب جس کمرے میں رہتی تھیں وہ بخش کا آبائی گھر تھا۔ بشیرہ والا گھر چودھری حکم دین نے بنا کر دیا تھا۔ بخش کو چودھری حکم دین نے قاتل بنا دیا تھا۔ دیسی کبڈی میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اسے ''چھا'' ڈالنے میں حرف آخر سمجھا جاتا تھا۔ چودھری کو بخش کی طاقت اور پھرتی کا اندازہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کبڈی میں طاقت اور جسمانی پھرتی کے ساتھ حاضر دماغی بہت ضروری ہے۔ وہ سوچتا کہ جو شخص اپنے جیسے طاقت ور اور پھرتیلے مخالف کو کلائی

سے پکڑنے کے بعد اس کی ٹانگوں کو اپنی ٹانگوں کی زنجیر بنا کر جکڑ لیتا ہے وہ اگر ہتھیار سے لیس ہو تو مخالف پر کیا گزرے گی! بخش بہت غریب گھر میں پیدا ہوا تھا اس کے ماں باپ نے کسی بھی دن دو وقت کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ بخش اپنے ہم عمر لڑکوں میں سب سے زیادہ لمبا اور طاقت ور تھا۔ اس نے جب کبڈی شروع کی تو خوراک اور تیل وغیرہ کے اخراجات دوست اٹھانے لگے۔ پھر وہ پیشہ ور کھلاڑی بن گیا۔ اسے میلوں اور دوسرے نمائشی مقابلوں میں حصہ لینے کی قیمت ملنے لگی۔ ایسے ہی ایک مقابلے کے بعد چودھری حکم دین اسے اپنے ڈیرے پر لے آیا۔ پیشہ ور کھلاڑی بننے کے بعد بخش کی سوچ میں خوش آئند مستقبل کا ایک خاکہ بننے لگا تھا۔ حکم دین کی سرپرستی میں اسے یہ مکمل ہوتا نظر آیا۔

اس کا پہلا کام چودھری کے گاؤں میں ایک مخالف کی ٹانگیں توڑنا تھا۔ یہ واردات کرنے پر بخش کو پریشانی ہوئی نہ ندامت۔ اسے ایک بے بسی کا احساس ضرور تھا۔ یہ بے بسی اسے اپنی کمزوری لگی جس پر غلبہ پانے کے لیے وہ ہر قسم کی واردات کرنے کو تیار ہو جاتا۔ مگر چوری کرنا یا ڈاکہ ڈالنا اسے غیر اخلاقی فعل لگا۔ کسی خاندان کو زندگی کے ذرائع سے محروم کر دینا اس کے اصول کے خلاف تھا مگر اسی خاندان کے کسی فرد کو جان سے مار دینا اس کی ضرورت تھی۔

اس کا پہلا کام چودھری کے گاؤں میں ایک مخالف کی ٹانگیں توڑنا تھا

چودھری حکم دین نے بخش کو اس کے گاؤں میں گھر بنا دیا۔ بخش نے دھوم دھام سے اپنی برادری میں شادی کی۔ اس کے ہاں دو بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ اس کے والدین نئے گھر میں خوش تھے۔ انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ ان کی آخرت اتنی آرام دہ ہو سکتی ہے۔ اسی بے یقینی کی کیفیت میں وہ باری باری فوت ہو گئے۔ بخش نے اردگرد کے دیہات میں چودھری حکم دین کے مخالف چن چن کر ختم کر دیے۔ چودھری اپنے علاقے کا سردار بن گیا۔ پولیس بھی ہر تفتیش کا فیصلہ اس کی مشاورت سے کرتی۔

اب بخش ایک عوامی نام بن گیا تھا۔ اس کے ساتھ کئی رومانوی اور پرتشدد کہانیاں منسوب تھیں۔ چودھری نے چوروں کے ٹولے بھی پال رکھے تھے جن کی وہ پشت پناہی کرتا اور وہ اسے ماہانہ ادا کرتے اور اسی رقم سے بخش کا گھر چلتا۔

سکینہ جب آئی تو رات گئے تک بشیرہ اور اس کے دونوں بیٹے بخش سے جھگڑتے رہے مگر بخش نے تو جیسے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس رکھی تھی اور جیسے اس کے منہ میں زبان نہیں تھی۔ آدھی رات کے بعد وہ سکینہ کو ساتھ لے کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

سکینہ اس کمرے کی مالکہ بن گئی۔ بخش جب گاؤں میں ہوتا تو وہیں سوتا۔ بشیرہ نے سکینہ کو برابری کا درجہ کبھی نہ دیا۔ وہ بخش کی منکوحہ بیوی تھی اور سکینہ محض ایک رکھیل۔ اسے یقین تھا کہ بخش ایک نہ ایک دن سکینہ کو گھر سے ضرور نکال دے گا۔

سکینہ کے لیے بخش ایک تصوراتی ہستی تھا...... مضبوط' دلیر' دریا دل اور محبت کرنے والا! اس کے والدین کا گاؤں زیادہ دور نہیں تھا۔ اسے اپنا تین کمروں والا گھر کبھی یاد نہیں آیا تھا۔ اس کے ذہن سے بہنیں اور والدین محو ہو چکے تھے۔ وہ بخش میں گم تھی اور پانچ برس پلک جھپکنے میں گزر گئے!

ایک دن بخش گھر آیا تو اس کے ساتھ اصغری تھی۔ بشیرہ اور اس کے بیٹوں نے پھر بغاوت کر دی۔ وہ اصغری کو گھر میں رکھنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ بیٹوں کو اب باپ کے ہر اقدام پر اعتراض تھا۔ بشیرہ نے اس بغاوت میں سکینہ کو ساتھ ملانا چاہا مگر اس نے اصغری کا ساتھ دیا۔ اسے وہ دن یاد تھا جب بشیرہ اور اس کے بیٹوں کو اسے گھر میں رکھنے پر اعتراض تھا۔ اگر بخش ہتھیار ڈال دیتا تو وہ کدھر جاتی!

سکینہ کو اصغری کا مستقبل اپنی طرح تاریک لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ اصغری کو سہارے اور رہنمائی کی ضرورت ہے۔ خود اسے بخش کے ساتھ تعلق میں کہیں بھی لالچ اور خود غرضی نظر نہ آئی تھی وہ اسے اتنا چاہتی تھی کہ اپنا مقام اس چاہت کے سپرد کر گئی۔ وہ کبھی سوچتی کہ اصغری میں شاید اسے اپنی بہنیں نظر آتی ہیں۔ چنانچہ وہ اصغری کو اپنا کمرہ دے کر خود اناج والی کوٹھری میں منتقل ہو گئی جہاں اسے بو اور چوہوں کا عادی ہونا پڑا۔

سکینہ جانتی تھی کہ اب بخش کے ساتھ نکاح کا وقت گزر چکا ہے۔ اسے بخش پسند تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ دنیا میں بے وقار تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اصغری کے ساتھ ایسا نہیں ہونے دے گی۔ وہ اسے بشیرہ والا مقام دلانا چاہتی تھی۔ سکینہ اور بخش جب بھی اکٹھے ہوتے وہ ہمیشہ اسے اصغری سے نکاح پڑھوانے کو کہتی۔ شروع شروع میں بخش بیخ پا ہوتا رہا مگر پھر آہستہ آہستہ اس نے سکینہ کے جذبے کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

ایک سال بعد بخش نے اصغری سے نکاح کر لیا۔ اس وقت بخش کی شہرت دھندلی پڑنا شروع ہو چکی تھی۔ لوگوں کو اس کی شخصیت زنگ آلود لگتی اور وہ سحر جو جوانی کے ساتھ وابستہ تھا اثر کھو بیٹھا۔ بخش محسوس کرنے لگا تھا کہ چودھری اب دوسرے لوگوں کو ترجیح دیتا ہے۔ چودھری بھی بوڑھا ہو چکا تھا مگر بخش جانتا تھا کہ اسے تو صرف منصوبہ ہی بنانا ہوتا ہے۔ وہ اپنے منصوبوں پر بخش کے بجائے اب دوسروں سے عمل درآمد کرانے لگ گیا تھا۔ یہ بخش کی انا پر شدید حملہ تھا۔ دونوں کے درمیان اختلافات

سکینہ جانتی تھی کہ اب بخش کے ساتھ نکاح کا وقت گزر چکا ہے

جنم لینے لگے۔

چودھری حکم دین کی ہر کامیابی بخش کی مرہون منت تھی مگر چودھری اسے اپنے پروردہ کے سوا کچھ نہ سمجھتا تھا۔ وہ چودھری کے لیے دردِ سر بنتا جا رہا تھا۔ وہ آنکھوں میں کانٹا سا کھٹکنے لگا تو چودھری نے اسے گرفتار کرا دیا۔ بخش پر کئی مقدمے چلے اور اسے ایک مقدمے میں موت کی سزا ہو گئی۔ وہ بے بس ہو گیا اور سکینہ کو اس کی بے بسی میں برتری نظر آئی۔

سکینہ اور اصغری کو کوئلے بجھنے کے بعد سردی لگنا شروع ہو جاتی۔ آج سکینہ پر کپکپی طاری تھی۔ اسے اصغری سے ہمدردی تھی اور ناراضی بھی۔ وہ جانتی تھی کہ ان دونوں کی زندگی ایک ہی سوئی کے نکے میں پروئی گئی ہے۔ وہ دونوں اندھے کنوئیں میں پڑی لاشوں کے مانند تھیں مگر سکینہ کو دکھ تھا کہ اصغری نے اسے اندھیرے میں رکھا۔ جب کوئلے دہک رہے تھے تو اصغری نے بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ اب کوئلے بجھنا شروع ہو گئے تھے۔ اصغری نے بتایا کہ اندھیرا ہونے کے بعد جب وہ باہر جاتی تو نذیر درزی کا بیٹا فرید نئے سلے کپڑے پہنے اس کا منتظر ہوتا۔ وہ اسے دھتکارتی رہتی کہ اسے بخش کی حیثیت اور مقام کا پتا تھا۔ وہ اگر زندہ ہوتا تو فرید کا نام ونشان باقی نہ رہتا۔ اس کے اپنے اندر بھی ایسی کوئی خواہش سر نہ اٹھاتی۔ اس کے لیے فرید، بخش کا نعم البدل تو نہیں تھا۔ لیکن کچھ نہ کچھ تھا ضرور۔ اس کے دل میں ایک ننھی سی روشنی ہونے لگی۔ اسی روشنی کے سائے تلے وہ فرید سے ملتی رہی۔ فرید ایک نیا سلا زنانہ سوٹ لے آتا۔ وہ ان کپڑوں کو پہنتی اور کچھ دیر کے لیے اپنی غربت بھول جاتی۔ فرید اسے کوئلے اور چوہے مار گولیاں بھی دیتا۔ اصغری نے کہا کہ وہ بخش کی امانت تھی لیکن......

ان کی زندگی تو پہلے ہی ایک مذاق سے بڑھ کر کچھ نہ تھی

سکینہ نے سوچا کہ اصغری کا بچہ کسی بھی طرح بخش کے ساتھ منسوب نہیں ہو سکے گا۔ تھوڑے دنوں بعد گاؤں تو کیا پورے علاقے میں بات پھیل جائے گی۔ بشیرہ اور اس کے بیٹوں کی موجودگی میں بھی وہ خود کو بخش کی جانشین سمجھتی آئی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بشیرہ کو یہ بات معلوم ہو سکے۔ ایسی حالت میں بشیرہ انہیں پھر شکست دے دیتی۔

ان کی زندگی تو پہلے ہی ایک مذاق سے بڑھ کر کچھ نہ تھی۔ کمرے میں چولہا تک نہیں تھا۔ وہ گاؤں کے کسی گھر سے اپنے لیے کھانا لے آتیں۔ سکینہ سوچنے لگی کہ گاؤں والوں کو جب اصغری کے بارے میں معلوم ہو گا تو ان کا کھانا بھی بند ہو جائے گا۔ بخش کیا سوچے گا اس نے سن رکھا تھا کہ مرنے والوں کی روحیں آسمانوں سے نیچے آتی رہتی ہیں اور اپنے عزیزوں کی غمی خوشی میں شامل ہوتی ہیں۔ بخش کی روح

کا غصہ...... وہ دونوں یکدم خوف زدہ ہوگئیں۔ اصغری نے کمرے میں کوئی حرکت محسوس کی۔ انہیں لگا کہ بخش وہاں موجود ہے اور چپکے سے ان کی باتیں سن رہا ہے۔ پھر کسی چیز کے فرش پر پھڑ پھڑانے کی آواز آئی۔ سکینہ نے ہمت مجتمع کر کے دیکھا تو ایک چوہا زہریلی گولی کھا کر تڑپ رہا تھا۔

سکینہ نے سوچا کہ آج' بخش زندہ ہوتا تو ان دونوں کو جان سے مار دیتا۔ وہ کانپنے لگیں۔ خوف سنگریزوں کی طرح برس رہا تھا۔ وہ اسے کمرے میں تیسرے فرد کی طرح محسوس کر رہی تھیں۔ بخش کا خوف' دنیا والوں کا خوف اور بشیرہ...... سکینہ چکرا گئی۔ اسے زندگی بے مقصد لگی۔ ماں' باپ' بہنیں' بخش' اصغری اور اب اصغری کے پیٹ کا بچہ' کیا اسے کسی نے کچھ دیا' اصغری کی لمبی سانس نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ اصغری نے بتایا کہ بخش کی روح سے بچنے کے لیے وہ چوہے مار گولیاں کھا کر خود روح بن جائے گی۔ سکینہ کو بھی یہی حل نظر آیا۔ اسے جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا چ جڑتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ بشیرہ کی فتح برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے اصغری کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اصغری آلے میں رکھی گولیاں لینے گئی تو سکینہ نے کہا کہ مرنے سے پہلے وہ فرید سے تو مل آتی! بخش سے تھوڑی دیر بعد ملاقات تو ہو ہی جانا تھی۔ اصغری تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی اور دہلیز پار کر گئی۔ سکینہ کو محسوس ہوا جیسے وہ اکیلی رہ گئی ہو۔ اب وہ تھی' چوہے تھے اور چوہے مار گولیاں!

☆......☆......☆

مراق مرزا۔ ممبئی

کیا گاندھی زندہ ہے؟

لڑائی سیاسی تھی۔ مگر عوام الناس بھی اس خونی جنگ میں کود پڑے تھے۔ نام مذہب کا تھا۔ کام سیاسی رہنماؤں نے دکھایا تھا۔ مندر میں گائے کا گوشت پھکوا کر اور مسجد میں سُور گوشت۔ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں مذہب کو انسانی زندگی سے زیادہ وقار و اہمیت حاصل ہے۔ جہاں زندگی مذہب کے لئے ہے، مذہب زندگی کے لئے نہیں۔ جہاں سڑکوں پر مہا آرتی اور جمعہ کی نماز کو لیکر بھی لوگ لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔

مذہب کی بنیاد پر فرقہ وارانہ فساد کروا دیا گیا تھا۔ آدمی درندہ بن کر کھلے عام ایک دوسرے کا لہو بہا رہا تھا۔ سڑکوں پر جگہ جگہ لاشیں پڑی تھیں۔ کہیں خون میں لت پت تو کہیں آگ میں جھلسی ہوئی لاشیں۔ انہیں اٹھا کر جلانے یا دفنانے والا کوئی نہ تھا۔ عورتوں اور جوان لڑکیوں کی آبرولوٹی جا رہی تھی۔ بچوں کو زندہ جلایا جا رہا تھا۔ جے شری رام اور نعرۂ تکبیر اللہ اکبر کی پیر فلک کا دل دہلا دینے والی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں۔ فساد کی آڑ میں لُوٹ مار کا بازار بھی گرم تھا۔ شہر کی کئی بڑی مارکیٹوں کی دکانیں لوٹ کر انہیں نذر آتش کیا جا رہا تھا۔ جس کو جہاں موقع مل رہا تھا وہ کمزور گروہ پر ظلم ڈھا کر اپنی طاقت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ سارا شہر تشدد کی بھیانک آگ میں جل رہا تھا۔ انسانیت تقریباً مر چکی تھی۔ ہر سمت حیوانیت رقص کر رہی تھی۔

چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے مگر پولیس اب تک فساد پر قابو پانے میں ناکام تھی۔ شاید وہ دنگا روکنا ہی نہیں چاہتی تھی، حالانکہ شہر میں متعدد مقامات پر کرفیو نافذ کر دیا گیا تھا اس کے باوجود درندگی کا ننگا ناچ دھڑلے سے جاری تھا۔ پولیس بے چاری کر بھی کیا سکتی تھی۔ وہ اپنے آپ میں کوئی مکمل سسٹم تو ہے نہیں۔ وہ تو سسٹم کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ اسے تو بڑے افسروں کی غلامی کرنی پڑتی ہے۔ انکے حکم پر بندروں کی طرح ناچنا پڑتا ہے۔ یہاں سے وہاں۔ وہاں سے

کبھی کبھی تو کتے کی طرح ڈانٹ پھٹکار بھی کھانی پڑتی ہے

یہاں۔ کبھی کبھی تو کتے کی طرح ڈانٹ پھٹکار بھی کھانی پڑتی ہے اسے اپنے حاکموں سے۔ لاٹھی چارج کا حکم ہوا اور وہ لاٹھی برسانے لگتی ہے۔ یہ سمجھے اور جانے بغیر کہ وہ جن پر لاٹھیوں کی برسات کر رہی ہے وہ قصوروار ہیں یا بے قصور۔ فائرنگ کا آرڈر ہوا اور وہ اندھا دھند فائرنگ کرنے لگتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اُسکی فائرنگ میں مجرم بہت کم ہلاک ہوتے۔ اکثر معصوم اور بے گناہ لوگ ہی اسکی گولیوں کا نشانہ بنتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پولیس حکمرانوں کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی ہے۔ اسے انکے اشارے پر ہی ناچنا پڑتا ہے۔

موہن داس شہر کا مشہور و معروف سماج سیوک تھا۔ وہ کٹر گاندھی وادی تھا اسکا ایقان تھا کہ دنیا اگر گاندھی کے نظریہ عدم تشدد کے فلسفہ کو سمجھ لے اور اس پر عمل پیرا ہو جائے تو اس صفحۂ ہستی سے ظلم و جبر اور قتل و غارت گری کا نام و نشان مٹ سکتا ہے۔ اور یہ کرۂ ارض بہشت بن سکتا ہے وہ گاندھی کو نہ صرف ہندوستان بلکہ سارے عالم کے لئے امن و آشتی کا پیغام بر خیال کرتا تھا۔ اسکی عمر ستر کے آس پاس تھی۔ وہ آنکھوں پر گاندھی جیسا چشمہ لگاتا تھا۔ دھوتی بھی وہ گاندھی جی جیسی ہی پہنتا تھا اور کمرے سے اوپر ننگے بدن رہتا تھا بالکل مہاتما گاندھی کے انداز میں۔ وہ گاندھی جی کا سچا بھگت تھا۔ جب کبھی گھر سے باہر نکلتا تو گاندھی جی جیسا عصا بھی ہاتھ میں لے لیتا۔ ویسے اسے چلنے کے لئے سہارے کی ضرورت بھی پڑتی تھی۔ جب وہ سڑک سے گزرتا تو لوگوں کو بابائے قوم کی یاد آجاتی۔ گاندھی جی کے ہمراہ اس کی کئی بلیک اینڈ وائٹ تصویریں تھیں جنہیں فریم کروا کر یادگار کے طور پر اس نے اپنے گھر کے ہال میں لگا رکھا تھا۔ اس کا گھر بھی کوئی آشرم سے کم نہ تھا۔ حویلی نما وسیع و عریض گھر۔ سامنے کے حصے میں کافی بڑا لان اور عقبی حصہ میں چھوٹا سا باغ تھا جو مختلف اقسام کے پیڑ پودوں سے آراستہ تھا۔ ایک دو نیم اور آم کے درخت بھی تھے صبح سے شام تک اس کے گھر میں ملنے جلنے والوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ کبھی کبھار کچھ صحافی اور ٹی وی رپورٹرز بھی آجاتے تھے اس سے گفتگو کرنے۔

گاندھی جی کے ہمراہ اس کی کئی بلیک اینڈ وائٹ تصویریں تھیں

پیدائشی طور پر وہ ایک ہندو تھا۔ مگر کسی ذات یا دھرم کے لیبل سے اس نے خود کو آزاد رکھا تھا۔ اس نے گیتا اور رامائن کے علاوہ بائبل اور قران کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ کئی دیگر مذاہب کو بھی پڑھا تھا اس نے۔ اور یہی وجہ تھی کہ مذہب اور دھرم کی فصیلوں سے باہر نکل کر وہ انسانیت کا پجاری بن گیا تھا۔ وہ نہ ہندو تھا نہ مسلمان۔ نہ سکھ نہ عیسائی۔ وہ انسان تھا اور دنیا کے سارے انسانوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس کی نگاہ میں نہ کوئی چھوٹا تھا نہ بڑا۔ نہ گورا نہ کالا۔ اس

پر یہ حقیقت واضح ہوگئی تھی کہ دنیا کے سارے انسان ایک ہی رب کے بندے ہیں۔ اِس لئے وہ کسی کو غیر یا دشمن تصور نہیں کرتا تھا۔

وہ گاندھی کی تعلیمات کو موضوع بنا کر اکثر نصیحت آمیز اور با مقصد مضامین لکھا کرتا تھا جو شہر اور ملک کے معتبر اخبارات ورسائل میں شائع ہوتے تھے۔ اسے ٹی وی کے پروگراموں میں بھی مدعو کیا جاتا تھا جہاں وہ گاندھی کے ہی نظریات اور فلسفہ، حیات کی روشنی میں حالات حاضرہ کے مختلف مسائل اور موجودہ سیاست پر بحث ومباحثہ کرتا تھا۔ جنگ آزادی کے دور کی بہت سی یادیں تھیں اس کے ذہن میں جنہیں وہ اکثر اوقات ٹی وی پر سناتا تھا۔ وہ نفرت کا جواب نفرت سے دینے کا قائل نہ تھا۔ اس کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی کہ لوگ نفرت کا جواب محبت سے دیں، محبت ایک ایسا تریاق ہے جو نفرت کے زہر کو جڑ سے مٹا دیتا ہے۔

وہ اس دنیا میں اکیلا تھا۔ اس کی شریک حیات کئی برس پہلے زندگی سے رشتہ توڑ کر دور کہیں آسمان میں جا بسی تھی۔ ایک بیٹی تھی جو شادی کے بعد پرائی ہو کر اپنے سسرال چلی گئی تھی۔ اور اب وہ اپنے ملک اور قوم کیلئے جی رہا تھا۔ اُس نے اپنی زندگی سماج کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کردی تھی۔

پچھلے چوبیس گھنٹے سے اس پر شدید اضطرابی کیفیت طاری تھی۔ جب سے فساد شروع ہوا تھا وہ اندر سے ہر پل ہر گھڑی مر رہا تھا۔ نہ کچھ کھاتا نہ سوتا۔ ہر وقت ٹی وی کے سامنے بیٹھا خبریں سنتا رہتا۔ کبھی کبھار چند لوگ ملنے آجاتے اور وہ کچھ ایسی وارداتوں کے بارے میں بتاتے جس سے متعلق ٹیلیفون یا اخبارات میں خبریں نہیں آرہی تھیں، وہ اندر سے بے چین ہو

جب سے فساد شروع ہوا تھا وہ اندر سے ہر پل ہر گھڑی مر رہا تھا

اٹھتا۔ کہیں مندر پر حملہ۔ کہیں مسجد کا انہدام۔ عورتوں کی عصمت دری، بچوں کا زندہ جلایا جانا۔ یہ وہ خبریں تھیں جو اُس کے قلب وروح کو ہر لمحہ زخمی کر رہی تھیں۔ فساد روکنے کے لئے اس نے کئی بار ٹی وی اور اخباروں کے ذریعہ عوام سے اپیل بھی کی۔ مگر اس کی اپیل کا فسادیوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔

دو دن بیت گئے تھے اور آج تیسرا دن تھا۔ فساد میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ مسلسل کشت وخون کی آگ میں انسانی زندگیاں قربان ہورہی تھیں۔ اور اب خدشات کچھ ایسے تھے کہ گرد و نواح کے گاؤں اور شہر میں بھی یہ آگ پھیل سکتی تھی۔ فساد حکمران پارٹی نے کروایا تھا اپنی حریف سیاسی پارٹی کو بدنام کرنے کی غرض سے۔ حکمران پارٹی اس دنگے کی ذمہ دار اپوزیشن کو ٹھہرا کر مستقبل قریب میں ہونے والے انتخابات میں اپنی فیلڈ مضبوط کرنا چاہتی تھی۔ نیز اقلیتوں کے

آنسو پوچھ کر انکا ووٹ ہتھیانا بھی پسِ فساد اُس کا مقصد تھا۔

موہن داس کے لئے اب کسی بھی طرح گھر میں بیٹھ کر انسان کشی کا تماشا دیکھنا قابل برداشت نہ تھا۔ وہ کسی بھی حال میں فساد روکنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے آٹھ دس لوگوں کو اپنی رہائش گاہ پر بلا کر انکے سامنے شانتی یاترا نکالنے کی تجویز پیش کی۔ بھی لوگ چونکہ ذی شعور اور امن پسند تھے۔ لہٰذا انہوں نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ ان میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ موہن داس کی اس شانتی یاترا کے نکالے جانے کی خبر جب ٹی وی پر آئی تو حکمران پارٹی کے لوگ حرکت میں آ گئے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ فساد رکے۔ ان کے منصوبے کے مطابق ابھی ایک دو دن اور دنگے پر کنٹرول نہیں کیا جانا تھا۔ اس لئے کچھ ہی دیر بعد پولیس کی ایک ٹیم موہن داس کے گھر آدھمکی۔

پولیس کے ایک بڑے افسر نے موہن داس کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''ہم سب جانتے ہیں کہ آپ شانتی کے پجاری ہیں۔ اور شہر میں امن وامان قائم کرنے کی غرض سے یہ شانتی یاترا نکالنا چاہتے ہیں۔ مگر صورتحال ابھی بہت نازک ہے۔ کل جمعہ کا دن ہے۔ دونوں فرقوں کے لوگ پوری تیاری کر چکے ہیں۔ کبھی بھی کچھ بھی ہو سکتا۔ ایسی حالت میں آپکا شانتی یاترا پر نکلنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ ہم آپکی سرکشا کی ذمہ داری نہیں لے سکتے''۔ پولیس افسران نے قدرے ہمدردی جتاتے ہوئے اسے شانتی یاترا نہ نکالنے کا مشورہ دیا۔ مگر پولیس کی باتیں اس کا ارادہ نہ بدل سکیں۔

دوسرے دن موہن داس آٹھ دس افراد کے ہمراہ شانتی یاترا پر نکل پڑا۔ پولیس نے اسے گرفتار کرنے کی کوشش نہیں کی۔ پولیس کے پاس کوئی جواز نہ تھا جس کی بنا پر وہ اسے حراست میں لے پاتی۔ وہ کوئی فساد پھیلانے کی غرض سے تو نکلا نہیں تھا۔ وہ تو شہر میں امن وامان قائم کرنے کے مقصد سے امن کے سفر پر چل پڑا تھا۔

اسے گاندھی کی تعلیمات پر ازحد یقین تھا۔ اسے پورا بھروسا تھا کہ اس کی شانتی یاترا کے سبب لوگ خونریزی کا سلسلہ روک دیں گے اور پچھلے تین دنوں سے قتل وغارت گری کی جو آگ شہر کو جلائے جا رہی تھی وہ ٹھنڈی ہو جائے گی۔ ہندو اور مسلمان کے علاوہ دیگر مذاہب کے لوگ بھی اس سے محبت وعقیدت رکھتے تھے۔ شہر کا ہر اچھا برا آدمی اسے عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ شاید اسی لئے اسے اٹوٹ وشواس تھا کہ اس کا یہ امن کا سفر کامیاب ثابت ہوگا۔

ہاتھ میں لاٹھی لئے، آنکھوں پر گاندھی جیسا چشمہ لگائے بالکل گاندھی جی کے انداز میں دھوتی پہنے، اپنے پیچھے آٹھ دس اشخاص کا کارواں لئے وہ آہستہ آہستہ سڑک سے گزر رہا تھا۔ لوگ اپنے اپنے مکان کے دریچوں اور چھتوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ یہ سوچ کر نکلا تھا کہ

شہر کے لوگ بھی دھیرے دھیرے اسکی اس شانتی یاترا میں شامل ہوتے جائیں گے اور وہ ایک بہت بڑا امن کا کارواں لیکر گاندھی میدان پہنچے گا۔ مگر ہوا اسکے برعکس۔ وہ آٹھ دس لوگ جو اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ موت کے خوف سے ایک ایک کر کے اس کا ساتھ چھوڑتے چلے گئے۔ کچھ دیر بعد جب موہن داس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ تنہا تھا۔ خود کو اکیلا پا کر اس کا عزم ٹوٹا نہیں بلکہ وہ اپنے امن کے مشن پر آگے قدم بڑھاتا چلا گیا۔

سڑکیں ویران تھیں مگر جگہ جگہ جلتی ہوئی کاریں، ٹرک اور سرکاری بسیں دکھائی دے رہی تھیں جن کے سبب ماحول پر دہشت چھائی ہوئی تھی۔ پتھر اور اینٹ کے چھوٹے ٹکڑے

موہن داس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ تنہا تھا

بھی سڑکوں پر بکھرے نظر آرہے تھے۔ کبھی کبھار دور سے جے شری رام اور نعرۂ تکبیر کی آوازیں سنائی دیتیں تو ماحول مزید ہولناک ہو جاتا۔

سورج اب ڈوب چکا تھا اور رات دھیرے دھیرے شہر پر اپنا قبضہ جمارہی تھی۔ کچھ دیر بعد موہن داس ایک چوراہے پر آگیا۔ یہ چوراہا ہندوؤں اور مسلمانوں کی بستی کو جوڑتا تھا۔ اچانک دو طرف سے دو فرقوں کا ہجوم اشتعال انگیز نعرے لگاتے ہوئے اور اپنے اپنے ہتھیار ہوا میں لہراتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف بڑھا۔ موہن داس انکے درمیان آگیا۔ اور انہیں روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر کسی نے آج کے اس گاندھی کی آواز نہ سنی اور نہ ہی اسے پہچانا۔ دونوں گروہوں کے درمیان تصادم شروع ہو گیا۔ کچھ دیر لاٹھیوں تلواروں اور پتھروں سے مقابلہ ہوا پھر گولیاں چلنے لگیں۔ اور تشدد کی گونج میں موہن داس کی آواز گم ہو کر رہ گئی۔

تھوڑے وقفے کے بعد پولیس سائرن کی آواز فضا میں گونجی۔ اور اِس کے ساتھ ہی فسادی منتشر ہو کر گلیوں کی طرف بھاگنے لگے۔ پولیس کے جوانوں نے تیز رفتاری سے وین سے اتر کر بھاگتے ہوئے لوگوں پر ایک دو فائر بھی کیا۔ تاہم گولی کسی کو نہ لگی۔ اور اب چوراہے پر بالکل سناٹا تھا۔ لیکن موہن داس کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔

اچانک پولیس والوں کی نظر ایک چشمہ پر پڑی۔ وہ چشمہ موہن داس کا تھا۔ جس کا شیشہ ٹوٹ کر چکنا چور ہو چکا تھا۔ پھر اس کی دھوتی نظر آئی جو خون میں لت پت تھی۔ اسکے بعد پولیس والوں کی نظر ایک لاش پر پڑی جسے دیکھ کر انکی آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔ وہ ایک برہنہ لاش تھی۔ اور وہ لاش کسی عورت کی نہ تھی۔ بلکہ موہن داس کی تھی۔ کسی فسادی نے اس کے مذہب کی شناخت کے لئے اُس کا جانگیہ بھی اتار لیا تھا۔ حالانکہ زندگی بھر اس نے اپنے آپکو

مذہب کی چار دیواریوں سے بالا ہی رکھا تھا اس کے باوجود مذہب نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔

پولیس والوں کی نظر ایک لاش پر پڑی جسے دیکھ کر انکی آنکھیں شرم سے جھک گئیں

مذہب کے سبب ہی آج وہ چوراہے پر ننگا پڑا تھا۔ ایک حولدار سے یہ شرمناک منظر دیکھا نہ گیا۔ ایک پل کے لئے اسے لگا جیسے گاندھی جی کی ننگی لاش پڑی ہے وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ پھر اس نے خون آلودہ دُھوتی اٹھا کر لاش پر رکھ دی۔

موہن داس کو ہندوؤں نے مارا یا مسلمانوں نے اس بات کا پتہ تو نہ چل سکا۔ مگر فساد فی الحال رک گیا۔ دوسرے دن فساد کے پیش نظر ٹی وی پر ایک پروگرام تھا جس میں ملک کے جانے مانے دوانشوروں اور بدھی جیویوں نے حصہ لیا تھا۔ اور زیر بحث یہ سوال تھا۔ ''کیا گاندھی زندہ ہے؟!!''۔

☆☆☆☆☆

وقار عظیم

کسی افسانہ نگار نے اپنے فن میں اُس وقت تک کامیابی حاصل نہیں کی، جب تک اُس میں جدت پسندی، عجز بیانی اور بلندئ تخیل اور وسعتِ تصور کی صفات ایک جگہ جمع نہ ہوں۔

فن افسانہ نگاری ص ۲۹
مطبوعہ ۱۹۶۹ء

رضا احمد

زیرِ سایہ

ابا نے چاہے کھانے کو کچھ بھی نہ دیا ہو مگر دیکھا سارے گھر والوں کو شیر کی سرد نظر سے تھا۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ گھر کے میان میں ان کی موجودگی میں تلوار تو کیا ایک کند چھری ہی بن سکے۔ ادھر وہ گھر میں بنگال ٹائیگر کی طرح داخل ہوئے ادھر گھر کی فضا میں اڑتے مٹی کے ذروں میں کوئی عجیب سا ارتعاش پیدا ہو جاتا۔ ہر چیز، خیال اور جذبے کا چہرہ اپنے ہی نیوکلیس کی طرف رخ موڑ کر دم سادھ لیتا۔ بغیر گھنٹی بجائے ابا کی آمد کا اعلان ہو جاتا، ٹن ٹن ٹن، با ملاحظہ، ہوشیار.........

سارے میں اڑتی نظروں اور دھوپ میں بوجھل پن پھیل جاتا، وزن بڑھ جاتا، کشش ثقل زور پکڑ جاتی، ہر چیز نیچے گرنے لگتی، قدم سست اور عمل تیز ہوتے، اسی لیے بار بار غلطیاں ہوتیں۔ ابا اپنی رکی رکی چال کے ساتھ چلتے تو ان کے اردگرد دہشت کا ہالہ بھی سرکتا ہوا دالان اور کمروں کی ملگجی روشنی میں رینگ جاتا۔ ان کی ذات کے چاروں طرف کوئی میگنیٹک فورس تھی کہ اول تو کسی کے نیوکلیس میں اس دائرے کے قریب پھٹکنے کی سکت اور کشش ہی نہ تھی اور اگر کبھی کوئی بھولا بھٹکا اس دائرے کے اندر آجاتا تو ابا کی ذات کے بلیک ہول اسے گھما گھما کر اتنا بے وزن کر دیتے کہ اس کا نشان نہ رہتا سوائے اماں کے۔

اماں کی ذات کے اندر نجانے کونسا طاقتور جنریٹر لگا تھا کہ ابا کی موجودگی کے خوف کی گھوں گھوں چلتی موٹر روانی اور بے آوزی سے دوڑنے لگتی۔ صحن میں گزرتے، برآمدے میں تخت پوش پر بیٹھے یا اپنے کمرے میں کرسی کی نرم گود میں گھسے ابا، اماں جان سے کوئی بات کہتے، لہجے میں ٹوٹے کانچ کی سنسناتی کھنکناہٹ مدھم پڑجاتی، سفید ہو رہی مونچھوں کے دونوں کونوں اور ہونٹوں کی آخری سرحدوں کے اتصال پر مسکراہٹ کا کنکر گرتا، شائبہ سا ہوتا کہ ابا مسکرا رہے ہیں...... یہ مسکراہٹ اولین جنبش سے شروع ہوتی اور لہر کی صورت میں پھیلنے لگتی، پھیلتی جاتی، پھیلتی جاتی، قالین، صوفے، کھڑکی کے شیشوں کے اوپر سے لہراتی، اڑتی، کمرے کا دروازہ کھولتی اور سارے گھر میں بچے کی

اماں کی ذات کے اندر نجانے کونسا طاقتور جنریٹر لگا تھا

اولین کلکاری کی طرح پھیلتی چلی جاتی۔ اس ہنسی کے ناخن بڑے تیز ہوتے اسی لیے وہ ہر سنجیدگی کی گانٹھ کو بڑی روانی سے کھول دیتی جیسے سوئی مرغی کو بلی جھپٹے تو دوسری مرغیاں گھبرا کر شور مچاتی اور لڑکھڑاتی اڑانیں بھرنے لگتی ہیں، بالکل ایسے ہی سنجیدگی گھبرا کر اڑتی، اڑان بھرتی، درختوں کی نمدار شاخوں اور پتوں میں گھس جاتی۔ پرانے سٹور کے اندر رکھے کاٹھ کباڑ کے نیچے بلی کے نوزائیدہ بچوں کی طرح چھپتی پھرتی یا پھر دیوار کے ایک کونے میں پروں میں سر دیئے ٹھٹھرا کرتی...... بچے اور ان کے بچے نجانے کیسے ابا کی مسکراہٹ کے احساس سے نچڑ جاتے، اس حادثے کو جان لیتے کہ ابا مسکرا رہے ہیں۔ خوشگواری کا احساس ہینگ کے تڑکے کی خوشبو جیسا پورے گھر میں بھر جاتا، سنجیدگی غائب ہو جاتی، خوف مر جاتا اور بے آواز چھلیں کمروں میں سرسراتیں، ہاتھوں میں گدگدی کے فوارے چلتے اور ہر کوئی اپنے ہونے کے احساس کو چھو لیتا۔ سرخوشی کے یہ لمحے اکثر بڑے مختصر

ابا کی ہر حرکت اور حکم میں گٹر کے ڈھکن اور ہسپتال کے ڈسٹ بن نظر آنے لگے

ہوتے، کبھی تو یہ درمیان میں کچی مولی کی طرح کچ سے ٹوٹ جاتے۔ آرام دہ ہونے کا احساس تیتری بن کر لمبی اڑانوں پر چلا جاتا اور سنجیدگی ایک ٹانگ پر گول گول ناچتی صحن میں اتر آتی، کالی ماتا کی طرح۔ ابا کسی کونے، کمرے سے تھوڑا تیز رفتاری سے برآمد ہوتے، سرمئی آنکھوں کے دونوں کناروں پر جھریوں کی برچھیاں تنی ہوتیں۔ ایک طرف سے مونچھ ہلکے سے کپکپا رہی ہوتی اور چند قدم کے فاصلے پر اماں منہ ہی منہ میں ساجت کرتی پیچھے آتیں، مگر خوشی کا رنگ اڑ چکا ہوتا اور اس کی جگہ وہی پرانے خوف اور خاموشی کے گدھ لمبی گردنیں نکالے ادھر ادھر پھدکتے پھرتے۔ گھر مردے کی طرح پڑ جاتا۔

دوسروں کا تو پتہ نہیں لیکن ندیم کے اندر نجانے کہاں سے بغاوت کا بیج گر پڑا تھا۔ یہ بیج بچپن میں ذات کی نمدار مٹی میں سر دیئے پڑا رہا، جوانی کے آغاز میں یہ ہلکا سا پھٹ گیا اور اندر سے سبزی مائل پیلے رنگ کا پودا کوڑیالے سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا اٹھا۔ عجیب یہ ہوا کہ اس پودے پر پتوں سے پہلے ہی کانٹے پھوٹ نکلے...... میان میں تلوار کی نوک کے پاس ایک ننھی چھوی بھی کسمسانے لگی۔ ابا کی ہر حرکت اور حکم میں گٹر کے ڈھکن اور ہسپتال کے ڈسٹ بن نظر آنے لگے۔ وہ ہر ایسا کام کرنے کی کوشش کرتا جو ابا کی منشا اور ارادوں کے الٹ ہو۔ گو عملی طور پر اس بغاوت کا اظہار فضول خرچی اور میز پر برتنوں کو چھلکانے کے علاوہ کسی صورت میں نہ ہو پاتا۔ جب بھی ابا کے بھرے بھرے احساس کا اور شخصیت کا سامنا ہوا تو اس کا حال اس چنڈال کتے جیسا ہو گیا جو کاروں

کے پیچھے بھونکتا ہوا بھاگتا ہے لیکن اگر کوئی کار سے رک کر اتر آئے تو بھاگ کر دم دبائے قریبی کھیت یا کھوکھے کے پیچھے گھس جاتا ہے۔ عموماً ندیم کے ساتھ یہی کچھ ہوتا اس کی ساری سرکشی، بغاوت اور انا پسندی ابا کے سامنے مری مرغی بن جاتی۔ غصے کا بدذات کتا اپنی ہی دم کے گرد چکر لگانے لگتا اور زبان تھتھلی ہو جاتی۔ ایک بھی ڈھنگ کا لفظ منہ سے نہ نکلتا۔ ایسی پیشی کے دوران میں اگر اس کے منہ سے کوئی بات نکل جاتی تو وہ اپنی ہی آواز اور فقرے کو اجنبیوں کی طرح سنتا۔ اسے حیرت ہوتی کہ اس کے حلق سے وہی فقرے نگر و غلاموں کی طرح مرے مرے قدموں سے قطار بنا کر چلے آرہے ہیں جو ابا سننا چاہتے ہیں۔ باتوں کے دوران جب وہ اپنا موقف بھنبھنا رہا ہوتا تو اچانک ابا ہونہہ کا ہنکارا ابھرتے جس کا مطلب ہوتا کہ یہاں سے دفعہ ہو جاؤ، ندیم نہایت فرمانبرداری سے باہر آتا، لیکن میگنیٹک فیلڈ سے نکلتے ہی باسی کڑھی بڑبڑا کر کے ابلتی اور اپنے ہی کناروں کے اندر خود

بادل چھٹ جاتا تو وہ چپل کے سول کو چوم کر رکھ دیتا

کو جلاتی۔ گاڑھے شیر کی طرح اس میں بڑے بڑے بلبلے، گزری عمر کے بڈھوں کی طرح کمر پر ہاتھ رکھے سطح سے ہولی ہولی اٹھتے لیکن پھر ہلکی سی تھڈ کی آواز نکال کر شیرے میں شیرہ ہو جاتے۔

غصہ آتا اور بہت آتا مگر بھک بھک جل کر اندر ہی ختم ہو جاتا، دل کی دل میں بیوہ ہو جاتی۔ اس حالت میں اس کا دل چاہتا کہ مینار پاکستان کے پیچھے بم کو سرہانے رکھ کر لیٹ جائے، کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔ ابا پر تھوتھو کا بندوبست کرنے کے لیے کسی راہ چلتی لڑکی کے گریباں میں انگلی ڈال کر نیچے قمیض کا لنگار لا دے اور رج کے مار کھائے، مال روڈ پر عین چیرنگ کراس کے درمیان کھڑے ہو کر سارے ابوؤں کو ننگی گالیاں بکے۔ اپنے کمرے میں جب وہ غصے کی انتہا کو چھو لیتا تو اپنی چپل اپنے ہی سر پر تڑتڑ برسانا شروع کر دیتا اور خود کو فرقہ ملامتیہ کا ہرکارہ خیال کرتا۔ تھوڑے لمحوں بعد کچا کچا کتھارسس ہو جاتا۔ بادل چھٹ جاتا تو وہ چپل کے سول کو چوم کر رکھ دیتا۔ منہ میں مٹی کا نامعلوم نمکیلا پن اور ریت کے ذروں کی کراہٹ، دانتوں اور زبان کے اردگرد پھیل جاتی، غصے میں کمی آجاتی، سانس ہموار چلنے لگتا، لیکن لمحوں بعد غصے کا غبارہ پھر بھرنے لگتا۔ کتھارسس کی جوتیاں بھول جاتیں، ابال آجاتا سفیدی سے بھرے ڈرم کی طرح بے چارگی اس پر پانی کا کام کرتی اور درجہ حرارت بڑھتا جاتا، تب وہ گھر سے نکل جاتا، ہال روڈ کی مدھم پڑتی رونق، مال روڈ پر فراٹے بھرتی لڑکیاں اور کاریں، ٹیڑھے ہینڈل والے سائیکل، درختوں کے پتوں سے ذرہ ذرہ گرتی دھول، ہنستا بل کھاتا ڈیزل انجن کا دھواں، چیرنگ کراس سے آگے چڑیا گھر جس کے سینے سے ہر شام شیر کے دھاڑنے کی آواز جست بھر کر اٹھتی، الحمرا کا سکون، گورنر ہاؤس کی میسنی خاموشی اور اس کے ماتھے

سے ماتھا جوڑے جناح باغ........ سارے سیلانیوں، گھروں سے نکلے اور نکالے ایام رفتہ کے مارے بابوں، گرسنہ نظر طوائفوں اور درختوں سے الٹے لٹکے ڈیڑھ ڈیڑھ کلو کے چمگادڑوں کا گھر........ وہ جناح باغ میں گھس جاتا اور تارکول ماری سڑکوں پر ادھر ادھر چکراتا۔ پہاڑی کی سیڑھیوں پر بیٹھتا، چمگادڑوں کی چیں چیں کانوں میں گرتی رہتی اور وہ سارے جہان کو مٹھیاں بھینچ کر گالیاں دیتا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے لڑکیوں کو گھورتا، رات کی تاریکی کو ابلتے محسوس کرتا اور شانت ہو جاتا........ گالیاں نروان کا راستہ بن جاتیں...... تب وہ پرسکون ہو کر گھر کو چل پڑتا۔ ہر ماہ عام پھرنے پھرانے کے علاوہ جناح باغ کے غصے والے دو تین راؤنڈ ضرور ہو جاتے۔ کئی بار غصے، بے چارگی، بے عزتی اور نظر اندازی کے احساس سے بھرے لمحے دنوں میں ڈھل جاتے۔ وقت چبائی ہوئی چیونگم جیسا

نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی ڈکشنری سے فتح اور انکار کے لفظ ختم ہو گئے

بدذائقہ اور غیر مختتم ہو جاتا۔ فرار کے سارے راستوں پر علی گڑھ کے پرانے کالے قفل لٹک جاتے۔ اندر گھٹن اور سانس بھنور کی مانند گھوم گھوم کر اندر ہی اترتا جاتا۔ ایک ایسے ہی لمحے جب ابا سے آوارہ مزاجی کے الزام میں دھر لیے جانے کے بعد وہ احساس ذلت سے پچھاڑ پر پچھاڑ کھا رہا تھا تب اس نے پہلی بار اپنی آنکھوں کو شموں کو گھورتے پایا۔

شموں........ مریل شموں، کانگڑی شموں، دولے شاہ کی چوئی شموں۔ کئی برس گزرے جب شموں اپنی ماں کے ساتھ پہلی بار گھر آئی تھی، گھر میں وہ کسی چیز کے پاس نہ جاتی۔ بس دو تین فٹ دور کھڑے ہو کر تکتی رہتی۔ پاس جانے اور چھو لینے کا حوصلہ اس میں سرے سے تھا ہی نہیں۔ جب پکارو تو ہاں جی، ہاں جی کہتی آ جاتی۔ ہاں جی پہلے اس کا تکیہ کلام اور پھر عادت بن گئی، نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی ڈکشنری سے فتح اور انکار کے لفظ ختم ہو گئے۔ جس وقت شموں کی ماں کچن میں برتن دھوتی یا باہر کپڑوں کو پانی سے نتھارتی تو شموں اپنی کالی سڑک سی آنکھوں سے ٹکر ٹکر ماں کو دیکھتی۔ جو بچا کھچا مل جاتا اسے بڑے سلیقے اور غربت کی چالاک پھرتی سے اپنے منہ میں چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر مسلسل رکھے جاتی۔

ندیم کے لیے دوسرے گھر والوں کی طرح شموں اور اس کی ماں دو نوکروں سے زیادہ کچھ بھی نہ تھے جو آپ کہیں نہیں تھے بس اپنے کام سے جانے پہچانے جاتے تھے اور ندیم کو تو کام دیکھنے کی بھی فرصت نہ تھی۔ لیکن اس دن جس وقت ندیم نے شموں کو دیکھا تو اس کی نظریں تین چار لمحوں کے لیے شموں کی ریڑھ کی ہڈی کے خم سے چپک کر رہ گئیں۔ ہزاروں وولٹ گزارتی تاروں سے چمٹے

بندے کی طرح ندیم کی نظریں شموں سے ہٹنا بھی چاہتیں تو شموں کی کشش جسم اسے اپنے دائرے میں کھینچ لے جاتی...... ندیم اس لمحے کی سنسنی خیزی میں چاروں شانے لت پت گر پڑا۔

اس لمحے کے اندر ضرور کوئی حرمزدگی چھپی ہوئی تھی۔ شاید کچھ لمحوں کے جینز میں ابنارملٹی کا بیج گھسا ہوتا ہے، نظروں کی نمی اور گرمی سے پھوٹ نکلتا ہے اور پھر چل سو چل۔ برآمدے سے گزرتی، کچن کے سینک میں برتن نچاتی، سیڑھیاں اترتی، کھنکھناتے ہوئے ہلکے قدم اٹھاتی شموں بار بار اس کی نظروں کی ڈور کاٹتی، مگر وہ پھر چوری چوری پتنگ بڑھا دیتا، پیچا پھر کس جاتا۔ وقت کا بیج شموں کے جسم میں بڑے قہر سے پھوٹا تھا۔ جگہ جگہ چھوت چھات جیسی اونچ نیچ پیدا ہو گئی تھی جسے چھونے کی اجازت نہیں تھی۔ فیشن رسیدہ پرانے کپڑے پہنے شموں اپنے آپ سے آگاہی کے دروازے پر کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کی ماں پرانے کپڑے تو چھوٹے کر کے اسے پہنا سکتی تھی لیکن شترِ بے مہار جسم کو نکیل کیسے ڈالتی۔ غربت اور جوانی مون سون کی طرح شموں کے سر پر گرج رہی تھیں۔ وہ اپنے

شموں نے تیسرے ہی دن ندیم کی نظروں کو اپنے گریبان کے اندر ناچتے ہوئے پکڑ لیا

پورے جسم سے مسکراتی اور ہر کام لمحوں میں سمیٹ دیتی۔ نہیں کا لفظ کبھی اس کی زبان پر نہ آیا۔ فتح اور انکار اس کی ڈکشنری سے رخصت ہو چکے تھے۔ ''ہاں'' جیسی مسکراہٹ ہمیشہ اس کے ہونٹوں کے کناروں پر گھات لگائے بیٹھی رہتی اور اب ندیم اس مسکراہٹ کے لیے نظروں کا پھندا لیے پھرنے لگا۔ بلی چوہے کا کھیل شروع ہو گیا۔ ندیم کی نظریں بار بار شموں کو دیکھتیں اس کے تلوے کے خم سے لے کر دائیں کان کے پیچھے چھپے مہین سے تل تک شموں کے جسم کے وہ سارے حصے اور دائرے ندیم کی نظروں میں بلی کے شرارتی بچوں کی طرح اچھلتے اور گتھم گتھا ہوتے جو ہر بار شموں پر نظر ڈالنے سے دکھائی یا سجھائی دیتے۔ ایک حادثہ اور ہوا۔ ابا کی باتوں کو شوگر ہو گئی، تلخ اور طنزیہ باتیں زیادہ خوشگوار لگنے لگیں۔ نظروں کی تیزی کو پالا مار گیا۔ موسم میں نامحسوس خنکی آ گئی۔ مال روڈ کے دھوئیں میں چمن کی آئس کریم کی مہک جاگ اٹھی۔ ٹریفک ہموار اور سپاہی مہذب نظر آتے، اور تو اور جناح باغ کی طوائفوں میں سلیقہ مندی اور چمگادڑوں کی بدبو دب سی گئی۔ کئی بار اس نے اپنے آپ کو گنگناتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا لیکن پھر خود ہی دھیرے سے مسکرا کر آگے بڑھ گیا۔

شموں نے تیسرے ہی دن ندیم کی نظروں کو اپنے گریبان کے اندر ناچتے ہوئے پکڑ لیا، گھبراہٹ کی بجائے اس کے ہونٹوں پر دبی سی مسکراہٹ جاگ اٹھی کیونکہ اس کی ڈکشنری سے فتح اور انکار کب کے رخصت ہو چکے تھے۔ ندیم جو اس طرح پکڑے جانے پر بوکھلا گیا تھا پہلے تو اس کا

خون سنسنا گیا، بازوؤں کے جوڑوں اور ریڑھ کی ہڈی کا سارا علاقہ گلیشیر بن گیا لیکن جب اسے احساس ہوا کہ شموں مسکرا رہی ہے تو ساری گھبراہٹ خوشگوار حدت میں تبدیل ہو گئی۔

دسمبر میں بلیک کافی کا پہلا گھونٹ ملا.......... پھر چل سو چل.......... شموں کی زبان اور حرکات میں سہولت پیدا ہو گئی۔ فضا اور نظریں ہلکی پھلکی ہو کر اڑنے لگیں۔ ابا سے بغاوت سنسنی خیز کھیل میں تبدیل ہو گئی۔ ٹیسٹ میچ میں ون ڈے کا مزہ آنے لگا، خطرات کبوتر بن گئے۔ اسے جب بھی اور جہاں بھی موقع ملتا وہ شموں کو نظروں کا جال پھینک کر پکڑ لیتا، گھڑے کی مچھلی جیسا۔

محبت، نشے اور حرام کاری کی طلب ہمیشہ اوپر اٹھتی ہے اور بڑھتی ہے، سو بات نظروں سے گزر کر اشاروں تک آئی اور ایک دن ندیم نے کمرے سے نکلتی شموں کا ہاتھ پکڑ لیا، گیارہ ہزار وولٹ والے ہاتھ نے اس پر فالج طاری کر دیا۔ گھبرا کر اس نے ننگی تاریں چھوڑ دیں، شموں ''پوٹیٹو چپس''

اگلے دس پندرہ منٹ ندیم کو اپنے مرد ہونے کا ادھ پچدا یقین آگیا

جیسا قہقہہ لگا کر باہر نکل گئی اور وہ دھم سے اپنے بستر پر آن گرا۔ اس پہلے لمس کا نشہ انڈے کی طرح کٹھک گیا اور اندر سے خوف نکل کر سارے کمرے میں دگمبیر سادھوؤں کی طرح ننگا ناچنے لگا۔ اسے لگا ابھی کوئی نیچے سے اسے بلانے آئے گا۔ نیچے ابا غصے میں چکرا رہے ہوں گے.......... پھر.......... پھر.......... پھر.......... اس پھر کے بعد کوئی ڈھنگ کی بات اسے سجھائی نہ دیتی۔ کبھی وہ اپنے آپ کو مقتول ہوا صحن میں پڑا پاتا یا احساس ذلت کے پہیے اس کے جسم کے ٹکڑے اڑاتے گزر جاتے.......... لیکن عملی طور پر کچھ بھی نہ ہوا سوائے شموں کی ہنسی میں چینی کی پیالیوں جیسی کھنک پیدا ہو جانے کے۔ وہ میز پر کھانے کے برتن لگاتی، کچن میں ماں کا ہاتھ بٹاتے، کوئی نہ کوئی بات ایسی کہہ جاتی جس کا مخاطب صرف ندیم ہوتا۔ ندیم گھبراہٹ آمیز خوشی محسوس کرتا اور مزید ایسی ہی ذومعنی باتوں کی امید کرتا۔ جوانی کے پریشر ککر کی سیٹی زوروں سے بجتی رہتی۔ اس روز کوئی خاص واقعہ تو نہیں ہوا، نہ بادل گرجے نہ بجلی نے کڑک کر کھڑکیوں میں لگے شیشوں کے سینے لرزائے.......... بس ابا نے دکان پر دیر سے آنے کی وجہ سے ندیم کو طلب کر لیا.......... وہی ماحول، وہی لفظ اور وہی احساس، ذلت کی پتھریلی چٹانیں..........

کمرے سے نکلا تو کانوں میں ساں ساں ہو رہی تھی۔ بلڈ پریشر کہیں ایفل ٹاور کی اوپری منزلوں پر آسمان کی طرف منہ اٹھائے چیخ رہا تھا۔ وہ غصے میں بھرا اپنے کمرے میں داخل ہوا تو شموں اس کے بیڈ کی چادر درست کر رہی تھی۔ اس کے بھرے کولہے اور کمر کا خم چادر جھٹکنے پر لرز جاتے، ندیم کے اندر ذلت کا گیدڑ ایک ہی جست میں شیر کے قالب میں ڈھل گیا۔ وہ شموں کی طرف لپکا، ایک لمحے کو وہ گھبرائی لیکن پھر خود ہی خود سارا مرحلہ آسان کر دیا کیونکہ انکار اور فتح کب سے اس کی

ڈکشنری سے رخصت ہو چکے تھے۔

اگلے دس پندرہ منٹ ندیم کو اپنے مرد ہونے کا ادھ پچدا یقین آ گیا۔ شموں ہلکے سے مسکراتی ہوئی اٹھی اور سہولت سے چلتی کمرے سے نکل گئی، ندیم وہیں پڑا رہ گیا۔ ہوش آیا تو شیر کی کھال دروازے میں پڑی تھی اور اندر کا مردار گیدڑ کونے میں پڑا ہونک رہا تھا۔ ابا کا انتقام شموں چکا کر جا چکی تھی۔ چند لمحوں میں ہی اس سنسنی خیز تجربے کا سانپ نکل گیا اور پیچھے خوف کی لکیر چھوڑ گیا، یہ لکیر چوڑی ہوتے ہوتے دریا بن گئی۔ اس دریا میں جب ندیم اپنی ذات کی ٹوٹی کشتی کے ایک شکستہ تختے سے چمٹا غوطے کھا رہا تھا، اسی وقت کمرے کے باہر سے ابا کے بھاری قدم ایک ہیبت ناک چاپ کی لے اٹھاتے آگے بڑھنے لگے۔ ندیم گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ کھلے دروازے کے سامنے سے گزرتے ابا نے ایک نظر ندیم پر ڈالی، وہی کانٹوں بھری نظر۔ ندیم نے خود کو پوکھران میں ایٹم بم کے عین اوپر کھڑا پایا۔ اس کے قدموں کے نیچے زمین لرزی مگر اچھا ہوا کہ ابا نظر ڈال کر گزر گئے ''ابا نے شموں کو کمرے سے نکلتے دیکھ لیا ہے'' ندیم کے ذہن میں پہلا کوندا لپکا، دوسری بات

بس ابا کے خوف کا روشندان پہلی روشنی کی آبشار گرانے کو کھلا رہ گیا......

سوچنے سے پہلے ہی اس کی ٹانگیں اس کے بوجھ سے عاری ہو گئیں، ہوا میں لڑکھڑاتا ہوا وہ چند قدم چلا، پھر کرسی پر ڈھیر ہو گیا...... شام تک وہ بستر میں دبکا ابا کے سمن کا منتظر، جیتا مرتا رہا لیکن ابا کا حکم موت کے انتظار کی طرح نہ آیا۔ اسے کچھ حوصلہ ہوا کہ شاید ابا نے اسے نہیں دیکھا۔

اگلی صبح جب وہ ناشتے کی میز پر آیا تو اسے ابا کی آنکھوں میں پراسرار شرارے کوندتے نظر آئے۔ اسے لگا جیسے وہ ننگا بیٹھا چائے پی رہا ہے اور ابا اسے گھور رہے ہیں۔ جلدی ناشتے سے ہاتھ کھینچ کر وہ اٹھ آیا۔ آنے والے ہر دن وہ ابا کے بلاوے سے لرزتا رہا مگر آہستہ آہستہ خوف کا دریا اترتا اور نیچے سے کہیں کہیں امید کی ریت کے جزیرے ابھر آئے۔ پھر بھی ابا کی کچھ باتوں سے اسے لگتا کہ وہ شموں والے واقعے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ یہ سوچ کر وہ فوری طور پر ابا کے سامنے سے اڑن چھو ہو جاتا یا زیادہ تیزی سے کام میں مصروف ہو جاتا۔ اماں خوش تھی کہ اب بیٹا محنت سے کام کرنے لگا ہے لیکن ندیم کی حالت پکڑے جانے کے خوف اور نہ دیکھے جانے کی امید کے درمیان شٹل کاک بن گئی۔ پر جھڑ گئے اور ذات میں یتیمی کے سوتے پھوٹ نکلے۔ ابا کے بلاوے کا خوف ذہن کا وظیفہ بن گیا...... ڈیڑھ ہفتے بعد جب ہر خوف اپنی موت آپ مر چلا تھا کہ اچانک کریم بھائی نے اسے ابا کا پیغام دیا کہ وہ شام کے کھانے کے بعد اس سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں...... سنتے ہی ندیم کے کان کے اندر بارہ بور کا فائر ہو گیا۔ کریم بھائی چلے گئے تو وہ فوری طور پر دکان کا رخ کر گیا۔ دس بجے تک ابا دکان پر نہ آئے تو اسے یقین آ گیا کہ آج

یوم حساب آن پہنچا۔ ابا سخت غصے میں تڑتڑا رہے ہوں گے.......... پچھلے چاروں دنوں کے خوف کی گٹھڑی اس کے سر پر آن گری، گردن ٹیڑھی ہوگئی۔ کاؤنٹر پر بیٹھا وہ خالی خالی نظروں سے ملازموں کو کام کرتے دیکھتا رہا۔ ایک بجے تک خوف نے اس کی ذات کے سارے دروازوں کے سامنے کنڈلی مار لی۔

پوری ذات شاہی قلعے کا عقوبت خانہ بن گئی، ہر راستہ ہر کھڑکی بند، بس ابا کے خوف کا روشندان پیلی روشنی کی آبشار گرانے کو کھلا رہ گیا.......... وہ اس خوف سے بچنے کی خاطر مریل کتے کی طرح اِدھر اُدھر بھاگتا رہا لیکن خوف کے پنجے ہر جگہ اس کا پیچھا کرتے آن لیتے اور جب اس

ابا اپنے ہی خوف کی جھاگ میں سرنگوں قالین پر ڈھیر تھے

خوف نے اپنی انتہا کو چھولیا تو چوہا، شیر بن گیا۔ وہ کاؤنٹر سے اٹھا تو سوچ چکا تھا کہ شام تک موت کا انتظار کرنے سے بہتر ہے کہ اس کا ابھی سامنا کر لیا جائے۔ موٹر سائیکل گھر کی طرف دوڑاتے کبھی وہ ابا کے سامنے غصے سے چلانے لگتا یا پھر خود کو ابا کے قدموں میں معافی مانگتے ہوئے پاتا.......... جس وقت اس نے موٹر سائیکل آہستگی سے سٹینڈ پر کھڑی کی تو اس کی ہمت، غصے اور خوف کا بھوت اپنے ہی منتر میں حال کھیل رہا تھا.......... بس وہ ابا کے کمرے میں جائے گا اور ان کے قدموں میں گر پڑے گا.......... بھلا گرے ہوئے کو کوئی مزید کیا گرائے گا۔

گھر میں خاموشی پاؤں پھیلائے ہڈحرام ملازم اور کاہل بلی کی طرح اونگھ رہی تھی.......... سبھی اپنے کمرے میں پڑے تھے۔ وہ بدحواس دلیری سے چلتا ہوا ابا کے کمرے کی طرف بڑھا۔ جس وقت وہ خاموشی سے ابا کے کمرے میں داخل ہوا تو سارے احساسات سے مکتی پا چکا تھا۔ ابا کمرے میں نہیں تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ سٹڈی روم میں ہوں گے۔ وہ سٹڈی روم کے ہلتے پردے کو ایک ہاتھ سے ہٹا ہی رہا تھا کہ وہیں پتھر ہو گیا.......... ابا.......... ابا اپنے ہی خوف کی جھاگ میں سرنگوں قالین پر ڈھیر تھے، ان کے ہاتھ کاؤچ پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی شموں کے پاؤں چھو رہے تھے۔ مونچھیں چھپکلی کی کٹی دم کی طرح لچک اور پھڑک رہی تھیں۔ ایک آنسو ناک کی پھننگ پر پھانسی لٹکا جھول رہا تھا۔ ندیم نے پہلی بار ابا کی خوف میں لرزتی آواز سنی، وہ بڑی بے چارگی سے بار بار کہہ رہے تھے.......... شموں، مجھے معاف کر دو، خدا کا واسطہ مجھے معاف کر دو، مجھ سے غلطی ہو گئی.......... مجھے معاف کر دو، شموں.......... شموں.......... اور شموں اپنی ٹانگوں میں آدھی پھنسی شلوار کو چٹکی میں مسلتی ہلکے ہلکے مسکرائے جا رہی تھی، کیونکہ اس کی ڈکشنری سے فتح اور انکار کب کے ختم ہو چکے تھے۔

افسانے سے ڈرامے تک

کیا گزرتی ہے افسانے پر ڈرامہ ہونے تک

اردو افسانے کا ایک بہت بڑا نام...... بانو قدسیہ ہے۔ افسانہ "امربیل" بانو آپا نے تحریر کیا تھا، اور پھر یہ افسانہ ہاتھ لگا امجد اسلام امجد کے۔ انھوں نے اسے ڈرامہ بنا دیا۔ یہ ڈرامہ لاہور ٹی وی سنٹر سے ٹیلی کاسٹ ہوا۔ ہم افسانہ اور ڈرامے کا اسکرپٹ دونوں شائع کر رہے ہیں۔ یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رکھا جا سکتا ہے اگر قارئین سورج نے پسند کیا تو...........

بانو قدسیہ

میرے افسانوں میں رومان سے زیادہ اُس کا تجزیہ ہوتا ہے۔

بہ حوالہ ''یہ صورت گر کچھ خوابوں کے'' صفحہ ۲۹۴ مرتبہ طاہر مسعود

افسانہ: بانو قدسیہ

امر بیل

محبت کی امر بیل میں ہمیشہ ہائی سنتھ کے پھول لگتے ہیں۔

تم نے کبھی ہائی سنتھ کا پھول دیکھا ہے زری؟

ہائی سنتھ کا پھول جس کی پنکھڑیوں پر تاسف کے آنسو منجمد ہوں اور جس کی مخملیں جلد سے جدائی کی خوشبو آئے۔۔۔ لیکن تم نے تو ہائی سنتھ کا پھول دیکھے بغیر ہی اپنے دل کے نہالچے پر کیوپڈ دیوتا کو سلایا اور پھر آپ ہی آپ ایک رات پچھلے پہر اس کا گلا گھونٹ دیا۔ محبت کا کھیل گنجفہ کا کھیل نہیں ہوتا زری۔۔۔ پھر تم نے اپنے بچوں کو بازی کیوں سمجھا۔ یہ تو ایک بجھارت ہے۔ ایک کہہ مکرنی ہے، ایک پہیلی ہے جس کی سمجھ برسوں نہیں آتی۔ تم تو ابھی فلیٹ بوٹ پہنتی تھیں۔ کندھے پر دو چوٹیوں میں سرخ ربن ڈالتی تھیں۔ تمہاری عمر آئس کریم کھانے اور نٹ بال کھیلنے کی تھی۔ پھر تم نے سانپ کی بانبی میں ہاتھ کیوں ڈالا۔ تم سے کس نے کہا تھا کہ پارے کا کشتہ اتنی آسانی سے بن جاتا ہے۔

تم نے محبت کے لئے جو ہدف چنا وہ بڑا پر پیچ تھا۔ کیسی عجیب سی بات ہے کہ میری محبت تم سے مہ رخ کے توسط سے ہوئی۔ اگر وہ خجستہ صورت لیکن منحوس لڑکی میری زندگی میں نہ آتی تو تمہاری محبت کا سربند چشمہ میرے دل میں کبھی نہ پھوٹتا۔ تمہاری محبت میرے دل میں اس طرح بچھی ہے جیسے کسی پرانے مزار پر تازہ پھولوں کی چادر۔۔۔ نئی عقیدت کا اظہار۔ اس مرقد میں تمہاری محبت دفن ہے اور تعویذ پر ہائی سنتھ کی پھولوں کی تازہ چادر تنی ہے۔۔۔ جن کے مومی وجود پر تاسف کے آنسو منجمد ہیں۔ ان کی مخملی جلد سے جدائی کی خوشبو آتی ہے۔ موت کی ٹھنڈی باس اٹھتی ہے۔

آنڈا سے پہلی ملاقات نیل کے کنارے ہوئی تھی۔ میں اپنے دیس واپس آ رہا تھا اور وہ

اپنے ہسپانیہ لوٹ رہی تھی۔ مسجد قرطبہ کے عقب میں رہنے والی آنڈا جس کے چھپئی سینے پر پلاٹینم کی صلیب آویزاں تھی۔ ہماری ملاقات چند روزہ تھی۔ بادام کے شگوفوں کی طرح معطر بیحد نازک اور اپنی موت کے احساس سے لرزاں۔ اس شام ہم دونوں ہوٹل سے اٹھ کر نیل کے ناسپاس پانیوں میں فاتلے آبیٹھے تھے۔ اندھیرا ست مدعی کی طرح دبے پاؤں آگے بڑھ رہا تھا اور قاہرہ شہر کی بتیاں نیل کے ناسپاس پانیوں میں فانوس رنگ جل بجھ رہی تھیں۔ ان منعکس بتیوں کو دیکھ کر ہسپانیہ کی دختر نے کہا تھا:

''آصف! ان بتیوں کا اپنا تو کوئی وجود نہیں۔۔۔نہیں ہے ناں''۔

''کن بتیوں کا آنڈا؟''

''جو بتیاں آپی آپ نیل کے سینے سے آ گئی ہیں۔ میلوں کا فاصلہ طے کر کے۔''

''نہیں۔۔۔''

آنڈا لونا چماری تھی' جادوگرنی تھی۔ اس کا یمین و یسار سیسہ پلائی دیوار کی طرح شکست سے ناآشنا تھا۔ اس میں کارمن کی روح تھی۔ وہ مسجدِ قرطبہ کی طرح خوبصورت اور جادو آفریں تھی۔ لیکن نہ جانے اس روز ہمارے قیام کی آخری شام وہ شمع رو کیوں قطرہ قطرہ پگھل رہی تھی۔ اس کی ستواں ناک ضبط کئے ہوئے آنسوؤں کے باعث ٹیڑھی نظر آ رہی تھی اور سینے کی چمنی میں رکی ہوئی آہوں نے زیر و بم کا نامتواتر ساز چھیڑ رکھا تھا۔

''اس میں ان بتیوں کا بھی کوئی قصور نہیں جو قاہرہ میں جل رہی ہیں۔۔۔ ہے نا؟''

مرد ہر لمحہ جرات میں بزدل بن جاتا ہے۔ وہ کچھار میں پناہ لینے والے شیرِ ببر کی مانند سویا رہنا چاہتا ہے۔ مجھ پر بھی اس وقت بزدلی طاری تھی۔ کوئی چیز فضا میں ایسی تھی جو نامانوس تھی' جو بموں کی خوشبو سے مشابہ لیکن عطرِ حنا میں لپٹی گیس غبارے کی طرح اوپر اٹھ رہی تھی۔ شام پر انہونے پن کی روشنیاں پڑ رہی تھی۔ مجھے۔۔۔ لگ رہا تھا۔۔۔ میں نہیں ہوں۔۔۔ اور پھر بھی کرسی پر بیٹھا ہوں' میرا کوئی مستقبل نہیں۔ میرا کوئی ماضی نہیں۔۔۔ میرا حال بھی سائے کی مانند ہے جس کا اپنا کوئی وجود نہیں۔۔۔ میں اس کیفیت سے ڈرتا تھا جیسے اپریشن ٹیبل سے بھاگ کر میں سڑکوں پر بلا مقصد گھوم رہا ہوں اور میرے سر پر میرے جسم' میری شریانوں میں کلوروفارم کا نشہ شاں شاں کر رہا ہے۔

''میری بات کا جواب دو آصف!''

اس کی بات کا ایک ہی جواب تھا کہ میں چپکے سے اٹھتا اور نیل کے پانیوں کو اپنا غیر مرئی حساس اور کلوروفارم سے مدہوش جسم سپرد کر دیتا۔ لیکن میں نے اپنی بزدلی کو ہنسی ٹھٹھوں میں چھپاتے ہوئے کہا۔۔۔ ''سیدھی بات کیا کرو۔''

اس نے منہ پھیر لیا۔ نیلی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے وہ بولی۔ ''جو خواہ مخواہ کسی کا عکس اپنے دل میں ڈال لیں اور اسے چھپائے رکھیں۔۔۔ وہ بیوقوف ہوتے ہیں ناں؟''

''خدا کے لئے اتنی خوبصورت شام کو تباہ نہ کرو۔''

لیکن آنڈا کے اپنے وجود کے اندر خصی پرنالہ گر رہا تھا۔ اس کے اندر شکست و ریخت کا ایک طوفان موجود تھا۔ وہ شیام رنگ لمحوں کی کیا پرواہ کرتی' بھڑک کر بولی۔ ''اگر نیل ان بتیوں کو اپنے پانیوں میں یوں بسانا چاہتا ہے تو اس میں شہر کی بتیوں کا کیا قصور؟''

''تمہیں کیا ہو گیا ہے آنڈا۔۔۔'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

دور کسی ریڈیو پر ام کلثوم گا رہی تھی۔ ہر تان میں فی سبیل اللہ' فی سبیل اللہ کی التجا تھی۔ میرے اردگرد رنگین چھتریاں' ان کے نیچے بیٹھے ہوئے لوگ' ان میں گھومنے پھرنے والے بیرے چرخے کی مال کی طرح گھومتے نظر آ رہے تھے۔ آنڈا نیم وا آنکھوں میں چقماق سے آنسو لئے بولی۔ ''ہائی سنتھ پھول کی کہانی سنی ہے تم نے؟''

''نہیں۔۔۔ اور میں سننا بھی نہیں چاہتا۔ میری ایک کزن مجھے فلمی کہانیاں سنایا کرتی ہے۔ میں کبھی ان کے گھر نہیں جاتا۔''

''ہائی سنتھ کی کہانی فلمی نہیں ہے آصف۔ یہ تو دکھ کے پھول کی داستان ہے۔۔۔ ایسا پھول جس میں محبت کا مدفن تھا۔''

میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ میری قوت مدافعت جواب دے چکی تھی۔ سارے میں زمستانی ہواؤں کی سیٹیاں بج رہی تھیں۔ چرخی کی مال گھوم رہی تھی اور ام کلثوم التجا کر رہی تھی۔۔۔ رو رہی تھی۔ فی سبیل اللہ۔۔۔ فی سبیل اللہ۔

آنڈا اپنے آپ سے بولی۔۔۔ ''کہتے ہیں کہ دیوتا اپالو کی دوستی ایک یونانی نوجوان سے تھی۔ ہائی سنتھ نامی یہ یونانی نوجوان حسن میں بے مثل تھا۔ انگور کے پتوں کا تاج پہنے اخروٹ کی لکڑی کی کمان سنبھالے چیتے کی کھال میں ملبوس جب وہ پہاڑیوں سے اترتا تو یونان کی دوشیزائیں پانی بھرنا بھول جاتیں۔ خود اپالو۔۔۔ سورج کی طرح پلک جھپکے بغیر اس کی طرف تکتا چلا جاتا۔۔۔ لیکن اپالو اور ہائی سنتھ کی دوستی چند روزہ تھی۔ اپنی موت کے احساس سے خود لرزاں۔ یہ بتاؤ آصف ہر خوبصورت چیز' ہر مکمل ملاپ چند روزہ کیوں ہوتا ہے۔۔۔ کیوں ہوتا ہے۔ بتاؤ ناں؟''

میں چپ رہا۔ میری عافیت اسی میں تھی کہ میرے منہ سے کچھ نہ نکلے۔

''سنو آصف! ابھی ہائی سنتھ اور اپالو پر محبت کی اولین سرشاری طاری تھی کہ ہائی سنتھ'

نے کہا۔ " یہ بتاؤ جب محبت کا نشہ چڑھا ہو تب موت کا حادثہ ہو تو المیہ زیادہ ہے کہ محبت کا نشہ اتر جانے پر۔۔۔ یعنی دونوں میں سے کون سا بڑا المیہ ہے؟''

نیل کے پانی گنبد کی گونج بن کر میری طرف بڑھے۔ میں جلدی سے اٹھا اور اس کی کرسی پر جھک کر بولا۔۔۔ '' یہ میری آخری شام ہے پردیس میں۔۔۔ اسے یوں مضمحل نہ کرو۔۔۔ آؤ بازار چلیں۔''

وہ اپنی جگہ سے اٹھے بغیر بولی۔۔۔ '' تمہی کہا کرتے ہو کہ مشرق کے لوگ دل کے معاملے بہتر سمجھتے ہیں۔''

میں اس کے طعنے کا تھوتھا تیر کھا کر بیٹھ گیا اور وہ بولتی چلی گئی۔ "ہائی سنتھ کی قبر پر اپالو کے اتنے آنسو گرے کہ ایک دن قبر سے ایک پودے نے سر نکالا۔ ہولے ہولے اس میں شاخیں نکل آئیں اور پھر ایک پھول کھلا۔ ارغوانی رنگ کا۔۔۔ ہائی سنتھ کا پھول۔۔۔ جب اپنے دیس لوٹ جاؤ تو یاد رکھنا کہ آنڈا کو ہائی سنتھ کے پھولوں سے عشق تھا عشق۔۔۔''

میں نیل کے پانیوں میں جھلملاتی بتیوں کا رقص دیکھنے لگا۔۔۔ ارغوانی بتیاں۔۔۔ آسمانی بتیاں۔۔۔ گڈمڈ پھولوں کی قطاریں۔۔۔ آنڈا نے ایک چھوٹی سی سسکی لی۔ سینے کے پہلو کی ہڈیوں میں ایک چھوٹا سا زلزلہ آیا اور وہ میرے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر بولی۔۔۔ " جانتے ہو۔ ہائی سنتھ کی پنکھڑیوں پر کیا لکھا ہوتا ہے۔۔۔ جانتے ہو آصف؟''

''نہیں۔۔۔''

اس کے ہاتھوں کا دباؤ شکنجے کی طرح بوجھل بھی تھا اور آسمان میں تیرنے والے پر کی مانند ہلکا بھی۔۔۔

'' ہائی سنتھ پچھتاوے کا پھول ہے۔ محبت کا مدفن ہے اس سے جدائی کی خوشبو آتی ہے، اس میں تمناؤں کا لہو جھلملاتا ہے۔ اس کی ہر پنکھڑی پر لکھا ہوتا ہے افسوس۔۔۔ صد افسوس۔۔۔'' اس کی آنکھوں سے دو چھوٹے سے آنسو جھلملاتے ہوئے مجھ پر آن گرے۔

"جب میں پاکستان آؤں گی تو مجھے تاج محل دکھاؤ گے ناں؟"

میں نے اس کے گریبان میں لٹکی ہوئی صلیب کو چھو کر کہا۔۔۔ '' تاج محل ہندوستان میں ہے آنڈا۔۔۔ تمہیں اپنا ہمسفر بدلنا پڑے گا بارڈر پر۔۔۔''

آنڈا نے اب تک ضرور اپنا ہمسفر تلاش کر لیا ہوگا زری۔۔۔ یہ تم ہی تھیں کہ جس میں سفرِ حیات کا حوصلہ نہ تھا۔ ورنہ راستہ چاہے جاں گسل ہی سہی لیکن اس راہ میں اور آبلہ پا بھی ملتے ہیں۔ آنڈا کا میری زندگی سے ایسا ہی تعلق تھا جیسے بچوں کی نصابی کتابوں میں رنگین تصویروں کا وجود۔ ان تصویروں کا تعلق اصل متن سے ضمنی ہوتا ہے۔ اسی طرح آنڈا میری زندگی میں آئی

اور چلی گئی۔ ایک طرح سے تو مہ رخ بھی میری زندگی میں اصل متن نہیں ہے۔

جب بھی بارش آتی ہے زری اور بوندیں گرم مٹی سے لپٹ کر سوندھی خوشبو میں بھیگ جاتی ہیں۔ میں تم کو ہمیشہ یاد کرتا ہوں۔ تم اس خوشبو کی طرح تھیں۔ انوکھی انجان۔۔۔ گرم اور سرد کے باہم اتصال کی خوبصورت دلیل۔۔۔ آج شام سے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ بجلی ان سیاہ بادلوں میں گھبرائی پھرتی ہے۔ پہلے آسمان پر ایک سفید چادر لہرائی۔ پھر مشرق کی جانب سے اودی، نیلی سیاہ ساڑھیوں کے تھان اڑ اڑ کر آنے لگے اور بہت جلد ان کپڑے کے تھانوں نے غف اونی تنبو کی شکل اختیار کر لی۔ اس تنبو کی طنابیں ابھی ٹھیک طور پر کسی بھی نہ گئی تھیں کہ جا بجا غف کپڑے میں شگاف آ گئے۔ مینہ اس طرح برسا جیسے رکھیل عورت میکہ یاد کر کے رودے۔ بارش کو دیکھ کر تمہاری یاد کا گھٹا ٹوپ اندھیرا میرے چاروں طرف چھانے لگا۔ میں نے کھڑکی کھول دی۔ مٹی کے گرم وجود سے لپٹی ہوئی ٹھنڈی بوندوں کی خوشبو اٹھی۔۔۔ کچھ لوگ کم ظرف اور تیلیے ہوتے ہیں۔ ان میں محبت کا مشکیزہ جب غٹ غٹ انگیلیں گراتا ہے تو عموماً ان کا وجود گڈی کاغذ کی طرح پھٹ جاتا ہے۔ کچھ کے لئے محبت بھرنے اور اترنے کا موقع ہوتی ہے۔ وہ اپنی بے ہوا میں تلواریں مارتے ہیں۔ کچھ طفل زادے محبت کے نذرانے کو ٹھوکریں مار مار کر کچے گھڑے کی طرح بے وقعت کر دیتے ہیں۔

ایسے ہی فرعونوں میں میرا شمار بھی تھا لیکن مہ رخ سے ملنے کے بعد نہیں۔ اس وقت مجھے محبت اور محبت میں محرومی کا احساس پوری طرح ہو چکا تھا۔

جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تو تمہارے سینے پر دو لمبی لمبی چوٹیاں تھیں جن میں بل دیئے ہوئے سرخ ربن گڑھل کے پھولوں کی طرح لٹک رہے تھے۔ تمہارے پیروں میں فلیٹ بوٹ، کانوں میں گول سنہری رنگ اور کندھے پر سکول یونیفارم کا سرخ دوپٹہ تھا۔ تمہارے گال پکے ہوئے سیبوں کی طرح شنگرفی ہو رہے تھے۔ اس سرخی میں کسی آئرن ٹانک یا غازے کی آمیزش نہ تھی۔ اوپر والے لب پر پسینے کے چھوٹے چھوٹے قطرے تھے۔ یہی پسینہ کسی معمر عورت کی بدصورتی کی وجہ ہو سکتا تھا لیکن تم پر یہ صحت اور تازگی کا اشتہار تھا۔ آنکھوں کے دونوں جانب دنبالہ دار سرمہ تھا۔ بھاگتے تیر کی طرح پر افشاں اور تیز رو۔

یہ عمر عشق و عاشقی کی عمر نہ تھی۔ یہ عمر سوڈا واٹر، لیمن ڈراپس اور آئس کریم کی عمر تھی۔ تم اگر چیونگم منہ میں چچوڑتی کولہے کو چست قمیض میں لچکاتی بائی بائی کہہ کر میرے پاس سے گزر جاتیں تو مجھے تعجب نہ ہوتا۔ لیکن تم آ کر چپ چاپ کھڑی ہو گئیں۔ تم نے نہ اپنی عمر پر ترس کھایا نہ اس مشکل راہ پر نظر کی جو تم نے اپنے لئے لمحوں میں انتخاب کر لی تھی۔ بس تم پر تو خبط اچھلا۔۔۔ اور تم میری محبت میں گرفتار ہو گئیں۔ تمہاری طرف سے یہ پہلی نظر کی محبت تھی۔ اس

میں استانی جی سے والہانی عشق کا دیوانہ پن بھی تھا۔ باپ سے دلی شیفتگی بھی تھی اور ایک اور چیز بھی تھی جسے صرف تم ہی سمجھتی تھیں، جو صرف تمہاری ہی رگِ جاں تھی۔

''میجر صاحب گھر پر ہیں بے بی؟''

بے بی کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''ڈیڈی نہیں ہیں جی۔ ممی اندر ہیں۔''

''تو انہیں جا کر بتائیے کہ آصف تنویر آیا ہے۔۔۔ آصف تنویر یاد رہے گا ناں؟''

''جی آصف تنویر صاحب۔۔۔ یاد رہے گا جی۔''

پھر تم جالی کا دروازہ کھول کر اندر بھاگ گئیں۔ گیلری میں تمہارے بھاگنے کی آواز آتی رہی۔ اس عمر میں بھاگنا کتنا فطری اور خوبصورت فعل ہے۔ ہرن کی قلانچوں سے مشابہ عربی گھوڑے کی جست کی طرح بے خوف، چیتے کی طرح سڈول جسم کو فضا میں تولتے ہوئے بھاگنا۔ یہ فلمی بھاگنا نہ تھا۔ ٹپے کھاتی گیند کا سا دوڑنا تھا۔ چند ہی لمحوں میں تم واپس بھی آ گئیں۔

''جی۔ اندر آ جائیے، ممی بلا رہی ہیں۔''

تم مجھے اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے گئیں۔ یہ بیٹھک یا دیوان خانہ کم تھا اور میجر اقبال کے شکار کئے ہوئے شیر، چیتے، بارہ سنگھوں کا عجائب گھر زیادہ تھا۔ صوفوں پر ہرنوں کی ملائم گندم گوں کھالیں پڑی تھیں۔ آتش دان کے پاس دو چیتے مع اپنے چار بڑے بڑے خونخوار دانتوں اور نارنجی آنکھوں کے سر اٹھائے لیٹے تھے۔ کارنس پر بارہ سنگھے ٹنگے تھے۔ ان کے سینگ اخروٹ کی لکڑی کے بنے نظر آتے تھے۔ جا بجا ہاتھی دانت اور پیتل کا آرائشی سامان سجا تھا۔ سارے کمرے میں کمائے ہوئے چمڑے کی مہک تھی۔ تم مجھے کمرے میں بٹھاتے ہی پھر بھاگ گئیں۔ غالباً میں تمہارے رسی پھاندنے کے شغل میں مخل ہوا تھا۔

تمہاری ممی چند لمحے بعد تشریف لائیں۔

وہ پہلے سے بہت زیادہ موٹی اور سانولی ہو چکی تھیں۔ ساتھ ہی انہوں نے نہایت دہشت انگیز قسم کی گلابی لپ اسٹک، بمقدار وافر استعمال کر رکھی تھی۔ بغیر آستینوں کے بلاؤز اور بڑے بڑے پھولوں والی واش اینڈ ویئر قسم کی ساڑھی میں وہ مجھے اپنے ماضی کا بھوت نظر آئیں۔

''ہیلو آصف۔۔۔ بھئی بیٹھو بیٹھو۔۔۔ ہم تو سوچ رہے تھے کہ تمہیں ڈھونڈ ہی نکالیں گے ایک دن، لیکن اقبال کو تو سوائے شکار کے اور کچھ سوجھتا ہی نہیں۔۔۔ زری۔۔۔ زری ڈارلنگ۔۔۔''

''مجھے ابھی مال پر رانا حمید مل گیا۔ اس سے پتہ چلا کہ اقبال کی تبدیلی ہوگئی ہے۔ بڑی مشکل سے گھر تلاش کیا۔ اس نے تو گلوب سینما کی طرف کوٹھی بتائی تھی۔ آپ لوگ تو صدر بازار کی طرف رہتے ہیں۔''

''رانا حمید وہیں آئے تھے لیکن وہ کوٹھی مجھے پسند نہیں آئی تھی۔ پانی کا پرابلم تھا۔ غسلخانوں میں سے تل چٹے نکلتے تھے رات کے وقت' بڑی سیلن رہا کرتی تھی۔ سارے قالین خراب ہو گئے وہاں۔۔۔ آپ ابھی تک سیف گارڈ انشورنس میں ہی ہیں ناں۔۔۔ زری۔۔۔زری ڈارلنگ۔ یہاں آؤ' انکل آئے ہیں۔''

''جی ہاں۔ ابھی تک تو ان ہی لوگوں کے ساتھ دانہ پانی بندھا ہے۔''

''شادی۔۔۔ ہوگئی کہ ابھی تک؟''

''ابھی تک نہیں۔''

تمہاری می کھڑکی میں جا کھڑی ہوئیں اور تمہیں آواز دینے لگیں۔ تمہاری می ایک زمانے میں بڑی خوبصورت عورتوں میں شمار ہوتی تھیں۔ نمک کی کان تھیں۔ نقشہ اور جسم ایسا تھا کہ سارے میس میں ان کا چرچا ہوتا تھا۔ اب وہ ایک بے جان تودے کی طرح سامنے کھڑی کسی اینگلو انڈین بڑھیا کی طرح تمہیں بلا رہی تھیں۔

تم آ کر پردوں کے پاس رک گئیں۔

''آ جاؤ زری ڈارلنگ۔۔۔ انکل آصف ہیں۔ تم ان سے اپنی Booties پہنا کرتی تھیں۔ پنڈی کے دن بھی خوب تھے۔ ہے نا آصف؟'' می بولیں۔

''جی ہاں۔ ویسی بے تکلفی کا دور پھر میں نے کبھی نہیں دیکھا۔۔۔ یورپ میں بھی نہیں۔''

''کیسا انجوائے کرتے تھے ہم سب۔۔۔ یاد ہے آصف؟ وہ مری کی پکنک یاد ہے تمہیں جس روز زری تقریباً مر ہی چلی تھی۔''

''میری بے وقوفی تھی۔ میں نے تجربے کے طور پر پانی میں اتار دیا تھا۔''

می کھی کھی کر کے ہنسنے لگیں۔

''زری ڈارلنگ۔ انکل کو کافی تو پلاؤ۔ یہ کیا بچوں کی طرح پردہ پکڑ کر کھڑی ہو۔ جاؤ بیٹے!''

تم پھر بھاگ گئیں اور تمہاری می مجھے پرانے دنوں کے واقعات یاد دلانے لگیں۔ ایسے واقعات جو بظاہر ہم دونوں کے لئے بالکل غیر اہم تھے۔

یہ میری تمہاری پہلی ملاقات تھی۔ اسی ملاقات میں کیوپڈ دیوتا نے تمہیں منتخب کر کے

تمہاری دستار بندی کردی۔ تمہارے لئے یہ ملاقات حرز جاں تھی۔ اس ملاقات کو تم نے ہیرے جڑی انگوٹھی کی طرح بار بار پرکھا۔ ہر سمت سے دیکھا۔ قریب سے دور سے' اس کی چمک میں تمہیں دھنک کے سارے رنگ نظر آنے لگے۔ تمہارے لڑکپن کی فصیل میں یہ پہلی دراڑ تھی۔ اس ملاقات کے بعد جب بھی میں تمہاری طرف گیا تمہاری خوشی دیکھ کر مجھے ایکدن بھی شبہات نے نہ گھیرا کیونکہ میں تو تمہیں اپنے ہاتھوں جوتے پہنا چکا تھا۔ تمہیں سائیکل کی سیر کرانا اور تمہاری چوٹیوں میں ربن ڈالنا بقول تمہاری ممی کے ایک زمانے میں میرا محبوب مشغلہ رہا تھا۔ میں تمہاری خوشی کی اصل وجہ کبھی بھی جان نہ پاتا اگر اچانک ایک دن تم سے ڈرامائی ملاقات نہ ہو جاتی۔

اقبال گھر پر نہیں تھا۔ تمہاری ممی اپنی کسی دوست کے ساتھ شاپنگ کو گئی ہوئی تھیں۔ تم اپنی گیتوں کی کاپی لئے اکیلی آتشدان کے پاس بیٹھی تھیں۔

''ڈیڈی کہاں ہیں بے بی؟''

''مرغابیوں کے شکار پر گئے ہیں جی۔۔۔'' تم نے یکدم کاپی کو پشت کی جانب چھپالیا۔

''اور ممی کہاں ہیں بے بی؟''

''آپ مجھے بے بی نہ کہا کریں۔''

''کیوں؟''

تم نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔۔۔'' کیونکہ جی۔۔۔ کیونکہ۔۔۔ بس جی۔۔۔ آپ مجھے بے بی نہ کہا کریں۔''

حکمتِ عملی کے خلاف جو حرکت مجھ سے اس وقت ہوئی وہ نا قابلِ معافی ہے۔ میں نے تمہیں قد آور بچہ سمجھ کر تمہارا بازو پکڑا اور صوفے پر اپنے پاس بٹھالیا۔

پتہ ہے تم بہت تنگ کیا کرتی تھیں پنڈی میں۔" کیا بات ہے زری! تم کانپ کیوں رہی ہو؟"

میرا بازو تمہارے کندھوں کے گرد حمائل تھا اور تم ڈری ہوئی کبوتری کی طرح لرز رہی تھیں۔

''کیا بات ہے زری! بخار تو نہیں کہیں۔۔۔؟'' میں نے انگریزی میں سوال کیا۔

تم خاموش رہیں۔

''تم ٹھیک تو ہو زری؟''

تم نے اٹھنے کی کوشش کی تو تمہارے ہاتھ سے گیتوں کی کاپی پھسل کر قالین پر جا گری۔ دانت نکالے چیتے سے ایک فٹ ادھر۔ میں نے اسے ہرگز کھولنے اور پڑھنے کی نیت سے نہ

اٹھایا تھا۔ لیکن کاپی کچھ اس انداز سے گری کہ پہلے صفحے پر بنا ہوا پان کے پتے جیسا دل جگر جگر چمکتا ہوا نظر آرہا تھا۔ میں نے جھک کر اس دل کو اٹھالیا۔ دل کے وسط میں ایک لمبا سا تیر کھنچا تھا جس سے آنسوؤں کی لڑی ٹوٹ کر صفحے پر بکھری پڑی تھی۔ اوپر انگریزی میں رقم تھا۔۔۔''

الف کے لئے جو نہیں جانتا۔'' ہائی سنتھ کے پھولوں کا حاشیہ۔

تم خوفزدہ کھڑی تھیں اور میں احمق پن سے بار بار پوچھ رہا تھا۔'' یہ الف سے کس کا نام شروع ہوتا ہے زری ڈارلنگ؟''

تم نے منہ پھیر لیا اور آہستہ سے بولیں۔'' اسے نہ دیکھئے پلیز۔۔۔ پلیز''

میں نے صفحوں کو بڑی بے دردی سے الٹنا شروع کر دیا۔'' بے وقوف انکل سے نہیں شرمایا کرتے۔ انکل تو راز دار ہوتے ہیں الٹا۔۔۔ ہم کوئی ممی کو بتائیں گے تھوڑا ہی۔''

تمہاری کجلائی آنکھوں میں آنسوؤں کا ترمرا پھیلنے لگا۔ میں نے اس کو اپنی بے وقوفی سے نہ سمجھا اور کاپی کو بے توجہی سے دیکھنے لگا۔ یہ تو ایک کجلی بن تھا جس میں شرم و حیا والے ہاتھی رہتے تھے۔ دنیا سے چھپ کر محبت کرتے تھے اور اس محبت کو سب سے چھپائے رکھتے تھے۔ سارے گیت انگریزی میں تھے۔ ہر گیت کے اوپر ایک ہی جملہ لکھا تھا۔

'' الف سے مخاطب ہو کر۔''

'' پلیز۔ میری سونگ بک واپس کر دیجئے۔ پلیز۔''

اگر مجھے لمحے بھر کے لئے بھی احساس ہوتا کہ میرا نام الف سے شروع ہوتا ہے تو شاید میں بہت جلد تمہاری کتاب لوٹا کر گھر چل دیتا لیکن میں تو پورے دو سیٹ ٹینس کے کھیل کر آرہا تھا۔ میرا سارا وجود پٹہ کھائی گیند کی طرح کھلنڈرا ہو رہا تھا۔

'' پلیز۔۔۔''

یکدم میری نگاہ ایک صفحے پر رک گئی۔ اوپر بار بار لکھا تھا۔ شاید کبھی۔۔۔ شاید کبھی۔ نیچے کونونٹ مارکہ مخصوص لکھائی میں نظم مرقوم تھی۔

'' الف۔۔۔ شاید کبھی تمہیں میرا خیال آئے
تنہائی میں
شاید جس کا آج تمہیں انتظار ہے وہ بے وفا نکلے
شاید!
تم آہیں بھرو اور دستِ بدعا ہو،
میرے لئے۔۔۔ شاید
کون جانے میں لوٹ کر آ بھی سکوں۔''

نظم نے مجھ سے بسولی مار کر ساری ہوا نکال دی۔

''یہ الف کون ہے زری۔ کون ہے یہ؟''

لیکن تمہارے چہرے پر موٹے موٹے آنسو برس رہے تھے۔ فلمی آنسو نہیں بلکہ وہ آنسو جو بڑی شدت سے حلق میں بھی اترا کرتے ہیں۔

''آئی ایم سوری بے بی ڈارلنگ۔ خدا قسم۔۔۔ لو اپنی سونگ بک۔ یہ لو۔ میں تمہارا راز نہیں جاننا چاہتا۔۔۔ پلیز بے بی!''

میں نے تمہیں چپ کرانے کی نیت سے تمہارا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اگر چانکیہ زندہ ہوتا تو وہ دست بستہ عرض کرتا کہ مہاراج! ایسی کنیا کو سینے سے لگانا حکمتِ عملی کے خلاف ہے۔ یہ سراندیپ کی سروپ نکھا ہے۔ کام دیو کی بانی پر ننگے پیر آنے والی۔ ایس کنیا کی ناک اول تو ہوتی ہی نہیں اور جو باقی رہ بھی جائے تو اسے کاٹ لینا ہی بہتر ہے۔ حکمتِ عملی کی دوسری غلطی کر چکنے کے بعد۔۔ بہت بعد میں مجھے احساس ہوا کہ اگر مجھے الف کا نام نہ معلوم ہوتا تو اس میں ہم دونوں کی بہتری ہوتی۔

اس واقعے کے بعد کئی روز تک میں تمہارے گھر نہ گیا۔ دل میں ایک انجانا سا خوف تھا۔ گو بظاہر اس خوف کی کوئی وجہ نہ تھی۔ تم نے اپنے منہ سے کچھ نہ کہا تھا لیکن میرے دل کے ٹیلی پرنٹر پر مسلسل یہی خبر پہنچ رہی تھی کہ حذر کرو۔۔ بچ جاؤ۔ آگے خطرہ ہے۔ زیرو لائن ہے۔ یہ جگہ بیمہ کمپنی کے مینجر کے لئے بارود خانے سے کم نہیں۔ تمہا Vaccination کارڈ مکمل نہیں حذر کرو۔۔ بچ جاؤ۔

جب سے یہ پرچہ دل کو لگا تھا میں نے چھاؤنی کا رخ کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اچانک ایک دن مجھے دفتر میں اقبال کا فون آ گیا۔

''ابھی اسی وقت گھر پہنچو۔ میں چولستان سے تین چیتل اور دو ہرنوٹے مار کر لایا ہوں۔ ''

میں نے کام کا عذر پیش کرنا چاہا تو میجر نے دھمکی دی۔۔ ''سنو۔ اگر آدھ گھنٹے میں نہ پہنچے تو ہم خود تمہیں لینے آ جائیں گے۔۔ خدا حافظ۔''

پیشتر اس کے کہ میں کوئی معقول بہانہ تراش کر سکتا فون ادھر سے بند ہو گیا۔ میں عجب گھولے میں پڑ گیا۔ نہ تو جانے پر طبیعت آمادہ ہوتی تھی نہ ٹھہرنے کی جا تھی۔ ہموار زندگی میں یہ نیا شاخسانہ پیدا ہو گیا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد جب میں بالآخر وہاں پہنچا تو ممی اور ڈیڈی برآمدے میں بیٹھے تھے۔ حسب عادت اقبال پائپ پی رہا تھا۔ چہرے پر بڑی بشاش مسکراہٹ تھی۔ ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ دھرے اوپر والی ٹانگ بڑے تواتر سے ہلائے جا رہا تھا۔ ممی

کی کرسی سے چند قدم پرے ہرن اور چیتل پڑے تھے اور ان کے پیٹ کو کلوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ممی ایک چھوٹا سا رومال لئے اپنی ناک کریدنے میں مشغول تھیں۔

''ہیلو ینگ مین۔۔۔ کمال ہے ادھر کا چکر ہی نہیں لگاتے۔ تم اچھے دوست ہو۔'' اقبال نے اپنی کرسی سے اچھل کر کہا۔

تمہاری ممی نے پہلے تمہیں آواز دی اور پھر رومال سے کہنی صاف کرتے ہوئے بولیں۔ ''ہم تو تمہارے ہوٹل آ رہے تھے ہرن لے کر۔ پھر اقبال کہنے لگا یہ ہرن اس کے کس کام کا۔ وہ تو ہوٹل میں رہتا ہے۔''

تم باہر آئیں تو میں نے محسوس کیا کہ تمہارا چہرہ ہسپانوی لیموں کی طرح زرد ہو چکا تھا۔ سرخ ربن' فلیٹ بوٹ اور یونیفارم کے باوجود تمہاری آنکھیں باب المندب بن چکی ہیں۔ تم میں ایک ایسی بیاہی ہوئی عورت کا سروپ تھا جس کا شوہر اسے پہلی رات ہی چھوڑ گیا ہو۔

''زری نہایت اعلیٰ کباب بناتی ہے آصف۔۔۔ انکل کو سلام کرو زری ڈارلنگ۔''

تم مقدس کبوتر جیسا سفید ہاتھ اٹھا کر پیشانی کی طرف لے گئیں۔

''یہ تو آپ کو بہت یاد کرتی ہے آصف۔ ابھی کل ہی کہہ رہی تھی اب تو انکل کبھی آتے ہی نہیں۔ میں نے جواب دیا تمہارے ڈیڈی چولستان گئے ہیں۔ وہ بھلا کس سے ملنے آئیں۔''

میں نے تمہاری جانب دیکھا۔ تمہارے ہونٹوں میں ضبط کئے ہوئے آنسوؤں کی کپکپاہٹ تھی۔ آنکھوں میں بے رخی اور اپنی کم نصیبی کا گلہ تھا۔ ان آنکھوں میں ایک پوری داستان تھی۔ شہر پومپیائی کی تباہی کی داستان۔ میں نے اس کی عبرانی زبان بظاہر سمجھتے ہوئے کہا۔ ''زری تو ہم سے بولتی ہی نہیں۔ ہم کس سے ملنے آئیں بھلا؟''

اپنے غلط جواب پر پشیمان ہو کر میں نے فوراً ہی باتوں کا رخ پلٹ دیا۔۔۔ ''اچھا یہ بتاؤ کہاں کہاں شکار کرنے گئے؟''

''پہلے تو گئے بہاولپور۔۔۔ وہاں نواب صاحب کے مقربین میں سے ایک حضرت ساتھ تھے۔ بڑا آسائشی شکار کھیلا' بالکل پرنس آف ویلز بن کر۔ شکار کم اور ضیافتیں زیادہ ہوئیں۔ پھر چار دن چولستان میں رہے۔۔۔ ونڈر فل۔۔۔ سمندر۔۔۔ پہاڑ۔۔۔ اور ریگستان یہ تینوں اللہ نے اس لئے بنائے ہیں کہ جب انسان زیادہ اترانے لگے تو انہیں دیکھ کر اپنی اصلیت کو پہچانے۔''

''کافی پئیں گے آپ؟'' ممی نے سوال کیا۔

اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر زری کو آرڈر لگایا ''جاؤ زری۔ انکل کے لئے کافی لاؤ۔ چیز اور ویفرز بھی لانا۔''

اقبال اپنی ترنگ میں بولتا گیا۔'' یار چولستان خوبصورت ہے، بہت ہی خوبصورت۔ خاص کر چاندنی میں۔ لیکن وہ سندر بن والی بات کہاں۔''

تمہاری ممی نے گہرے فیروزی رنگ کا پلو کندھے پر گھسیٹ کر کہا۔'' توبہ توبہ۔ میمن سنگھ میں یہ اس قدر خوش تھے آصف کہ کیا بتاؤں۔ صبح صبح آدھی درجن کیلے کھاتے۔ رات کو دو چار اناس اور شام کے وقت کچے ڈاب۔ ان کا بس چلتا تو کبھی لوٹ کر مغربی پاکستان نہ آتے۔''

'' میری زندگی کے چار بہترین سال میمن سنگھ میں گزرے ہیں۔ وہ شکار ہے وہاں یار' وہ شکار ہے کہ انسان شکار Afford ہی نہیں کر سکتا۔ کارتوس ختم ہو جاتے ہیں لیکن شکار ختم نہیں ہوتا۔ میلوں پھیلا سبزہ' جھیلیں' بجرے۔۔۔ کوئی بیوٹی ہے' کوئی وائلڈ لائف ہے مائی گاڈ۔۔۔ ونڈرفل۔۔۔ ونڈرفل۔۔۔ لیکن یہ تمہاری بھابھی بہت بور ہوئیں وہاں۔''

تمہاری سانولی ممی نے فوراً کہا۔'' توبہ میرا تو رنگ سنولا گیا تھا وہاں۔ سال دو اور ہوتی تو بالکل کالی ہو جاتی۔''

'' میں تو ریٹائر ہو کر وہیں چلا جاؤں گا یا کھلنا میں کاٹج بنا لوں گا یا چندر گونا میں جھونپڑی ڈال لوں گا۔۔۔ میمن سنگھ اب Sophisticated ہو چلا ہے۔''

'' چاٹگام بہتر ہے۔''۔۔۔ ممی بولیں۔۔۔ '' ہم لوگ بھی چھٹیوں میں آ جایا کریں گے۔''

'' کہیں بھی ہو۔ رہوں گا مشرقی پاکستان میں۔ یار آصف۔ اس قدر سادہ زندگی ہے ان لوگوں کی۔ ایسی سادہ زندگی کہ انسان عبرت پکڑتا ہے۔ ہر گھر کے آگے ایک پول بھی ہوتا ہے چھوٹا سا۔ سارا خاندان اس میں تین چار بار نہاتا ہے۔ باتھ روم کا خرچ صفر۔ بارہ روپے کی فرسٹ کلاس دھوتی آتی ہے۔۔۔ ایک پہن لی ایک دھو لی۔ پیروں میں کھڑاویں' سونے کو سیتل پائی۔ کھانے کو مچھلی بھات۔ نہ انہیں کوئی کراکری چاہئے نہ قالین درکار ہیں۔ نہ الیکٹرک گڈز۔ سبحان اللہ کیا زندگی ہے۔ شیر کی طرح آزاد پھرتے ہیں بنوں میں۔''

'' توبہ بس بھی کیجئے۔ بہشت کا نمونہ ہی بنا دیا مشرقی پاکستان کو۔''

'' بس کیسے کروں۔ جس نے ایک بار ڈابھ پی لی اس نے سوم رس پی لیا۔ یار آصف! کیا لذت ہے کچے ناریل میں۔ سبحان اللہ۔ ونڈرفل۔ کبھی گئے ہو مشرقی پاکستان؟''

'' جاتا ہی رہتا ہوں۔''

'' پھر' کیسی جگہ ہے؟''

'' تفریح کے لئے نہایت اعلیٰ ہے۔''

'' بالکل ٹھیک۔ بالکل ٹھیک۔۔۔'' ممی چہکی۔

''تم لوگ جنت میں بھی صرف تفریح کے لئے جاؤ گی۔'' اقبال نے کہا۔

اتنے میں تم کافی لے کر آ گئیں۔ اخروٹ کی لکڑی کے بڑے ٹرے میں۔ تم میرے پاس بیٹھ کر کافی بنانے لگیں۔ جب بھی تم میری طرف نگاہ کرتیں تو مجھ تکلے کے سب بل نکل جاتے۔ مجھے سلسلہ کلام جوڑنا مشکل ہو جاتا۔ کوئی چیز مجھے اندر ہی اندر سمجھا رہی تھی کہ مجھے جلد گھر جانا چاہئے لیکن اقبال ہر قسم کے کارتوس' بندوقوں کی قسمیں' مچان باندھنے کے طریقے' جانوروں کی شکار سے بچنے کی گھاتیں' آدھی رات پچھلے پہر اور دوپہر کے شکار کے فوائد اور نقصانات پر سیر حاصل بحث کرتا رہا۔ یک طرفہ بحث جس میں میری شمولیت برائے نام اور تمہاری ممی براہ راست شامل رہیں۔ تم کونے میں کتابیں لئے بیٹھی رہیں۔ گو کئی بار تمہاری ممی نے تمہیں سو جانے کو کہا لیکن تم نے سنی ان سنی کر دی۔

عجب بات ہے مجھے تمہارے دلی جذبات کا اندازہ ہو چکا تھا۔ پھر بھی میں اپنے آپ کو سمجھا رہا تھا کہ یہ میری خودستائی ہے۔ کبھی اس قدر پیاری بچی کو عشق ہو سکتا ہے۔ یہ سب کنچوں کی جھٹل کھیل ہے کہ بازی ہار جانے پر کھلاڑی اپنے اپنے کنچے واپس لے کر ہنسی خوشی اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے۔۔۔ مجھ انکل نما انسان سے ایسی محبت۔۔۔ اور پھر وہ بھی اتنی کم عمر معصوم لڑکی کرے۔ توبہ توبہ!

اس روز کے بعد میں نے دل ہی دل میں عہد کر لیا کہ جو کچھ بھی ہو گا میں تمہارے گھر نہیں جاؤں گا۔ لیکن ایک انشورنس کے سلسلے میں مجھے ایک ایسے گھر جانا پڑا جہاں میرے عزم کو توڑنے والی تمہاری ممی موجود تھیں۔ انہوں نے میرے عذر کو پس پشت ڈال دیا اور مجھے اپنے ساتھ لے گئیں۔ آخری بات جو انہوں نے کی اس کے بعد انکار کی گنجائش نہ تھی۔ وہ بولیں!'' میرے پاس گاڑی نہیں ہے۔ صرف مجھے گھر پہنچا آؤ۔ اترنا نہ اترنا تمہاری مرضی۔۔۔''

اور جس وقت میں نے کار پورچ میں کھڑی کی وہ فٹ سے اتریں اور اقبال کو فون کرنے چلی گئیں۔ میرا ارادہ اندر جانے کا نہیں تھا۔ میں صرف تمہاری ممی کو تکلفاً خدا حافظ کہنے کے لئے رک گیا۔ لان کے ایک گوشے میں رنگین نواڑ سے بنی ہوئی کرسیاں پڑی تھیں۔ میز پر تمہاری کتابیں تھیں جن سے ظاہر ہوتا تھا جیسے تم ابھی پڑھتی اٹھ کر گئی ہو۔ میں وقت کٹی کے طور پر ان کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ تمہاری انگریزی کی لکھائی اچھی تھی لیکن اردو کے حرف ناپختہ اور بچگانہ تھے۔ رف کاپی میں ایک مضمون بہار پر' ایک رخصتی کی عرضی اور چھوٹے پیروں کو اختصار سے لکھنے کی مشق کی گئی تھی۔ جا بجا میرا نام لکھ کر اس طرح پنسل سے کاٹا گیا تھا کہ بمشکل پڑھا جاتا۔ میرا دل خوف سے لرزنے لگا۔ آسمان پر جیٹ طیارے زناٹے سے گزرتے ہوں تو گھر کی کمزور کھڑکیاں دروازے اسی طرح لرزا کرتے ہیں۔ اسی کاپی کے آخری صفحے کو

پنسل سے کاٹ کاٹ کر سیاہ کیا ہوا تھا۔ میرے دل نے گوشالی کی لیکن تجسس نے حرف کو شناخت کئے بغیر نہ چھوڑا۔ صفحے کے ایک کونے میں حروف ابھی اچھی طرح مٹائے نہ گئے تھے۔ اوپر میرا نام لکھا ہوا تھا۔ نیچے تمہارے نام کے انگریزی میں ہجے کئے گئے تھے جو حروف دونوں ناموں میں موجود تھے انہیں بعدازاں کاٹ کر محبت اور نفرت کا پڑتا لگایا گیا تھا۔ اس عمل سے ظاہر ہوتا تھا کہ تمہیں مجھ سے محبت اور مجھے تم سے نفرت ہے۔ تم نے یہ نتیجہ بدلنے کے لئے سارا صفحہ سیاہ کر دیا تھا۔۔۔ میں تمہیں کیا سمجھاتا زری کہ جب نصیب کا ہارا ڈوب جاتا ہے تو کوئی عمل کام نہیں آتا۔۔۔ میں تمہیں کیا بتاتا کہ محبت تو امر بیل ہے۔۔۔ جس درخت پر یہ چڑھ جاتی ہے وہ پیڑ سوکھ جاتا ہے اور درخت ایک دن آپ ہی آپ گر جاتا ہے۔۔۔ میں تمہیں کیا سمجھاتا کہ محبت کی امر بیل میں کبھی کسی قسم کے پھول نہیں لگتے۔ اس بیل میں تو ہمیشہ ہائی سنتھ کے شگوفے کھلتے ہیں۔۔۔ پشیمانی کے ارغوانی پھول۔۔۔ تاسف کے آسمانی پھول۔

میں تم سے ملے بغیر تمہاری ممی کو فون کرتا چھوڑ کر فوراً ہی چلا گیا۔ کئی گھنٹے ہوٹل کے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں کروٹیں بدلنے کے باوجود مجھے ٹھنڈے پسینے آتے رہے۔ کٹے ہوئے حروف۔۔۔ ایل او وی ای سے بھری ہوئی کاپی۔ ذرا سی برآمدے میں آہٹ ہوتی تو میں چونکیل جانور کی طرح اٹھ بیٹھتا اور آہٹ پر کان دھر کر سوچتا کہیں یہ زری نہ ہو۔۔۔ کہیں اس کے دماغ کی ڈھبریاں اس قدر ڈھیلی نہ پڑ گئی ہوں کہ وہ یہاں تک آ گئی ہو۔ پھر جی کو تسلی دیتا کہ اول تو وہ میرے ہوٹل کا رستہ نہیں جانتی ہوگی اور پھر اتنی چھوٹی عمر میں اتنی جرات کہاں سے آ جائے گی۔ مجھے بھی ہالی وڈ کا کوئی ایکٹر سمجھ کر محبت کرنے بیٹھ گئی ہے۔ چند روز ملیریا یا بخار جیسی تھرتھری چھوٹے گی۔ پھر آپ ہی آپ ٹھنڈا نارمل پڑ جائے گا۔

اب میں نے پھر پکا عہد کر لیا تھا کہ تمہارے گھر کسی قیمت پر بھی نہ جاؤں گا۔ اور تو اور میں یہاں تک سوچنے لگا تھا کہ اپنی تبدیلی کہہ سن کر کراچی کروالوں تا کہ اس دھبدھا سے جان چھوٹ جائے۔۔۔!

اس شام میں نہا کر غسلخانے سے نکلا تو مجھے برآمدے میں چوڑیوں کے چھناکے کی آواز آئی۔ پھر یوں لگا کہ کسی نے میرے کمرے کا کنڈا کھولنے کی کوشش کی ہو۔ میں نے کنوتیاں اٹھا کر پوچھا۔ ''کون ہے؟''

ابھی میں قمیض پہن ہی رہا تھا کہ تم دروازہ کھول کر اندر آ گئیں۔ میں کلرزدہ زمین کی طرح سفید پڑ گیا۔

سینے پر وہی دو چوٹیاں اور چوٹیوں کے سروں پر سرخ گڑھل کے پھول، لٹھے کی سفید سفید شلوار قمیض اور کندھوں پر سفید دوپٹہ۔۔۔ ہاں ایک بات خلاف معمول تھی۔ تمہارے دونوں

ہاتھوں میں آج کالی چوڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

''زری۔۔۔ہیلو بے بی! تم یہاں کیسے؟''

لمحہ بھر کو مجھے وہم ہوا کہ شاید تمہارے والدین نیچے کھڑے ہوں اور انہوں نے محض چونکانے کی خاطر پہلے تمہیں بھیج دیا ہو۔ میں اس وہم پر بھروسہ کر کے جلدی سے برآمدے تک گیا اور نیچے جھانکنے لگا۔ ایک بھڑ سی زرد اور سیاہ ٹیکسی پھاٹک سے نکل رہی تھی۔ لان' پورچ اور پکی سڑک تک تمہارے والدین جیسا کوئی بھی موجود نہ تھا۔ میں ڈرتے ڈرتے واپس آیا ور پہلی بار میں نے تمہارے چہرے کی طرف دیکھنے کی جرات کی۔ تمہاری آنکھیں زیادہ رو لینے کے باعث سرخ ہو رہی تھیں۔ ہونٹ اور ناک کی پھننگ یاقوت رنگ کی تھی اور تم چھوٹے سے رومال کی لگدی بنا رہی تھیں۔

''کیا بات ہے زری؟ ممی ڈیڈی کہاں ہیں؟''

تم چپ چاپ کھڑی رومال کا گولا بنانے میں مصروف رہیں۔

''بات کیا ہے۔ کچھ بولو ناں۔۔۔؟'' میں نے انگریزی میں سوال کیا۔

''میں اکیلی آئی ہوں جی۔۔۔''

زن سے سارا ہوٹل میرے پیروں تلے سے نکل گیا۔

''کیوں۔۔۔کیوں بیٹے؟''

میں لفظ بیٹے کا قفل ڈال کر تمہارے جذباتی وجود کو مقید کرنا چاہتا تھا لیکن اس کا اثر الٹا ہوا۔ آنسوؤں کی چمک پھر سے آنکھوں میں پیدا ہو گئی اور تم نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔۔۔

''آپ مجھ سے ناراض ہیں جی!''

''نہیں نہیں نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں۔۔۔ توبہ۔ ہرگز نہیں۔۔۔ یہ خیال تمہیں کیسے آیا؟ کبھی انکل بھی ناراض ہوتے ہیں؟''

''بحرِ رمل میں ایک سے وزن کے آنسو تمہارے گالوں پر بہنے لگے۔

''پھر جی آپ ہمارے گھر کیوں نہیں آتے؟''

''آؤں گا۔۔۔بھئی ضرور آؤں گا۔ انشاءاللہ۔''

تم نے رومال کا گیند کھولا اور اسے ہونٹوں پر رکھ کر بولیں۔ ''میں تو سمجھی تھی کہ آپ کبھی نہیں آئیں گے۔''

''چلو بے بی۔۔۔ چلو میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔ کم آن ڈارلنگ۔''

تم دو قدم پیچھے ہٹ کر بولیں۔ ''آپ مجھے ڈارلنگ نہ کہا کریں۔ ڈیڈی کی طرح۔''

میں نے کار کی چابی میز پر سے اٹھائی اور تحکمانہ لہجے میں بولا۔ ''چلو گھر چلیں۔''

''میں اکیلی چلی جاؤں گی میری سہیلی گیٹ پر کھڑی ہے۔ میں اس کے ساتھ جاؤں گی۔''

یکدم مجھے احساس ہوا کہ پہلی بار جھجک مٹ جانے پر شاید تم دوبارہ سہ بارہ اور پھر تواتر سے یہاں آنے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہ کرو۔ یوں تن تنہا ہوٹل کے ایک بیچلر روم میں آنا میرے ان سفارتی مراسم کو تباہ کرسکتا تھا جو میرے تمہارے خاندان سے تھے۔ میں تمہیں بدنامی سے اپنے آپ سے اور سب سے زیادہ تمہارے اپنے نوشگفتہ ضمیر کی زدوکوب سے بچانا چاہتا تھا۔

''بے بی اگر تم مجھ سے ایک وعدہ کرو تو پھر میں تمہارے گھر آؤں گا۔''

مجھے علم تھا کہ اس عمر میں وعدے کا بڑا پاس ہوا کرتا ہے۔

''جی؟۔۔۔ضرور۔۔۔!''

''تم یہاں کبھی نہیں آؤ گی...... کبھی نہیں سمجھیں۔''

تم نے آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ''کیوں جی؟''

''اس لئے کہ...... کہ میں تمہارا یہاں آنا پسند نہیں کرتا۔ اس لئے کہ تمہارے ڈیڈی کو اگر علم ہوگیا تو وہ بھی ناخوش ہوں گے۔'' تم نے لب کاٹا اور نظریں جھکا لیں۔

''دیکھو زری۔ ابھی تم بہت چھوٹی ہو۔ ان باتوں کو نہیں سمجھتیں۔ تمہیں میری بات ماننا ہو گی۔''

''جی مانوں گی۔''

تم نے اثبات میں سر ہلایا اور اس غیر مشروط وعدے پر تمہارے لبوں نے ایک ہلکی سی سسکی سے مہر لگا دی۔

اس واقعے کے بعد میں مہینے میں ایک آدھ بار تمہارے گھر جانے لگا لیکن کچھ اس التزام سے کہ تمہیں مجھ سے بات کرنے کا ایک لمحہ نہ ملتا۔ میں تمہارے پہنچنے سے پہلے اقبال کو فون کرتا اور اگر وہ گھر پر موجود نہ ہوتا تو پھر میں ادھر کا قصد بھی نہ کرتا۔ جتنی دیر تک اقبال گھر پر ٹھہرتا میں بھی قیام کرتا۔ اگر اسے کہیں جانا ہوتا تو میں بھی فوراً اٹھ جاتا۔ اس احتیاط کی کچھ وجہ تو تمہارا تحفظ تھا اور کچھ اس داخل خارج مقدمے میں مہ رخ کا نزول بھی ہو چکا تھا اس لئے میں تمہارے قرب کا متمنی نہ ہوسکا۔

میرے لئے مہ رخ بڑی منحوس صورت اور سبز قدم ثابت ہوئی۔ اس سے ملاقات کے وقت مجھے یہ علم نہ ہوسکا کہ وہ اس طرح میری عنانِ حکومت سنبھال کر میری خوشیوں کے راہوار پر سوار ہو جائے گی۔ مہ رخ کا اصلی نام امتل الحفیظ اور قلمی نام مہ رخ تھا۔ وہ ایک مشہور اخبار

میں عورتوں کا کالم لکھتی تھی۔ اس کالم کے اوپر روز مہ رخ کی تصویر بھی چھپتی تھی اور اسی تصویر کے باعث میں نے اسے پہچان بھی لیا تھا۔ گو تصویر میں جو خیرگی تھی وہ اس کی اصلی صورت میں موجود نہ تھی پھر بھی مجھ پر اس صورت کا اثر ہوتا تھا ہو کر رہا۔

مہ رخ سے میری ملاقات شالیمار میں ہوئی تھی۔ اکابرینِ شہر چین کے صدر لیوشاؤچی کو ایک نظر قریب سے دیکھنے کے لئے اس جی داری سے ٹوٹ کر آئے تھے کہ کار پارک کرنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ عورتیں پھولوں کی پتیاں پلاسٹک کے لفافوں میں لئے روش کے کنارے بھڑی کھڑی تھیں۔ اس نسوانی دیوارِ چین میں جگہ بنا کر آگے بڑھنا قریب قریب ناممکن تھا۔ میں بھی انچ انچ کھسکتا بڑھ رہا تھا کہ میری نظر مہ رخ پر پڑی۔ پہلی نظر میں ہی میں نے اس کالم نگار خاتون کو پہچان لیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبی ڈائری اور پنسل تھی۔ وہ اچک اچک کر بیقراری سے ادھر ادھر چکر لگا رہی تھی۔ اسی بیقراری کے عالم میں وہ گھستی گھساتی لوگوں میں جگہ بناتی مجھ تک آ پہنچی۔ اب اس سے نانک چندی اینٹوں کی روش تین فٹ کے فاصلے پر تھی اور وہ آسانی سے صدر لیوشاؤچی کے درشن کر سکتی تھی۔ میں نے قرونِ وسطیٰ کے جانبازوں کی طرح اس کے لئے جگہ چھوڑتے ہوئے پوچھا۔

''محترمہ! آپ مہ رخ ہیں ناں؟''

''جی۔۔۔''

''آپ خواتین کا صفحہ لکھتی ہیں۔۔۔ میرا قیاس درست ہے کیا؟''

دل میں وہ اپنی شہرت پر بہت خوش ہوئی لیکن بظاہر چڑ کر بولی۔ ''آپ کیوں پوچھتے ہیں؟''

''اس لئے کہ اگر واقعی آپ مہ رخ ہی ہیں تو میں آپ کی مدد کروں گا۔ آپ کا کالم بہت دلچسپ ہوتا ہے اور اسے مرد زیادہ شوق سے پڑھتے ہیں۔''

مہ رخ کا نام سن کر چند لڑکیوں نے پلٹ کر دیکھا۔ آپس میں نوٹس ملانے اور کھسر پھسر کرنے لگیں۔ میری تعریف کا خاطر خواہ اثر ہوا اور مہ رخ سے تناؤ کی کیفیت جاتی رہی۔ وہ ہنس کر بولی۔ ''واقعی۔۔۔''

یہ ہنسی میرے حق میں بڑی ناانصاف ثابت ہوئی۔ میں نے ایک ہی وار میں سارے ہتھیار ڈال دیئے اور دل کے قلعے کی تمام چابیاں اسے نذر کر دیں۔

''ادھر آ جایئے میرے سامنے۔ یہاں سے آپ بہتر دیکھ سکیں گی۔''

وہ مجھ سے چھ انچ آگے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اب اس کے بالوں کی گندھک آمیز خوشبودار بغیر آستیوں کی قمیض سے اٹھنے والی جسم کی گرمی مجھ تک بلا روک ٹوک پہنچنے لگی۔ اس

نے کوئی نا معلوم فرانسیسی سینٹ استعمال کر رکھا تھا لیکن اس سینٹ پر لائف بوائے سے دھلے ہوئے جسم کی خوشبو غالب تھی۔

''دراصل آج میں دفتر والوں کے ساتھ نہیں آئی ورنہ مجھے اتنی تکلیف نہ ہوتی۔ وہ سامنے جو آدمی بیٹھا ہے ناں...... وہ رنگین چھتریوں کے تلے...... پریس گیلری میں، وہ ہمارا سب ایڈیٹر ہے لیکن میں اسے بلانا نہیں چاہتی۔" یہ بات اس نے یک رخی ہو کر کی اور پھر جیسے اپنے آپ سے بولی۔ "اللہ جانے اگر ظفر نہ ملا تو پھر میں واپس گھر کیسے پہنچوں گی؟''

اس کے آخری جملے پر ذہن میں پلان بناتے ہوئے میں نے کہا۔ ''میں سیف گارڈ انشورنس کا زونل مینجر ہوں۔ آصف تنویر۔''

''میرا اصلی نام امتل الحفیظ ہے۔ سلام علیکم۔۔۔'

''اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں آپ کو گھر پہنچا آؤں گا۔''

میری شوخ چشمی کا جواب اس نے بڑی بے رخی سے دیا۔ ''جی نہیں۔ شکریہ۔ یہاں ضرور کوئی نہ کوئی واقف مل جائے گا۔''

لیکن عجیب اتفاق ہے کہ مہ رخ کو اس بھرے مجمع میں ایک بھی واقف شخص نہ ملا جو اسے گھر لے جاتا اور بالآخر جب وہ شام گئے میری کار میں بیٹھی تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ میرے ساتھ دفتر تک جائے گی اور وہاں سے تھوڑی دیر بعد اکیلی بس پر گھر چلی جائے گی۔ میں نے کسی قسم کی حجت بازی نہ کی کیونکہ میرے لئے یہ بھی بارانِ رحمت سے کم نہ تھا۔

مہ رخ بڑی چمکدار گفتگو کرتی تھی۔ ٹکسال سے نکلے ہوئے چمکدار سکوں کی طرح۔ اس گفتگو میں دلآویز مسکراہٹوں اور کھنک دار قہقہوں کی چیپیاں لگا کر وہ نفسِ مضمون کو بڑا معنی اور دلچسپ بنا دیتی تھی۔ حالانکہ نہ تو اس کی تحریر میں ذہانت تھی اور نہ ہی اس کی کھوپڑی میں فطرت نے معمول سے زیادہ مغز بھرا تھا۔ ایک عام سی سادہ لڑکی جو حسنِ اتفاق سے کالم لکھنے پر مامور ہو گئی تھی۔ اس کالم لکھنے نے اس کی شخصیت میں ایک قسم کا وقار پیدا کر دیا تھا جیسے کوئی چھوٹے قد کی عورت ایڑی والی جوتی پہن کر خود اعتمادی محسوس کرتی ہے اسی طرح خواتین کا کالم لکھ کر مہ رخ مردوں سے بے تکلف بات کرنے میں، گفتگو کا دھار موڑنے میں، برجستہ جواب کو احمق پن کی دلیل بنانے اور خواتین کی سائیکولوجی پر سیر حاصل بحث کرنے کے قابل ہو گئی تھی۔ عورتوں کے مسائل کی وکالت کرتے ہوئے اس کی نظروں میں مردوں کی ذات بالکل بے وقعت ہو کر رہ جاتی۔ جب وہ باتیں کرتی تو اس کی باتوں میں قندھاری انار کا کھٹا میٹھا مزہ اور رنگ ہوتا۔ عجیب سی بات ہے کہ سارے دفتر میں اس گفتگو کا کوئی شیدائی نہ تھا اور سب اسے ایک Pushing لڑکی سمجھتے۔

مہ رخ سے ملاقات ہونے کے بعد میں تو اتر سے تمہارے گھر جانے لگا۔ تم کو دیکھ کر اب مجھ پر مراتی کیفیت طاری نہ ہوتی تھی۔ میں تم سے، تمہارے جذبے سے خوفزدہ نہ رہا۔ میں نے اپنے جملہ حقوق مہ رخ کے نام محفوظ کر کے اپنے آپ کو نظرِ بد سے بچانے کا اہتمام لکھوا لیا تھا۔ تمہارے لئے شاید یہی بہت تھا کہ میں نے تمہارے گھر کو یاد تو رکھا۔ کیونکہ نہ تو تم نے مجھے کبھی بلانے کی کوشش کی اور نہ کبھی مجھے اکیلا پا کر میرے پاس ہی آئیں۔ بس مجھے دیکھ کر تم میں اتنی تبدیلی آتی کہ تمہارا چہرہ دمکنے لگتا۔ جیسے سرِ شام برف آلود چوٹیوں پر شفق کی روشنی پڑ رہی ہو۔ کانسی کے گلدان میں سرخ گلابوں کا عکس پڑ رہا ہو، جیسے کوئی بچہ ہتھیلی میں ٹارچ جلا کر اپنی انگلیوں کی نارنجی روشنی دیکھنے لگے۔ تمہاری ہسپانوی لیموں جیسی جلد پر اتنی سرخی کا عود کر آنا بذاتِ خود ایک بہت بڑی علامت تھی لیکن میرے لئے یہ علامت اپنا مطلب کھو چکی تھی۔

مہ رخ سے شالیمار میں ملنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ اتنے برس اتنے قرن میں ایک تیر کی مانند گھومتا رہا ہوں۔ ایک ایسا تیر جس کا ہدف کھو گیا ہو۔ میری ساری زندگی آبشاری تھی۔ شور و غوغا سے پر۔۔۔ بہت ساری عورتیں میری زندگی میں سمندر کے جھاگ کی طرح آئیں اور چلی گئیں۔ مجھ سے ان کا رشتہ سطحی تھا۔ ان عورتوں کی محبت میں جانبین کی کوئی ذمہ داری نہ تھی۔ نہ ذہنی، نہ جسمانی۔ وہ مجھے اور میں انہیں کھیل کود کے شریک سمجھ کر علیحدہ ہوئے تھے۔ کسی سے بھی بچھڑ کر مجھے پامالی، مکمل خستہ حالی کا دورہ نہ پڑا تھا۔ نہ میں نے کبھی شیو بڑھائی نہ خواب آور گولیاں کھائیں اور نہ کبھی دل بہلانے کے لئے شہر چھوڑا۔ لیکن جونہی مہ رخ کار سے اتری مجھے یوں محسوس ہوا کہ اب میں زندہ نہ بچوں گا۔ اس کی شکل دل پر کندہ ہو گئی تھی۔ اس کی آواز، اس کے قہقہے، اس کی مہک دل کو تھامے بیٹھی تھی ورنہ میں تو شاید اسی روز کچھ کر بیٹھتا۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ دمے کے مریض کی طرح میرا سانس اکھڑ رہا ہے۔ میری ٹانگیں کمزور پڑ چکی ہیں اور میں / وہ رہا جواب تک تھا۔ مجھ میں حضرت عیسٰے جیسی انکساری۔۔۔ کچھوے جیسی سخت جانی۔۔۔ فاختہ جیسی ناعاقبت اندیشی اور نہ جانے کیا کیا خاصیتیں پیدا ہوئی جا رہی ہیں۔ میں ان چند گھنٹوں میں بہت زیادہ بڑھ گیا تھا یا بہت زیادہ گھٹ گیا تھا۔ کوئی ایسی قوت تھی جو میرے ماضی کو ربڑ سے مٹا رہی تھی۔ میں ساری رات جاگتا رہا۔ میں نے کئی درجن سگرٹیں پھونک ڈالیں۔ کئی بار مسہری لگائی، اندر لیٹا۔ پھر ہڑبڑا کر باہر نکلا۔ مسہری اوپر چڑھائی اور پھرنے لگا۔ کوئی صاحبِ عصا ایسا تھا جو اونگھ سے جگاتا اور مہ رخ کے خیالوں میں غلطاں کر دیتا۔

میں بے خواب آنکھیں، بوجھل سر اور اڑا اڑا سا چہرہ لئے دوسرے دن مہ رخ کے دفتر پہنچا۔ وہ ہاتھ میں پنسل اور ڈائری لئے ایک عینک پوش آدمی سے چتر چتر باتیں کر رہی تھی۔ اس نے رتی بھر میرا نوٹس نہ لیا۔

''مجھے آپ سے کچھ کام تھا۔۔۔''

مہ رخ نے مجھے پہچاننے سے قطعی طور پر انکار کرتے ہوئے کہا۔ ''فرمایئے۔''

''آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟''

''جی نہیں۔ میں نے پہچان لیا ہے۔ آپ سیف گارڈ انشورنس کمپنی کے زونل منیجر ہیں' تنویر آصف صاحب۔۔۔ فرمایئے۔''

عینک والے شخص کی باچھیں خواہ مخواہ کھل گئیں اور وہ بڑے اخلاق سے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔۔۔ ''ظفر۔۔۔ میں یہاں فوٹوگرافر ہوں۔''

تو یہ ظفر تھا۔ منخنی سا فوٹوگرافر۔ چھوٹی سی فرانسیسی داڑھی اور انتہائی چست ٹیڈی پتلون میں ملبوس ظفر!۔۔۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کی ظفرمندی کے آثار نہ تھے بلکہ یوں لگتا تھا جیسے وہ عادتاً یا مصلحتاً بھوکا رہنے کی عادی ہو۔ میں نے اس سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ ''آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔'' میں نے ازراہِ تکلف کہا۔ ''بہت جلد آپ نے نے یہ بات کہہ دی ہے۔۔۔'' فوٹوگرافر نے انگریزی میں کہا۔ یہ بات مہ رخ کے قہقہہ کا باعث ہوئی۔ میرے منہ پر تالا پڑ گیا۔

مہ رخ دیر تک ہنستی رہی اور وہ نیم مسخرہ' نیم فلاسفر' دبلا پتلا ہاتھ ہلاتا ہلاتا چینی چوپ سٹکوں کی طرح ٹانگیں ہلاتا اندر چلا گیا۔

میں ذاتی طور پر کسی کو انشورنس کے لئے نہ کہتا تھا۔ یہ کام میرے فرائض میں شامل نہیں۔ لیکن اس وقت مہ رخ سے اس سے بہتر تقریب ملاقات کا بہانہ بھی تو نہ تھا۔ میں نے کاروباری لہجہ میں کہا۔ ''میں حاضر ہوا تھا کہ آپ سے انشورنس کے لئے کہوں۔ سیف گارڈ انشورنس کمپنی کم سے کم پریمیم پر زیادہ سے زیادہ روپیہ ادا کرتی ہے۔''

مہ رخ کچھ طیش میں آ گئی۔ پہلا ہی وار اوچھا پڑا۔ ''اسی لئے تو میں انشورنس والوں سے گھبراتی ہوں۔ ذرا سی ملاقات بھی ہو تو فوراً انشور ہونے کو کہیں گے۔''

عجیب سی بات اسی لمحے ہوئی۔ جونہی اسے غصہ آیا میری ہمت عود کر آئی۔ ممکن ہے یہ ان سالوں کی ریاضت اور صبر کا نتیجہ تھا جب میں لوگوں کو انشور کرنے نکلا کرتا تھا۔۔۔ وہ بھی ٹیلیفون ڈائریکٹری میں سے ایڈریس دیکھ کر۔ اب مجھے حالات کے خاطر خواہ ہونے کا احساس ہونے لگا۔

''ہماری کمپنی عورتوں کی انشورنس نہیں کرتی۔ لیکن میں آپ کو بہت اچھی ٹرمز پر انشورنس دلوا دوں گا۔ پریمیم بھی کم دینا ہوگا اور۔۔۔'

''دیکھئے۔ میں انشورنس کروا چکی ہوں۔۔۔ تھینک یو۔''

اب مجھے حجت بازی میں مزہ آنے لگا۔

''دیکھیے فی زمانہ انسان جتنی بھی انشورنس کروائے کم ہے۔ زندگی کے Risks بہت بڑھ چکے ہیں مس مہ رخ۔''

''آصف صاحب۔ میں ایک ڈیلی اخبار میں کام کرتی ہوں۔ میرا وقت بہت قیمتی ہے پلیز۔۔۔''

''محترمہ مہ رخ صاحبہ! اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ ایسے قیمتی وقت اور ایسی گرانمایہ شخصیت کے تحفظ کی اشد ضرورت ہے۔''

جوں جوں اسے غصہ چڑھ رہا تھا میری کمزوری میں کمی واقع ہو رہی تھی۔ میں بھولتا جا رہا تھا کہ میں اچانک اس لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو چکا ہوں۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ میرا نام امتل الحفیظ ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس وقت مجھے اسلامیہ کالج جانا ہے ایک مشاعرے پر۔۔۔ معاف کیجئے۔''

یہ جملہ بول کر اس نے بڑے طمطراق سے اپنا بڑا سا بیگ اٹھایا۔ اس میں ڈائری اور پنسل ڈالی اور بیگ جھلاتی دفتر کی عمارت سے باہر نکل گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ سدھائے کتے کی طرح میں سڑک تک چلا آیا۔ نہ اس وقت مجھے یہ خیال تھا کہ شاید وہ دل ہی دل میں مجھے بے حیا سمجھ رہی ہے نہ ہی اس بات کا خدشہ تھا کہ شاید میرا غلط رویہ ہمیشہ کے لئے اسے مجھ سے بدظن بھی کر سکتا ہے۔ بس ایک لگن تھی' اکل للک تھی اسے زیادہ سے زیادہ وقت تک دیکھنے کی۔ اس کے قریب رہنے کی۔

دفتر کی سیڑھیاں اترتے وقت اس نے چپراسی سے پوچھا۔ ''ظفر صاحب کہاں چلے گئے؟''

چپراسی نے پہلے اندر نظر دوڑائی۔ پھر سائیکلوں والے چھپر کے قریب گیا اور دور سے آتے ہوئے بولا۔ ''جناب۔ وہ ابھی ابھی یونیورسٹی کیمپس گئے ہیں۔''

مہ رخ جھنجلاتی ہوئی سڑک پر آ گئی۔ حسنِ اتفاق سے سڑک سنسان پڑی تھی۔ دور کتنے گزرے دونوں میں سواریاں لدی تھی۔ مہ رخ بار بار اپنی گھڑی دیکھ رہی تھی۔

''میری کار حاضر ہے اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ ساری راہ ایک بار بھی آپ کو انشورنس کے لئے نہ کہوں گا۔۔۔ وعدہ۔۔۔!''

اس نے لمحہ بھر کو میری طرف دیکھا اور پھر کار میں بیٹھ گئی۔

مہ رخ فلرٹ لڑکی نہ تھی۔ فقط ذرا بے احتیاط سی باتیں کرنے' ترپ کے پتے چھوڑنے' شام گھات دکھانے اور بازی لوٹ لے جانے کا اسے چسکا تھا۔ اس کا جسم اور دل بالکل پاک

تھے۔ صرف نیت نیک نہ تھی۔ عام عورتوں کی طرح جو بج بن کر بازار جاتی ہیں اور چاہتیں ہیں کہ نظروں ہی نظروں میں سارے جہاں کے مردان کے عاشق ہو جائیں لیکن اوچھا آوازہ کوئی نہ کسے۔ ان کے دوپٹے کو کسی کی انگلی بھی نہ چھو پائے۔ مہ رخ بھی یہی چاہتی تھی کہ چاہنے والوں کے پشتارے لگ جائیں جو ایک بار اس سے بات کر لے ہمیشہ کے لئے اس کا پلیتھن نکال لے۔ وہ اپنی جودت طبع کی خود اس قدر قائل تھی کہ ہر مرد کو اس میدان میں ہرا کر اسے ذہنی سکون ملتا تھا۔۔۔ گو بعد میں مجھے علم ہو گیا کہ یہ ذہانت بھی بالکل سطحی ہے۔ اس میں نہ تو اصلی ذہانت کے ابرق جیسے پرت در پرت تھے نہ گہرے پانیوں کا سکون۔ اور نہ ہی خیال کی گہرائی۔ زیادہ سے زیادہ وہ پنڈت رتن ناتھ سرشار کی مٹیارنوں کی طرح ضلع جگت کی ماہر تھی۔ بہت جلد مجھ پر عیاں ہو گیا کہ آم تو سارے ظفر کے لئے ہیں میری طرف تو وہ گٹھلیاں پھینکتی ہے۔ لیکن میں مہ رخ کی محبت میں اس قدر محصور ہو چکا تھا کہ اس لم چھڑے مسخرے سے جلنا تو درکنار' الٹا اس کی خوشنودی کا خیال ہر وقت رہتا تھا۔ مجھے یہ گٹھلیاں اس قدر عزیز تھیں کہ میں ان ہی کی تلاش میں مہ رخ کے دفتر میں جاتا اور پہروں نکر گداؤں کی طرح بیٹھا رہتا۔

جب کبھی میں تمہارے گھر جاتا تو ان باتوں کی چمک میرے ساتھ آتی۔ پھر نہ تو زری مجھے تمہاری روتی ہوئی آنکھیں نظر آتیں نہ تمہارا گم سم چہرہ دکھائی دیتا' نہ تمہاری آوازیں دیتی خاموشی سنائی پڑتی۔ میں تو سارا وقت خلوت اور جلوت میں مہ رخ سے ہی باتیں کئے جاتا۔ اسی طرح ایک روز میں تمہارے ہاں بے دھیان بیٹھا تھا۔ اقبال نے پہلی مرتبہ میری توجہ تمہاری طرف لوٹائی۔

''صبح تم نے انڈا کھایا تھا بے بی ڈارلنگ؟'' اقبال نے پوچھا۔

تم نے نفی میں سر ہلایا۔

''دودھ؟''

''جی پیا تھا۔۔۔'' تم آہستہ سے منمنائیں۔

''کہاں پیا تھا زری۔۔۔ ہاں چکھا ضرور تھا اقبال۔ اللہ جانے اسے کیا ہوتا جاتا ہے۔ نہ کچھ کھاتی ہے اور نہ کسی سے بولتی ہے۔ دو بوتلیں کاڈلیور آئل کی پلائیں۔ وٹامن بی اور سی کی گولیاں کھلاتی ہوں۔ ذرا رنگ تو دیکھئے اس کا۔ چھپکلی سی نکلتی آتی ہے۔۔۔ ہے نا آصف؟''

میں نے ہسپانوی لیموں جیسی جلد پر نظر ڈالی اور پرے دیکھنے لگا۔ بڑے دنوں کے بعد میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے اور نیکی کرنے پر اکسانے آ بیٹھا تھا۔

اقبال اپنی بندوق کو گز سے صاف کر رہا تھا۔ اس نے تمہاری ممی کی بات پر کام دھرے

بغیر کہا۔۔۔ ''آؤ آصف! ذرا باہر چلیں کھیتوں کی طرف۔ شاید کوئی سینڈ گروز مل جائے۔''

میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ تمہارا شکاری باپ مجھ سے تمہارے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہے۔ جب ہم آبادی سے بہت دور نکل گئے اور فضا سے شہر کی آوازیں غائب ہو گئیں تو وہ اچانک رک گیا اور گھاس پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''آصف! مجھے زری کے متعلق بڑا فکر رہتا ہے۔۔۔ میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔''

میں ماہ رخ کے متعلق سوچ رہا تھا یکدم میرے گھٹنے کمزور پڑ گئے۔

''ہاں۔۔۔ ہاں ضرور پوچھو۔۔۔''

''نہ تو وہ کچھ کھاتی ہے نہ کسی سے بولتی ہے۔ نہ کسی سہیلی سے ملنے جاتی ہے اور نہ ہی اب کوئی اس کی سہیلی گھر آتی ہے۔ پہلے تو وہ کرنل افتخار کی بیٹیوں سے بہت فری تھی۔ اب کبھی ان کا نام بھی نہیں لیتی۔ میں بڑا فکر مند ہوں۔''

میں نے تھوک نگل کر پوچھا۔ ''کسی ڈاکٹر کو دکھانا تھا اقبال۔۔۔ شاید معدہ۔۔۔ ہو''

''دکھایا تھا۔ کرنل وسیم سے سارا چیک اپ کروایا ہے۔ بلڈ ٹیسٹ لیا۔ چیسٹ کا ایکسرے کروایا ہے۔۔۔ بظاہر وہ بالکل تندرست ہے۔'' اقبال نے انگریزی میں کہا۔

''تعجب ہے۔۔۔'' دور کہیں چکی چلنے لگی تھی اور اس کی آواز میں مدھم آہوں کی ہوک تھی۔

شکاری کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ میں نے ہمیشہ اقبال کو کھلنڈرے موڈ میں دیکھا تھا۔ کارتوس سے لے کر چیتے کی آنکھوں تک اس کی باتوں کی اڑان تھی۔ اس کے سامنے شکار سے ہٹ کر اگر کوئی بات کی جاتی تو وہ اونگھنے لگتا۔ آج وہ گھاس پر بندوق پرے رکھے گھٹنوں کو بازوؤں میں لئے متوحش سا بیٹھا تھا۔ اقبال کا یہ پہلو میرے لئے بالکل اجنبی تھا۔ بڑی دیر کے بعد اس نے انگریزی میں بڑے اکھڑ پن سے پوچھا۔۔۔ ''تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا اسے کسی سے محبت ہو گئی ہے۔۔۔ اگر مجھے علم ہو جائے کہ اسے کس سے محبت ہے تو میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔۔۔ میں۔۔۔ میں زری کی بڑی عزت کرتا ہوں آصف۔''

میرے لئے اس سوال کا جواب دینا سہل نہ تھا۔ ذرا سا اعتراف ہی مجھے اتنی دور لے جاتا کہ پھر میں لوٹ کر نہ آ سکتا۔ میں نے ساری بات کو معمولی روپ دے کر کہا۔ ''ابھی کہاں اقبال۔ ابھی تو وہ اپنی استانی سے Calf Love کر رہی ہو گی۔''

• اقبال نے لمحہ بھر کو میری جانب دیکھا۔ اس نظر میں بڑی مجروح سی چمک تھی۔ پھر اس نے بندوق اٹھائی اور گھر کی طرف لوٹنے لگا۔ سارا راستہ اس نے جنگلی مرغابی، تیتر، بٹیر، مچھلی کے گوشت کی جداگانہ خاصیتوں پر بحث کی۔ شکار کے گوشت کو کوئلوں پر سینک کر پکانے اور سکھانے

کے طریقے بتائے لیکن ایک بار بھی پھر اس نے تمہارا نام نہ لیا۔ لیکن اتنی ساری باتوں کے باوجود آج تشویش مجھ سے چھپی نہ تھی۔ وہ اپنی اکلوتی بچی کے لئے بڑے چکر میں تھا۔ اس کی باتوں میں آج انہماک تو ضرور تھا لیکن وہ گہری دلچسپی نہ تھی جو عموماً اس کی باتوں سے مترشح ہوا کرتی تھی۔ میں اقبال کی مدد کرنا چاہتا تھا اور کسی قسم کی مثبت گفتگو ہم میں ممکن نہ تھی۔ پورچ کے پاس پہنچ کر میں نے اس سے اجازت چاہی۔ اس نے مجھے روکنا چاہا لیکن میں دل ہی دل میں جو فیصلہ کر چکا تھا مجھے اس پر عمل کرنا تھا اور وہ بھی بہت جلدی۔ میں بڑی عجلت میں رخصت ہوا اور سیدھا مہ رخ کے پاس پہنچا۔ وہ ایک فل سکیپ پیپر پر بال پن کے ساتھ کچھ لکھ رہی تھی۔ دفتری میز پر بہت سی تصویری پڑی تھیں اور ہر تصویر کے اوپر ایک چٹ لگی تھی۔ میں سلام کر کے اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے بڑے صاحب کی طرح سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا اور کام میں مصروف رہی۔ میں نے جھک کر صفحے پر دیکھا۔ لکھا تھا۔

''میرے میاں شادی کی سالگرہ بھول گئے۔۔۔''

اس عنوان کو نیک شگون سمجھ کر میں نے کاغذ پر ہاتھ رکھا اور آہستہ سے بولا۔

''امتل الحفیظ۔۔۔''

اس نے نظریں اٹھائے بغیر جواب دیا۔۔۔ ''امتل الحفیظ بہت ذاتی نام ہے۔۔۔مہ رخ کہئے۔۔۔''

گرم استری پر جیسے پانی کے چھینٹے پڑ گئے۔

''مہ رخ!''

وہ کاپی پر لکھتے ہوئے بولی۔ ''آنسو نیک شگون ضرور ہیں لیکن چہرے کا میک اپ خراب کر دیتے ہیں۔ شادی کی پہلی رات۔۔۔''

''مجھے تم سے ایک ضروری بات کہنا ہے۔''

''وہ اپنے بچوں کی دیکھ بھال خود کرتی ہیں۔۔۔ بیگم رضوانی سے ایک ملاقات۔''

''میری بات سنو مہ رخ۔۔۔ خدا کے لئے۔۔۔'

''ٹین کے ڈبوں سے آراستہ کھانا۔۔۔'' وہ تصویروں پر کیپشن لکھتی گئی۔

''مہ رخ لحہ بھر کے لئے میری طرف توجہ دو۔''

وہ قلم گھسیٹتے ہوئے بولی۔۔۔ ''فرح دیبا۔ اپنے شوہر کی چہیتی بیگم۔''

''اللہ کے لئے مہ رخ مجھے تم سے محبت ہے۔''

''ملکہ الزبتھ دس لاکھ کی مالیت کے ملبوسات لے کر سفر کرتی ہیں۔''

میں نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام کر کہا۔۔۔ ''مجھے تم سے محبت ہے مہ رخ۔''

''محبت کی شادی میں ناکامی کی وجہ۔۔۔''

اب میں جھنجلا کر اٹھا اور اس کے ہاتھوں سے کاغذ چھین کر بولا۔۔۔''مہ رخ۔ مذاق کی ایک حد ہوتی ہے۔''

''مذاق کون کر رہا ہے؟''

میں نے چڑ کر کہا۔''اور میرے ہر سوال کا وہی جواب ہے جو آپ نے دیا۔''

مہ رخ نے کاغذ بڑی اتراہٹ سے میرے ہاتھوں سے چھینا اور اوپر اٹھا کر بولی۔۔۔ ''جناب۔ میں کچھ عنوان بنا رہی تھی اپنے کالموں کے لئے۔۔۔ دیکھنا پسند فرمائیے۔''

''اچھا۔ آج تم سنجیدہ نہیں ہو۔ میں پھر آؤں گا۔''

جب میں دروازے کے پاس پہنچ گیا تو مہ رخ اپنی میز پر بیٹھتے ہوئے بولی۔''اور وہ کلاسیکی موسیقی کی کنسرٹ پر نہیں جائیں گے۔ ابھی کل تک تو بڑا جوش تھا۔''

مہ رخ سے ناراض ہونا اور پھر اس ناراضگی کو مستقل کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ میری شخصی آزادی اس کے حضور بالکل ختم ہو چکی تھی۔۔۔ میں دم دبائے کتے کی طرح دوبارہ کرسی پر آ بیٹھا۔ اس کے بعد کسی قسم کی گفتگو نہ ہوئی۔ میں اپنا جھوٹا وقار قائم رکھنا چاہتا تھا اور وہ مجھ جیسوں کو دھوئیں میں اڑاتی تھی۔ اس لئے جب تک وہ لکھتی رہی میں تصویریں دیکھتا رہا۔ میں نے ان تصویروں کو دیکھ کر اندازہ لگایا کہ پاکستان کی خواتین فینسی ڈریس کو بہت پسند کرتی ہیں۔ جا بجا کلچرل شوز میں عورتیں گہنے پاتے سے لیس' غرارے' سندھی قمیض' چوڑی دار پاجامے' پشواز' سلہٹ کے انداز کی ساڑھی' نو گزے لہنگے' پٹھانی کرتے اور شیشوں کی بنی ہوئی ٹوپیاں پہنے ہوئے تھیں۔ پنجابی لڑکیوں کو پٹھانی بننے کا شوق تھا۔ سندھی لڑکیاں ساڑھی پہنے اترا رہی تھی۔ معمر عورتیں چوڑی دار پاجاموں اور عروسی لباسوں میں ملبوس تھیں۔ غرضیکہ بڑے پیمانے پر ایک بڑا وسیع وعریض کھیلا تھا۔ فیشن کے ان مقبول شوز کے علاوہ ان خواتین کی تصویروں کا بھی پلندہ دھرا تھا جو ایکٹریس بنتے بنتے کسی طرح بچ گئی تھیں۔ یک رخا' پورا چہرہ اور تین چوتھائی چہرے کی ان گنت تصویریں تھیں۔ سب شکلوں پر وہی ایک لیمن ڈراپ قسم کی مسکراہٹ تھی۔ کچھ تصویریں ان پارٹیوں کی تھیں جو شادی' سالگرہ اور نوجوان لڑکوں کے یورپ جانے کی تقریبوں پر دی جاتی ہیں۔ ان تصویروں میں مہمان عموماً دولہا دلہن' سالگرہ منانے والا یا سفر پر جانے والا نہیں ہوتا بلکہ وہ افسرِ بالا یا مشہور آدمی ہوتا ہے جن کے اردگرد تمام مہمان گھسنے کی کوشش کریں۔ میں نے تو ایک آدھ تصویر میں یہاں تک ظلم دیکھا کہ دولہا اور دلہن کے عین درمیان ایک گنجے سر والے صاحب براجمان ہیں۔ اردگرد گھر والوں کی دوردیہ پلٹن کھڑی ہے۔ نیچے رقم ہے۔

''دولہا دلہن کے درمیان جناب اعزاز الحق صاحب''

ان تصویروں پر مستزاد ان معمر لیڈر رنما عورتوں کی تصویروں کا اجتماع تھا جو بیرونی ممالک کے سربراہوں کا خیر مقدم کرنے ایئرپورٹ کے وی آئی پی Enclosure میں پہنچی تھیں۔ جنہیں مقامی فنکشنز پر پہلی قطار میں بیٹھنے کا موقع ملا تھا۔ جو زنانہ جلسوں میں صدارت کے فرائض ادا کر چکی تھیں۔ ان خواتین کے چہرے فوٹوگرافروں کی چابکدستی کے باوجود وہیل مچھلی کی طرح تھل تھل اور بے جان نظر آرہے تھے۔ میں یہ تصویریں دیکھنے میں مصروف تھا کہ مہ رخ اٹھتے ہوئے بولی۔

''کیوں چلئے گا کہ ناراض رہے گا ابھی۔''

ابھی ہم مال تک پہنچے تھے کہ مجھ پر پھر دورہ پڑا۔

''مہ رخ! یہ سلسلہ کب تک چلے گا؟''

''کونسا سلسلہ! دیکھئے دیکھئے آہستہ چلائیے رکشا آرہا ہے ادھر سے۔''

''میری گرویدگی اور تمہاری بے رخی۔''

''جب تک آپ چلانا چاہیں۔ ساری کاروائی یک طرفہ ہے۔''

میں نے ستر کی رفتار پر موڑ کاٹا۔

''اللہ! آج آپ صحیح سالم لے جانے کا ارادہ نہیں رکھتے۔''

''مہ رخ۔ میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں جو شادی کے بعد عورتوں کی آزادی سلب کرلیا کرتے ہیں۔ تم چاہے ساری عمر عورتوں کا کالم لکھنا خدا قسم مجھے اعتراض نہ ہوگا۔''

''یہ تو میری مرضی پر منحصر ہے۔ شاید میں جرنلزم فوراً چھوڑ دوں۔''

ایک تانگے سے ٹکر ہوتے ہوتے بچی۔

''ہم دونوں کی مرضی ہمیشہ ایک ہوگی مہ رخ۔۔۔ ہمیشہ۔''

وہ کھکھلا کر ہنس دی۔۔۔ ''یعنی بالا ہی بالا میرے حقوق آپ کے نام محفوظ بھی ہو گئے۔''

''تمنا تو میری یہی ہے۔''

''خوب۔۔۔ اللہ کے لئے اتنی تیز نہ چلایئے گاڑی۔''

مجھ پر اپنی محبت کا بوجھ بڑا شدید ہو چلا تھا اور گاڑی بے قابو ہو کر کبھی دائیں کبھی بائیں مڑنے اور جھولنے لگی تھی۔

''آصف صاحب۔ کیوں مفت میں بدنام کرنے لگے ہیں مجھے۔ صبح اخبار میں چھپے گا۔۔۔ مہ رخ، خواتین کی کالم نگار۔۔۔ ستیلا مندر کے پاس حادثے کا شکار ہوگئیں۔۔۔ ان کے ساتھ کار میں جو شخص تھا اس کی شناخت جاری ہے۔''

میں نے گڑگڑا کر کہا۔ ''تم دن بھر میں کسی وقت سنجیدہ بھی ہوتی ہو کہ نہیں۔''

اس نے پکا سا منہ بنا کر جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے سارے دن میں مجھے غیر سنجیدہ ہونے کا ایک لمحہ بھی میسر نہیں آتا۔''

''خدا کے لئے مہ رخ۔ مجھ سے شادی کرلو۔ پلیز''

''اب اگر آپ نے مجھ سے ایسا مذاق کیا تو میں یہیں اتر جاؤں گی۔ اسی لمحہ۔''

میں خاموش ہوگیا اور کنسرٹ کے اختتام تک خاموش رہا۔

لان پر رنگدار نواڑی کرسیاں پڑی تھیں اور کنسرٹ شروع ہونے میں ابھی تھوڑی دیر تھی۔ ہمیں ایسی جگہ ملی جہاں سے ہر آنے جانے والا آدھ فٹ کے فاصلے سے گزرتا تھا۔ شامیانے کے تلے اکابرینِ شہر کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ مجمع میں عورتوں کی اکثریت تھی اور ان میں وہ خواتین زیادہ تھیں جو شوہروں کے شانہ بشانہ بڑے ٹھسے سے آئی تھیں۔ عورتوں کی تعداد کچھ اس لئے زیادہ نہ تھی کہ یکدم لاہور کی مستورات کن رس ہوگئی تھیں اور انہیں موسیقی سے عشق ہو گیا تھا بلکہ اکثر اس لئے آئی تھیں کہ ان کے پاس کچھ ایسے لباس تھے جو لوگوں کو دکھانا بہت ضروری تھا۔ کچھ اس لئے تشریف لائی تھیں کہ صبح ہی انہیں اپنی ہمسائی اور دوستوں کو بتانا تھا کہ رات وہ بھی کنسرٹ پر موجود تھیں۔ کچھ محض اس لئے چلی آئی تھیں کہ آج شام کنسرٹ سے بہتر شہر میں کوئی اور پروگرام نہ تھا۔۔۔ بیگمات کی خیرہ کن زیبائش ایسی تھی کہ بڑی بڑی رسہ گیر طوائفیں کان پکڑتیں اور ان سے لباس پہننے کا سبق حاصل کرتیں۔ مجھ سے ایک مرتبہ ایک ٹیکسی گرل نے شکایتاً کہا تھا۔

''جناب! جب سے بیگمات طوائف گیری کرنے لگی ہیں انہوں نے ہمارے رزق پر لات ماردی ہے۔''

''وہ کیسے؟'' میں نے سوال کیا۔

''پہلے مرد طوائفوں کے پاس اس لئے زیادہ آتے تھے کہ گھریلو بیبیاں سادہ لباس پہنتی تھیں اور اپنے آپ کو ڈھانپے رکھتی تھیں۔ اب تو بیگمات ہر پہلو سے اپنے آپ کو یوں پیش کرتی ہیں کہ طوائف دنگ رہ جاتی ہے۔ اب ہم لوگوں کو کون پوچھے بھلا!''

آج چونکہ میں بظاہر مہ رخ سے ناخوش بیٹھا تھا اس لئے میری نظروں میں تنقید زیادہ تھی اور تحسین کم۔ بجی سجائی عورتوں کو دیکھ کر مجھے سالم خرگوش کا روسٹ یاد آنے لگا۔ ایسا روسٹ جو بڑے سلیقے سے سٹین لیس ٹرے میں پیش کیا گیا ہو۔ ان عورتوں کا ہر رنگ آپ کے سامنے تھا۔ آپ کے تخیل کے لئے کچھ باقی نہ تھا۔ یہ مرد کی تواضع تھی۔ سوء ہضم پیدا کرنے کی حد تک تواضع۔

کنسرٹ ختم ہونے کے بعد ہم دونوں مہ رخ کے گھر چل دیئے۔ ساری راہ نہ میں نے اسے بلایا اور نہ ہی اس نے مجھ سے کوئی بات کی لیکن جونہی میکلوڈ روڈ کے پہلو میں ایک بند گلی کے پاس اتری میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''مہ رخ!''

مہ رخ نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑایا اور تنک کر بولی۔ ''مسٹر آصف! میرا خیال تھا کہ مرد اور عورت میں افلاطونی محبت ہے لیکن یہ تجربہ غلط نکلا۔ مرد اور عورت میں کیسا ہی لاتعلق رشتہ کیوں نہ ہو دونوں میں ایک کو ضرور توقع پیدا ہوتی ہے محبت کی۔ خدا حافظ۔''

''مہ رخ! سنو تو۔''

''کیا سنوں۔ خدا جانتا ہے کہ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی جس نے آپ کو غلط امید دلائی ہو۔ پھر بھی غلط فہمی پیدا ہوگئی۔ ہوگئی۔ ہوگئی ناں۔''

''مہ رخ۔ تم لوٹ کر مجھ تک ضرور آؤ گی۔''

''فی الحال تو میں ظفر کی طرف مراجعت کر رہی ہوں۔ خدا حافظ۔ مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کیجئے گا۔ یہ بات طے ہے۔''

مہ رخ جلدی سے روانہ ہوگئی اور میں کتنی ہی دیر وہاں کھڑا رہا۔ ظفر' مہ رخ۔ چوپ سٹک جیسی ٹانگیں چلانے والا نیم مسخرہ۔ نیم فلاسفر۔ اس آتشبازی کا منظور نظر ہے۔ یہ حقیقت مجھے سمجھ نہ آئی تھی۔ ۔ ۔ بڑی دیر بعد جب میں کار میں بیٹھا تو ونڈ سکرین پر مجھے تمہاری صورت نظر آئی۔ ہسپانوی لیموں جیسی جلد' گم سم آنکھیں' سینے پر لٹکتے دو لمبے لچکیلے سانپ اور سانپوں کے منہ میں گڑھل کے آتشیں پھول۔ میں نے تم سے ایسی کوئی بات نہ کی تھی جس سے محبت کی بو آتی ہو۔ پھر تم نے آپی آپ یہ فیصلہ کیوں کر لیا۔ میری محبت کے بغیر تمہارا وجود نامکمل ہے۔ شاید مہ رخ ٹھیک ہی کہتی تھی۔ مرد اور عورت کا رشتہ کبھی لاتعلق نہیں ہو سکتا۔ یہاں ہمیشہ ایک وائرس موجود رہتا ہے جو مکمل بھولپن اور سادگی کو مفلوج کر دیتا ہے۔ یہ وہ بتیاں ہیں جو آپی آپ نیلے پانیوں میں منعکس ہو جاتی ہیں۔

دوسرے دن سہ پہر کے وقت میں تمہارے ہاں پہنچا۔ یہ میری خود غرضی تھی کہ میں تمہاری عقیدت کے پھاہے سے اپنی زخمی انا کو سینک دینا چاہتا تھا۔ میں ہمدردی وصول کرنے اس جگہ پہنچا جہاں کا ہر ذرہ محبت کے وائرس میں ڈوبا ہوا تھا۔ جب میں نے کار کو پورچ میں روکا تو پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ شاید تمہارے ممی ڈیڈی گھر پر نہ ہوں لیکن بھاگ جانے کی راہ مسدود ہو چکی تھی۔ کار کا شور سنتے ہی تم برآمدے میں آ پہنچی تھیں۔ تمہارا چہرہ زرد تھا۔ کبھی یہ آئرن ٹانک اور غازے کی سرخی سے بے نیاز شگرفی نظر آیا کرتا تھا۔ مجھے دیکھ کر تمہارے کان کی

لوئیں سرخ ہوگئیں۔ تم بھاگ کر ڈرائیور والی سیٹ کی جانب آگئیں اور ہینڈل گھماتے ہوئے بولیں۔ ''آیئے۔''

''ڈیڈی کہاں ہیں تمہارے؟''

''وہ جی ہرن مینار گئے ہیں۔''

''اور ممی جان؟''

''وہ بھی ساتھ گئی ہیں جی۔''

''تم نہیں گئیں ان کے ساتھ؟'' میں نے سوال کیا۔

''میرے سینئر کیمبرج کے امتحان ہیں جی۔۔۔ پرسوں سے۔''

میں نے بالکل انکلوں جیسی آواز میں کہا۔ ''ٹھیک ٹھیک۔ پھر تم پڑھو بے بی۔ میں تو چلتا ہوں۔ اقبال کو بتا دینا کہ میں آیا تھا۔''

تم نے پہلی بار جرات سے دروازہ کھول کر بات کی۔ ''جی ممی ڈیڈی آنے والے ہیں۔ آپ ذرا اتر آیئے۔''

تمہاری آواز میں جو التجا تھی میں نے اس کے سامنے اپنے آپ کو نہتا محسوس کیا۔

''نہیں بھئی۔ تمہاری پڑھائی کا حرج ہوگا۔''

''پانچ منٹ رک جایئے۔ سچ ڈیڈی آنے والے ہیں ابھی۔''

تمہاری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

ان آنسوؤں کا دکھ میں نے پہلی بار محسوس کیا۔ اپنی محرومی کے احساس سے میرا اپنا حلق نمکین ہوگیا۔ تم مجھے ڈرائنگ روم میں لے گئیں۔ میں اسی مخصوص صوفے میں بیٹھ گیا جو آتشدان کے قریب تھا۔ سارے کمرے میں کمائے ہوئے چمڑے کی مہک تھی۔ چیتے کے سر، بارہ سنگھوں کی آنکھیں اور شیر ببر کی کھال یکدم بہت جاندار ہوگئی تھی۔ مجھے جنگل کا سناٹا کمرے میں مقید محسوس ہو رہا تھا۔

''پہلا پرچہ کس کا ہے؟''

''انگلش کا۔''

''پھر؟''

''دوسرے دن سنڈے ہے جی۔''

''اچھا بھئی میں تو چلتا ہوں۔ تمہارے ڈیڈی تو مچھلی کا شکار کھیلنے گئے ہوں گے۔''

یکدم میں اٹھ کھڑا ہوا اور چلنے کی نیت سے دو ہی قدم اٹھائے ہوں گے کہ تمہاری آواز آئی۔ یہ آواز ایک بچے کی تھی لیکن اس میں میرا بائی کا سارا غم تھا۔ اس پر آنسوان کا اور تعاون

بھی کر رہے تھے۔

''مجھ سے شادی کر لیجئے' دو دن کے لئے۔ ایک دن کے لئے۔ ساری لڑکیاں مجھے چھیڑتی ہیں آصف صاحب۔ خدا کے لئے مجھ سے نکاح کر لیجئے۔ ایک گھنٹہ بھر کے لئے چاہے پھر آپ مجھے طلاق دے دیجئے گا۔ میں ہمیشہ آپ کی احسان مند رہوں گی۔''

میرے سر کے عین اوپر بم کا گولہ پھٹا۔

''لڑکیوں کو اس بات کا علم کیسے ہوا زری؟''

''ہو گیا جی۔ ہونا ہی تھا۔ میں آپ کی تصویر جو ساتھ لے جاتی تھی بستے میں۔''

میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ میری تصویر اس کے پاس کہاں سے آئی لیکن جب میں نے لوٹ کر اس کی طرف دیکھا تو وہ مجھے بے حد چھوٹی' دل برداشتہ نظر آئی۔ بالکل جنگی قیدی کی طرح مجبور اور بدحال۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھے اور آہستہ آہستہ بولا۔

''سنو زری! میں تمہاری محبت کی عزت کرتا ہوں لیکن ابھی تم بچہ ہو۔ یہ دور گزر جائے گا۔ تم خود اس جذبے پر ہنسو گی۔ بچپن میں سبھی اسی طرح محبت کرتے ہیں۔ لیکن اقبال میرا جگری دوست ہے۔ ہم دونوں چاہے برسوں نہ ملیں ہماری دوستی بہت گہری ہے۔ میں ایک خاص اعتماد پر یہاں آتا ہوں۔''

تمہاری آنکھیں بند تھیں اور پلکوں سے بھری برسات ٹوٹ رہی تھی۔

''اور ایک اور بات بھی ہے زری۔''

تم نے آنکھیں کھول دیں۔ آنسوؤں سے لبالب بھری آنکھیں۔

''مجھے کسی اور سے محبت ہے۔ بالکل ایسی ہی محبت جیسی تمہیں مجھ سے ہے۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ سمجھیں زری؟''

''جی!۔۔۔'' نہ جانے وہ سارے آنسو کیسے یکدم خشک ہو گئے۔

میں بھاری قدم اٹھاتا باہر آیا اور کار میں بیٹھا اور پورچ سے رخصت ہو گیا۔ کاش! میں پلٹ کر ایک بار تمہیں دیکھ لیتا۔

رات کو پونے دو بجے مجھے اقبال کا فون ملا۔ جب میں ہسپتال پہنچا تو اقبال باہر ٹہل رہا تھا۔

''بڑی دیر لگا دی تم نے آصف۔''

مجھے معلوم نہ تھا کہ اقبال میرے متعلق کس قدر جانتا ہے۔ میں خاموش رہا۔

''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ اس قدر جلد مرنا چاہتی ہے تو میں اسے خود شوٹ کرتا۔ اسے دو گھنٹے مرنے میں نہ لگتے۔''

''آئی ایم سوری اقبال۔''

''ابھی تک میرا خیال تھا کہ زری اتنی سخت دل نہیں ہو سکتی۔ اس کے دل میں میری محبت ضرور ہو گی لیکن۔۔۔'' میں بلا مقصد اس کا کندھا تھپتھپانے لگا۔

''ایک شکاری کی بیٹی کا نشانہ اتنا خراب۔ پورے دو گھنٹے سسکتی رہی۔ بہت دیر کر دی تم نے آصف۔''

''کاش میں اسے ہسپتال نہ لایا ہوتا۔ آصف! گھر اور ہسپتال میں خدا تو وہی رہتا ہے نا!''

میں خاموشی کے ساتھ اس کے برابر ٹہلنے لگا۔

''وین ابھی تک نہیں آئی؟''

''وین؟۔۔۔'' میں نے بے دھیانی سے سوال کیا۔

''زری کو گھر لے جائیں گے۔ اسے نہلائیں گے' دھلائیں گے۔ میں اس کے ماتھے کا زخم خود صاف کروں گا۔ بڑی Darling لڑکی تھی۔ تھی نا آصف؟''

میرے پاس اس کی باتوں کا کوئی جواب نہ تھا۔

''میں اصل وجہ نہ سمجھ سکا۔ میں ہرن مینار سے لوٹا تو وہ بے ہوش پڑی تھی۔ خانساماں بد بخت گھر پر نہیں تھا۔ دی ایڈیٹ۔''

''چلو ذرا بنچ پر بیٹھ جائیں۔''

اس نے میری نصیحت پر عمل نہ کیا۔ ''زری مجھے ہمیشہ شکار سے منع کرتی تھی۔ کہا کرتی تھی ڈیڈی اللہ میاں سزا دیتا ہے۔ یہ گناہ ہے۔''

اس کی آنکھوں میں تھوڑا تھوڑا پاگل پن اتر آیا تھا۔

''آصف! کیا اسے کسی سے محبت تھی۔ تم ہمارے گھر آتے تھے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا کوئی ایسا بھی اس صفحہ ہستی پر تھا جو زری کو نہ چاہ سکا۔ ہم کبھی اس کے خلاف نہ ہوتے۔ زری نے یہ کیوں سمجھا کہ میں اس کی محبت پر معترض ہوتا۔ کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟''

میں تمہارے ڈیڈی کو کیا سمجھاتا کہ نیل کے پانیوں میں منعکس ہونے والی بتیوں کا کوئی قصور نہیں۔ میں تمہارے ڈیڈی کو کیا بتاتا محبت تو امر بیل کی مانند ہے جس درخت پر اس کی زرد روڈالیاں چڑھ جاتی ہیں وہ درخت آپی آپ مر جاتا ہے۔ میں تمہارے باپ کو کیا سمجھاتا اور وہ کیوں سمجھتا۔

میں تو تمہیں بھی نہ بتا سکا زری کہ تمہارے جانے کے بعد مہ رخ کی محبت چھن جانے کے بعد مجھ پر کیا گزری۔ تمہاری محبت مجھ تک مہ رخ کے توسط سے پہنچی ہے زری۔ اس محبت کا تمہیں

کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکا لیکن میں نے تمہارا قرض لوٹا دیا ہے۔ میرے اردگرد امربیل چڑھ چکی ہے۔ اس میں ہائی سنتھ کے پھول کھلے ہیں۔ پشیمانی کے ارغوانی پھول۔ تاسف کے آسمانی پھول۔ میں تمہارا قرض لوٹا رہا ہوں۔ ہولے ہولے۔ آنسو آنسو۔ آہ در آہ!

تمہاری محبت کی بتیاں میرے دل کے ناسپاس پانیوں میں منعکس ہو چکی ہیں زری۔ لیکن میں بتیاں تمہیں نہیں دکھا سکتا۔ میرا کوئی مستقبل نہیں۔ میرا کوئی ماضی نہیں۔ میں وہ مریض ہوں جس کی شریانوں میں کلوروفارم کا نشہ شاں شاں کر رہا ہے اور وہ آپریشن تھیٹر سے بھاگ آیا ہے۔

بارش بہت زور سے آئی ہے۔ بادلوں کے غف کپڑے میں شگاف آ گئے ہیں۔ مٹی کے گرم وجود سے ٹھنڈی بوندوں نے لپٹ کر سوندھی خوشبو اٹھائی ہے۔ تمہاری یاد کا گھٹا ٹوپ اندھیرا میرے چاروں طرف چھانے لگا ہے۔ میں اس طفل زادے کی طرح تھا جو محبت کے نذرانے کو ٹھوکریں مار مار کر بے وقعت کر دیتے ہیں۔ لیکن اب نہیں۔ اب نہیں زری۔

لیکن اب کیا فائدہ؟

اب کیا فائدہ زری؟؟

☆☆☆☆☆

PRIDE OF PERFORMANCE
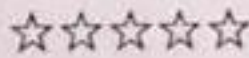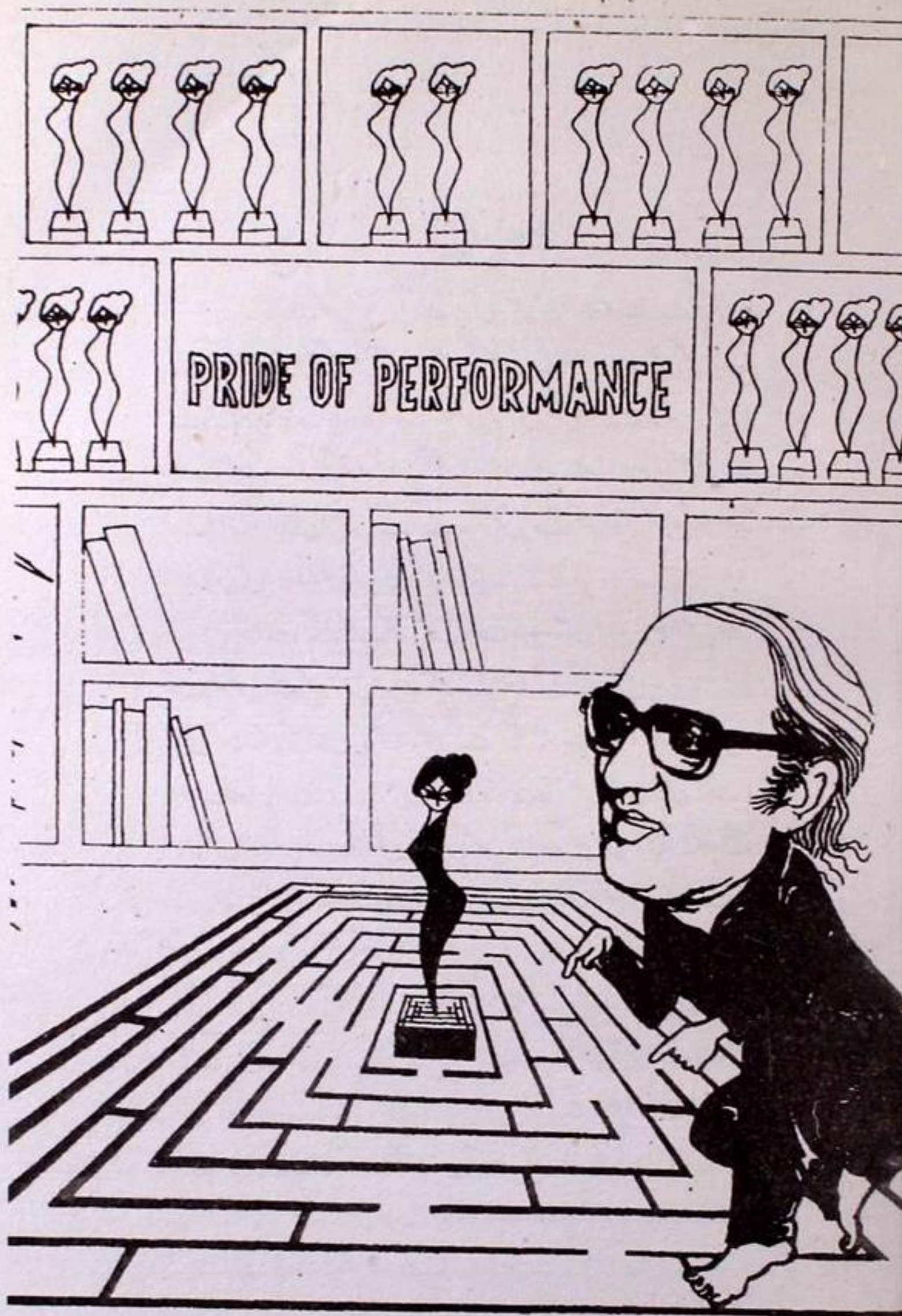
۔۔۔گھر پر "رات" کی آخری قسط بہت سے لوگوں کے درمیان بیٹھ کر دیکھی، جس شخص نے اس سیریل کو سب سے زیادہ پسند کیا وہ ایک مشکل آدمی ضرور ہے، لیکن پڑھا لکھا، سنجیدہ اور کم گو صاحب نظر استاد ہے۔ میری مراد نفسیات کے استاد انیق احمد سے ہے۔ جس نے تمہاری تحریر کو اور افضال کی ادائی کو دل سے پسند کیا۔

رات گئے تک گھر میں لطف رہا، میں اور بانو اس وجہ سے خوش تھے کہ اس مرتبہ ہم نے سوائے ایک آدھ قسط کے باقی ساری قسطیں باقاعدگی سے دیکھیں۔ ہم دونوں ایک مرتبہ پھر تم کو داد دیتے ہیں اور دعا کرتے ہیں، تمہاری صحت، سلامتی اور تمہارے تخلیقی عمل کی گہرائی اور گیرائی کیلئے۔ تم نے دورِ جدید میں تمثیل کے فن اور اس کے رموز کو خوب سمجھا ہے۔

سلامت رہو۔

اشفاق احمد

۶۔۱۔۱۹۸۸

(ایک خط سے اقتباس)

پاکستان ٹیلی ویژن لاہور سنٹر

کہانی گھر

امر بیل

کہانی	:	بانو قدسیہ
ڈرامائی تشکیل	:	امجد اسلام امجد
دورانیہ	:	۵۰ منٹ
ہدایات	:	ایوب خاور

کردار:

زری، آصف، نواز، بیوی، مہ رُخ، نوکر

سین نمبرا آصف کا بیڈ رُوم

ایک خوشحال اور نفیس ذوق کے حامل گھرانے کا بیڈ رُوم، فرنیچر، کلر سکیم، سامان آرائش، ہر چیز سے مکینوں کے اعلیٰ ذوق کا پتہ چلتا ہے۔ خوبصورت دیوار گیر یا بیڈ سائڈ پر رکھی گھڑی میں رات کے تین بجے رہے ہیں۔ ڈریسنگ ٹیبل قیمتی سامان آرائش سے بھرا ہوا ہے۔ اور اس کے ساتھ آصف اور مہ رخ کی ایک خوبصورت تصویر ہے جس میں دونوں بہت خوبصورت نظر آ رہے ہیں۔ بیڈ پر کمبل وغیرہ تہہ کئے رکھے ہیں اور بستر کی حالت سے پتہ چلتا ہے کہ ماضی قریب میں اس پر کوئی نہیں سویا۔ کمرے کے ایک کونے میں رکھی دو کرسیوں میں سے ایک پر آصف بظاہر آنکھیں بند کئے بیٹھا ہے۔ اس نے دونوں پاؤں میز پر رکھے ہیں اور اس کے پاؤں کی انگلیاں مسلسل حرکت میں ہیں۔ جس سے اس کی بے چینی کا اظہار ہوتا ہے۔ ٹیبل لیمپ کی مدہم اور محدود روشنی میں آصف کا سوچ میں ڈوبا ہوا چہرہ اور آنکھوں میں جگراتے کی کیفیت ہے جو

اس کی اندرونی بے چینی کی غمازی کر رہے ہیں۔ اس منظر کو Establish کرنے کے بعد چند لمحوں کے وقفے کے ساتھ کمرے کے بیرونی دروازے پر کسی چیز کے ٹکرانے کی آواز آتی ہے۔ آصف آہستہ سے سر گھما کر دیکھتا ہے تو مہ رخ ہاتھ میں ایک خوبصورت اور تقریباً نیا سا اٹیچی کیس لئے آتی ہے اور بڑے طنطنے کے ساتھ الماری سے اپنے ملبوسات اور دیگر سامان آرائش اٹھا اٹھا کر بکسے میں رکھنا شروع کرتی ہے۔ ماہ رخ ایک تیس پینتیس سال کی خوبصورت اور خوبرو عورت ہے جبکہ آصف تقریباً 45/50 برس کا ایک وجیہہ اور ہینڈسم انسان ہے جس کی آواز اور شخصیت میں ایک مخصوص قسم کی دلکشی ہے جو جنس مخالف کی توجہ فوراً اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اس وقت بڑھے ہوئے شیو اور مسلسل جگراتے کی وجہ سے اس کا چہرہ کچھ اترا ہوا ہے۔ چند لمحے مہ رخ کو بکس میں کپڑے رکھتے دیکھتا ہے پھر صلح کل سے لہجے میں بولتا ہے۔

آصف: یہ کیا کر رہی ہو!

مہ رخ بغیر کوئی جواب دیئے گھوم کر اس کی طرف دیکھتی ہے۔

آصف: او کے، او کے میری غلطی تھی۔ اب ختم کرو پلیز

مہ رُخ: ختم ہی تو کر رہی ہوں۔

آصف: پلیز مہ رُخ کیوں خواہ مخواہ بڑھا رہی ہو بات کو، کہا نا I am sorry۔

ماہ رُخ: (طنزیہ لہجے میں) معافی تو مجھے مانگنی چاہیے اپنے آپ سے کہ میں نے ایک پتھر کو انسان سمجھ کہ اس سے شادی کر لی اس میں تمہارا کیا قصور ہے!

آصف: دیکھو پلیز ...... میری طبیعت اچھی نہیں تھی۔ اب بھی نہیں ہے...... ورنہ میں ضرور تمہارے ساتھ اس ڈنر پر چلا جاتا ...... کسی کی مجبوری بھی سمجھا کرو۔

مہ رُخ: میں ہی رہ گئی ہوں ساری مجبوریاں سمجھنے کیلئے۔ اور یہ کوئی آج کی بات تو نہیں ہے۔ پچھلے دو سال سے جب سے ہماری شادی ہوئی ہے۔ تمہارا یہی وطیرہ چلا آ رہا ہے۔ ہر جگہ تم نے مجھے Let Down کیا ہے۔ ذلیل کرایا ہے مجھے لوگوں میں۔ میں انسان ہوں کوئی روبوٹ نہیں۔ جس پر کسی بات کا اثر ہی نہ ہو۔

آصف: کس چیز کی کمی ہے تمہیں یہاں ۔۔۔

مہ رُخ: (آواز آہستہ آہستہ بلند اور جذباتی ہو جاتی ہے) محبت کی پیار کی، اپنائیت کی، خلوص اور عزت کی، توجہ کی ۔۔۔۔ کوئی ایک کمی ہو تو بتاؤں۔

آصف: (دھیمی آواز میں) اب یہ تم زیادتی کر رہی ہو۔ میں تو تمہارا ہر ممکن خیال رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

مہ رُخ: اسے خیال رکھنا کہتے ہیں۔ سارا دن تو تم گھر سے باہر رہتے ہو۔۔۔ چلو

مان لیا کہ نوکری ہے مگر اس کے بعد تم کیا کرتے ہو۔۔۔اجنبیوں کی طرح دیوار کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتے ہو۔ میں نے کیا پہنا ہے! کیا پکایا ہے! کیسے دن گزارا ہے! تمہیں کسی چیز سے غرض نہیں۔۔۔ہم ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی ایک ساتھ نہیں رہتے۔ مجھے نہیں چاہیے ایسی زندگی۔۔۔میں جا رہی ہوں اس گھر سے بھی اور تمہاری زندگی سے بھی۔ تمہیں تنہائی اچھی لگتی ہے۔۔۔سوخوش رہو۔

بیگ کو زور سے بند کرتی ہے۔

آصف: (اس کا راستہ روکنے کی کوشش کرتا ہے) بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔۔۔رات کے تین بج رہے ہیں۔۔۔یہ کوئی وقت ہے گھر سے نکلنے کا۔ جاؤ اپنے کمرے میں سو جاؤ صبح تک تمہارا غصہ بھی اتر جائے گا پھر آرام سے بات کریں گے۔

مہ رُخ: اب نہیں اترے گا یہ غصہ۔۔۔اگر میں نے اکیلے ہی رہنا ہے تو اس کیلئے میرے باپ کے گھر میں بھی کمرے موجود ہیں۔ تمہیں کہا کس نے تھا شادی کرنے کو۔

آصف: (سمجھانے کے انداز میں) دیکھو۔ کمرہ تم نے اپنی مرضی سے علیحدہ کیا تھا کہ مجھے رات کو دیر تک لائٹ جلانے کی عادت ہے۔ یہ تمہارا اپنا فیصلہ تھا۔

مہ رُخ: اور یہ بھی میرا اپنا فیصلہ ہے کہ اب میں اس گھر میں ایک پل نہیں رہوں گی۔۔۔تم ہر وقت کیا سوچتے رہتے ہو۔ میں پوچھ پوچھ کر تھک چکی ہوں لیکن اب مجھے یقین ہو گیا ہے۔ کہ تم میرے نہیں کسی اور کے ہو۔۔۔تمہاری آنکھیں میرے چہرے میں کسی اور کا چہرہ ڈھونڈتی ہیں اور تمہارے ہاتھ مجھے اس طرح چھوتے ہیں جیسے انہیں کسی اور لمس کی تلاش ہو۔۔۔تو مسٹر آصف تنویر اب میں یہ Humiliation مزید برداشت نہیں کر سکتی۔۔۔تھینک یُو ویری مچ۔۔۔

اٹیچی اٹھا کر باہر کی طرف جاتی ہے۔ مہ رخ جھٹکے سے بکس اس کے ہاتھ سے چھڑاتی اور زور سے دروازہ بند کر کے جاتی ہے آصف اس کو روکنے کی ناکام کوشش کے بعد چند لمحے پریشان سا دروازے کے قریب کھڑا رہتا ہے۔

.......CUT......

سین نمبر۲ زری کا گھر

کیمرہ زری کی تصویر سے آہستہ آہستہ P/0 کرتا ہے۔زری کا باپ میجر نواز جو بیٹی کی موت کے بعد ایک دم جیسے بوڑھا ہو گیا ہے۔ لیکن اس کے انداز میں اب بھی فوجیوں کی بہت سی عادات نظر آتی ہیں آہستہ سے ایک پھول تصویر کے فریم کے پاس رکھتا ہے اور واپس مڑتا ہے۔ اس کی بیوی جواب اپنے ماضی کا ایک سایہ رہ گئی ہے۔ دروازے کے قریب خاموش اور اداس کھڑی ہے۔اُس کے قریب آتی ہے اور تسلی دینے کے انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتی ہے۔نواز اس سے چھپا کر اپنی چادر کے پلو سے آنکھیں صاف کرتا ہے۔

بیوی: چلئے کپڑے بدل لیجئے۔شکور نے جوتے پالش کر دیئے ہیں۔

نواز: بوجھل قدموں کے ساتھ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بے دلی سے بولتا ہے۔نہیں جان! میں نے فرخ کو فون کر دیا ہے کہ میں نہیں آپاؤں گا۔ کچھ عجیب سی طبعیت ہو رہی ہے۔کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کیلنڈر سے یہ دن ہمیشہ کیلئے کھرچ دیا جائے۔

بیوی: یاد تو کسی کیلنڈر کی محتاج نہیں ہوتی نواز۔دیکھو آج تین سال بعد ایسے محسوس ہو رہا ہے۔جیسے وہ ابھی کسی طرف سے آئیگی اور۔۔۔۔آواز ہلکی سی بھرا جاتی ہے۔ ایک دم خاموش ہو جاتی ہے پھر منہ پھیر کر بولتی ہے۔آپ ہو آتے تو اچھا تھا۔

نواز: کہا نا۔جی نہیں چاہ رہا۔۔۔

بیوی: ابھی کچھ دیر پہلے مہ رخ کا فون آیا تھا۔اس نے بتایا ہے کہ وہ آصف کا گھر چھوڑ آئی ہے اور اب خلع کے لئے کیس کر رہی ہے۔

نواز: (ایکدم چونک سا جاتا ہے) یہ تو بہت برا ہوا۔۔۔وہ تو بالکل ٹھیک ٹھاک جا رہے تھے۔

بیوی: (نفی میں سر ہلاتے ہوئے) نہیں۔۔۔ذکر تو اس نے مجھ سے پہلے بھی کئی بار کیا تھا کہ آصف ہر وقت گُم سُم سا رہتا ہے۔ کسی چیز میں دلچسپی نہیں لیتا۔ بلاؤ تو بس ہوں ہاں میں جواب دیتا ہے اور اپنی طرف سے بہت کم بات کرتا ہے۔

نواز: ہاں یہ تو میں نے بھی نوٹ کیا ہے لیکن کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔۔۔ وہ تو بہت خوش طبع اور ہنس مکھ آدمی تھا۔۔۔کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ ہمارے حصے کی ساری ہنسی شائد Consume ہو چکی ہے۔

بیوی: مہ رخ کہہ رہی تھی کہ۔۔۔

بجلی کی چمک اور بادل کی گرج

خدا خیر کرے یہ بن موسم کا بادل کہاں سے آ گیا۔

.......CUT......

سین نمبر۳ آصف کا گھر

رات کا وقت۔ کھڑکی کے شیشوں پر مسلسل ہلکی بارش۔ آصف چند لمحے کھڑکی کے قریب کھڑا جیسے بارش کے ردھم میں گم ہے۔

آصف: (آواز) شاید تم ٹھیک ہی کہتی ہو ماہ رُخ۔۔۔ مجھے شادی نہیں کرنا چاہیے تھی۔۔۔ لیکن اس وقت مجھے یہ اندازہ ہی کب تھا کہ وہ بے وقوف لڑکی اپنے ساتھ میری بھی زندگی لے جائے گی۔۔۔ امر بیل کی طرح لپٹ جائے گی میرے وجود سے۔۔۔ اور میں ساری عمر ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا رہوں گا۔۔۔ میں نے تو اسے گودوں کھلایا تھا۔۔۔ اس کے باپ کا دوست تھا۔ انکل تھا اس کا۔

کیمرہ آصف کے کلوز پر اور فلیش بیک شروع۔

.......CUT......

سین نمبر۴ زری کا گھر (فلیش بیک)

پانچ چھے سالہ ایک بہت پیاری بچی زری خوبصورت کپڑوں میں ملبوس ایک گڑیا کو گود میں اُٹھائے زور زور سے رو رہی ہے میجر نواز اور بیوی (دس بارہ سال پہلے کے گٹ اپ میں) اسے بہلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ڈرائنگ روم کی آرائش سے میجر اقبال نواز کے شکار کا شوق نمایاں ہے۔

نواز: بہت گندی بچی ہے یہ کنول۔۔۔ بس اب آئندہ تم بالکل اس کے ساتھ نہ کھیلنا۔ میں خود اس کے کان کھینچوں گا۔ (مسکرا کر زری سے چھپا کر بیوی کو آنکھ مارتا ہے کہ اس وقت بچی کو منانے کا یہی ایک طریقہ ہے) ہم اس کی امی سے بھی شکایت کریں گے۔ کیوں راحیلہ؟

بیوی: بالکل...... (دروازے کی بیل کی آواز)

نواز: (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) یہ تمہارے انکل آصف کی بیل ہے چلو اب آنسو پونچھ لو...... انکل کیا کہیں گے کہ اتنی بہادر بچی رو رہی ہے۔ (دروازہ کھلتا ہے)

زری: میں اب اس سے کبھی بات نہیں کروں گی (بچوں والے غصے سے منہ میں

انگوٹھا دبا کر تیزی سے کہتی ہے) کُٹی۔ کُٹی۔ کُٹی......

نواز: (آصف سے ہاتھ ملاتے ہوئے۔ اونچی آواز سے) لو بھئی آصف انکل اب تم جانو اور تمہاری بھتیجی۔ ہم سے تو یہ چپ نہیں کرتی۔

آصف: (آ کر زری کو گود میں اٹھانے کی کوشش کرتا ہے) کس نے تنگ کیا ہے میری ڈارلنگ کو...... ہم کنول کا دو کانوں میں سر کر دیں گے...... یہ بھی کوئی بات ہے بھلا۔

زری: جایئے میں آپ سے نہیں بولتی (اُسی انداز میں سسکی لیتے ہوئے) کُٹی۔ کُٹی۔ کُٹی

آصف: ارے بابا مجھ سے کیوں کُٹی۔ میں نے کیا قصور کیا ہے۔

زری: آپ اُسے ٹافیاں کیوں دیتے ہیں؟

آصف: بھئی ہم تو اس لئے اسے ٹافیاں دیتے ہیں کہ وہ ہماری ڈارلنگ کی سہیلی ہے۔ اب نہیں دیں گے کیوں بھابی!

بیوی: بالکل ٹھیک ہے۔

آصف: مگر بھئی ہوا کیا ہے۔

نواز: ہوا یہ ہے کہ کنول کے گڈے کی آج زری کی گڑیا سے شادی تھی مگر ان لوگوں کو کہیں جانا پڑ گیا اور اس نے اس کو فون کیا کہ وہ آج نہیں آسکے گی...... بس اسی وقت سے یہ ''بہے آنسوؤں کی دھار، جیا میرا بیقرار'' چل رہا ہے۔

زری باپ کی اس بات سے دوبارہ ناراض ہو کر رونا شروع کر دیتی ہے نواز ایک دم مزاحیہ انداز میں اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتا ہے۔

ارے نہیں بابا نہیں......

آصف: ارے بھئی کیوں تنگ کر رہے ہو تم لوگ میری ڈارلنگ کو۔ چلیں آپ دونوں اُدھر چل کر بیٹھیں۔

زری کے ہاتھ سے گڑیا لے کر

آہا! کتنی پیاری دلہن ہے۔ کس نے تیار کیا ہے اسے۔

زری سسکی بھر کر گالوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلاتی ہے کہ میں نے کیا ہے۔

آصف: (زری کو گود میں اُٹھا کر) مگر بھئی ہماری ڈارلنگ اس گڑیا سے بھی پیاری ہے۔

زری: نہیں میری گڑیا زیادہ پیاری ہے۔
آصف: او کے۔او کے۔تمہاری گڑیا ہی زیادہ پیاری ہے۔
(زری کی گود سے ایک گتے کا ڈبہ اُٹھا کر)
یہ کیا ہے؟
نواز: یہ اس مغرور دولہا کے کپڑے ہیں جو دلہن کی طرف سے دیئے جانے تھے۔
آصف: (گڈے کے کپڑے دیکھتے ہوئے) بہت پیارے ہیں بھئی۔
مزاحیہ انداز میں ان کپڑوں کو اپنے جسم پر سجاتا ہے۔
چلو ایسا کرتے ہیں کہ میں پہن لیتا ہوں یہ کپڑے تم اپنی گڑیا کی شادی مجھ سے کردو۔
زری: (ایک دم ہنس پڑتی ہے) آپ کوئی گڈے تھوڑی ہیں؟
آصف: نہیں ہیں تو تمہاری خاطر بن جاتے ہیں۔
نواز ایک طرف سے کیمرہ اُٹھا کر تصویریں بناتا ہے۔
زری: (ایک دم خوش ہو کر) مگر یہ کپڑے تو آپ کو بہت چھوٹے ہیں
آصف: (شرارت آمیز انداز میں) مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔تمہاری خاطر ہمیں چھوٹا
تو بنا پڑے گا۔ہم اپنی ڈارلنگ کو ناراض تو نہیں کر سکتے نا!
سب لوگ ہنس پڑتے ہیں اور فلیش بیک ختم ہو جاتا ہے۔

.......CUT......

سین نمبر ۵ آصف کا کمرہ

فلیش بیک ختم ہونے پر کیمرہ آصف کے چہرے پر آتا ہے وہ سر جھٹک کر سامنے میز پر رکھی ہوئی تصویر اُٹھاتا ہے جس میں زری کی گڑیا کا گڈا بنا ہوا ہے۔اس پر اس کی آواز اس پر O/C ہوتی ہے۔

آصف: (آواز) اس شام تمہیں بہلانے کیلئے جب میں گڈا بنا تھا تو کسے خبر تھی کہ تقدیر اس مذاق کو اتنا سیریسلی لے گی کہ اس کے چند دن بعد ہی مجھے کمپنی نے لاگوس بھیج دیا اور پھر یوں ہوا کہ آئندہ دس برس تک ہم دونوں نے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا۔اس دوران میں نواز سے فون پر بات ہوتی رہی تین چار مرتبہ ہم ملے بھی لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ یا تو ہم گھر سے باہر ملے یا زری کسی وجہ سے موجود نہیں تھی۔ بس نواز سے اتنا پتہ چلتا رہا کہ گڑیوں سے کھیلنے والی وہ ڈارلنگ بھی اب بڑی ہو گئی ہے کالج جاتی ہے اور شاعری کرتی ہے۔تین برس پہلے جب میں واپس ٹرانسفر ہو کر

وطن آیا تو دوسرے ہی دن نواز سے ملنے گیا دروازے پر بیل دی دروازہ کھلا اور......

.......CUT......

نوٹ: اب یہاں سے آگے ساری کہانی فلیش بیک میں چلے گی۔

سین نمبر ۶ نواز کے گھر کا بیرونی حصہ۔

تین سال پہلے آصف ایک سمارٹ اور نفیس ۴۵ سالہ شخص کے رُوپ میں نہایت عمدہ لباس میں ملبوس کھڑا ہے۔ فاصلے پر اس کی کار کھڑی ہے۔ دروازہ کھلتا ہے زری ایک سولہ سترہ سالہ کی لڑکی۔ مگر انتہائی معصوم لڑکی بن چکی ہے۔ اس نے پیروں میں فلیٹ ٹائپ بوٹ پہن رکھے ہیں۔ بال قدرے بکھرے ہوئے۔ چہرہ میک اپ سے عاری مگر اپنے قدرتی حسن سے دہکا ہوا...... ایک اجنبیت بھری مگر مہذب نگاہ سے آصف کو دیکھتی ہے۔ واضح طور پر اس سے متاثر ہوتی ہے۔ لیکن اسے پہچان نہیں پاتی۔

زری: جی

آصف: (چند لمحے جیسے اسے دیکھ کر حیران سارہ جاتا ہے مگر پھر اس سچوئشن کا مزا لینے کیلئے مسکرا کر پوچھتا ہے) میجر صاحب گھر پر ہیں۔ بے بی

زری: (اپنا سکول کا دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے) ڈیڈی نہیں ہیں جی امی ہیں اندر .

آصف: تو اُن کو جا کر بتائیے کہ آصف تنویر آیا ہے۔ آصف تنویر...... یاد رہے گا۔

زری: جی...... آصف تنویر صاحب...... یاد رہے گا جی ایک دم جانے کیلئے مڑتے ہوئے رکتی ہے جیسے کچھ یاد آ جاتا ہے۔ آپ آپ...... آصف انکل ہیں نا

آصف: میں نے تو تمہیں دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ مصافحے کیلئے ہاتھ بڑھاتا ہے۔

زری تھوڑا سا جھجک کر اس سے ہاتھ ملاتی ہے مسکراتے ہوئے کہتی ہے۔

زری: (اُسے اندر آنے کیلئے راستہ دیتے ہوئے) آپ آ جائیے نا میں امی کو بتاتی ہوں۔

.......CUT......

سین نمبر ۷ نواز کا ڈرائنگ روم

بیوی: جو اس دوران اپنی جوانی کی کشش خاصی حد تک کھو چکی ہے۔ لیکن اب بھی

بنی سنوری رہتی ہے۔ چائے کی ٹرالی سامنے رکھے چائے بنا رہی ہے۔ آصف کے آنے سے بہت خوش ہے۔

بیوی: یہ کیک تو تم نے چکھا ہی نہیں...... زری نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے...... بہت شوق ہے اِسے کوکنگ کا۔

آصف ایک ٹکڑا چکھتا ہے۔ پھر پلیٹ میں بڑا ٹکڑا ڈالتا ہے۔

آصف: یہ تو واقعی بہت کمال کا ہے بھئی Delicious

زری: تھینک یو

بیوی: ڈارلنگ چائے بناؤ نا انکل کیلئے اپنے پیارے پیارے ہاتھوں سے تمہیں یاد ہے تم اسے ہمیشہ زری ڈارلنگ کہہ کے بلایا کرتے تھے۔

آصف: (مسکراتے ہوئے) ہاں...... مگر یہ تو ایک دم اتنی بڑی ہوگئی ہے۔

زری: (آصف کے قریب قالین پر بے تکلفی سے بیٹھ کر چائے بناتے ہوئے) میں تو آہستہ آہستہ ہی بڑی ہوئی ہوں۔ آپ نے ہی مجھے بہت دیر بعد دیکھا ہے...... چینی کتنی؟

آصف: جتنی جی چاہے ڈال دو...... بے...... (بیٹی کہتے کہتے رک کر) بی......

زری: (لاڈ سے) یہ کیا بات ہوئی۔

آصف: اچھا چلو ایک چمچ ڈال دو۔ دودھ بے شک نہ ڈالنا بالکل بھی نہیں؟

زری: بالکل بھی نہیں؟

بیوی: یہ تمہارے انکل کی پرانی عادت ہے...... کہتے ہیں کہ اس سے چائے کا تقدس غارت ہو جاتا ہے۔

زری: (مسکراتے ہوئے) پھر تو مجھے گلوز پہن کر آپ کے کپ کو ہاتھ لگانا چاہیے۔

بیوی: پنڈی کے دن بھی خوب تھے۔ ہے نا آصف

آصف: جی ہاں...... ویسا خوبصورت زمانہ پھر میری زندگی میں نہیں آیا۔ افریقہ، یورپ، امریکہ تینوں continent کھنگال کے دیکھ لئے ہیں میں نے۔

زری: (لاڈ سے) اور ایک بار بھی مجھے یاد نہیں کیا۔

آصف: یاد تو اسے کرتے ہیں جو کبھی بھولا ہو (مسکراتے ہوئے) بھئی وہ ہماری دلہن کہاں ہے۔

زری: کونسی دلہن؟

آصف وہی جس سے تم نے ہماری شادی کی تھی۔ بھول گئیں کیا۔ رو رو کر سارا گھر سر پر

اٹھایا ہوا تھا تم نے ...... کیوں بھابی

بیوی: (اندر کہیں فون کی گھنٹی بجتی ہے) ڈارلنگ ذرا دیکھو کون ہے۔

زری لپک کر اچھلتی ہوئی اندر کی طرف بھاگ کر جاتی ہے۔ چند لمحوں بعد کسی چیز کے زور سے گرنے کی آواز آتی ہے۔

اب کیا توڑا ہے۔ (آصف سے) دیکھو وقت کیسی تیزی سے گزرتا ہے۔ آج دس برس بعد آئے ہو تم اس گھر میں۔۔۔

زری اسی انداز میں تیز تیز چلتی ہوئی آتی ہے کارڈلیس فون ماں کی طرف بڑھاتی ہے۔

زری: آپ کا فون ہے ممانائٹی بصیرت ہیں

بیوی مسکراتے ہوئے فون لیتی ہے۔ زری آصف کے کان کے پاس منہ لا کر رازدارانہ انداز میں جیسے سرگوشی کرتی ہے۔

کم از کم ایک گھنٹہ بات ہو گی اب

(آصف اس کے بالوں میں محبت سے ہاتھ پھیر کر) بہت شیطان ہو گئی ہو تم

.......CUT......

سین نمبر ۸ Moutagul

زری کے P/v سے آصف کی شخصیت کا جادو اس پر چڑھنا شروع ہوتا ہے۔

۱۔ آصف زری کے گھر میں اس کے والدین سے گفتگو کر رہا ہے۔ زری چھپ کر اسے دیکھ رہی ہے۔

۲۔ آصف اس کے گھر کے سامنے کار سے اترتا ہے

۳۔ ماڈل ٹاؤن پارک یا کسی اور جگہ دو سیٹوں والی کشتی چلاتے ہوئے۔

۴۔ جھولے میں بیٹھ کر خوف آمیز خوشی سے چیخ مار کر آصف سے لپٹ جاتی ہے۔

۵۔ آصف ہنستے ہوئے۔

۶۔ چائے پیتے ہوئے۔

۷۔ زری سے پاپ کارن لے کر کھاتے ہوئے۔

۸۔ زری آصف کی تصویر اپنی سکول کی کاپی میں رکھ رہی ہے۔

۹۔ زری جیسے بے خیالی میں کاپی پر آصف کا نام لکھتی جا رہی ہے۔

.......CUT......

سین نمبر ۹ اقبال نواز کا گھر

آصف ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر اندر آتا ہے۔ آوازیں دیتا ہے۔

آصف: ہیلو Any body home بھئی کہاں ہیں سب لوگ۔

اندرونی کمرے سے زری ایک کاپی ہاتھ میں پکڑے ہوئے تیزی سے آتی ہے آصف کو دیکھ کر ایک دم رک جاتی ہے۔

آصف: کیا چکر ہے بھئی Bell کا کوئی جواب نہیں دیتا اور دروازہ کھلا ہے۔ کہاں ہیں تمہارے ڈیڈی۔

زری: جی وہ...... وہ اور امی تو کسی برتھ ڈے پارٹی میں گئے ہیں۔ بیل کل سے خراب ہے۔ اور دروازہ شاید وہ کم بخت شکور کھلا چھوڑ گیا ہے۔ عجیب ہونق آدمی ہے...... آپ بیٹھے نا۔

آصف: بھئی اب جس سے ملنے آئے ہیں وہ تو گھر پر ہے ہی نہیں

ایک دم زری کا چہرہ زرد پڑ جاتا ہے۔ آصف اس کی حالت کو محسوس کر کے بات بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

چلو تم سے ہی کچھ گپ لگاتے ہیں...... کیا ہو رہا ہے۔ آج کل...... یہ کیا ہے تمہارے ہاتھ میں بے بی

زری: (ایک دم کاپی کو کمر کے پیچھے چھپانے کی کوشش کرتی ہے) کچھ نہیں...... ایسے ہی۔

آصف: دیکھو بے بی یہ فاؤل ہے...... دکھاؤ کیا ہے۔

زری: (سنجیدگی سے) پلیز آپ مجھے بے بی نہ کہا کریں۔

آصف: (حیرت سے) کیوں۔

زری: کیونکہ جی...... کیونکہ...... بس آپ مجھے بے بی نہ کہا کریں

آصف محبت آمیز بے تکلفی سے اسے کندھے سے پکڑ کر اپنے ساتھ صوفے پر بٹھاتا ہے

آصف: اُلو کہیں کی...... ادھر بیٹھو میرے پاس...... پتہ ہے تم بچپن میں مجھے کتنا تنگ کیا کرتی تھیں۔

(پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتا ہے)

یہ تم کانپ کیوں رہی ہو۔

زری: (جیسے آصف کے قرب سے مسحور سی ہو جاتی ہے۔ اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے

ہوئے بولتی ہے) نہیں تو

آصف: (اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر) تمہارا ماتھا تو بہت گرم ہو رہا ہے۔ بچے Are you alright بھئی ایک تو تم آج کل کے بچے اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتے۔

اس کا کندھا تھپکتے ہوئے۔

گھر میں کوئی بخار کی گولی ہے تو لے کر آؤ میں تمہیں خود کھلاتا ہوں۔ چلو شاباش

زری: میں نے کہا نا...... مجھے کچھ نہیں ہوا۔

آصف: (اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے سامنے کی کرسی پر بیٹھتا ہے مصنوعی دھمکی کے اندر میں بولتا ہے) چپ چاپ دوائی کھا لو ورنہ میں فون کر کے ڈاکٹر کو بلا لوں گا۔

زری: (اپنی جگہ سے اٹھتی ہے اس کی کاپی وہیں پڑی رہ جاتی ہے۔ زری اندر کی طرف جاتے ہوئے) میں آپ کیلئے چائے بناتی ہوں۔

آصف: (سرسری انداز میں) نہیں ڈارلنگ چائے رہنے دو...... پھر کسی وقت آؤں گا۔

زری: چائے تو خیر آپ کو پینی پڑے گی۔

آصف: (محبت سے) ضدی بچہ

ایک دم نظر کاپی پر پڑتی ہے۔ جس کے ٹائیٹل پر دل کی تصویر بنی ہے۔ جس میں ایک تیر ترازو ہے اور اس کے نیچے شکستہ خط میں لکھا ہے الف کے نام۔

آصف جیسے بے خیالی میں کاپی اٹھا کر اس کے صفحے اٹھتا ہے پہلے صفحے پر ایک شعر کے اوپر لکھا ہے۔ الف کے نام

(جو نہیں جانتا کہ یہ ساری شاعری اسی کیلئے ہے)

خزاں کے پھول کی صورت بکھر گیا کوئی
تجھے خبر نہ ہوئی اور مر گیا کوئی

آصف حیرت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ چند اور صفحے پلٹتا ہے ایک دم زری دروازے میں آتی ہے۔ بھاگ کر کاپی اس کے ہاتھ سے لیتی ہے۔ اسے دوبارہ کمر کے پیچھے چھپاتی ہے۔

آصف: ارے بھئی کیا ہوا پڑھنے تو دو

زری: (شرم آلود مسکراہٹ کے ساتھ) کسی کی پرسنل ڈائری پڑھنا بہت بُری بات ہے۔

آصف: مجھے کیا پتہ کہ یہ تمہاری پرسنل ڈائری ہے۔ اور بائی دی وے ''یہ الف'' کون ہے۔

ایک دم جیسے اس کی بے خبری میں اس کے ہاتھ سے کاپی چھین کر دوبارہ پڑھنے کی کوشش کرتا ہے زری کاپی واپس لینے کیلئے ہاتھ بڑھاتی ہے۔ مگر آصف اپنے دونوں ہاتھ بلند کر کے کاپی اس کی پہنچ سے باہر کر دیتا ہے۔

زری: پلیز...... اسے نہ پڑھیے پلیز

آصف: ارے بے وقوف...... انکل سے شرمایا نہیں کرتے انکل تو راز دار ہوتے ہیں الٹا...... ہم کوئی تمہارے ممی ڈیڈی کو تھوڑا ہی بتائیں گے۔ (کاپی کے صفحے الٹتے ہوئے) توبہ میری۔ تم نے تو اس ''الف'' کے نام پورا دیوان ہی لکھ مارا ہے...... کوئی بہت ہی خوش قسمت لڑکا ہے یہ

زری: میری کاپی مجھے واپس کر دیجئے پلیز۔

آصف: کریں گے بھئی۔ پہلے ذرا اس ''الف'' صاحب کا تو پتہ کر لینے دو مجھے...... واہ...... کیا نظم ہے۔

پڑھتا ہے۔

الف کے نام

چاند کبھی تو تاروں کی اس بھیڑ سے نکلے
اور میری کھڑکی میں آئے
بالکل تنہا اور اکیلا
میں اس کو بانہوں میں بھرلوں
ایک ہی سانس میں سب کی سب وہ باتیں کرلوں
جو میرے تالو سے چمٹی
دل میں سمٹی رہتی ہیں
سب کچھ ایسے ہی ہو جائے۔ جب ہے نا
چاند میری کھڑکی میں آئے۔ تب ہے نا

واہ واہ بھئی یہ تو بڑی زبردست نظم ہے۔ اب تو تمہارے اس مسٹر الف سے ملنا ہی پڑے گا۔

آصف کی نظر زری پر پڑتی ہے۔ جو زارو قطار رو رہی ہے۔ منہ میں دوپٹہ لیکر اندر کیطرف بھاگ جاتی ہے۔

آصف: (پریشان سا ہو کر اندرونی دروازے کی طرف جا کر آواز دیتا) آئی ایم سوری...... بے بی ڈارلنگ ...... خدا کی قسم ...... میں تو ...... یہ لو بھئی مت بتاؤ مجھے اپنا راز۔ (کاپی میز پر رکھتا ہے) پلیز بے بی روتے نہیں ہیں۔

.......CUT......

سین نمبر۱۰ آصف کا گھر

آصف اپنے بسر میں کمبل لپیٹے خاموش لیٹا ہے۔ اس پر اسکی اپنی آواز O/L ہوتی ہے۔

آصف کی آواز: اگر اس روز مجھے ذرا سا بھی آئیڈیا ہو جاتا کہ اس بے وقوف لڑکی کی نظموں کا محور ''الف' اس کا کوئی ہم عمر یا کلاس فیلو نہیں۔ بلکہ وہ میرے ہی نام کا ابتدائی حرف تھا تو شاید میں کبھی دوبارہ ان کے گھر کا رخ نہ کرتا لیکن نہ جاننے کے باوجود میرے دل میں کچھ عجیب سی الجھن تھی ...... کوئی ایسا خیال جو مجھ پر واضح ہوئے بغیر مجھے Uneasy کر رہا تھا ...... ایک واہمہ سا تھا۔ جو میرے قدم روک روک لیتا تھا۔ لیکن ایک دن اچانک اقبال نواز کا فون آ گیا۔ پہلے تو وہ میرے اتنے دن نہ آنے پر ناراض ہوا اور پھر دھمکی دی کہ اگر میں فوراً اس کی طرف نہیں پہنچا تو. وہ بمعہ فیملی آئے گا اور مجھے زبردستی اٹھا کر لے جائے گا ...... سو میں کیا کر سکتا تھا۔

اس دوران میں فون آتا ہے۔ بیل کی آواز، فون سنتا ہے، چند لمحوں بعد فون رکھتا ہے کمبل الٹ کر بستر پر بیٹھ جاتا ہے۔

.......CUT......

سین نمبر۱۱ نواز کا گھر

نواز: تمہارے لئے دس بارہ تیتر میں نے صاف کر کے فریزر میں رکھوا دیئے ہیں۔ واپسی پر لے جانا نہ بھولنا۔

آصف: میرے کس کام کے ہیں ...... وہاں کون ہے پکانے والا

بیوی: اسی لئے تو کہتی ہوں کہ شادی کر لو ...... کیا فائدہ یوں لور لور پھرنے کا۔

نواز: (مزاحیہ انداز میں) یہ ہماری طرح نہیں ہے نا کہ ماں باپ نے جس کھونٹے سے باندھ دیا ساری عمر آنکھیں بند کر کے وہیں کھڑے رہے۔ کمہاروں کے گدھے

کی طرح

بیوی: (آصف سے) لگتا ہے تمہاری پسند کوئی زیادہ ہی اونچی ہے۔

کیمرہ زری پر جاتا ہے۔ جو اندرونی دروازے میں کھڑی ہے۔ پردے کے پیچھے سے اس کے پاؤں نظر آ رہے ہیں۔ آصف کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھتا ہے اور پھر Casual انداز میں بولتا ہے۔

آصف: جہاں اتنی گذری ہے باقی بھی گذر جائے گی...... دراصل میرے ہاتھ میں شادی کی لکیر ہے ہی نہیں۔

نواز: (پھلوں کی پلیٹ سے چاقو اٹھاتے ہوئے) لکیر کا کیا ہے لاؤ ابھی بنا دیتے ہیں۔ جھوٹ موٹ انداز میں آصف کا ہاتھ پکڑ کر جیسے اس پر چاقو چلانے لگتا ہے۔

ایک دم زری گھبرا کر کمرے میں آتی ہے۔

زری بے اختیاری کے انداز میں باپ کی طرف بڑھتی۔

زری: نہیں ڈیڈی نہیں...... پلیز

تینوں چند لمحے اس عمل پر مبہوت سے رہتے ہیں۔ پھر ایک دم ہنسنے لگ جاتے ہیں۔

نواز: (مسکراتے ہوئے) زری کے کہنے پر تمہیں چھوڑ رہے ہیں

آصف: تھینک یو۔ بے بی

زری شکایتی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی ہے

بیوی: یہ کیا ہے زری ڈارلنگ آپ نے انکل کو سلام بھی نہیں کیا۔

زری ہاتھ کے اشارے سے سلام کرتی ہے۔

یہ تو دیوانی ہے تمہاری...... بہت یاد کرتی ہے...... ابھی کل ہی کہہ رہی تھی کہ انکل کو پتہ کریں کہیں پھر تو باہر نہیں چلے گئے (آصف سے) کافی پیو گے؟

آصف: چلیے آپ کہتی ہیں تو پی لیتے ہیں۔

بیوی: جاؤ زری انکل کیلئے کافی لاؤ۔ چیز (Cheese) اور ویفرز بھی لانا۔

آصف: (زری سے) یہ تم نے حالت کیا بنا رکھی ہے اپنی کہیں ڈائٹنگ وغیرہ کے چکر میں تو نہیں پڑ گئیں ادھر آؤ۔

زری اس کے سامنے آ کر کھڑی ہوتی ہے ناخن کاٹتی ہے۔

یہ تم اتنی سنجیدہ کیوں رہنے لگی ہو۔ یہ عمر تو بغیر کسی وجہ کے ہنسنے کی ہوتی ہے۔

زری: (جاتے ہوئے) آپ کو کیا؟

نواز: (ہنستے ہوئے) اوہو بھئی لگتا ہے زری نے تمہاری غیر حاضری کو کچھ زیادہ ہی

محسوس کیا ہے۔
آصف چند لمحے حیرت سے زری کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر نواز سے نظر ملنے پر خواہ مخواہ مسکراتا ہے۔

.......CUT......

سین نمبر ۱۲ آصف کا گھر

نوکر پھولوں کا ایک خوبصورت بوکے جس کے ساتھ ایک کاغذ کا لفافہ پن کیا ہوا ہے۔ لے کر آتا ہے۔ آصف کا کمرہ خالی ہے ادھر اُدھر دیکھ کر باتھ روم کی طرف دیکھتا ہے۔ دروازے سے کان لگا کر جیسے پانی گرنے کی آواز سنتا ہے۔ اطمینان کے اندر میں سر ہلا کر پھول آصف کے سرہانے رکھتا ہے۔ باتھ روم سے آصف تولئے سے بال صاف کرتا ہوا آتا ہے۔

آصف: یہ کیا ہے۔ کون لایا ہے۔

نوکر: پتہ نہیں جی۔ باہر ایک موٹر سائیکل والا آیا تھا۔ وہی دے گیا ہے۔

آصف: (بوکے لے کر توجہ سے دیکھتا اور سونگھتا ہے۔ لفافہ کھول کر پڑھتا ہے ایک دم چہرے کے تاثرات بدلتے ہیں خط کی تحریر اس پر زری کی آواز میں O/L ہوتی ہے)

آپ ہمیں بھول گئے ہیں۔ لیکن ہم کیسے بھولیں۔ سالگرہ مبارک ہو۔ ممکن ہو تو فون پر بات کر لیجئے گا۔ ایک بہت مختصر نظم ہے۔ پتہ نہیں کس کی ہے لیکن مجھے اپنی لگتی ہے۔

محبت ایسا دریا ہے
کہ بارش روٹھ بھی جائے
تو پانی کم نہیں ہوتا

آپ کی زری ڈارلنگ

(آصف پریشانی کے عالم میں چاروں طرف دیکھتا ہے کاغذ کو ایک بار پھر پڑھ کر مسلتا ہے فون کی طرف جاتا ہے۔ فون اٹھاتا ہے مگر پھر کچھ سوچ کر نمبر ملائے بغیر واپس رکھ دیتا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیاں دباتا ہوا ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جاتا ہے غور سے اپنے چہرے کا جائزہ لیتا ہے۔ اس کی آواز اُسی پر O/L ہوتی ہے۔)

آصف: (آواز) میں نے اس خط کو کئی بار پڑھا اور اپنے دل کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ محض ایک معصوم انداز عقیدت ہے اور اس کے ہر حرف سے جس

اظہار عشق کی خوشبو پھوٹ رہی ہے وہ محض میرے آوارہ تخیل کی کارفرمائی ہے لیکن کوئی میرے اندر سے بار بار آوازیں دے رہا تھا کہ عمر کے اتنے فرق کے باوجود تم میری محبت میں گرفتار ہو چکی ہو اور ایک سیلاب کی طرح تمہیں میری سمت بہائے لئے آ رہی ہے میں نے اپنے آپ کو بہت سمجھایا کہ یہ میری خودستائی ہے ایسی پیاری اور معصوم بچی کو مجھ جیسے انکل نما انسان سے اس طرح کی محبت کیسے ہو سکتی ہے جیسی جولیٹ کو رومیو سے ہیر کو رانجھے سے اور مرزے سے صاحباں کو تھی...... میں نے دل میں پکا ارادہ کر لیا کہ اب چاہے کچھ بھی ہو جائے نواز کے گھر میں قدم نہیں رکھوں گا...... اور میں نے نہیں رکھا...... فون کا پلگ نکال کر نوکر کو تاکید کر دی کہ نواز صاحب بھی آئے اسے کہہ دو کہ صاحب گھر پر نہیں اور کچھ پتہ نہیں کب آئے گا۔ یوں دو مہینے گذر گئے اور اس دوران میں میرے دفتر کی کولیگ مہ رخ پتہ نہیں کیسے میرے نزدیک آتی چلی گئی۔

.......CUT......

سین نمبر ۱۳

آؤٹ ڈور۔ کسی کھلی جگہ پر ہوٹل میں آصف اور مہ رخ باتیں کر رہے ہیں مہ رخ بہت خوش دکھائی دے رہی ہے۔

مہ رخ۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ہم اس قدر جلد ایک دوسرے کے اتنے قریب آ جائیں گے۔

آصف: وہ کیا شعر ہے کسی شاعر کا کہ

تم مخاطب بھی ہو قریب بھی ہو
تم کو دیکھوں کہ تم سے بات کروں

مہ رخ: ایک نمبر کے جھوٹے ہوتے ہیں یہ شاعر لوگ...... لگاوٹ سے مسکرا کر دیکھتی ہے۔

آصف: (مزاحیہ انداز میں) دو نمبر کے...... پہلا نمبر تم عورتوں کا ہے۔

مہ رخ: پھر وہی میل شاونزم۔ اچھا یہ بتاؤ تمہارا فون ہر وقت انگیج کیوں رہتا ہے۔

آصف: وہ...... دراصل ایک دم کچھ سوچ کر رک جاتا ہے خراب ہے...... کیوں؟

مہ رخ: میرے بھائی جان آئے ہیں امریکہ سے...... تم سے ملنا چاہ رہے تھے۔

آصف: تو انہیں گھر لے آؤ نا کسی وقت ...... چائے تو میرا نوکر بنا ہی لیتا ہے۔
مہ رخ: کل چھٹی ہے ...... ہم لوگ صبح دس بجے کے قریب آئیں گے۔
آصف: بھئی چھٹی کے دن تو دس بجے بہت Early ہے ...... دوپہر کے بعد کیسا رہے گا۔
مہ رخ: (سوچتے ہوئے) ٹھیک ہے ...... مگر خدا کیلئے شیو ضرور کر لینا۔
آصف: اگرچہ کنفیوشس نے کہا ہے کہ چھٹی کے دن شیو کرنے سے چھٹی کا مقصد فوت ہو جاتا ہے لیکن تمہارے بھائی صاحب کے آنر میں ہم یہ قربانی بھی دے دیں گے۔

.......CUT......

سین نمبر ۱۴

آصف کا گھر گھڑی پر دن کا ایک بج رہا ہے دروازے کی گھنٹی بجتی ہے آصف کا کمرہ خالی ہے چند لمحوں بعد وہ باتھ روم سے تولیے کے ساتھ شیو کا جھاگ صاف کرتے ہوئے نکلتا ہے دروازہ کھولتا ہے ایک دم حیرت زدہ سا ہو کر پیچھے مڑتا ہے دروازے میں زری خاموش اور قدرے Tense کھڑی ہے

آصف: تم ...... تم یہاں کیسے! ...... آؤ اندر آ جاؤ
ڈیڈی کہاں ہیں؟
(زری اپنے رومال کا گولا سا بنا کر اسے بے چینی سے ملتی ہے کچھ کہتے کہتے رک جاتی ہے۔)
بات کیا ہے کچھ بولو نا!
(آصف جیسے اس کے کندھے کے اوپر سے نواز اور بیوی کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے۔)
زری: میں اکیلی آئی ہوں جی۔
آصف: ایک دم جیسے چکرا سا جاتا ہے اکیلی کیوں ایک لمبا سانس لے کر اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر بولتا ہے اکیلی کیوں آئی ہو۔
زری: آنسو بھری آنکھوں اور لرزتے ہونٹوں کے ساتھ دانتوں سے اپنا ناخن کاٹتے ہوئے بولتی ہے آپ مجھ سے ناراض ہیں ناں

آصف: نہیں نہیں ...... ہرگز نہیں ...... میں تم سے کیوں ناراض ہونے لگا۔
زری: پھر آپ ہمارے گھر کیوں نہیں آتے۔
آصف: آؤں گا۔ بہت جلد آؤں گا ...... بس کچھ ایسی مصروفیت رہی کہ ...... نواز کو پتہ ہے کہ تم یہاں آئی ہو (زری نفی میں سر ہلاتی ہے) یہ تو اچھی بات نہیں ...... آؤ میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں۔ میں دومنٹ میں کپڑے بدل کر آتا ہوں۔
زری: (اپنی جگہ سے ہلے بغیر زمین کی طرف دیکھتے ہوئے بولتی ہے) میں آپ سے ملنے آئی ہوں۔
آصف: (پریشانی میں ہاتھ مل کر پھیکی سی ہنسی ہنستا ہے) چلو تمہارے گھر چل کر باتیں کرتے ہیں۔ اسی بہانے تمہارے ڈیڈی ممی سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ ٹھیک ہے نا بیٹی۔
زری: میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں۔
آصف: (زبردستی ہنستے ہوئے) کم ان ڈارلنگ ایسی باتیں نہیں کرتے۔
زری: (مستحکم لہجے میں) اور مجھے ڈیڈی کی طرح ڈارلنگ بھی نہ کہا کریں۔
آصف: تو چلو تم ہی بتادو کہ تمہیں کیا کہا کریں بے بی کہنا بھی تمہیں اچھا نہیں لگتا۔
زری: (روہانسی آواز میں) آپ سمجھتے کیوں نہیں۔
آصف: (اس کے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر اسے بزرگانہ انداز میں سمجھاتا ہے) میں اس لئے نہیں سمجھتا میری ڈارلنگ بچے کہ میں تمہاری بات سمجھنا نہیں چاہتا ...... وعدہ کرو کہ تم آئندہ یہاں کبھی نہیں آؤ گی اور یہ بات کبھی نہیں بھولو گی کہ میں تمہارا صرف اور صرف انکل ہوں ...... تمہارے باپ کا دوست ...... میں نے تمہیں اپنی گود میں کھلایا ہے۔
زری: لیکن سر ...... اب تو میں بڑی ہو گئی ہوں۔
آصف: اول تو تم بڑی نہیں ہوئیں اور اگر ہو بھی جاؤ تو میرے لئے ہمیشہ چھوٹی ہی رہو گی ...... تم ابھی بچی ہو ...... بہت سی باتوں کو نہیں سمجھتیں ...... کیا تمہیں پتہ ہے کہ تمہارے ماں باپ اس طرح تمہارے یہاں آنے سے کتنے ناخوش ہوں گے۔
(زری ہونٹ دانتوں سے کاٹ کر مثبت میں سر ہلاتی ہے) تو پھر وعدہ کرو کہ آئندہ تم ایسا نہیں کرو گی ......
زری: (زری مثبت میں سر ہلاتی ہے) آپ بھی وعدہ کریں کہ ہمارے گھر آیا کریں گے۔ ہفتے میں کم از کم ایک بار

آصف: (اس کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھتا ہے) Ok Promise
زری چند لمحے جھجک کر اس کا ہاتھ پکڑتی ہے اور چوم لیتی ہے آصف ایک لمحے کے لئے پریشان ہو جاتا ہے پھر ہنس کر کہتا ہے۔

آصف: You are a silly little child

.......CUT......

سین نمبر۱۶ آؤٹ ڈور

نواز: (سنجیدہ اور فکر آمیز لہجے میں) کئی دنوں سے میں ایک بات تم سے کرنا چاہ رہا ہوں...... سمجھ میں نہیں آتا کیسے کروں...... عجیب اُلجھن میں پڑ گیا ہوں......

آصف: کوئی نوکری کی پریشانی ہے۔

نواز: نہیں...... (ایک لمبا سانس لے کر فیصلہ کن لہجے میں بولتا ہے) زری کی حالت دیکھ رہے ہو تم......

آصف: (ایک دم جیسے چوکنا سا ہو جاتا ہے) ہاں۔ کیوں

نواز: کچھ سمجھ میں نہیں آتا اسے کیا ہو گیا ہے...... کیسی Full of life بچی تھی وہ...... مگر اب نہ کچھ کھاتی ہے نہ پیتی ہے...... نہ ہنستی بولتی ہے...... میں نے اور تمہاری بھابھی نے بہت کریدنے کی کوشش کی ہے مگر وہ کچھ بتاتی ہی نہیں...... تمہارے خیال میں کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

آصف: (نظر چراتے ہوئے) میں کیا کہہ سکتا ہوں بھئی...... دیکھو نا

نواز: مجھے شبہ سا ہے کہ وہ کہیں انوالو (Involve) ہو گئی ہے محبت ہو گئی ہے اسے کسی سے...... کیونکہ سب نشانیاں اسی کی ہیں...... اس کی ماں نے میرے کہنے پر بہت کھل کر اس سے بات کی ہے کہ اگر ایسا ہے تو ہمیں بتا دے...... ہم اس کی مدد کریں گے مگر وہ نہ تو بات مانتی ہے اور نہ کسی کا نام بتاتی ہے۔

آصف: (تھوک نگلتے ہوئے) ہو سکتا ہے اس کی یہ حالت کسی جسمانی بیماری کی وجہ سے ہو...... اس عمر میں لڑکیاں...... میرا مطلب ہے کسی سپیشلسٹ سے مشورہ کر لیں۔

نواز: کیا ہے...... مکمل چیک اپ کر دیا ہے...... ڈاکٹرز کہتے ہیں...... نو پرابلم۔ تم سے وہ بہت attached ہے...... تمہاری مانتی بھی بہت ہے...... تم اس سے بات کرو پتہ تو کرو...... اسے کیا پریشانی ہے...... میں اس کی خوشی کی خاطر سب کچھ کر سکتا

ہوں...... اگر اسے کسی سے محبت ہوگئی ہے تو مجھے بتائے۔ میں ہرگز ہرگز اس کے رستے میں دیوار نہیں بنوں گا۔

آصف: ابھی تو وہ بچی ہے اس عمر میں تو لڑکیاں زیادہ سے زیادہ اپنی استانیوں سے ہک (Hook) ہوتی ہیں۔ میرا خیال ہے یہ محض ایک وقتی کیفیت ہے...... ٹھیک ہو جائے گی وہ انشاء اللہ

نواز: (نواز نا یوسی میں اپنے سر کو دائیں سے بائیں ہلاتا ہے) پھر بھی تم ایک بار اس سے بات تو کرو...... میری خاطر...... کل شام چار بجے میں تمہاری بھابھی کو بہانے سے لے کر کچھ دیر کے لئے نکل جاؤں گا تم اکیلے میں اس سے بات کرو پوچھو کہ وہ کیا چاہتی ہے......

آصف: (پریشان سا ہو کر) مگر......

نواز: (اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر) پلیز آصف Help me

آصف اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اثبات میں سر ہلاتا ہے۔

.......CUT......

سین نمبر ۱۶

نواز کا گھر، زری ایک طرف خاموش بیٹھی ہے اس کا چہرہ اُترا ہوا اور لباس شکنوں بھرا ہے آصف دیوار کی طرف منہ کئے Tense انداز میں کھڑا ہے۔ چند لمحوں کی خاموشی

آصف: تمہیں اندازہ نہیں کہ نواز اور بھابھی تمہاری وجہ سے کتنے پریشان ہیں۔

زری: مجھے پتہ ہے...... لیکن میں کیا کروں...... میں بہت کوشش کرتی ہوں...... بہت سمجھاتی ہوں اپنے آپ کو مگر مجھ سے نہیں ہوتا...... آپ کیوں نہیں سمجھتے اس بات کو

آصف: کس بات کو

زری: یہی کے آپ کیے سارے لیکچروں کے باوجود میرا دل آپ ہی کی طرف جھکا رہتا ہے۔

آصف: بے وقوفی کی باتیں مت کرو...... تمہاری اور میری عمروں میں......

زری: عمروں کا اس بات سے کیا تعلق ہے...... محبت کوئی سرکاری نوکری تو نہیں جس میں age limit ہوتی ہے مگر آپ کو شاید پتہ ہی نہیں کہ محبت کیا ہے۔

آصف: (فوری غصے سے) ہاں ہاں مجھے نہیں پتہ...... اور یہ جس چیز کو تم بار بار محبت کہہ رہی ہو تمہیں خود بھی علم نہیں کہ یہ کیا ہے۔ (زری اس کی آنکھوں میں آنکھیں

ڈال کر اعتماد کے ساتھ اس کی طرف دیکھتی ہے آصف اس کی نگاہوں کی تاب نہ لا کر جھکا لیتا ہے) میں تم سے اس طرح کی محبت نہیں کر سکتا جو...... اپنے آپ کو سنبھالو پلیز...... تمہیں تو لوگ شاید بچہ سمجھ کر معاف کر دیں مگر میں دنیا کو کیا منہ دکھاؤں گا...... اگر میں وقت پر شادی کر لیتا تو تمہاری عمر کی میری بیٹی ہوتی۔

زری: مگر میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں۔

آصف: ٹھیک ہے...... تم نہیں سمجھو گی...... میں جا رہا ہوں...... نواز آئے تو اسے بتا دینا کہ میں اس سے آخری بار ملنے آیا تھا۔ میں یہ ملک ہی چھوڑ رہا ہوں۔

زری: (آصف جانے کیلئے مڑتا ہے زری ایک دم اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتی ہے) مجھ سے شادی کر لیجئے پلیز...... دو دن کے لئے...... ایک دن کے لئے...... ساری لڑکیاں مجھے چھیڑتی ہیں...... آصف صاحب خدا کیلئے مجھ سے نکاح کر لیجئے...... ایک بار میرے ساتھ دو بول پڑھوا لیجیے پھر چاہے اسی وقت طلاق دے دیجئے گا...... مجھے اپنے نام سے منسوب کر لیجئے میں ہمیشہ آپ کی احسان مند رہوں گی۔

آصف: (جیسے سکتے میں آ جاتا ہے کمزور آواز میں بولتا ہے) لڑکیوں کو اس بات کا علم کیسے ہوا زری!

زری: ہو گیا ہے جی...... ہونا ہی تھا...... میں آپ کی تصویر جو ساتھ لے جاتی تھی کالج بیگ میں۔ پلیز......

آصف: (چند لمحے کچھ سوچتا ہے پھر دونوں ہاتھ زری کے کندھوں پر رکھتا ہے جن پر وہ فوراً ہاتھ رکھ دیتی ہے) دیکھو زری...... میری بات دھیان سے سنو۔ میں تمہاری محبت کی عزت کرتا ہوں...... بہت عزت کرتا ہوں...... لیکن تم ابھی بچہ ہو...... یہ دور گذر جائے گا تو تم خود اس جذبے پر ہنسو گی...... بچپن میں سبھی اس طرح محبت کرتے ہیں...... پاگلوں کی طرح ٹوٹ کر...... لیکن نواز میرا جگری دوست ہے...... یہ اس کا میری ذات پر اعتماد ہے کہ میں اس وقت...... اس کی عدم موجودگی میں تمہارے پاس ہوں...... خدا کے لئے اس طرح سوچنا چھوڑ دو۔ میرا تمہارا اس کے علاوہ کوئی رشتہ ممکن نہیں کہ تم میرے دوست کی بیٹی ہو اور اس رشتے سے......

زری: (آنسوؤں سے بھرا ہوا چہرہ اٹھا کر بولتی ہے) بس اور کچھ نہ کہیے گا۔ پلیز...... آپ کو میری قسم.

آصف: اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے زری...... (زری اس کی طرف دیکھتی

ہے آصف اس کا ہاتھ محبت سے سہلاتے ہوئے بولتا ہے) مجھے کسی اوڑ سے محبت ہے...... بالکل ایسی ہی محبت جیسی تمہیں مجھ سے ہے...... میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، سمجھیں زری!

زری: جی (خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی ہے) سمجھ گئی۔

ایک دم تیزی سے مڑ کر اندرونی کمرے کی طرف جاتی ہے آصف چند لمحے ہکا بکا کھڑا رہتا ہے

.......CUT......

سین نمبر ۱۷

آؤٹ ڈور۔ رات کا وقت سنسناتی سڑکوں پر آصف تیزی سے کار چلاتا جا رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے ہیں اور ہونٹ بھینچے ہوئے، ہسپتال کے گیٹ میں داخل ہوتا ہے۔ ایک ایمبولینس شور مچاتی ہوئی اس کے قریب سے گذرتی ہے۔

.......CUT......

سین نمبر ۱۸

ہسپتال کا کاریڈور۔ آپریشن تھیٹر کے باہر نواز اور بیوی سر جھکائے بیٹھے ہیں ایک طرف آصف آتا ہے نواز اٹھ کر اسے ملتا ہے

نواز: بڑی دیر لگا دی تم نے آصف

بیوی آصف کو دیکھ کر رونے لگتی ہے نواز اسے ہاتھ کے اشارے سے خاموش کراتا ہے۔

آصف: میں تو آپ کا فون ملتے ہی نکل پڑا تھا...... کیسی ہے وہ

نواز: (نیم جذباتی انداز میں لیکن آواز دبا کر بولتا ہے) اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اسے مرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو میں اپنے ہاتھوں سے اسے شوٹ کر دیتا اسے دو گھنٹے مرنے میں نہ لگتے۔

آصف: (جیسے ایک دم ڈھے سا جاتا ہے) اوہ مائی گاڈ

نواز: (جیسے اپنے آپ سے بات کرتا ہے) ایک شکاری کی بیٹی کا نشانہ اتنا خراب...... پورے دو گھنٹے سسکتی رہی ہے وہ کاش میں اسے ہسپتال میں نہ لایا ہوتا

آصف...... گھر ہو یا ہسپتال۔ خدا تو وہی رہتا ہے نا ہے نا......

آصف: کہاں ہے وہ!

نواز: کچھ پتہ نہیں...... میں تو جب پہنچا ہوں وہ بے ہوش پڑی تھی...... اس نے کیا بتایا آصف...... کیا اسے واقعی کسی سے محبت تھی۔
آصف: (پریشان سا ہو کر کچھ کہنے کی ناکام کوشش کرتا ہے) دراصل
نواز: میری سمجھ میں نہیں آتا وہ کون تھا جسے اس نے چاہا اور وہ اسے نہ چاہ سکا...... یہ کیسے ہو سکتا ہے آصف...... وہ جو بھی تھا ہم بھی اس کے خلاف نہ ہوتے...... زری نے یہ کیوں سمجھا کہ میں اس کی محبت میں رکاوٹ ہوں گا...... کیوں۔ کیوں۔ کیوں!

.......CUT......

سین نمبر ۱۹

آصف کا کمرہ فلیش بیک ختم ہوتا ہے آصف اسی انداز میں بیٹھا ہے اس پر اسی کی آواز O / L ہوتی ہے۔

آصف: (آواز) میں تمہارے ڈیڈی کو کیا سمجھاتا زری...... کیسے سمجھاتا...... میں تو تمہیں بھی نہ بتا سکا کہ تمہارے جانے کے بعد...... اور مہ رخ کے مل جانے کے باوجود مجھ پر کیا گزری...... تمہاری محبت تمہارے بعد مجھ تک پہنچی ہے زری...... اس محبت کا تمہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکا...... میں نے بھی اس سے تمہاری یادوں کے علاوہ کچھ نہیں پایا...... تمہاری یادیں جو امربیل کی طرح میرے وجود پر چڑھ چکی ہیں میری لوگوں سے گرہیں باندھ لی ہیں اس نے...... میرا کوئی ماضی نہیں...... کوئی مستقبل نہیں...... میں وہ مریض ہوں جس کی رگوں میں کلوروفارم کا نشہ شاں شاں کر رہا ہے اور وہ آپریشن تھیٹر سے بھاگ آیا ہے اور بھاگتا چلا جارہا ہے کسی رستے...... کسی منزل کے بغیر...... تم نے ٹھیک کہا تھا زری محبت کوئی سرکاری نوکری نہیں Age limit کی پابندی ہوتی ہے...... مگر اس وقت مجھے پتہ ہی کیا تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆

عذرا اصغر، کراچی

(چوتھی قسط)

مسافتوں کی تھکن

زندگی اپنے معمول کی رفتار پر گامزن تھی مگر رخشندہ بیگم کی اندرونی کیفیت میں ہلچل تھی۔ کچھ بدل رہا تھا۔ جیسے برسوں کا بیمار صحت مند ہوتا ہے تو اس کے رگ و پے میں نئی توانائی بھرتی ہے۔ کمزور اور لاغر بدن آہستہ آہستہ جاگتا ہے اور دنیا نئی اور خوبصورت نظر آتی ہے۔ رخشندہ بیگم کے ساتھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ زندگی کا سہانا پن انھیں گدگداتا تھا اور ہونٹ آپ سے آپ مسکرا اٹھتے تھے۔ فرجاد کریم نے انھیں احساس دلایا تھا کہ وہ اس دنیا کی زندہ اور اہم فرد ہیں۔ اس کائنات کے ہنگاموں میں ان کا بھی حصہ ہے۔ ان خوشیوں اور مسکراہٹوں پر ان کا بھی حق ہے جو اس جہان میں بکھری پڑی ہیں — اور یہ کہ وہ اس کائنات کی زندہ اور اہم فرد ہیں۔

''مگر اس نے ایسا کیوں کیا۔ اس کو مجھ سے کیا غرض و سروکار؟ کیوں وہ مجھے میری اہمیت کا احساس دلانا چاہتا ہے''۔

یہ سب رخشندہ بیگم نے معمول کے اپنے کاموں سے فراغت پا کے اپنے کمرے میں رات کے کپڑے بدلتے ہوئے سوچا۔

''وہ وجیہہ شخص جس کا نام فرجاد کریم تھا اور جس کے بارے میں وہ کچھ زیادہ نہیں جانتی تھیں۔ اور جب وہ ان سے محوکلام تھا تو انھوں نے اس کے بارے میں زیادہ کچھ جاننے کی نہ خواہش محسوس کی تھی اور نہ ضرورت۔ یوں بھی کوئی کسی کو جان لینے کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہے۔ انسان تو خود اپنا بھید بھاؤ نہیں جان پاتا اور وہ تو بس ایسے ملا تھا جیسے راہ چلتے دو راہگیر یا سفر کے دوران ملنے والے دو مسافر۔ جنھیں معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنا اپنا اسٹیشن آنے پر سواری سے اتر کر اپنی اپنی منزل کی طرف چلے جانا ہے۔ پھر کبھی نہ ملنے کے لیے۔ اس تمام تر حقیقت کے باوجود وہ اس کی پر اعتماد اور بے تکلفانہ شخصیت کے سحر میں اس سے اپنائیت کے ساتھ باتیں کرتی رہی تھیں۔ ایسی باتیں اور ایسے خیالات کا اظہار جو اس سے پہلے وہ کسی سے نہیں کر سکتی تھیں۔ ذرا ط

سے ان کا رابطہ تھا ضرور۔ بے تکلفی تھی۔ مگر زراط کے مزاج میں بچگانہ رومینس تھا۔ یہ شاید اس کی عمر کا تقاضا تھا اور رخشندہ بیگم کے لیے وقت گزاری کا ایک بہتر ذریعہ تھا۔ وہ یقیناً زراط پر عاشق نہیں ہوگئی تھیں مگر اس کی باتیں انھیں نشاط و سرور پہنچاتی تھیں۔ وہ بخوبی جانتی تھیں کہ یہ سب نہایت وقتی اور بے ضرر سا ہے۔ مگر فرجاد کریم ایک سنجیدہ اور میچور انسان تھا جس کے ساتھ وہ لا ابالی پن سے بات نہیں کر سکتی تھیں۔ یوں بھی وقت نے انھیں دائمی مسرتوں کے حصول سے دور کر دیا تھا اور ان کی اب تک کی زندگی میں رونما ہونے والا پہلا واقعہ تھا کہ انھوں نے کسی انجان مرد سے اتنی بے تکلفانہ اور بے جھجک باتیں کی تھیں اور اب وہ اپنے اس پُر اعتماد، بے خوف اندازِ تخاطب پر مسرور بھی ہو رہی تھیں اور حیران بھی۔ روشنا اور تعبیر اپنے دوستوں میں مگن رہتے اور وہ ایک آرام دہ صوفے پر انمول کے ساتھ بیٹھی اس اجنبی مرد سے محوِ تکلم رہتیں اور اس کی بھرپور مردانہ شخصیت کے اثر میں خود کو بھیگتا محسوس کرتیں۔ اب یہ ان سب کا معمول تھا۔ شام کو کلب جاتے ہوئے تعبیر اور روشنا انھیں بھی ساتھ لے لیتے۔ وہ بہت اہتمام سے تیار ہوتیں۔ جس کا انتظام وہ وقت سے پہلے ہی کر لیا کرتی تھیں۔ مگر ایسے غیر محسوس طریقے سے کہ کسی کو پتہ نہ چلے، مگر روشنا کی تیز، بھانپ لینے والی نظروں سے ان کے انتظامات پوشیدہ نہیں تھے۔ وہ دیکھتی تھی کہ کلب پہنچتے ہی فرجاد کریم جو پہلے سے وہاں موجود ہوتا ہے رخشندہ اس کی پھوپھی کے پاس آبیٹھتا ہے اور پھر وہ دونوں جانے کن قصے کہانیوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ اپنے دوستوں میں مصروف ہوتے ہوئے بھی روشنا رخشندہ اور فرجاد کو اپنی نگاہوں کے حصار میں رکھتی اور جب اس کی الجھن بہت بڑھ گئی تو اس نے تعبیر سے اس کا اظہار کر ہی دیا''۔

''تم جانتے ہو تعبیر کہ میں آج کل باجی کی طرف سے بہت الجھن میں مبتلا ہوں''۔

''کیوں بھئی۔ خیر تو ہے؟ کیا ہوا باجی کو''۔ اس نے تشویش سے پوچھا۔

''تعبیر باجی کو کچھ ہوا ضرور ہے۔ تم کیا دیکھتے نہیں۔ باجی اور فرجاد کریم کی بے تکلفی بڑھتی جا رہی ہے۔ یہاں سے باجی غیر معمولی سج دھج کے ساتھ جاتی ہیں اور وہاں کلب پہنچتے ہی فرجاد کریم ان کے پاس آبیٹھتا ہے اور پھر جیسے باتوں میں انھیں دنیا و مافیا کی خبر نہیں رہتی''۔

روشنا نے یکدم سارا غبار نکال دیا۔ تعبیر اس کی بے تابی پر مسکرایا اور بولا۔

''تم کیا چاہتی ہو روشی؟ کیا باجی میری اور تمھاری محکوم بن کے رہیں؟''

''یہ میں نے کب کہا ہے۔ لیکن ذرا یہ سوچو، پاپا نے انھیں یہاں ہماری ذمہ داری پر بھیجا ہے اور باجی یوں من مانی کرنے لگیں تو......'' روشنا نے بات ادھوری چھوڑ دی مگر اس کے لہجے میں تشویش تھی۔ جو وہ کہنا چاہ رہی تھی کہہ نہیں پا رہی تھی۔

''روشی آپ کے پاپا نے باجی کی ذمہ داری آپ کے سپرد نہیں کی۔ انھوں نے باجی کو آپ کی دوسرائتی کے لیے بھیجا ہے۔ ان کے سپرد آپ کی دیکھ بھال کی ذمہ داری کی ہے اور تم باجی بچاری کو اپنا غلام تصور کرنے لگیں۔ روشی کیا انھیں یہ حق نہیں کہ وہ اپنی مرضی سے جی سکیں۔ وہ کسی سے بات کرنے کے لیے بھی کیا پہلے تم سے اجازت لیا کریں؟'' تعبیر بڑے رسان سے اسے سمجھاتا رہا۔

''تعبیر یہ بات نہیں ہے''۔

''پھر کیا بات ہے؟ یار ذرا سوچو، وہ بھی ایک جیتی جاگتی انسان ہیں۔ باشعور ہیں۔ پڑھی لکھی ہیں۔ وہ جوان ہیں۔ ان کے اندر بھی جذبات ہیں اور وہ اتنی ناسمجھ بھی نہیں ہیں کہ اپنا برا بھلا محسوس نہ کر سکیں۔ ان پر ایک نہیں کئی صدمے گزر چکے ہیں۔ اب اگر وہ زندگی کی طرف لوٹ رہی ہیں تو ہمیں سب کو شکر کرنا چاہیے۔ میری جان ان کی زندگی میں اتنی تلخیاں نہ بھرو کہ وہ جیتے جی مر جائیں''۔

''دراصل تعبیر باجی ایسی تھیں نہیں۔ وہ تو کسی کے سامنے بولتی بھی نہیں تھیں مگر اب__؟ اب تو وہ اتنی پُراعتماد ہوگئی ہیں کہ غیر مردوں سے بھی اتنی بے تکلفی سے گھنٹوں باتیں کرتی ہیں کہ انھیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ وہی باجی ہیں۔ بے زبان۔ شرمیلی''۔

''ڈونٹ بی سلی روشی۔ باجی کو اپنی زندگی جینے دو۔ ان کے بارے میں سوچ سوچ کے خود کو ہلکان مت کرو۔ انتظار کرو کہ وہ اپنے لیے، اپنی آئندہ زندگی کے لیے کیا فیصلہ کرتی ہیں''۔ تعبیر نے پلنگ پر نیم دراز حالت میں برابر بیٹھی روشنا سے کہا اور پھر اس کی ٹھوڑی کو اپنی انگلیوں سے اونچا کر کے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

''میری رانی! تم نے سولہ سترہ برس کی نہایت ناپختہ عمر میں مجھ سے شادی کا فیصلہ کر لیا تھا اور باجی بچاری کو انتیس تیس سال کی عمر میں میں بھی اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ بات تک کرنے کی اجازت دینا نہیں چاہتی ہو۔ تمھیں کیا خوف ہے آخر؟ سوچو اور اپنا ذہن صاف کرو''۔

''ہاں جانے مجھے کاہے کا خوف ہے۔ واقعی میں خوفزدہ ہوں''۔ اس نے تعبیر کے سینے پر سر رکھ کے آہستہ سے کہا اور ایک آہ کے ساتھ سانس کھینچا۔ ''اگر باجی کو اب کوئی معقول شخص اپنی زندگی کا ساتھی بنالے اور باجی بھی اس بات کے لیے تیار ہو جاتی ہیں تو ہمیں مطمئن ہونا چاہیے اور خوش بھی اور میں سمجھتا ہوں ایسا ہو جانا چاہیے۔ مگر میں نہیں جانتا کہ فرجاد کریم غیر شادی شدہ ہے یا اس کے ساتھ کوئی حادثہ یعنی کوئی Mishap ہوا ہے۔ بہرحال اگر وہ مجرد ہے اور باجی کے ساتھ سنجیدہ ہے تو میرا خیال ہے کہ ان کا اچھا کپل رہے گا''۔

اس نے آہستہ آہستہ روشنا کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔
''ہاں یہ سب تو تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن میں نے اپنے گھر میں دیکھا ہے، بلکہ محسوس کیا ہے— کہ —'' وہ بات ادھوری چھوڑ کے چپ ہوگئی اور سیدھی لیٹ کے ہاتھ سینے پر باندھ لیے۔ جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔
''ہاں بولو نا۔ کیا دیکھا۔ کیا محسوس کیا''۔ وہ روشنا کی طرف رخ پھیرتے ہوئے بولا۔
''سب لوگ یہی کہتے ہیں کہ اب باجی کی شادی کی عمر نکل گئی ہے۔ بس ہمارے ذہن میں بھی شاید یہی بات جم گئی ہے''۔ اس نے لفظوں کو چبا چبا کے بات مکمل کی۔
''عجیب منطق ہے بھئی —— دیکھو اول تو باجی ابھی فوری طور پر شادی نہیں کرنے لگیں اور اگر وہ کر بھی لیں تو یہ ان کا حق ہے۔ مگر وہ خود سے ہرگز ایسا نہیں کرنے لگیں۔ میں جانتا ہوں انھیں اپنے خاندانی وقار اور اقدار کا بہت احساس ہے۔ وہ باغی ذہن کی مالک نہیں ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا فرجاد کریم کیا واقعی باجی کو پسند کرتا ہے اور یہ کہ کیا وہ غیر شادی شدہ ہے۔ یہ تو خیر ہم سب جانتے ہیں کہ وہ ایک متمول شخص ہے اور اچھے کردار کا مالک ہے۔ لیکن وہ زیادہ تر کسی سے گھلتا ملتا نہیں۔ اس لحاظ سے باجی سے اس کی دوستی معنی خیز ضرور ہے''۔ اتنا کہہ کر وہ چپ ہوگیا اور خاموش لیٹی روشنا کے گال کو ہلکے ہلکے تھپتھپانے لگا۔ کچھ دیر دونوں خاموش رہے پھر روشنا نے ہولے ہولے کہنا شروع کیا۔
''یہ سچ ہے تعبیر کہ باجی کی اب تک کی ساری زندگی دوسروں کی خدمت کرتے ہی کٹی ہے۔ دادی اماں ان کا البتہ بہت خیال رکھتی تھیں لیکن ان کے بعد تو جیسے وہ بچاری رُل گئیں۔ وہ میرے پاپا سے بہت چھوٹی ہیں۔ پاپا اور چچا کے درمیان ان کے دو بھائی اور تھے۔ ان چاروں کے بعد باجی پیدا ہوئی تھیں۔ دادی اماں بتایا کرتی تھیں کہ جب باجی پیدا ہوئیں تو دادا نے خصوصیت سے بہت خوشی منائی تھی۔ مٹھائیاں تقسیم کی تھیں۔ لیکن گھر کی بڑی بیٹی ہونے کی وجہ سے ذمہ دار بھی وہی بنیں۔ اپنے بعد پیدا ہونے والے بہن بھائیوں کے علاوہ انھوں نے ہمیں بھی سنبھالا اور پھر چھوٹی بہنیں بیاہی گئیں تو باجی ان کی بھی مدد کرتی رہیں۔ پھر دادی اماں کے انتقال کے بعد تو سب نے انھیں ایک فالتو پرزہ سمجھنا شروع کر دیا۔ ہر کوئی انھیں Forgranted ہی لینے لگا۔ دادا، دادی کی بیماری میں بھی باجی ہی نرس بنی رہیں۔ راشد چچا کے سلسلے میں تو کسی نے ایک لمحہ کو بھی نہ سوچا کہ ان پر کیا گزری ہے۔ ان کے جذبات میں یقیناً طلاطم بپا ہوا ہوگا۔ جانے یہ حادثہ انھوں نے کیسے برداشت کیا۔ وہ راشد چچا کو بہت چاہتی تھیں۔ بچپن سے انھوں نے خود کو راشد چچا سے منسوب پایا تھا۔ ان کی محبت کوئی دو دن کی بات تو نہ تھی۔ برسوں پر محیط تھی اور جب راشد چچا کی شادی کی خبر

ہمارے گھر پہنچی تو سارا گھر گویا ماتم کدہ بن گیا تھا۔ مگر باجی بچاری سے کسی نے ہمدردی یا تسلی کے دو بول بھی نہ بولے۔ ان کو اس سارے معاملے میں قطعی غیر جانبدار سمجھا گیا۔ الٹا باجی دادی اماں کو سنبھالتی رہیں۔ ان کی ڈھارس بندھاتی رہیں اور تسلیاں دیتی رہیں۔ خود وہ چپ چاپ یہ صدمہ سہ گئیں۔ پھر راشد چچا کی شادی کی خبر عام ہوئی تو ان کے لیے رشتے آنے لگے مگر آنے والوں میں کوئی نہ کوئی نقص نکال کر ریجیکٹ کر دیا جاتا رہا۔ رشتوں کی مخالفت میں پہلے پہلے میری دوسری پھوپھیاں اور ان کے شوہر پیش پیش رہے۔ پھوپھیاں اس طریقے سے دادی کو بتاتیں کہ وہ ان لوگوں کی بات کو صحیح سمجھ کر رشتے سے انکار کر دیتیں۔ پھر میرے پاپا بھی اس سازش میں شامل ہو گئے جو اپنی مصلحتوں کے سبب باجی کی شادی کے خلاف کی جا رہی تھی''۔

''یہ سازش تھی —؟ تم کیا کہہ رہی ہو؟''

''ہاں تعبیر یہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ جس پر سب نے مل کر بیٹھک میٹنگ نہ کی ہو مگر سب شامل لگتے تھے۔ جیسے سب آپس میں ایک دوسرے کی بات سمجھتے ہوں۔ البتہ میرے بڑے چچا اور چچی ان کی شادی کے لیے کوشاں رہے۔ مگر پاپا نے یہ کہہ کر سب کی زبان بند کر دی کہ ''تم سب رخشندہ کی فکر کرنا چھوڑ دو۔ مجھ پر اپنی بہن کی دو روٹیاں بھاری نہیں ہیں''۔ دادی اماں کے انتقال کے بعد وہ باجی کو اپنے ساتھ لے گئے اور دو لاکھ روپے سے ان کا ایک اکاؤنٹ کھلوا دیا۔ اس کے علاوہ پاپا نے سب بہن بھائیوں کو آمادہ کر کے دادا والا مکان باجی کے نام منتقل کروا دیا اور اب انمول کی پیدائش پر انھیں ہماری دوسرا اتھ کے لیے یہاں بھیج دیا گیا''۔

تعبیر نہایت سکون سے روشنا کو بولتے سنتا رہا۔ وہ بات ختم کر چکی تو تعبیر نے ایک لمبی ہوں کی اور بولا۔

''یعنی باجی بچاری ساری زندگی خاندانی خدمت میں گزاریں گی اور اس فریضے کو ادا کرنے کے لیے ان کی رضامندی کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ وہ —! جنھیں دو لاکھ بنک بیلنس اور ایک عدد شاندار مکان کی ملکیت کی مایا جال سے نواز کر بہلا دیا گیا ہے۔ مگر یار دادی اماں نے کیوں اپنی زندگی میں ان کو نہیں بیاہ دیا؟''

''میں نے بتایا ہے کہ نا کہ دادی اماں بچاری تو بہت چاہتی تھیں مگر اولاد ان کی بات مانتی ہی نہیں تھی۔ سب کو اپنے اپنے مفاد جو نظر آتے تھے''۔

تھوڑی دیر وہ خاموشی لیٹی چھت کو گھورتی رہی۔ پھر کہنے لگی۔

''اُس وقت سب سے بڑھ چڑھ کر چھوٹی پھوپھو باجی کی شادی کی مخالفت کرتی تھیں اور ان کے میاں۔ پھوپھو کے دو بچے بہت چھوٹے تھے اور پھوپھو اکیلی ان کو سنبھال نہیں پاتی تھیں اور

تب وہ تقریباً مستقل طور پر دادی اماں کے پاس ہی رہتی تھیں۔ باجی کو ان کے بچے ان سے بڑھ کر سنبھالنا پڑتے تھے۔ بلکہ سنبھالتی ہی وہ تھیں''۔

پھر وہ خود ہی ٹھہر ٹھہر کر بولتی گئی۔

''آپ اسے خودغرضی کہہ لیں لیکن اب مزید اتنا وقت گزر گیا اور اب اس کے سوا کوئی صورت باقی نہیں بچتی کہ باجی اسی طرح گھوم پھر کر وقت گزاریں۔ کسی ایک جگہ رہنے پر اصرار کریں تو شاید اس طرح ان کے رکھنے والے تنگ آجائیں۔ شاید ان کی قسمت میں یہ ہی سب تھا''۔ وہ پھر چپ ہوگئی۔

''کمال ہے۔ یعنی اپنی طرف سے آپ نے ساری باتیں خود ہی طے کرلی ہیں۔ یعنی باجی کی شادی اب نہیں ہوسکتی۔ باجی کسی جگہ مستقلاً جم کر نہیں رہ سکتیں۔ باجی کو اب تیری میری خدمت کر کے زندگی گزارنی ہے۔ باجی کی قسمت میں یہی کچھ لکھا تھا۔ بہت خوب''۔ تعبیر نے روشنا کا مذاق اڑاتے ہوئے ہنس کر کہا۔ وہ چڑ گئی اور تنک کر بولی۔

''مگر تم بھلا باجی کے اتنے سگے حمائتی کہاں سے بن بیٹھے۔ ذرا بتاؤ تو سہی؟ جوش میں وہ اٹھ کر بیٹھ گئی''۔

''بھئی کوئی تو ہو جو اس بے کس لڑکی کا حمائتی بنے''۔ تعبیر نے چھیڑا تو وہ غور سے میاں کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ''خیریت ہے نا؟''

''ارے کیا مطلب__؟ وہی فضول عورت۔ تمھاری اتنی پست تھنکنگ؟ میں تو راہ ہموار کر رہا ہوں کہ اگر فرجاد کریم یا کوئی اور شخص باجی میں انٹرسٹڈ ہے تو بیاہ کر لے جائے انھیں''۔ تعبیر نے برا مان کر کہا۔ ''تم اتنی شکی ہوسکتی ہو میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا''۔

کھڑکی کے پاس دو بلیوں کے غرانے کی آواز آئی۔ روشنا نے اٹھ کر کھڑکی کے شیشے کو تھپتھپا کر ہشت ہشت کیا۔ تعبیر شرارت سے بولا۔ انگریز بلی بلا ہیں۔ اردو نہیں سمجھتے۔

''تمھیں کیسے پتہ ہے کہ بلی اور بلا ہیں؟'' روشنا نے پوچھا۔

''اس وقت لڑ جو رہے ہیں۔ بلیوں نے رات کے وقت بھلا کیوں لڑنا ہے؟'' تعبیر نے شرارت سے کہا اور روشنا کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹ لیا۔

O

شام ڈھل چکی تھی جب وہ واپس اپنی قیام گاہ پہنچا تھا۔ سرائے علمدار پر خاموشی طاری تھی اور زیادہ تر کمرے ابھی مقفل تھے۔ آج کا تمام دن اس نے تفریح کی بجائے کام کرتے گزارا تھا۔ وہ شہر کے مختلف لوگوں سے ملا تھا۔ تاکہ معلوم کر سکے کہ یہاں رہ کر کیا کام کیا جاسکتا ہے۔ وہ اب

کسی فیصلے پر پہنچنا چاہتا تھا۔ اگرچہ وہ تفریح کے دوران بھی سوچتا رہا تھا مگر آج وہ صرف اسی مشن کے تحت باہر نکلا تھا اور کئی سرکردہ اہم شخصیات سے ملا تھا۔ اس علاقے میں غربت تھی لیکن اس کے باوجود یہاں کے لوگ ایماندار تھے۔ مخلص تھے۔ محنتی تھے۔ یہ لوگ لالچی اور مفاد پرست نہیں ہیں۔ یہ مہمان نواز ہیں۔ قدرت کے لامتناہی وسائل انھیں میسر ہیں لیکن ان وسائل کو بروئے کار لانے میں یہ لوگ اپنی غربت کے سبب قاصر ہیں۔ یہ سادہ طبیعت کے قناعت پسند لوگ ہیں اور وہ — راشد علی سید۔ ان کے لیے، اپنے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا اور اس ''کچھ'' کے لیے پچھلے کئی مہینوں سے وہ جائزہ لیتا رہا تھا۔

گزشتہ روز اپنے طور اس نے آخری اور لمبی تفریح کی تھی اور دیوسائی کی سیر کرنے کے بعد فی الحال کچھ بھی اور دیکھنے کی تمنا اپنے اندر نہیں پاتا تھا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ ان علاقوں میں لاتعداد مقامات ابھی قابل دید اور لائق توجہ ہیں۔ مگر اب جب اس نے یہیں رہ جانے کا ارادہ کر لیا تھا تو کھانے کمانے کی فکر لاحق ہونے لگی تھی اور اب سستی اور تھکن اس کے اعصاب پر مسلط ہو رہی تھی اور وہ اپنے اندر کسی قدر بددلی پاتا تھا۔ گھر اسے رہ رہ کر یاد آرہا تھا اور اکیلے اکیلے کمرے میں کرسی پر بیٹھا وہ مسلسل سوچے جارہا تھا۔

''میں نے اتنی ذرا سی بات پر گھر کیوں چھوڑ دیا بھلا؟''

مگر یہ اتنی سی بات تو نہ تھی۔ پوری جیتی جاگتی زندگی کا سوال تھا۔ اس کے اندر سے جواب آیا۔

''لیکن ماہین ایسی ناقابل توجہ بھی تو نہ تھی؟ جوگنگ کرتے ہوئے اس روز پارک میں وہ میری توجہ حاصل کرتی رہی تھی''۔

''مگر بھئی مسئلہ توجہ اور بے توجہی کا نہیں ہے۔ یہ تو پسند کا مسئلہ ہے۔ اصول کا ہے اور سب سے بڑھ کر انڈرسٹینڈنگ اور چاہت کا ہے''۔

''مگر اس اصول اور چاہت نے مجھے سب سے چھڑا دیا۔ حتیٰ کہ میں اپنی چاہت بھی کھو بیٹھا''۔ اور تب اسے رخشندہ بے طرح یاد آئی۔ اس کے ساتھ ہی غصے کی ایک لہر نے اسے جھنجھوڑا۔

''مگر بابا کو کم از کم پتہ تو چلا ہوگا کہ اس دور میں اولاد کے لیے ڈکٹیٹر نہیں بنا جا سکتا میرے اس اقدام سے چھوٹوں کی منزل ضرور آسان ہو گئی ہے۔ میری زندگی تباہ ہوئی سو ہوئی اور تب اس نے یہ بھی سوچا کہ اس طرح چلے آنے پر اس کی ماں پر جانے کیا گزری ہوگی۔ اس کی بہن کتنا روئی ہوگی اور بھائی — ؟ شاید اس نے شادی کرلی ہو اور شاید ماہین اس کی بھابھی بن کر اس کے گھر آگئی ہو اور یہ سب سوچتے ہوئے اس کے لبوں پر تبسم بکھر گیا''۔

''اگر یہ سب یونہی ہونا تھا تو آسانی سے ہو جاتا۔ مگر بابا کے اندر غصہ تھا۔ امی سے وہ کسی ناکردہ گناہ کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔ وہ ماموں جان کو ذلیل کرنا چاہتے تھے۔ وہ انتقال پر اتر آئے تھے اور جانے اتنے برسوں تک کیسے وہ حالات کا انتظار کرتے رہے اور بالآخر اپنے منصوبے میں کامیاب ہو گئے۔ انھوں نے مجھے غصہ دلایا اور غصہ مجھ پر غالب آگیا اور میں مولائے کائنات کا قول بھول گیا کہ ''غصہ وہ آندھی ہے جو عقل کا چراغ گل کر دیتی ہے'' اور یہ بھی کہ غصے کی ابتداء دیوانگی اور انتہا پشیمانی ہے اور اگر پشیمانی نہ ہو تو دیوانگی پختہ ہے'' اور یقیناً غصے نے مجھے دیوانہ بنا دیا تھا۔ لیکن اب میں پشیمان ہوں مگر پشیمانی کا تدارک ممکن نہیں۔ وقت بہت آگے نکل آیا ہے۔ اب میں واپس پلٹ کر جاؤں بھی تو کچھ حاصل نہیں ہو سکے گا بجز ذلت کے۔ اب تک حالات جانے کتنی کروٹیں بدل چکے ہوں گے۔ اب تو ہر طرف سے مجھ پر انگلیاں اٹھیں گی اور اب اتنے برسوں بعد بھی میں خالی ہاتھ جاؤں؟ بس اب کچھ نہیں ہو سکتا ماسوائے اس کے کہ میں تنہا رہوں اور ان لوگوں کے لیے — اس خطے کے لیے کچھ کروں۔ جس نے مجھے سہارا دیا۔ زندہ رہنے کا حوصلہ بخشا۔ میں شکر گزار ہوں اس حسن بے مثال سرزمین کا۔ یہاں کی جھیلیں، آبشار، ٹھنڈے میٹھے اور شفاف پانی کی چھوٹی بڑی یہ ندیاں، جن کو بہتا دیکھ کر ہمیشہ میرا جی چاہا ہے کہ ان کو کھینچ کر کسی طرح اپنے پنجاب لے جاؤں۔ اتنا وافر اور صاف پانی؟ جیسے پتھروں سے ٹکراتی پگھلی ہوئی چاندی سیال شکل میں بہہ رہی ہو اور یہ فلک بوس پہاڑ — سرسبز دلکش، جن کی چوٹیاں برف سے ڈھکی رہتی ہیں اور جن کے پیچھے سے جب سورج طلوع ہوتا ہے تو ان کا سبزہ گہرا ہو کر سیاہ پڑ جاتا ہے اور پھر ان کی چوٹیوں پر سنہری رنگ بکھر جاتا ہے اور ان کی بلندیوں پر جما برف قوسِ قزح بن کر کھلکھلا اٹھتا ہے اور اے وادیٔ سکردو گواہ رہنا۔ تجھے قسم ہے اپنے بے پایاں حسن کی کہ میں نے تیرے ہر حسین و دلفریب منظر کو دیکھتے ہوئے اسے یاد کیا ہے جو میری محبت تھی اور جس کے بغیر میری زندگی ہمیشہ کے لیے سونی ہو گئی ہے اور جانے وہ میرے بارے میں کیا سوچتی ہو گی؟ اور آج جب وہ علی جواد کاظمی کے گھر کے اس سادہ سے کمرے میں بیٹھا تھا تو وہ نازک سی لڑکی کمرے میں چائے کے لوازمات اٹھوائے داخل ہوئی تھی اور شائستگی سے سلام کر کے فرش پر دسترخوان بچھانے لگی تھی۔ علی جواد کاظمی نے چند رسمی لفظوں میں تعارف کرایا تھا۔

''یہ میری سب سے چھوٹی بیٹی زہرہ ہے''۔

زہرہ بغیر کسی ردعمل کے اپنے کام میں مشغول رہی تھی۔

اس نے ایک نظر دوبارہ زہرہ پر ڈالی جو قطعی بے نیازی سے چائے کا سامان ٹرے سے نکال کر دسترخوان پر چن رہی تھی۔ جواد کاظمی کہہ رہے تھے۔ ''زہرہ کو پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ بی۔

اے کر چکی ہے۔ اب ایم۔ اے کرنے کا اصرار کر رہی ہے۔ مگر یہاں سکردو کالج میں ایم۔ اے کی کلاسز نہیں ہیں'' اور تب اپنی قیام گاہ کی طرف آتے ہوئے اس کی کوششوں میں ایک اور کوشش کا بھی اضافہ ہو چکا تھا اور زہرہ کا بے نیاز سراپا اس کے ساتھ تھا۔

O

دریچے کے شیشے سے پرے، سورج پیلا ہو کر مغربی کونے میں بہت نیچے تک جھک آیا تھا اور بادلوں کے بوجھ سے لدی تیز ہوا لان میں کھڑے درختوں کو جھنجھوڑ رہی تھی۔ پھولوں کی پتیاں اور درختوں سے جھڑے پتے ہوا کے دوش پہ بے خانماں خاندان کی طرح اڑتے پھر رہے تھے۔ پورٹیکو (Portico) کے ستونوں سے لپٹی بیلیں ہوا کے خلاف زور آزمائی کر رہی تھیں۔ آسمان پر بادلوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں جمع ہو کر گھٹا کی صورت اختیار کرتی جا رہی تھیں۔ دروازہ ہلکی دستک کے ساتھ کھلا اور علی نے گرم چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھا کر سموسوں کی پلیٹ ٹرے سے نکال کر رکھ دی اور کہا۔

''میں نے سوچا سر پتہ نہیں آپ نے آج لنچ کیا ہو گا کہ نہیں۔ یہ تازہ تازہ لاہوری سموسے خود سائیکل پر جا کے پریشان چوک سے لے کر آیا ہوں''۔ ''ارے واہ بھئی — تم تو بڑے کام کے لڑکے ہو۔ لنچ تو واقعی میں نے آج نہیں کیا مگر کئی جگہوں پر چائے کے ساتھ اتنا کچھ کھا لیا کہ پیٹ بھر گیا''۔ اس نے کہا اور پھر ایک سموسہ اٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھا اور باقی پلیٹ علی کی طرف کھسکا کر بولا۔ ''یہ تم لے لو''۔ پھر اس نے سموسے کو دانتوں سے کاٹا اور خوش ہو کر بولا۔

''یار یہ تو واقعی بالکل میرے شہر کے جیسے ہی ذائقے کے ہیں۔ یہ تم نے مجھے کیا یاد دلایا—؟''

''سر یہ سکردو بھی تو پاکستان کا ہی ایک حصہ ہے اور یہاں بہت سے لوگ پنجاب اور دوسرے صوبوں اور شہروں سے آئے ہوئے ہیں جو یہاں مختلف کاروبار کرتے ہیں''۔ علی نے اطلاعاً کہا۔ وہ بلاشبہ راشد کے جذبات سے بے خبر تھا۔

''میں بھی یہی ارادہ کر رہا ہوں''۔ اس نے بلا ارادہ ہی علی کو اپنا شریکِ کار بنا لیا۔ علی یکدم خوش ہوا۔

''سر یہ تو بہت ہی اچھا ہو گا۔ پھر آپ اپنی فیملی بھی یہیں بلا لیں گے نا؟''

''فیملی — ؟ بلا کر کیا کریں گے۔ یہیں بنا لیں گے۔ راشد نے ہنس کر کہا اور علی کچھ سمجھتے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے برتن سمیٹ کر باہر نکل گیا۔ چائے سے فراغت پا کے اس نے سائیڈ ٹیبل سے کتاب اٹھائی جو صبح ہی اس نے چلتے چلتے ایک بک اسٹال سے خریدی تھی اور کرسی کو ٹیبل لیمپ

کے نزدیک کر کے ورق گردانی کرنے لگا۔ اسے کتاب کے عنوان نے چونکایا تھا۔ ''جھیل جھیل اداسی'' کتاب کی مصنفہ خاتون تھی اور یہ ہائیکو تراجم پر مشتمل تھی۔ کتاب میں انگریزی ہائیکو بھی ساتھ دیئے گئے تھے۔ جن کے تراجم کئے گئے تھے وہ پڑھنے لگا۔ Shiki کے ایک ہائیکو پر اس کی نگاہ ٹھہر گئی''۔

How much longer
is my life?
A brief night

شاعرہ نے ترجمہ کیا تھا۔
''ہے کتنا لمبا
میرے جیون کا رستہ
اک چھوٹی سی رات''

''واہ!'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ یہ صنف سخن جو برسوں بعد بھی اردو ادب میں ابھی پوری طرح اپنے قدم نہیں جما سکی میرے کتنی حسب حال ہے۔ آہستہ آہستہ، سرسری نظر ڈالتے ہوئے کئی صفحے اس نے پلٹے اور ایک صفحے پر وہ ٹھٹھک کے رک گیا۔

''دامن ہے خالی
سانسیں ہی بس اپنی ہیں
تنہائی — آرام''

کھڑکی سے پرے زور سے بادل گرجا اور بجلی کی تیز روشنی سے لمحہ بھر کو کمرہ جگمگا اٹھا۔ بارش برس رہی تھی اور موسم میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ اس نے کمبل کھول کر پیروں پہ ڈال لیا اور اطمینان سے کتاب کا مطالعہ کرنے لگا۔

باہر بارش برستی رہی۔ چھم چھم۔ چھما چھم۔

ممتاز فارسی افسانہ نگار۔ سید محمد علی جمالزادہ

سید محمد علی جمال زادہ فارسی میں جدید افسانہ کے پیش رو حضرات میں سے ہیں۔ وہ 1895ء میں اصفہان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم تہران میں مکمل کی اور اعلیٰ تعلیم کیلئے بیروت چلے گئے۔ وہاں سے قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد فرانس سے بھی قانون کا ڈپلومہ حاصل کیا۔ وہ سید جمال الدین کے فرزند ہیں۔ جو ایران کے سیاسی آزادی کی جدوجہد کے اکابرین سے تھے۔ جمالزادہ نے بھی ان کی پیروی میں اپنے وطن کی خدمت میں بڑے کارنامے انجام دے اور ادب وصحافت کے میدان میں بڑا بلند مرتبہ حاصل کیا۔ انہوں نے قانون کی ڈگری کے حصول کے بعد اپنے آپ کو ادب اور صحافت کیلئے وقف کر دیا۔

جمال زادہ فارسی کے اولین افسانہ نگاروں میں صفِ اول کے ادیب ہیں ان کی تصانیف بے شمار ہیں۔ انہوں نے اپنے فن کو ملک وقوم کی بہتری کیلئے استعمال کیا ان کی فکر کا اصل منبع اور ماخذ ان کا معاشرہ اور ان کا ماحول ہے۔ اس معاشرے اور ماحول کو بہتر بنانا ان کا نقطۂ نظر ہے۔ انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ ماحول کتنا ہی ناسازگار ہو اور لوگوں کے نظریات کتنے بھی ٹیڑھے ہوں۔ فنکار کو چاہیے کہ اپنے راستے پہ ثابت قدمی سے رواں رہے اور دوسروں کی یاوہ گوئی کی کوئی پرواہ نہ کرے۔

آئندہ صفحات پر دیا گیا افسانہ جمالزادہ کے مشہور افسانوں میں سے ہے۔ اور مدت تک تعلیمی نصابوں کا حصہ رہا ہے۔ افسانہ نگار کی زبان کی روانی، بے ساختگی اور طنز کاری کا لطف اصل کہانی پڑھ کر ہی اٹھایا جاسکتا ہے۔ ترجمہ میں مکمل طور پر منتقل کرنا شاید ممکن نہیں ہے۔

سید محمد علی جمالزادہ

ترجمہ: پروفیسر جلیل نقوی، لاہور

مرغاب

عید نوروز کی آمد آمد تھی اور ساتھ ہی محکمانہ ترقی کیلئے نامزدگی ہونے والی تھی۔ ہمارے دفتر میں تمام رفیقان کار نے مل کر یک زبان فیصلہ کیا کہ اس دفعہ جس ساتھی کو بھی محکمانہ ترقی کیلئے نامزد کیا جائے گا وہ دفتر کے تمام دوستوں کو ایک پر تکلف ضیافت پر مدعو کرے گا جس میں مرغابِ مسلم کا خصوصی اہتمام کیا جائے گا۔ اس طرح تمام دوست اس کی بلندئ عہدہ کی خوشی میں مخلصانہ شرکت کریں گے اور اس کی عمر اور عزت میں اضافہ کیلئے دعا کریں گے۔

ہمارے دفتر میں ایک ہی شخص کو ترقی کیلئے چنا جانا تھا۔ قسمت نے یاوری کی اور اس بلندئ منصب کیلئے میرا نام چن لیا گیا۔ میں نے فوراً اس مسئلہ پر اپنی بیگم سے بات کی اور بتایا کہ اس محکمانہ ترقی پر اپنے دوستوں کے ساتھ کیا ہوا ضیافت کا وعدہ مجھے پورا کرنا ہے۔ میری شادی ہوئے ابھی چند ہی دن گذرے تھے۔ بیگم نے بڑی خوشدلی کے ساتھ کہا۔

''یہ تو بڑا اچھا موقع پیدا ہو گیا ہے۔ آپ نے اپنے دوستوں کو اب تک اپنی شادی کی پارٹی بھی نہیں دی ہے۔ اب بہت شاندار طریقہ سے دونوں خوشیوں کے قرض سے سبکدوش ہونا چاہیے۔ لیکن ایک بات ہے'' اس نے رک کر ذرا سوچتے ہوئے کہا ''ہمارے ہاں برتنوں، چھریوں اور کانٹوں کا صرف ایک سیٹ ہے جو بارہ افراد کیلئے کافی ہو سکتا ہے۔ اب یا تو ایک سیٹ اور خرید لیا جائے، یا پھر گیارہ افراد سے زیادہ کو مدعو نہ کیا جائے کہ آپ سمیت بارہ افراد ہو جائیں۔''

''تم درست کہتی ہو'' میں نے جواب دیا۔ ''لیکن تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ عید کے موقع پر طرح طرح کے اخراجات کے بعد گھر کے بجٹ کی صورت حال کیا ہے اب کسی مزید خریداری کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ دوسری جانب میرے دوستوں کی تعداد بھی تیئس چوبیس سے

کم نہیں۔''

''لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر علیک سلیک رکھنے والے مفت خورے کو ضرور دعوت دی جائے صرف اپنے ہم مرتبہ لوگوں کو اور افسرانِ بالا کو بلا لینا مناسب ہے۔ باقی ناموں کو اپنی فہرست سے خارج کر دیجئے انہیں خوش کرنے کی کوئی اور تدبیر کی جاسکتی ہے۔''

''خدا کے واسطے، ایسی بات ذہن میں بھی نہ لانا۔'' میں نے سمجھایا۔ ''ان بدبختوں کو سال میں کہیں ایک آدھ بار موقع ملتا ہے اور اسی کیلئے وہ اپنے معدوں کو خاص طور پر پالش کرا کے تیار رکھتے ہیں اور اب تو مرغاب مسلم کی اشتہا لئے ایک ایک گھڑی گن کر گذار رہے ہیں اگر میں نے ذرہ برابر کوئی ایسی ویسی بات کی تو دفتر میں میرا رہنا دوبھر کر دینگے۔ پھر یہ ہے کہ وہ جو کچھ بھی کریں اس کا انہیں حق پہنچتا ہے۔''

بیگم میری باتیں سن کر خاموشی سے کچھ سوچتی رہ گئی۔ میں نے تجویز پیش کی

''کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ کسی دوست کے ہاں سے برتنوں وغیرہ کا ایک سیٹ ہم عاریتاً لے لیں۔''

''اس منحوس خیال کو بھی اپنے ذہن میں جگہ مت دینا'' اس نے تلخی کے ساتھ کہا۔ ''یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ شادی کے بعد پہلی ضیافت کریں اور اس میں عاریتاً لی ہوئی چیز استعمال کریں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ایسا کرنے والوں کا پہلا بچہ مرجاتا ہے۔''

''اس کے بعد تو ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''ضیافت کا کام دو دنوں پر تقسیم کر دیا جائے۔ آدھے دوستوں کو ایک دن مدعو کر لیا جائے اور باقی آدھے دوسرے دن بلا لیے جائیں۔''

بیگم نے تجویز کو پسند کیا اور طے پایا کہ عید کے نوروز کے دوسرے دن دوستوں کے پہلے دستہ کی ضیافت ہوگی اور عید کے تیسرے روز دوسرے دستہ کی۔

عید کا دوسرا دن ہونے تک مہمانوں کی پیشوائی، خدمت، خاطر کے تمام انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ اس دن کی ضیافت کیلئے پرتکلف کھانے تیار تھے۔ وعدہ شدہ مرغاب مسلم کے علاوہ چکن کارن سوپ، اعلیٰ نسل کے بکرے کے کباب، دورنگ پلاؤ، مرغ قورمہ، سلاد، دہی، رائتہ، سویٹ ڈش اور دیگر لوازمات مہیا ہو چکے تھے۔ میں ہر طرف سے مطمئن ہو کر بیگم کے جہیز میں آنے والی نرم اور گرم نئی مسہری پر نیم دراز بےفکری کے عالم میں صادق ہدایت کی بے نظیر کہانیوں کے مطالعہ میں اس قدر محو تھا کہ گرد و پیش کی خبر نہ تھی کہ بیگم کمرے میں داخل ہوئی اور کہنے لگی۔

''ایک نوجوان آیا ہے۔ اپنا نام مصطفیٰ بتاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ آپ کا ماموں زاد

ہے اور عید کی مبارکباد پیش کرنے کیلئے حاضر ہوا ہے۔''

مصطفیٰ میری والدہ کی خالہ کے ماموں کی بیٹی کا چچازاد تھا۔ پچیس چھبیس سال عمر ہوگی۔ تن تنہا، نہ آگا نہ پیچھا، نہ جورو نہ جاتا، اللہ میاں سے ناتہ، سمجھ بوجھ سے عاری، بالائی منزل خالی۔ بیٹھا ہو تو اٹھنا مشکل اور اٹھ کھڑا ہو تو قدم اٹھانا دشوار۔ اس پر مستزاد یہ کہ بے ڈیل و بے ڈول، اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی۔ بات کرنے کیلئے اسے بڑی محنت کرنی پڑتی تھی۔ اس کوشش میں چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک رنگ جاتا تھا۔ لگتا تھا گلے میں کوئی چیز پھنس کر رہ گئی ہے۔ منہ کھل جاتا تھا اور گلے سے خرخر کی آوازیں آنے لگتی تھیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ سال میں ایک مرتبہ سے زیادہ اس کے جمال کی زیارت سے شرفیاب ہونے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ میں نے بیگم سے التجا کی۔

''خدا کے واسطے مجھے اس غول بیابانی کے نرغے سے بچاؤ۔ کہہ دو کہ سوئے ہوئے ہیں۔ تاکہ دفع ہو جائے اور اس ضیافت کے موقع پر اس ناگہانی آفت میں نہ پھنسوں۔''

''میرا اس سے کیا تعلق ہے۔'' بیگم نے کہا۔ ''جس کی بلا ہو اس کے سر رہنی چاہیے۔ ماشاء اللہ وہ آپ کا ماموں زاد ہے، آپ دونوں کے درمیان جو مراسم ہیں انہیں آپ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ میں نے تو تہیہ کیا ہوا ہے کہ آپ کے خویش و اقارب سے کوئی واسطہ نہیں رکھوں گی اور خاص طور پر ایسے لم ڈھینگ احمق سے۔ نا بابا۔ اس مخلوق کو آپ خود ہی سنبھالئے''

اب میرے لیے چارہ کار باقی نہیں رہا تھا۔ سوچا کہ اللہ تعالیٰ کو بھی یہ بات پسند نہیں ہوگی کہ اس غریب کو مایوس کروں جو لازماً ایک طویل فاصلہ طے کر کے بھوکے پیٹ اور ننگے پاؤں کے ساتھ محض چند ریال عیدی کی امید لئے یہاں تک پہنچا ہے۔ میں نے خود کو ملامت کی کہ ایسے مبارک موقع پر بھی صلۂ رحمی کا رویہ اختیار نہیں کروں گا تو پھر اس کے لئے اور کونسا موقع ہوگا۔ چنانچہ میں نے اسے آواز دی۔ وہ سر کو جھکائے کمرے میں داخل ہوا۔ ماشاء اللہ پہلے کی نسبت کافی ترقی کر گیا تھا۔ قد مزید بڑھ گیا تھا، ہاتھ پاؤں مزید بے ڈول ہو گئے تھے اور چہرے کی کراہت مزید نمایاں ہو گئی تھی، اس کی گردن کی درازی دیکھ کر اس مرغاب کی گردن یاد آ گئی جو اس وقت چولہے پر چڑھی ہوئی تھی۔ یہ گردن ایک میلے کچیلے گریبان سے برآمد ہوئی تھی اور اس کے چہرہ کو سہارا دیے ہوئے تھی۔ اپنے حساب سے وہ شیو کر کے آیا تھا مگر اس کے گریبان کے آس پاس زرد اور کشمشی رنگ کے ایک ایک انگل لمبے بال ادھر ادھر اس طرح سر نکالے ہوئے تھے جیسے کسی چیز پر کیڑے چڑھ آئے ہوں۔ یہ بال اس کی گردن اور گردن کے گرد لہرا کر عجیب کراہت پیدا کر رہے تھے۔ اس کے لباس کے بارے میں کچھ نہ کہوں تو بہتر ہے۔ فقط اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس کی پتلون بہت اچھی طرح دھلی ہوئی تھی اور اس کے گھٹنوں کی جگہ اس طرح

پھولی ہوئی تھی گویا دو تربوز وہاں چھپا دیئے گئے ہیں۔

میں اس مخلوق عجیب وجود غریب کے مشاہدہ سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ بیگم حواس باختہ داخل ہوئی اور گویا دھماکہ کر دیا۔

''غضب ہو گیا۔'' عجیب عقل اور فہم رکھنے والے ہیں کہ سب سے اہم بات کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ آپ صرف ایک مرغاب لائے ہیں نا۔ یہ مرغاب آج کی ضیافت کے کام آ گیا تو کل ضیافت کے لئے کیا انتظام ہوگا۔ مرغاب مسلم کا وعدہ تو تمام دوستوں کے ساتھ ہے نا۔''

بات بڑی معقول تھی اور مجھ سے سخت غفلت ہو گئی تھی۔ میں نے کہا۔

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آدھا مرغاب آج میز پر لے آئیں اور آدھا کل کیلئے رکھ لیں۔''

''گویا آپ اپنی عزت و آبرو کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔'' بیگم نے طنز کے ساتھ کہا۔ ''کیا آپ نے کبھی سنا ہے کہ مرغاب مسلم کی ضیافت ہو اور دستر خوان پر آدھا مرغاب لایا جائے۔ مرغاب مسلم کو تو مسلم ہی اسی لیے کہا جاتا ہے کہ جوں کا توں دستر خوان پر لایا جائے۔''

بات بالکل درست تھی اور کسی چناں چنیں کی گنجائش نہیں تھی، اب مسئلہ کا حل تلاش کرنا میری ذمہ داری تھی، بہت سوچا اور بڑی مغز ماری کی، مگر چارہ کار صرف ایک نظر آیا کہ جس قدر جلد ہو سکے ایک عدد مرغاب مزید مہیا کیا جائے۔ اور کوئی صورت ہی نہیں بنتی تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ مصطفیٰ اگرچہ نہایت کوڑھ ذہن اور نکما آدمی ہے۔ مگر تہران جیسے وسیع شہر میں ایک عدد مرغاب کا مہیا کرنا لینا بھی کوئی امریکا دریافت کر لینے اور رستم کو زیر کر لینے کا سا مشکل کام نہیں ہے۔ اس قدر معمولی سا کام تو وہ کر ہی سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

''مصطفیٰ جان۔ تمہیں پتہ چل گیا ہے کہ مسئلہ کیا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں میرے اسی مسئلہ کی خاطر اس وقت میرے پاس بھیجا ہے۔ تمہاری کارکردگی اور قابلیت کا میں ہمیشہ سے قدردان ہوں۔ آج اگر تم ایک تازہ اور اعلیٰ قسم کا مرغاب کہیں سے تلاش کر لاؤ تو یقین جانو میں تمہارا مرید ہو جاؤں گا۔ قیمت کی پرواہ مت کرنا جس قیمت پر ملے لے آؤ۔''

مصطفیٰ کے چہرہ نے حسب معمول پہلے تو کچھ سرخ اور سیاہ رنگ تبدیل کئے۔ اس کے بعد اس کے گلے کی پر پیچ راہوں سے کئی پھٹی آواز اس طرح برآمد ہوئی جس طرح حقہ تازہ کرنے کے بعد اس کے پانی کو کم زیادہ کرتے وقت آواز آتی ہے۔ آواز کا تجزیہ کرنے پر پتہ چلا کہ فرماتے ہیں۔

''عید کا دن ہے اور تمام شہر میں ایک دوکان بھی کھلی نہیں ہے، اس لئے میرے خیال

ہمیں مرغاب مسلم کی شرط کو یکسر ختم کر دینا چاہیے اور اس خیال کو ہی ترک کر دینا چاہیے۔''

''لیکن میں اپنے سر میں کونسی خاک ڈالوں؟'' میں نے احتجاج کرتے ہوئے پوچھا۔ لیکن اس پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ اس نے تھوک نگلتے ہوئے اسی آواز اور لہجہ میں کہا۔

''جناب آپ صاحب اختیار ہیں۔ اسی لئے میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔ ورنہ میری رائے تو یہ ہے کہ اس ضیافت کو فی الحال منسوخ کر دیجئے۔''

''تمہاری عقل و فہم کا میں مزید قائل ہو گیا ہوں۔ یعنی ابھی ایک گھنٹہ بعد مہمانوں کی آمد شروع ہو جائے گی۔ اس صورت میں ضیافت کو منسوخ کیونکر کیا جا سکتا ہے۔''

''جناب اس میں کیا مشکل ہے۔ بیمار بن کر بستر پر دراز ہو جائیے اور کہہ دیجئے کہ ڈاکٹر نے بستر سے نکلنے پر قدغن لگا دی ہے۔''

''اور آج ہی میں جن دوستوں کے ساتھ فون پر گفتگو کرتا رہا ہوں۔ وہ کیا کہیں گے؟''

''یہ بات ہے تو ایک اور ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے۔'' مصطفیٰ نے پینترا بدل کر کہا۔ ''اس مرغاب مسلم کا قصہ ہی پاک کر دیجئے۔ کہہ دیجئے کہ مرغاب خرید ا گیا تھا۔ مگر اسے کتا اٹھا کر لے گیا۔''

''جی ہاں۔ میرے دوست ویسے ہی دودھ پیتے بچے ہیں کو جو کچھ کہوں گا اس پر یقین کر لیں گے۔ وہ فوراً کہیں گے کہ ایک مرغاب خریدنے سے تم کنگال تو نہیں ہونے لگے تھے۔ بلکہ ان میں سے کچھ تو ایسے ہیں جو کہیں گے کہ اس کتے کو ہمارے سامنے لاؤ تاکہ حساب فہمی براہ راست اسی سے ہو سکے۔''

''اس صورت میں ایک اور تدبیر کی جا سکتی ہے۔'' اس نے عقلمندی کا مزید ثبوت دیتے ہوئے کہا'' سرے سے بات ہی ختم کر دیجئے۔ کہلوا دیجئے کہ آپ گھر پر موجود نہیں ہیں اور حضرت معصومہ کی زیارت کیلئے چلے گئے ہیں''

میں نے دیکھا کہ وہ کچھ عقلمندی کے زور میں زیادہ ہی یاوہ گوئی پر اتر آیا ہے اس لئے میں نے سوچا کہ اس کی چونچ کاٹوں اور جان چھڑاؤں۔ چنانچہ میں نے کہا۔

''مصطفیٰ۔ یہ دیکھ میں تیرے لئے عیدی لے آیا ہوں۔ اس رقم کو قبول کر اور جتنی جلدی ہو سکے واپس اپنے گھر پہنچ کر میری اور بیگم کی جانب سے ماموں جان کو سلام اور عیدی پیش کر دے کہنا کہ ہم اس سال کی تہہ دل سے مبارک باد پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ ایسے ہزار سال آپ کو دیکھنے نصیب ہوں۔''

لیکن مصطفیٰ کا فکر و خیال کسی اور ہی جگہ تھا۔ اس نے میری بات پر ذرہ برابر توجہ دیئے بغیر اپنے سلسلۂ فکر کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''ایک اور صورت بھی ہو سکتی ہے۔ کوئی ایسی تدبیر کی جائے کہ آج کے مہمان مرغاب کی جانب ہاتھ ہی نہ بڑھائیں اور اسی مرغاب کو گرم کر کے کل دوبارہ دستر خوان پر لے آیا جائے۔''

سرسری طور پر سننے میں یہ بات مجھے اس کے پہلی باتوں سے بھی زیادہ بے بنیاد اور بے معنی نظر آئی۔ مگر جب میں نے اس پر ذرا غور کیا ور اس کے تمام پہلوؤں کو الٹ پلٹ کو سوچا تو کچھ اس قدر نامعقول بھی نہیں لگی۔ جب میں مزید اس بارے میں سوچتا گیا تو ایک طرح کی چمک مجھے اس طرح نظر آئی جیسے گہری تاریکی میں اچانک کوئی جگنو در آیا ہو۔ اس جگنو کی روشنی رفتہ رفتہ بڑھتی چلی گئی اور ایک سخت مسئلہ کا حل مجھے نظر آ گیا۔ میں نے مصطفیٰ سے مخاطب ہو کر کہا۔

''میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ تجھ سے عقل کی بات سنی ہے۔ مگر اب اس گرہ کو کھولنا بھی تیرے ہاتھ میں ہے تجھے ایسی مہارت کا ثبوت دینا ہے کہ کوئی مہمان اس مرغاب کی جانب ہاتھ نہ بڑھا سکے۔''

مصطفیٰ کی بھی جان میں جان آئی۔ اگر چہ ابھی پوری طرح سمجھ نہیں پایا تھا کہ میرا مقصد کیا ہے اور اسی مقصد کو میں کس طریقے سے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن اس کے چہرہ سے خوشی کے آثار بر آمد ہونے لگے۔ میں نے اس کی تعریف اور اپنی خوش بیانی کی لو ذرا بڑھا کر کہا۔

''میرے بھائی! تم ذرا یہاں آ کر بیٹھو۔ یہاں میرے نزدیک اس مخملی کرسی پر بیٹھو تا کہ تمہارا حال احوال تفصیل سے معلوم کر سکوں۔۔۔ تم آج کل کیا کر رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہارے لئے کوئی اچھی ملازمت تلاش کروں اور کسی اچھی جگہ تمہاری شادی کر دوں۔ تم یہ میوہ کیوں نہیں کھا رہے ہو۔ یہ بزد کی سوغات ہے۔ بہت لذیذ ہوتا ہے۔ کھا کر تو دیکھو۔''

مصطفیٰ نے اپنے ٹیڑھے میڑھے دراز قد کو بڑی احتیاط سے مخملی کرسی پر متمکن کیا اور کوشش کی کہ اس محبت و دلبستگی پر اظہار تشکر کرے جس کا تجربہ اسے عمر میں شاید پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ مگر میں نے اسے مہلت نہ دی اور کہا۔

''استغفر اللہ۔ یہ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ تم آخر میرے چھوٹے بھائی ہو۔ آج تو میں ہرگز تمہیں یہاں سے جانے نہیں دوں گا۔ تم میرے مہمان رہو گے۔ سال میں کہیں ایک دفعہ تو تم نظر آتے ہو مجھے یاد نہیں کرتے اور کبھی سوچتے بھی نہیں کہ اس شہر میں تمہارا ایک بھائی بھی رہتا ہے۔ اب آئے ہو تو آج کا کھانا بہر حال میرے ساتھ کھاؤ گے۔ میں ابھی تمہیں بیگم کے سپرد کرتا ہوں وہ تمہیں میرا ایک خوبصورت سوٹ دے گی جسے پہن کر تم خوب فیشن ایبل نوجوان بن کر کھانے کی میز پر میرے پہلو میں بیٹھو گے'' مصطفیٰ اس تمام غیر متوقع اور غیر مترقبہ التفات پر

حیران ہو رہا تھا کہ میں نے اسے متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اصل بات جس پر تمہیں توجہ دینی ہوگی یہ ہے کہ ضیافت کے شروع ہونے کے بعد ابتدأ سوپ دیا جائے گا۔ اس کے بعد بکرے کے کباب، پلاؤ اور دیگر کھانوں کے ساتھ مرغاب کو بھی میز پر لایا جائے گا۔ مرغاب کے لانے پر تم نے یہ کہنا ہے کہ ارے بابا۔ اتنا کھا چکنے کے بعد ہمارے پیٹوں میں کیا جگہ باقی رہ گئی ہے۔ کھانا ہمارا نہیں مگر پیٹ تو ہمارے ہیں۔ گنجائش کے بغیر کھا کر نہ ہم کھانے کے ساتھ انصاف کریں گے نہ اپنے ساتھ۔ میں ان تمام حضرات کی جانب سے درخواست کرتا ہوں کہ اب مزید کھانے کو واپس کر دیا جائے۔ اگر بہت اصرار ہے تو اسی موسم بہار میں کسی اور دن ہم حاضر ہوں گے۔ مگر اس وقت تو مزید کھا کر ہم بیمار پڑ جائیں گے۔ اس موقع پر میں خود کسی قدر اصرار کروں تم ہرگز مزید کھانے پر آمادہ نہ ہونا اور تمام مہمانوں کو بھی اپنا ہم رائے کر لینا تمہاری ذمہ داری ہے۔''

مصطفیٰ نے اپنی گردن دراز اور دہن نیم باز کے ساتھ میری باتیں پوری توجہ سے سنیں اور اس طرح مسکرایا کہ ہر بات اچھی طرح سمجھ گیا ہے۔ اس کے بعد گویا اپنی آواز کی مشین کو کچھ دیر چابی دینے کے بعد گویا ہوا۔

''بہت خوب۔ میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ مطمئن رہیے۔ میں اپنی ذمہ داری پوری طرح نبھاؤں گا۔''

میں نے اس کے سبق کو کئی دفعہ دہرا کر پھر ریہرسل کرائی۔ جب مطمئن ہو گیا تو اسے اپنا حلیہ درست کرنے اور لباس تبدیل کرنے کیلئے دوسرے کمرے میں بھیج دیا اور خود بے فکر ہو کر پھر کتاب کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔

دو گھنٹہ کے بعد تمام مہمان میز کے گرد بیٹھے پورے انہماک اور بے تکلفی کے ساتھ اپنے سامنے رکھے ماکولات کے ساتھ زیادہ سے زیادہ انصاف کرنے کی کوشش میں مشغول تھے کہ مصطفیٰ ایک اعلیٰ قسم کا نفیس سوٹ، اس کے ہم رنگ جرابیں اور ٹائی اور اونچے کالر کے شوز پہنے، زرق برق کرتا، طاؤس مست کی طرح چلتا کمرے میں داخل ہوا۔ شیو کرنے، بالوں کو درست طرح بنانے اور کریم، پاؤڈر اور خوشبویات کے استعمال کے بعد وہ گویا فلمی ہیرو بن گیا تھا۔ میں اسے دیکھ کر سخت حیران ہوا کہ اس قدر لمبے قد کے باوجود کیا تدبیر اختیار کی ہے کہ میرا لباس اس طرح درست آیا ہے گویا اول دن سے اسی لئے سیا گیا تھا۔

جناب مصطفیٰ خاں نے کمال متانت اور دلربائی کے ساتھ ابتدائی تعارفی رسم کو پورے وقار سے ادا کیا اور میز کے سرے پر میرے ساتھ کرسی پر تشریف فرما ہوئے۔ میں اپنے دوستوں سے اس کا تعارف دارالحکومت کے ایک لائق اور فاضل جوان کے طور پر کرایا۔ اور جب میں نے دیکھا کہ اپنے فرائض سے پوری خوبی اور ذمہ داری کے ساتھ عہدہ برآ ہو رہا ہے تو دلی طور

پر بڑی مسرت ہوئی۔ آخر کار میں اصل مسئلہ کی جانب سے پوری طرح مطمئن ہو گیا۔

اپنے اس اطمینان اور خوشنودی کے اظہار کی خاطر میں نے ایک گلاس عرق سے پر کیا اور گویا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''جناب مصطفیٰ خان صاحب۔ یہ اصفہانی عرق ہے جس میں الکحل کی مقدار کم ہے۔ اس کا ایک گلاس جناب کی خوشنودی کیلئے پیش کرتا ہوں۔''

اپنے لبوں کو غنچہ کی مانند وا کرتے ہوئے بولے۔

''اگرچہ مجھے ستارہ مارکہ فرانسو کی عادت ہے۔ مگر اس وقت آپ کے اصرار پر اطاعت کرتا ہوں۔''

یہ کہ کر انہوں نے گلاس میرے ہاتھ سے لیا۔ اپنی کلائی کے ایک جھٹکے سے اپنے گلے میں انڈیلا اور خالی گلاس میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اس کا مزہ بھی برا نہیں ہے۔ کچھ کچھ ووڈکا کے مزہ کی مانند ہے۔ خاص طور پر لینن گراڈ کا ووڈکا جس کی چند بوتلیں روسی قونصل جنرل نے چند دن پہلے ہی تحفتاً مجھے بھجوائی تھیں مگر یہ ایرانی تحفہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ ایرانی ہر میدان میں یورپ سے آگے بڑھ سکتے ہیں۔ مہربانی فرما کر ایک گلاس مزید عنایت فرما دیجئے۔''

قصہ مختصر یہ کے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ دو تہائی بوتل دیگر اعلیٰ مشروبات کے ساتھ مل کر اس لائق فائق جوان کے شکم کا حصہ بن چکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ماکولات کے ساتھ انصاف کرنے میں بھی ذرہ برابر کوتاہی نہیں کی، اس سے بڑھ کر یہ اس شراب و کباب نے مل کر ان کی شخصیت میں وہ انقلاب برپا کیا کہ دیکھنے کے باوجود یقین نہیں آتا تھا۔ انہوں نے اپنی خوش زبانی، خوش کلامی، بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی، حکایت سازی اور طاقت لسانی سے وہ سماں باندھا کہ پوری مجلس پر چھا گئے۔ یہاں تک کہ وہ اکیلے بولنے والے تھے اور باقی تمام ہمہ تن گوش تھے۔

یہ شخص جس نے امام زادہ داؤ حضرت عبدالعظیم کے محلوں سے باہر قدم تک نہیں رکھا تھا وہ اس وقت شکاگو، مانچسٹر، پیرس اور یورپ و امریکا کے دیگر شہروں کی اپنی سیاحت کے دوران پیش آنے والے واقعات ایسی تفصیل اور دلچسپ طریقے سے بیان کر رہا تھا کہ خود میں انہیں سن کر یقین کرنے پر مجبور ہو گیا۔ صرف وہ بول رہا تھا اور باقی سب سن رہے تھے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ گفتگو کا یہ سلسلہ ان کے لقموں کے راستے میں قطعاً رکاوٹ نہیں بنا جو پے در پے ان کے حلق سے اتر رہے تھے۔ لگتا تھا کہ ان کے گلے کے دو راستے ہیں۔ ایک نگلنے کا اور دوسرا بولنے کا۔

انہوں نے عید کی تیرھویں تاریخ کی مناسبت سے ایک قصیدہ بھی سنانا شروع کر دیا۔ اس کے بارے میں ان کا دعویٰ تھا کہ کل ہی کہا ہے۔ قصیدہ کے ہر شعر پر داد و تحسین کا شور بلند ہوتا، حاضرین میں چند ایسے بھی تھے جنہیں اپنے علم و فضل کا بڑا گمان ہے۔ وہ اس قصیدہ کے کچھ اشعار کو بار بار پڑھوا کر سنتے اور داد و تحسین کے ڈونگرے برساتے رہے۔ ایک صاحب جو شعر و ادب کے بڑے تحقیق والے ہیں وہ اس قدر خوش ہوئے کہ آگے بڑھ کر شاعر کی پیشانی کو چوم کر کہنے لگے۔ ''اے واللہ۔ حقیقتاً آپ استاد ہیں۔'' ساتھ ہی انہوں نے ان کا تخلص معلوم کیا تو مصطفیٰ نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

میں تخلص کو ایک رسمی اور زائد چیز سمجھتا ہوں اور اس کو ضروری خیال نہیں کرتا۔ مگر مرحوم ادیب پیشاوری مجھ پر خصوصی لطف فرماتے تھے۔ اپنی آخر عمر میں تو میرے ساتھ ان کا حال یک جان و دو قالب کا تھا۔ ان کی تجویز پر میں نے ''استاد'' کے لفظ کو تخلص کے طور پر اختیار کر لیا تھا۔ مگر اس کا زیادہ استعمال مجھے پسند نہیں ہے۔''

تمام حاضرین نے یک زبان ہو کر تصدیق کی کہ تخلص کے سزاوار حقیقتاً وہی ہیں۔

اسی دوران ٹیلیفون کی گھنٹی کی اندر کے ایک کمرے سے آواز آئی۔ جناب استاد نے ملازم کی جانب رخ کر کے کہا۔

''بھئی ذرا جانا۔ میرا خیال ہے کہ وزیرِ داخلہ ہوں گے اور مجھ سے بات کرنا چاہتے ہوں گے۔ بتا دینا کہ میں فی الحال مصروف ہوں۔ فارغ ہو کر انہیں فون کر لوں گا۔''

مگر معلوم ہوا کہ فون کی گھنٹی غلط نمبر ملنے سے بج رہی تھی۔

اگر کبھی میری نظر اس کی نظر سے مل جاتی تھی تو میں اپنی زبان بے زبانی سے اسے یاد دلاتا تھا کہ جو ذمہ داری اسے سونپی گئی ہے اسے یاد رکھے۔ مگر مجھے لگتا تھا کہ اس وقت پوری توجہ صرف میز کی جانب ہے اور اس کی آنکھیں انتہائی بے چینی کے ساتھ ایک ڈش سے دوسری ڈش کی جانب متوجہ ہو رہی ہیں۔ اس کے علاوہ پوری کائنات سے اس کا تعلق منقطع ہو چکا ہے۔

آخر وہ مرحلہ آ پہنچا جس کا انتظار میں گویا سالوں سے کر رہا تھا۔ سوپ، کباب، پلاؤ، سلاد، رائتہ، مشروبات و ماکولات کے دور پر دور چل چکے۔ احباب نے اپنے پیٹوں کو دہلانا اور ڈکاروں کا مقابلہ شروع کر دیا۔ اب گویا وہ موقع تھا کہ مرغاب کی ڈش سامنے لائی جائے۔ میں دل ہی دل میں حفظ و امان کی دعاؤں کا ورد کر رہا تھا اور اس قدر خوفزدگی کے عالم میں منتظر تھا کہ جانے کیا ظہور پذیر ہونے والا ہے۔ اسی لمحہ میں نے دیکھا کہ خادم ایک بڑی ڈش لئے داخل ہوا۔ ڈش پر ایک صحت مند بھنا ہوا مرغاب رکھا ہوا تھا۔ اس کے اطراف میں گھی کا پر جوش اظہار اس کی تازگی اور لذت کو نمایاں کر رہا تھا۔ خادم نے ڈش میز کے درمیان رکھی اور واپس

چلا گیا۔ میرے حواس کی ساری کائنات مصطفیٰ کی جانب منعطف تھی کہ مرغاب کا دلکش نظارا اور خوش کن خوشبو اسے اتنا مست نہ کردے کہ صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھے۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ ابھی اس کی عقل ٹھکانے پر تھی۔ جونہی اس کی نظر مرغاب پر پڑی اس نے مہمانوں کی جانب رخ کرتے ہوئے کہا۔

''حضرات آپ یقیناً اس وقت میری بات کی تائید فرمائیں گے کہ ہمارے میزبان تو ہم سے خیر خواہی کا رویہ نہیں رکھتے ہیں۔ کیا ابھی مزید گنجائش ہے کہ مرغاب بھی میز پر لایا جائے۔ ذاتی طور پر میرا یہ حال ہے کہ نہایت اعلیٰ اور خوش ذائقہ اس قدر کھانے کھا کر حلق تک پر ہو گیا ہوں۔ اب تو آسمانی دستر خوان بھی اتر آئے تو مزید ایک لقمہ کی گنجائش نہیں رہی ہے۔ ہم لوگوں کا یقیناً یہ ارادہ نہیں ہے کہ یہاں سے اٹھ کر سیدھے ہسپتال پہنچ جائیں۔'' اس کے بعد اس نے ملازم کو آواز دے کر بلایا اور کہا ''یہاں آؤ۔ تمام حضرات کی خواہش ہے کہ مرغاب کی ڈش کو جوں کا توں یہاں سے اٹھا کر اندر لے جائے۔ اسی میں ہم سب کی عافیت ہے۔''

تمام حضرات عجیب کشمکش میں پھنس گئے تھے۔ ایک طرف تو مرغاب کی اشتہا انگیز خوشبو ان کے دماغوں کو معطر کر رہی تھی، بھوک نہ رہی ہو تب بھی ایک آدھ لقمہ لے کر پتہ تو چلتا کہ اس کا ذائقہ کیسا اور بکرے کے کبابوں سے اس کا موازنہ کیا ہے۔ لیکن دوسری جانب جناب استاد کی بھاری بھرکم شخصیت تھی۔ اس کا لحاظ بھی لازم تھا۔ اب صورت یہ تھی کہ ہر ایک کی للچائی ہوئی نظر مرغاب کی جانب لگی ہوئی تھی۔ مگر زبان سے وہ جناب استاد کی بات کی تائید کر رہا تھا اور ان کی رائے پر آفرین کناں تھا۔ میں نے جب دیکھا کہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو رہا ہوں تو بے اختیار جی چاہا کہ ابھی اٹھ کر مصطفیٰ کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اسے آفرین کہوں اور اس کے اونٹ جیسے ہونٹوں کے بوسے لیتا رہوں۔ میں نے سوچا کہ ایسے کام کے بندے کو تو مجھے ہر وقت اپنے ساتھ رکھنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے ارادہ کیا کہ اس کیلئے کسی اچھی ملازمت کی تلاش کروں گا۔

میں دل ہی دل میں خوش ہونے کے باوجود چھری کانٹے کو اس طرح پکڑے ہوئے تھا جیسے مرغاب پر حملہ آور میں ہی ہونے والا ہوں۔ میں نے اصرار کیا کہ مرغاب کو چکھ ضرور لیا جائے۔ لیکن مصطفیٰ اس پر آمادہ نہیں ہوا۔ میرا اصرار بڑھا تو اس کا انکار بھی سخت ہو گیا۔ یہاں تک ہوا کہ تمام مہمان بھی اس کے ہم زبان ہو گئے اور مرغاب کو واپس بھیجنے کی رائے دینے لگے۔ گویا معاملہ بالکل خیر و عافیت کے ساتھ میری منشاء کے مطابق انجام پذیر ہو رہا تھا کہ شامت اعمال سے اچانک میرے منہ سے نکل گیا ''حضرات اس مرغاب کے اندر میوے بھر کر اسے خالص فرنگی مکھن میں بھونا گیا ہے یہ بالکل نئی ترکیب سے تیار ہوا ہے۔ اس سے بے تو جہی

نہیں کی جانی چاہیے۔''

میرے منحوس منہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ مصطفیٰ کا تو کوئی پرزہ جیسے ایک دم غلط سمت میں رواں ہوگیا اس نے ہاتھ بڑھا کر مرغاب کا کندھا کاٹا اور اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے بولا۔

''اب جبکہ اس کے اندر بھرے ہوئے میوہ جات اور فرنگی مکھن کی بات ہے تو میرے خیال میں میزبان محترم کی اس بات کو رد کر دینا روا نہیں۔ ان کا دل رکھنے کیلئے ہی ایک چھوٹا سا لقمہ چکھ لینے میں حرج نہیں ہے۔''

مہمان تو سب کے سب اسی موقع کے منتظر تھے۔ انہوں نے ایک لمحہ کی مہلت نہیں دی اور قحط زدہ بھوکوں کی طرح مرغاب پر ٹوٹ پڑے آن کی آن میں وہاں مرغاب چھوڑ اس کی ہڈیوں تک کا نشان باقی نہیں رہا تھا۔ انسان کو گوشت خور جانور کہا جاتا ہے۔ مگر اس دن تو یوں لگتا تھا کہ یہ گوشت خور نہیں ہڈی خور جانور ہے۔ لگتا تھا کہ یہ حضرات ایک زائد معدہ بھی اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ آخر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جو مہمان دو گھنٹوں سے طرح طرح کے کھانوں سے لطف اندوز ہو رہے ہوں اور پلیٹوں کو چاٹ کر چمکا چکے ہوں وہ نئے سرے سے اسی طرح مرغاب پر پل پڑیں گے کہ گویا مہینوں کے بھوکے ہیں۔

مرغاب کے ساتھ گزرنے والے اس ہولناک منظر نے مجھے تو بدحواس کر کے رکھ دیا اور اب سوائے رسمی خاطر داری کے الفاظ کے مجھے کوئی بات ہی نہیں سوجھتی تھی۔ ادھر مصطفیٰ نے مرغاب سے فراغت کے بعد ایک طویل ڈکار لی۔ میری جو پتلون پہنے ہوئے تھا اس کی جیب سے ریشمی رومال نکال کر بڑے انداز سے اپنے منہ اور ہونٹوں کو صاف کیا اور پھر سے ہندوستان کی سیر اور اس کے جنگلوں میں اپنے شکار کے قصوں کو بیان کرنا شروع کر دیا۔ یہ شکار اس نے اس دور کے رؤسا کی معیت میں کھیلے تھے اسی دوران ایک بلند منصب خاندان کی لڑکی سے اس کا معاشقہ بھی ہوگیا تھا۔ یہ تمام داستانیں مگن ہو کر سنا رہا تھا اور تمام حاضرین ان پر پورے یقین کے ساتھ واہ واہ کر رہے تھے۔ اسی دوران فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں اٹھ کر اندر گیا اور واپس آ کر اس معشوقہ کش شکاری حضرت سے مخاطب ہو کر کہا۔

جناب مصطفیٰ خان صاحب! وزیر داخلہ بذات خود فون پر موجود ہیں اور ان کا اصرار ہے کہ آپ سے چند باتیں کریں گے۔ وہ بڑے ناز کے ساتھ تمام حضرات پر نظر ڈالتا ہوا اٹھا اور میرے ساتھ کمرے سے باہر آ گیا۔ میں نے اپنے پیچھے دروازہ احتیاط سے بند کیا اور بلا کسی تمہید و تعارف کے ایک ایسا بھرپور ہاتھ استاد کے چہرے پر جڑا کہ انگلیوں سمیت بھرپور نقش استاد کی صورت پر ابھر آیا۔ میں نے کہا۔

''خانہ خراب کے بچے۔ حلق تک تو توں توں کر بھر چکا تھا۔ اس کے باوجود تیری لالچی

نظر مرغاب پر لگی ہوئی تھی۔ میں نے تجھ جیسے لنگور کو اپنے سر پر بٹھایا اور اتنی عزت دی۔ مگر تو نے تو اپنا دین وایمان دو بوٹیوں پر ہار دیا اور میرے ساتھ خیانت کی۔ اب لے ذرا اسی کا مزا چکھ''

اس کے بعد میں نے پوری طاقت سے ایک اور دھول صورت مبارک پر نثار کر دیا۔ اب وہ گویا پھر سے اپنی اصلی جون میں آ گیا تھا۔ وہی بے ڈھنگ اطوار، بے طور انداز اور پھٹی ہوئی بریدہ آواز کھانے کے تمام دورانیے میں ان اطوار وانداز کا کہیں شائبہ تک نہیں ہوا مگر اب جیسے پھر اصل مصطفیٰ میرے سامنے تھا۔ اپنی پھٹی ہوئی آواز میں بریدہ الفاظ کے ساتھ بولا۔

''میرے پیارے بھائی۔ میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ بھول تو آپ سے ہوئی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ہمارے درمیان جو کچھ طے پایا تھا وہ صرف مرغاب کے بارے میں تھا۔ آپ نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ اس کے اندر میوے بھرے ہوں گے اور اسے فرنگی مکھن میں تلا گیا ہوگیا۔ ذرا غور فرمائیں غلطی میری جانب سے نہیں آپ کی جانب سے ہوئی ہے۔''

اب میرے غصہ کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ اس کی بہانہ جوئی نے مجھے اس قدر مشتعل کر دیا کہ میں نے گھر کا بیرونی دروازہ کھولا اور اسے دھکا دے کر گلی میں اسی طرح پھینک دیا جیسے مردہ چوہے کو پھینک دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد کچھ وقت میں نے پرسکون ہونے میں لیا اور کمرے میں واپس آیا تو ایک مصنوعی مسکراہٹ زبردستی چہرے پر چپکالی تھی۔

یہاں احباب ادھر ادھر نیم دراز نیم غنودگی کی حالت میں تھے میں نے بتایا۔

''جناب مصطفیٰ خان انتہائی معذرت خواہ تھے کہ آپ حضرات کو خدا حافظ کہے بغیر ہی جانا پڑا ہے۔ دراصل وزیر داخلہ نے اپنے گاڑی ان کیلئے بھیجی تھی کہ فوراً آ کر ان سے ملیں''

تمام حضرات نے اس پر تاسف کا اظہار کیا اور ان کی خوش مشربی، مجلس آرائی، اور فضل وکمال کی طرح طرح سے تعریف کرتے رہے۔ ہر ایک نے مجھ سے ان کے گھر کا پتہ اور فون نمبر معلوم کیا کہ ان کی دعوت کا شرف حاصل کر سکے۔ میں بھی انتہائی بے حیائی کے ساتھ پیشانی پر بل ڈالے بغیر سب کو غلط بتاتا رہا۔

دوسرے دن مجھے خیال آیا کہ غصہ کے غلبہ میں میں نے جناب مصطفیٰ خان کے ساتھ اپنے ایک نئے سلے ہوئے بہترین اور قیمتی سوٹ کو اپنے ہاتھوں گلی میں پھینک دیا تھا۔ لیکن خود کردہ را علاجے نیست۔

اسی پر مجھے خیال آیا کہ یہ تمام صورت حال جو مجھے پیش آئی وہ میری اپنی کرنی کا پھل ہی تو ہے اس میں مصطفیٰ کا شاید زیادہ قصور نہیں ہے۔ واقعی خود کردہ را علاجے نیست۔

☆☆☆☆☆

مشتاق احمد یوسفی۔ کراچی

پانچواں شیر

جو غائب بھی ہے حاضر بھی

اردو کے ممتاز ترین مزاح نگار جناب مشتاق احمد یوسفی کا تازہ ترین شہ پارہ۔ لمز یونیورسٹی لاہور کے سالانہ کانووکیشن میں پڑھا گیا خطبہ صدارت

جناب پرو چانسلر، جناب ریکٹر، جناب وائس چانسلر، اساتذۂ کرام، عزیزانِ جامعہ، معزز خواتین و حضرات! بیٹھ کر تقریر کرنے کی معذرت سب سے پہلے لازم ہے۔ ممکن ہے آخری صف والوں کو صرف میرا سر اور جسم کا نصف بالائی حصہ نظر آ رہا ہو۔ یقین جانیے باقی ماندہ نصف بھی ایسا ہی ہے۔

مجھے یہاں اور ایسے جامہ و جبہ عالمانہ میں دیکھ کر جتنا تعجب آپ کو ہو رہا ہوگا، اس سے کہیں زیادہ حیرت مجھے ہے۔ کچھ دیر پہلے جب گاؤن پہن کر آئینہ دیکھا، تو مجھے شناختی کارڈ والی تصویر سراسر جعلی لگی۔ بینکار اور بیوروکریٹس آج کل بجا اور بے جا، دونوں اعتبار سے بدنام ہیں، لیکن ان سے بھی بدتر ایک اور شخص ہے، ریٹائرڈ بیوروکریٹ اور بینکار ع۔ پھرتے ہیں سود خوار کوئی پوچھتا نہیں

عمرِ عزیز کی اکتالیس بہاریں بینکاری کی نذر ہوئیں۔ چند برس سے فقط لکھاری کی حیثیت سے جانا، پہچانا اور پکارا جاتا ہوں، الحمدللہ۔ چند روز قبل اسلام آباد میں بلند منصب پر فائز ایک دوست نے حسب حال قصہ سنایا۔ ایک پرہجوم تقریب کے اختتام پر انہوں نے مائیک پر بار بار اعلان کروایا کہ غلام نبی ڈرائیور نہیں آیا۔ جب کامیابی نہیں ہوئی تو ہمارے دوست نے جھنجھلاتے ہوئے پانچویں بار اعلان کرایا غلام نبی ڈرائیور جو پندرہ برس سے مالی کا کام کرتا رہا ہے اور ڈیڑھ ماہ سے ڈرائیوری کر رہا ہے، گاڑی لے آئے۔ اعلان ہوتے ہی غلام نبی نے

پھرتے ہیں سود خوار کوئی پوچھتا نہیں

فوراً کار صحن میں لا کے کھڑی کر دی۔

میں وثوق کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کس حیثیت سے طلب اور یاد کیا گیا' بہر صورت وبہر عنوان حاضر خدمت ہوں ع

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ سود خوار ہوتا

مالی ہونے پر نہ متاسف ہونا چاہیے نہ محجوب کہ یہ تو ایک علامت استعارہ ہے ورنہ عزیزو' آگے چل کر آپ کا پیشہ کچھ بھی ہو اور آپ جو بھی وسیلۂ معاش اختیار کریں' آپ کا شعار اور طریق کار وہی ہوگا اور ہونا بھی چاہئے جو باغبان کا ہوتا ہے۔ میاں محمد بخش کہتے ہیں ؎

مالی دا کم پانی دینا' بھر بھر مشکاں پاوے
مالک دا کم پھل پھل لانا' لاوے یا نہ لاوے

(مالی کا کام پانی دینا' وہ مشکیں ڈالتا چلا جاتا ہے' مالک کا کام پھل پھول لانا' لائے یا نہ لائے)۔

دانش گاہ کی علمی' آدرش وادی اور شفاف فضاؤں سے باہر نکلنے کے بعد زندگی میں آپ کو ایسے چھوٹے بڑے صحرا اور خارزار بکثرت ملیں گے جنہیں خونِ دل سے سینچ کر گل وگلزار بنانا آپ کا فریضہ ہوگا۔ اس سے عہدہ برآ ہونا فی نفسہ فوزِ عظیم ہے کہ یہ عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔

کسی شخص نے ایک ولی کامل سے سوال کیا "حضرت! اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسمائے حسنہ میں وہ کون سا اسمِ اعظم ہے جس کے واسطے سے جو دعا کی جائے' شرفِ قبولیت پاتی ہے؟"

انہوں نے فرمایا۔ "رزقِ حلال کماؤ' پھر اللہ کو جس نام سے بھی پکارو گے' وہی اسمِ اعظم ہوگا۔"

اگر آپ نے مجھے ادیب اور مزاح نگار کی حیثیت سے دعوتِ کلام دی ہے' تو واقعی بڑا خطرہ مول لیا۔ خیر جب ''رسک'' لیا ہے تو صبر کر' اس میں تو یہی کچھ ہوتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ بچھو اپنی محبت کا اظہار بھی ڈنگ مار کر کرتا ہے۔

اسی لئے اس کی محبت سے پناہ مانگنی چاہیے۔ اس پر مجھے ہوسٹن' امریکہ کا واقعہ یاد آیا جہاں میرے اعزاز میں پاکستانی انجمن نے ایک پر تکلف تقریب پذیرائی کا اہتمام کیا تھا۔ اس

اصل بات یہ ہے کہ بچھو اپنی محبت کا اظہار بھی ڈنگ مار کر کرتا ہے۔

میں شرکت کا ٹکٹ بیس ڈالر تھا۔ انجمن کے منتظمین بہت بڑے پاکستانی تاجر کی خدمت میں وفد کی صورت میں اس درخواست کے ساتھ حاضر ہوئے کہ آپ یوسفی صاحب کی تقریب کے

سرپرست (Sponsor) بن جائیے۔ موصوف نے پوچھا "یہ صاحب کیا کرتے ہیں؟"

جواب ملا "کچھ نہیں کرتے، لکھتے ہیں۔"

"کیا لکھتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"یہی ہنسی دل لگی کی باتیں۔" وفد کے سربراہ نے جواب دیا۔

"تو کیا معین اختر سے بھی بہتر ہیں؟"

جب وفد کے سربراہ سے اس کا کوئی جواب نہ بن پڑا تو اس تاجر نے نہ صرف میری سرپرستی کرنے سے انکار کر دیا بلکہ بیس ڈالر کا ٹکٹ بھی نہیں خریدا۔

پاکستانی یونیورسٹیوں کو اگر کمالِ جامعیت اور بین الاقوامی معیار کی درس و تدریس کے اعتبار سے مختصر کیا جائے تو لمز (LUMS) یقیناً پاکستان کی دو بہترین یونیورسٹیوں میں سے ایک ہوگی۔ میرے لئے یہ امر باعثِ صد افتخار و انبساط ہے کہ جناب سید بابر علی نے مجھے اس جلسہ تقسیمِ اسناد کے طلبہ و سامعین کرام سے خطاب کی دعوت دی جس کے لئے میں تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔

مجھے علم ہے کہ گزشتہ برسوں میں خطبہ صدارت کی زبان صرف انگریزی رہی ہے لیکن ذاتی طور پر میں ایلیٹ (Elite) یعنی اشرافیہ اور پروفیسروں کے اس طبقے سے تعلق نہیں رکھتا جو غلط انگریزی کو صحیح اردو پر ترجیح دیتے ہیں۔

لہٰذا میں نے اردو میں گفتگو کرنے کی اجازت چاہی جو مجھے بخوشی مل گئی۔ اگر میں فارسی یا پنجابی میں خطاب کی اجازت چاہتا تو یقیناً وہ بھی خوشدلی سے مل جاتی، اس لئے کہ بابر علی صاحب کو یہ فخر اور قابلِ رشک امتیاز حاصل ہے کہ ایک شاندار اور جید جامعہ کی داغ بیل ڈالنے کے علاوہ انگریزی، فارسی، اردو اور پنجابی کے ادبی شاہکار اپنے مؤقر ادارے کی زیرِ نگرانی شائع کر کے اہلِ ذوق اور شائقین کو تحفۃً ارسال فرماتے رہتے ہیں۔

پرخلوص اظہارِ ممنونیت کے ساتھ ساتھ یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ عزیزانِ جامعہ سے اردو میں گفتگو کرنے کا عذر قطعاً نہیں کروں گا۔ انگریزی کے مقابلے میں اردو میں بظاہر ایک ہی خرابی نظر آتی ہے...... وہ یہ کہ آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔

قطع نظر اس سے کہ کس کی مادری زبان کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ گانا، گنتی، گلہ گزاری، گر کی بات اور گالی اپنی مادری زبان ہی میں اچھے لگتے ہیں۔ بڑے سے بڑا ہفت زبان بھی

انگریزی کے مقابلے میں اردو میں بظاہر ایک ہی خرابی نظر آتی ہے... وہ یہ کہ آسانی سے سمجھ آ جاتی ہے۔

نوٹ اپنی مادری زبان ہی میں گنتا ہے۔ میں بھی ساری عمر اوروں کے لوٹ کھسوٹ کے نوٹ مادری زبان میں نہ صرف گنتا بلکہ ماہ بہ ماہ اس کی معقول تنخواہ بھی پاتا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تازہ اور نئے نوٹوں کی خوشبو قلب کو تقویت، آنکھوں کو طراوت اور روح کو طمانیت بخشتی ہے، لیکن اس کی تین شرطیں ہیں۔ پہلی شرط یہ کہ نوٹ اپنے ہی ہوں، دوسری اور تیسری شرط بھی یہی ہے۔

میں کبھی کوئی اچھا سکول، کالج یا یونیورسٹی دیکھوں تو مسرت، ستائش اور رشک کے ملے جلے جذبات کے علاوہ مجھے اپنے سنِ پیدائش پر بے اختیار غصہ آ جاتا ہے۔ اگر یہ وہی ہوتا جو اوسطاً عزیزانِ جامعہ کا ہے، تو آج میں بھی آپ کی صفوں میں گاؤن پہنے کھڑا مسکرا رہا ہوتا اور ایک اعلیٰ اور معتبر درس گاہ سے سندِ فضیلت وصول کر کے خود کو مسرور و مفتخر محسوس کرتا۔ میری دلی مبارکباد قبول کیجئے۔

میں نے زندگی میں پند و نصائح سے لبریز بس ایک ہی خطبہ صدارت سنا ہے جو کسی بھی معصوم طالب علم کو تا دمِ حیات خوش فہمی اور مغالطے میں رکھنے کے لئے کافی تھا۔ وجہ یہ کہ اس خطبہ معلی میں دانش سقراط سے زیادہ بقراط کا غلغلہ تھا۔ اس کے بعد میں نے عہد کیا کہ گاؤن پہن کر میں جاہلانہ بات تو کر سکتا ہوں، سن نہیں سکتا۔ کیا خبر تھی کہ ایک دن یعنی آج، آپ کو اس آزمائش میں مبتلا کرنا میرے خوشگوار فرضِ منصبی میں شامل ہوگا، لیکن معاف کیجئے، دل کی بات زبان پر آئے بغیر نہیں رہتی۔ ایسا کرتے ہوئے مجھے ایک طرح کی انتقامی مسرت محسوس ہو رہی ہے ع

وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا

مجھے اپنی ذات سے ایسی کینہ پروری کی توقع نہیں تھی! ماشاءاللہ، آج جو طلبہ و طالبات

مجھے اپنی ذات سے ایسی کینہ پروری کی توقع نہیں تھی!

جامعہ کی سندِ فضیلت سے سرفراز ہو رہے ہیں، وہ بلاشبہ سمسٹروں (Semesters)، سخت امتحانوں اور سخت تر نظم و ضبط سے کامیاب گزرے ہیں۔ دل کی بات پوچھئے تو زمانہ طالب علمی میں دو کانٹے ایسے تھے جن کی چبھن رگِ جاں میں آج بھی محسوس ہوتی ہے۔ اول، بزرگوں کی نصیحتیں جن سے ہمارے چال چلن کی ناکہ بندی کر دی گئی۔ دوم، امتحان...... ان دونوں نے حیران و پریشان کر رکھا تھا۔

بزرگوں کی نصیحتوں پر تنقید کرنے یا برسرِ عام ان کا مذاق اڑانے کی گستاخانہ حرکت سے میں خود کو سختی سے باز رکھوں گا، اس لئے کہ میرے پوتے اور نواسے کہتے ہیں کہ اب میں بالکل

ویسی ہی نصیحتیں کرنے لگا ہوں۔ بلکہ جیسے جیسے وقت گزرتا ہے' نصیحت میں وصیت کا رنگ اور رقت جھلکنے لگتی ہے۔

رہا دوسرا کانٹا یعنی امتحان کی تیاریاں اور اس کا خوف تو ایسا لگتا ہے کہ یہ باغ جوانی میں کبھی بہار نہیں آنے دے گا۔ ہم سوچا کرتے تھے کہ اگر امتحان نہ ہوتے تو ہماری زندگی جنت کا نمونہ ہوتی۔ اب خیال آتا ہے کہ وہ تو ایسی اجاڑ جنت ہوتی جس سے آدم اور شیطان' دونوں امتحان میں فیل ہونے کے سبب نکالے جا چکے تھے۔ ایسی جنت کو کیا کرے کوئی؟ ہم اپنے پروفیسروں سے حسد کرنے لگے تھے' محض اس لئے کہ انہیں کسی امتحان میں نہیں بیٹھنا ہوتا تھا۔ دراصل ہم پڑھنے سے پہلے پڑھانے کے خواہشمند تھے۔ ہماری حالت اس چیلے جیسی تھی جو علم کی تلاش میں ایک پہنچے ہوئے گرو جی کے پاس ناریل' لڈو' سیندور اور گرو دکشنا (نذر) لے کر گیا۔ ڈنڈوت کے بعد ہاتھ جوڑ کے عرض کی کہ اسے اپنا چیلا بنا لیجئے۔

گرو جی نے کہا "بچہ' چیلا بننا تو بڑا کٹھن کام ہے۔"

اس نے کہا "تو پھر مجھے گرو ہی بنا لیجئے!"

عزیزانِ گرامی قدر! آپ خوش نصیب ہیں کہ آپ کو ایسے گرو نہیں ملے۔ آپ کے گرو آپ سے بھی زیادہ خوش قسمت ہیں کہ انہیں ایسے شاگردوں سے پالا پڑا۔ آپ جس نظم و ضبط سے بتدریج' بمراحل اور باقاعدہ طور پر گزرے ہیں' یہ یقیناً اس امر کی ضمانت ہے کہ آپ تجارت و صنعت اور انتظامی تقاضوں اور چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کی پوری پیشہ ورانہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں انتظام (Management) اگر کوئی علم تھا بھی' تو اس کی حیثیت سفلی علم سے زیادہ نہ تھی۔

جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا اور ذہانت' جودت و جدت کے بجائے صرف پسینہ طلب کرتا تھا! میں نے وہ زمانہ دیکھا ہے جب بینکاری جیسے اختصاصی شعبے میں تربیت کا کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ میں نے جس بینک میں پندرہ سال گزارے' وہاں ایک زمانے میں سوائے چیف اکاؤنٹنٹ کے کسی کو بینک کی کتاب ہدایات (Manual of Instructions) پڑھنے کی اجازت نہ تھی' جو سیکورٹی کی غرض سے لندن میں چھپوایا گیا تھا۔

وجہ یہ بتائی جاتی تھی کہ اگر افسر و کلرک صاحبان بینک کے تمام مراحل سے واقف ہو گئے تو قوی امکان ہے کہ غبن کر بیٹھیں گے! میں نے اس کتاب کا خفیہ حصہ دوم مقررہ عہدے اور

ہمارے زمانے میں انتظام (Management) اگر کوئی علم تھا بھی' تو اس کی حیثیت سفلی علم سے زیادہ نہ تھی۔

استحقاق سے بہت پہلے چوری چھپے پڑھ ڈالا۔ چنانچہ اس چوری شدہ علم کی بدولت میں صرف پونے تین سال کے بینکاری تجربے کے باوصف مسلم کمرشل بینک کا چیف اکاؤنٹنٹ بنا دیا گیا۔ چیف انسپکٹر آف برانچز اور سیکرٹری کے عہدے اس کے علاوہ!

اس سہ گونہ ترقی درجات سے میری تنخواہ میں تو ایک پائی کا بھی اضافہ نہیں ہوا' لیکن بینک کو ایک روپے اور دو آنے کا نقصان ہوا۔ اس سے زیادہ نقصان اس لئے نہیں ہوا کہ چھ چھ آنے کے تین ربڑ اسٹمپوں کی قیمت یہی بنتی تھی۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ مجھ سے بحیثیت چیف اکاؤنٹنٹ 'ٹوٹل یعنی جمع میں تین پائی کی غلطی ہو گئی۔ انگریز جنرل منیجر نے جو اس حد تک 'الکحلک' تھا کہ جیب میں وہسکی کی شیشی رکھ کر بینک آتا تھا' مجھے بحیثیت انسپکٹر آف برانچز طلب کیا اور کہا "میں چاہتا ہوں کہ تم چیف اکاؤنٹنٹ کے کام کا سختی سے معائنہ کیا کرو!"

اس واقعے کا ذکر میں ازاہِ مشیخت یا مذاقاً نہیں کر رہا بلکہ آج سند پانے والے طلبہ و طالبات دہری مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہیں پیشے کے رموز اسرار سے واقف ہونے کے لئے میری طرح چوری نہیں کرنی پڑی۔

ہاں' یہ بھی بتاتا چلوں کہ الکحلک انگریز بینکار کہتا تھا' تین پائی کی غلطی تین کروڑ روپے کی غلطی سے زیادہ ذلیل ہے' اس لئے کہ اس سے غلطی کرنے والے کی کم ہمتی بھی ظاہر ہوتی ہے۔

یوں کہنے کو تو طالب علم امتحان دینے اور ڈگری ملنے کے بعد فارغ التحصیل کہلاتا ہے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ اصل امتحانات کا سلسلہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ہی شروع ہوتا ہے۔ زندگی ہر قدم' ہر موڑ اور مرحلے پر محنت اور جفاکشی کا مطالبہ کرتی ہے۔ کامیاب انسان کی زندگی میں کبھی دم لینے کی فرصت یا وقفہ آرام طلبی نہیں آتا اور نہ آنا چاہئے۔ جہدِ مسلسل کا عادی کبھی نگارِ ہستی سے یہ کہنے کا تصور نہیں کر سکتا ع

مجھ سے پہلی محنت مرے محبوب نہ مانگ

جن پیشوں کو عرفِ عام میں معمولی پیشے (Mundane Profession) کہا جاتا ہے' ان میں کاروباری برداشت سے زیادہ پڑھا لکھا ہونا یا ادیب اور دانش ور کہلانا ایک نوع کی گالی تھی اور ہے! خصوصاً دانش ور کہلانا کسی بھی بینکار کی بدترین نااہلیت تھی۔ کاروباری دنیا میں ایسے دانش ور کو یوں بھی دوغلی مخلوق سمجھا جاتا ہے۔ اس کی مثال بالعموم اڑن مچھلی سے دی جاتی ہے جس کی مصیبت یہ ہے کہ اگر وہ سمندر میں زیادہ نیچے اتر جائے تو بڑی مچھلیاں اسے کھا جاتی ہیں اور اگر ہوا میں ذرا اونچی اڑے تو چیل کوے تکا بوٹی کر دیتے ہیں۔ زمین پر اترے تو بلی بھنبھوڑ کر کھائے۔

ایک بار بینک کے چیف اکاؤنٹنٹ' یعسوب الحسن غوری نے مجھ سے کہا کہ آپ بینک میں اتنی صحیح اردو نہ بولا کریں' بیوپاری بدک جاتے ہیں۔ آپ ابھی' کنفرم' نہیں ہوئے اور انہوں نے کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہا۔ میں نے عمر عزیز کے ۳۹ سال اس پیشے کی نذر کیے ہیں۔ پانچ مختلف بینکوں کا صدر رہ چکا ہوں۔ دیدنی و نادیدنی سب کچھ دیکھا بھالا ہے　ع

گزرا اک زمانہ ہماری نگاہ سے

لیکن میں نے آج تک کسی شاعر یا ادیب کو کیش ڈیپارٹمنٹ میں نقدی کی رکھوالی پر مامور ہوتے نہیں دیکھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے' کراچی میں مجھے ایک سیٹھ صاحب کا' جو بینک کے ڈائریکٹر بھی تھے' فون آیا کہ مجھے یوسفی صاحب سے بات کرنی ہے۔ میں نے عرض کیا "خادم بول رہا ہے۔"

جھنجھلاتے ہوئے بولے "بابا! ایک باری سن لیا' میں بہرا نہیں ہوں۔ کیا سمجھے؟ میرے کو خادم نئیں چھیئے' یوسفی سے بات کرنی ہے' جلیبخا بائی سے نئیں۔"

وہ دن ہے اور آج کا دن' ٹیلی فون کے اس سرے سے پھر کبھی خادم نہیں بولا۔ کم و بیش دس سال تک میں صرف مشتاق احمد کے عام نام سے مضامین لکھتا رہا۔ تاکہ بینک والے مجھے پہچان نہ سکیں اور جب یہ بھانڈا پھوٹا تو میرا ملازمت سے نکالا جانا بہت مشکل تھا' اس لئے کہ انتظامیہ کی غفلت اور ڈائریکٹروں کی بے خبری کے سبب میں اتنی ترقی پا چکا تھا کہ خود اچھے اچھوں کی کلغی پہ چونچ مار سکتا تھا۔

ایک اور سیٹھ کا ذکر ہے۔ میں ڈپازٹ کے پھیر میں چھ ماہ تک جوڑیا بازار میں ان کے دفتر کا طواف کرتا رہا' مگر ان کا دل نہ پسیجا۔ ہر دفعہ تھری کاسل کی سگریٹ پلا کے رخصت کر دیتے۔ چاندی کے سگریٹ کیس میں ایک طرف سگرٹیں اور دوسری طرف بیڑیاں بجی رہتیں۔ وہ خود ہمیشہ بیڑی پیتے تھے۔ ایک دن ہم نے پوچھا۔ "سیٹھ آپ سگریٹ نہیں پیتے؟"

اس وقت تازہ جلیبی کھا رہے تھے' بولے "نئیں' جس مانس (آدمی) نے ایک بار جلیبی اور بیڑی چکھ لی' وہ جنت میں بھی بیڑی اور جلیبی ہی مانگے گا۔ سگریٹ تو ہم تم جیسے بابو لوگوں کے لئے رکھتے ہیں' عزت دار لوگوں کو بیڑی آفر کرتے ہیں' لو سگریٹ پیو۔"

مرزا بھی بیڑی کی بہت تعریف کرتے ہیں' کہتے ہیں "طبی تحقیق سے ثابت ہو گیا ہے کہ سگریٹ پینے والوں کو لنگ کینسر ہو جاتا ہے' لیکن بیڑی سے آج تک کسی کو پھیپھڑے کا سرطان نہیں ہوا' حلق کا کینسر ہوتا ہے!"

ایک دن ہم نے جی کڑا کر کے سیٹھ سے پوچھ ہی لیا کہ صاف صاف بتائیے' آپ ہمارے بینک کو ڈپازٹ کیوں نہیں دیتے؟ بولے "آج تم نے جینئس لائک بات کی ہے۔ مگر

پہلے تم صاف صاف بتاؤ کہ تم گجل بناتے ہو؟ بولو'ہاں۔"

میں نے کہا" نہیں میں تو نثر لکھتا ہوں۔"

بولے "یہ کیا ہوتا ہے؟"

ہم ٹھیک سے صراحت نہ کر سکے' تو بولے "خیر مگر بہی کھاتوں کے علاوہ کچھ اور لکھتے تو ہو' کہو ہاں!"

پھر فرمایا"اب تم ایک سوال کا جواب دو۔ فرض کرو تمہیں آنکھ کا آپریشن کرانا ہے۔ تمہارے پاس دو ڈاکٹروں کی چوائس ہے۔ ایک تو فقط ڈاکٹر ہے' دوسرا شاعر بھی ہے۔ ایمان سے بتاؤ' تم کس ڈاکٹر سے آپریشن کراؤ گے؟ صورت سے تو بال بچے دار آدمی لگتے ہو۔"

میں نے اقرار کیا"اس ڈاکٹر سے جو شاعر نہیں ہے۔"

بولے "تو ایسا بولو نا! میں اسی لئے تمہاری برانچ میں پیسہ نہیں رکھتا۔ روپے پیسے اور بیوپار کی بات آدمی دیکھ کے کی جاتی ہے۔ یہ کوئی گجل تھوڑا ہی ہے کہ رستہ چلتے آدمی کو پکڑ کے سنا دی۔ برا نہیں ماننا منیجر صاحب! لو ایک سگریٹ اور پیتے جاؤ۔"

یہ دو واقعات میں نے ازراہِ تفنن گوش گزار نہیں کیے نہ ان سے اپنی مبینہ بے توقیری کی تشریح و تشہیر مقصود ہے۔ دکھانا صرف یہ تھا کہ کاروبار اور صنعت کار کا مزاج' زبان اور تقاضے ادبی محفلوں اور کمرۂ جماعت کے ماحول سے مختلف ہوتے ہیں۔ نیز یہ کہ محض ماحول پر لاحول پڑھنے سے بات نہیں بنتی' مکتبوں' مدرسوں' دانش گاہوں اور جامعات سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد پہلا انکشاف یہ ہوتا ہے کہ کاروبارِ دنیا ہمیشہ نصابی کتاب کے مطابق نہیں چلتا۔

> **کاروبارِ دنیا ہمیشہ نصابی کتاب کے مطابق نہیں چلتا**

جس طرح ہومیو پیتھک دوا کو جتنا زیادہ ہلکایا(Dilute) کیا جائے اتنی ہی اس کی تاثیر اور زود اثری میں اضافہ ہوتا ہے' اسی طرح کتابی علم جب ذاتی تجربے کی کٹھالی میں گل اور پگھل کر حقائق حاضرہ کے ساتھ یک جان و ہم رنگ یک دگر ہو جائے تب ہی صحیح معنوں میں نافع یعنی کارآمد' کارکشاہ آفریں ہوتا ہے۔ پھر انسان' بقول شاعر "نشہ علم میں سرمست غرور و پراں" نہیں ہوتا بلکہ' م اس کے وجود کے رگ و پے میں بھینی بھینی خوشبو کے مانند رچ بس جاتا ہے　ع

باسی ہار میں جیسے خوشبو پھول پہننے والے کی

آج کل جس تیزی سے بعض تعلیمی ادارے اپنے ترسیلی پٹے (Conveyor belt) سے نیم پخت اور ان گھڑ ایم بی اے نکال رہے ہیں' اس سے ظاہر ہے کہ مقصد منفعت کے علاوہ تعداد بڑھانا ہے...... معیار پیشِ نظر نہیں۔ نہ صرف یہ کہ تحقیق ان کے نصاب میں شامل نہیں بلکہ نیت

اور نظریہ تعلیم میں بھی فتور نظر آتا ہے۔

بری بھلی تھیوری کو جیسے طوطے کی طرح رٹا اور معجون کی طرح چٹا کر ڈگری ہاتھ میں تھما دیتے ہیں، لیکن طلبہ نے جو کچھ، جیسا کچھ اور جتنا کچھ بھی پڑھا پڑھایا ہے، اس کو مارکیٹ کے حالات اور منڈی کے کڈھب میکنزم سے دور کی بھی نسبت نہیں ہوتی۔ ایسے طلبہ کو مارکیٹ کے کھردرے حقائق، مسائل، میلانات اور پیچ و خم کا قطعاً علم نہیں ہوتا۔ ان غریبوں کی حالت اس باز کی سی ہوتی ہے جسے ایک شیخ نے گھر کی چار دیواری میں پالتو کبوتروں پر جھپٹنا، جھپٹ کر پلٹنا اور پلٹ کر پکڑنا سکھایا تھا۔ جب باز کی گھریلو تربیت مکمل ہوگئی تو شیخ اسے صحرا میں لے گیا اور ہشکار کر تکوروں پر چھوڑا۔ مگر باز سیدھا گھر گیا، وہاں ایک پالتو کبوتر پر جھپٹا، اسے پنجوں میں دبائے لوٹا اور شیخ کو پیش کر دیا!

فقط تھیوری اور کتابیں رٹنے والے آگے چل کر صرف کاغذی کبوتر ہی پکڑ سکتے ہیں

تو صاحبو! فقط تھیوری اور کتابیں رٹنے والے آگے چل کر صرف کاغذی کبوتر ہی پکڑ سکتے ہیں اور مینجمنٹ "جارگن" کے طوطا مینا اڑا سکتے ہیں۔ صدی بہ صدی اور سال بہ سال بدلتے زمینی حقائق، بیوپار اور بیوپار کے نئے طور طریق، فکر و نظر کے تغیر پذیر زاویے، پیداواری تکنیک اور توسیع و ترقی کے جدید ضابطے...... یہ سب عوامل اس کے متقاضی ہیں کہ ہم علم و فضل اور ٹیکنالوجی کے کسی بھی درجے اور بلند مرتبے پر پہنچ جائیں، ہمارے پانچ یا پچاس سالہ منصوبے اور معاشی عزائم خواہ عرشِ معلیٰ کی رفعتوں کو چھونے لگیں، لیکن ہمارے پاؤں اپنی گلِ زمیں، اپنی سوہنی دھرتی پہ مضبوطی سے جمے رہنے چاہئیں۔

یونانی دیومالا میں ایک دیو انٹایوس کا ذکر ملتا ہے جو اپنی ساری طاقت و توانائی زمین سے حاصل کرتا تھا۔ اسے کشتی اور دوبدو لڑائی میں کوئی نہیں ہرا سکتا تھا، کیونکہ اس کے پاؤں ہمہ وقت طاقت بخش زمیں سے جڑے رہتے تھے۔ اس دیو کو یونانیوں کے عظیم ترین ہیرو ہرکولیس نے بالآخر اس طرح زیر، ذلیل اور ہلاک کیا کہ کولی میں بھر کر زمین سے اٹھا لیا۔ زمین سے پیروں کا تعلق منقطع ہوتے ہی اس کی ساری طاقت، کس بل اور شہ زوری دم بھر میں ختم ہو گئی۔ کچھ ایسا ہی انجام ان لوگوں اور قوموں کا ہوتا ہے جو زمین، اہلِ زمین اور زمینی حقائق سے

کچھ ایسا ہی انجام ان لوگوں اور قوموں کا ہوتا ہے جو زمین، اہلِ زمین اور اور زمینی حقائق سے اپنا رشتہ ناتا توڑ لیتے ہیں

اپنا رشتہ ناتا توڑ لیتے ہیں۔ ہماری تعلیمی بنیاد (Corporate Bottom Line) کتنی ہی خوش کن کیوں نہ ہو، ہم اس چیختی، کراہتی زمینی حقیقت سے کیسے نظریں چرا سکتے ہیں کہ وطنِ عزیز میں تین کروڑ افراد یعنی ہر پانچواں آدمی خطِ افلاس سے نیچے زندگی بسر کر رہا ہے؟ اس کی ماہانہ آمدنی ۶۷۰ روپے یعنی ۲۲ روپے یومیہ ہے ؏

کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں

میں آپ کو اعداد و شمار سے گرانبار کیے بغیر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خطِ افلاس کے نیچے، معاشرے کی پاتالی پستیوں میں جینے اور جئے جانے والے یہی لوگ ہماری تہذیبی روایات کے پاسدار، قومی تشخص اور سلامتی کے محافظ و امانت دار اور مستقبل کے نقیب وصورت گر ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے ایک جاپانی حکایت پڑھی، جس کا عنوان تھا "پانچواں شیر۔"

یہ حکایت کچھ اس طرح ہے کہ کوزن نامی معبد یعنی عبادت گاہ کا مہامہنت، کِکی یو شیروں کو سدھانے میں حیرت انگیز مہارت رکھتا تھا۔ اس کی شہرت سارے ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اس کی سدھائی ہوئی شیرنیاں انسانی بچوں کو اپنا دودھ پلا کے پال سکتی ہیں۔ شیروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ عبادت گاہ کے مخصوص منتروں اور گانوں کی دھن پہ ڈکارتے اور دھاڑتے ہیں۔ ایک دن ایک شہزادہ، کِکی یو کے شیروں کے محیر العقول کرتب دیکھنے آیا۔ ابھی وہ ورطہ حیرت سے نہیں نکلا تھا کہ اچانک اس کی نظر پانچ گندے، مرکھنے اور دوغلے شیروں پر پڑی جو ایک درخت کے نیچے سو رہے تھے۔ ان کے جسم پر کلیاں (چچڑیاں) رینگ رہی تھی۔

شہزادے نے پوچھا "اور یہ وہ شیر ہیں جنہیں تربیت دینے میں آپ ناکام رہے؟"

"ناکام؟" کِکی یو نے تفاخر سے کہا۔ "جنابِ عالی! یہ تو میری کامیابی کا سب سے بڑا ثبوت ہیں۔" پھر اس نے بتایا کہ ان پانچ شیروں کو عبادت گاہ کا پہرا دینے کی خصوصی تربیت دی گئی ہے۔ جیسے ہی سورج غروب ہوا، ایک شیر عبادت گاہ کی دیوار کا پہرا سنبھال لیتا ہے۔ دوسرا مغرب کی طرف خود کو تعینات کرتا ہے۔ باقی ماندہ دو شمالی اور جنوبی اطراف کی دربانی کرتے ہیں۔ یہ چاروں رات بھر گھومتے پھرتے اور عبادت گاہ اور اس کے اندر رہنے اور عبادت کرنے والوں کو ڈاکوؤں اور لٹیروں سے محفوظ رکھتے ہیں۔

"لیکن یہ تو پانچ شیر ہیں، پانچواں کس کی حفاظت کرتا ہے؟"

"پانچواں دیکھنے میں کمزور اور مسکین لگتا ہے، مگر یہ سب سے زیادہ خونخوار ہے۔ باہر

تو صاحبو! ہمارے دیس میں یہ پانچواں شیر کون ہے اور کہاں ہے

دینے کے بجائے عبادت گاہ کے اندر صدر دروازے پہ بیٹھا پہرا دیتا ہے۔"

"لیکن عبادت گاہ کے اندر پہرا دینا کیا معنی؟" شہزادے نے حیرت سے پوچھا۔

سرکار! بہت سے گھر اندر والے ہی ڈھا دیتے ہیں۔" یکی نے جواب دیا۔

تو صاحبو! ہمارے دیس میں یہ پانچواں شیر کون ہے اور کہاں ہے؟

یہ ضیغم کس کچھار سے دھاڑتا ہوا نکلتا ہے؟ بظاہر لاغر و مسکین' یہ کیسا شیر ہے جو ستاون برس سے اس خواب کی حفاظت کر رہا ہے جو ہمارے پرکھوں نے دیکھا تھا۔ یہ شیر:

جو غائب بھی ہے' حاضر بھی
جو منظر بھی ہے' ناظر بھی
یہ شیر ہے ساری خلق خدا
جو تم بھی ہو اور میں بھی ہوں
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی، کراچی

انشائیہ
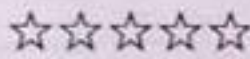
عورت

دنیاوی رشتوں میں سب سے عظیم رشتہ ماں کا ہے۔ پھر بہن خالہ، پھوپھی وغیرہ کا نمبر آتا ہے۔ یہ سب کی سب عورتیں ہیں۔ تاریخ ہمیں بار بار بتاتی ہے۔ عورت کی حیثیت اور مرتبہ کیا تھا اور اب کیا ہے۔ شیکسپیئر مصیبت کے مارے نے شاید کسی تلخ تجربے سے بلبلا کر ہی کہا ہوگا۔ اے، عورت تیرا نام فریب ہے تو ایک سلیپر ہے جو درست ہو تو ٹھیک ہے اسے پہن لیا جائے ورنہ پھینک دیا جائے۔ طالسطائی ساری زندگی بیوی کی زیادتیوں سے بھاگا بھاگا پھرا۔ پھر غریب سردی سے اکڑ کر مرگیا۔ بیوی کا کیا بگڑا ہمارا دنیا کا عظیم ترین ناول نگار ہمیں پھر نہیں ملا۔

قلوپطرہ سے لے کر اختری تک عورت کی جبلت اس کی بے وفائی، اس کے ظلم وستم کی انگنت مثالیں سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہیں شاذ و نادر ہی کوئی اس زہر سے بچا ہو۔ اس کا غصہ، اس کی ضد اس کی ہٹ دھرمی اس کا عقل سے پیدل ہونا حیرت کی بات نہیں عورت کی شخصیت کا ایک چھوٹا سا حصہ ہیں ان میں سے تھوڑی تھوڑی سی خصوصیات لے کر شاید بلڈ پریشر کا لفظ بنا ہے۔ عورت کا رونا اور ہنسنا ایک مشکل ترین معمہ ہے۔ سیانے اس غم میں دُبلے ہیں کہ انھیں اس وقت کی شناخت کیوں نہیں ہوتی کہ عورت کس وقت رو رہی ہوتی ہے اور کس وقت ہنس رہی ہوتی ہے۔ اس کی ہاں تو خیر ہاں ہے اس کی نہ بھی ایک طرح سے ہاں ہی ہوتی ہے۔

تاریخ کا مشاہدہ ہے کہ وہ ناقص العقل بھی ہے۔ غصے میں اپنا رواں رواں نوچ ڈالتی ہے، اپنی ہی ہڈیاں چبا جاتی ہے۔ اس کے ہنسے اور رونے کی کبھی کبھی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ جب کبھی وہ سوچتی ہے تو دور کی کوڑی لاتی ہے۔ اندلس کے بادشاہ کی بیوی نے ایک عجیب طوفان کھڑا کر دیا تھا محل کی کھڑکی کھولی تو کالا پہاڑ نظر آیا جو بہت برا لگا حکم ہوا اس پہاڑ کو اکھاڑ کر کہیں دور پھینک دیا جائے۔ اس کا کالا پن گراں گزرتا ہے وہ تو خیر ہوئی بادشاہ کا وزیر باتدبیر تھا اس سارے پہاڑ پر

مٹی ڈلوا دی اور درخت لگوا دیئے۔ ہری گھاس لگوا دی۔ پہاڑ کا رنگ بدل دیا۔

سیانے کہتے ہیں عقل مند کام کرنے سے پہلے سوچتے ہیں اور عورت نہ تو کام کرنے سے پہلے سوچتی ہے نہ بعد میں۔ بہرحال اپنا مفاد کبھی نہیں بھولتی۔ بے چینی اور بے قراری اور ایک جست میں پہاڑ پر چڑھ جانے کی خواہش میں وہ عقل کو فضول سمجھ کر طاق میں رکھ کر عمل شروع کرتی ہے۔

یوں تو وفا کے نام پر لیلیٰ، شیریں، عذرا وغیرہ نے نام کمائے ہیں لیکن ان کے ساتھ ساتھ جن مردوں کے نام گنوائے جاتے ہیں ان کی مٹی بھی انھوں نے ہی پلید کی۔

عورت کا آئینے کے ساتھ ایک خاص قسم کا بیر ہے۔ اس کے خیال میں آئینہ بار بار جھوٹ بولتا ہے اس لیے کہ وہ وہ بات ہی نہیں کہتا جو اُس کے دل میں ہوتی ہے۔ آئینہ تو سچ بولتا ہے اور عورت کو یہ سچ ہی اچھا نہیں لگتا لیکن وہ آئینے کو توڑتی نہیں اس لیے کہ جتنی بات وہ بتاتا ہے اتنی بات بھی کوئی دوسرا نہیں بتاتا۔ خواہ کتنا ہی قریبی رشتہ ہو ایک عورت کو دوسری عورت کی صورت میں کوئی نہ کوئی نقص ضرور نظر آ جاتا ہے۔ سچے دل سے کوئی عورت دوسری عورت کی خوبصورتی کو بھی برداشت نہیں کر سکتی۔

حسد اور عورت کا بھی بڑا قریبی تعلق ہے۔ دراصل خود نمائی کا بے تحاشا جذبہ اس کی شخصیت کا بڑا حصہ ہے وہ اپنے سے آگے چلتا کسی کو نہیں دیکھ سکتی۔ کوئی ہم سا ہو تو سامنے آئے۔ گیانی لوگوں کا اندازہ ہے یہ سب کچھ اس کے لاشعور اور فطرت میں ہوتا ہے۔

الزبیتھ ٹیلر، مارلن مزو، جین مینس فیلڈ، صوفیہ لارین بھی عورتیں تھیں انھیں دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ عورت سب کچھ کر سکتی ہے اور یہ جملہ مشکوک نظر آتا ہے کہ وہ عقل سے پیدل ہوتی ہے وہ مردوں کو تگنی کا ناچ بھی نچوا سکتی ہے۔

فیشن کا لفظ بڑی وسعت رکھتا ہے اس کا اصل مفہوم کوئی عورت ہی بیان کر سکتی ہے اس لیے کہ اس کی بے حد حساس طبیعت معاشرے کو کھلی آنکھ سے دیکھنے کی عادی ہوتی ہے وہ سوچتی ہے کہ وہ اس وقت کس مقام پر ہے اور اسے کس مقام پر ہونا چاہئے تھا۔ وہ ہر قیمت پر اپنی آئیڈیل جگہ پر رہنا چاہتی ہے اس کے لیے اسے چاہے کتنے ہی پاپڑ کیوں نہ بیلنے پڑیں۔ ستم بالائے ستم جب اس کے ہاتھ میں قلم آ جاتا ہے۔ عورت ہو کر بھی وہ عورتوں کے منہ کالے کر کے دل کی بھڑاس نکالتی ہے۔ عصمت چغتائی ہو یا واجدہ تبسم وہ عورتوں کی خفیہ باتیں اور پولیس کھولتی چلی جاتی ہے۔ مرد بار بار دانتوں میں انگلی دباتا ہے۔

عورت کے اتنے سارے رخ ہیں، اتنے گوشے ہیں سب کچھ کہنے کے بعد انھیں حسرت

رہتی ہے کہ اب بھی اور نہ ایسی ہیں جنھیں کھولا جاسکتا ہے اور نئی نئی صورتیں سامنے آسکتی ہیں۔

عورت اچھی طرح الجھنا بھی جانتی ہے اس میں یہ خوبی بھی ہے کہ وہ اپنے آپ کو سلجھا بھی سکتی ہے اگر اس میں یہ خوبی نہ ہوتی تو ساری کائنات کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ وہ پانی کو مانی اور روٹی کو اوٹی کہہ سکتی ہے لیکن جب فلسفے کی زبان میں بات کرتی ہے تو افلاطون کا فلسفہ دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔ ارسطو اور سقراط حیرانی سے اس کا منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ جب وہ شفقت اور مہربانی پر اتر آئے تو اپنی جان ناتواں کو ہتھیلی پر لیے پھرتی ہے۔ جب انتقام کی سرحد پار کرتی ہے تو ہزاروں ناگنوں کا زہر بھی ہیچ نظر آتا ہے۔

اقبال اسے تخلیق نظام کا ایک بڑا حصہ تسلیم کرتے ہیں۔ کائنات میں اس کی بدولت رنگ و نور بکھرا ہوا ہے۔ بڑے بڑے فلسفی کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں ہماری کیا مجال جو اس کی حقیقت بیان کرسکیں وہ جو کچھ مسلسل محسوس کرتی ہے شاید وہی اس کی فطرت ہے۔

عورت کے بغیر ہمارا معاشرہ مکمل نہیں ہے بلکہ معاشرے کا لفظ ہی لغت سے نکل جائے گا معاشرے کو مکمل کرنے کے لیے شاید عورت کو تخلیق بھی کیا گیا اب یہ دوسری بات ہے کہ اسے آدمؑ کی پسلی سے بنایا گیا۔

جب عورت اور مرد ایک دوسرے کو سمجھنے کی اپنی سی کوشش کرتے ہیں اور بار بار سمجھوتہ کرتے ہیں تو یہ زندگی آگے بڑھتی ہے۔ جہاں بھی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے وہاں ہی معاشرہ دم توڑ دیتا ہے عورت فطری طور پر جذباتی ہوتی ہے اور جب یہ جذباتیت پھیلنے لگتی ہے تو وقت کی نبض کی رفتار سست پڑنے لگتی ہے اس لیے کہ جذباتیت تو ایک بھڑکتا ہوا شعلہ ہے اسے اگر اور دہکایا جائے تو سب کچھ راکھ ہو جاتا ہے کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔

عورتوں کی مثالیں ہیں ضرور اور نمایاں ہیں۔ اس کی فطرت میں محبت اور مامتا کا جذبہ رکھا گیا ہے وہی کائنات کو قائم رہنے کی اصل وجہ ہے۔ عورت میں اگر مامتا کا جذبہ نہ ہوتا تو مرد تنہا اس کائنات کے نظام کو کبھی بھی نہ چلا پاتا اور کائنات ایک تو ہوتی ہی نہیں اگر ہوتی بھی تو بے رنگ ونور، ویران بیابان جہاں سناٹا تو ہوتا لیکن زندگی نہ ہوتی۔

یادِ رفتگاں

فخر زمان، لاہور
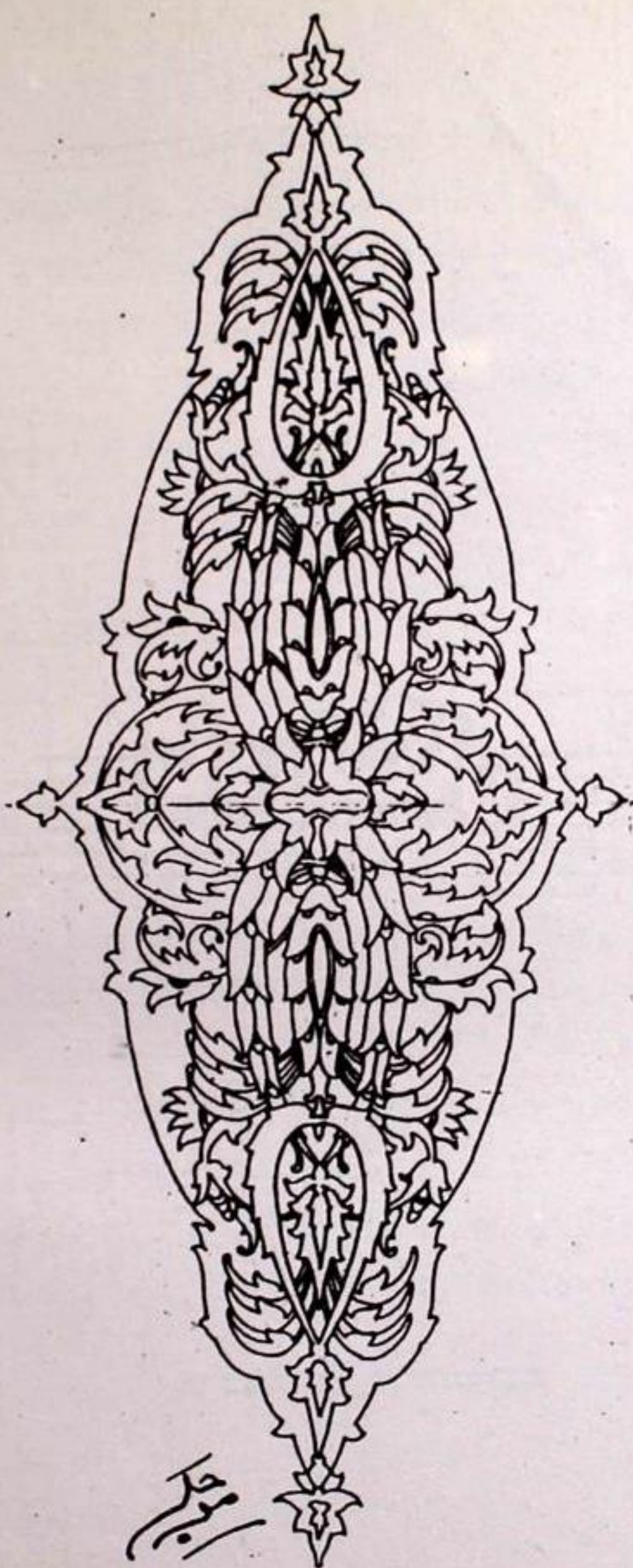
امرتا پریتم: تاریخ ساز شخصیت

''جب میں کالج میں پڑھتا تھا اور پنجابی ادب پڑھنا شروع کیا تو امرتا پریتم کی شاعری کی کتاب ''نویں رُت'' مجھے بہت اچھی لگی۔ دراصل مجھے اس سے انسپریشن ہوئی کہ ماں بولی میں لکھنا چاہیے اس سے پہلے میں نے پنجابی کے چند صوفی شعراء کو پڑھا ہوا تھا۔ امرتا پریتم کی شاعری نے مجھے بہت متاثر کیا، بعد میں، میں نے ان کی بہت سی تحریریں پڑھیں۔ یونیورسٹی کے بعد میں تعلیم کیلئے ملک سے باہر چلا گیا او جب واپس لوٹا تو پنجابی کی طرف رجوع کیا۔ اردو اور انگریزی میں، میں تو پہلے ہی لکھتا تھا، اور لیکن اب، پنجابی میں بھی لکھنا شروع کیا۔ میری پہلی کتاب ''کنسو یلے دی'' 1972ء میں شائع ہوئی۔ میں نے یہ کتاب امرتا پریتم کو بھیجی۔

دوردرشن سے نشر ہونے والا پنجابی ادبی پروگرام ''درپن'' جو امرتا پریتم پیش کرتی تھیں، میں بڑی دلچسپی سے دیکھتا تھا۔ ایک شام امرتا پریتم نے میری کتاب ''کنسو یلے دی'' کی شاعری پر بات شروع کی اور کہا'' یہ بہت اچھی شاعری ہے۔ یہ نظمیں بالکل نئے شعور اور نئے احساس Sensibility کی ہیں اور اب تک ہونے والی شاعری کو ایک نیا ٹرینڈ اور ایک نئی شکل دی ہے۔ اس میں جدیدیت ہے۔ بہت گہری ایمائیت اور سمبولزم ہے۔ انہوں نے مجھے ٹیلی ویژن پروگرام کے ذریعے مبارکباد دی۔

میں نے انہیں خط لکھا اور شکریہ ادا کیا۔ میرے خط کے جواب میں امرتا جی نے لکھا ''مجھے تمہاری کتاب ملی، میں نے پڑھی اور مجھے پسند آئی۔ جو چیز مجھے پسند آئے تو میں اس پر کھل کر اظہار کرتی ہوں''

اس کے بعد دوسری پنجابی شاعری کی کتاب ''ونگار'' شائع ہوئی پھر میرا ناول ''ست گو اچے لوگ'' امرتا پریتم کو اس قدر پسند آیا کہ انہوں نے ٹی وی پر اس کا بہت ذکر کیا۔ اس کے

بارے میں آرٹیکل لکھے۔ پھر میرا دوسرا ناول ''اک مرے بندے دی کہانی'' پھر ''بندی وان'' اور پھر ''بے وطنا'' انہیں بھیجا۔ اس دور میں ہندوستان سے آمدورفت بند ہوگئی۔ صرف خط و کتابت جاری تھی۔ ڈاک پر گہرا سنسر تھا۔

اس لئے جب ملک سے باہر ہوتا تو امرتا پریتم کو خط لکھتا اور ٹیلی فون پر ملاقات ہوتی تو وہ بڑی خوشی کا اظہار کرتیں۔

مجھے امرتا پریتم کی تمام تحریریں پڑھنے کے بعد ان کے متعلق پوری جانکاری حاصل ہو گئی۔ خاص طور پر 1976ء میں شائع ہونے والی ان کی سوانح عمری ''رسیدی ٹکٹ'' اور پھر 1977ء میں سوانح عمری کا دوسرا حصہ ''جمع توں''۔

''رسیدی ٹکٹ'' نے ادبی حلقوں میں ہلچل مچادی بہت سے لوگوں نے اعتراض کیا کہ انہیں بعض باتیں نہیں لکھنی چاہیے تھیں۔ میں سمجھتا ہوں ایسی کوئی بات نہیں دراصل ان کے ہاں منافقت نہیں۔ وہ ہر بات سیدھے پیرائے میں کردیتی ہیں۔

1947ء میں ہندوستان کی تقسیم پر فرقہ وارانہ فسادات میں قتل وغارت گری ہوئی، اس میں امرتا پریتم کو ان کی نظم ''اج آکھاں وارث شاہ نوں ،کتوں قبراں وچوں بول'' نے پنجابی شاعری میں امر کردیا۔ پھر 1956ء میں ان کی پنجابی شاعری کی کتاب ''سنیہڑے'' پر ساہت ایوارڈ دیا گیا اور پھر 1969ء میں انہیں پدم شری کا ٹائٹل دیا گیا۔ 1973ء میں انہیں دہلی یونیورسٹی کی طرف سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دی گئی۔ امرتا پریتم ورلڈ پیس کانگریس 1973ء کے موقع پر ماسکو گئیں۔ اس سے پہلے 1961ء میں امرتا پریتم ماسکو کے رائٹرز یونین کی دعوت پر تاشقند، تاجکستان، ازبکستان اور 1966ء میں بلغاریہ گئیں اور 1967ء میں حکومت نے انہیں ماسکو میں ثقافتی تبادلے کے سلسلے میں یوگوسلاویہ، ہنگری اور رومانیہ بھیجا تھا۔

16 اکتوبر 1980ء کو باقاعدہ ایک تقریب میں امرتا پریتم کو نکولا اپتسا روف ایوارڈ دیا گیا۔ ایوارڈ کمیٹی کے صدر پنچو دان چیف نے اپنی تقریر میں کہا۔ ہم بلغارین ادیب اور سب لوگ خوش ہیں کہ ہندوستان کی ممتاز اور مشہور ادیبہ اور شاعرہ ہماری دوست ہیں، امرتا کی شاعری سماجی شعور اور انسانی بہتری کیلئے جدوجہد کو تسلیم کرتی ہے۔

1983ء میں امرتا پریتم کو وشو بھارتی یونیورسٹی اور جبل پور یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگریاں دیں۔ 1986ء کو امرتا پریتم راجیہ سبھا کیلئے نامزد ہوئیں۔ یہ 1987ء کی بات ہے۔ میں ملک سے باہر ہالینڈ میں تھا۔ مجھے پنجابی کی نامور فکشن رائٹر اجیت کور نے دہلی میں ہونے والی دوروزہ ''پنجابی کانفرنس'' کیلئے دعوت دی۔ میں دہلی پہنچا۔ کانفرنس کے بعد امرتا جی کو فون پر بتایا کہ میں دہلی میں ہوں انہوں نے کہا فوراً سیدھے میرے گھر چلے آؤ۔ میں

K-25 حوض خاص ان کے گھر پہنچا اور تین دن اور تین راتیں وہاں گزاریں۔ وہ لمحے میری زندگی کے سنہری لمحات میں شامل ہیں۔ امرتا پریتم سے مختلف حوالوں سے ادب سیاست اور تصوف پر گفتگو ہوئی۔ پنجابی زبان ادب اور ادیبوں کے بارے میں۔ ہندو پاک تعلقات کے حوالے سے تبادلہ خیال ہوا۔ انہیں جنرل ضیاء کے دور میں میری پنجابی کتابوں پر پابندی کا علم تھا۔ جب میں نے انہیں اپنے ناول ''بندی وان'' کی ڈرامائی تشکیل کی وڈیو دیکھنے کیلئے کہا تو انہوں نے حیرانی سے پوچھا کہ کتابوں پر پابندی کے باوجود آپ نے اس ناول کو ڈرامے کے روپ میں کیسے پیش کیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ جب ضیاء الحق نے چادر اور چاردیواری کا احترام کرتے ہوئے چاردیواری کے اندر ادبی ثقافتی اور سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دی تو ہم نے پہلی عالمی کانفرنس لاہور 1986ء کے موقع پر یہ ڈرامہ گھر کی چاردیواری میں دکھایا۔ ایک دوست نے اس ڈرامے کی وڈیو ریکارڈنگ کر لی۔ یہ ریکارڈنگ گھریلو کیمرے سے کی گئی تھی، اس لئے تکنیکی اعتبار سے کمزور ہے، بہرحال ایک دستاویز تو ہے۔

امرتا پریتم نے کہا میں نے ناول ''بندی وان'' پڑھا ہے، لہٰذا میں جان سکتی ہوں کہ اس ناول کی ڈرامائی تشکیل کتنے دل گردے والے شخص نے کی ہو گی۔ میری آنکھوں کے سامنے ناول کا ایک ایک کردار درد کی چبھن بن کر آنکھوں سے بہتا گیا۔ ڈرامائی تشکیل ممتاز ادیب احمد سلیم نے کی تھی۔

اردو ادیبوں نے دوسرے دن ''قلم زار'' تنظیم کی طرف سے مجھے استقبالیہ دیا، جہاں اردو کے ادیب قمر رئیس کی صدارت تھی اور مہمان خصوصی کیلئے امرتا پریتم سے کہا گیا تھا۔ امرتا پریتم عام طور پر گھر سے نہیں نکلتی تھیں اور ادبی تقریب میں وہ بالکل نہیں جاتی تھیں، لیکن انہوں نے مہربانی کی کہ مہمان خصوصی بننے پر رضامند ہوئیں بلکہ انہوں نے اس تقریب میں میری شاعری اور ناولوں خاص طور پر ''بندی وان'' کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا۔ فخر زمان اپنے ناول ''بندی وان'' میں زیڈ کا کردار پیش کرتے ہیں تو زیڈ کہتا ہے، کل جو انسان قتل ہوا تھا، وہ بھی میں تھا۔ آج جو قتل ہو رہا ہے، وہ بھی میں ہوں، آنے والے کل میں جو قتل ہو گا، وہ بھی میں ہوں گا۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس وقت میرا یہ عالم ہے کہ میں سوچ رہی ہوں کہ وہ زیڈ، فخر زمان بھی ہے اور میں بھی۔

میرے لئے یہ بڑے اعزاز کی بات تھی۔ میں تو ویسے ہی امرتا پریتم جیسی شخصیت کے ساتھ سٹیج پر بیٹھا فخر محسوس کر رہا تھا۔

امرتا پریتم پچھلے پہر آرام کرتی تھیں ہم شام کو بیٹھ جاتے تھے، پھر باتیں شروع ہو جاتیں۔ کچھ کتابوں کا ذکر ہوتا۔ میرے اصرار پر وہ کوئی نئی نظم سناتیں، وہ رشیوں، منیوں،

صوفیوں اور درویشوں کے حوالے سے اپنے تجربات، مشاہدات کا ذکر کرتیں۔ انہوں نے مجھے اپنے بارے میں ایک دو ڈاکومنٹریز دکھائیں، جو بہت ہی خوبصورت بنی ہوئیں تھیں۔ میرا مطلب ہے تین دن پورے میرے لئے اپنے گھر جیسا ماحول تھا۔ بالکل جیسے آپ اپنے Parents کیساتھ رہ رہے ہوں۔ بالکل اسی طرح امرتا جی دوپہر کا کھانا پکا رہی ہیں، روٹیاں بنا رہی ہیں امروز وہیں باورچی خانے میں میز پر روٹیاں رکھ رہا ہے، سالن رکھ رہا ہے۔ کبھی امروز چائے بنا رہا ہے۔ کبھی ہاتھ بٹا رہا ہے۔ مطلب یہ کہ بالکل اپنے گھر کے فرد کی طرح میں وہاں رہا۔

میں نے کہا کہ آج کل آپ شاعری بہت کم کر رہی ہیں اور آپ نے ہندی میں بھی لکھنا شروع کر دیا ہے۔ آپ کی ہندی میں شاعری ''کاغذ اور کینوس'' شائع ہوئی ہے۔ انہوں نے کہا: جب محسوس کرتی ہوں کہ شاعری کرنی چاہیے، تب میں شاعری کرتی ہوں۔ میں کبھی زبردستی Conscious Effort نہیں کرتی کہ کوئی نظم لکھوں۔ ہندی کی بہت ریڈرشپ ہے، اس لئے ہندی میں لکھنا بھی ضروری ہے۔

1987ء میں انہیں پنجاب یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دی اور اسی سال فرانس حکومت نے بھی انہیں اعزازی ڈگری سے نوازا، جبکہ 1989ء میں بمبئی کی ایس این ڈی ٹی یونیورسٹی نے بھی انہیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی اور 1990ء میں پنجابی اکیڈمی دہلی نے انہیں وارث شاہ ایوارڈ دیا۔ امرتا پریتم ایک بہت عمدہ شخصیت تھیں۔ ایک بہت بڑی انسان، فراخ دل اور امن کی پرچار، محبت کی پیغامبر اور بہت ہی روشن خیال اور ترقی پسند نظریات کی حامل خاتون تھیں، جس نے روایت کی، اس طرح پاسداری نہیں کی جس طرح ہمارے ہاں روایتی کھوبہ (دلدل) میں لوگ دھنسے ہوئے ہیں اور ساری زندگی ایک غلط اور جھوٹے قسم کے ڈسپلن کے تحت گزارتے ہیں۔

امرتا پریتم نے ساری زندگی ڈسپلن توڑے اور روایات سے بغاوت کی، اسی لئے زندگی میں انہیں بڑی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ زندگی میں انہیں امروز کی صورت میں اچھا رفیق، دوست اور ہمسفر ملا۔ امروز سے ان کی پہلی ملاقات 1955ء میں ہوئی اور دوستی 1960ء میں شروع ہوئی اور 1964ء میں وہ ایک ہو گئے۔ دونوں نے مل کر ''ناگ منی'' ماہنامہ پنجابی رسالہ اور اشاعت گھر بنایا۔ ''ناگ منی'' رسالہ 1966ء میں شروع ہوا اور اپریل 2004ء میں بند ہوا۔ ''ناگ منی'' کے حوالے سے میں نے امرتا پریتم اور امروز کو اکٹھے کام کرتے دیکھا۔ میٹر کا انتخاب امرتا کرتیں۔ پروف اور سکیچز امروز کی ذمہ داری تھی۔ یہ چھوٹا سا رسالہ بڑا معیاری اور پاپولر رہا۔ اس رسالے نے اپنا ایک پورا گروپ پیدا کیا، جو اعلیٰ ادب

تخلیق کر رہا تھا۔

ایک بات اور جو ان میں سب سے اچھی تھی کہ وہ نئے لکھنے والوں کی بے حد حوصلہ افزائی کرتی تھیں، وہ بڑی فراخدل تھیں۔ کوئی بھی لکھنے والا چاہے وہ پاکستان میں تھا یا ہندوستان میں یا کہیں دوسرے دیس اور ملک کا اور زبان چاہے کوئی بھی لکھتا تھا۔ اچھا لکھنا ہی ان کی شرط تھی اور اس کی تعریف اور اس کے متعلق لکھنا وہ اپنی ذمہ داری سمجھتی تھیں۔

میں نے جب بھی انہیں پاکستان آنے کی دعوت دی۔ انہوں نے کہا کہ میری صحت اجازت نہیں دیتی۔ جب بھی مجھے موقع ملا میں ضرور پاکستان آؤں گی۔ میری یہ ہمیشہ حسرت رہی کہ وہ پاکستان آئیں۔

مجھے یاد ہے شائستہ، فرخ اور میں جب ہندوستان گئے اور امرتا پریتم سے ملے۔ وہ شائستہ سے پہلی بار مل رہی تھیں، لیکن انہوں نے اس کی شاعری کو اپنے رسالے میں بہت زیادہ شائع کیا تھا، کیونکہ انہیں شائستہ کی شاعری بہت پسند تھی انہوں نے شائستہ سے مل کر بہت سے باتیں کیں۔ عورتوں کے حوالے سے Male dominated society کے حوالے سے تبادلۂ خیال کیا۔ شائستہ بہت خوش تھی کیونکہ ایک بڑی شاعرہ اس کی شاعری کے بارے میں اچھے کلمات کہہ رہی تھیں۔

جب فروری 2000ء میں غسل خانے میں امرتا پریتم کا پاؤں پھسلنے سے پاؤں میں ایسی چوٹ آئی کہ ہڈی ٹوٹ گئی۔ 81 سال کی عمر میں ہڈی کا ٹوٹنا بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ دو گھنٹے کا آپریشن پانچ گھنٹے میں مکمل ہوا۔ امرتا پریتم گھر آئیں، انہیں امید تھی کہ وہ پھر سے چلنے پھرنے لگیں گی، لیکن چند دنوں کے بعد دوبارہ ان کے پاؤں میں پھر سے تکلیف شروع ہوئی اور پھر اس کے بعد امرتا پریتم بستر پر ہی رہیں۔

ہم نے امرتا پریتم کیلئے ورلڈ پنجابی کانگریس کی طرف سے Life time achievement award 2003ء کا اعلان کیا۔ اگرچہ انہیں کسی ایوارڈ کی ضرورت نہیں تھی، لیکن ہم نے ایک Jesture دیا۔ ہم نے ان کیلئے ایک شیلڈ بنائی۔ ہمارے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے امرتا پریتم کیلئے لکھ کر بول کر اظہار خیال کیا۔ اس موقع پر امرتا جی پر ایک ڈاکومنٹری فلم جو کہ باسو بھٹہ چاریہ نے بنائی تھی، دکھائی گئی۔ اس تقریب کی بڑی ستائش ہوئی کہ انڈو پاک بلکہ اس وقت دنیا بھر کی سب سے بڑی پنجابی ادبی شخصیت کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔

مجھے ایک حسرت ہمیشہ رہی کہ وہ پاکستان نہیں آسکیں۔ میں چاہتا تھا کہ وہ پاکستان آئیں اور ان کا اتنا بڑا استقبال ہو کہ سارے لوگ یاد رکھیں کہ جتنی مہمان ادیبہ، شاعرہ ہیں اتنا ہی بڑا

ان کا استقبال ہو، لیکن میرے بار بار اصرار کے باوجود انہوں نے کبھی لاہور آنے کا وعدہ نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ کہتیں اچھا میں دیکھوں گی، میں ٹھیک ہوئی تو آؤں گی، لیکن وہ لاہور نہیں آئیں۔ بس یہ کسک ہمیشہ میرے دل میں رہے گی۔

اختر حیات۔ لاہور

ساغر صدیقی اور اندرونِ شہر

ایک شیشہ نفس شاعر کی داستان حیات کا ایک ورق

اندرون شہر یا فصیل شہر کے اندر بسنے والے لاہور کا ساغر صدیقی سے کیا رشتہ تھا؟ کوئی وثوق سے نہیں بتا سکتا۔

میں نئی انار کلی میں واقع سینٹ فرانسس ہائی سکول میں چھٹی کا طالب علم تھا۔ گرمیوں کی ایک دوپہر کا ذکر ہے میں سکول سے چھٹی بعد گھر لوٹ رہا تھا۔ لوہاری گیٹ کے اندر بازار سوتر منڈی کی طرف مڑا ہی تھا کہ پلے فالودے والے کی دکان پر تین خوش پوش پہلوان نما نوجوان دکھائی دیے جن کے ساتھ سر تا پا کالی چادر اوڑھے ایک ادھیڑ عمر دکھائی دیا اس حلیہ کا شخص اگر کسی سنسان گلی میں نظر آتا تو میں یقیناً ڈر کر اس گلی سے واپس آجاتا لیکن یہاں معاملہ اُلٹ تھا۔ پہلوانوں جیسے ڈیل ڈول کا ایک لمبا تڑنگا نوجوان چادر پوش کو فالودے سے بھرا پیالہ پیش کر رہا تھا مگر ادھر سے صاف جواب تھا: ''نہیں بھیا! فالودہ نہیں پیئوں گا۔ کیپسٹن کا سگریٹ پلا دو''

''باباجی پہلے فالودہ کھالیجئے، سگریٹ بھی پلا دیں گے'' ایک نوجوان بولا۔

میں نے سوچا چادر والا کوئی درویش فقیر ہوگا جس کی خدمت کر کے یہ پہلوان اپنے حق میں دعا کروانا چاہتے ہوں گے۔ اتنے میں سوتر منڈی چوک میں برف فروخت کرنے والا جالا بھی وہیں آپہنچا تھا۔ گورا چٹا جالا جس کا اصل نام ملک ضیاء اللہ ضیاء تھا۔ پنجابی زبان کا شاعر تھا۔ سخن فہمی کی صلاحیت رکھے بغیر جب اس کی دکان پر برف لینے جاتا تو وہاں مجمع لگا ہوتا اور گاہکوں سے بے نیاز ضیاء اللہ ضیاء شعر و سخن کی محفل جمائے ہوتا۔ دکان کے تھڑے پر رکھے برف کے بلاک دھیرے دھیرے پگھل رہے ہوتے۔

ملک ضیاء چادر پوش فقیر سے بغل گیر ہو کر ملے'' ساغر صاحب! آپ یہاں آیئے دکان پر چلتے ہیں میں نے ایک نظم لکھی ہے۔ اصلاح کر دیجئے'' ضیاء اللہ نے کالی چادر والے کے ننگے

شانے پر ہاتھ رکھا اور پھر دونوں چوک سوتر منڈی کی طرف چل دیئے جو قریباً تین سو میٹر دور تھا۔ میں بستہ سنبھالتے ہوئے گھر کی طرف چل دیا۔

جالے یعنی ملک ضیاء اللہ ضیاء کی دکان شاعروں کا ایک اڈہ تھا جہاں دن رات اردو اور پنجابی کے شاعر اپنا تازہ کلام سناتے اور پھر داد طلب نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے۔ چند ماہ بعد مجھے معلوم ہوا کہ سیاہ چادر اوڑھنے والا کوئی فقیر یا مجذوب نہیں بلکہ ایک بھلا چنگا شاعر ہے جسے ساغر صدیقی کہتے ہیں۔

جن دنوں میں دسویں جماعت میں پڑھتا تھا، ساغر صدیقی کے وطنِ مالوف کے بارے میں بھی جان چکا تھا۔ وہ امرتسر میں پیدا ہوئے اور 1947ء کے اواخر میں ہجرت کر کے لاہور آ گئے۔ ملک ضیاء اللہ کی دکان پر ہر دوسری شب آنے والے برانڈرتھ روڈ کے تاجر، معروف شاعر رؤف شیخ نے ایک بار بتایا تھا کہ امرتسر میں ساغر صدیقی ایک نہایت خوش پوش نوجوان ہوا کرتے تھے۔ وہ بارہ گھوڑا بوسکی کی قمیض اور سفید براق لٹھے کی شلوار زیب تن کیا کرتے۔

اس زمانے میں ریڈیو پاکستان سے ایک قوالی ہر جمعے کو نشر ہوا کرتی تھی۔ یہ قوالی نصرت فتح علی خان کے والد فتح علی اور تایا مبارک علی نے گائی تھی اور اس کے بول تھے

بزمِ کونین سجانے کیلئے آپ آئے
شمعِ توحید جلانے کیلئے آپ آئے

یہ کلام ساغر صدیقی ہی کا ہے۔ ساغر نے محض خم ساغر اور پیمانے ہی کی بات نہیں کی۔ کئی نعت خوانوں نے ریڈیو پر ان کی نعتیں نہایت عقیدت سے پڑھی ہیں مثلاً

جاری ہے دو جہاں پہ حکومت رسول ﷺ کی
کرتے ہیں مہر و ماہ اطاعت رسول ﷺ کی

جس طرف چشمِ محمد ﷺ کے اشارے ہو گئے
جتنے ذرے سامنے آئے، ستارے ہو گئے

چلو اچھا ہوا ہے نعتِ ساغرؔ کام آئی ہے
غلامانِ نبی ﷺ محشر میں پہچانے کہاں جاتے

سانحہ مشرقی پاکستان کے بعد جب پاکستانی فوجی اور سول افسر بھارت کی قید میں تھے، ساغر نے کہا تھا

رہائی! اسیروں کی ہو یا محمد ﷺ

فدائی تمہارے دعا کر رہے ہیں

برصغیر میں جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی اور حبیب جالب جیسے شاعر ترنم سے اپنا کلام سنایا کرتے تھے جس پر سامعین جھوم جھوم جاتے۔ میں جالب کے سوا باقی دو کو نہیں سن سکا کہ اس وقت دنیا میں میرا وجود ہی نہیں ہوا تھا۔ میں نے قلعہ گُجھن کی ایک محفل مشاعرہ میں ساغر کو پہلی اور آخری بار سنا تھا۔ کلام ساغر بزبان شاعر سننے والے میرے اس دعویٰ سے اتفاق کریں گے کہ ساغر صدیقی جیسا سوزِ گداز سے لبریز ترنم کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوا ہوگا۔

جنہیں خدا کی طرح بولنے کی عادت ہے

انہیں بشر کی زباں میں کلام کرنا ہے

فقیہ شہر نے تہمت لگائی ساغؔر پر

یہ شخص درد کی دولت کو عام کرتا ہے

ساغر نے دو غزلیں سنائی تھیں، پنڈال سسکیوں سے سسک اٹھا تھا۔

غالباً 1970 کے وسط میں قتیل شفائی کی کسی جریدے میں ایک غزل چھپی تھی جس کے مطلع کا پہلا مصرعہ تھا۔

کھلا ہے جھوٹ کا بازار آؤ سچ بولیں

ساغؔر صدیقی کو یہ غزل انتہائی ناپسند تھی ان کا کہنا تھا جس دن دنیا میں جھوٹ جھوٹ ہو گیا، اس کے باقی رہنے کا جواز ختم ہو جائے گا۔ ساغر نے فلمی گیت بھی لکھے۔ ایک روز ضیاء اللہ ضیاء کے تھڑے پر اس نے بھرے مجمع میں کہا تھا کہ میں فلمی سٹوڈیوز کا رخ نہیں کر سکتا۔ وہاں جانے کا سوچ کر ہی وحشت ہونے لگتی ہے۔ ایسا کیوں تھا؟ ساغر صدیقی نے کبھی نہیں بتایا لیکن شہر کے بعض بزرگ شاعر جن میں حاجی بخت بھی شامل تھے، کہا کرتے تھے کہ فلمی دنیا کے ناخدا، ساغر سے گیت اور نغمے تو لکھوا لیتے ہیں مگر انہیں معاوضہ دیتے اور نہ ہی گیت نگار کے زمرے میں ان کا نام درج کرتے ہیں۔

ساغر نے پنجابی نغمے بھی تخلیق کیے۔ زبیدہ خانم کی آواز میں گایا ان کا یہ گیت آج بھی زندہ ہے۔

مینوں ڈنڈیاں گھڑا کے دے گیانی منڈا ماجھے دا

جب انسان نے چاند پر قدم رکھا تو ساغر نے چیخ کر کہا تھا

قافلے منزل مہتاب کی جانب ہیں رواں

میری راہوں میں تیری زلف کے بل آتے ہیں

میں وہ آوارۂ تقدیر ہوں یزداں کی قسم

لوگ دیوانہ سمجھ کر جسے بہلاتے ہیں

ساغر صدیقی دنیاوی راحتوں اور زر و سیم سے بے نیاز اپنی چادر سے تن ڈھانپے فقیری کی زندگی بسر کرتا رہا۔ وہ گاہے بگاہے مدہوشی کے سامان بھی کرتا رہا مگر دنیا و مافیہا کے معاملات سے غافل نہیں رہا۔ صدر ایوب کے دہ سالہ جشن ترقی کے پس منظر میں اس نے لافانی غزل کہی:

چراغ طور جلاؤ بڑا اندھیرا ہے

ذرا نقاب اٹھاؤ بڑا اندھیرا ہے

ابھی تو صبح کے ماتھے کا رنگ کالا ہے

ابھی فریب نہ کھاؤ بڑا اندھیرا ہے

یہ غزل یحییٰ خان کے زمانے میں پی ٹی وی پر مہدی حسن نے گائی۔ بعد میں اس پر سرکاری حکم کے تحت پابندی لگ گئی جو آج تک قائم ہے۔

ساغر صدیقی کے ان اشعار کی شدت اس دور میں بھی پوری طرح محسوس کی جاسکتی ہے۔

دستور یہاں بھی اندھے ہیں

فرمان یہاں بھی اندھے ہیں

اے دوست! خدا کا نام نہ لے

ایمان یہاں بھی اندھے ہیں

وہ زبردست عوامی شاعر تھا مگر کسی لابی یا مخصوص دبستان میں شامل نہ ہونے کی وجہ سے اسے اس کا حق اور جائز مقام کبھی نہیں دیا گیا۔ وہ مجید امجد کے قبیلے کا شاعر تھا، جس کے کلام اور شاعرانہ مقام کا تعین کرنے والا کوئی نقاد نہیں تھا۔ جیسے ایک کھرا اور سچا بندہ دنیا میں تنہا رہ جاتا ہے، سچا بے باک اور اینٹی اسٹیبلشمنٹ شاعر بھی تنہائی کی زندگی سے دوچار ہو جاتا ہے۔ ساغر صدیقی کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ اس کے دوست بابا یونس ادیب میانی صاحب میں آسودۂ خاک اپنے دوست کے مزار پر ہر سال ساغر میلہ منعقد کیا کرتے تھے۔ بابا یونس ادیب جب دنیا سے رخصت ہوئے یہ میلہ بھولی داستان بن کر رہ گیا۔

دیمک لکڑی کو اور غم انسان کو کھا جاتا ہے۔ ساغر کو ایسے غم چمٹے رہے جن کی تشخیص ہوئی اور نہ کسی نے ایسا کرنے کی کوشش کی۔ دمِ واپسیں تک اسے کسی سے شکایت بھی نہیں تھی۔ زندگی کے آخری ایام میں اس نے کہا تھا:

مجھ کو نہ پھولوں سے شکایت ہے نہ کانٹوں سے گلہ
میں تیرے جلوۂ رخسار کا دم بھرتا ہوں
میں نہیں شیخ و برہمن کی عقیدت کا مزار
بندگی اپنے خیالوں کی کیا کرتا ہوں

سونے چاندی کی چمکتی ہوئی میزانوں میں
میرے جذبات کی تسکین نہیں ہو سکتی
زندگی روزِ ازل سے ہے چھلکتا ہوا زہر
زندگی لائق تحسین نہیں ہو سکتی

ساغر صدیقی کے دن رات اندرون شہر میں گزرے دن کے کسی نہ کسی حصے میں وہ استاد دامن سے بھی ملاقات کر آتا۔ لوہاری، بھاٹی اور اندرون دہلی دروازے کی تنگ و تاریک گلیوں میں اس کے کئی مسکن تھے جو اس کے چاہنے والوں نے اس کیلئے مخصوص کر رکھے تھے۔ ساغر کا آدھے سے زیادہ کلام گلی محلوں اور کوچوں میں تخلیق ہوا۔ ہاں وہ کبھی کبھی بھری دوپہر میں شہر کے مختلف قبرستانوں میں جایا کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے کہ جب بستی کے ہنگاموں سے طبیعت گھبرا جاتی ہے تو شہرِ خموشاں کی سیر کو نکل جاتا ہوں۔

ساغر دنیا کے رنگ و روغن اور حصول جائیداد کے شوق سے ماورا رہا۔ غریبوں کی منڈیوں میں بیٹھا غریبوں کا دم بھرتا رہا اور انہیں میں اس کا جنازہ اٹھا وہ اکثر کہا کرتا تھا۔

جواب دے نہ سکیں جس کا دو جہاں ساغر
کسی غریب کے دل کا سوال ہوتا ہے۔

☆☆☆☆☆

بیگم یاسمین پرویز، اسلام آباد
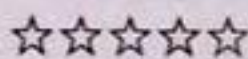
شجرِ سایہ دار
(صادق حسین کی یاد میں)

علمی و ادبی حلقوں کی جانی پہچانی شخصیت صادق حسین یکم اکتوبر ۱۹۱۷ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ گارڈن کالج راولپنڈی سے بی-اے اور ایس ایم لا کالج کراچی سے ایل ایل بی کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔

ان کا پہلا افسانہ ''بوفے'' ۱۹۵۴ء میں رسالہ ''نقوش'' میں شائع ہوا۔ ۱۹۶۳ء میں افسانوں کا مجموعہ ''پھولوں کے محل'' اور ۱۹۸۸ء میں افسانوں کا دوسرا مجموعہ ''شہر اندر شہر'' شائع ہوا۔ ناول ''نیا سویرا'' اور افسانوں کا مجموعہ ''گلاب کے آنسو'' زیرِ طبع ہیں۔ اس کے علاوہ ملکی و غیر ملکی رسائل و جرائد میں ان کے تخلیقی مضامین اکثر و بیشتر شائع ہوتے رہے ہیں۔ متعدد افسانوں کے تراجم غیر ملکی زبانوں میں کیے گئے۔

''پونچھیاں'' اور ''خون کا معبد'' میٹرک کے کورس میں شامل کیے گئے۔ ''مولا پہلوان''، ''خون اور پانی'' اور ''خوشبو'' پاکستان ٹیلی ویژن سے ٹیلی کاسٹ کیے گئے۔ مختلف اخبارات میں سو سے زائد کالم لکھے۔ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی میں آپ کے فنِ افسانہ نگاری پر مقالہ برائے ایم-اے اردو تحریر کیا گیا۔ ۱۹۹۱ء میں انھیں ''قومی ادبی ایوارڈ'' اور ۱۹۹۲ء میں ''نقوش ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔

علم و ادب کا یہ تابندہ ستارہ ۲۶ جون ۲۰۰۵ء رات دس بجے پولی کلینک ہسپتال اسلام آباد کے ایمر جنسی وارڈ میں زندگی کی بازی ہار گیا۔ بیگم یاسمین پرویز شعبہ اردو گورنمنٹ پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ برائے خواتین اسلام آباد سے وابستہ ہیں۔ وہ اپنے والد مرحوم کو یاد کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

ان کی موت کی خبر بجلی بن کر مجھ پر گری۔ زندگی جو رب کائنات کی امانت ہے۔ ہم سب بخوبی جانتے ہیں کہ ہر ذی نفس نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے اور ہمیں مقررہ ساعت پر اِس کا سامنا کرنا ہے۔ مگر جب موت کے ہاتھوں محبت کی سوغات لٹتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں انسان شجرِ سایہ دار سے محروم ہو گیا ہو۔

زندگی کے حسین رنگ ماند پڑ گئے۔ یکدم یوں محسوس ہوا جیسے بہار کا قافلہ رخصت ہو گیا ہو اور زیست کے چمن میں خزاں نے ڈیرے ڈال لیے ہوں۔

زندگی کبھی اتنی بے رونق اور بے رنگ نہ نظر آئی تھی۔ آج محسوس ہوا کہ زندگی کو عزم و حوصلہ اور جینے کا ولولہ عطا کرنے والا میرا باپ تو آنکھیں موندے لمبی تان کے سو گیا ہے۔ یوں جیسے ساری زندگی کی تھکن اتارنے چلا ہو۔ نہ جانے یہ تھکن اُس نے کہاں چھپا رکھی تھی؟ ہم نے تو اس چہرے پہ ہمیشہ جینے کا ولولہ اور عزم دیکھا۔ وقت نے نہ جانے دل پہ کتنے گھاؤ لگائے ہوں گے مگر ہم نے انھیں چٹان کی مانند مضبوط پایا۔ لاڈلی جواں سال بیٹی ''نرگس'' کی موت بھی اس چٹان میں دراڑ نہ ڈال سکی۔ اس لمحے جب ہم سب اِس ناگہانی صدمے سے گزرتے ہوئے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔ میرے باپ نے جانماز بچھائی، گریہ وزاری کی اور اپنے رب سے استقامت کی دُعا مانگی۔ اور پھر یوں پُرسکون ہو گئے جیسے ایک صابر و شاکر بندہ اپنے رب کی رضا میں راضی ہو گیا ہو۔ جسم کا ایک حصہ کٹ گیا مگر اس اذیت میں بھی سجدۂ شکر بجالانا کتنا مشکل ہے .... یہ میں نے آج جانا۔

محبت کے ہزاروں رنگ ہیں۔ مگر باپ کی صحبت کا رنگ اتنا گہرا، انمول اور انمٹ ہے کہ وقت کی دھند اس کے نقوش مٹانے کے بجائے اُجاگر کرنے کا باعث بن جاتی ہے۔

تنہائی کا اذیت ناک زہر آج جب میرے رگ و پے میں اُترا تو میں نے جانا کہ تنہائی کا جہنم کیا ہوتا ہے؟ باپ کی توانا محبت کے سائے تلے زندگی کے پچپن برس بیت گئے مگر کسی مقام پر بھی اپنے آپ کو تنہا نہ پایا۔ ہر قدم پہ محبت کی سوغات لیے میرا باپ میرے ہمراہ چلا۔ زندگی میں بہت نشیب و فراز آئے .... جہاں مسکرائے تو آنکھوں نے آنسو بھی بہائے .... مگر غم کو مسکرا کے گلے لگانا اور سر اُٹھا کر جینا میرے باپ نے ہی تو مجھے سکھایا ورنہ شائد میں ٹوٹ کے بکھر گئی ہوتی۔

ماضی پہ نگاہ دوڑاتی ہوں تو گھنگریالے بالوں والی ننھی یاسمین باپ کے پہلو میں دراز اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے باپ کی گردن پہ پائے جانے والے مسّے کو مسلتی ہے اور میٹھی آواز میں لوری سنتے سنتے نیند کی آغوش میں چلی جاتی ہے۔ پھر قدم قدم چلنا اور دوڑنا سیکھتی ہے اور ایک دن جب دو پہیوں والی سائیکل چلانا چاہتی ہے تو شہر کراچی کے ایک بڑے خالی میدان میں اس آس پہ

سائیکل چلا پاتی ہے کہ ابو جی ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ ایک آدھ مشکل مقام پہ وہ چلا اٹھتی ہے ''ابو جی سائیکل چھوڑی تو میں گر جاؤں گی'' تو محبت سے لبریز میٹھی آواز کانوں سے ٹکراتی ہے ''بے فکر رہو بیٹا، میں تمھارے ساتھ ہوں'' اور سچ مچ وہ ہمیشہ یوں ہی ہر کٹھن مقام پہ مجھے گرنے سے بچانے کے لیے موجود ہوتے۔

ہمارے ساتھ وہ ہر کھیل میں شامل ہوتے۔ شہر لاہور کے حسین باغات میں لے کے جاتے۔ سبز گھاس کے قطعوں پہ ہم کبھی قلا بازیاں کھاتے اور کبھی دوڑ لگاتے۔ کبھی تتلیوں کے پیچھے بھاگتے اور کبھی رات کو جگنو پکڑتے۔ کبھی ریستوران لے کے جاتے تو کھانے پینے کے آداب سکھاتے اور کبھی گھر کے کسی کمرے میں دفتر لگتا اور وہ ''باس'' بن کر ہم بہن بھائیوں کو باری باری انٹرویو کے لیے بلاتے اور پھر بڑی سنجیدگی سے ہمیں سکھاتے کہ انٹرویو کیسے دیا جاتا ہے؟ کبھی انگریزی کی کلاس لگتی اور انگریزی زبان و ادب پہ ہمیں بڑا دلچسپ اور معلومات افزا لیکچر دیتے۔ کبھی اردو کا فقرہ بولتے اور ہم انگریزی میں ترجمہ کرتے۔ پھر آخر میں ہم سب گپ شپ لگاتے اور بڑے پُر لطف انداز میں ہمیں اپنی زندگی کی دلچسپ باتیں سناتے۔ کبھی ترنگ میں آجاتے تو کوئی گیت سنا دیتے۔ اور کبھی جو کہانی لکھ رہے ہوتے اس کا کوئی حصہ سناتے۔ کبھی گوئٹے، بائرن، کیٹس اور شیلے کی شاعری سناتے اور کبھی جگر اور اقبال کے اشعار سناتے۔ کبھی تھامس ہارڈی، چارلس ڈکنز، شیکسپیئر، ٹالسائی، چیخوف، دوستوفسکی اور برناڈ شا پہ بات کرتے اور کبھی ٹیگور، سروجنی نائیڈو اور نواب یار جنگ بہادر سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے۔ مگر جب حضورؐ کی پُرنور شخصیت پہ بات کرتے تو پھر دوسری کوئی بات اس ذکر کے سامنے ٹھہر نہ پاتی۔ عقیدت و محبت سے لبریز یہ گفتگو ہماری روح کو سرشار کر دیتی۔

اپنے افسانوں کو انھوں نے ہمیشہ اپنی دولت سمجھا۔ وہ اکثر کہتے لوگ اپنے پیچھے بنگلے اور دولت کے ڈھیر چھوڑ جاتے ہیں مگر میں ورثے میں کہانیوں کی دولت چھوڑ کے جا رہا ہوں اور وہ اولاد جس کی تربیت میں میں نے اپنی ساری توانائیاں صَرف کر دی ہیں۔ یہی میری کھڑی کی ہوئی عمارات ہیں!

مجھے آج بھی وہ دن یاد ہیں جب برٹش فرم میں استعفیٰ دے کر وہ گھر بیٹھ گئے تھے۔ گلبرگ میں جو ہمارا بنگلہ اور گاڑیاں تھیں وہ سب فرم نے واپس لے لیں۔ ہم انگریزی میڈیم سکول سے اردو میڈیم سکول میں آگئے۔ میرا باپ ساری رات بیٹھا کہانیاں اور کالم لکھا کرتا اور یوں اخبار و جرائد سے ملنے والی اس قلیل آمدنی سے گھر کا خرچ چلتا۔ میری ماں نے اس کٹھن وقت میں میرے باپ کا بھرپور ساتھ دیا اور یوں یہ مشکل دور گزر گیا۔ میرے والد رزق حلال اور عزت نفس کے قائل تھے۔ نہ وہ سستی شہرت چاہتے تھے اور نہ کبھی اپنے فن اور صلاحیت کو بیچنے کا سوچا۔

میں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تو ایک دن میں نے ابو جی سے کہا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ مجھے لاہور کالج میں داخلہ مل جائے۔ کہنے لگے ضرور ملے گا اور اگر نہ ملا تو میں وزیرِ تعلیم کے پاس چلا جاؤں گا۔ اگرچہ اس کی نوبت نہ آئی اور میرا داخلہ ہوگیا لیکن میرے باپ نے تکمیلِ خواہش کے اس سفر میں جس بھرپور انداز سے میری مدد کی ہامی بھری، وہ آج بھی میری روح پہ نقش ہے۔

میں یونیورسٹی اورینٹل کالج پہنچی تو وہ اکثر و بیشتر مجھے کبھی چھوڑنے اور کبھی لینے آتے۔ اور باتوں باتوں میں مجھ سے دن بھر کی روداد سنتے اور اِسی دوستانہ ماحول میں مجھے مرد کی فطرت اور نفسیات سے آگاہ کرتے۔ کبھی ہنستے ہنستے یہ مصرعہ اتنے پُراثر انداز میں ادا کرتے کہ آج بھی میرے ذہن و دل پہ یہ الفاظ نقش ہیں:

کہتی تھیں سچ سہیلیاں ، مرد کا اعتبار کیا

اُس وقت تو شائد میں اس بات کی گہرائی تک پہنچ نہ پائی تھی۔ مگر آج سوچتی ہوں کہ جوانی کے اس دور میں، یونیورسٹی کے مخلوط تعلیمی ماحول میں، کتنے دل نشیں انداز میں کتنی بڑی سچائی انھوں نے میرے سامنے لا رکھی، جسے شائد میری معصومیت کبھی نہ دیکھ پاتی۔ یوں زندگی کے خارزار جنگل سے دامن بچا کر گزرنا، مجھے میرے باپ نے سکھایا۔

میں لیکچرار بنی تو انھوں نے مجھے بات کہنے کا ڈھنگ سکھایا۔ آواز کا زیر و بم، لہجے کی کھنک، لوچ اور بانکپن، مافی الضمیر کو بیان کرنے میں کتنا اہم ہے، یہ میں نے اپنے باپ سے سیکھا۔ بطور استاد علم کے موتی چننے اور انھیں تقسیم کرنے کے عمل میں خلوص و محبت کی شمع جلائے رکھنا، ان ہی کی تعلیم تھی۔ تلاشِ علم اور تقسیم علم کے اس سفر میں مَیں کتنی کامیاب رہی، میرے دامن میں کھلے عقیدت و محبت کے پھول اس بات کا بین ثبوت ہیں۔

گھر میں محبت سے وہ مجھے ہمیشہ ''بابائے اردو'' کہتے۔ شعر و ادب پر وہ اکثر مجھ سے تبادلہ خیال کرتے اور میدانِ ادب میں مجھے اپنا جانشین تصور کرتے۔ میں نے جو بھی لکھا، ان ہی کی تحریک پہ لکھا۔ مگر میں ایک ایک لفظ پر ان کی محنت شاقہ دیکھ کر ششدر رہ جاتی۔ وہ رات رات بھر لیمپ جلائے بیٹھے لکھتے رہتے اور اتنی کانٹ چھانٹ کرتے کہ میں سوچتی جب کوئی قلم کو رب کائنات کی امانت سمجھ کر استعمال کرتا ہے تو ایک ایسی سچی تخلیق کا اظہار ہوتا ہے جو جگر سے لہو کا خراج مانگتی ہے۔

ازدواجی زندگی کے نازک لمحات میں جب میری شخصیت کی شکست و ریخت ہوئی تو میرے لڑکھڑاتے وجود کو توانائی بخشنے والی میرے باپ کی قد آور شخصیت میرے سامنے موجود تھی۔ دل کے زخموں سے رسنے والا لہو، باپ کی محبت یوں سمیٹ لیتی کہ زخم پھول بن جاتے۔ میرے سارے

آنسو اپنی جھولی میں سمیٹ کر وہ مجھے جینے کا نیا عزم و حوصلہ عطا کرتے۔ یوں ایک ولولہ انگیز مسکراہٹ چہرے پہ سجائے میں زندگی کی پُر پیچ راہوں پہ رواں دواں ہو جاتی۔

کبھی کبھی وہ فرطِ محبت سے کہتے ''یاسمین میرا جی چاہتا ہے کہ میں تمھیں اپنی آغوش میں اُسی طرح سمیٹ لوں جیسے بچپن میں سمیٹا کرتا تھا۔'' تو میں سوچتی محبت بھری یہ آغوش ہی تو میری ہستی کا سامان ہے۔ محبت کے اِسی حصار نے تو مجھے جینا سکھایا۔

آج کارزارِ حیات میں اگرچہ میں تنہا کھڑی ہوں مگر مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میرے باپ کی شفقت و محبت کے حصار نے میرے چاروں طرف ایک ایسا نور بکھیر رکھا ہے جو ہر قدم پر میرا راہنما ہے۔ محبت کا یہ لمس مجھے یہی باور کراتا ہے کہ میرا باپ کبھی نہیں مر سکتا۔ وہ زندہ ہے اس لیے کہ محبت ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ خوشبو کبھی مر نہیں سکتی۔

اسلم کولسری۔ لاہور

ملک مصیب الرحمٰن

وہ کتنی دھوپ میرے رتجگوں میں چھوڑ گیا

لاہور کے جم پل بانکے سجیلے، سروقد، تنومند، لا اُبالی، پُر خلوص، سانولے سلونے، شاعری کے رسیا، ہاکی کے نامور کھلاڑی، اس شخص نے دوحہ قطر کی وسیع، تابناک اور زندگی سے معمور فضاؤں میں اپنی شبانہ روز محنت سے اتنے وسائل حاصل کر لیے تھے کہ شاندار، آرام دہ اور پر تعیش زندگی بسر کرتا، مگر اس نے اپنی جد وجہد کے ساتھ جمع کی گئی ساری کمائی اس خارزار پر نچھاور کر دی جس کا حاصل حصول کچھ بھی نہ تھا۔

اس نے دنیوی طور پر مقتدر ہستیوں کی بجائے خون جگر سے حرف وصوت کی آبیاری کرنے والے مہمان لکھاریوں کے قدم چھوئے اور حسینانِ عشوہ طراز کی جگہ آنسوؤں سے چراغ جلانے والے شاعروں کو اپنی آنکھوں میں بسایا، اہل دول کو چھوڑ کر اہلِ دل سے لو لگائی اور زبر دستوں کو نظر انداز کر کے فاقہ مستوں کے دروازوں پر حاضر دی۔ یہ شخص ملک مصیب الرحمٰن تھے۔

ملک مصیب الرحمٰن کو مطالعے کا جنون تھا۔ مطالعے کے جنون نے ایک نیا رنگ اختیار کیا اور 1990 میں انہوں نے دوحہ میں ایک ادبی تنظیم مجلس فروغ اردو ادب کی بنیاد رکھی، اور خلیج میں بسنے والے شاعروں کا جشن منانے کی رسم کا آغاز کیا، اُدھر دوبئ کی روشن، رنگین اور رعنائیوں سے معمور ہواؤں میں بھی ایک دیوانہ بستا تھا، سلیم جعفری، وہی رنگ، وہی ڈھنگ، وہی ذوق، وہی شوق اور وہی طور۔ سلیم جعفری نے یونیکرین کے نام سے ایک ادبی تنظیم قائم کر رکھی تھی۔ چنانچہ جیسا کہ ہونا چاہیے تھا، ہوا۔ سلیم جعفری نے اپنی تنظیم کو مجلس فروغ اردو ادب میں ضم کر دیا اور پھر ان کی مشترکہ مساعی سے مجلس فروغِ اردو ادب کی عالمی ادبی تقریبات نے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اردو زبان کے شیدائیوں کو مسحور کر دیا اور ایسی شہرت حاصل کی کہ مجھ ایسا گم صم بھی اس کی حیرت انگیز حد تک شاندار کارکردگی سے بے خبر نہ تھا۔ 1994ء میں شہزاد احمد

صاحب کے کہنے پر مجھے بھی جشن محشر میں مدعو کیا گیا مگر میں نے سلیم جعفری صاحب کو خط لکھ کر معذرت کر لی، کی کہاں راجا بھوج کی سبھا اور۔۔۔ وغیرہ، سلیم جعفری نے اس خط کے جواب میں ایک طویل خط لکھا کہ یہ موقع تو تم نے گنوا دیا، 1995ء کے جشن کیفی میں تمہاری شرکت لازمی ہے۔ حکم میں اس قدر تیقن تھا کی بجالاتے ہی بنی۔

وہاں میں نے پہلی بار مصیب الرحمٰن کو دیکھا، یوں محسوس ہوا جیسے وہ ایک جز یٹر ہوں، جو پردے کے پیچھے کسی کونے کھدرے میں مصروف کار رہتا ہے، مگر محفل کی تمام تر جگمگاہٹیں اسی کے دم سے ہوتی ہیں۔ خاموش، مگن، اور نام ونمود سے قطعی بے نیاز۔ مصیب الرحمٰن مجھ سے ملے تو مسکراتے ہوئے کہنے لگے ''شہزاد صاحب نے جب تمہارا نام لیا، تو مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں نے تمہارا کلام پڑھا ہے''۔ اس کے بعد وہ پھر سے ذمہ داری کے کسی بھنور میں ڈوب گئے اور اکبر زمین میں ''شدت حیرت'' سے گڑ گیا کہ چھوٹے سے چھوٹا شاعر بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں، بڑے شاعروں ادیبوں کا تو ذکر ہی کیا بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے شادی تو کی نہیں، چنانچہ کتابوں ہی سے جی لگا رکھا ہے، ان کا گھر، ہر قسم کی لغات، کلیات، دیوانوں اور دیگر ادبی کتابوں سے بھرا پڑا ہے، حتیٰ کہ بیڈ روم میں ساتھ کے بیڈ پر بھی کتابوں ہی کا ڈھیر ''پڑا'' رہتا ہے۔ انہیں اساتذہ سے لے کر آج کے نوجوان شعرا تک کے سینکڑوں اشعار ازبر تھے، خود بھی شعر گوئی کی صلاحیت رکھتے تھے مگر یار لوگوں کیلئے خود سناتے اور نہ چھپواتے۔ ہاں اپنی والدہ کی برسی پر ایک شعر کہتے اور اخبار میں ان کی یاد میں دیے گئے اشتہار میں دیتے۔ گزشتہ برس کہنے لگے ''بھائی سارے قافیے ختم ہو گئے، اب؟؟ خاموش ہونا ہوگا''۔۔۔ اب میں سوچتا ہوں کہ ان کا جملہ کس قدر پُر معنی اور پیش گوئی کی حیثیت رکھتا تھا۔

1997 میں اچانک معلوم ہوا کہ سلیم جعفری بیمار ہو گئے ہیں اور۔۔۔ سرطان کا انکشاف ہوا ہے۔ میرے اس وقت کے ڈی جی امجد اسلام امجد نے چشمہ اتار کر میز پر رکھا۔ خلاؤں میں تاکا۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کچھ یوں بڑبڑائے جیسے اپریشن روم سے نکلتے ہوئے ڈاکٹر نے لواحقین کو ''ساری'' کہا ہو۔ اور وہی ہوا۔ مصیب الرحمٰن نے اپنے دوست کے علاج معالجے کے لیے ہر ممکن کوشش کی، امریکہ بھی لے گئے، مگر۔۔۔ ایک دوپہر میں دو تین روز کے بعد گاؤں سے لوٹا، تو میز پر سلیم جعفری کا خط پڑا تھا، میں نے خط پڑھا جو انہوں نے ہسپتال سے لکھا تھا۔ اور فوری طور پر جواب لکھا، ان کی ہمت بندھائی۔ خط قاصد کے سپرد کر کے اخبار کھولا۔۔۔ تو ایک کونے میں خبر ملی، سلیم جعفری انتقال کر گئے۔ یہ لمحہ کس قدر بھیانک تھا، احاطہ تحریر میں نہیں آ سکتا۔ ملک مصیب الرحمٰن غم سے نڈھال ہو گئے مگر ہمت نہ ہاری اور سلیم جعفری کے جنون کو بھی اپنے جنون میں انڈیل کر نشے کو دوچند کر لیا اور پھر سے ادبی افق پر جگمگاہٹوں کے

عمل میں جت گئے۔ اب عالمی اردو ادب ایوارڈ کی تقریب، کسی شاعر کے جشن اور عالمی مشاعرے کے اہتمام کے ساتھ سلیم جعفری ایوارڈ کی تقریب کے انعقاد کا بھی اضافہ ہوگیا۔

مجلسِ فروغِ اردو ادب، ہر سال ایک بڑے پاکستانی اور ایک بھارتی ادیب کو عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ سے نوازتی تھی۔ مجلس ایوارڈ کے ساتھ ایوارڈ یافتہ کو ڈیڑھ لاکھ روپے کی کثیر رقم بھی پیش کرتی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر سال برصغیر کے کسی نامور شاعر کے ساتھ جشن کا بھی اہتمام کیا جاتا۔ جبکہ سلیم جعفری ایوارڈ اس تخلیق کار کے لیے مخصوص تھا جو برصغیر سے باہر کسی ملک میں رہ کر اردو ادب کی خدمت کرتا۔ اس ایوارڈ کے ساتھ ایوارڈ یافتہ کی خدمت میں پچھتر ہزار روپے بھی پیش کیے جاتے۔ دنیا میں کہیں کوئی ایسی ادبی تنظیم نہیں جو ہر سال فروغ ادب کے لیے اتنا زرِ کثیر صرف کرتی ہو۔ پھر یہ تقریبات اتنی منظم، پُر وقار اور عالیشان ہوتیں کہ ایک بار جناب احمد ندیم قاسمی، جنہیں بلاشبہ دنیا بھر کی ادبی تقریبات میں شرکت کا اعزاز حاصل ہے، نے کہا، کہ مجلسِ فروغِ اردو ادب کے زیر اہتمام منعقدہ ادبی تقریبات کی مثال کرہء ارض پر کہیں نہیں ملتی۔ اور جمیل الدین عالی کا کہنا تھا کہ وہ نوبل پرائز کی تقریب میں بھی شریک ہوئے ہیں اور پورے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ مجلسِ فروغِ اردو ادب کی منعقدہ تقریبات اپنے معیار، وقار اور حسن انتظام، غرض کسی بھی لحاظ سے نوبل پرائز کی تقریب سے کم نہیں۔ اور یہ سارا انتظام فردِ واحد مصیب الرحمن کے جنون کا مرہون منت تھا۔ اسی لیے ممتاز ادیب، شاعر اور کالم نگار عطا الحق قاسمی نے بجا طور پر مصیب الرحمن کو اردو ادب کی دیو مالائی شخصیت قرار دیا۔

ملک مصیب الرحمن نے مجلسِ فروغِ اردو ادب کی جانب سے پاکستان کے جن مشاہیر ادب کو ایوارڈ پیش کیے ان میں احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، انتظار حسین، بانو قدسیہ، مختار مسعود، شوکت صدیقی، حمید کاشمیری، عبداللہ حسین، محمد خالد اختر، مستنصر حسین تارڑ اور محترمہ خدیجہ مستور شامل ہیں۔ جبکہ محشر بدایوانی، شہزاد احمد، پیرزادہ قاسم، امجد اسلام امجد کے جشن منانے کا اہتمام کیا گیا۔ سلیم جعفری ایوارڈ، نجم الحسن رضوی (دوبئ)، پروفیسر رالف رسل (برطانیہ)، نتالیا پری گارنیا (روس)، انتخاب عالم (چین)، اشفاق حسین (کینیڈا)، بخش لائل پوری (برطانیہ) اور ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز (برطانیہ) کو دیا گیا۔

ان تقریبات کے حوالے سے ملک مصیب الرحمن کو دنیا بھر میں بسنے والے تقریباً ساڑھے سات سو ادیبوں اور شاعروں کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا اور میزبانی بھی ایسی کہ جس نے ایک بار یہ اعزاز حاصل کیا وہ ہمیشہ کے لیے مصیب الرحمن کا گرویدہ ہوگیا۔ وہ ہر مہمان کا ائرپورٹ پر خود استقبال کرتے، لمحہ لمحہ ان کے آرام کا خیال کرتے اور یوں خدمات بجا لاتے کہ خود مہمان ششدر رہ جاتا، مہمانوں کو تحائف سے لاد دیتے اور پھر ہر مہمان کو خود

ائر پورٹ پر الوداع کہتے۔

اسی پر بس نہیں وہ مرحوم شعرا کے نادر کلیات کی اشاعت کا بھی اہتمام کرتے اور اہم مگر بے نیاز یا مجبور شعرا کے شعری مجموعے اپنے خرچ پر شائع کرواتے۔ معذور اور نادار ادیبوں اور شاعروں کی مستقل مالی مدد بڑی راز داری کے ساتھ جاری رکھتے۔ دنیا میں اردو کے کسی بھی بڑے تخلیق کار کا انتقال ہو جاتا تو فوری طور پر تعزیتی ریفرنس کا انعقاد کرتے۔ بلکہ وہ خود مرحوم ادیب کے اپنے وطن میں ریفرنس کے انعقاد سے قبل وہاں تعزیتی اجلاس کرڈالتے، حد تو یہ ہے کہ انہوں نے ان قلمکاروں کے بارے میں بھی تعزیتی پروگرام منعقد کیے جن کو اپنے وطن میں مکمل طور پر فراموش کر دیا گیا۔ پھر وہ ان کی یاد میں نے مختلف اخبارات اور رسائل کو اشتہار بھی دیا کرتے۔

ان ادبی تقریبات کے حوالے سے وہ سال بھر دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ادیبوں اور شاعروں سے ٹیلی فونک رابطے میں رہتے۔ مجھے بھی کبھی کبھار ان کا فون آتا لیکن جب ایک بار ان کی فرمائش پر میں نے ایک بہت پرانی کتاب کسی لائبریری سے حاصل کی، اس کو فوٹو سٹیٹ کروا کے انہیں بجھوایا تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی، وہ کہہ رہے تھے کہ میرے لیے یہ کام میرے والد مرحوم کیا کرتے تھے۔ تب سے وہ مجھے زیادہ ہی لائق توجہ سمجھنے لگے۔ تاہم پچھلے چند مہینوں سے ایک ایک کر کے ٹیلی فون کے تار خاموش ہوتے گئے۔ شبانہ روز محنت، (وہ تقریبات کے دنوں میں مسلسل کئی دن رات جاگ کر گزار دیتے جبکہ ان کی خوراک دو چمچ کھیر، چائے، کافی اور سگریٹ تک محدود ہو گئی تھی) اور صحت کے حوالے سے فطری بے نیازی کے نتیجے میں وہ شوگر، بلڈ پریشر اور دیگر کئی امراض میں مبتلا ہو گئے تھے۔ جب انہیں اس سلسلے میں مشورہ دیا جاتا تو مسکرا کر کہتے بھائی یہ امراض بھی مہمان ہوتے ہیں، اور مہمانوں سے بدسلوکی نہیں کیا کرتے۔

مصیب الرحمٰن خط لکھنے سے گریز کرتے تھے، چنانچہ وہ لمبے لمبے خطوط کے لیے ٹیلیفون ہی استعمال کرتے۔ ان کا پہلا جملہ ہوتا۔۔ ''ہاں جی خیر اے؟'' اور پھر چل سو چل۔ وہ دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ ایسے ایسے اشعار سُناتے کہ وجد طاری ہو جاتا۔ مگر دو تین ماہ قبل انہوں نے ایسے اشعار سنائے جو روح کو چھید ے جاتے۔ یوں لگتا تھا جیسے ساتھ ساتھ رو بھی رہے ہوں، مگر جلد سنبھل گئے، اور اپنی پسندیدہ کتابوں کا تذکرہ شروع کر دیا، پھر گفتگو میں ہنسی شامل کر لی۔

اگلے فون میں کہنے لگے۔ ''میں نے شوداس (ان کے ذاتی ملازم) سے کہہ دیا ہے کہ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو فوراً اسلم کو اطلاع دے دینا، بس۔۔۔ اور بھائی وہ کتاب۔۔۔۔۔۔ یعنی اس جملے کو کتابوں کی فرمائش کے نیچے روند دیا، مجھے کچھ تشویش تو ہوئی مگر ایسی بھی نہیں۔۔۔ کیونکہ وہ بات ختم کرنے سے پہلے ابتدائی فضا تہس نہس کر چکے تھے۔

یکم اپریل کی شام ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہنے لگے۔۔۔ ''میرے انتہائی پیارے انکل رفیق احمد ملک انتقال کر گئے ہیں، میں آ رہا ہوں۔ صبح پانچ بجے جہاز لینڈ کرے گا۔ ظفر اقبال (آف دوحہ) مجھے ائرپورٹ سے لے لیں گے۔ 9 بجے جنازہ ہے، تم پہنچ جانا۔۔۔ اور یار کسی کو بتانا نہیں، کیونکہ مجھے جلدی واپس جانا ہے''۔

میں 2 اپریل کی صبح ان کے چچا کے ہاں پہنچا، تو جنازہ روانہ ہونے والا تھا، ظفر اقبال دکھائی دیئے، میں نے ان سے پوچھا ''مصیب آ گئے ہیں؟'' ''ہاں'' وہ بولے مگر ایک اور سانحہ ہو گیا ہے''۔

''کیا؟'' میں نے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ مصیب صاحب کے چچا کے جنازے میں شرکت کے لیے کوئی عزیز آیا تھا، اچانک اس کی طعبیت بگڑی، فوری طور پر ہسپتال پہنچایا گیا۔ تھوڑی دیر پہلے اطلاع آئی ہے کہ اس کا بھی انتقال ہو گیا ہے۔۔۔ تبھی گیٹ سے جنازہ نمودار ہوا اور ہم لوگوں میں شامل ہو گئے۔ قریبی مسجد کے وسیع لان میں نماز جنازہ ادا کی گئی، نماز کے بعد ظفر اقبال میرے پاس آئے، ''مصیب صاحب نظر نہیں آئے، اُدھر ہوں گے۔۔۔ ان سے مل لیں''۔

تب لوگ تدفین کے لیے قبرستان کی طرف جا رہے تھے ہم نے ہجوم کی آخری ٹکڑی سے دریافت کیا، ''مصیب صاحب آگے چلے گئے ہیں۔۔۔۔ یا۔۔۔''

''ان کی تو ڈ-تھ ہو گئی ہے'' ظفر اقبال نے بتانے والے کو یوں دیکھا، جیسے وہ کوئی پاگل ہو، پھر یوں گھورا جیسے ابھی گولی ہی تو مار دیں گے، پھر میری طرف دیکھا، میں نے ان کی طرف، مگر نہ انہیں میں نظر آ رہا تھا، نہ مجھے وہ۔

اخبارات میں سلیم جعفری کے انتقال کی خبر کی طرح، تن تنہا زرِ کثیر صرف کر کے نوبل پرائز کے مقابلے کی ادبی تقریبات منعقد کروانے والے، اردو کے بزرگ شعرا کی تعظیم کرنے والے، شاعروں اور ادیبوں کے وقار اور اعتبار کے لیے جد و جہد کرنے والے اور اردو ادب کے فروغ کے لیے تن، من، دھن قربان کر دینے والے مصیب الرحمٰن کی رحلت کی خبر بھی کہیں کونے کھدرے میں شائع ہوئی تھی۔ تین سطری خبر۔ وہ بھی ایک دو اخبارات میں۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر مسکین علی حجازی، لاہور
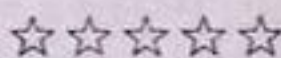
اکرام رانا کی رحلت، ایک دبستان کی موت

اس نے ایک قابل احترام علمی ادبی گھرانے میں جنم لیا تھا۔ جہاں دینی تعلیمات، اخلاقی روایات اور مشرقی اقدار کی پاسداری لازمی تھی اس کے دادا امجد دالسنہ شرقیہ مولانا احمد حسن شوکت احسن المطابع کے مالک اپنے دور کے بلند پایہ کے شاعر اور جرات مند صحافی تھے ان کے اخبار شحنہ ہند نے انگریز اور قادیانت کے خلاف زبردست جہاد کیا تھا۔ ''طوطی ہند'' میں ان کے افکار بہت پسند کیے جاتے تھے۔ پیسہ اخبار میں ان کے جرات مندانہ اظہار خیال کی بڑی مانگ تھی وہ صرف صحافت ہی کے علم برادر نہ تھے بلکہ انھوں نے سب سے پہلے شرح دیوان غالب قلم بند کر کے اپنے ادارے سے شائع کی۔ فارسی شعراء کے کلام کی تشریحات تحریر اور طبع کیں۔ اس کے عم مکرم مولانا شیث احمد جودت ایک آتش بیان مقرر اور خطیب تھے۔ مجمع پر چھا جاتے تھے۔ پل بھر میں ہنسا دیتے، پل بھر میں رلا دیتے تھے علی گڑھ یونیورسٹی کے سالانہ اجلاس میں خصوصیت سے بلائے جاتے۔ لوگ انھیں سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ اپنے وقت کے مشہور شاعر مولانا حافظ شعیب احمد ندرت بھی اس کے عم محترم تھے جو آئینہ پریس کے مالک اور ہفت روزہ ''آئینہ'' اور ماہنامہ ''عندلیب'' کے مدیر تھے۔ ان کے چار دیوان طبع ہو کر قبول عام پا گئے اس کے والد مولانا ہارون احمد جدت ملٹری اکاؤنٹس کے اعلیٰ تنظیموں کے سیکرٹری ہونے کے ناطے سماجی بھلائی کے کاموں میں بھرپور حصے لیتے رہے اس کے باوجود اپنے موروثی مشغلہ شاعری سے دوسروں کو بھی مستفیض کرتے رہے۔ کوئٹہ میں انھوں نے عید الشعرا کی طرح ڈالی۔ بہت سی علمی محفلیں منعقد کیں۔ پروفیسر صادق حسن صادق جوہر ڈبائیوی۔ عیش فیروز پوری وغیرہ ان کے بہت مداح تھے۔ راولپنڈی تبادلہ ہوا تو بزم روح الادب کے صدر منتخب ہو کر طرحی مشاعروں کا ایک بلند معیار برسوں قائم رکھا۔ افسوس کے ان کے بعد یہ پر رونق سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ انھوں نے اپنی بیٹی سلطان زماں نزہت کے ذوق کی تسکین کے لیے خواتین کا آرگن ماہنامہ ''صبح درخشاں'' جاری کیا جس میں نزہت کا مشہور زمانہ اعلان ''بیٹی کا خط ماں کے نام'' پہلی بار شائع ہوا اور بہت سے رسالوں اور اخبارات کی

زینت بنتا رہا۔

یہ گھر امیر کبیر تو نہیں تھا لیکن ہمسر سفید پوشوں میں اپنی پہچان رکھتا تھا بیٹی کو حسب توفیق جہیز دیا جاتا تو وہ بھی خاصا اچھا سمجھا جاتا لیکن اعلیٰ تعلیم یافتہ بیٹی کی ضد تھی کہ ''شادی کروں گی تو اس سے جو مجھے تین کپڑوں میں اپنے گھر لے جائے'' اس نے اپنی خواہش کو موزوں ترین الفاظ کا جامعہ پہنایا اور وہ اخبارات اور جرائد میں بھی شائع ہوگئی۔ گھر کے بزرگ، رشتے دار سمجھاتے رہے مگر وہ پرعزم رہی اور یہی کہتی رہی میں معاشرتی برائیوں کے خلاف جہاد کا آغاز عملی مثال سے کروں گی اس کا عزم بلجزم جیت گیا اور وہ ممتاز صحافی، ادیبہ، شاعرہ، مصنفہ بنی، پی ایچ ڈی کی۔ ایک دور میں اس کے قلم نے جولانیاں دکھائیں۔ اس خاتون کی داستان اپنی جگہ پر بڑی دلچسپ اور درس آموز ہے۔ معاشرہ میں بے حسی نہ ہوتی تو اس داستان کو ایک مثال بنا کر مہم شروع کی جاتی۔ ناول لکھے جاتے، کوئی فلم بنائی جاتی مگر یہاں اس خاتون کا ذکر تو ایک حوالے سے آیا ہے۔ کیا اس خاتون کو اپنا آئیڈیل ملا؟ اگر ملا تو وہ کون تھا؟ کیا وہ خاتون اپنا آئیڈیل پانے کے بعد خوش رہی یا مایوس ہوئی؟ میرا مقصد ان سوالوں کا جواب دینا نہیں ہے۔ جس شخص کا ذکر مقصود ہے وہ میرا بھی دوست تھا اور یہی شخص اس خاتون کا بھی آئیڈیل ثابت ہوا تھا۔

اس کے دوستوں کا حلقہ وسیع تھا۔ وہ فلسفی دانشور صحافی تھا مگر ایسا صحافی جو صحافت کو عبادت سمجھتا تھا۔ جو بک نہیں سکتا مگر اہل خلوص اسے مفت میں بندہ بے دام بنا لیتے تھے۔ وقت سب سے بڑا ابن الوقت ہے کروٹ لیتا ہے تو پیچھے کی طرف مڑ کے نہیں دیکھتا۔ صحافت ہنگامیت کے ساتھ چلتی ہے حال کی ہوا سے سانس لیتی ہے اقتدار، اختیار، مال و زر کشمکش حوادث جرائم یا لہوولعب اس کے پسندیدہ کھلونے ہیں یہ اپنے ماضی کے محسنوں کو بھی اس وقت یاد کرتی ہے جب کوئی اسے یاد دلائے اور یہ یاد بھی ایک تذکرے کی صورت میں ہوتی ہے میں اس خاتون کی ہمت، محنت، قابلیت کا شاہد ہوں اور اس خاتون کے آئیڈیل کے طور اطوار، عادات، ذوق، کام کاج کا اتنا ہی عینی گواہ ہوں جتنا اس خاتون کا، برسوں ایک کمرے میں بیٹھے کام کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے گھر بھی ہمارا آنا جانا تھا۔ اکثر ہم دونوں یعنی میں اور بیگم اکٹھے ان لوگوں کی طرف جاتے، کچھ ہی روز پہلے رانا صاحب سے فون پر بات بھی ہوئی۔ سچی بات یہ ہے کہ اس روز جب جنازہ سامنے تھا تو میں بولنے کی ہمت نہیں پا رہا تھا لیکن ڈاکٹر نزہت اکرام نے مجھے دیکھ کر کہا بھائی رانا صاحب میرا ساتھ چھوڑ گئے اس پر میں نے کہا یہ اللہ کی مرضی ہے آپ رانا صاحب کی زندگی میں کوئی شکایت کرتیں تو بات ہوتی۔ دسمبر ۱۹۶۵ء سے لے کر اپریل ۲۰۰۲ء تک مدت کافی طویل ہے۔ یہ ڈاکٹر نزہت اکرام اور اکرام علی رانا کی ازدواجی زندگی کی عمر ہے۔ راجپوت قوم ہمیشہ سے ایک مارشل ریس رہی ہے۔ اکرام علی رانا کے خاندان میں زیادہ تر افراد پولیس اور فوج

سے منسلک رہے۔ ان کے والد رانا جہانگیر خاں بھی محکمہ پولیس سے وابستہ تھے۔ متحدہ ہندوستان میں صرف دس افراد کو دیانت داری الاؤنس ملتا تھا جس میں ایک رانا جہانگیر خان مرحوم تھے۔ رانا علی حسن، رانا جاوید، رانا محمود الحسن، رانا سعادت وغیرہ کی خدمات بھی پولیس میں رہیں۔ ان کے برادران محترم عبدالستار خان اور بختیار میجر جنرل ریٹائرڈ کی خدمات کون نہیں جانتا۔ رانا اکرام کے بھائی رانا محمد حسین ہریانہ کے ذیلدار تھے اور چیف آف ہریانہ تھے۔ تایا رانا عبدالغفور خاں بڑے زمیندار تھے۔ رانا محمد آصف، رانا محمد عارف زمین سے وابستگی کے علاوہ سرکاری محکموں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ اکرام علی رانا کے ایک بھائی ڈاکٹر رانا محمد عاقل فیصل آباد زرعی یونیورسٹی میں ہیں جبکہ سب سے چھوٹے بھائی رانا عبدالقیوم اٹامک انرجی پلانٹ میں اہم خدمات انجام دے رہے ہیں ان کے کچھ عزیز ملکی سیاست میں حصہ لے کر اہم عہدوں پر فائز رہے جن میں رانا صابر، رانا محمد نواز، علی اکبر، رانا اکرام ربانی، رانا سخاوت کے نام آتے ہیں۔ اکرام علی رانا نے کبھی خود عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا، وہ صحافت سے منسلک رہ کر ملکی سیاست پر کھری تنقید میں پیش پیش رہے۔ قومی اور بین الاقوامی سیاسیات اور معاملات پر ان کی گہری نظر تھی، ہر شعبہ حیات میں ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا روزانہ رات کو خصوصیت سے مطالعہ کرنے کی عادت تھی وہ اپنی ذاتی لائبریری رکھتے تھے جہاں ہر موضوع پر کتاب کا بڑا ذخیرہ موجود تھا اور ہے۔ دیکھئے کہ ان کا بیٹا احمد اس ذخیرے سے کتنا فیض یاب ہوتا ہے۔

اکرام علی رانا المعروف اکرام رانا ایک منفرد یکتا انسان تھے اپنی ذات میں ایک انجمن ایک دبستان فلسفے کا چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا اردو اور فلسفے میں ایم اے تھے۔ لیکن علمی طور پر فلسفے کے کئی ڈاکٹروں پر حاوی تھے۔ تمام نامور فلسفیوں کے ان گنت اقوال ان کو ازبر تھے اور وہ ان کو تحریر اور گفتگو میں بکثرت استعمال کرتے تھے۔ ترجمہ و تالیف ''کشاف اصطلاحات فلسفہ'' ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے فطرتاً درویش منش تھے۔ نمود اور تکلف، طمع، مرعوبیت کے الفاظ ان کی زندگی کی لغت میں تھے ہی نہیں علم اور خلوص کے گرویدہ کوئی شخص اپنے عالی منصب یا اپنی امارات کے طول و ارض کی بنیاد پر ان کو نہ متاثر کر سکتا تھا نہ دوست بنا سکتا تھا۔ ڈاکٹر کرامت حسین جعفری (مرحوم) عبد الحمید چودھری۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ (مرحوم)، پروفیسر مرزا محمد (مرحوم)، شورش کاشمیری (مرحوم)، مظفر حسین، ڈاکٹر وحید قریشی کے ساتھ احترام کے رشتہ کے باوجود نوک جھونک کرتے رہتے۔ مجھے ان اکابر سے ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، پروفیسر مرزا محمد منور اور ڈاکٹر وحید قریشی کے سامنے زانوے تلمذتہہ کرنے کا اعزاز حاصل ہے رانا صاحب کبھی ان کے ہاں جانے میں دیر کر دیتے تو مجھے پیغام ملتا رانا صاحب کو ساتھ لے کر آئیں۔ آغا شورش کاشمیری بڑے دبنگ آدمی تھے۔ نامور اہل قلم اور خطیب آغا صاحب مرحوم سے مخاطب ہوتے وقت یہ احتیاط برتتے تھے کسی لفظ پر گرفت نہ

ہو جائے لیکن رانا صاحب کی بے تکلفی وہ بھی برداشت کر لیتے تھے بلکہ ان کی بے تکلفی سے محظوظ ہوتے تھے۔ ایک دور میں ڈاکٹر سید محمد عبداللہ اورینٹل کالج کے پرنسپل اور پروفیسر مرزا محمد منور گورنمنٹ کالج لاہور سے منسلک تھے۔ رانا صاحب ان کی طرف جاتے یا ان کی طرف سے آتے ہوئے کچہری روڈ پر مکتبہ کارواں میں چودھری عبدالحمید کے پاس ضرور رکتے بعض اوقات دوسرے بزرگ بھی مکتبہ میں آجاتے اور علمی مجلس برپا ہو جاتی۔ اس زمانہ میں شعبہ صحافت (موجودہ شعبہ ابلاغیات) علامہ اقبال (اولڈ) کیمپس ہی میں تھا میں نے صحافت میں ایم اے کیا تو ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کا حکم ملا اب ایم اے اردو بھی کر لو۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کی شاگردی میں جاکر اکرام رانا صاحب سے ربط ضبط بڑھا جو بعد ازاں دوستی میں بدل گیا۔ اب تو مرحوم کوہستان کا ذکر بھی پرانے مضامین یا تحقیقی مقالات میں ملتا ہے ۱۹۶۰ء کے آس پاس اس اخبار کا ملک میں ڈنکا بجتا تھا۔ لاہور، راولپنڈی اور ملتان سے بیک وقت شائع ہونے والا یہ اخبار اردو صحافت میں کئی جدتیں پیدا کر چکا تھا قبول عام ہونے کے باوجود اپنا نظریاتی تشخص رکھتا تھا۔ ہفتہ وار اشاعت اور روزانہ اشاعت میں عالم اسلام کی خبروں کے الگ صفحے متعارف کرانے کے علاوہ بھی اس نے کئی جدتیں پیدا کیں۔ جناب نسیم حجازی (مرحوم) چیف ایڈیٹر اور عنایت اللہ (مرحوم) جنھوں نے ۱۹۶۳ء میں مشرق جاری کیا) اس کے مدیر منتظم تھے۔ جناب نسیم حجازی کی مساعی سے میر جعفر خاں جمالی کے تعاون سے ۱۹۴۴ء میں کوئٹہ سے ہفت روزہ ''تنظیم'' جاری ہوا تھا۔ جس نے بلوچستان میں تحریک پاکستان کے لیے خاصا کام کیا تھا۔ نسیم حجازی مرحوم کے ناول ایک الگ بات ہیں لیکن ناولوں میں جو منظر (IMAGERY) ملتے ہیں۔ وہ اصل میں سرزمین بلوچستان کی دین ہیں کوہستان کے مخصوص اداریئے نسیم حجازی لکھتے تھے لیکن معمول کے اداریوں کے لیے دوسرے افراد موجود تھے۔

عنایت اللہ مرحوم کو اپنے اخبار میں جدتیں پیدا کرنے کی دھن سوار تھی۔ انھوں نے اپنے کچھ رفقاء ایسے نئے لوگوں کی تلاش پر مامور کر رکھے تھے جو ان کے معیار پر پورے اتر سکیں اور ان کی خواہش کے مطابق اخبار میں جدتیں پیدا کر سکیں۔ نئے کالم، نئے ایڈیشن، نئے مندرجات، راقم کو منہاج الدین اصلاحی اس لیے کھینچ لے گئے تھے کہ انھیں عنایت اللہ مرحوم نے یہ کہہ کر بھیجا تھا جو لوگ یونیورسٹی سے صحافت میں ایم اے کر کے نکلتے ہیں ان میں سے جسے علمی صحافت کی شدبدھ ہو اسے ڈھونڈ لاؤ اس وقت یہ یاد نہیں کہ ڈاکٹر نزہت اکرام اور اکرام علی رانا کو ادارہ کوہستان کے کس رکن نے ڈھونڈا تھا لیکن راقم بھی ڈاکٹر نزہت کے ساتھ میگزین سیکشن ہی میں بیٹھا تھا کچھ عرصہ بعد پنجاب یونیورسٹی میں چلا گیا لیکن جب تک کوہستان کا دبستان آباد رہا میں وہاں حاضری دیتا رہا۔ اس دور میں ''نوائے وقت'' اپنی جگہ پر وقیع تھا۔ امروز ایک الگ دبستان تھا۔ کوہستان دونوں سے الگ اپنی دنیا بسائے ہوئے تھا اس وقت اس سے وابستہ جن صحافیوں کے نام ذہن

میں ہیں ان میں ابوصالح اصلاحی، اقبال زبیری، احسان بی اے، عالی رضوی، سید سعادت خیالی، امین راحت چغتائی، منہاج الدین اصلاحی، خالد محمود، عبدالکریم عابد، منظور ملک، ایم ارشد، شمشیر شاہ باری، محبوب علی خاں عبدالحق شہباز، راجہ خلیق احمد خاں، سلمٰی جبیں، میاں منظور احمد، طارق وارثی، ریاض بٹالوی بھی ادھر سے گزرے مگر چمکے مشرق میں جا کر بعد میں عبدالوحید خاں بھی شامل جماعت ہو گئے ملتان میں قیوم جاوید اور راولپنڈی میں قیوم قریشی مدار المہام تھے۔ اس اخبار کے میگزین سیکشن میں منہاج الدین اصلاحی، نزہت اکرام، خالد محمود، منظور ملک اور راقم کی نشستیں مستقل تھیں۔ اکرام علی رانا ادارتی صفحے سے منسلک تھے لیکن جہاں چاہتے بیٹھ کر لکھنا شروع کر دیتے تھے۔ نسیم حجازی صاحب زیادہ تر راولپنڈی اور لاہور کے درمیان سفر کرتے رہتے۔ ضرورت ہوتی تو خصوصی اداریہ تحریر کر دیتے اب ان میں سے کون مرحومین ہیں اور کون حیات اس کا بھی پورا علم نہیں شجر حیات کے پتے ایک ایک کر کے گرتے جاتے ہیں لیکن یہ سب لوگ اس انوکھی شادی میں شریک تھے۔ جو دسمبر ۱۹۶۵ء میں ہوئی۔ کچھ باراتی کچھ دلہن کے گھر والے کچھ دونوں طرف کے منتظمین یہ شادی نرالی اس لیے تھی کہ اس میں کسی قسم کا لین دین ہی نہیں ہوا تھا۔ صحافی خاتون صحافی مرد کے ساتھ بیاہی گئی نکاح ہوا مہمانوں کی تواضع چائے سے ہوئی اور رخصتی ہو گئی۔

نزہت اکرام کی خبرگیری کرنے والے ہم بہت تھے۔ اصل میں یہ خبرگیری رانا صاحب سے چھیڑ چھاڑ کا حیلا تھی۔ ''نزہت کو تنگ تو نہیں کرتے نا'' ہر روز کوئی نہ کوئی پوچھ لیتا لیکن رانا صاحب یہ سننے اور کوئی ردعمل ظاہر نہ کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔ کوہستان بند ہوا تو یہ دبستان اجڑ گیا (صحافی موسم خزاں میں درخت سے گرنے والے پتوں کی طرح بکھر گئے اگرچہ ہر اچھے ادارہ کے ارکان ایک ٹیم کی طرح کام کرتے ہیں لیکن کوہستان سے وابستہ یہ قلم قبیلہ تو ایک خاندان کی طرح تھا، مکروہات زندگی نے چھوٹے چھوٹے جغرافیائی فاصلوں کو بھی طویل کر دیا ہے۔ رانا اکرام صحافت میں ذہنی طور پر ظہور عالم شہید اور بشیر احمد ارشد کے قریب تھے کوہستان کی بندش کے بعد انھوں نے نوائے وقت میں لکھا پھر انھوں نے ظہور عالم اور بشیر احمد ارشد سے مل کر ''جاوداں'' کا ڈول ڈالا۔ یہ ایک انتہائی معیاری اور متین اخبار تھا مندرجات کا معیار اعلیٰ اور منفرد تھا۔ اسے کارکن صحافیوں کا پہلا اخبار قرار دیا گیا لیکن نظریاتی اور کہنہ مشق صحافی ''مارکیٹنگ'' کے ماہر نہیں تھے۔ کاروباری دنیا میں ''مقابلہ'' میں استعمال ہونے والے ہتھکنڈوں سے ابھی بے خبر تھے۔ حکومت کو بھی یہ اخبار بری طرح کھٹکتا تھا۔ چنانچہ کئی عوامل اس کے خاتمے کا باعث بن گئے۔ ظہور عالم شہید اور بشیر احمد ارشد تو اپنے پہلے ادارہ میں واپس چلے گئے ''جاوداں'' ۲۱ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو منظر عام پر آیا اور دسمبر ۱۹۷۱ء میں نابود کر دیا گیا۔

رانا صاحب کی صحافتی زندگی کے مشکل ترین سال ۱۹۷۴ء تا ۱۹۷۶ء تھے جب وہ استقلال

نکالتے تھے پاکستانیت اصول پسندی اور اسلامی نظریہ سے وابستگی کے لیے اس دور کی فضا خاصی ناسازگار تھی اس دور میں کئی اخبارات پر وار ہوئے۔ کئی صحافیوں کی پکڑ دھکڑ ہوئی مجیب الرحمن شامی، الطاف حسین قریشی، حسین نقی اور کئی اور زیر عتاب آئے رانا صاحب بھی گرفتار ہوئے اور ان کو ہتھکڑی لگا کر لے جایا گیا جس پر وکلاء نے احتجاج کیا کہ یہ کوئی مجرم تو نہیں کو ہتھکڑی لگائی گئی پھر مجسٹریٹ نے ہتھکڑی کھلوا دی۔ لاہور سے پکڑ کر شاید کوہاٹ لے جایا گیا بعض بزرگ انھیں اعتدال کا مشورہ دیتے رہے اور یہ کہتے رہے کہ پاکستان کے معاملہ کا ٹھیکہ تم ہی نے نہیں لے رکھا ہے۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ مرحوم نے نزہت اکرام سے بھی کہہ دیا تھا کہ مجھے آپ کے رانا صاحب شاہی مہمان بنتے نظر آتے ہیں۔ جتنی اچانک ان کی گرفتاری تھی اتنی ہی اچانک رہائی تھی۔ غالباً کسی سطح پر یہ احساس ہوگیا کہ یہ درویش جھکنے یا بکنے والا نہیں ٹوٹ گیا تو مسئلہ بن جائے گا۔ بہر حال پرچہ کی بندش تو بدیہی امر تھی۔ اس کے بعد ۱۹۸۹ء میں انھوں نے ''ثالث'' جاری کیا۔ یہ ہفت روزہ بھی ڈیڑھ دو سال چلا بعد ازاں انھوں نے کسی اخبار کی فرمائش پر بھی کبھی کبھی لکھا اس کے بعد رانا صاحب کا زیادہ آنا جانا چودھری محمد الیاس کے دفتر تک مشاورت کے لیے بہت رہا۔ ان کے مشورے بہت دقیع ہوتے تھے جن سے اپنے پرائے بھی فیض یاب ہوتے رہے۔

سابق لارڈ میئر آف لاہور چودھری محمد حسین مرحوم کے صاحبزادے چودھری محمد الیاس کا صحافت سے کچھ نہ کچھ تعلق ہے۔ ان کے والد مرحوم ایک زمانہ میں پی پی ایل کے مینجنگ ڈائریکٹر رہے تھے رانا صاحب کو شاید چودھری محمد الیاس کی نیک نیتی سادگی اور انسانیت بھا گئی تھی یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ چودھری صاحب نے کسی طور رانا صاحب کو قابو کر رکھا تھا اور ان کے توسط سے اپنے ہاں مجلس آرائی کا اہتمام کر لیا تھا۔ بلاشبہ اکرام رانا یا ان کے صحافی ساتھیوں ظہور عالم شہید اور بشیر احمد رانا ایسے لوگوں کے لیے عہد ساز شخصیت ''عظیم صحافی'' ایسے الفاظ استعمال نہیں ہو سکتے مگر کوئی ان کی تحریروں یکجا کرے تو ان میں نظریہ، جذبہ، مقصدیت، خلوص، اسلوب اور بے خوفی کا امتزاج ملے گا جو آج ناپید ہے، یا پھر کم ہے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اکرام رانا اور ڈاکٹر نزہت اکرام نے وقت کا دھارا بدل دیا۔

صحافت شخصیات اور حوادث کے گرد گھومتی ہے شخصیات کو اتفاقات مال و زر اور طاقت نمایاں کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نزہت اکرام نے زمانہ کی روش کے خلاف چل کر اکرام رانا کو رفیق حیات بنایا۔ وہ مطمئن تھیں کہ انھوں نے اپنے عمل سے وہ کچھ کر دکھایا جو وہ کرنا اور دیکھنا چاہتی تھیں رانا صاحب کی ساری زندگی ساری مساعی ڈاکٹر نزہت اکرام کی آرزوؤں کے مطابق تھی۔

ایک منحنی سا انسان کتنا متحرک تھا۔ ایک ہی دن میں بہت سے کام کر لیتا تھا۔ بہت سے لوگوں سے مل آتا تھا، کچھ کو اپنے ہاں بلا لیتا تھا۔ زیادہ گفتگو ٹھیٹ پنجابی میں کرتا لیکن گفتگو میں

اردو اور انگریزی اقوال اور علامہ اقبال کے اشعار بکثرت استعمال کرتا تھا۔ اس کی اپنی ایک خاص لغت تھی اس کے رسائل میں جو تحریریں فرضی ناموں سے چھپتی تھیں جاننے والے پہچان لیتے تھے کہ تحریر کس کی ہے مجلس سازی ایک فن ہے اور مجلس ایک معاشرتی ضرورت رانا صاحب مجلسی انسان تھے۔ خاص احباب کی مجلس میں خوب چہکتے اور چمکتے تھے جملے کستے بھی تھے اور ہنستے بھی تھے۔ ٹیلی ویژن نے گھر میں داخل ہو کر مجلسی زندگی میں نقب لگائی ہے لیکن یہ لوگوں کو وہ کچھ نہیں دے پاتا جو ان کو مجلسوں میں ملتا تھا۔ چنانچہ انسانوں کی زندگی میں تنہائی بڑھی ہے اور اس نے گوناگوں مسائل پیدا کیے ہیں۔

ڈاکٹر نزہت اکرام کو علالت نے چلنے پھرنے کے قابل نہیں چھوڑا۔ رانا اکرام زندہ تھے تو وہ ڈاکٹر نزہت کے حصہ کی نقل و حرکت بھی کر لیتے تھے احمد اکرام ابھی بچہ ہے لیکن اسے یہ احساس ضرور ہے کہ اس کے ''ماں باپ'' نے ناسازگاریوں اور ناموافقتوں کے خلاف کس طرح کتنی طویل جدوجہد کی، مال و زر کو کبھی مقصد حیات نہیں بنایا۔ دنیا سے لیا بہت کم اور دنیا کو دیا بہت زیادہ۔

نوائے سروش

اس جگر کاوی کا اندازہ عام لوگ نہیں لگا سکتے۔ ان کے سامنے شعر بنا بنایا آ جاتا ہے۔ وہ اس روحانی اور لطیف کرب سے آشنا نہیں ہو سکتے۔ جس نے الفاظ کی ترتیب پیدا کی ہے۔ جہاں اچھا شعر دیکھو سمجھ لو کہ کوئی نہ کوئی مسیح مصلوب ہوا ہے۔ اچھے خیال کا پیدا کرنا اوروں کے لیے کفارہ ہوتا ہے۔

اقتباس از مکتوب علامہ اقبال بنام گرامی۔ ۲ دسمبر ۱۹۱۸ء

ادیب سہیل

عراق کے لوگو

عراق کے لوگو
ہم تمہارے دکھوں کو محسوس کر رہے ہیں
سقوطِ ڈھاکا کے وقت ہم پر بھی
دُکھ کے اُڑتے پہاڑ ٹوٹے تھے
ہم بھی ایسے ہی خوں کے دریا کو پار کر کے
اِدھر اُدھر منتشر ہوئے تھے
حیات اور موت میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہا تھا
نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کا سا سماں تھا
جدھر سماتا تھا سینگ اس سمت بھاگتے تھے

عراق کے لوگو
ہم شب و روز تم سے اخبار اور ٹی وی کے راستے سے — جڑے ہوئے ہیں
تمھارے غم کو ہم اپنے غم کے قریب تر کر کے دیکھتے ہیں
ہم اپنے احساس کی بدولت
نجف میں، بصرہ میں اور بغداد میں بھی خود کو
تمھارے ہم شانہ پا رہے ہیں
ہمارے اندر جو کرب پیدا ہوا ہے
وہ اقتضا ہے انسان دوستی کا

عراق کے لوگو
تم جہاں بود و باش کرتے ہو صدیوں، قرنوں سے
دیوتاؤں کی
تاج داروں کی

حکمرانوں کی
منفعت کوش طبقہ داروں کی سرزمیں ہے
یہاں بہت سی قدیم تہذیبوں کی ہزاروں نشانیاں ہیں
فرات و دجلہ کی وادیوں میں بہت سی تہذیبیں
بابلی اور اشوری چہرہ کشا ہوئی تھیں
جہاں کبھی حکمراں حمورابی اور بختِ نصر کا چرچا تھا
المیۂ کربلا یہیں رونما ہوا تھا!

عراق کے لوگو
کوئی حجاج ہو یا صدام
انھیں تو نشہ تھا ملک گیری کا
نہتے لوگوں پہ اپنی شمشیر سونتنے کا
اور ان کے زعم و ہوس کا ہاتھی
کچلتا پھرتا تھا اپنی مٹی کے ہر کہہ و مہ کو
صدا بہ صحرا تھا آن کی فریاد کا مقدر
تمھارے اوپر طویل عرصے سے غلبہ دجّال فکر کا ہے
انھیں کے کارِ عبس سے ملتی رہی سزا ہائے بے پناہی
انھیں کے پیروں تلے دبے آرہے ہو صدیوں سے
اور آواز پر تمھاری لگا ہے قدغن
پلٹ کے دیکھا نہ اِن گراں گوش آمروں نے
تمھاری جانب
کہ کس اذیت میں مبتلا جیتے آرہے ہو،
شروع دن سے

عراق کے لوگو
روز اوّل سے تم عقائد کے تفرقے میں پھنسے ہوئے ہو
سنا گیا ہے کہ سارے ادیان، سب صحائف
دیار و امصار میں تمھارے

درود کرتے رہے ہیں،
سکھ چین اور آرام بانٹنے کو
مگر یہاں تو عجب ہے عالم
شجر کا سایہ جو سب میں آرام بانٹنے کا ہے اک ذریعہ
اسے بھی اب شاخ شاخ کرنے کی
اندرونی، بیرونی سازش کا کھیل جاری ہے ایک عرصے سے
تمھیں تو چلنا تھا خاص دھارے میں
اور تم شاخ شاخ ہوتے رہے ہو اب تک
کسی بھی صورت میں خاص دھارے سے
خود کو رکھنا کشیدہ یا اُس سے کٹ کے رہنا
تباہ کاری کا پیش خیمہ!
یہی تمھاری ہر اک خرابی کی اصل ہے
تم بدن سے یہ خرقۂ قدیمی اُتار پھینکو
تمھارے اندر جو نزع گھڑنے کے ڈھونڈتا رہتا ہے بہانے
بقا تمھاری ہے ایک رہنے میں
کسی بھی حالت میں تم دوئی کا نہ راگ الاپو
کسی صحیفے میں اک ورق کے ہو صفحے دو کی مثال تم - اور
اِسی صداقت کو جسم و جاں کا لباس جانو
نفاق کرب و بلا کا
اور تمھارے اندر دوئی کا جذبہ ہے سانپ جیسا

عراق کے لوگو
تمھاری یہ بے پناہ دولت! ''طلائی ساگر''
تمام تر اندورن و بیرون خرخشوں کا سبب بنا ہے
تمام حارص
تمھاری جانب حریص نظروں سے دیکھتے ہیں
سرشت جن کی ہے غاصبوں کی

اگر جو بس ان کا اس پہ چلتا
اٹھا کے لے جاتے اپنے گھر یہ "طلائی ساگر"
تمھاری مٹی کی شاہ رگ میں جو خوں کی صورت رواں دواں ہے
مگر یہ بس میں نہیں ہے اُن کے
تمھارے اندر کے ہوں کہ باہر کے جو بھی حارص
کڑی نظر ان پہ رکھو
دشمن ہیں دونوں ہی خواہ اپنے کہ غیر ہوں
دشمنی کے چہرے ہیں ایک جیسے—
یہ جان بل اور سام کے ہیں قدیمی چیلے—
قیامِ اسرائیلی حکومت کا شرقِ اوسط میں
بل کی اور سام کی اِک ملی بھگت ہے
ازل سے ان کی نگہ میں ہیں
تیل کے یہ سارے عرب علاقے
شروع دن سے ہی دیکھتے آرہے ہیں
قبضے کا خواب ان پر—

عراق کے لوگو
مآل اس حرص کا ہے—
امریکنوں کا تم پر یہ تازہ حملہ
تمھارا جارج
تمھارا دشمن تمھارا جلّاد
زعم میں برتری کے آفاق میں تمھارے ہوا بھی داخل
زمیں پہ دوزخ کے کھیل برپا کیے بھی
بغلیں بجائیں بھی تالیاں بھی پیٹیں
پر اُس کی دانش میں ادنیٰ سے بات کیوں نہ آئی
کہ غیر دھرتی پہ اُس کے بمبار آتشیں کھیل کھیل سکتے ہیں
اُن کے لوگوں کو اور املاک کو—

جلا کر سیاہ و برباد کر بھی سکتے ہیں
فتح کا خواب—
اس زمیں پر تبھی ہے ممکن
جب اس کے لاکھوں کڑوروں اذہان بھی ہوں
——مفتوح!

نتیجہ اِس سارے جارحانہ عمل کا نکلا
عراق پر جنگ امریکا نے جو کی مسلّط
وہ اِس تسلّط سے، اِس تشدد سے
ساری دنیا میں ساکھ ہارا ہے
—امن ہارا ہے

عراق کے لوگو
تم اکیلے نہیں ہو
تمھارے جارح نے جو روا رکھا ظلم تم پر
تمام عالم خلاف ہے احتجاج برلب
ہدف ملامت کا اس کے باعث——
——وہ ساری دنیا میں بن رہا ہے
وہ لاکھوں ہی ہم وطن کی نظروں میں گر گیا ہے
مطعون ہر لمحہ ہو رہا ہے
گڑھا جو اُس نے عراقیوں کے لیے——
زعم میں ہے کھودا
دہانہ اُس کا کھلا ہوا ہے خود اس کے آگے
ہزاروں ہی دلدلوں کا جیسے ہو ایک دلدل
اور پیش ہے خود کیے کا مشکل ترین لمحہ
اور جارحیت
نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن کے مرحلے میں
کھڑی ہوئی ہے

خلیل جبران

تمھارے پاس تمھارا لبنان اور میرے پاس میرا لبنان

لبنان کے مایہ ناز فرزند عظیم ادیب، مصور اور شاعر خلیل جبران نے یہ انسانیت نواز نظم جنگ عظیم اول کے بعد ۱۹۲۰ء کی دہائی میں تخلیق کی، اس منظوم شاہکار کا ہر لفظ آج مظلوم مگر بہادر لبنانیوں کے حوصلوں کا عنوان لگتا ہے

تمھارے پاس تمھارا لبنان اور اس کی
پس پیش
میرے پاس میرا لبنان اور اس کا حسن
تمھارا لبنان اہل مشرق و اہل مغرب کا
ایک اکھاڑا
میرا لبنان صبح سویرے پھڑ پھڑاتے
پرندوں کا ایک غول
جب چرواہے ریوڑ لے کر چراگاہ کو
چل پڑیں
شام ڈھلے جب دہقان اپنے کھیتوں
سے واپسی کی راہ لیں
اور پرندوں کے یہ غول بھی واپسی کی
اُڑان بھریں
تمھارے پاس تمھارا لبنان اور اس کے
لوگ

میرے پاس میرا لبنان اور اس کے لوگ
تمھارے پاس وہ روحیں جو پیدا ہوئیں
مغرب کے اسپتالوں میں
وہ ایسے جہاز جن کی کوئی پتوار نہیں
جیسے بپھرے سمندر پہ بادبان
وہ تنومند اور شیریں زبان مگر
اہل یورپ کے ہاں کمزور و بے زباں
وہ حریت پسند، مصلح اور بہادر
مگر صرف اپنی زمیں پر
وہ ڈرپوک، ازل سے جنھیں اہلِ یورپ
دھکیلیں
ان کا مینڈکوں کی مانند ٹرٹرانا، شیخی
بگھارنا
کہ ازلی دشمن سے جان چھوٹی
سچ تو یہ ہے کہ وہ جابر و ظالم

آج بھی ان کے اندر روحوں میں چھپ
کے بیٹھا ہے
وہ ایسے غلام جن کی زنجیروں کی چکا چوند
وقت نے زنگ آلود کر دی تو وہ سمجھے
وہ آزاد ہو گئے ہیں
یہ تمھارے لبنان کے بچے!
کوئی ان میں ایسا بھی ہوگا جو
لبنان کی چٹانوں کی بلندی کو چھو سکے؟
جو اس کے پاک پانی کی لطافت اور
ہوا کی مہک
اپنے کردار میں دکھا سکے؟
کوئی تو کہہ دے کہ جب میں مرا تو
میرا وطن اس سے بہتر تھا جب میں پیدا
ہوا
کون ہے جو اس اظہار کی جرأت
کرے کہ
میری ہستی لبنان کی رگوں میں خون کا
قطرہ
اس کی چشم تر کا ایک آنسو
اس کے لبوں کی ایک مسکان تھی
وہ تمھارے لبنان کے بچے!
تمھاری نظر میں وہ معتبر ٹھہرے مگر
میرے لیے وہ کچھ نہیں ہیں

آؤ کہ میں بتاؤں
میرے لبنان کے بچے کون ہیں
وہ کسان جو کھیت کو سبزہ و گل میں بدل
ڈالیں
وہ چرواہے جو حسیں وادیوں میں اتر کر
تمھارے دستر خوان کی خاطر
تمھاری اون کی خاطر ریوڑ پال لیتے ہیں
وہ مزدور جو انگوروں کو شراب میں بدل
ڈالیں
وہ ماں باپ جو نرسریوں کے نگراں ہیں
وہ مائیں جو بچوں کو سہانی لوریاں سنائیں
وہ خاوند جو گندم کی فصل اُگائیں اور
بیویاں جن کی اناج کی بالیاں اُٹھائیں
وہ معمار و کمہار، جولاہے اور گھنٹی ساز
وہ شاعر جو ہر نئے جام میں اپنی روح انڈیلیں
وہ بے گھر جو ہجرت کو نکلیں تو دلوں میں
عزم و ہمت اور دست و بازو جن کے
ساتھ ہوتے ہیں
مگر جب لوٹتے ہیں تو ان کے ہاتھوں
میں دولت
اور سروں پر شان و شوکت کے تاج
ہوتے ہیں
وہ جہاں جائیں فاتح ہو کے رہتے ہیں

محبت ان کو ملتی ہے جہاں مقیم ہو جائیں
جہاں بھی ٹھہریں وہ محترم کہلائیں
وہ کٹیا میں ہوئے پیدا مگر
لازوال درسگاہوں میں امر ہو گئے
یہی لبنان کے بچے ہیں!
اس چراغ کی مانند جو ہوا سے بجھ نہیں سکتا
وہ ایسے نمک کی طرح جو صدیوں تک
پگھلنے نہ پائے
جو بڑی ثابت قدمی سے بڑھ رہے ہیں
جمال وکمال اور صدق وصفا کی جانب
مجھے بتاؤ کہ اس صدی کے آخر میں
تمھارا لبنان کیا ہوگا؟
ماسوا شیخیوں اور حماقتوں کے
کیا تم توقع کرتے ہو کہ زمانہ اپنی یاد میں
مکر وفریب اور دھوکہ وعیاری کو سمیٹ
رکھے گا
کیا تم سمجھتے ہو زمانہ موت کے سائے
قبروں کی سڑاند اپنے پاس سنبھال رکھے گا
کیا تم یقین رکھتے ہو کہ زندگی اپنے لیے
ایک تار تار لباس قبول کرلے گی
مگر حقیقت تو وہ ہے جو
میں تم سے کہہ رہا ہوں
لبنان کے پہاڑوں میں اُگنے والا
زیتون کا پودا تمھارے سب خیال واعمال
پر سبقت لے جائے گا
لبنان کی سرزمین پر شگاف ڈالتا وہ ہل
جسے بیل کھینچتے ہیں
وہ تمھاری خواہشات سے زیادہ عالی
شان ہے
اب جبکہ دنیا کا ضمیر مجھے سن رہا ہے
تم بھی میری بات سن لو
لبنان کی وادیوں میں پھول چنتی دوشیزہ
کے گیت
اس پر سبقت لے جائیں گے
تمھارے درمیان
سب سے بڑا جو فضول گو ہے
میں تم سے یہ بھی کہہ رہا ہوں
تم کچھ نہیں پاسکو گے
اگر تم جان سکتے ہو
کہ تم جو سمیٹ رہے ہو
وہ کچھ نہیں ہے
تو میں تم پہ افسوس کرتا
مگر تم یہ نہیں جانتے ہو
تمھارے پاس تمھارا لبنان اور
میرے پاس میرا لبنان

☆☆☆

صلاح الدین ایوبی ۔ لاہور

بالاکوٹ میں ایک والنٹیر کی خود کلامی

مجھے یہ وہم ہے
اک بار پھر سے
کہ یہ ننھی سی باہیں بھی
مری بانہوں سے پھسلی جا رہی ہیں

مجھے یہ وہم ہے
خوشبو بھری سانسیں
بہت زیروزبر ہیں

مجھے یہ وہم ہے
ہنستی ہوئی آنکھیں
بہت حیراں، بہت ویراں
بہت گہری سی ہوتی جا رہی ہیں

مجھے یہ وہم ہے
میرے جنوں کی کاوشِ پیہم،
مری انسانیت سے بے غرض الفت کا یہ بندھن
بھلا کس طرح سے
اِک رشتۂ جاں کو بچائے گا

مجھے یہ وہم ہے
آہیں کہیں پاتال سے آنے لگی ہیں
کراہیں، سسکیاں
مدفن میں اتری جا رہی ہیں
بھلا کب تک۔۔
اسی ملبے،
انہی یخ بستہ خیموں کی
ہلاکت آفرینی سے

انہی معصوم جسموں
اَدھ کھلی کلیوں، بکھرتی پتیوں کو
گود میں لے کر سمیٹوں گا،
کسی بے نام ٹیلے میں اتاروں گا!

بھلا کب تک۔
خدایا!
اب کسی کے لمس کی برفاب لہریں
مری سسکارتی،
جلتی رگوں کو منجمد کر دیں
مرے جینے کو مجھ سے چھین لیں
یا پھر۔

مجھے یوں حوصلہ دے دے
کہ اس شہرِ فغاں کے باسیوں کے
درد کا درماں بن جاؤں
انہی وحشت زدہ گلیوں
شکستہ بام و در کے درمیاں
دستِ جنوں میں
تیشۂ فرہاد کی صورت،
ادھر میں ہوں،
اُدھر اک خود فراموشی کا عالم ہو
ہر اک بکھرا ہوا منظر
مرے ہاتھوں سے پھر ترتیب پا جائے
ہر اک اُجڑی ہوئی بستی
مرے ہاتھوں سے پھر تعمیر ہو جائے

گلشن کھنہ، ہونسلو، برطانیہ

گیت

جب سے بھئے پردیسی سجنا آنسو میت بنائے
من میرا گھبرائے نِس دن من میرا گھبرائے

میں پگلی تھی تن آنگن میں پیت کے دیپ جلائے
لُٹ گئیں آشاؤں کی کرنیں دکھ بدرا گھر آئے
آشا بھئی نراشا اب دھیرج کون بندھائے
آجا سجنا رُوپ دھوپ کا موسم بیتا جائے
من میرا گھبرائے نِس دن من میرا گھبرائے

مجھ کو کب راہ ملی جیون کے ان سپنوں کی
راکھ سے اڑتی جاتی ہے تیری ہی اب یادوں کی
سگری رینا میں نے سجنا چھم چھم نیر بہائے
من میرا گھبرائے نِس دن من میرا گھبرائے

جلنے لگی ہے میری وفا تو آس نراس کی لو میں
اُس پت جھڑ کو کیا کہیے جو آئے وسنت رتو میں
بھری جوانی میں یہ برہا اب تو سہی نہ جائے
من میرا گھبرائے نِس دن من میرا گھبرائے

☆☆☆☆☆

ناصر شہزاد، اوکاڑہ، پاکستان
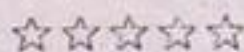
گیت

کھڑے ، چرائیں گیاں
دودھ کے اوپر چاٹی
مرغابی پر کاٹی
اُڑے ڈوپٹہ میرا بکری کھینچے کھونٹی
ڈھونڈے رستہ تیرا جھنکے جھانجھ ، جھنجھوٹی
اُڑے ڈوپٹہ .... بارش ، گرتی بوندیں
آنگن میں لہرائے ہاتھ سے اکھیاں موندیں
دوار کی جانب جائے منٹو ، عصمت ، بیدی
کتا دیکھ کے چونکے انتر گھٹ کے بھیدی
کھول کے جبڑے بھونکے اکھر ، شبد ، عبارت
میا منہ بسوریں بلحا باجھ اکارت
بابا بیٹھے گھوریں پیاس نے تن من گھیرا
ندی کے کنارے سیاں اُڑے ڈوپٹہ ....

عبدالاحد سازؔ، ممبئی

انتظار باقی ہے!

کانپتی ہیں ہونٹوں پر
کتنی اَن کہی باتیں
گونجتے ہیں کانوں میں
کتنے اَن سنے نغمے
جاگتے ہیں پلکوں سے
انگلیوں کے پوروں تک
خواب کتنے اَن دیکھے
لمس اَن چھوئے کتنے
نام ہے طلب جس کا:
مستقل حرارت ہے
حسرت وتمنا کے
آنسوؤں سے نم لیکن
اَن بجھے شراروں کی
دائمی مسافت ہے
بے بس آرزوؤں سے
درد کی رسائی تک
قید سے رہائی تک

دھڑکنوں کی سرحد کے
اس طرف بھی امکاں ہے
جان وتن سے باہر بھی
زندگی فروزاں ہے

آنکھ جم بھی جائے تو
سانس تھم بھی جائے تو
دل کے تہہ نشیں جذبے
روح میں پنپتے ہیں

عمر صرف مہلت ہے
عشق لمحۂ دائم
اعتبار باقی ہے

میرا غم سلامت ہے
تیرا حسن ہے قائم
انتظار باقی ہے!

اوریا مقبول جان، لاہور

محبت مختصر بھی ہو

محبت مختصر بھی ہو
تو اس کو بھولنے میں عمر ساری بیت جاری ہے
وہ چہرہ بھول جاتا ہے
مگر دل کے دریچے پر دھری
اُس شوخ کی آنکھیں
گزشتہ عمر کے دامن سے لپٹی
لمس کی مُہریں
کچھ ایسے ثبت ہوتی ہیں
کہ ان کو بے مروت موسموں کی بارشیں
بھی دھو نہیں پاتیں

وہ سرگوشی کے لمحے گونجتے رہتے ہیں کانوں میں
کسی کے عشق میں ڈوبی ہوئی راتوں کی بے خوابی
کسی کی یاد میں الجھی ہوئی بے چینیوں میں
خواب کے جھونکے
یہ سب سامانِ حیرے ساتھ رہتا ہے
وہ وقفِ انتظار یار کی لمبی مسافت
ساتھ چلتی ہے

کہ ڈھلتی عمر کی بڑھتی ہوئی

ہر منزل بے کیف
اک ایسی قیامت ہے
کہ جوں جوں عمر بڑھتی ہے
گزشتہ زندگی کے سب ورق
آنکھوں کی دہلیزوں پہ آ کر بیٹھ جاتے ہیں
انہیں کتنا مناؤ، ان سے آنکھیں پھیر لو
پھر بھی
کسی بچے کی صورت بس اُسی دہلیز سے
لپٹے ہوئے
آنکھوں کے رستے
روزنِ دل میں اترتے ہیں
جہاں پر وقت کی مٹی کے پردے میں چھپے
کچھ زخم اب بھی بول اٹھتے ہیں
بھلانے سے، منانے سے، چھپانے سے
نہ ان کا درد گھٹتا ہے نہ ان کو چین آتا ہے
منانے بھولنے کی اس کشاکش میں
یہ عمر بے مروت بیت جاتی ہے
محبت مختصر بھی ہو۔۔۔۔۔

☆☆☆☆☆

ستیہ پال آنند، امریکہ

جسم کے دو روپ

پہلا روپ

جسم خود کو بانٹتا ہے
اپنی حدت، اپنی خنکی
لمس کی نرمی، تنفس کی حلاوت
بانٹنے کی نعمتیں ہیں
جسم اپنے چاہنے والوں میں یہ سب
نعمتیں تقسیم کرنا جانتا ہے
مختلف وقفوں میں اپنے ہاتھ کو کچھ روک کر پھر
جسم اپنی قوتوں کو
مجتمع کرتا ہے پھر سے بانٹنے کو
لینے والے ہاتھ پھیلائے بدن کے
رزق کی خیرات لینا چاہتے ہیں
جسم کی صحت بھی اس پر منحصر ہے
خود کو رزق خیر کی مانند بانٹ!

دوسرا روپ

جسم خود میں مجتمع ہو کر ہی جینا چاہتا ہے
نعمتیں ساری ہیں اس کے پاس، لیکن
بانٹنے کو کچھ نہیں ہے

اک خزینے یا دفینے کی طرح ہی
دفن رہنا اس کی قسمت میں لکھا ہے
دھوپ کی جاں بخش حدت یا ہوا کی نرم خنکی
اس کی قسمت میں نہیں ہے
جسم ہر پل تھوڑا تھوڑا، ذرہ ذرہ ٹوٹتا ہے
آخرش یہ ڈھیلا ڈھالا
بُھربُھرا مٹی کا تودہ
جسم مر جاتا ہے اپنی موت
اپنے وقت کے آنے سے پہلے

(سوامی ناتھ رجنیش کے ایک پرانے ایڈیشن سے ماخوذ۔ ۱۹۷۷، غیر مطبوعہ)

ترنم ریاض، نئی دہلی

یاسمیع الدعا

(۱)

خالق دو جہاں
میں ہوں واحد وہ تخلیق تیری
جہاں کے بہشت بریں پر
جو مخلوق اشرف کے پھلنے کا موجب بنی

یاعلیم السمیع
جس کی پسلی سے کی تھی مری ساخت
اُس کی رفاقت کی خاطر
وہ تنہا نہ ہو
زیست کی راہ نو پر کہ میں نے بھی تو
دیکھ بن کر زمیں
بخش ڈالا اُسے آسمانوں کا رتبہ
اور اپنی مطیع قوت صبر پر

یاعظیم القوی
اس کے ہی زورِ بازو کو ترجیح دی
اپنے ہر نرم جذبے میں اس کو کیا حصہ دار
اُس کی چاہت کو اپنے پہ حاوی کیا

یاحفیظ الغنی
اس کو اپنا محافظ سمجھنے لگی
رنگ اُس کے رنگی
زندگی اُس کی جی
قادر المقتدر، مالکِ بحر و بر
آج تک اس کا گھر
گھر اسی کا رہا
درد میں نے سہے
نام اس کا ہوا

(۲)

یا نصیر الوفی

بن کے دختر کبھی

گود میں کھیل کر

شفقتِ پدرانہ کی تشفی کی

اس کی خدمت، اطاعت

صبح و شام کر کے

سجایا سنوارا جو گھر میں نے تھا

وہ مرا گھر بھی میرا نہیں اور میں

دوسروں کی امانت پکاری گئی

یا متین البدیع

خواہرانہ محبت سے مغلوب ہو کر

میں اس پر ہر اک شے لٹاتی گئی

گر تھا چھوٹا تو ماں کی طرح خواہشیں

اس پہ قربان کر کے مناتی خوشی

پھر بھی دل میں جگہ مجھ کو اس نے نہ دی

یا مُمیت المحی

جنم جس کو دیا اِتنے ارمان سے

خود کو ٹکڑے کیا، بوجھ کر جان کر

مجھ کو ان رت جگوں کو ملے کچھ صلہ

ٹوٹ جائے نہ الفت کا یہ سلسلہ

ہے یہی ایک جذبہ کسی طرح قائم

اسی ایک رشتے پہ ہے کچھ یقیں

تیرا تبدیل ہوتا ہوا یہ جہاں

یوں نہ ہو جائے اس کو بدل دے کہیں

خوں نہ ہو جائے جذبات کا دیکھنا

آس تیرے کرم کی میں کھو دوں؟

نہیں!

یا سمیع الدعا، یا سمیع الدعا

یارب العالمیں یارب العالمیں

☆☆☆

بشریٰ اعجاز

لمحوں کے رجسٹر میں !!

رات میرے شہر میں
تین موتیں ہوئیں
ایک میرے دل کی
ایک اس محبت کی
جس کی قسم
زمانے نے نہیں،
تم نے کھائی تھی
اور ایک موت
بے موت مرنے والے
اس نوجوان کی ہوئی
جو گھر سے نور پیرو لیے
ڈگریوں کی گٹھڑی اٹھا کر نکلا
اور شام سے پہلے
گھر واپسی کا راستہ بھول گیا
اس کی بوڑھی ماں اور چھوٹا بھائی
فاقے پیٹ پر باندھے
گلی کی نکڑ پر

کھڑے کھڑے سایہ بن گئے
سایوں نے دیکھتے ہی دیکھتے
رات کا کفن پہن لیا
اس رات کا
جس میں پہلے تین موتیں ہوئی تھیں
پھر کتنی ہوئیں
یہ گنتی نہ ہو سکی
اور لمحوں کے رجسٹر میں صفحے کم پڑ گئے!!

ابھی ناراض ہے موسم

ابھی ملنے نہیں آنا
غضب آثار ہیں بے حد
ابھی بارش میں ہے جاناں
جو دریا کی سی طغیانی
اسی بارش سے حائل ہیں
ابھی کچھ دوریاں جاناں
مگر یہ جان لو تم بھی
تمھاری عافیت سے ہے عبارت زندگی میری
مجھے کیونکر گوارا ہو کہ تم پر کوئی آنچ آئے
ہیں یہ بھی مسئلے دل کے
یہ پاگل پن محبت کا
یونہی مجبور کرتا ہے
ہمیں جن سے تعلق ہو، تعشق ہو، تملق ہو
انھیں ہم سامنے پائیں
مگر موجودہ صورت میں
تم اس سنگین بارش میں
لیے جذبوں کو، چاہت کو

ابھی ملنے نہیں آنا
اگر ہے زندگی باقی
ملیں گے ہم دوبارہ بھی
گزر جائے گا یہ طوفاں
یہ رِم جھم تھم ہی جائے گی
یہی اب میں نے سوچا ہے
مجھے ملنے نہیں آنا
ابھی ناراض ہے موسم

شاہین فصیح ربانی۔ کراچی

ماہیے

ہاتھوں میں لکیریں ہیں
دل کے آئینے میں تیری تصویریں ہیں

چولہے پہ توا رکھنا
دل میں تم اپنے میری یاد سوار رکھنا

پھولوں کی پتیاں ہیں
گوری کے ہونٹوں پر ساجن کی بتیاں ہیں

پُر نور ستارے ہیں
ان شوخ نگاہوں میں اُلفت کے اشارے ہیں

چاہت کا صِلہ پایا
پھولوں کے تحفے میں پیغام وفا آیا

رستوں میں خار ملے

منزل پہ مگر جاناں ہمیں تیرا پیار ملے

کوئی دیپ جلا لینا
نفرت کو فصیح اپنے دل میں نہ جگہ دینا

☆☆☆☆☆

شبیر رانا، جھنگ، پاکستان

ہائیکو

بارش صحرا دھوپ
سے کا سم تو کھا جاتا ہے
چندن جیسا روپ

آہو اور صیاد
ایک درندہ پڑ گیا پیچھے
کون سنے فریاد

ورد ہے صبح و شام
ظالم کا بھی اس جگ میں ہو
عبرت ناک انجام

مت پھرنا دل گیر
ظالم پر بھی لگ کے رہے گی
فطرت کی تعزیر

آندھی اور طوفان
ہر سو موت نے دام بچھائے
سوچ ذرا نادان

دیکھو کرگس، بوم
جہاں تھے سرو صنوبر پہلے
وہاں اُگے ہیں زقوم

کہاں وہ گلشنِ راغ
ویراں باغ میں اب بستے ہیں
کرگس، گدھ اور زاغ

آپس کی باتیں
وقت نے ہم کو دی ہیں وافر
غم کی سوغاتیں

ہر لحہ ہوشیار
آستین کے سانپ ہیں ساتھی
موذی اور مکار

گاؤ نہ دیپک راگ
آس کا گلشن راکھ ہوا ہے
دل میں لگی ہے آگ

کانٹے اور ببول
ایسی بادِ سموم چلی ہے
سوکھ گئے سب پھول

رفو نہ ہوں گے چاک
محسن بن کے آ دھمکے ہیں
ظالم اور سفاک

صحرا، دھوپ، ببول
عہد وفا کو توڑ کے اس نے
آنکھوں میں جھونکی دھول

پڑھ لو استغفار
انسانوں کا قحط پڑا ہے
ساتھی ہیں عیار

دل میں نہیں ملال
شہرِ ستم سے چل دیئے ہم تو
اب یہ سنگ سنبھال

حسرت کی تصویر
وحشی کو اب کون بتائے
انساں کی توقیر

ساون، میگھ، ملھار
طوطا چشم بنے سب ساتھی
وقت آیا دشوار

کیسا تھا وہ شوم
بانسری خوب بجاتا جائے
جلتا رہا جب روم

کیسا قحط الرجال
ڈوم اور ڈھارے بنے علام
جینا ہوا محال

☆☆☆☆☆

شاہدہ لطیف، اسلام آباد

وطن کا نغمہ

اے وطن، اے مری کائناتِ سُخن

تو نہ ہوتا تو کیا میری پہچان تھی
کونسی میری عزّت تھی کیا آن تھی
بن ترے کب جہاں میں مری شان تھی

اے وطن، اے مری کائناتِ سُخن

اے مرے خواب جیسی حسیں سرزمیں
تیری مٹی کے لعل و گہر کے امیں
اپنا ثانی زمانے میں کوئی نہیں

اے وطن، اے مری کائناتِ سُخن

تجھ کو خوابوں کی جنت بنائیں گے ہم
تیری راہوں پہ پلکیں بچھائیں گے ہم
ہر گھڑی گیت تیرے ہی گائیں گے ہم

اے وطن، اے مری کائناتِ سُخن

☆☆☆☆☆

ندیم بنام بھوپالی

۱۲؍دسمبر ۲۰۰۵ء

محترمی و مکرمی محسن صاحب۔ سلام مسنون

یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ علالتوں کے باوجود آپ تخلیقی طور Active ہیں۔ خدا کرے آپ اسی طرح سرگرمِ عمل رہیں۔

جاپانی صنفِ سخن ہائیکو کا مجموعہ پڑھتا رہا ہوں اور یہ سوچ کر تسکین ہوتی رہی ہے کہ آپ نے ''ہائیکو'' کو صحیح معنوں میں سمجھا اور برتا ہے، ورنہ یار لوگ تو ہائیکو کے ساتھ وہ برتاؤ کر رہے ہیں جو پنجابی صنفِ سخن ''ماہیا'' کے ساتھ عالمگیر سطح پر ہو رہا ہے کہ ''ماہیا'' کا سارا حسن زائل ہو چکا ہے اور ماہیا لکھنے والوں کو پروا نہیں کہ اس صنفِ سخن کے موضوعاتی مطالبات کیا ہیں۔

''چیری سے چنبیلی تک'' کا اشتہار آئندہ فنون میں انشاء اللہ ضرور آئے گا۔

مخلص

احمد ندیم قاسمی

غزل — محسن بھوپالی

فردا کی جو نوید ہے سادہ دلی کے ساتھ
طرفہ مذاق ہے خبرِ آگہی کے ساتھ

فاتح سے بڑھ کے لائقِ تحسین ہے وہ شخص
جو مانے شکست کشادہ دلی کے ساتھ

حائل انا کا مسئلہ تھا درمیان میں
مانی ہے اس نے بات مگر بے بسی کے ساتھ

کیا جانے کب یہ رشتۂ انفاس ٹوٹ جائے
کھٹکا لگا ہوا ہے ہمیشہ سبھی کے ساتھ

اب روشنیٔ علم بھی ہے وجہِ اختلاف
جینا بھی اب محال ہوا آگہی کے ساتھ

محسن تمام عمر کا حاصل ہے اس قدر
سود و زیاں کا کھیل ہے کب زندگی کے ساتھ

محسن بھوپالی

⊙

فردا کی جو نوید ہے سادہ دلی کے ساتھ
طرفہ مذاق ہے خبر و آگہی کے ساتھ

فاتح سے بڑھ کے لائقِ تحسین ہے وہ شخص
جو مان لے شکست کشادہ دلی کے ساتھ

حائل انا کا مسئلہ تھا درمیان میں
مانی ہے اس نے بات مگر برہمی کے ساتھ

کیا جانے کب یہ رشتۂ انفاس ٹوٹ جائے
کھٹکا لگا ہوا ہے ہمیشہ سبھی کے ساتھ

اب روشنئ علم بھی ہے وجہ اختلاف
جینا بھی اب محال ہوا آگہی کے ساتھ

محسنؔ تمام عمر کا حاصل ہے اس قدر
سود و زیاں کا کھیل ہے سب زندگی کے ساتھ

ہائیکو ~ محسن بھوپالی

*

پیڑوں کو سینچو
یہ دھرتی کی شہ رگ ہیں
ان کو مت کاٹو!

*

پانی کے قطرے
کھیتوں میں بن جاتے ہیں
گندم کے دانے

*

سوکھے پتوں نے
شاخوں کو خوش خبری دی
کونپل نکلے گی

*

دیکھو پروانے
آپس میں کب جلتے ہیں
مگر مل کر مرتے ہیں

*

گنے کا پودا
مجھ سے باتیں کرتا ہے
کل تھا چھوٹا سا

*

تینوں ہیں مہمان
سرما کی یہ لمبی رات
میں اور آتش دان

*

مل کر سوچیں گے
بیری پکنے والی ہے
پتھر آئیں گے

*

سرسوں پھولے گی
اک لڑکی کھیتوں میں
رستہ بھولے گی

محسن بھوپالی
16 9/6

محسن بھوپالی

ہائیکو

☆

پیڑوں کو سینچو
یہ دھرتی کی شہ رگ ہیں
ان کو مت کاٹو!

☆

سوکھے پتوں نے
شاخوں کو خوش خبری دی
کونپل نکلے گی

☆

گنے کا پودا
مجھ سے باتیں کرتا ہے
کل تھا چھوٹا سا

☆

مل کر سوچیں گے
بیری پکنے والی ہے
پتھر آئیں گے

☆

پانی کے قطرے
کھیتوں میں بن جاتے ہیں
گندم کے دانے

☆

دیکھو پروانے
آپس میں کب جلتے ہیں
مل کر مرتے ہیں

☆

تینوں ہیں مہمان
سرما کی یہ لمبی رات
میں اور آتش دان

☆

سرسوں پھولے گی
الہڑ لڑکی کھیتوں میں
رستہ بھولے گی

ڈاکٹر خالد حمید شیدؔا، ہوسٹن، امریکہ

○

اے برقِ دیدِ یار، شبِ انتظار میں
آ پھر لگانے آگ دلِ داغدار میں

افزوں ہو سوزگر جگرِ لخت لخت کا
شاید قرار آئے دلِ بے قرار میں

ہے مشتِ خاک گرچہ تصور ہے عرش پر
کتنا ہے کبرِ آدمِ ناکردہ کار میں

کہتی ہے خس کہ ہے یہ تلاطم مرے لئے
موجوں کا ہے جو شور، بحرِ بیکنار میں

ہوتا نہیں فنا بھی انا الحق کہے بغیر
کیسا ہے زعم مردم بے اختیار میں

دیوانگی ہے کیسی دلِ بدشعار کی
غم ہے خوشی میں اس کی خزاں ہے بہار میں

شیدؔا ہوا نزار ہے فرقت میں آپ کی
اب لیجئے بلا اسے اپنے کنار میں

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر خالد حمید شیدا، ہوسٹن، امریکہ

○

آپ سا دل سے کبھی کوئی جدا ہوتا ہے
ہنس کے پھر دیکھئے، پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

دل دیوانہ مرا دیکھئے آ کر تو کبھی
دیکھ کر آپ کو کیسے یہ فدا ہوتا ہے

کیجئے آ کے بہاروں میں مسیحائی دل
سبزہ و گل سے مرا زخم ہرا ہوتا ہے

پہلے ہی حشر سے اک وادی خاموشاں میں
آپ آتی ہیں تو اک حشر بپا ہوتا ہے

ناروا سب کو اگرچہ ہے دُکھانا دل کا
آپ کے واسطے لیکن وہ روا ہوتا ہے

شکوہ کرتے ہیں اگر، آپ کو ہوتا ہے گلا
نہ کریں شکوہ تو پھر اور گلا ہوتا ہے

ہوتے محشر میں ہیں سرشار مئے کوثر سے
جن کا پیمانۂ دل غم سے بھرا ہوتا ہے

عشق کرتے ہیں جو مخلوق خدا سے شیدؔا
ایسے عشاق کا مشتاق خدا ہوتا ہے۔

☆☆☆☆☆

مظفر حنفی۔ نئی دہلی

o

نقش پا اس کا بلا سے خاک میں رُل جائے گا
راستا تو گمرہی کے واسطے کھل جائے گا

اک ستارا پھر مری پلکوں پہ ہے آ دیکھ لے
ورنہ یہ بھی آتش سیال میں گھل جائے گا

ہم جو آ بیٹھے ہیں اس دیوار کے سائے تلے
اب ترا سایہ بھی اس دیوار سے ڈھل جائے گا

کیا کریں گے کانچ کی نگری کے باسی، سوچ لیں
سنگ ساری پر ہی دیوانہ اگر تُل جائے گا

کون سا دن ہو گا یا رو جس کی آئے گی نہ شام
کب ہماری زندگی سے یہ تسلسل جائے گا

غم نہ کر رسوائی وغیرت کی باتیں سوچ کر
بے تکلف آئے گا جو بے تامّل جائے گا

اے مظفر تجھ کو اپنے پاس رکھنے کے لیے
اس کا بازو بند بھی محفل میں کھل کھل جائے گا

☆☆☆☆☆
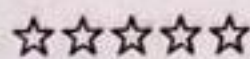
سلطان رشک، راولپنڈی، پاکستان

⊙

مرض اب انتہا تک آ گیا ہے
مسیحا بھی دُعا تک آ گیا ہے

حرم والوں کا دستِ زر طلب اب
غریب و بے نو تک آ گیا ہے

ہمارا جرم ناداری ہے —— وہ بھی
محبت میں ، ریا تک آ گیا ہے

جو سچ بولے ، درِ زنداں بھی کھولے
صحیفوں میں لکھا تک آ گیا ہے

صبا کے دوش پر ، پرواز کرکے
دیا بامِ ہوا —— تک آ گیا ہے

سفر کیسا ہے جاناں ، روشنی کا
تمھارے نقشِ پا تک آ گیا ہے

⊙

اس قرینے سے شعر کاری ہو
ایک مصرعے میں بات ساری ہو

اپنے حصے میں سنگ باری ہو
بزمِ گل سب کی سب تمھاری ہو

اس طرح شاعری ہماری ہو
شعر میں روحِ عصر ساری ہو

لکھ دیا کس نے سب کے چہروں پر
زندگی خوف میں گزاری ہو

اہلِ دل ، اہلِ زر ہیں یوں جیسے
خیر اور شر میں جنگ جاری ہو

ایسا اعزاز کیوں قبول کریں
جس سے توہین کچھ ہماری ہو

سر بزانُو ہو ، اِک پری چہرہ
خوبصورت سی برفباری ہو

کُنجِ تنہائی رشکؔ مل جائے
اور قُربت فقط تمھاری ہو

خالد اقبال یاسر، لاہور

⊙

وہی محمل ہے، لیلیٰ ہے، نیا کیا ہے
وہی مجنوں ہے، صحرا ہے، نیا کیا ہے

وہی گلیاں، وہی طفلانِ آوارہ
وہی پتھر ہیں، پگلا ہے، نیا کیا ہے

وہی ترچھی نظر اس کی، نشانے پر
وہی آنکھیں ہیں، کجلا ہے، نیا کیا ہے

وہی وعدے وفا کے، پیار کی قسمیں
وہی چیچی ہے، چھلّا ہے، نیا کیا ہے

وہی ہے کان کا بیندھا ہوا نرمہ
وہی چاندی کا بالا ہے، نیا کیا ہے

وہی ستواں کسی کی ناک سنبل سی
وہی نگ اور کوکا ہے، نیا کیا ہے

وہی نخرے، وہی ناز و ادا یاسر
وہی منّت ہے، ترلا ہے، نیا کیا ہے

⊙

گھماؤں ہے نہ بیگھہ ہے، نیا کیا ہے
وہی اک آدھ مرلہ ہے، نیا کیا ہے

وہی گھر بے در و دیوار سا میرا
وہی خالی تغارہ ہے، نیا کیا ہے

وہی آبادیاں زیرِ خطِ غربت
وہی صاحب کا بنگلہ ہے، نیا کیا ہے

وہی کوچہ، جہاں جانے پہ پابندی
وہی تیرا محلّہ ہے، نیا کیا ہے

وہی بنسی، وہی تانیں گڈریے کی
وہی بھیڑوں کا گلّہ ہے، نیا کیا ہے

وہی دھرتی بھٹائی کی، بلاول کی
وہی ترخان ہے، سمہ ہے، نیا کیا ہے

وہی یاسر خمارِ دانۂ گندم
وہی آدم ہے، غلہ ہے، نیا کیا ہے

گلشن کھنہ، ہانسلو، برطانیہ

⊙

روش روش پہ کھلے ہیں گلاب زخموں کے
زمانہ دیکھے گا اب انقلاب زخموں کے

افق افق پہ اندھیروں کی حکمرانی ہے
سجائیں اہلِ نظر آفتاب زخموں کے

ملا جو وقت تو سود و زیاں کی سوچیں گے
ابھی تو پیشِ نظر ہیں حساب زخموں کے

کتابِ زیست میں خوشیوں کے بھی حوالے ہیں
مگر جلی نظر آتے ہیں باب زخموں کے

کدورتوں نے فضا میں وہ زہر گھولا ہے
زمانہ بھول گیا ہے نصاب زخموں کے

بہار آئی ہے گلشن میں ہم بھی کہتے ہیں
برستے دیکھے ہیں ہم نے سحاب زخموں کے

⊙

آئینہ سا اُجلا کوئی چہرا نہیں ملتا
آنکھوں میں چمک دل میں اُجالا نہیں ملتا

دعوے تو رفاقت کے سبھی کرتے ہیں لیکن
دیکھیں تو کوئی دوست بھی سچا نہیں ملتا

حق بات نہ سننے کے خطا وار بہت ہیں
مطلب کی جو سُن پائے وہ بہرا نہیں ملتا

قاتل ہے کہ ہاتھ میں اک خوں بھرا خنجر
منصف ہے کہ انصاف کا رستا نہیں ملتا

سینوں میں تو زخموں کے بہت پھول کھلے ہیں
گلشن میں بہاروں کا اشارا نہیں ملتا

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگل پور، بھارت

⊙

دھوپ محل کا راجا سایہ
سر پہ مکٹ ہے اچھا سایہ

نیلا ، نیلا ، اجلا ، کالا
ٹی وی کے گھر چمکا سایہ

جنگل جنگل بھیڑ لگی ہے
تنہا پیڑ کا تنہا سایہ

سورج سر پہ دوڑ رہا ہے
جسم سے نیچے اترا سایہ

اڑ گئی خوشبو گلشن گلشن
پھولوں پر تتلی کا سایہ

رات کا کمرہ کھول کے دیکھا
قید تھا عاشقؔ اپنا سایہ

⊙

جب پرندہ اڑان بدلے گا
دیکھنا آسمان بدلے گا

اپنے اندر کی وادیوں میں گم ہے
کہہ رہا تھا جہان بدلے گا

جگنوؤں کی ضیا سے سورج کا
کیا بھلا خاندان بدلے گا

ہاتھ گیتا پر برہمن رکھ کر
بول کتنے بیان بدلے گا

جہد پیہم کے بعد بھی کیا وہ
ایک ننھی سی جان بدلے گا

وہ سلاخوں میں قید ہے تو مگر
پنچھیوں کی زبان بدلے گا

کون عاشقؔ شناخت کی خاطر
آئنوں کا مکان بدلے گا

اصغر مہدی، کراچی

O

جو نزاکت، جو نفاست تیرے آداب میں ہے
وہ سلاست، وہ بلاغت تیرے القاب میں ہے

تجھ میں اوصاف کچھ ایسے حدِ امکاں میں نہیں
کیا فرشتہ کوئی شامل تیرے احباب میں ہے

سارے آثار تو ساحل کے نظر آتے ہیں
کشتیِ زیست ابھی تک میری گرداب میں ہے

لڑکھڑا جاتا ہوں، لیکن میں سنبھل جاتا ہوں
اتنا دم خم تو ابھی بھی مرے اعصاب میں ہے

عقل و دانش کا ابھی اک فلسفہ ہے اپنی جگہ
ایک تڑپ سب مقدم دلِ بیتاب میں ہے۔

ذوق اپنا ہے، سمجھ اپنی، تصور اپنا
لے وہ بربط میں نہیں، جو زدِ مضراب میں ہے

عشق کے بحرِ طلاطم میں ہوئے ہیں غرقاب
وہ مزا اور کہاں ہے جو غرقاب میں ہے

زندگی اپنی نہیں ہے کہ گزارو تنہا
یہ ہنر، درج سبھی زیست کے ابواب میں ہے

قابلِ رشک یہی بات ہے اصغر مہدیؔ
خوبرو کوئی تو شامل تیرے اصحاب میں ہے

اسلم کولسری۔ لاہور

o

میں شبنم سا اور وہ لمحہ جُوں کانٹے کی نوک
ڈھلتی شام ، سنہرا مکھڑا ، تنہائی ، "بسروک"

بختوں والے چُن چُن لائے معنی کے کھلیان
اور اپنے حصے میں آیا ہے لفظوں کا پھوک

پیڑوں کا پہناوا پہنے بہتی تھی ندیا
ندیا کے اس پار جھمکتی تھی ساجن کی جھوک

آنکھیں پتھر، سوچیں ساکت، سپنے سانپ ہوئے
جب سے بچھڑے شیتل گاؤں کے ٹھنڈے میٹھے لوگ

جانے کیسے بن جاتی ہے دل کا پکا راگ
اس کے شرمیلے ہونٹوں کی رنگی رنگائی ڈھوک

یونہی دھیان میں آتا ہے اور ڈھارس بندھتی ہے
جیسا یہ سنسار ہے پیارے ویسا نہیں پرلوک

شملے والا کھانسے بھی تو اچھل اچھل کر داد
اسلمؔ گیت سنائے بھی تو ڈانٹ ڈپٹ کر ٹوک

☆☆☆☆☆

پرویز مظفر۔ برمنگھم برطانیہ

○

جو چاہتا تھا زمانے سے کس طرح مِلتا
دِوانہ ایک دِوانے سے کس طرح مِلتا

ہماری عمروں نے دیوار سی کھڑی کر دی
نیا مزاج پرانے سے کس طرح مِلتا

ستاروں سے وہ گھرا رہتا ہے خلاوں میں
مجھے پسینہ بہانے سے کس طرح ملتا

سکون اپنے ہی دل میں قیام کرتا ہے
ہمیں پرانے خزانے سے کس طرح مِلتا

ہمیں خبر ہے کہ یکتائے روزگار ہو تم
تمہارا جوڑ زمانے سے کس طرح مِلتا

اثر تو اپنی حکایت میں ہوتا ہے پرویزؔ
کسی کے شعر سُنانے سے کس طرح مِلتا

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی، گوجرانوالہ، پاکستان

⊙

ڈھلک کے گرنے سے یہ دل مرا ڈرا ہوا ہے
چھلکتے اشکوں میں اس نے مجھے رکھا ہوا ہے

غموں کے سارے پرندے ہی اس پہ آ بیٹھے
خوشی کی رت میں ذرا سا جو دل ہرا ہوا ہے

نہیں ہیں بولنے والے جو چار سو اپنے
ہمارے کانوں میں یہ شور کیوں بھرا ہوا ہے

مجھے ملے گا وہ تنکا ہی ناخدا بن کر
مرے لیے کسی طوفاں میں جو بہا ہوا ہے

بجھا سکے نہیں طوفان سیم و زر اس کو
ہوا کے رخ پہ چراغ انا جلا ہوا ہے

مری بھی پہلی محبت تھی صرف یک طرفہ
مرے بھی ساتھ ہوا سب سے جو سدا ہوا ہے

تمھارے پیار کا قرضہ ہے اس قدر دل پر
فقیر دل ابھی قسطوں میں ہی گھرا ہوا ہے

ہے سانس سانس میں خوشبو اسی کی اب سعدیؔ
وفا کا پھول جو دل میں مرے کھلا ہوا ہے

⊙

عہد نو کی بات لکھو
دو اور دو کو سات لکھو

پیسہ ہی اب مذہب ہے
پیسے کی آیات لکھو

ظلمت ہے اب ذہنوں پر
دن کو بھی اب رات لکھو

صبر کا پھل کڑوا لکھو
جیت کو بے شک مات لکھو

کام سبھی جب الٹے ہیں
خوشیوں کو صدمات لکھو

اوروں کو شودر جانو
اپنی اونچی ذات لکھو

حاکم سے تحفہ کیسا؟
رشوت یا خیرات لکھو

لوگ لکھیں کچھ بھی سعدیؔ
تم دل کے نغمات لکھو

شاہین فصیح ربانی۔ کراچی

O

آدمی کس جہاں سے آیا ہے
کیا کسی آسماں سے آیا ہے

دوست بتلائیں گے، مری جانب!
تیر یہ کس کماں سے آیا ہے

دیکھئے! آپ کے فسانے میں
رنگ میرے بیاں سے آیا ہے

یہ جو تارا ہے میری پلکوں پر
پیار کی کہکشاں سے آیا ہے

رُخ ہواؤں کا جان لیتے ہیں
یہ ہُنر بادباں سے آیا ہے

دل میں طوفان چھپا کے رکھ لینا
قلزم بیکراں سے آیا ہے

تند آندھی میں آگے بڑھنے کا
حوصلہ امتحاں سے آیا ہے

سوچتا ہوں، عجب درخت ہے وہ!
رنگ جس پر خزاں سے آیا ہے

الجھا الجھا، اداس اداس فصیح
محفلِ دوستاں سے آیا ہے!

ڈاکٹر نزہت اکرام، لاہور

o

بات میں بات نکلتی ہے کوئی بات نہ پوچھ
سُن شکایات مگر وجہ شکایات نہ پوچھ

تیری محفل میں کہیں بن جائے نہ ماتم خانہ!
اپنی محفل میں غمِ دل کی حکایات نہ پوچھ

سازِ ہستی سے نکلتے ہیں سسکتے نغمے!
مطربِ دہر کی بے کیفیٔ نغمات نہ پوچھ

تازہ غم، تازہ الم، تازہ ستم، تازہ ملال
زندگانی کو ملے کیا کیا انعامات نہ پوچھ

ہے کبھی شوق کبھی یاس، کبھی غم دل میں
میری دنیا کے بدلتے ہوئے حالات نہ پوچھ

چشمِ حق بیں سے ذرا دیکھ لیا تھا نزہتؔ
کیسے اُٹھے تھے حقیقت کے حجابات نہ پوچھ

☆☆☆☆☆

حصیر نوری، کراچی

⊙

عدل جب وقت کے مجرم کو رہائی دے گا
اک نہ اک دن یہاں منظر یہ دکھائی دے گا

میں یہی سوچ کے سوتا نہیں راتوں میں کبھی
پھر مجھے کوئی حسیں خواب دکھائی دے گا

میں بھی ناداں ہوں عبث ذکر وفا کرتا ہوں
شور اتنا ہے یہاں کچھ نہ سنائی دے گا

اس سے بہتر ہے بھلائی نہ کروں میں ورنہ
میری اچھائی کے بدلے وہ برائی دے گا

دیکھ! ہر گام پہ ٹھہرا ہوا سناٹا ہے
ایسا لگتا ہے کہ یہ موڑ جدائی دے گا

کیسی امید ہے ان بجھتی ہوئی آنکھوں میں
کل جو دیکھا ہے وہی خواب دکھائی دے گا

میں تو خود سنگ گراں ہوں رہِ الفت کا حصیرؔ
محفلِ حسن میں اب کون رسائی دے گا

حکیم خان حکیم، اٹک

⊙

دل اُس کی محبت میں ہے بے تاب ابھی تک
آنکھوں میں مچلتے ہیں کئی خواب ابھی تک

حق بات پہ دیتا ہوں سرِ عام گواہی!
خائف ہیں مری ذات سے احباب ابھی تک

کشتی کو سمندر کے حوالے نہ کرو کہ!
ہر سمت چھپے بیٹھے ہیں گرداب ابھی تک

بے چین نظر آتے ہیں گردوں پہ ستارے
کیوں نکلا نہیں گھر سے وہ مہتاب ابھی تک

ہر وقت لگی رہتی ہیں در پر مری آنکھیں
گلشن ہے مری آس کا شاداب ابھی تک

جس شخص کو پوجا ہے حکیمؔ اپنا بنا کر
ہے حسن کی دنیا میں وہ نایاب ابھی تک

طالب انصاری، لاہور

O

مشکل سے خود کو کھینچ کے لایا ہوں اپنے ساتھ
آدھا وہیں پہ رہ گیا آدھا ہوں اپنے ساتھ

دشمن سے نرم لہجے میں کرتا ہوں گفتگو
پھر اس کے بعد خوب جھگڑتا ہوں اپنے ساتھ

منوا لے مجھ سے آ کے جو منوانا ہے تجھے
میں زیادہ تیرے ساتھ ہوں تھوڑا ہوں اپنے ساتھ

اک بار مجھ سے جان مری مانگ تو سہی
چل جائے گا پتہ تجھے کتنا ہوں اپنے ساتھ

پہلے یہ آرزو تھی مرے ساتھ تو بھی ہو
اک عمر سے اب آپ ہی رہتا ہوں اپنے ساتھ

طالب شکست مان کے بیٹھا ہوں اک طرف
قسمت سے میں خفا نہیں روٹھا ہوں اپنے ساتھ

☆☆☆☆☆

کلام شاعر بقلم شاعر

ڈاکٹر خالد حمید شیدا (ایم-ڈی) ہوسٹن، امریکہ

گر وصل نہیں، وصل کا اقرار ہے کافی — مجھ کو تو ترا وعدۂ دیدار ہے کافی

آزاد نہ کر مجھ کو، نہ کر فکر تو اتنی — زنداں میں مجھے روزنِ دیوار ہے کافی

کرتا ہوں طلب میں نہ مسیحائی کسی سے — مل جائے اگر ایک ہی غمخوار ہے کافی

امیدِ شفا کی ہے نہ خواہش ہے دوا کی — مجھ کو تو فقط پرسشِ بیمار ہے کافی

خنجر کی نہ شمشیر کی کوئی ہے ضرورت — مرنے کے لئے اک نگہِ یار ہے کافی

مت بیٹھو یوں آغوش میں اگی کہ مجھے تو — تھوڑا سا ہی اک خدشۂ اغیار ہے کافی

کہتی ہے تو اس سے میں فقط کھیل رہی ہوں — کہتا ہوں میں، دشمن مرا ہشیار ہے کافی

ہے رات جواں، کھینچ نہ یوں ہاتھ کو ساقی — اس دل پہ ابھی غم کا مرے بار ہے کافی

کر اور نہ شیدا ہوسِ گیسوئے جاناں
پہلے ہی سے تو اس میں گرفتار ہے کافی

Nasir Zaidi
GPO Box #.887
Rawalpindi Cantt
Mobile # 0303-6664838
0301- 4096710

اصِر زیدی
ٹ بکس نمبر 887 راولپنڈی صدر

غزل

چشمِ بینا سے بھی جن کو کچھ نہ آتا ہو نظر
عقل کے اندھے اُنھیں سمجھے، نہ سمجھے بے بصر

اِس کو دُنیا کی لُغت میں کیا کہوں؟ قسمت کا پھیر!
کل تلک جو عرش پر تھے، آج ہیں وہ در بدر

جن سے مل کر میں کنارا کش رہا، وہ لڑکیاں
کیسی کیسی بد دُعا دیتی رہی ہیں عمر بھر

جس کی خاطر پائے استقلال بے لغزش رہے
آج تک نظروں میں پھرتی ہے اُسی کی رہگزر

بد نظر لوگوں سے بچنے کے لیے لازم ہے یہ،
اے حسینہ! کچھ تو اپنے حُسن کی خیرات کر!

جس کے سینے میں نہیں حساس دل کی دھڑکنیں
اُس پہ میرے حرف، میرے لفظ، یکسر بے اثر

گھر بسا لو اب نیا تم بھی میاں ناصر کوئی!
اِس طرح سے کب کسی کی زیست ہوتی ہے بسر؟

ناصر زیدی

لاہور، ۱۰ر نومبر ۲۰۰۵ء

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

غزل

الجھ رہا ہے لکیروں میں زاویہ تنہا
بشر بشر کی ہے گردش کا دائرہ تنہا

جیسے سوئے ہیں سبھی خامشی کی چادر میں
ہجومِ شور کے اندر ہے ضابطہ تنہا

کوئی سفیرِ مسافت نہیں تھا کوسوں تک
مرے سمندر سے گزرتا تھا راستہ تنہا

ہر ایک شاخ پہ سہما ہوا پرندہ ہے
یہ موسموں کے تھپیڑوں کا سلسلہ تنہا

تم اپنا عکس تو آنکھوں میں میری رکھ نہ سکے
بجھاتا پیاس کہاں تک وہ تشنہ تنہا

جسے دریچے سے عاشق میں پھینک آیا تھا
مرے ہی پاس کھڑا تھا وہ حادثہ تنہا

خادم

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی۔ بھاگل پور۔ بھارت

فنا — !

شبنم طراز

فروری ۵۶ء

آسمان پہ کہکشاں کی آگ ،
راکھ ہو گئی —

خواب ،
اِس جہاں کی آنکھ ڈھونڈتے رہے ،
زمینِ اپنی پاؤں بھر کی سند
سوچتی رہی —
ساحلوں پہ ارمغانِ وقت —
کچھ نہیں —

آخری ادیم پر
لہلہاتے اسمران جل گئے ،
وقت — افسا — اَفنزل —
فریب گر — فریب گر
پر بسشر —
محاربہ —! دھواں دھواں
نہ یہ جہاں نہ وہ جہاں
— عزلقِ آز ہو گئے —
دلوں پہ مرتسم ، سوائے درد
کچھ نہیں
زمیں اپنی پاؤں بھر کی سند سوچتی رہی
نصیب کے ستارے
فلک کے سو گئے —!

695 ایف جوہر ٹاؤن ۔ لاہور

[سہ ماہی "سورج"
کیلئے بطورِ خاص]

ڈاکٹر انجم رحمانی، لاہور

⊙

وہ بت ہے بات کچھ سنتا نہیں ہے
گو اب کعبہ میں وہ رہتا نہیں ہے
ہو کیسے اس کو احساسِ محبت
جو خود اس آگ میں جلتا نہیں ہے
خطا میری وہ جتلائے مسلسل
ستم اپنے مگر گنتا نہیں ہے
ہے نام اس کا میری نوکِ زباں پر
جو میرا نام بھی سنتا نہیں ہے
بڑھاؤں دو قدم کیا اس کی جانب
جو آگے اک قدم بڑھتا نہیں ہے
مرض میرا فقط دردِ محبت
دوا سے جو کبھی گھٹتا نہیں ہے
بھرم ہے دوستی کا مجھ سے قائم
وہ خود سر ہے، مجھے ملتا نہیں ہے
سحر تو ہجر کی شب میں ہوئی گم
یہ سورج آج کیوں چڑھتا نہیں ہے
شہر کی وحشتیں کم ہوں گی کیونکر
کہ انجم ساتھ وہ چلتا نہیں ہے

پریتا واجپائی، لکھنؤ

⊙

جب کسی کی بھی چاہ کرتے ہیں
تو اُسی سے نباہ کرتے ہیں

آپ اِس بات پر یقین کریں
پیار ہم بے پناہ کرتے ہیں

منزلِ عشق وہ نہ پائیں گے
جان کر جو گناہ کرتے ہیں

غم کے ماروں کی بے بسی دیکھو!
چُھپ چُھپا کے وہ آہ کرتے ہیں

جو سمجھتے ہیں عشق کی قیمت
شوق سے رسم و راہ کرتے ہیں

لوگ پریتا کو بے وفا کہہ کر
اپنی دنیا تباہ کرتے ہیں

ضیا اکرام

⊙

جاگے ہیں تو خواب کھو گئے ہیں
کیا تھے وہ سراب کھو گئے ہیں

ہزار گردشوں کی زد میں آکر
کتنے انقلاب کھو گئے ہیں

اب کیا شعرِ دل میں جا کرے گا
سوچوں سے گلاب کھو گئے ہیں

ہے تار رگِ نفس ہی حاضر
مطرب سے رباب کھو گئے ہیں

پت جھڑ نے تو یہ ہیں گل کھلائے
سرسبز خواب کھو گئے ہیں

اب ان کی کمی ستا رہی ہے
وہ جو اضطراب کھو گئے ہیں

لگتا ہے ٹھہر گیا ہے دریا
سطح سے حباب کھو گئے ہیں

بیٹھے دوستوں کے درمیاں تھے
پھر کیوں آنجناب کھو گئے ہیں

سعدیہ قریشی، لاہور

O

یہ دل کہ حرفِ تسلی کا منتظر ہی رہا
جو اشک آنکھ سے نکلا وہ دربدر ہی رہا

زمینِ خواب پہ اشکوں کی فصل بونے تک
وہ شخص سارے حوالوں میں معتبر ہی رہا

ہوائے حزن، اداسی، دیارِ تنہائی!
رہِ وفا میں مسافر بچشمِ تر ہی رہا

تمام شہر ہی مرہم بدست حاضر تھا
مگر وہ شخص کہ اس دکھ سے بے خبر ہی رہا

گھروں کو خواب نگاروں نے الوداع تو کہا
مسافرت ہی رہی، عمر بھر سفر ہی رہا

یہ شہر خفتہ نصیبی پہ بین کرتا ہے
ہر ایک خواب یہاں خوابِ بے ثمر ہی رہا

اجل کا گھاؤ بھی ہم سہہ کے جی اٹھے تو کہا
جو زندگی نے دیا زخم، بیشتر ہی رہا

غافر شہزاد، لاہور

⊙

باندھ رکھے ہیں کئی خدشے پر و بال کے ساتھ
پھر بھی پرواز میں رہتا ہے مہ و سال کے ساتھ

جل بجھا کوئی ستارہ تو یہ معلوم ہوا
عمر آئندہ تھی وابستہ مرے حال کے ساتھ

سوئیاں ہیں یہ لکیریں، جو ہتھیلی پر ہیں
ہم سفر رہتی ہیں دن رات یہ گھڑیال کے ساتھ

آج بازار میں بے قیمت و قامت ٹھہرا
جس نے انساں کو خریدا تھا زر و مال کے ساتھ

شاخ سرسبز نے بانہوں میں لیا ہے اس کو
صحن سے ایک پرندہ جو اڑا جال کے ساتھ

عنبرین صلاح الدین

⊙

خار و خس کی مہ و انجم سے یوں نسبت دیکھی
میرے خوابوں کی مرے شہر نے قیمت دیکھی

کب مرا راستہ ایسا تھا کہ مجھ تک پہنچے
میں نے خود چشم تخیل سے رعایت دیکھی

میں نے لفظوں کو سمیٹا تو فسانے پھیلے
خواب بکھرے تو مری آنکھ نے شہرت دیکھی

وقت کی آندھیاں کس سمت اڑا لے آئیں
اُس نے دیکھا تھا مجھے، میں نے قیامت دیکھی

گونج رہتی ہے در و بام میں تنہائی کی
کب ترے بعد کسی جشن کی فرصت دیکھی

اُس کے لفظوں کے مقابل میں بھلا کیا کہتی
میں نے حیران ہی رہنے میں سہولت دیکھی

چھو کے آئی ترا پیکر جو نکھرتی ہوئی دھوپ
کیا سے کیا میں نے در و بام کی رنگت دیکھی

نثر لکھنا شاعری سے زیادہ مشکل کام ہے۔ شہزاد احمد

مجھے شہزاد احمد سے اختلاف ہے۔ ستیہ پال آنند

ستیہ پال آنند
Dr. Satya Pal Anand
13855 Marcey Creek Road , Herndon, VA 20171-4810
Phone: 703-733-3993
Email: spanand786@hotmail.com

بصد عجز و انکسار، مجھے شہزاد احمد صاحب کے اس موقف سے اختلاف ہے کہ نثر لکھنا شاعری سے زیادہ مشکل کام ہے۔ جونہی وہ اس بحث کا در وا کرتے ہیں، ایک جست میں اس دہلیز کو عبور کر جاتے ہیں، جسے میرے لیے پھلانگنا کارے دارد والا معاملہ ہے۔ وہ کہتے ہیں "شاعری میں تو آپ کے لیے بحر ہوتی ہے، ردیف و قافیہ ہوتے ہیں، اور ایک ایسی روایت ہوتی ہے، جس پر صدیوں سے کام ہو رہا ہے۔" مجھے "بحر" اور "روایت" سے تو کوئی بغض نہیں، لیکن "ردیف" اور "قافیے" کا ذکر خیر یا ذکر شر کرتے ہوئے وہ اعلانیہ یہ مفروضہ دہرا جاتے ہیں کہ شاعری سے ان کی مراد صرف اور صرف غزلیہ شاعری ہے۔ ان کے مختصر رائیٹ اپ میں بار بار یہ بات دہرائی گئی ہے۔ "ایک مصرعے کا ہونا"۔ "دوسرے مصرعے کا وارد ہو جانا" سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان کے لیے شاعری "غزل" کا اسم خاص ہے۔ اس طرح وہ نظم، (پابند نظم اور بلینک ورس) دونوں کے کلیم کو بیک وقت موقوف کر رہے ہیں۔ موصوف جیسے شاعری (تخیلات کی بیساکھیاں، یعنی روایت پر انحصار رکھنے کی حالت)، کہتے ہیں۔ وہ اقبال کی "شکوہ"، "جواب شکوہ"، "ذوق و شوق" (جو فلسطین میں لکھی گئی) پیر و مرید کے مابین یا جبریل و ابلیس کے مابین مکالمات میں کہاں ہیں؟ ٹی ایس ایلیٹ کی Love song of Prufrock یا اسٹیفن اسپنڈر، لوئی میکنیس کس روایت کی بیساکھیاں لے کر چلتے ہیں؟

اب آئیں اصل سوال کی طرف۔ بندہ ناچیز کے علاوہ ن م راشد جیسے قلمکار نثر سے نظم کی طرف نظم کی آسانی کے لیے نہیں آئے۔ راشد نے "ایران میں اجنبی" لکھنے سے پہلے ایران ہی کے پس منظر کا ایک ناول لکھنا شروع کیا تھا۔ ایک انٹرویو میں ("شعر و حکمت" کا راشد نمبر دیکھیں) راشد نے کہا تھا کہ انہوں نے محسوس کیا کہ نثر میں وہ ایجاز ممکن نہیں ہے، جو نظم میں ہے۔ مطالعے، مشاہدے، عالمی تجربات کے لیے جب ذہن کشادہ ہوتا ہے، تو ناول یا افسانے یا تنقیدی مضمون کے کینوس پر احساس، خیال اور تخلیق کے اپنے رنگوں کے ہیولے کی طرح منعکس نہیں ہوتے۔ یہ شاعری میں ہی ممکن ہے۔

بے حد عجز و انکسار سے مجھے اپنا ذکر کرنے دیجیے۔ میں نے ساٹھ سے کچھ اوپر افسانے لکھے (چار افسانوی مجموعے چھپے) اس کے علاوہ چار ناول لکھے۔ اب تک میں پانچسو سے کچھ اوپر نظمیں لکھ چکا ہوں۔ طویل نظمیں مجموعے ابھی چھپے ہیں، جو دو سو سطروں سے زیادہ طوالت کی حامل ہیں ("مجھے تو کر وداع"، "دھرتی پران"، "مرثیہ پران"، "میری بہنیں نہیں"، "گیلا تیلا سے کون بچے گا" وغیرہ)۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ جو بات میں پانچسو نظمیں لکھ کر کہہ چکا ہوں، وہ اگر پانچسو افسانے لکھتا، یا پچاس ناول لکھتا، تو نہیں کہہ سکتا تھا۔

ستیہ پال آنند

۳ مارچ ۲۰۰۶ء

بصد عجز و انکسار، مجھے شہزاد احمد صاحب کے اس موقف سے اختلاف ہے کہ نثر لکھنا شاعری سے زیادہ مشکل کام ہے۔ جونہی وہ اس بحث کا در وا کرتے ہیں ایک حسرت میں اس دلیل کو مجبور کر جاتے ہیں، جو میرے لیے کھٹکنے کا ہے، در دوا معاملہ ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ ''شاعری میں تو آپ کیلئے بحر ہوتی ہے، ردیف و قافیہ ہوتے ہیں اور ایک ایسی روایت ہوتی ہے، جس پر برسوں سے کام ہو رہا ہے۔'' مجھے ''بحر'' اور ''روایت'' سے کوئی بغض نہیں، لیکن ''ردیف'' اور ''قافیے'' کا ذکر خیر بار بار کرتے ہوئے وہ اعلانیہ یہ مفروضہ دہراتے ہیں کہ شاعری سے ان کی مراد صرف اور صرف غزلیہ شاعری ہے۔ ان کے مختصر ''رائیٹ اپ'' میں بار بار یہ بات دہرائی گئی ہے۔ ایک مصرعے کا ''ہونا'' دوسرے مصرعے کا ''وارد ہو جانا'' سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان کیلئے شاعری ''غزل'' کا اسم ذات ہے۔ اس طرح وہ نظم، (بشمولیت پابند نظم اور بلینک ورس) دونوں کے کلیم کو بیک وقت موقوف کرتے ہیں۔ موصوف جسے شاعری کی بیساکھیاں، یعنی روایت پر انحصار رکھنے کی حالت، کہتے ہیں وہ اقبال کی ''شکوہ''، ''جواب شکوہ''، ''ذوق و شوق'' (جو فلسطین میں لکھی گئی) پیر و مرید کے مابین یا جبریل و ابلیس کے مابین مکالمات میں کہاں ہیں؟ ٹی ایس ایلیٹ کی اپنی Love song of Prufrock میں یا اسٹیفن اسپنڈر، لوئی میک نیس کس روایت کی بیساکھیوں لے کر چلتے ہیں؟

اب آئیں اصل سوال کی طرف۔ بندہ ناچیز کے علاوہ ن م راشد جیسے قلمکار نثر سے نظم کی طرف نظم کی ''آسانی'' کیلئے نہیں آئے۔ راشد نے ''ایران میں اجنبی'' لکھنے سے پہلے ایران ہی کے پس منظر پر ایک ناول لکھنا شروع کیا تھا۔ ایک انٹرویو میں (''شعر و حکمت'' کا راشد نمبر دیکھیں) راشد نے کہا تھا کہ انہوں نے محسوس کیا کہ نثر میں وہ ایجاد ممکن نہیں ہے، جو نظم میں ہے۔ مطالعے، مشاہدے، عام تجربات کیلئے جب ذہن کشادہ ہوتا ہے تو ناول یا افسانے یا تنقیدی مضمون کے کینوس پر احساس، ذہن اور تخلیق اپنے گونا گوں رنگوں کے ہیولے کی طرح منعکس نہیں ہوتے۔ یہ شاعری میں ہی ممکن ہے۔

بے حد عجز و انکسار سے مجھے اپنا ذکر کرنے دیجئے۔ میں نے ساٹھ سے کچھ اوپر افسانے لکھے (چار افسانوی مجموعے چھپے) اس کے علاوہ چار ناول لکھے۔ اب تک میں پانچ سو کچھ اوپر نظمیں لکھ چکا ہوں۔ طویل نظمیں کچھ ایسی بھی ہیں، جو دو سو سطروں سے زیادہ طوالت کی حامل ہیں (''مجھے نہ کر وداع''، ''دھرتی پران''، ''گرڑ پران''، ''میری نہیں لیکن''، ''گیلا تیا سے کون بچے گا'' وغیرہ) میں نے محسوس کیا ہے کہ جو بات میں اپنی پانچ سو نظموں میں لکھ کر کہہ چکا ہوں، وہ اگر پانچ سو افسانے لکھتا، یا پچاس ناول لکھتا تو نہیں کہہ سکتا تھا۔　　(ستیہ پال آنند)

مسعود احمد، اوکاڑہ کینٹ، پاکستان

O

لہو ابال کے اپنے ہی سر کی گرمی سے
فلک کو خاک کیا بال و پر کی گرمی سے

یہ کیسی طرح محبت میں ڈال دی اُس نے
بدن کو ٹھنڈا کیا ہے نظر کی گرمی سے

چلو چلیں اُسی بادل کے آستانے پر
وہ تپ کے نکلا ہے دیوار و در کی گرمی سے

وہ جس میں کب سے مرا اُس کا اٹھنا بیٹھنا تھا
جھلس گیا ہے وہ سایہ شجر کی گرمی سے

یہ مری اب کی نہیں جانے کب کی عادت ہے
سفر کو مارنا رنجِ سفر کی گرمی سے

☆☆☆☆☆☆

O

خواب ہوتے مکان کی اینٹیں
ہم تو ہیں اِس جہان کی اینٹیں

لے گئے دوسری لحد کے لیے
قبر پر سے نشان کی اینٹیں

موت کو سنگسار کرنا ہے
دے زمیں آسمان کی اینٹیں

یہ جو گرتے شہاب ثاقب ہیں
یہ تو ہیں لا مکان کی اینٹیں

ہو کے محصور بیٹھ جاتا ہوں
جوڑ لیتا ہوں دھیان کی اینٹیں

ہے یہ بے کار صحن کا ملبہ
پھینک باہر یہ گیان کی اینٹیں

آگئی موت مقبروں کو بھی
بھر گئیں درمیان کی اینٹیں

☆☆☆☆☆

کلیم احسن بٹ، گجرات، پاکستان

⊙

دیکھتا اک نظر تو کیا ہوتا
غیر ہوتا ادھر تو کیا ہوتا

اپنا دشمن ہے آسماں یونہی
کچھ بھی ہوتا ہنر تو کیا ہوتا

وہ نہیں ہے تو کیا نہیں اب بھی
وہ بھی ہوتا اگر تو کیا ہوتا

دو قدم ساتھ چل نہیں پایا
وہ مرا ہم سفر تو کیا ہوتا

میں مسافر مزاج رکھتا ہوں
میرا ہوتا بھی گھر تو کیا ہوتا

کس قدر سخت زندگی تھی کلیمؔ
یونہی ہوتی بسر تو کیا ہوتا

کرشن کمار طور، دھرم شالہ، بھارت

⊙

تھا وقفہ ہمیں برابری کا
کیا عقدہ کھلا بھی زندگی کا

بھگتو گے سزائیں عمر بھر تم
مانو گے نہ جو کہا کسی کا

کہنے کی فقط ہیں سب یہ باتیں
دنیا میں کوئی نہیں کسی کا

پر فرق سمجھ سکو تو سمجھو
عنصر ہے غم میں بھی خوشی کا

ہنستے ہنستے رُلا رہی ہے
یہ کیا ہے اصول زندگی کا

انجام سے اپنے بے خبر ہے
دیکھو تو غرور آدمی کا

اشعار تمہارے طورؔ دیکھے
اردو میں ہے رنگ فارسی کا

گفتار خیالی

⊙

اپنی ہر خواہش مجھے مسمار کر دینا پڑی
جیت بھی مجبوریوں میں ہار کر دینا پڑی

میرے ہر جانب سے یوں اُمڈے چلے آئے غنیم
فوج ساری برسرِ پیکار کر دینا پڑی

دیدۂ حرص و ہوس ہر سمت تھا چشمک کناں
گھر کی اونچی اس لیے دیوار کر دینا پڑی

زخم کاری تھے بہت جن کے تدارک کے لیے
پارہ پارہ اپنی ہی دستار کر دینا پڑی

زندگی میں زندگی کرنا پڑا دشوار تھا
صبر کی حد بھی تھی جتنی پار کر دینا پڑی

ایک کوشش سے اُٹھے گفتارؔ کتنے مسئلے
پہلی ہر کوشش مجھے بیکار کر دینا پڑی

نوٹ: آخری شعر میں ''دینی'' کی بجائے ''دینا'' ردیف کی ضرورت پر لکھنا پڑا

تلک راج پارس۔ جبل پور۔ بھارت

O

تم کو اگرچہ گوہر نایاب سا لگے
آنسو ہماری آنکھ میں تیزاب سا لگے

دل میں فشار ذہن میں گرداب سا لگے
وہ حسنِ بے مثال جب بیتاب سا لگے

آنکھوں میں اس کا عکس ہے خورشید کی طرح
پانی میں ڈوب جائے تو مہتاب سا لگے

رامش گری کے شوق میں ڈوبا ہوں اس قدر
تنکا اگر اٹھاؤں تو مضراب سا لگے

اب لمحۂ وصال میں تیرا لطیف لمس
اے ملکۂ بہار مجھے خواب سا لگے

حیران ہوں کہ تیری محبت میں جانِ جاں
آسودگی ہے، دل مگر بیتاب سا لگے

جس گاؤں کے نصیب میں دریا نہیں کوئی
اس کی زمیں پہ جھرنہ بھی تالاب سا لگے

☆☆☆☆☆☆

واحد جمال، کرت پور، بھارت

○

ذرا سی دیر کو خود ساختہ اوتار ہونا تھا
تجھے اپنے قبیلے کا اگر سردار ہونا تھا

دیئے جس قوم نے منصب اُسے دھوکے دیئے تم نے
تمھیں تو ایک دن رسوا سرِ بازار ہونا تھا

وہ پہلی آزمائش تھی جہاں تم چیخ اٹھے تھے
مراحل کو ابھی تو اور بھی دشوار ہونا تھا

ذہانت کی حدوں کو پار کر جاتے تھے تم اکثر
تمہارے ذہن کو اک روز تو بیمار ہونا تھا

نہ جانے کیا ہوا محفل سے میں اٹھ کر چلا آیا
ہوا بھی وہ میری خاطر میں جو اصرار ہونا تھا

جب اُس نے خون سے لکھ کر سلام عشق بھیجا تھا
میری جانب سے اُس کے بعد کیا انکار ہونا تھا

حقائق پر مجھے بھی تبصرہ کرنے کی عادت تھی
یقیناً دوستوں کو برہم و بیزار ہونا تھا

ابھی سے مطمئن فنکار کیسے ہو گیا تجھ سے
ابھی تو اور بھی تیرا غزل سنگھار ہونا تھا

☆☆☆☆☆

بشریٰ شریف

میر کی ایک غزل کے انگریزی تراجم

ترجمہ، بنیادی طور پر کسی عبارت کو اس کے معنی و مفہوم سمیت ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنے کا عمل ہے۔ ترجمہ، انسانوں کے مابین باہمی رابطے اور اتحاد کی راہ میں موجود فطری رکاوٹوں کو دور کرنے کے ساتھ ساتھ علم و عرفان کو بنی نوع انسان کی مشترکہ میراث بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

کلاسیکی شاعری میں اگرچہ مرزا اسد اللہ خان غالب کے کلام کے انگریزی تراجم پر سب سے زیادہ توجہ دی گئی لیکن میر اور بعض دوسرے کلاسیکی اردو شعراء کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ میر تقی میر کے کلام کو انگریزی زبان میں منتقل کرنے اور ان کی فکر کو انگریزی دان طبقے سے روشناس کرانے میں خورشید الاسلام، رالف رسل، کے۔ سی کانڈا، ڈاکٹر محمد صادق، راجندر سنگھ ورما، احمد علی، شہاب الدین رحمت اللہ اور اومیش جوشی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

میر کی فکر اتنی متنوع اور ہمہ گیر ہے کہ بظاہر آسان اور سہل ممتنع کی مثال دکھائی دینے والے اشعار کو زبان غیر میں منتقل کرتے ہوئے مترجمین کے پیش نظر یہی احساس غالب رہا کہ: ؎ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

میر شناسی، عصر حاضر کا ایک اہم فکری اور ادبی مسئلہ ہے۔ میر کے کلام کے انگریزی تراجم کا جائزہ لینے پر اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ میر کی فکر ترجمے کے قالب میں کچھ حد تک تو واضح کی جا سکتی ہے لیکن پوری عکاسی نہایت دشوار اور جانگسل ہے۔

میر کی شاعری ان کی ذات کے نہاں خانوں کے ساتھ ساتھ ان کے عہد کی بھی ترجمانی کرتی ہے۔ ہر بڑا شاعر جہاں اپنی ذات سے مکالمہ کرتا ہے وہاں گرد و پیش کے

کائناتی حقائق کو بھی اپنی تخلیقات کا جز ولازم بناتا ہے۔

میر ذات سے کائنات کے اس سفر میں کائنات کی رنگا رنگ صداقتوں اور مجاز و کہیں براہ راست، بلاواسطہ اور کہیں رمز وایما کے پردے میں اجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً میر کی ایک معروف غزل درج ذیل ہے جس میں وہ اپنی ذات، شخصی تجربات اور عصری حالات کا بیان نہایت موثر پیرائے میں کرتا ہے:

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

عہد جوانی رو رو کاٹا، پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے، صبح ہوئے آرام کیا

حرف نہیں جاں بخشی میں اس کی، خوبی اپنی قسمت کی
ہم سے جو پہلے کہہ بھیجا سو مرنے کا پیغام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں، ہم کو عبث بدنام کیا

سارے رند اوباش جہاں کے تجھ سے سجود میں رہتے ہیں
بانکے، ٹیڑھے، ترچھے، تیکھے سب کا تجھ کو امام کیا

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اس کی اور گئے، پر سجدہ ہر ہر گام کیا

کس کا کعبہ، کیسا قبلہ، کون حرم ہے کیا احرام
کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

شیخ جو ہے مسجد میں ننگا، رات کو تھا میخانے میں
جبہ، خرقہ، کرتا، ٹوپی مستی میں انعام کیا

کاش اب برقع منہ سے اٹھا دے، ورنہ پھر کیا حاصل ہے
آنکھ مندے پر ان نے گو دیدار کو اپنے عام کیا

یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

صبح چمن میں اس کو کہیں تکلیف ہوا لے آئی تھی
رخ سے گل کو مول لیا، قامت سے سرو غلام کیا

ساعد سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لا کر چھوڑ دیے
بھولے اس کے قول و قسم پر، ہائے خیال خام کیا

کام ہوئے سارے ضائع پر ساعت کی سماجت سے
استغنا کی چوگنی ان نے، جوں توں میں ابرام کیا

ایسے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی
سحر کیا، اعجاز کیا، جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے ہو کیا ان نے تو

قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا [۱]

مذکورہ غزل کے پہلے شعر کا ترجمہ کرتے ہوئے احمد علی لکھتے ہیں:

"My heart's afflictions and its pain could not be cured, I tried in vain; useless were all remedies, and futile were the potions that I drained.[۲]

احمد علی کا ترجمہ، میر کے شعر کی عکاسی تو کرتا ہے لیکن ''بیماری دل'' کی تاثیر اور کیفیت کو پیش کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس کے مقابلے میں خورشید الاسلام اور رالف رسل کا ترجمہ کچھ اس انداز سے مفہوم کو اجاگر کرتا ہے:

"All my plans have been overturned,
and no medicine has had any effect.
You see?
This sickness of the heart [love] has killed me in the end [as I told you it would]". [۳]

خورشید الاسلام اور رالف رسل نے ''بیماری دل'' کے کام تمام کرنے کی کیفیت کو نہ صرف محسوس کیا ہے بلکہ اس کو واضح کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

کے۔سی کانڈا مذکورہ شعر کا ترجمہ کچھ اس طرح سے کرتے ہیں:

"All plans have gone amiss, all recipes have failed,
This ailing heart, you see, has undone me at last". [۴]

کے۔سی۔کانڈا نے میر کے شعر میں موجود جذبے کی شدت کو نہایت اختصار کے ساتھ ترجمے کے قالب میں سمویا ہے:

راجندر سنگھ ورما کا ترجمہ:

Plans all failed and drugs were of no
avail
Did you note how me love-sickness did
kill. ۵

راجندر سنگھ ورما نے نہ صرف میر کی فکر کی صحیح معنوں میں ترجمانی کی، بلکہ نہایت آسان الفاظ میں شعر کے مفہوم کے قارئین تک موثر ابلاغ میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

مذکورہ بالا غزل کے دوسرے شعر کا ترجمہ کرتے ہوئے خورشید الاسلام اور رالف رسل لکھتے ہیں:

I passed the days of my youth in
weeping, and in old age I closed my
eyes. That is, I passed many nights in
wakefulness, and when morning came
I rested. ۶

مندرجہ بالا ترجمہ کا شمار بہت حد تک بامحاورہ تراجم کی ذیل میں کیا جاسکتا ہے۔ مجموعی طور پر ''رات کو جاگنے اور صبح ہونے پر آرام کی کیفیت'' کا بیان مترجمین اتنے موثر پیرائے میں کرتے ہیں کہ یہ چیز ترجمے میں چاشنی اور دلکشی کا رنگ پیدا کر رہی ہے۔

شہاب الدین رحمت اللہ کا ترجمہ:

I spent my youth in weeping much,
And in my old age closed my eyes;
As if I kept awake all nights
And so, with morning did not rise. ۷

شہاب الدین رحمت اللہ نے نہایت آسان الفاظ میں مفہوم کو اجاگر کیا ہے، نیز ''جوانی'' میں ''رونے'' اور پیری میں ''آنکھیں موند'' لینے کے تاثر کو نہایت خوبصورتی سے پیش کیا۔

احمد علی کا ترجمہ:

My youth I spent in grief and tears,
And in old age I closed my eyes,
As though I had kept awake all night
And when the morning came I could
not rise. ۸

احمد علی کا ترجمہ جہاں قارئین کو میر کی فکر سے روشناس کرانے میں معاون ثابت ہوتا ہے وہاں بہت حد تک وضاحتی انداز لیے ہوئے ہے۔

کے۔سی۔کانڈا کا ترجمہ:

Groaning, grieving I spent my youth,
as age arrived I closed my eyes,
Having passed a sleepless night,
I dozed off at dawn. ۹

کے۔سی۔کانڈا کا ترجمہ مفہوم کی عکاسی نہایت عمدگی سے کرتا ہے۔ مجموعی طور پر ان کے ترجمے کو اختصار کی عمدہ مثال قرار دیا جا سکتا ہے۔

راجندر سنگھ ورما کا ترجمہ:

Youth I spent in tears in old age shut
eyes kept a vigil at night
At sunup took rest. ۱۰

مذکورہ ترجمہ کو میر کی فکر اور شعر میں پائی جانے والی معنوی گہرائی و گیرائی کی پیشکش کے سلسلے میں نہایت موثر خیال کیا جا سکتا ہے۔

غزل کے تیسرے شعر کا ترجمہ خورشید الاسلام اور رالف رسل کچھ اس طرح سے کرتے ہیں:

I do not question her life giving power.
It is just the excellence of my fortune
that the first message that she sent me
was my sentence of death. ۱۱

خورشید الاسلام اور رالف رسل نہ صرف ''جاں بخشی''، ''قسمت'' اور مرنے کے پیغام کی وضاحت عمدگی سے کرتے ہیں بلکہ ان اوصاف کا تعلق ''محبوب'' کی ذات سے قائم کرتے ہیں۔ جس کے لیے انگریزی کا لفظ "she" کو استعمال کر کے یہ ثابت کرنے کی سعی کرتے ہیں کہ ترجمے کا مزاج خالصتاً کلاسیکی شاعری کے عین مطابق ہے۔

مذکورہ شعر کے حوالے سے خورشید الاسلام اور رالف رسل کی رائے دیکھی جا سکتی ہے:

"The beloved has power of life and death over her lover; One word from her can save him, and one word can kill him. It is his good fortune that her message, rejecting his love, is equivalent to sentence of death upon him. "Good Fortune" may be ironical, or it could be literal for it is good fortune to have the opportunity to die for one's love. The verse could be also interpreted in a mystic sense". ۱۲

غزل کے چوتھے شعر کا ترجمہ کرتے ہوئے خورشید الاسلام اور رالف رسل لکھتے ہیں:

We act under constraint, and You slander us when You say we have free will. It is Your will that is done, and we are blamed without cause. ۱۳

احمد علی کا ترجمہ:

We the helpless, are accused of independence, alas, the shame!
You act as it please You
And yet we are the ones who get the blame. ۱۴

کے۔سی۔کانڈا کا ترجمہ:

Unjustly we helpless mortals are charged with having sovereign wills,
He doth what He wills, me are to blame in vain. ۱۵

راجندر سنگھ ورما کا ترجمہ:

Wrongly we, the helpless ones,
Have been accused with free will
Providence does what it likes, and the blame is thrust on us. ۱۶

مذکورہ تراجم ''خدا سے شکایتی انداز'' کو موثر پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر انھیں نظریہ جبر و قدر کے ابلاغ کے حوالے سے نہایت اہمیت حاصل ہے، لیکن شعری حسن کو ترجمے کے عمل میں ڈھالنے سے قاصر رہتے ہیں۔

پانچویں شعر کو خورشید الاسلام اور رالف رسل کے ہاں کچھ اس انداز سے لیا جاتا ہے:

All the rakes and profligates of the whole world bow down before you. The proud the perverse, the awkward, the independent_

All have acknowledge you their leader.

۱۷

کے۔ سی۔ کانڈا کا ترجمہ:

All revellers and drinkers hold Thee in respect,
crooked and clever, sharp and sly; all kneel to Thee_.۱۸

خورشید الاسلام، رالف رسل اور کے۔ سی۔ کانڈا، ''بانکے، ٹیڑھے اور ترچھے'' لوگوں پر محبوب کی امامت کا ابلاغ موثر خطوط پر کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر مذکورہ تراجم مفہوم کی عکاسی میں ممکنہ حد تک مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

غزل کے چھٹے شعر کا ترجمہ خورشید الاسلام اور رالف رسل اس انداز سے کرتے ہیں:

If even in my distracted state I have been guilty of any want of respect [in daring to approach her], then it was little enough for mile after mile as I made my way towards her, I fell down to worship her at every step.۱۹

کے۔ سی۔ کانڈا کا ترجمہ:

Even in my frenzied state seldom did I
misbehave;
For miles after him I went,
but knelt at every stage.[٢٠]

خورشید الاسلام اور رالف رسل کا ترجمہ مجموعی طور پر مفہوم کی وضاحت تو کرتا ہے لیکن جذبے کی لطافت سے عاری ہونے کے سبب اپنے آخری تاثر میں ایک نثر پارہ محسوس ہوتا ہے، جبکہ اس کے مقابلے میں K.C.Kanda نے نہ صرف جذبے کی لطافت کا پورا پورا خیال رکھا ہے بلکہ misbehave کا لفظ استعمال کرتے ہوئے ''بے ادبی'' کی معنویت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

شعر نمبر ۷ کا ترجمہ، خورشید الاسلام اور رالف رسل کے ہاں وضاحتی انداز اختیار کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے مثلاً:

What do we care for the ka' ba', and
the direction in which we should turn to
pray, and the robes of pilgrimage? we
who live in her lane have side fare-well
to all these things.[٢١]

کے۔سی۔کانڈا نے ترجمے میں استفہامیہ انداز کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ مجموعی طور پر ان کا ترجمہ کفایت لفظی کی عمدہ مثال پیش کرتا ہے۔ لکھتے ہیں:

Why talk of Mecca or Kaaba, who
cares for pilgrimage?
Dwellers of the street of love, great
these places from a far.[٢٢]

راجندر سنگھ ورما نے دو دفعہ "No, No" کا استعمال کرتے ہوئے کعبہ۔ قبلہ۔ حرم۔ احرام کی نفی کو اس کی شدت سمیت ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ذیل میں ان کا

ترجمہ اس امر کی تصدیق کرتا ہے۔ مثلاً:

Going to Kaba and Mecca
Donning sacred cloth? No, No
Dwellers of her lane salaamed all
these from this distant place.[۲۳]

مجموعی طور پر راجندر سنگھ ورما ''سلام'' کا ترجمہ "salaamed" کرتے ہیں جسے عام طور پر لفظی ترجمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

غزل کے شعر نمبر ۸ کا ترجمہ کرتے ہوئے خورشید الاسلام اور رالف رسل لکھتے ہیں:

If the shaikh stands naked in the mosque today it is because he spent the night drinking in the tavern, and in his drunkeness gave his cloak and gown and shirt and hat away.[۲۴]

مذکورہ ترجمہ کلاسیکی شاعری کے معروف منفی کردار ''شیخ'' کی منافقت اور اس کی مسجد میں موجودہ حالت کی وضاحت میں نہایت اہم خیال کیا جاتا ہے۔

غزل کے شعر نمبر ۹ کا ترجمہ خورشید الاسلام اور رالف رسل کچھ اس انداز سے کرتے ہیں:

If only she would lift the veil from her face now what will it profit me if when my eyes are closed [in death] she unveils herself for all to see?[۲۵]

مذکورہ ترجمہ، شعر کے مرکزی خیال کو موثر انداز میں اجاگر کرتا ہے۔ مجموعی طور شعر کی پر اسراریت کی عکاسی ترجمے میں واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔

غزل کے شعر نمبر ۱۰ کا ترجمہ، خورشید الاسلام اور رالف رسل کے ہاں کچھ اس طرح سے ملتا ہے:

> What can we do with the black and white of the world? if any thing, then only this, that we can see the [black] night out with constant weeping and bear the tail of the [white] day until evening comes.[۲۶]

احمد علی کا ترجمہ:

> All that we are allowed to say in the affairs of the universe, is to pass our days in grief, and spend our nights in anguish weeping in silent tears.[۲۷]

کے۔ سی۔ کانڈا کا ترجمہ:

> In the light and shade of life,
> This is our only role, wailing we move from night to morn,
> From morn, some how, to eve.[۲۸]

راجندر سنگھ ورما کا ترجمہ:

> If we have a say in this scheme of things, it is only that weep away the night till dawn manage to wear out the day.[۲۹]

خورشید الاسلام اور رالف رسل نے ''سپید و سیہ'' کے لیے "black and

'white کی اصطلاح استعمال کی ہے جس سے لغوی مفہوم کی وضاحت تو ہو جاتی ہے مگر شعر کے مزاج کے مطابق یہ اصطلاح سطحیت کا تاثر پیدا کرتی ہے۔ علاوہ ازیں بریکٹوں میں [black] اور [white] استعمال کیے گئے الفاظ بہت حد تک تشریحی نوعیت کے محسوس ہوتے ہیں اور یوں ان کا ترجمہ، وضاحتی انداز اختیار کر جاتا ہے جبکہ احمد علی نے ''سپید و سیہ'' کی وضاحت "affairs of the universe" سے کرتے ہوئے ترجمے میں معنوی گہرائی و گیرائی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح کے۔سی۔کانڈا نے shade of life اور راجندر سنگھ ورما نے scheme of things کو استعمال کرتے ہوئے مصرع اول میں پنہاں معنویت کی ترجمانی کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

مصرع ثانی کا ترجمہ کرتے ہوئے خورشید الاسلام اور رالف رسل نے رونے کی کیفیت کو constant weeping کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کی جو مفہوم کی عکاسی تو کرتا ہے لیکن بہت حد تک لفظی ترجمے کا تاثر پیدا کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں احمد علی کا ترجمہ صحیح طور پر شعر کے مفہوم و معانی کو قارئین پر عیاں کرتا ہے، خاص طور پر silent tears کے الفاظ قارئین کو ایک خاص لطف سے ہمکنار کرتے ہیں۔ اسی طرح K.C.Kanda نے شعر میں موجود تکرار لفظی کا خیال کرتے ہوئے ترجمے میں "to morn" اور "from morn" جیسے الفاظ برتتے ہوئے شعر کی چاشنی ترجمے کے قالب میں پیدا کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔

غزل کے شعر نمبر ۱۱ کا ترجمہ خورشید الاسلام اور رالف رسل کے ہاں کچھ اس طرح کا ملتا ہے:

> At morning in the garden she walked
> out to take the air.
> Her cheek made the rose her slave,
> and her graceful stature made the
> cypress her thrall. ۳۰

خورشید الاسلام اور رالف رسل کا مذکورہ ترجمہ محبوب کے ''رخسار'' کو'' گلاب'' کی سرخی پر'' غالب'' اور'' قامت'' کو'' سرو'' کے مقابلے میں زیادہ ''طویل'' ثابت کرنے کی کوشش میں موثر خیال کیا جاتا ہے۔

غزل کے شعر نمبر ۱۲ کا ترجمہ کرتے ہوئے خورشید الاسلام اور رالف رسل لکھتے ہیں:

> I held her silver - white wrists in my hands, but she swore [that she would come to me later], and I let them go. How raw and inexperienced I was to trust her word! ۳۱

احمد علی کا ترجمہ:

> I held her silvery hands in mine, then suddenly I let them go, for I had put my faith in her, false promises before too long ago. ۳۲

کے۔سی۔کانڈا کا ترجمہ:

> I had grasped her silver arms, but then I let them go, A fool I was to trust her word to harbour wishful thoughts. ۳۳

خورشید الاسلام اور رالف رسل کا ترجمہ بہت حد تک مفہوم کی وضاحت میں قارئین کی مدد کرتا ہے، جبکہ کے۔سی۔کانڈا کا ترجمہ مفہوم کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ شعر میں چھپی کیفیت کو بھی عیاں کرتا ہے، ان کے مقابلے میں احمد علی کا ترجمہ شعر کے لغوی مفہوم اور مطالب کا بیان موثر پیرائے میں کرتا ہے۔

غزل کے شعر نمبر ۱۳ کا ترجمہ، خورشید الاسلام اور رالف رسل کے ہاں اس طرح سے ملتا ہے:

Every moment I beseeched her, and this has brought all my efforts to nothing. Her proud indifference increased fourfold with every time I importuned her.۳۴

مذکورہ ترجمہ، مفہوم کی وضاحت تو کرتا ہے لیکن مترجمین کا زیادہ وضاحتی انداز اختیار کرنے کے سبب تشریحی نوعیت کا محسوس ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر مذکورہ ترجمہ شعر میں چھپی کیفیت کو عمدگی سے بیان کرتا ہے۔

غزل کے شعر نمبر ۱۴ کا ترجمہ کرتے ہوئے خورشید الاسلام اور رالف رسل لکھتے ہیں:

Such a timid, fleet does not easily her fear of man. Those who have tamed you have performed a wonder, as though by magic power.۳۵

احمد علی کا ترجمہ:

It was not easy task to rid that scared and terrified gazelle of wild despair, and those who tamed her had indeed performed a miracle.۳۶

کے۔سی۔کانڈا کا ترجمہ:

It's hard indeed to subdue a deer run amuck,
Those who controlled your frenzy did a miraculous feat.۳۷

خورشید الاسلام اور رالف رسل کا ترجمہ مفہوم کی وضاحت میں نہایت اہم

کردار ادا کرتا ہے نیز یہ اپنے وضاحتی انداز کے سبب قارئین کی راہنمائی کرتا ہے۔ احمد علی کا ترجمہ، شعر کے ظاہری و باطنی مفاہیم کی وضاحت کے ساتھ ترجمانی کا حق ادا کرتا محسوس ہوتا ہے۔ کے۔سی۔کانڈا کا ترجمہ مجموعی طور پر شعر کے ابلاغ میں معاون ثابت ہوتا ہے۔
غزل کے آخری شعر کا ترجمہ کرتے ہوئے خورشید الاسلام اور رالف رسل لکھتے ہیں:

Why do you ask at this late hour what
Mir's religion is?
He has drawn the caste mark on his
forehead and sat down in the temple.
He abandoned Islam long ago.[۳۸]

احمد علی کا ترجمہ:

Why do you ask the faith of Mir?
A caste mark on his brow, having lost,
None knows when the faith of
Mahammed.[۳۹]

کے۔سی۔کانڈا کا ترجمہ:

Why ask the Mir's sect or faith, long
since he abjured Islam, A sacred mark
on his brow, he kneels in the temple
now.[۴۰]

راجندر سنگھ ورما کا ترجمہ:

O what do you ask about creed of
"Mir"? well, he has put mark on his
brow, sat in fan.
Gave up Islam long ago.[۴۱]

خورشید الاسلام اور رالف رسل کا ترجمہ، شعر میں موجود استفہامیہ حالت کو برقرار رکھنے کے ساتھ ''ترک اسلام'' کی عمدہ عکاسی کرتا ہے۔ احمد علی نے مجموعی طور پر شعر میں پائی جانے والی تہہ داری کو موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ کے۔ سی۔ کانڈا نے long since کے الفاظ کو استعمال کرتے ہوئے ایک خاص معنویت ترجمے میں پیدا کردی ہے۔ اسی طرح راجندر سنگھ ورما نے "long since" کو کب کی جگہ استعمال کر کے زمانہ ماضی کا تاثر دینے کی کوشش کی ہے۔

مذکورہ بالا مترجمین نے میر کی غزل کو انگریزی زبان میں ڈھالنے کی جو کاوشیں کیں، ان کے مختصر تجزیے سے یہ صداقت عیاں ہوتی ہے کہ اگرچہ تمام مترجمین میر کے اشعار کے شکوہ، شخصی انفرادیت، عصری حالات، کائناتی حقائق اور فنی خوبیوں کو (جو میر کی شناخت کے بنیادی حوالے ہیں) اپنی گرفت میں نہیں لے سکے، لیکن اس کے باوجود انگریزی زبان اور انگریزی دان طبقے کو میر کی فکر سے روشناس کرانے کے سلسلے میں نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ نیز مغرب میں اردو کے کلاسیکی شعراء بطور خاص میر کی شاعری کے انگریزی تراجم کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ مذکورہ مترجمین کی کوششیں رائیگاں نہیں گئیں۔

حوالہ جات

۱۔ کلیات میر (دیوان اول)، مرتبہ، کلب علی خاں فائق، لاہور، مجلس ترقی ادب، جون ۱۹۸۶ء، ص ۱۰۱۔۱۰۲۔

2- Ahmed Ali, The Golden Tradition, New York and London, Columbia University Press. 1973, p. 140.

3- Khurshid-ul-Islam and Ralph Russell, Three Mughal Poets,Mir, Sauda, Mir Hasan, Delhi, OXford University Press, 1998. P.274.

4- K.C.Kanda, Master Pieces of Urdu Ghazal, New Delhi, Sterling paper back, 1995, p.79.

5- Rajinder Singh Verma, Pick of Mir, Lahore Urdu Academy, 1999, p.2.

6- Khurshid-ul-Islam and Ralph Russell, Three Mughal Poets,Mir, Sauda, Mir Hasan, P.274.

7- Shahabudin Rahmatullaha, Art in Urdu Poetry Anjuman-e-Tarraqi-e-Urdu, 1954, p.15.

8- Ahamed Ali, The Golden Tradition, p.140.

9- K.C.Kanda, Master Pieces of Urdu Ghazal, p.79.

10- Rajinder Singh Verma, Pick of Mir, p.2.

11- Khurshid-ul-Islam and Ralph Russell, Three Mughal Poets,Mir, Sauda, Mir Hasan, P.275.

12- Ibid.

13- Ibid.

14- Ahamed Ali, The Golden Tradition, p.140.

15- K.C.Kanda, Master Pieces of Urdu Ghazal, p.79.

16- Rajinder Singh Verma, Pick of Mir, p.2.

17- Khurshid-ul-Islam and Ralph Russell, Three Mughal Poets,Mir, Sauda, Mir Hasan, P.275.

18- K.C.Kanda, Master Pieces of Urdu Ghazal, p.79.

19- Khurshid-ul-Islam and Ralph Russell, Three Mughal Poets,Mir, Sauda, Mir Hasan, P.275.

20- K.C.Kanda, Master Pieces of Urdu Ghazal, p.79.

21- Khurshid-ul-Islam and Ralph Russell, Three Mughal Poets,Mir, Sauda, Mir Hasan, P.275.

22- K.C.Kanda, Master Pieces of Urdu Ghazal, p.79.

23- Rajinder Singh Verma, Pick of Mir, p.2.

24- Khurshid-ul-Islam and Ralph Russell, Three Mughal Poets,Mir, Sauda, Mir Hasan, P.276.

25- Ibid.

26- Ibid.

27- Ahamed Ali, The Golden Tradition, p.140.

28- K.C.Kanda, Master Pieces of Urdu Ghazal, p.79.

29- Rajinder Singh Verma, Pick of Mir, p.3.

30- Khurshid-ul-Islam and Ralph Russell, Three Mughal Poets,Mir, Sauda, Mir Hasan, P.276.

31- Ibid.

32- Ahamed Ali, The Golden Tradition, p.140.

33- K.C.Kanda, Master Pieces of Urdu Ghazal, p.79.

34- Khurshid-ul-Islam and Ralph Russell, Three Mughal Poets,Mir, Sauda, Mir Hasan, P.276.

35- Ibid.

36- Ahamed Ali, The Golden Tradition, p.141.

37- K.C.Kanda, Master Pieces of Urdu Ghazal, p.81.

38- Khurshid-ul-Islam and Ralph Russell, Three Mughal Poets,Mir, Sauda, Mir Hasan, P.277.

39- Ahamed Ali, The Golden Tradition, p.141.

40- K.C.Kanda, Master Pieces of Urdu Ghazal, p.81.

41- Rajinder Singh Verma, Pick of Mir, p.3.

غالب کا سفرِ کلکتہ
اور
کلکتے کا ادبی معرکہ

خلیق انجم

غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی

خصوصی مطالعہ:-

ایک کتاب ــــ دو مُلک

تبصرہ نگار:-

رفعت سروش (بھارت)
پروفیسر جلیل نقوی (پاکستان)
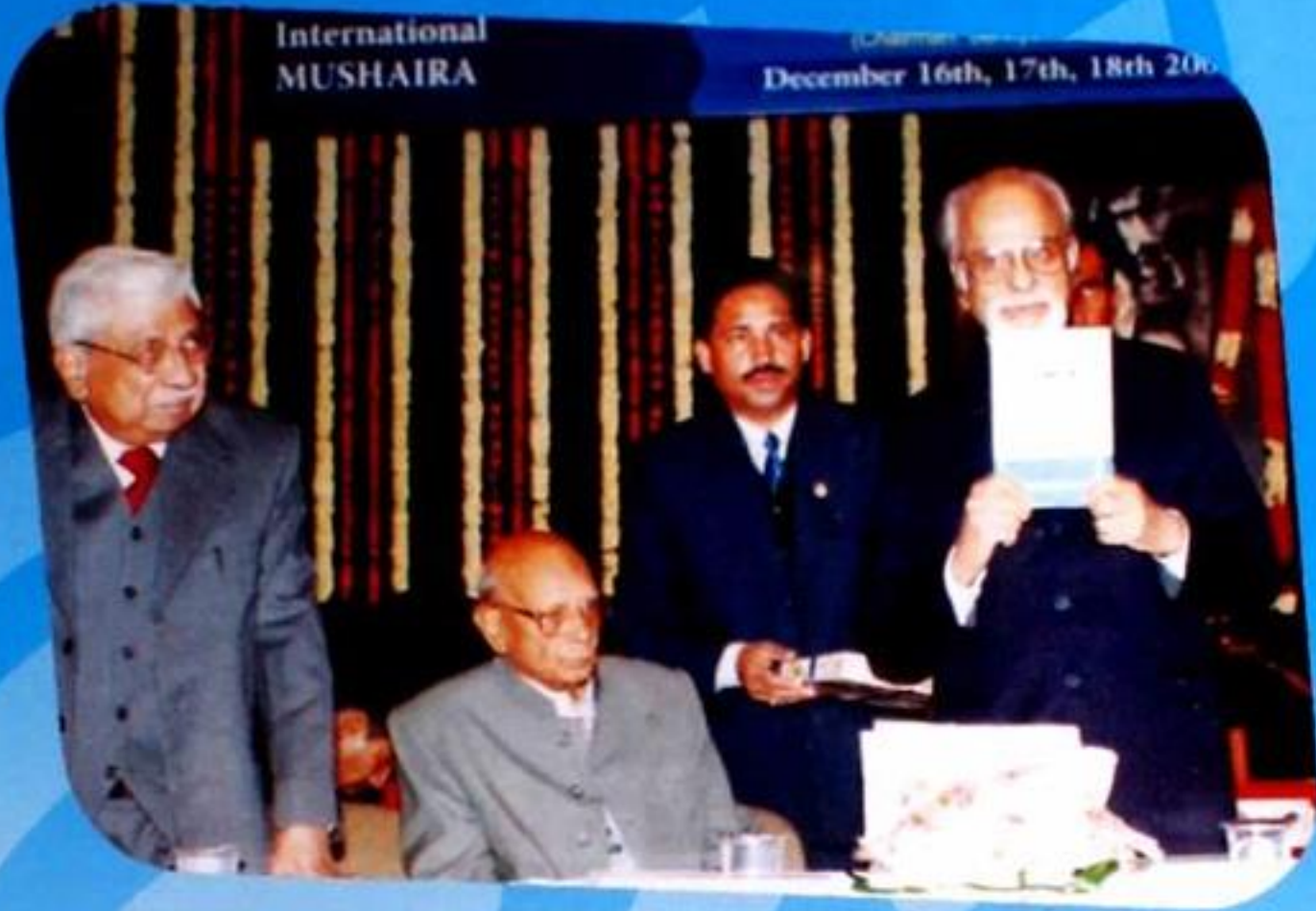
انجمن ترقی اردو (ہند) کے استقبالیہ میں سورج (غالب نمبر) کی رونمائی کے موقع پر
تسلیم احمد تصور اور ڈاکٹر خلیق انجم

غالب انعامات 2005ء حاصل کرنے والے (دائیں سے بائیں) پروفیسر فضیل جعفری، اختر سعید خان،
یوگ راج ٹنڈن، ڈاکٹر محمد اسلم پرویز، سابق وزیر اعظم اندر کمار گجرال، عابد سہیل، ڈاکٹر کمال احمد صدیقی
اور پروفیسر عبدالودود اظہر دہلوی

ممتاز شاعر شاہد ماہلی عالمی مشاعرے میں غزل سرا ہیں۔

نامور گلوکار جگجیت سنگھ کلام غالب سنا رہے ہیں۔

اسلم کمال اور غالب کا نیا پورٹریٹ

غالب میموریل ٹرسٹ نے لاہور جم خانہ میں 24 مارچ 2006ء کی شام شہرہ آفاق مصور اسلم کمال کے تیار کردہ غالب کے پورٹریٹ کی رونمائی کا اہتمام کیا۔ اس تقریب کی تفصیلی رپورٹ آئندہ صفحات پر ملاحظہ فرمائیے۔

شہرہ آفاق مصور اسلم کمال ٹرسٹ کے چیئر مین کو غالب کا پورٹریٹ پیش کر رہے ہیں۔

تقریب کے مہمان خصوصی سابق سیکرٹری خارجہ شمشاد احمد خان نے غالب کے پورٹریٹ کی رونمائی کی۔

سابق سیکرٹری خارجہ شمشاد احمد خان

شہرہ آفاق مصور اسلم کمال

چیرمین غالب ٹرسٹ تسلیم احمد تصور

غالب ٹرسٹ کے سرپرست ابوسعید احسن اصلاحی تقریب کے مہمانانِ خصوصی،
شمشاد احمد خان اور اسلم کمال کو نشانِ غالب کی یادگاری شیلڈز پیش کر رہے ہیں۔

شمشاد احمد خان، ابوسعید احسن اصلاحی اور حمید اختر

محمد سعید شیخ، حسین احمد شیرازی اور کرنل (ر) سعادت مہدی

سعدیہ قریشی، نیلم احمد بشیر، بیگم بشریٰ انیس الرحمٰن اور عذرا اصغر

پروین عاطف، نیلم احمد بشیر اور ثروت محی الدین

ڈاکٹر انیس الرحمٰن اور بیگم بشریٰ انیس الرحمٰن

خواجہ محمد ہارون، شاہد علی خان، تسلیم احمد تصور اور حُر حامیم

اسلم کمال اور کرنل (ر) سعادت مہدی

دبئی۔ (دائیں سے) محسن علی، گلنار آفریں، جمیل الدین عالی، محسن بھوپالی، حمید کاشمیری اور رُخسانہ انور
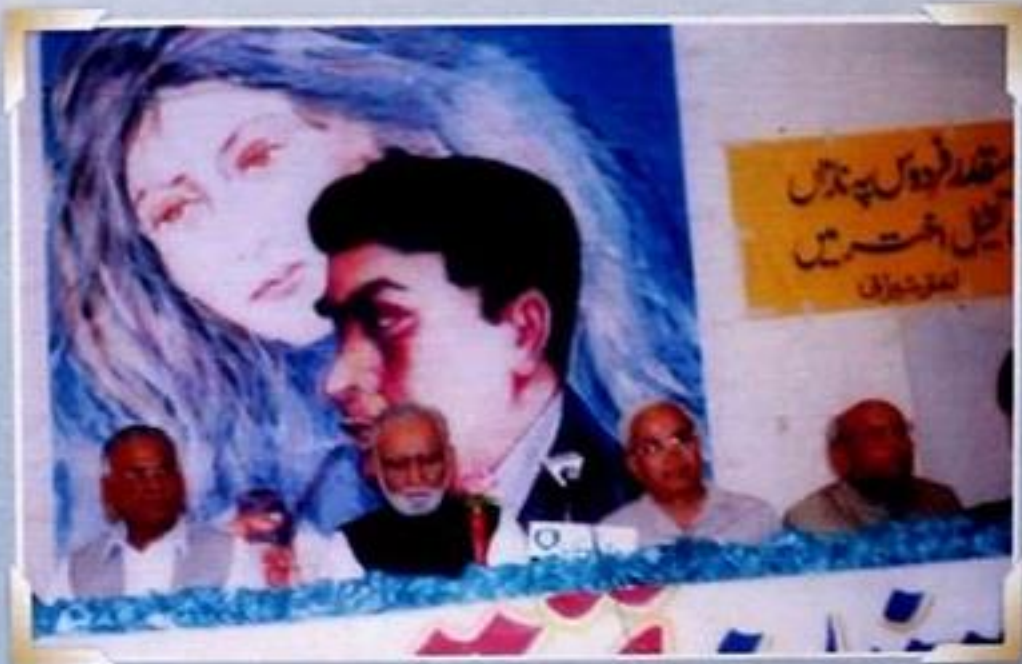
اختر شیرانی اکیڈمی کراچی کے زیر اہتمام جشن اختر شیرانی کے موقع پر ڈاکٹر یونس حسنی، ڈاکٹر عبدالوہاب، سید صفوان اللہ اور ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی

ڈاکٹر محمد علی صدیقی، کراچی

محمد سعید شیخ، لاہور

کفایت دہلوی، نئی دہلی

ڈاکٹر خالد حمید شیدا، ایم ڈی
ہوسٹن، امریکہ

یادِ رفتگاں

اکرام رانا مرحوم، لاہور

صادق حسین مرحوم، لاہور

ایوانِ غالب

نظم و نثر کی قلمرو کا انتظام ایزد توانا کی
عنایت سے خوب ہو چکا - اگر اس نے چاہا تو
قیامت تک میرا نام و نشان باقی رہے گا۔

غالب

عودِ ہندی طبع اول میرٹھ 1858ء

ڈاکٹر محمد علی صدیقی، کراچی

غالبؔ اور آج کا مقدّر

فروری غالبؔ کا مہینہ ہے۔ شاید اسی لیے نئے سوالات کی فصل لاتا ہے اور پرانے جوابات پر خط تنسیخ کھینچ دیتا ہے۔ غالبؔ عالمی ادب کی ان چند گنی چنی شخصیات میں سے ہیں جنھوں نے ذہنِ انسانی کو بے پناہ تموّل بخشا ہے اور اس لیے مقامِ تعجب نہیں کہ ان کی فکر وفن کے متوالے غالبؔ کی حیثیت کو چیلنج نہیں کرتے بلکہ ان سے اغماض برتنے والوں کی سمجھ بوجھ پر شک کرتے ہیں۔

آخر وہ کیا بات تھی جو غالبؔ پر آکر تمام ہو گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ غالبؔ نے انسان و کائنات کے امور پر غور وخوض کی جو دعوت دی ہے وہ اردو کے کسی اور شاعر نے نہیں دی۔ یوں لگتا ہے کہ غالبؔ کے سامنے شمع فکر آتے آتے دعوت اندیشہ میں بدل گئی، اور اس طرح دکنی شعرائے اُردو سے لے کر میر تقی میرؔ تک جس روایت کی پاسداری اُردو شاعری کی شرط اولیں قرار پا چکی تھی، اس کی بساط یک بیک الٹ گئی اور ہم ایک ایسے دور میں داخل ہوتے ہوئے نظر آنے لگے ہیں جب مفروضات کی حوصلہ شکنی اور مسلّمات کی تلاش وتوقیر شروع ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ دور ہے جب برصغیر کے مسلمانوں کی سب سے بڑی تحریک کے رہنما سر سیّد احمد خاں ایک نئے علم الکلام کی جستجو میں سرگرداں تھے۔ نئے علم الکلام کی ضرورت بذاتِ خود ایک ایسی جدوجہد تھی جس پر جس قدر بھی غور کیا جائے، کم ہے۔ نئے علم الکلام کی جستجو اسی وقت بامعنیٰ نظر آسکتی ہے جب اعتقادات کے ترکش کے سارے تیر خرچ ہو چکے ہوں اور معتقدین کو اپنے زوال اور پستی کے اسباب نظر آنے بند ہو گئے ہوں۔ برصغیر کے مسلم بالادست طبقے پر ایک ایسا پیغمبری دور مسلط ہو چکا تھا، اور ان کے سیاسی قویٰ اس درجہ مضمحل ہو چکے تھے کہ ان کے لیے دشمن کی توپوں میں کیڑے پڑنے کی دعائیں مانگنا فطری امر ہو چکا تھا، یوں لگتا تھا کہ جن افواج نے باہمی حسد اور نفاق میں گرفتار راجپوت سرداروں پر بہ آسانی فتح پائی تھی، وہ اپنے اندر جاری و ساری نفاق کو (خواہ وہ ایرانی اور ترک سرداروں کی باہمی چپقلش کی صورت میں ہو یا عوام اور امرا کے مابین رسہ

کشی کی صورت میں ہو) معذرت رساں نہ سمجھتے ہوں۔ وہ ۱۸۵۷ء میں سو سال سے قائم برطانوی حکومت کے جبروت پر قائم انتظامیہ کی مسلسل کامرانیوں پر غور وفکر کرنے کے بجائے ''لعنت بر پدرِ فرنگ'' کے تبرّہ ہی کو کافی سمجھتے ہوں۔

ظاہر ہے کہ اس نوع کی تبرّہ بازی نے لال قلعہ کی علامت حکومت کے ذہن کو ''شل'' کر دیا تھا۔ اور اب وہ معجزات اور کرامات ہی کے منتظر ہو سکتے تھے۔ سر سیّد احمد خاں نے ان معجزات، کرامات اور خارق العادت توقعات کے خلاف ایک 'نیم سائنسی' علم الکلام کی بنیاد رکھی جو ان کی تفسیر سے عیاں ہے۔ اگر ہم عین اس ہنگام جب سر سیّد اپنے علم الکلام کی 'عوامی تائید' کے خواہش مند تھے اور گویا فرضِ محال کی منزل میں تھے۔ غالب کی سوال انگیز شاعری میں سبب اور مسبّب جیسا رشتہ موجود ہے۔ بڑا شاعر اپنے جلو میں ہر شعبۂ زندگی میں اپنے لیے سنگھی اور ساتھی پیدا کرتا ہوا چلتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جب غالب نے سر سیّد کی مرتبہ ''آئین اکبری'' کے لیے تقریظ لکھنے سے معذرت کر لی اسی وقت سر سیّد نے غالب کی نکتہ رسی کو اپنے دور کے بزرگ شاعر کی شاعری میں تلاش کیا ہوگا اور وہ لاجواب ہو چکے ہوں گے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ سر سیّد غالب کے صاف جواب کے باوجود بھی ''آثار الصنادید'' میں غالب کی شان میں قصیدہ خواں نظر آتے ہیں۔ جب کہ محمد حسین آزاد تذکرہ مشاہیر شعرائے اُردو (آبِ حیات) میں غالب کی شاعرانہ عظمت کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے ملتے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سر سیّد اور غالب میں بہر حال ایک ایسا ذہنی رشتہ موجود ہے جو غالب اور آزاد میں مفقود تھا۔ شاید اسی لیے سر سیّد غالب کے لیے اور غالب سر سیّد کے لیے خصوصی گوشۂ رعایت رکھتے ہیں (غالب اور سر سیّد احمد خاں، خاندان لوہارو کے رشتوں میں بھی بندھے ہوئے تھے)۔ جو جذباتی بھی ہے اور فکری بھی۔

غالب نے وہ کون سا معرکہ ہے جو سر نہ کیا ہو۔ کیا کسی لٹے پٹے قافلے میں شامل افراد پر حقیقی صورت حال کی وضاحت کچھ کم اہم کام ہوتی ہے۔ غالب صحیح معنوں میں اپنی قوم کے لیے Anti-Hero تھے اور یہی وجہ ہے کہ آج کی حقیقت پسند نسل کے لیے ''ہیرو شاعر'' ہیں۔ غالب نے نوجوانوں کی دنیا میں رہنے والوں کے لیے 'زمیں مہیا' کی۔ 'زمینیت' کے احساس سے راستہ کھوتا نہیں ہوتا اور شاید اسی لیے بھٹکے ہوئے لوگ زمینی حقائق سے کتراتے ہیں۔

دیکھا گیا ہے کہ سنگین حقائق کے لیے صرف انھی حضرات میں تپاک ہوتا ہے جو خوابوں میں رہنا نہیں چاہتے۔ غالب کی شاعری غالب کے ساتھ ساتھ اپنے دلدادگان کو بھی ''اندیشوں اور وسوسوں'' سے دوچار کرتی ہے اور دیکھا جائے تو ''اندیشوں'' کی پرورش ہی سے ان سوالات پر غور وخوض کیا جا سکتا ہے جو ہمارے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہو جاتے ہیں۔

آج کی صورتِ حال پر نظریں دوڑائیں۔ یوں لگتا ہے کہ بعض حلقے اصل حقائق کے

بارے میں سنجیدہ نہیں ہیں۔ وہ اپنے مفروضات کی دنیا میں رہنا چاہتے ہیں جہاں صرف ''سب کچھ ٹھیک ہے'' کا ورد ہے۔ ممکن ہے کہ یہ صورت حال پریشان حال اشرافیہ کی نفسیاتی ضرورت ہو اور وہ ''سب کچھ ٹھیک ہے'' کے علاوہ سننا اور جاننا نہ چاہتے ہوں لیکن اس عرصے میں دریائے سندھ کے پلوں کے نیچے سے اس قدر پانی گزر چکا ہے کہ آج کا دریائے سندھ کل کا دریائے سندھ نہیں رہ پایا۔ اور نہ آج کا بحیرۂ عرب کل کا بحیرۂ عرب ہو سکتا ہے۔ صرف پانی کی یکسانیت سے دریا اور سمندر کی کیفیات میں ہمیشگی کی تلاش بے سود رہے گی۔

اگر ہم اپنی موجودہ صورت حال کی تشریح و تحلیل فکرِ غالبؔ کی وساطت سے کر دیں تو پھر اربابِ حل و عقد سے درخواست کی جائے گی کہ وہ صورت حال کی سنگینی کا جائزہ لیں اور وہ دامِ التباس جو انھوں نے مخلوقِ خدا کی نظروں پر ڈال رکھا ہے وہ خود ان کی آنکھوں پر نہ پڑ چکا ہو۔ صورتِ حال کچھ یوں ہے:

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفت ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

لیکن غالبؔ انسانی مقدر (Human Destiny) کی تابناکی کے خیال سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوتے اور یہی ان کا وصفِ خاص ہے۔ جس قدر سیلابِ بلا کی حرکت تیز ہوتی رہتی ہے۔ غالب کے ذوقِ سفر میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

نہ ہو گا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

اور جب صورتِ حال یہ ہو تو پھر التباس کے پردے چاک کر دیے جائیں کہ یہی معقولیت کا تقاضہ ہے۔

پروفیسر شمیم حنفی، نئی دہلی

غالب کے مطالعے کی اہمیت

(غیر اردو کلچر اور روایت کے حوالے سے)

غالب کی شاعری نے ہماری ذہنی اور جذباتی ضرورتوں کی تکمیل کے ایک اہم وسیلے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ زندگی کے مختلف مرحلوں میں غالب کے شعر ہمیں اچانک یاد آ جاتے ہیں اور کبھی کبھی، کسی خاص تجربے سے گزرتے وقت یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ غالب سے مدد لیے بغیر اس تجربے کی تفہیم ہمارے لیے ادھوری رہے گی۔ غالب کے شعروں سے ہمیں ایک خاموش طاقت بھی ملتی ہے، ان تجربوں کے بوجھ سے سبک دوش ہونے کی۔ گویا کہ ہم سفری اور ذہنی و جذباتی موانست کی بعض کیفیتیں ہیں جو غالب کو اپنے عہد کے دائرے سے نکال کر ہمارے پاس لے آتی ہیں۔ ہم غالب کے آئینۂ خیال میں اپنی حسرتوں، آرزوؤں، روحانی اور باطنی پیچیدگیوں، اور اپنی دنیا کے بہت سے تماشوں کا عکس دیکھنے لگتے ہیں۔

لیکن یہ بات تو دوسرے بہت سے شاعروں، ادیبوں اور ادب پاروں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ اپنے آپ کو سمجھنے اور اپنی دیکھی ان دیکھی دنیاؤں کو سمجھنے کے ذرائع ہمیں دوسروں نے بھی مہیا کیے ہیں۔ پھر غالب کا امتیاز کیا ہے؟ ڈاکٹر آفتاب احمد کا خیال ہے کہ ہر بڑے شاعر کی طرح غالب کے تخیل اور تخلیقی طاقت نے اپنی ایک خاص دنیا تعمیر کی ہے اور یہ دنیا عام انسانوں کے تجربوں سے آباد ہے۔ یہ دنیا ہماری رسائی سے آگے کی دنیا نہیں ہے۔ یہ دنیا ہم سے اپنے آپ کو تبدیل کرنے، اپنے اندر نئے اوصاف پیدا کرنے، اپنی اصلاح کرنے کا تقاضہ نہیں کرتی۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

> (میر اور اقبال کی دنیاؤں کے مقابلے میں) مجھے غالب کی دنیا عام انسانوں کی دنیا نظر آتی ہے۔ اس میں امیدؔ و بیم بھی ہے اور شکر و شکایت بھی۔ 'مرغ اسیر' کی سی کوشش بھی اور 'حسرت تعمیر' بھی۔ یہاں بہار کے پھول بھی کھلتے ہیں اور خزاں کے پھول بھی۔ درد و غم کی کسک بھی ہے اور زندگی سے لطف و انبساط اٹھانے کی خواہش بھی۔ حسنِ طبیعت اور ذوق جمال بھی ہے اور حسِ مزاح و ظرافت بھی۔ مختصر یہ کہ غالب کی دنیا ہماری

آپ کی جانی پہچانی دنیا ہے۔ اس کی فضا میں آدمی آسودگی کے ساتھ اور کھل کر سانس لے سکتا ہے۔

(میر، غالب اور اقبال۔ تین صدیوں کی تین آوازیں، ص ۶۷)

ادب کے ایک عام قاری کی حیثیت سے دیکھا جائے تو غالب کی کائناتِ خیال سے ہمارا یہ تعلق ایک دولتِ کم یاب، ہے، ایک ایسی سعادت ہے جو ہمارے حصے میں روز روز نہیں آتی۔ ہم سے ہر بڑی شاعری، بالعموم، اپنی شرطوں پر پڑھے جانے کا مطالعہ کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ غالب کے تخلیقی اظہار اور فنی حکمتوں کی تعبیر کے اپنے آداب ہیں اور اُن سے باخبری کے بغیر غالب کی حسیّت کے مخفی اسرار تک رسائی آسان نہیں۔ لیکن غالب کی بصیرت کا دروازہ ہم سب کے لیے کھلا ہوا ہے۔ غالب زندگی کی عام حقیقتوں کے ادراک میں اپنی ہستی کے سوا کسی نظریے، عقیدے، تصور، ترجیح کو وسیلہ اور واسطہ نہیں بناتے۔ چنانچہ ان کے پڑھنے والے کو بھی اپنے احساسات کے سوا، غالب تک پہنچنے کے لیے کسی بیرونی سہارے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس در سے، حسب توفیق، ہر کس و ناکس کو کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے۔ بے شک غالب کا شمار اپنے عہد کے خواص میں ہوتا تھا۔ رہ و رسم عوام سے انھیں دور کی نسبت تھی۔ اپنے ذہنی میلان اور شخصیت کی وضع کے لحاظ سے غالب میں انفرادیت کا عنصر نمایاں تھا۔ مسلمات کو وہ خاطر میں نہیں لاتے تھے اور بڑی سے بڑی آزمودہ سچائی پر سوالیہ نشان قائم کرنے میں انھیں باک نہ تھا۔ پھر بھی، غالب کی حسیت کا جمہوری مزاج، ان کی شخصیت کا پھیلاؤ، ان کے وجدان کی حیرت ناک لچک، ان تصورات کی بے خوفی اور ان کے اظہار کی جسارت غالب کو 'اردو سمیت' اپنے زمانے کا سب سے بڑا شاعر بناتی ہے۔ زندگی کے تمام قرین قیاس اندھیروں اور اجالوں، تمام ممکنہ تضادات سے بھری پُری غالب کی شعری دنیا اردو کے دوسرے ہر بڑے شاعر ((میر، اقبال) کی دنیا سے زیادہ فطری ہے اور ہماری دست رس میں آسانی سے آجاتی ہے۔

محمد حسن عسکری نے (اپنے ایک کالم میں بہ عنوان غالب کی انفرادیت، ۱۰ مارچ ۱۹۵۰ء) کو لکھا تھا:

بڑا شاعر اتنی بڑی روح کا مالک ہوتا ہے کہ وہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے پوری نسلِ انسانی کی مجموعی کیفیت کا احاطہ کر سکتا ہے۔ اگر غالب میں کوئی اور بات نہ ہوتی تو انھیں بڑا بنانے کے لیے یہی بات کیا کم تھی کہ انھوں نے اپنے زمانے اور اپنے بعد کے سو سال تک والے زمانے کے اہم ترین اور غالب ترین روحانی عناصر کو اپنے اندر محسوس کر لیا اور صرف یہی نہیں، بلکہ انھیں محسوس کرنے کے بعد ان کی شعری تجسیم اور تشکیل بھی کی۔

یہاں "اپنے بعد کے سو سال تک والے زمانے کے اہم ترین اور غالب ترین روحانی عناصر" کی

حد بندی درست نہیں کیونکہ غالبؔ زندگی کے ہر بنیادی سروکار، چھوٹے بڑے ہر جذبے، معمولی اور غیر معمولی ہر رویے اور سوال سے ''جڑے ہوئے'' شاعر ہیں۔ غالبؔ کی شاعری تمام تعینات سے آزادی کی شاعری ہے اور اس معاملے میں اُن کا کوئی ہمسر، کم سے کم ہماری اپنی روایت میں موجود نہیں ہے۔ اسی سلسلے میں ایک اور اہم بات یہ ہے کہ غالب نے تاریخ اور وقت کے ایک مخصوص اور معینہ دائرے کو بھی قبول نہیں کیا۔ اپنے وقت کا وہ گہرا ادراک رکھتے تھے۔ اُس وقت کے اندرونی انتشار اور کشاکش نے اُن کی حسیت کو متاثر بھی کیا ہے۔ غالب کی شاعری میں ایسے کتنے مضامین ملتے ہیں جن کی وساطت سے ایک نئے شعور، فکر کے ایک نئے نظام اور آنے والے دور کے تجربات تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اس طرح غالب نے تاریخ کے حصار کو ذہنی سطح پر تسلیم تو کیا، لیکن اس حصار کو اپنے بعض تصورات کا پس منظر بنانے کے باوجود اُس کی حدوں سے نکلنے کی کوشش بھی کی۔ ردّ و قبول کی اس صورتِ حال سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ غالب نے تاریخ میں رہتے ہوئے بھی کسی کی تابعداری نہیں کی۔ اپنی تخلیقی آزادی پر انھوں نے تاریخ سے کوئی سودا نہیں کیا۔ نئی قدروں اور نئے تصورات کی روشنی سے اپنے باطن کو منور کرنے کے باوجود غالب نے اپنی انفرادیت کو بچائے رکھا۔ اس توازن کو برقرار رکھنے میں انھیں کامیابی اس لیے ملی کہ انھوں نے تاریخ سے بڑی چیز یعنی اپنی روایت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ غالب کی شاعری اپنی روایت میں سانس لیتی ہے، تاریخ میں نہیں۔ یہ روایت گزشتہ اور موجودہ کو ایک ہی تسلسل کا حصہ بنا دیتی ہے۔ یہ روایت ماضی کے احساس کو تخلیقی طاقت کے ایک سرچشمے کے طور پر محفوظ رکھتی ہے۔ غالب نے وقت کے بدلتے ہوئے مزاج کو اچھی طرح پہچان لینے کے بعد بھی اپنے آپ کو اُس سطح پر بدلنے کی کوئی کوشش نہیں کی جو انیسویں صدی کے ہندوستان میں مذاق عامہ کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ غالب مردہ پروری کے خلاف تھے، لیکن روایت اُن کے لیے فیضان کی ایک جاوداں اور پیہم رواں لہر تھی جس سے اپنی شخصیت اور اپنے تہذیبی شعور کو وہ اب بھی سیراب کر سکتے تھے۔ انیسویں صدی کے سماجی قائدین اور مصلحین کے مقابلے میں غالب کا تاریخی شعور زیادہ منظم اور مستحکم تھا۔ لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اُن کی تہذیبی شخصیت بھی اتنی ہی مربوط اور مستحکم تھی۔ اسی لیے وقت کے بہاؤ میں غالب کے پائے استقلال کو جنبش نہیں ہوئی۔ اپنی روایت کے بہترین عناصر اور اوصاف سے ان کی شخصیت ہمیشہ مزین رہی۔ غالب کو نئے سوالوں کا ترجمان اور ایک نئی بصیرت کا نمائندہ قرار دیتے وقت یہ حقیقت اکثر نظرانداز کر دی جاتی ہے کہ ''آئین روزگار'' کی آگہی نے غالب کو اپنے ماضی کے احساس سے پل بھر کے لیے بھی غافل نہیں ہونے دیا۔ اُن کی شخصیت اپنے معاصرین (ذوقؔ، مومنؔ، ظفرؔ) اور اپنے بعد کے مصلحانہ جوش رکھنے والے شعرا (آزادؔ، حالیؔ) کی بہ نسبت تخلیقی اعتبار سے کہیں زیادہ شاداب اور تابندہ جو دکھائی دیتی ہے تو اسی لیے کہ اس کی پرداخت کا بوجھ اُن کے

اپنے زمانے کے علاوہ دوسرے کئی زمانوں نے بھی اٹھایا تھا۔ اس گھنے سائے نے غالب کی شخصیت کو سکڑنے اور سوکھنے سے بچائے رکھا، اس حد تک کہ اپنے بعد والوں کے لیے بھی غالب کی حسیت اور شعور کی تازگی میں فرق نہیں آیا۔ پچھلی صدیوں کے بڑے سے بڑے شاعر کے مقابلے میں غالب ہمیں زیادہ بامعنی اور تازہ کار نظر آتے ہیں۔

غالب کی معنویت کو سمجھنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھیں صرف اپنی تاریخ، اپنی تہذیب اور اپنی روایت سے الگ کر کے آج کے مجموعی تناظر میں رکھ کر دیکھا جائے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اردو اور فارسی کے علاوہ دوسرے لسانی معاشروں کے متعلقین بھی غالب سے مکالمہ قائم کر لیتے ہیں اور غالب کے اشعار میں انھیں اپنی روح کی سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں۔ غالب سے زمانی یا مکانی فاصلہ، بلکہ غالب کی روایت اور اُن کی شاعری کے معاشرتی اور تہذیبی سیاق سے لاتعلقی غالب کی تفہیم و تعبیر میں بالعموم رکاوٹ نہیں بنتی۔ انگریزی داں طبقے نے، بیسویں صدی کے اوائل میں غالب کی طرف جو توجہ دی اس کا سبب محمد حسن عسکری کے نزدیک یہ تھا کہ "رومانی شاعروں کے یہاں اور غالب کے یہاں کوئی قدر مشترک ضرور تھی، اور غالب کے کلام میں چند ایسے خصائص موجود تھے جن کا یہ طبقہ رومانی شاعری پڑھ پڑھ کر عادی ہو چکا تھا۔" (غالب کی انفرادیت، کالم مشمولہ تخلیقی عمل اور اسلوب، مارچ ۱۹۵۰ء)۔ لیکن رومانیت سے شغف تو اب تقریباً ٹھنڈا پڑ چکا ہے۔ پھر بھی غالب کی مقبولیت میں کمی نہیں آئی۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ غالب کو ہماری اپنی روایت سے باہر، آج جو باتیں مطالعے کے قابل بناتی ہیں اُن کا رمز دراصل غالب کی شاعری کے عالم گیر اوصاف میں مضمر ہے۔ غالب کی شاعری اُن سوالوں سے علاقہ رکھتی ہے جو کسی بھی عہد کی انسانی صورتِ حال سے رونما ہو سکتے ہیں۔ غالب کا رویہ اُن سوالوں کی طرف محض اپنی تاریخ و تہذیب، یہاں تک کہ اپنی لسانی روایت کے واسطوں تک بھی محدود نہیں ہے۔

غالب کی بصیرت اپنی قائم بالذات سطح پر بھی، پڑھنے والوں کے احساسات پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ اُن کے شعور میں ارتعاش پیدا کر سکتی ہے۔ اپنے تجربوں کا مفہوم متعین کرنے میں اُن کی معاون ہو سکتی ہے۔ اس مسئلے پر مزید بحث کیے بغیر، غالب کے بہ ظاہر "اجنبی" قارئین کے ردِ عمل سے شناسائی یہاں ہمارے لیے کارآمد ہو سکتی ہے۔ پچھلے کچھ دنوں سے غالب کے بارے میں غور و فکر کا دائرہ بھی وسیع ہوا ہے اور اس سلسلے میں تیزی بھی آگئی ہے۔ اردو کے علاوہ ہندوستان کی دوسری زبانوں، علاقوں اور روایتوں سے وابستہ ادیبوں میں غالب اب ایک مستقل موضوع کا مقام حاصل کر چکے ہیں۔ بنگالی میں غالب کے تراجم (شکتی چٹوپادھیائے، عین رشید) کا ایڈیشن ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوا اور اسے قبولیت ملی۔ شمشیر بہادر سنگھ جو اردو ہندی کے ادب کی مشترکہ تاریخ لکھنا چاہتے تھے اور جن کا نام جدید ہندی شاعری کے اولین معماروں میں شامل ہے، غالب کی حسیت کو ہندی شاعری کی جدید حسیت کے پورے سرمائے پر فوقیت دیتے تھے۔ اسی

طرح، دوسری ہندوستانی زبانوں کے ادیب ہیں جو غالب کو کسی رفتہ وگزشتہ زمانے کے بجائے آج کی انسانی صورتِ حال کا شاعر قرار دیتے ہیں۔ سب سے پہلے تمل میں غالب کی غزلوں کے مترجم (سی-کے- دوارکا نیل منی) کا ایک بیان حسب ذیل ہے۔[1]

> تمل میں غزل کا کیسٹ بنانے کے مقصد سے میرے ایک دوست نے تمل میں غزل لکھنے کے لیے کہا۔ یہیں سے غزل کے بارے میں میری تلاش شروع ہوئی۔ چینئی یونیورسٹی کے کتب خانے، مرکزی کتب خانے، اورینٹل تاڈیٹر کتب خانے، کنی میرا کتب خانے وغیرہ کی کئی کتابوں سے غزل کے بارے میں واقفیت حاصل ہوئی--- ان کتابوں سے (غالب کے بارے میں کلکتے سے شایع ہونے، آر-این-رینا کی کتاب) کو پڑھتے ہوئے مجھے ان غزلوں کو تمل میں ترجمہ کرنے کی خواہش ہوئی۔ اس کے بعد میں نے غالب کی غزلوں کا تمل میں ترجمہ کرکے (.............. کے نام سے) ایک کتاب کی شکل میں شایع کیا۔
>
> -----
>
> یہ ترجمہ کرتے وقت مجھے احساس ہوا کہ بولی اور علاقے میں فرق ہونے پر بھی "دنیا بھر کے لوگ ایک جیسے ہی ہیں۔"
>
> -----
>
> اس کتاب کو میری دوسری کتابوں سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔
>
> -----

حالیہ برسوں میں غالب پر ہمارے یہاں انگریزی میں جو مواد سامنے آیا، اس میں پون کمار ورما کی کتاب (Ghalih: His Life & His Times) سب سے زیادہ معروف ہوئی۔ اُن کا خیال ہے کہ:

> (غالب کی) سب سے بڑی خوبی، یہ ہے کہ اس کا دائرہ بہت بڑا ہے۔ شاید ہی کوئی ایسی بات ہوگی، زندگی میں جس کی اہمیت ہو (اور) اس پر غالب نے روشنی نہ ڈالی ہو۔ اس میں مذہبی رواداری کا جو اظہار ہے، جسے Eclectic شاعری کہتے ہیں، غالب کا خاص حصہ ہے۔
> اُن کی شاعری کا سب سے اہم عنصر، فلسفہ ہے، ان کا مابعد الطبیعیاتی پہلو۔ یوں کہنا چاہیے کہ اپنے ذاتی عقاید کی وجہ سے غالب کی شاعری تنگ یا چھوٹی نہیں ہوئی۔
>
> -----

غالب اپنی صدی کے Chronicler (وقائع نویس) تھے۔ ان کے خطوں سے ایک مکمل پورٹریٹ بن جاتا ہے اُس زمانے کا۔

ہندی کے ایک معروف شاعر اور نقاد، اشوک باجپئی کے لفظوں میں:

مجھے لگتا ہے کہ...... ہماری صورت حال، یعنی ہندوستانی صورت حال میں غالب پہلے جدید شاعر ہیں --- تین معنوں میں وہ تجدّد کے، وہ پہلے کلاسک ہیں--- ایک تو یہ کہ ان کے یہاں فرد شاعری کے مرکز میں موجود ہے--- بغیر کسی استواری جہت، بغیر کسی روایتی آدرش اور ایقان کے--- ایک نہتے انسان کی شکل میں--- دوسری بات غالب کا استفہامیہ مزاج ہے، ہر بات پر سوال قائم کرنے کی جرأت وہ دنیا کے تماشے پر سوال، اپنے وقت پر سوال اٹھاتے ہیں۔ غزل کی صنف جو ایک نرم اور شیریں وسیلہ اظہار کا، سمجھی جاتی تھی، غالب نے اسے ایک مختلف شکل دے دی--- تیسری بات یہ ہے کہ غالب کے یہاں ہندی اور فارسی روایت کا ایک امتزاج، ایک معنی خیز باہمی ربط ملتا ہے--- ہندی روایت کو غالب کی شاعری میں ایک نئی زبان ملی۔

غالب تھے تو انیسویں صدی میں، لیکن ان کا سب سے زیادہ اثر محسوس کیا گیا ہے بیسویں صدی میں گجراتی میں، مراٹھی میں، بنگلہ میں، (مشرق و مغرب کی کئی زبانوں میں) غالب کا ترجمہ ہوا اور غالب کو کئی طرح سے دیکھا گیا۔ ایک تو غالب کو روحانی تجربوں کے شاعر کی حیثیت سے دیکھا گیا ہے میرے پاس ایک مجموعہ ہے، دنیا مابعد الطبیعیاتی شاعری کا--- اس میں ہندستان کے جو شاعر لیے گئے ہیں--- وید اور اپنشد کے علاوہ، ایک حصہ گیتا کا ہے، گوتم بدھ کے کچھ کتھن ہیں--- اور پھر کبیر، میرا اور غالب۔

دوسری شکل یہ ہے کہ غالب کے بعد اردو شاعری وہ کچھ نہیں رہی جو غالب سے پہلے تھی۔ غالب تاریخ کے نہیں، ابدیت کے شاعر ہیں۔ اور ہمارے لیے وہ یوں بامعنی بنتے ہیں کہ ہم سے وہ ایک ہم عصر کی طرح مکالمہ قائم کرتے ہیں۔

یہ بات بھی بہت کھل کر، بغیر کسی جھجک کے کہی جانی چاہیے کہ غالب انیسویں صدی میں، نہ صرف ہندستان کے سب سے بڑے شاعر تھے بلکہ

دنیا کے سب سے بڑے شاعروں میں ہیں--- اپنی نگاہ کے پھیلاؤ میں، اپنی نئی وضع کی فکر میں، اپنے فلسفیانہ استدلال اور کھرے پن میں، اپنی جسارت مندی میں، اپنی بے چینی اور پریشان نظر میں، غالب ایک بہت بڑی شخصیت کے طور پر ابھرتے ہیں۔ وہ ایک ایسی بڑی برادری کا حصہ ہیں جو ہمارے یہاں وید سے لے کر اب تک پھیلی ہوئی ہے۔

ہندستانی صورتِ حال میں غالب، سکون اور آسودگی کے احساس سے عاری (فکری) روایت کے پہلے بڑے شاعر ہیں۔ ان کے یہاں تماشے کا جو احساس ہے، وہ بھیانک ہے۔ اس میں کوئی سامان راحت نہیں، کوئی بچاؤ نہیں، اس تماشے میں cosmic، کائناتی تخیل کے عجیب و غریب کھیل شامل ہیں۔ غالب ان معدودے چند متقدمین اور متوسطین میں ہیں، جن کے ساتھ ہم آج بھی سیدھی بات چیت کر سکتے ہیں۔ ان کے لیے ہم کو کسی ترجمان کی ضرورت نہیں۔

غالب ہمارے اضطراب اور تجسس، زمانے کے ساتھ ہمارے رابطوں سے، ہمارے آج کے خوابوں سے، ہماری عصریت سے۔ غرض کہ کئی واسطوں سے مکالمے کی دعوت دیتے ہیں۔

اس سلسلے کے آخری اقتباسات ملیالم زبان کے ممتاز شاعر، نقاد اور ادبی مفکر پروفیسر کے سچد انندن کے ہیں۔ کہتے ہیں:

میں صرف ایک قاری ہوں۔ میرا غالب سے اسی طرح کا تعلق ہے جیسا کہ بیسویں صدی کے کسی شاعر کا پہلے کی صدی کے عظیم پیش رووں سے ہوسکتا ہے--- اس طرح میں پاتا ہوں کہ وہ میرے اپنے ہم عصر ہیں، وہ مجھ سے ایک جدید شاعر کی طرح بات کرتے ہیں۔

غالب ایک ایسے دور کے شاعر ہیں جب رشتوں کا بنے رہنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔ سماج میں (انسان کی) بے توقیری کا احساس بڑھ رہا تھا۔ بے معنویت کا احساس اور کھوکھلے پن کا احساس۔ اس زمانے کی دلّی دشواریوں اور خون خرابے کی بستی تھی۔ یہاں سرگرمی تھی، لیکن مایوسی بھی، شور شرابہ تھا، لیکن گہرا اکیلا پن بھی غالب نے یہاں محسوس کیا۔

یہاں بھری پری بستی میں بھی جائے اماں نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے سب سفر میں ہیں۔ یہ سمجھ پانا مشکل تھا کہ ہمارے ساتھ یہ سب تماشہ کیا ہے؟ کیا ہو رہا ہے؟ انسانوں میں پھیلتا ہوا ایک غیر انسانی ماحول۔ اک ساتھ ان تمام تجربوں نے غالب کو صحیح معنوں میں جدید شاعر بنا دیا۔ مجھے لگتا ہے کہ اُن کے سوال میرے سوال ہیں گو کہ میں ایک علاحدہ وقت میں رہتا ہوں اور ایک الگ زبان میں لکھتا ہوں۔

جو سوال غالب نے اٹھائے ہیں وہ فارسی، اردو (شاعری سے وابستہ) روایتی سوالوں سے بہت مختلف نہیں تھے۔ عشق کیا ہے؟ خدا کیا ہے؟ کائنات میں انسان کی حیثیت کیا ہے؟--- لیکن ان کے جواب مختلف ہیں۔ ان کے جواب انسانی رشتوں کی ایک نئی دستاویز سامنے لاتے ہیں۔ دنیاوی اور ماورائی عناصر ایک ساتھ اُن کے یہاں اظہار پاتے ہیں، انھیں ایک نئی زبان، ایک نئے شعری محاورے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، اسی لیے زبان کے روایتی مذاق کو وہ قبول نہیں کرتے۔ ایک ادیب کی حیثیت سے غالب کی عظمت یہی ہے کہ وہ ایک نیا محاورہ تلاش کرتے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ وہ مستقبل کی زبان گڑھ رہے ہیں۔ طمانیت کے خاتمے اور تشکیک کا ایک نیا تجربہ، اپنے اظہار کے لیے نئی زبان چاہتا تھا۔ غالب نے شاعر کا روایتی رول اختیار کرنے سے انکار کیا۔

ان تفصیلات کے بیان کا مقصد اس حقیقت کی نشاندہی ہے کہ غالب کی شاعری اردو کی پوری روایت میں اپنی ایک ایسی شکل اور منفرد شناخت رکھتی ہے جس سے دوسری روایتوں کے تربیت یافتہ ذہن بھی آسانی سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ اُن کی اپیل پر اپنی روایت کے تہذیبی اور لسانی عناصر تک کو پس پشت ڈال دیتی ہے اور زندگی کے کچھ ایسے رموز کا انکشاف کرتی ہے جن سے کوئی بھی حساس روح آنکھیں نہیں چرا سکتی۔ غالب اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے زندگی کی بنیادی حقیقت یعنی اپنی ''ہستی'' کے احساس کو اپنے تمام سوالوں کا مرکزی حوالہ بنایا۔ کرکے گار نے اس احساس کو وجود کے باطنی تجربے کے بجائے فن نفسہٖ وجود کا مترادف قرار دیا تھا۔ گویا کہ ہمارے لیے اپنے وہی تجربے بامعنی بنتے ہیں جنھیں ہم ''وجودی تجربے'' کے طور پر برت سکیں۔ بہ قول نطشہ--- ''اگر ہماری آنکھیں اس حقیقت کو پہچان سکیں تو ہم انجام کار اسی نتیجے تک پہنچیں گے کہ ہر فلسفیانہ فکر کا اختتام اپنی ہستی کے تجربے پر ہوتا ہے۔'' غالب کی شاعری ہمیں بتاتی ہے کہ انسان زندگی کے ہر مظہر کو نظر انداز کر سکتا ہے سوائے اپنے وجود کے۔ وہ اپنے آپ سے بھاگ کر کہیں

نہیں جا سکتا۔ کر کے گار کے لفظوں میں---''ہم اپنے آپ سے بھاگنا چاہتے ہیں لیکن وجود کی زنجیر ہمیں کہیں جانے نہیں دیتی۔ ایک عجیب کھینچ تان میں زندگی گزر جاتی ہے۔ اسی تجربے سے ہم پر اس سچائی کا انکشاف ہوتا ہے کہ ایک فرد کی حیثیت سے زندہ رہنا کتنا دشوار ہے، لیکن کس قدر ناگزیر۔'' صرف اپنے دور کی ترجمانی جامد اور گریز پا حقیقتوں کو جنم دیتی ہے۔ غالب اپنے زمانے کی حدوں سے آزاد اسی لیے ہو سکے کہ انھیں متحرک اور سیال حقیقتوں کی تلاش تھی، ایسی حقیقتیں جو آنے والے زمانوں کا تجربہ بھی بن سکیں۔ انھیں زندگی کی دشواریوں کے ساتھ ساتھ زندگی کی ناگزیریت کا احساس بھی تھا۔ غالب جب یہ کہتے ہیں کہ ''اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو'' تو گویا کہ آگہی اور غفلت، یا شعوری اور غیر شعوری دونوں سطحوں پر اپنی ہستی کا اثبات کرتے ہیں۔ زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ اپنی ''ہستی'' کا مسئلہ ہے۔ غالب کی شاعری کا بنیادی سروکار اسی مسئلے سے ہے اور یہی مسئلہ اُن کی فکر کا مرکزی حوالہ ہے۔ اس مسئلے کی گونج سے زندگی کا آباد خرابہ کبھی خالی نہیں ہوگا۔ چنانچہ غالب کی آواز بھی ہمیشہ توجہ سے سنی جائے گی۔ زندگی کے تمام کھیلوں میں سب سے زیادہ الجھا ہوا، اندوہ پرور، مگر دلچسپ کھیل اپنی ہستی کا تماشا ہے۔ اگر اپنی ہستی بھی فریب ہے تو پھر سب کچھ فریب ہے۔ (ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے۔) غالب کہتے ہیں کہ ''ہستی فریب نامۂ موج سُراب ہے'' اور ایک ایسا تماشا جسے ہم ''دیکھتے ہیں چشم از خوابِ عدم نکشادہ سے۔'' گویا کہ تماشائی بجائے خود بھی ایک عجیب و غریب تماشہ ہے۔ ''عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے'' اور حقیقت صرف سانسوں کا جال ہے جس کے مرکز میں ہمارا اپنا وجود ہے اور کچھ بھی نہیں۔ یہ غالب کی انا گزیدگی نہیں، بلکہ ایک جبر کا اعتراف ہے اور اسی جبر سے انسانی اختیارات کی ابتدا ہوتی ہے۔ ہمیں غالب کے تجربوں میں اپنی ہستی کا عکس جو دکھائی دیتی ہے تو اسی لیے کہ غالب نے ایک حقیقت پسندانہ اور ٹھوس سطح پر انسانی وجود کے راز کو سمجھنے کی عظیم فلسفیانہ جستجو کی اور کائنات میں انسان کی حیثیت، انسانی ہستی کے رابطوں کا سراغ لگاتے رہے۔ اُن کی یہ تگ و دو کبھی ختم نہیں ہوئی کیونکہ ان سوالوں کا کوئی حتمی اور مطلق جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ خود غالب کے پاس بھی نہیں تھا۔

نمودِ غالب اسباب کیا ہے؟ لفظِ بے معنی
کہ ہستی کی طرح مجھ کو عدم میں بھی تامل ہے

غالب کے تحیر، استفہام اور بے چارگی میں لوگ اسی طرح اپنے احساسات کی پرچھائیاں دیکھتے ہیں اور ڈھونڈتے رہیں گے کہ یہ مسئلہ صرف غالب کا اور اُن کے عہد کا نہیں ہے۔

-----

۱) اس سلسلے کے تمام بیانات آکاش وانی کی نیشنل ہندی فیچر یونٹ نے غالب پر ایک نیشنل فیچر (اسکرپٹ: شمیم حنفی) کے لیے ریکارڈ اور محفوظ کر لیے ہیں۔ یہ فیچر ہندوستان کی تمام علاقائی زبانوں میں نشر کیا گیا۔

ڈاکٹر رضا حیدر۔ نئی دہلی

غالب کی رہائش گاہیں

(ولادت سے وفات تک)

میرزا اسداللہ خان غالب المعروف بہ میرزا نوشہ، الخاطب بہ نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ،

المتخلص بہ غالبؔ شب ہشتم ماہ رجب ۱۲۱۲ ہجری ۲۷ر دسمبر ۱۷۹۷ء کو شہر آگرہ میں پیدا ہوئے۔

(الطاف حسین حالی، یادگارِ غالب، صفحہ ۹)

یہ حوالہ غالب کے سب سے پہلے اور ممتاز ناقد الطاف حسین حالیؔ کا ہے۔ حالی نے غالب کی زندگی کے کئی نشیب و فراز اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے دنیا میں جتنے بھی ماہرین غالبیات ہیں وہ سب حالی کی کتاب (یادگارِ غالب) پر یقین رکھتے ہیں۔ آپ نے غالبؔ کی جائے پیدائش آگرہ قرار دی ہے جس پر تمام مورخین اور ماہرینِ غالب کا اتفاق ہے۔ حالیؔ، یادگار غالب میں غالب کے ایک خط کا حوالہ دے کر (جو غالب نے منشی شیونرائن رئیس آگرہ کو لکھا تھا) کہتے ہیں:

> ''شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں۔ انیس بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر اُن کی باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی، چونکہ گھر ان کا بہت دور نہ تھا اس واسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے۔ بس ہمارے اور ان کے مکان میں مچھیا رنڈی کا گھر اور ہمارے دو کٹڑے درمیان تھے۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے کہ جواب لکھمی چند سیٹھ نے مول لے لی ہے اسی کے دروازے کی سنگیں بارہ دری پر میری

نشست تھی۔ اور پاس اس کے ایک گھٹیا والی حویلی اور سلیم شاہ کے تکیے کے
پاس دوسری حویلی، اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی، اور اس سے
آگے بڑھ کر ایک کٹرا، کہ وہ گڈریوں والا مشہور تھا۔ اور ایک کٹرہ کہ وہ
کشمیرن والا کہلاتا تھا۔ اُس کٹرے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا، اور
راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔''

بروز بدھ، ۱۹/ اکتوبر ۱۸۵۸ء
(خطوطِ غالب جلد سوم، خلیق انجم، صفحہ ۱۰۵۴)

اس میں غالب نے اپنے مکان اور اردگرد کے مکانات کے بارے میں تفصیلی ذکر کیا ہے۔ جس حویلی میں غالب رہتے تھے اس کا نام کالا (کلاں) محل ہے۔ جس میں غالب پیدا بھی ہوئے اور اُسی گھر سے ان کی تعلیم وتربیت کا سلسلہ بھی شروع ہوا اس مکان سے غالب کے بچپن کی بہت ساری یادیں بھی جڑی ہیں جس کا ذکر وہ برابر کرتے رہے مثلاً راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ بازی، اپنی حویلی کے پاس ایک گھٹیا حویلی کا ذکر، سلیم شاہ کے تکیے کے پاس ایک اور حویلی کا تذکرہ، کٹرہ کشمیرن کی تفصیل الغرض ان کی تحریروں کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بچپن کے حسین ایام غالب نے اس حویلی میں گزارے تھے جسے وہ پوری زندگی یاد کرتے رہے۔

مالک رام نے اپنی کتاب ''ذکرِ غالب'' میں میرزا کی رہائش گاہ کے متعلق کچھ اس طرح وضاحت کی ہے۔

''یہ بڑی حویلی جس کے صدر دروازہ کی بارہ دری پر میرزا کی نشست رہتی تھی
اب بھی آگرہ میں موجود ہے۔ اسی کا نام کالا (کلاں) محل ہے۔ یہ نہایت
عالی شاہ عمارت ہے، میرا خیال ہے کہ میرزا کی پیدائش اسی مکان میں ہوتی
ہوگی۔ آج کل اس میں لڑکوں کا اسکول ہے۔ اس کے علاوہ جس جائیداد کے
نام اس مکتوب میں آئے ہیں اس میں سے بہت سی تا حال اسی طرح موجود
ہیں جیسی غالب کے بچپن کے زمانہ میں تھی۔

(ذکرِ غالب، مالک رام، ص ۱۱)

مالک رام کے اس حوالے سے بھی یہ بات واضح ہوگئی کہ غالب کی پیدائش اور ابتدائی زمانہ کالا (کلاں) محل میں گزرا جو مکان آج تک باقی ہے اور جس میں ایک لڑکیوں کا اسکول قائم ہے۔

غالب کی زندگی کے حالات کو ہر جہت سے جاننے کے لیے ہمیں خطوطِ غالب کا سہارا لینا پڑتا ہے اس لیے کہ غالب کے تقریباً اپنی زندگی کے تمام واقعات اپنے خطوط میں درج کیے

ہیں۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی نے بھی غالب کی زندگی کو ان کے خطوط ذریعے سمجھنے کی کوشش کی ہے ان کی مشہور کتاب (غالب کی آپ بیتی) جس میں آپ نے غالب کے قیام آگرہ کو ان کے خطوط کے ذریعہ سمجھا ہے یہاں اُن خطوط کا حوالہ اس لیے ضروری ہے کیونکہ اس تفصیلی خط سے نہ صرف یہ کہ ان کے قیامِ آگرہ کی روداد نیز مشاغل پر روشنی پڑتی ہے بلکہ میرزا کے ذوق وشوق اوران کی افتادِ طبع کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

قیام آگرہ:

پانچ برس کا تھا۔ جو باپ مرگیا، آٹھ برس کا تھا جو چچا مرگیا۔ ایام دبستان نشینی میں شرح ماۃ عامل تک پڑھا۔ اُس کے بعد لہو ولعب اور آگے بڑھ کر فسق وفجور عیش وطرب میں منہمک ہوگیا فارسی زبان سے لگاؤ اور شعر وسخن کا ذوق فطری وطبعی تھا ناگاہ ایک شخص کہ ساسان پنجم کی نسل میں سے تھا، معہذا منطق وفلسفہ میں مولوی فضل حق مرحوم کا نظیر اور مومنِ موحد اور صوفی مانی تھا۔ میرے شہر میں وارد ہوا۔ اور اکبرآباد میں فقیر کے مکان پر دو سال رہا۔ غوامضِ فارسی ناآمیختہ بعربی اُس سے میرے حالی ہوئے سونا کسوٹی پر چڑھ گیا ذہن معوج نہ تھا۔ زبانِ دری سے پیوند ازلی اور استاد بے مبالغہ جاماسپ عہد وبرزجمہرِ عصر تھا۔ حقیقت اس زبان کی دل نشین وخاطر نشان ہوگئی۔ اب مجھے اس امیر خاص میں نفس مطمئنہ حاصل ہے۔ مگر دعویِٰ اجتہاد نہیں۔ بحث کا طریقہ یاد نہیں۔

> ''ناظر بنسی دھر کے والد عہدِ بخت خانی وہمدانی میں میرے نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے۔ جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو انہوں نے بھی کمر کھولی اور پھر کہیں نوکری نہ کی۔ یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں۔ مگر جب جوان ہوا تو میں نے دیکھا کہ یہ بنسی دھر، خاں صاحب کے ساتھ ہیں اور انہوں نے کیٹھم گانو اپنی جاگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا تو منشی بنسی دھر اس امر کے منصرم ہیں اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں، واصل خاں نامی ایک سپاہی پیش دست رہتا تھا اور کٹڑوں کا کرایہ اوگاہ جمع کراتا تھا۔''

(غالب کی آپ بیتی، پروفیسر نثار احمد فاروقی، صفحہ ۱۵)

غالب نے آگرہ کے قیام میں راجہ بلوان سنگھ کا برابر ذکر کیا ہے کہ میں راجہ بلوان سنگھ کے ساتھ پتنگ اڑاتا تھا۔ اور غالب اس جگہ کا بھی ذکر کرتے ہیں جہاں سے وہ پتنگ اڑاتے تھے جسے کٹرہ کشمیرن کہا جاتا تھا۔ راجہ بلوان سنگھ کے متعلق غلام رسول مہر نے اپنی کتاب

''غالب'' میں بڑی پتے کی بات درج کی ہے ساتھ ہی ساتھ غالب کے قیام آگرہ کی مدت کا جواز بھی فراہم کیا ہے۔

''راجہ بلوان سنگھ بنارس کے مہاراجہ چیت سنگھ کے صاحبزادے تھے۔ مہاراجہ موصوف جب نذارن ہسنگو کے مالی مطالبوں سے تنگ آکر بنارس چھوڑنے پر مجبور ہوئے تو گوالیار میں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ وہاں انہیں ایک دو گاؤں بھی جاگیر کے طور پر مل گئے تھے۔ راجہ بلوان سنگھ وہیں ۱۷۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۱۰ء میں ان کی والدہ مونڈن کی رسم ادا کرنے کے لئے بنارس کی طرف چلی گئی تھی۔ وہ الہ آباد میں تھی کہ مہاراجہ چیت سنگھ کی وفات کی اطلاع ملی۔ سرکار نے رانی کے لئے دو ہزار روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر کیا لیکن شرط یہ تھی کہ وہ اپنے بچے سمیت گوالیار یا آگرہ میں رہے۔ رانی کو اس شرط سے انکار تھا۔ آخر بڑی کشمکش کے بعد ۱۸۱۳ء میں یہ شرط منظور کر کے رانی نے آگرہ میں اقامت اختیار کی۔ غالب نے راجہ کے ساتھ پتنگ لڑانے کا جو ذکر کیا ہے وہ ۱۸۱۳ء یا اس کے بعد ہی کا واقعہ ہو سکتا ہے لہٰذا یہ یقینی ہے کہ ۱۸۱۳ء تک غالب آگرہ ہی میں مقیم تھے۔''

(غالب، غلام رسول مہر، صفحہ ۷۹)

دہلی میں غالب کی سکونت اور مکان:

شعبان بیگ کی حویلی:

تقریباً سات برس کی عمر سے غالب کا دہلی میں آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا چنانچہ ۱۶ر فروری ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:

''اے میری جان یہ وہ دلی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے وہ دلی نہیں جس میں تم نے تحصیل کیا ہے وہ دلی نہیں جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے۔ وہ دلی نہیں جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں۔ وہ دلی نہیں جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک کیمپ ہے مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہنوز۔''

(خطوط غالب جلد اول، خلیق انجم، صفحہ ۳۸۶)

اس خط سے ایک بات تو ظاہر ہے کہ دہلی میں جب غالب نے مستقل سکونت اختیار کی تو شعبان بیگ کی حویلی میں رہے جہاں نواب علاء الدین

احمد خاں ان سے پڑھنے جاتے تھے۔ مالک رام نے بھی علاء الدین احمد خاں کے خط کے حوالے سے یہ لکھا ہے کہ غالب نے جب دلّی میں مستقل سکونت اختیار کی تو شعبان بیگ کی حویلی کو کرایہ پر لیا لیکن غالب نے دلّی میں کب مستقل سکونت اختیار کی اس کے بارے میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ غلام رسول مہر جن کا نام غالب تنقید وتحقیق میں صف اوّل میں آتا ہے وہ لکھتے ہیں کہ ۱۸۱۱ء کے قریب جبکہ ان کی عمر چودہ برس کی ہوگی، دہلی میں مستقل سکونت اختیار کی۔

(غالب، غلام رسول مہر)

لیکن غالب ایک خط میں منشی شیونرائن آرام (آگرہ) کو یہ بتاتے ہیں کہ ان کے دادا (منشی بنسی دھر) سے میرے کس طرح کے تعلقات تھے:

''شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑی ہوں یا چھوٹے ہوں۔ انیس بیس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر ان کی۔ باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت، آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی۔ چونکہ گھر ان کا بہت دور نہ تھا، اس واسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے تھے۔''

روز شنبہ ۱۹/اکتوبر ۱۸۵۸ء
(خطوط غالب جلد سوم، خلیق انجم، صفحہ ۱۰۵۴)

اس خط سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غالب نے انیس بیس برس کی عمر تک آگرہ کی سکونت مستقلاً ترک نہیں کی تھی۔ اگر اسے درست سمجھا جائے تو دہلی میں ان کی مستقل سکونت کو ۱۸۱۵ء کے بعد ہی ماننا مناسب ہوگا۔

کالے میاں کی حویلی:

تمام غالب اسکالرس کا اس بات پر اتفاق ہے کہ شعبان بیگ کی حویلی کے بعد غالب کا قیام میاں کالے خاں کی حویلی میں رہا۔ غالب تنقید پر سب سے پہلے لکھی جانے والی کتاب یادگارِ غالب میں خواجہ الطاف حسین حالی فرماتے ہیں۔

''غالب نے دہلی میں کوئی مکان اپنے لیے نہیں خریدا تھا ہمیشہ کرایہ کے مکانوں میں رہا کئے۔ یا ایک مدّت تک کالے صاحب کے مکان میں بغیر کرایہ کے رہے تھے۔ جب ایک مکان سے جی اکتایا، اسے چھوڑ کر دوسرا مکان لے لیا مگر قاسم جان کی گلی یا حبش خاں کے پھاٹک یا اس کے قریب و

جوار کے سوا کسی اور ضلع میں جا کر نہیں رہے۔ سب سے اخیر مکان جس میں
ان کا انتقال ہوا حکیم محمود خاں مرحوم کے دیوان خانہ کے متصل مسجد کے عقب
میں تھا جس کی نسبت وہ کہتے ہیں:

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

(یادگارِ غالب، الطاف حسین حالی، ص ۱۸)

کالے میاں کون تھے ان کے بارے میں مشہور ماہر غالبات غلام رسول مہر اپنی کتاب
غالب کے صفحہ نمبر ۸۰ پر لکھتے ہیں:

''شیخ نصیرالدین عرف کالے میاں بہادر شاہ کے پیر تھے۔ یہ شیخ قطب الدین
کے صاحبزادے اور مولانا فخر الدین فخر عالم رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے تھے جو
دورِ آخر میں چشتی خاندان کے بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں۔ کالے میاں کو
غالب سے بڑی محبت تھی۔ انہوں نے گلی قاسم جان میں اپنی ایک حویلی کرایہ
کے بغیر غالب کو رہنے کے لیے دے دی تھی۔ دربار شاہی میں حکیم احسن اللہ
خاں کے علاوہ شیخ کالے میاں بھی غالب کی ملازمت کا ایک ذریعہ تھے۔
شعبان بیگ کی حویلی کے بعد سب سے پہلا مکان جس میں غالب کے قیام کا پتا
چلتا ہے وہ کالے میاں کی یہی حویلی تھی یہ اب بھی موجود ہے اگرچہ اس کا نقشہ
بدل گیا ہے۔
معلوم ہوتا ہے کہ غالب اپنی قید یعنی ۱۸۴۷ء کے بعد تک اسی حویلی میں
رہے۔ مشہور ہے کہ رہائی کے بعد کسی دوست نے مبارک باد دی، تو اپنے
مخصوص ظریفانہ انداز میں یہ مشہور جملہ ادا کیا کہ:
''کون کہتا ہے میں قید سے رہا ہوا ہوں۔ پہلے گورے کی قید میں تھا۔ اب
کالے کی قید میں ہوں۔''

(غلام رسول مہر، غالب، صفحہ ۸۰)

''مالک رام کی تحقیق کے مطابق غالب ستمبر ۱۸۴۷ء سے لے کر مارچ
۱۸۵۲ء تک کالے صاحب کے مکان میں رہے۔''

(احوالِ غالب، مختار الدین آرزو، صفحہ ۹۱)

ان تمام تحقیقات اور خطوط غالب کی روشنی میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ ۱۸۱۵ء کے بعد
غالب آگرہ سے مستقبل میں سکونت پذیر ہوئے اور شعبان بیگ کی حویلی سے ان کی دلی کے

قیام کی ابتداء ہوئی اور ۱۸۴۶ء تک شعبان بیگ کی حویلی میں رہے بعد ازیں ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۶ء تک کالے میاں کی حویلی میں رہے۔

محمد حسن خاں کی حویلی:

کالے میاں کی حویلی کو چھوڑ کر حکیم محمد حسن خاں کی حویلی کرایہ پر لی وہ اس حویلی میں اپنی سکونت ۱۸۵۰ء سے بتاتے ہیں۔ غدر کے بعد دلّی میں جو حالات پیش آئے۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے میر مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جمعدار میرے پاس بھی آیا میں نے کہا بھائی تو مجھے نقشے میں نہ رکھ میری کیفیت کی عبارت الگ لکھ، یہ لکھ کہ اسد اللہ خاں پنشن دار ۱۸۵۰ء سے حکیم پٹیالے والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔ (حکیم محمود خاں کے بھائی مہاراجہ پٹیالہ کے ملازم تھے اس وجہ سے وہ پٹیالہ والے حکیم مشہور تھے حکیم محمد حسن اسی خاندان سے تھے)

۲رفروری، بروز بدھ/۱۸۵۹ء

(خطوطِ غالب جلد سوم، خلیق انجم، صفحہ ۵۰۲)

۱۸۵۲ء کو غالب ایک خط میں تفتہ کو حکیم محمد حسن خاں کی حویلی میں رہنے کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

''میں کالے صاحب کے مکان سے اٹھ آیا ہوں۔ بلّی ماروں کے محلّے میں ایک حویلی کرایے کو لے اس میں رہتا ہوں۔ وہاں کا میرا رہنا، تخفیف کرایہ کے واسطے نہ تھا، صرف کالے صاحب کی محبت سے رہتا تھا۔ واسطے اطلاع کے تم کو لکھا ہے۔ اگر چہ میرے خط پر حاجت مکان کی نشان کی نہیں ہے ''در دہلی بہ اسد اللہ برسد'' کافی ہے'' مگر اب 'لال کنواں' نہ لکھا کرو، محلّہ 'بلّی ماراں' لکھا کرو۔

۲۲رمارچ ۱۸۵۲ء

(خطوطِ غالب جلد اول، خلیق انجم، صفحہ ۲۴۴)

غلام رسول مہر کی تحقیق کے مطابق غالب ۱۹۶۰ء تک حکیم محمد حسن خاں کی حویلی میں ہے (یعنی پورے دس سال تک) غالب حکیم محمد حسن خاں کی حویلی کا ذکر کرتے ہوئے تفتہ کو لکھتے ہیں:

''میں دس بارہ برس سے حکیم محمد حسن خاں کی حویلی میں رہتا ہوں اب وہ حویلی غلام اللہ خاں نے مول لے لی۔ آخر جون میں مجھ سے کہا کہ حویلی خالی کردو۔ اب مجھے فکر پڑی کہ کہیں دو حویلیاں قریب ہم گر ایسی ملیں کہ ایک محل سرائے اور ایک دیوان خانہ ہو، نہ ملیں۔ ناچار یہ چاہا کہ بلی ماران میں ایک مکان ایسا ملے، جس میں جارہا ہوں، نہ ملا۔ تمہاری چھوٹی پھوپھی نے بے کس نوازی کی کروڑا والی حویلی مجھ کو رہنے کو دے دی۔ ہر چند وہ رعایت نہ رہی کہ محل سرا سے قریب ہو مگر خیر بہت دور بھی نہیں کل یا پرسوں وہاں جارہوں گا۔ ایک پاؤں زمین پر ہے۔ ایک پاؤں رکاب میں۔ توشہ کا وہ حال۔ گزشتہ کی صورت۔''

۸ جولائی، ۱۸۶۰ء

اسی مکان کی نسبت سے ایک خط منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:

''دس گیارہ برس سے اس تنگنائے میں رہتا ہوں۔ سات برس تک ماہ بہ ماہ چار روپے کرایہ دیا گیا۔ اب تین برس کا کرایہ کچھ اوپر سو روپیہ یک مشت دیا گیا۔ مالک مکان نے مکان بیچ ڈالا جس نے لیا ہے (یعنی غلام اللہ خاں نے) پیام بلکہ ابرام کیا کہ مکان خالی کردو۔ مکان کہیں ملے تو اُٹھوں بے درد نے مجھ کو عاجز کیا اور مدد لگادی وہ صحن بالاخانے کا جس کا دو گز کا عرض اور دس گز کا طول ہے، اس میں پاڑھ بندھ گئی۔ رات کو وہیں سویا۔ گرمی کی شدت، پاڑھ کا قرب، گمان یہ گزرتا تھا کہ یہ کٹگر ہے اور صبح کو مجھ کو پھانسی ملے گی۔ تین راتیں اسی طرح گزاریں۔ دوشنبہ ۹ جولائی کو ۱۸۶۰ء دوپہر کے وقت مکان ہاتھ آگیا۔ وہاں جارہا۔ جاں بچ گئی۔''

۲۰ جولائی بروز جمعہ، صبح کا وقت ۱۸۶۰ء

(خطوط غالب جلد اول، خلیق انجم، صفحہ ۳۲۴)

ایک خط غالب نے پنشن کے بند ہوجانے کے بعد میر مہدی مجروح کو لکھا تھا اس میں بھی اپنے گھر کے احوال تحریر فرماتے ہیں:

''برسات کا حال نہ پوچھو، خدا کا قہر ہے، قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں عالم بیگ کے کٹرہ کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے چھتیں چھلنی ہوگئی

ہیں۔ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔ کتابیں قلمدان سب توشہ خانہ میں۔ فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا ہے کہیں چلمچی دھری ہوئی ہے خط کہاں بیٹھ کر لکھوں۔''

۱۸۵۹ء

ان تمام خطوط سے یہ بات ظاہر ہے کہ غالب ۱۸۵۲ء سے ۱۸۶۰ء تک حکیم محمد حسن خاں کی حویلی میں رہے اور جب یہ حویلی غلام اللہ خاں نے لے لی اور غلام اللہ خاں نے جب غالب سے اس مکان سے نکل جانے کا تقاضہ کیا تو غالب نے اس حویلی کو چھوڑ دیا حکیم محمد حسن خاں کی حویلی میں غالب چار روپیہ مہینہ کرایہ دے کر رہتے تھے جب غدر میں پنشن بند ہوگئی تو غالب پر تین برس کا کرایہ چڑھ گیا مئی ۱۸۶۰ میں پنشن یک مشت ملی تو سارا کرایہ ادا کیا۔

کروڑا والی حویلی:

حکیم محمد حسن خاں کی حویلی کے بعد غالب کروڑا والی حویلی میں آگئے جس کا ذکر غالب ۸ جولائی ۱۸۶۰ء کے ایک خط میں علاء الدین احمد خاں سے کرتے ہیں:

''تمہاری چھوٹی پھوپھی نے بیکس نوازی کی کروڑا والی حویلی مجھ کو رہنے کو دی۔''

(خطوطِ غالب جلد اول، خلیق انجم، صفحہ ۳۶۶)

اس تحریر سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حویلی علاء الدین احمد خاں کی چھوٹی پھوپھی کی ملکیت تھی کروڑا والی حویلی کے بارے میں ماہرینِ غالبیات کا خیال ہے کہ یہ حویلی انہیں مفت میں ملی تھی۔ اور اس حویلی میں غالب کا تین سے چار سال تک کا قیام رہا کیونکہ ۱۹۶۴ء میں غالب جب کروڑا والی حویلی کو چھوڑ کر دوسرے مکان میں گئے تو انہوں نے ۱۹۶۴ء کے ایک مکتوب میں نواب علاء الدین احمد خاں کو ایک خط میں لکھا کہ برسات کی شدّت کے باعث مکان میں تکلیف ہے مینہ بند ہو۔ تو مالک مکان مرمّت کرائے۔ اور اگر یہ مکان وہی ہوتا (یعنی کروڑا والی حویلی) جو مفت رہنے کو ملا تھا۔ تو مالک مکان سے مرمت کرانے کا سوال درمیان میں نہ آتا۔ غالب اس حویلی میں ۱۸۶۰ء سے ۱۸۶۴ء تک رہے۔

نیا مکان:

غلام رسول مہر کی تحقیق کے مطابق غالبؔ نے ۱۸۶۴ء میں پھر ایک مکان کرایہ پر لیا اس لئے کہ جولائی ۱۸۶۴ء کے ایک خط میں غالب نواب علاء الدین احمد خاں کو اپنے مکان کی تنگی اور تکلیف کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''میاں میں بڑی مصیبت میں ہوں۔محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں۔پاخانہ ڈھ گیا۔چھتیں ٹپک رہی ہیں۔تمہاری پھوپھی (بیگم غالب) کہتی ہیں ہائے دبی ہائے مری۔دیوانخانہ کا حال محل سرا سے بدتر ہے۔میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔فقدان راحت سے گھبرا گیا ہوں چھت چھلنی ہوگئی ہے۔ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیونکر کرے۔مینہ کھلے تو سب کچھ ہو پُر اثناء مرمت میں بیٹھا۔''

جولائی، ۱۸۶۴ء

(خطوطِ غالب جلد اول، خلیق انجم، صفحہ ۳۹۸)

غالب کا آخری مکان:

۱۸۶۵ء میں غالب نے پھر نیا مکان لینے کا ارادہ کیا اور ساڑھے پانچ روپے کرایہ پر ایک مکان لیا اور یہی وہ مکان ہے جس میں غالب کا انتقال ہوا۔خواجہ الطاف حسین حالی غالب کے اس آخری مکان کے بارے میں فرماتے ہیں۔

''سب سے اخیر مکان جس میں ان کا انتقال ہوا حکیم محمود خاں مرحوم کے دیوانخانے کے متصل مسجد کے عقب میں تھا جس کی نسبت وہ کہتے ہیں:

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

(یادگار غالب، خواجہ الطاف حسین حالی، ص ۱۸)

اگر ہم غالب کی پوری زندگی پر نظر ڈالیں اور یہ دیکھیں کہ وہ کن کن مکانوں میں ٹھہرے تو بالترتیب تفصیل کچھ اس طرح ہوگی۔

ولادت: ۲۷ر دسمبر ۱۷۹۷ء، شہر آگرہ۔

پہلا مکان: کالا (کلاں) محل، آگرہ۔پیدائش سے ۱۸۱۵ء تک

دوسرا مکان: شعبان بیگ کی حویلی (دہلی)، ۱۸۱۵ء سے ۱۸۴۶ء تک

تیسرا مکان: کالے میاں کی حویلی (دہلی) ۱۸۴۶ء، ۱۸۵۰ء تک

چوتھا مکان: حکیم محمد حسن خاں کی حویلی: ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۰ء تک

پانچواں مکان: کروڑا والی حویلی: ۱۸۶۰ء سے ۱۸۶۴ء تک

چھٹا مکان: (مکان مالک کا نام کہیں درج نہیں ہے) ۱۸۶۴ء سے ۱۸۶۵ء تک

ساتواں اور آخری مکان: حکیم محمود خاں کے دیوان خانے کے متصل مسجد کے عقب۔ ۱۸۶۵ء

سے ۱۸۶۹ء وفات تک

کلکتہ کا سفر:

''غالب نے صرف ایک لمبا سفر کیا ہے۔ جب وہ خاندانی پنشن کے متعلق قانونی چارہ جوئی کے لیے کلکتہ گئے۔ غلام رسول مہر کی تحقیق کے مطابق وہ اپریل ۱۸۲۷ء میں دہلی سے نکلے تھے اور ۲۱ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچے یعنی اس سفر میں غالب کو دلی سے کلکتے پہنچنے میں دس مہینے لگے۔''

(غالب، غلام رسول مہر، صفحہ ۱۰۵)

کلکتہ کے قیام میں غالب شملہ بازار میں مکان کرایہ پر لے کر رہے (حالانکہ اب یہ حصہ بالکل بدل گیا ہے اور شملہ بازار بھی ختم ہو گیا ہے) شملہ بازار کے متعلق محلے بخش خاں رنجور کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''فرود آمدن جائے من کاشانۂ ایست در شملہ بازار کہ آں را روز ورود ہما ہنگام ورود بے زحمت جستجو یافتم''

مکان بڑا کشادہ اور آرام دہ تھا۔ اور اس کا کرایہ صرف دس روپے ماہانہ تھا۔ کلکتہ سے غالب ۲۹ رنومبر ۱۸۲۹ء کو دلی پہنچے۔

(غالب، غلام رسول مہر، صفحہ ۱۲)

رام پور اور میرٹھ کا سفر:

کلکتہ کے سفر کے بعد غالب کی تحریرات سے صرف تین سفر کا علم ہو سکا ہے وہ دو مرتبہ رام پور گئے اور ایک مرتبہ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ سے ملنے کے لئے میرٹھ پہنچے وہ پہلی مرتبہ جنوری کے آخر میں رام پور گئے اور مارچ میں واپس آئے۔ جیسا کہ وہ تفتہ کو لکھتے ہیں۔

''میاں میں جو آخر جنوری میں رام پور جا کر آخر مارچ میں یہاں آ گیا تو کیا کہوں کے لوگ میرے حق میں کیا کچھ کہتے ہیں۔''

۱۲/اپریل ۱۸۶۰

رام پور کی کیفیت غالب ان الفاظ میں بتاتے ہیں:

''اب میرا حال سنو تعظیم و توقیر بہت ہے۔ ملاقاتیں تین ہوتی ہیں ایک مکان کہ وہ تین مکانوں پر مشتمل ہے۔ رہنے کو ملا ہے۔ یہاں پتھر تو دوا کو بھی میسر نہیں۔ نشتی مکان گنتی کے ہیں، کچی دیواریں اور کھپریل، سارے شہر کی آبادی اسی طرح پر ہے۔ مجھ کو جو مکان ملے وہ بھی ایسے ہی ہیں۔ ہنوز کچھ گفتگو

درمیان میں نہیں آئی۔ میں خود ان سے ابتدا نہ کروں گا۔ وہ بھی مجھ سے بالمشافہ نہ کہیں گے مگر بلواسطہ کارپردازان سرکار۔ دیکھو کیا کہتے ہیں اور کیا مدد کرتے ہیں۔

غالب کے خطوط سے معلوم ہوا کہ نواب یوسف علی خان نے ابتدا میں چار دن تک غالب کو اپنی کوٹھی میں رکھا۔ بعد کو غالب جس مکان میں رہے وہ محلہ راج دوارہ کی اس شاہراہ پر جو خاص باغ پیلس کو جاتی ہے۔ مولوی محمد یحیےٰ صاحب وکیل کے مکان سے متصل واقع تھا۔ آجکل وہاں ایک آہنگر مقیم ہے وزیر اعظم رام پور کے مطابق وہاں یادگار کے طور پر ایک پتھر لگا دیا گیا ہے۔''

(غلام رسول مہر)

غالب نے رام پور کا دوسرا سفر اکتوبر ۱۸۶۵ء میں کیا اور جنوری ۱۸۶۶ء میں واپس ہوئے۔ غلام رسول مہر غالب کے رام پور کے دوسرے سفر کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

''نواب علی خاں نے ۷ رنومبر ۱۸۶۵ء کو ایک ہزار روپے کی رقم دی تھی۔ روانگی کے وقت دو سو روپے کی مزید رقم بوجہ زادِ راہ مرحمت فرمائی۔ قیام کے لئے جرنیلی کوٹھی دی جو اس زمانے میں قلعہ معلّےٰ کے مشرقی دروازہ کے باہر واقع تھی۔ نواب سید حامد علی خاں مرحوم نے قدیم عمارتوں کو گرا کر نئی عمارتیں تعمیر کرائیں تو یہ کوٹھی قلعہ معلّی کے اندر آگئی آج کل یہ عمارت مہمان خانہ کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔

(غالب، غلام رسول مہر، صفحہ ۱۳۸)

میرٹھ کا سفر:

میرٹھ کے سفر کا مقصد یہ تھا کہ غدر کے ہنگامے میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہؔ بھی گرفتار ہوئے تھے۔ ان پر مقدمہ چلا اور سات سال کی قید کی سزا ہوئی۔ بعد میں ان کی بے گناہی ثابت ہوئی۔ رہائی کی خبر سن کر غالب ان سے ملنے میرٹھ گئے۔ یہ سفر اواخر جنوری ۱۸۵۹ء میں ہوا اور غالب تین روز میرٹھ ٹھہرے اور ۲۵ جنوری ۱۸۵۹ء کو دلّی واپس آگئے۔ ہر گوپال تفتہؔ کو ایک خط میں میرٹھ کے سفر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میں مصطفےٰ خاں کی ملاقات کو بہ بہل ڈاک میرٹھ گیا تھا تین دن وہاں رہا۔ کل وہاں سے واپس آیا آج تم کو یہ خط بھجوایا۔

بروز بدھ ۲۶ رجنوری ۱۸۵۹ء

چونکہ غالب کا سفر بہت مختصر تھا اس لئے ماہرِ غالبیات کا اتفاق ہے کہ غالب مصطفےٰ خاں شیفتہؔ کے یہاں ٹھہرے ہوں گے۔

☆☆☆☆☆
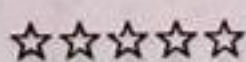
ایک کتاب، دو ملک — خصوصی مطالعہ

ڈاکٹر خلیق انجم کی معرکتہ الآرا تصنیف

غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ

رفعت سروش (بھارت)
پروفیسر جلیل نقوی (پاکستان)

رفعت سروش، نوئیڈا، بھارت

غالبؔ کا سفرِ کلکتہ — از ڈاکٹر خلیق انجم

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

غالب کی یہ ہائے ہائے معنی خیز ہے۔ اس میں حسینانِ کلکتہ کے نظاروں سے محرومی کا غم ہی نہیں بلکہ یہ ہائے ہائے اس المیے کا استعارہ ہے، جو غالب کو دہلی سے کلکتے تک دور دراز اور صعوبت انگیز سفر کے لئے مجبور کرتا ہے جہاں سے یہ نابغہء روزگار بے نیل و مرام واپس آتا ہے۔ اس سفر کے پیشِ نظر انگریز قوم کی مہم جوئی، جوڑ توڑ اور ہندوستانی معاشرت کی منصوبہ بند شکست و ریخت کی پالیسی ہے جس کے تحت اس ستم ایجاد نے بڑے اور چھوٹے پیانے پر ہندوستانیوں کو ہندوستانیوں ہی سے لڑوایا اور ان کی باہمی لڑائیوں اور رنجشوں کا تماشا دیکھ کر محظوظ ہوتا رہا اور آخرکار دہلی کے روایتی لال قلعے پر قابض ہو گیا۔ یہ زمانہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کا ہے۔ نفسیاتی طور پر ہندوستانی مغلوب ہو چکے تھے اور جوق در جوق انگریزی فوج میں بھرتی ہونے لگے تھے۔ غالب نے فخر سے کہا ہے:

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

ہزاروں سورماؤں کی طرح مرزا اسداللہ غالب کے چچا نصراللہ بیگ خاں بھی برطانوی فوج میں چار سو سواروں کے رسالدار تھے اور سترہ سو روپے ماہانہ تنخواہ پاتے تھے۔ انھوں نے بھرت پور کے قریب دو پرگنے سونک اور سونسا مرہٹہ سردار ہلکر سے فوج کشی کر کے اپنے قبضے میں کر لیے تھے جنھیں لارڈ لیک نے اپنے ہم وطنوں سے جنگ و فتح کے صلے میں نصراللہ بیگ خاں کو بخش دیئے۔ یہ لاکھ سوا لاکھ روپے کی سالانہ جاگیر تھی۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ نصراللہ بیگ خاں ہاتھی سے گر پڑے، زبردست مجروح ہوئے اور جانبر نہ ہو سکے۔ انگریز بہادر نے یہ دونوں پرگنے اپنی تحویل میں لے لیے اور نصراللہ بیگ خاں کے پسماندگان کے لیے پنشن مقرر کر دی اور وہ پنشن بھی ایسے آڑے

ترچھے طریقے سے دی کہ اپنے ایک پٹھو نواب احمد بخش خاں سے یہ معاملہ کیا کہ فیروز پور جھرکہ کی جائیداد ان کے قبضے میں رہے گی اور وہ حکومت کو پچیس ہزار روپے سالانہ ادا کریں گے۔ اس کے علاوہ نصراللہ بیگ خاں کے وارثوں کو دس ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ دیں گے اور سواروں کا ایک دستہ رکھیں گے۔ یہ پروانہ ۴ مئی ۱۸۰۶ء کا نوشتہ ہے۔ نواب احمد بخش خاں نے پہلے تو سواروں کا دستہ تحلیل کیا اور پھر دس ہزار روپے کے بجائے پانچ ہزار روپے سالانہ نصراللہ بیگ خاں کے پسماندگان کو دینا شروع کیا۔ مگر کس طرح:

۱۔ مرزا نصراللہ بیگ خاں کی والدہ اور ان کی تین بہنوں کو ۱۵۰۰/- روپے سالانہ۔

۲۔ ان کے بھتیجوں یعنی مرزا غالب اور ان کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کو ڈیڑھ ہزار روپے سالانہ۔ گویا ۷۵۰/- روپے فی کس۔

یہ سب تو نصراللہ بیگ خاں کے جائز وارث ٹھہرے۔ لیکن نواب احمد بخش خاں نے ۲۰۰۰/- روپے سالانہ خواجہ حاجی کو دینا طے کیا جو مرزا نصراللہ بیگ خاں کے تنخواہ دار ملازم تھے اور جو کسی بھی حیثیت سے نصراللہ بیگ خاں کے وارث نہیں تھے۔ اس وقت مرزا اسداللہ غالب نو سال اور مرزا یوسف سات سال کے تھے۔ جب مرزا اسداللہ غالب بڑے ہو گئے اور انھیں اپنی حق تلفی کا احساس ہوا تو انھوں نے نواب احمد بخش خاں سے اپنا جائز حق مانگا۔ نواب صاحب ٹال مٹول کرتے رہے اور ہات ٹالنے کے لیے انھوں نے غالب سے کہہ دیا کہ یہ مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔ بہرحال خواجہ حاجی بزرگ آدمی ہیں ایک سال میں اللہ کو پیارے ہو جائیں گے پھر ۲۰۰۰/- روپے مزید آپ کے وظیفے میں شامل کردوں گا۔ کچھ عرصے بعد خواجہ حاجی کا انتقال ہو گیا مگر نواب احمد بخش خاں نے اپنی بدنیتی کا ثبوت دیا وہ خواجہ حاجی کو جو رقم دیتے تھے، اسے انھوں نے ان کے بیٹوں کو دینا شروع کر دیا۔ غالب نے زبانی اور تحریری احتجاج کیا مگر نواب احمد بخش خاں تو انگریزوں کے پٹھو تھے اور چالبازیاں ان کے مزاج کا حصہ تھیں۔ مرزا غالب نے انگریز حاکموں سے رجوع کرنا چاہا اور جب مقامی طور پر کوئی صورت نظر نہیں آئی تو حالات سے مجبور ہو کر غالب نے کمپنی بہادر کے سربراہ کے حضور کلکتے جا کر اپنا مقدمہ پیش کرنے کا ارادہ کیا۔ غالب اپنی تنگ دستی اور اپنے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کی بیماری کے باوجود عازم سفر کلکتہ ہوئے۔ ان کے سفر کلکتہ کی ابتداء ۱۸۲۶ء میں ہوئی اور دہلی سے فیروز پور کانپور، لکھنؤ، باندہ، الہ آباد، بنارس، عظیم آباد اور مرشد آباد ہوتے ہوئے سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے ۲۹ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتے پہنچے۔ کلکتے پہنچنے سے پہلے ہی ان کے ایک عزیز مرزا افضل بیگ خاں نے ان کے خلاف زبردست ماحول بنا دیا تھا جس کا تعلق ان کی پنشن ہی سے تھا۔ انھیں اپنے ادبی حریفوں سے بھی لوہا منوانا پڑا، آخر کار اس شاعر نے نومبر ۱۸۲۹ء

میں کلکتے کو خیر باد کہا اور دہلی کے لیے روانہ ہو گئے۔

یہ سفر معمولی سفر نہیں تھا۔ ڈاکٹر خلیق انجم کے الفاظ میں "غالب نے دہلی سے کلکتے اور کلکتے سے دہلی کا تقریباً تین ہزار کلومیٹر کا سفر گھوڑے، یکے، لڑھیا (بیل گاڑی) اور کشتی کے ذریعے طے کیا تھا۔ سفر کے دوران غالب کسی خطرناک بیماری کا شکار ہو گئے۔ لکھنؤ میں پانچ مہینے علاج کرایا۔ بنارس میں کچھ صحت یاب ہوئے اور یہاں چھ ماہ قیام رہا۔ آج جدید سہولیات کے باوجود ہم اس راستے سے کلکتے تک کے اس سفر کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے جو غالب نے اپنی بلند ہمتی اور بلند حوصلگی کے سہارے پونے دوصدی قبل طے کیا تھا۔ بیماری، کمزوری، نقاہت اور مالی دشواری بھی انھیں اپنے ارادے سے باز نہیں رکھ سکی"۔

یہ کتاب ڈاکٹر خلیق انجم کا تحقیقی کارنامہ ہے، جس میں انھوں نے غالب کے سفر کلکتہ کی ممکن حد تک صحیح اطلاعات فراہم کرنے کی کوشش میں بہت سی کھوئی ہوئی کڑیوں کی بازیافت کی ہے۔ اس موضوع پر اپنے علم و تحقیق اور بالخصوص خطوط غالب کے ماہر خصوصی ہونے کی حیثیت سے غالب کی تحریروں کے نہاں میں اتر کر حقائق کے جواہر ریزے چننے کے بعد بے مثال کام کیا ہے۔ خلیق انجم صاحب نے ماہرین غالبیات کی اب تک کی تحقیقات سے استفادہ کیا ہے اور ان کا اعتراف کیا ہے۔ اس کتاب سے غالبیات کی تحقیق میں ایک اہم قدم آگے بڑھایا ہے۔ تحقیق کی رو سے یہ بے حد اہم کامیابی تصور کی جائے گی۔

ڈاکٹر خلیق انجم خشک مزاج محقق نہیں ہیں بلکہ ان کے مزاج کی شگفتگی ان کی تحریروں میں بھی جھلکتی ہے۔ اس کتاب کو پڑھتے وقت مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں غالب کے حوالے سے ایک سوانحی ناول پڑھ رہا ہوں۔ اس قدر رواں دواں تحریر اور خود غالب کی تحریروں کے زندۂ جاوید حوالے، اس سفر میں پیش آنے والے اچھے برے واقعات، دوستوں اور دشمنوں اور مخالفوں کی کردار نگاری، اگر ایسی شگفتہ نثر ہمارے محقق لکھتے ہیں تو عوام الناس میں تحقیقی ذوق پیدا ہو سکتا ہے۔ خلیق صاحب نے جزئیات نگاری سے بڑا کام لیا ہے۔ ان کی تحریر میں بین السطور کے معانی لطف دے جاتے ہیں۔ ایک اقتباس:

> "قاضی عبدالودود ہمارے سب سے بڑے محقق تھے۔ لیکن ان کی تحریروں کے بارے میں میرا ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ مرحوم ناشر کے کاغذ اور طباعت کے پیسے بچانے میں تحریر کو اتنا مختصر کر دیتے تھے کہ ان کی بیشتر تحریروں کو صحیح پڑھنا اور سمجھنا بجائے خود تحقیقی کارنامہ ہے"۔ (ص ۱۸)

قاضی صاحب کے مرتبے کا احترام کرتے ہوئے یہ الفاظ رقم کر دینا خلیق انجم ہی کا حصہ

ہے۔ اس کے برعکس اس کتاب میں خلیق انجم نے تحقیق کے ساتھ ''تفسیر'' کا فرض بھی انجام دیا ہے وہ جو کسی نے کہا ہے:

''سو بار بھی ہم کہہ کے مکرر نہیں کہتے''

یہی کیفیت اس کتاب میں خلیق انجم صاحب کے قلم سے نکلتے ہوئے بہت سے جملوں کے بارے میں ہے۔ غالب کے خطوط کے اقتباس تو ہیں ہی۔ ایسا موقع نکال لیا ہے کہ پھر اس خط کے پورے متن کو بھی زینت کتاب بنایا ہے۔ مثنویوں کے برمحل اقتباسات اور اشعار مضمون کی روانی میں لطف دیتے ہیں اور اہم اطلاع فراہم کرتے ہیں۔ پھر مثنویوں کے پورے متن کو بھی شامل کتاب کرلیا گیا ہے۔ ''مثنوی چراغ دیر'' (فارسی) کا منظوم اردو ترجمہ ڈاکٹر حنیف نقوی نے بہت مہارت سے کیا ہے۔ وہ پورا ترجمہ برمحل اقتباسات کے علاوہ کتاب کے دس صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اسی طرح فارسی مثنوی 'بادِ مخالف' کا اردو نثر میں ترجمہ بہ قلم ظ۔ انصاری بھی فارسی متن کے ساتھ کتاب میں موجود ہے۔ یہ مثنوی مرزا غالب نے ''بیانِ صفائی'' کے انداز میں اپنے کلکتہ کے نکتہ چینوں اور مخالفوں سے مصالحت کے طور پر اپنے دوست اور کرم فرما سید اکبر خاں کے مشورے پر لکھی تھی۔ اس کتاب میں پنشن کے بارے میں معلومات اور اپنے جائز حق کے حصول کے لیے غالب کے دور دراز سفر کا بیان بالتفصیل تو ہے ہی، کتاب میں مذکورہ مثنویوں کے متون اور غالب کے کچھ خطوط اور عرضیوں کی مکمل نقول کی موجودگی اس کتاب کی اضافی خصوصیات ہیں۔ حوالے کے لیے کوئی اور کتاب ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں۔

تین سال کے عرصے میں غالب کو جن مثبت اور منفی کرداروں سے سابقہ پڑا، اس کی عکاسی اور کردار نگاری میں ہی ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنے قلم کی فیاضی سے کام لیا ہے۔ جہاں جہاں یہ کردار بروئے کار آئے ہیں وہاں تو غالب کا ذکر ناگزیر ہے ہی، اس کے علاوہ کتاب کے آخر میں مستقل ایک باب ان کرداروں پر تفصیلی روشنی ڈالتا ہے۔ یہ وقیع باب ۶۵ صفحات پر پھیلا ہوا ہے جو بجائے خود ایک الگ کتاب بن سکتا ہے۔

منفی کرداروں میں سب سے قابل مذمت کردار نواب احمد بخش خاں کا ہے جنھوں نے نصراللہ بیگ خاں کے انتقال کے بعد ان کے خاندان کے افراد کو جو پنشن ازروئے حکم انگریز دی جانے والی تھی، اس میں خرد برد کر کے ایک ایسا فتنہ کھڑا کر دیا جو غالب کے سفر کلکتہ کا باعث ہوا۔ اس سے بھی قبیح کردار مرزا افضل بیگ کا ہے جس نے اس بساط کو ہی الٹ دیا جو غالب نے سفر کلکتہ کے لیے بچھائی تھی۔ وہ غالب سے پہلے کلکتہ پہنچ گئے تھے اور انھوں نے انگریزوں سے رسوخ رکھنے کے باعث ان کو غالب کی طرف سے پہلے ہی بدظن کر دیا۔ دوسری طرف اہل شہر اور اہل علم

میں یہ افواہ پھیلا دی کہ مرزا غالب قتیل کے مخالف ہیں اور اپنے آگے کسی کو کچھ نہیں سمجھتے۔ قتیل کی شاعرانہ عظمت کا دم بھرنے والے غالب کی مخالفت اور مذمت پر کمر بستہ ہو گئے۔ جون ۱۸۲۸ء میں غالب نے وہاں تین مشاعروں میں شرکت کی اور اپنے خلاف ایسی مکدر فضا پائی کہ کلکتہ سے ہی بددل ہو گئے۔ مرزا افضل بیگ کی بن آئی۔ غالب اپنی سوجھ بوجھ کے باعث کمپنی بہادر کے دربار تک پہنچ تو گئے مگر اپنا مقصد حاصل کرنے سے قاصر رہے۔

غالب شروع سے ہی نامساعد حالات کے شکار رہے۔ وہ اپنے نانا اور والد کی جائیدادیں فروخت کر کے بھی اس قرض کو مکمل ادا نہ کر پائے جو واجب الادا تھا۔ سب کچھ بیچ کر اور قرض خواہوں کو ادا کرنے کے بعد بھی وہ بیس ہزار روپے کے مقروض تھے۔ جب دلی آئے اور ظاہر ہے تنگ دستی نے ہی انھیں اپنا حق مانگنے پر مجبور کیا، سفر کلکتہ کے اخراجات کہاں سے آئے، اس بارے میں محقق غالب خود سوچ میں ہے۔ البتہ باندہ میں ان کے خالہ زاد بھائی نواب ذوالفقار علی خاں نے انھیں دو ہزار روپے قرض دیئے (شاید امی کرن نامی مہاجن سے دلوائے) انھی روپیوں میں سے غالب نے باندے میں گھوڑا خریدا تھا جو ان کی سواری کے کام آیا۔ تصور کیجیے کہ غالب نے عظیم آباد سے کلکتے تک کا سفر گھوڑے پر طے کیا۔ وہ گھوڑا انھیں تنگ دستی کے باعث کلکتہ میں بیچنا پڑا۔ ایک اور صاحب نواب محمد علی خاں ہیں جنھوں نے غالب کو دو سو روپے قرض دیئے تھے۔ قرض لینے میں غالب کو ملکہ حاصل تھا۔ اسی لیے تو فخر سے کہا ہے...... ''قرض کی پیتے تھے مے''۔

کلکتہ میں سید ابوالقاسم خاں، مولوی سراج الدین خاں اور مرزا احمد بیگ طپاں اور سید اکبر علی خاں جیسے مخلص دوست بھی مرزا غالب کو ملے۔ مگر مجموعی طور پر ۱۸۲۶ء سے ۱۸۲۹ء تک غالب کے یہ تین سال سخت ترین مشکلات کے تھے۔ کیسی کیسی آزمائشوں کی آگ میں تپ کر یہ لوہا کندن بنا، اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

تخلیقی سرچشمے جب انسان کے دل کی گہرائی سے اُبلتے ہیں تو کوئی پتھر ان کو اُبلنے سے روک نہیں سکتا۔ کلکتہ کے سفر نے غالب کو بہت سے تجربات سے ہمکنار کیا، دوران سفر وہ لکھنو اور بنارس کئی کئی ماہ کے لیے رُکے...... غالب کے محققین ہنوز یہ نہیں بتا سکے کہ آخر وہ کون سی کشش تھی جو اس آمادۂ سفر شاعر کو کئی کئی ماہ ان شہروں میں رُکنے پر مجبور کرتی رہی۔ غالب کی زندگی کے یہ گوشے ہنوز تشنۂ تحقیق ہیں۔ بہرحال اس سفر میں ان کی تخلیقی سرگرمیاں جاری رہیں۔

'مثنوی چراغ دیر' اور 'مثنوی بادِ مخالف' سفرِ کلکتہ کی ہی دین ہیں۔ اس کے علاوہ 'گل رعنا' یہ

غالب کے اردو اور فارسی کلام کا انتخاب ہے جو انھوں نے کلکتہ میں اپنے دوست سراج الدین احمد خاں کی فرمائش پر کیا تھا۔ اس انتخاب میں اس کلام کی نشان دہی ہو جاتی ہے جو انھوں نے سفر کلکتہ اور قیام کلکتہ کے دوران کہا تھا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے 'گل رعنا' کے بارے میں اہم معلومات فراہم پہنچائی ہیں۔ اس میں ۱۱۶ (ایک سو سولہ) اردو کی غزلیں اور ستائیس غزلیں فارسی کی ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے مالک رام صاحب کے حوالے سے لکھا ہے کہ "منجملہ اور چیزوں کے غالب کا 'چکنی ڈلی' والا قطعہ بھی کلکتہ میں ہی کہا گیا تھا اور وہ مشہور غزل بھی":

ظلمت کدے میں مرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

(ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالب نے کلکتہ ہی میں ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی دلی کا نقشہ اپنے ذہن میں مصور کر لیا تھا)

غالب کا سفر کلکتہ جو دراصل پنشن میں اضافہ کے لیے تھا۔ ان کے لیے بہت سی زحمتوں کا باعث ہوا۔ جو الوالعزمی، قوت ارادی اور بلند حوصلگی انھیں اس دور دراز شہر تک لے گئی تھی وہ چور چور ہو گئی۔ اپنے اصل مشن میں ناکامی کے علاوہ انھیں ذہنی طور پر بہت سے جھٹکے برداشت کرنے پڑے۔ انھیں گمان بھی نہیں تھا کہ ان کے مرتبہ کا شاعر کم اوقات لوگوں کی تنقید کا نشانہ بنے گا اور مشاعرے میں ان پر اتنے جاہلانہ اعتراضات کی بوچھاڑ کی جائے گی۔ اگرچہ یہ بساط ان کے مخالف مرزا افضل بیگ کی بچھائی ہوئی تھی۔ اس شخص نے مرزا غالب کی دُکھتی رگ پر انگلی رکھ دی اور اہالیانِ کلکتہ میں مقبول شاعر قتیل کی تعریفیں کر کے اسے اور مستند ثابت کرنے کی کوشش کی، جس نے غالب کی انانیت کو جگا دیا۔ وہ جھلائے، جھنجھلائے اور جواب میں لوگ اُن پر آوازے کسنے لگے۔

حق یہ ہے کہ قتیل کی تعریفوں نے غالب میں احساس کمتری پیدا کر دیا، جس کا اظہار وہ اپنی برتری کا ڈھنڈورا پیٹ کر کرنے لگے۔ یہ نفسیاتی گرہ اور مضبوط ہوتی چلی گئی اور وہ اس شخص کو، جو ان سے پہلے ہی دنیا سے جا چکا تھا اور جو کسی بھی صورت ان کا مد مقابل نہیں تھا، اس کے ساتھ حریفانہ سلوک کرنے لگے۔ اس کے نام و نسب پر حملہ، اس کے نومسلم ہونے پر طنز، اس کی فارسی دانی کو مشکوک نظر سے دیکھا بلکہ اس کی مذمت میں وہ اعتدال سے تجاوز کر گئے۔ ہمارے نزدیک یہ غالب کی کھلی شکست تھی۔

کلکتے کے ادبی معرکوں نے غالب کے مزاج میں جو جھلاہٹ پیدا کر دی تھی اس نے تمام عمر ان کا ساتھ نہ چھوڑا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ انھوں نے اپنے علاوہ کسی ہندوستانی کو صحیح فارسی

داں نہ سمجھا، خواہ وہ شاعر ہوں، یا لغت نویس۔ سو پشت سے سپہ گری کے پیشے پر فخر کرنے والے مرزا اسد اللہ غالب نے سب کو ایک لاٹھی سے ہانک دیا اور ان کے مزاج کا یہ منفی پہلو تمام عمر انھیں پریشان کرتا رہا۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے اس کتاب کے دوسرے باب میں سفر کلکتہ کے بعد غالب کے ردعمل کا جائزہ لیا ہے اور اس ضمن میں کئی عنوانات قائم کیے ہیں۔ خلیق انجم اپنی بات مستند حوالوں کے بغیر نہیں کرتے اور ہر موقعے پر وہ غالب کے خطوط کے حوالے جس خوب صورتی اور چابکدستی سے دیتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے وہ خطوط غالب کے حافظ ہیں اور ''ہم کو ہر موقعے کی غزلیں منہ زبانی یاد ہیں''۔ (ظریف لکھنوی) کے بہ مصداق وہ غالب کے خطوط کے اقتباسات پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔ اب غالب کے معاملے میں غالب کے خطوط کی حرف گیری کون کرے گا؟ ہر بات مستند ہے۔

غالب نے ہندوستانی شاعروں کو بخشانہ فرہنگ نویسوں کو اور قتیل کی تو وہ مٹی پلید کی ہے کہ وہ قبر میں بھی کلبلا رہا ہوگا۔ کبھی اسے 'لالہ' کہا، کبھی کھتری بچہ۔

> ''اصل فارسی کو اس کھتری بچے قتیل علیہ ماعلیہ نے تباہ کیا۔ رہا سہا غیاث الدین رام پوری نے کھو دیا''۔ (اقتباس خط بہ نام چودھری عبدالغفور مارچ ۱۸۵۹ء)

اس باب میں ڈاکٹر خلیق انجم نے غالب کے طرفدار ہونے کا نہیں بلکہ 'سخن فہم' ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ قتیل پر ان کا مدلل مضمون ہے۔ مالک رام کی تحقیق کے مطابق مرزا محمد محسن قتیل (اصل نام دیوانی سنگھ) کے اجداد بٹالہ کے کھتری بھنڈاری تھے۔ ان کے جدِ سوم صورت سنگھ بٹالہ سے ہجرت کر کے چلے گئے۔ دادا اور والد رائے لال جی مل اور درگاہی مل باغپت میں پیدا ہوئے اور قتیل کی ولادت ۱۷۵۸ء میں دہلی میں ہوئی۔ انتقال ۱۸۱۸ء میں ہوا۔ قتیل کی عظمت کی دلیل ہے کہ انھوں نے فارسی میں اتنی دستگاہ حاصل کی کہ لکھنؤ اور کلکتہ میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ ناسخ سے ان کے مراسم تھے اور سوائے غالب کے کوئی ان کا مخالف نظر نہیں آتا۔

معرکہ کلکتہ نے غالب کے ذہن میں ایسا زہر بھر دیا تھا کہ وہ اپنے سوا کسی کو بھی فارسی داں نہ سمجھتے تھے۔ (میرے نزدیک یہ احساس کمتری کی معراج تھی) ورنہ قتیل تو وہ شخص تھا جس کی وفات پر امام بخش ناسخ نے جو قطعۂ تاریخ نظم کیا اس میں اسے 'سعدی شیرازی ثانی' کہا تھا۔ بہ قول خلیق انجم......

> ''غالب ساری زندگی قتیل کو بُرا بھلا کہتے رہے۔ ان کو گالیاں دیتے

رہے۔ اس قصور کے لیے جو قتیل سے سرزد ہوا ہی نہیں، غالب کی قتیل سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ غیر معمولی شہرت ہی قتیل کا قصور تھا جس کی سزا زندگی بھرانھیں دیتے رہے''۔ (ص ۲۲۷)

غالب نے 'غیاث اللغات' والے مولوی غیاث الدین عزت کو بھی نہیں بخشا اور اسے گمنام کتاب والا کہا کیوں کہ وہ معلم تھا۔ غالب نے تو معرکہ، کلکتہ کے بعد اپنے من پسند شاعر مرزا عبدالقادر بیدل سے بھی ذہنی طور پر دور ہونے کی کوشش کی۔

خلیق انجم نے بیدل پر اس کتاب میں سیر حاصل مضمون لکھا ہے اور غالب اور بیدل کا موازنہ بھی کیا ہے۔

''غالب: در مدح خود'' اس کتاب کا ایک اہم مضمون ہے جس میں فاضل محقق نے غالب کو غالب کی ہی نظر سے دیکھا ہے اور خطوط اور دیگر تحریروں اور اشعار کے حوالے سے غالب کی عظمت کو نمایاں کیا ہے اور ان اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے جن کے تحت غالب تعلّی ہی نہیں خود پسندی کا شکار ہوئے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے بجا طور پر یہ تجزیہ کیا ہے کہ عظیم فنکار اپنے تن کو خون جگر سے سینچتا ہے اور ایسا کرنے کے لیے اسے تمام مادی ضرورتوں اور آسائشوں سے بے نیاز ہونا پڑتا ہے۔ غالب کا المیہ یہ ہے کہ ایک طرف ان کا آدرش عظیم فن کی تخلیق ہے اور دوسری طرف ذوق کا سماجی وقار بھی ان کے لیے ناقابل برداشت ہے۔

بہر حال اپنی تمام خامیوں اور مزاج کی کجروی کے باوجود وہ غالب جو ہمیں اور آنے والے زمانوں کو ورثہ میں ملا ہے وہ ایک عظیم فنکار ہے، ایک بڑا شاعر، ایک صاحب طرز نثر نگار۔ اس کے خطوط اس کی تفہیم کے اہم ماخذ ہیں۔ ان ماخذوں کو ڈاکٹر خلیق انجم نے بڑی احتیاط سے چھوا ہے اور زیر نظر کتاب بھی اس امر کی شاہد ہے کہ اتنے خطوط کے مطالعہ سے ہی ڈاکٹر صاحب نے غالبیات کو ایک اور سمت دی ہے اور اس تحقیقی کارنامے کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے، انھوں نے کمال توازن کے ساتھ غالب کی طرفداری کے ساتھ ساتھ 'سخن فہمی' کا فرض

بھی بخوبی نبھایا ہے۔ کتاب کے آخر میں 'اشاریہ' نہایت محنت سے تیار کیا گیا ہے جو کتاب کے حسن و معنویت میں اضافہ کرتا ہے۔

پروفیسر جلیل نقوی

غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتہ کا ادبی معرکہ

برصغیر پاک و ہند سے تعلق رکھنے والے تمام زبانوں کے شعراء میں صرف دو نام ایسے ہیں جو عالمی ادب کا لافانی حصہ بنے ہیں اور جن کی شاعری کے حسن، گہرائی اور گیرائی میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا رہا ہے۔ یہ سلسلہ لگتا ہے کہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ اس لئے ان کے کلام کی تفہیم اور زندگی کے مختلف گوشوں سے واقفیت کی کوششیں بھی یقیناً ہمیشہ جاری رہیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ غالب شناسی اور اقبال شناسی ہمارے ادب کے ایسے ابواب ہیں جن کیلئے کچھ باہمت ادیبوں نے اپنے وقت کے بڑے حصہ کو وقف کئے رکھا ہے۔ طرح ادب و شعر کی ان نابغۂ ہستیوں کے کلام سے مستفید ہونے کی راہیں استوار ہوئی ہیں۔

پروفیسر خلیق انجم ادب کی تاریخ، تحقیق اور تنقید کے ان بلند پایہ ناموں میں شامل ہیں جنہوں نے خاص طور غالب شناسی کیلئے بہت وقیع اور قابلِ ستائش کام کیا ہے۔ ان کے کام کی وسعت اور ہمہ گیری کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ تنہا شخص اتنا وسیع کام کیونکر ممکن بنالیتا ہے۔ جبکہ کام کا ہر پہلو اپنے معیار کے لحاظ سے بلند پایہ اور بالکل اچھوتا ہو۔ ان کی تازہ کتاب ''غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ'' بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہے۔ ان کے دوسرے سارے کام کو نظرانداز کر دیا جائے اور صرف اسی کتاب کو سامنے رکھ لیا جائے تب بھی یہ ادب کی تاریخ و تحقیق اور غالب شناسی کے میدان میں ان کا نام بہت وقار اور عزت کے ساتھ ہمیشہ زندہ رکھنے کیلئے کافی ہے۔

زیرِنظر کتاب ''غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی'' نے شائع کی ہے اس کے ذریعہ پروفیسر خلیق انجم نے غالب کی زندگی کے ایسے پہلو پر بھرپور روشنی ڈالی ہے جو ادب کے قارئین کی نظر میں اب تک زیادہ واضح نہیں تھا۔ اس سلسہ میں چند تشنہ سے مضامین ضرور شائع ہوتے رہے ہیں۔ لیکن اصل واقعہ کا تفصیل کے ساتھ پتا نہیں چلتا تھا کہ اس کی نوعیت کیا ہے۔ مثلاً غالب کی پنشن کے بارے ہمیشہ پڑھتے رہنے کے بعد بھی یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ یہ پنشن کیا تھی۔ کہاں سے ملتی

تھی اور کیوں ملتی تھی اس قضیہ کی نوعیت کیا تھی ۔ کلکتہ کے ادبی معرکہ کی تفصیل کیا تھی اور مرزا قتیل کا اس سے کیا تعلق تھا۔ برہان قاطع اور قاطع برہان کا جھگڑا کس قسم کا تھا۔ اور غالب کی زندگی اور شاعری پر ان تمام معاملات سے کیا اثرات مرتب ہوئے تھے ۔ یہ کتاب ان تمام باتوں کو اس قدر تفصیل اور وضاحت کے ساتھ روشن کرتی ہے کہ لگتا ہے کہ اس بارے میں مدتوں پڑھتے رہنے کے باوجود اصل بات کا پتہ اب چل سکا ہے ۔ کمال تحقیق اور کھوج سے کام لیا گیا ہے کہ ہر بات ہر پہلو ہر گوشہ کو غالب کے خطوط اور سرکاری دستاویزات کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے ۔

کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے جنہیں دو ابواب کا عنوان دیا گیا ہے ۔ پہلا باب غالب کی پنشن کے قضیہ کے بارے میں لکھا ہے ۔ یہ پنشن کیا تھی ۔ اس کی ابتدا کیسے ہوئی ۔ قضیہ کیسے پیدا ہوا ۔ اس کے لئے غالب نے کیا کوششیں کیں ۔ کلکتہ کا سفر اسی سلسلہ میں اختیار کرنا پڑا تو اس کے دوران کیا مراحل پیش آئے کلکتہ پہنچ کر کیا صورت حال پیش آئی اور کیسے کٹھن حالات سے واسطہ پڑا ۔ اس شاعر بے بدل کی جان کیسے کیسے بکھیڑوں میں الجھی اور کیسے کٹھن حالات سے واسطہ پڑا اور ان سے نجات کی کیا صورت پیدا ہو سکی ۔ یہ تمام تفصیلات پوری شرح و بسط سے بیان کی گئی ہیں ۔ دوسرے باب میں رفت نویسی اور لسانیات کے ان تنازعوں کا ذکر ہے جو غالب نے شاید بلا وجہ اپنے سر لے لئے تھے ۔ اسی سلسلہ میں ان شاعروں کا ذکر آ گیا ہے جن میں کچھ غالب کے ممدوح ہیں اور کچھ مغضوب ہیں ۔ دونوں ابواب میں ہر چھوٹے بڑے واقعے کو پوری طرح دستاویزی ثبوت کیساتھ درج کیا گیا ہے ۔ سب سے بڑا ثبوت تو غالب کے خطوط ہیں جو مختلف شخصیات کو لکھے گئے اور قریبا ہر واقعہ کو اور ہر واقعہ کی جزئیات کو ان خطوط نے بیان کیا ہے ۔ مصنف کو غالب کے بہت سے نایاب خطوط تک رسائی ہوگئی جو اس کتاب کی تصنیف میں اس قدر کام آئے کہ ان کے بغیر واقعات کو اتنی تفصیل اور وضاحت کیساتھ بیان کیا ہی نہیں جا سکتا تھا ۔ ان خطوط کے علاوہ متعدد سرکاری دستاویزات سے مدد لی گئی ہے ۔ یہ دستاویزات دوسرے باب کے آخر میں شامل کی گئی ہیں ۔ اصل دستاویزات کے عکس کتاب میں شامل ہیں اور ساتھ ہی ان کی عبارت کو کمپوز شدہ صورت میں بھی شامل کیا گیا ہے ۔ کتاب کے آخر میں حواشی اور تعلیقات پر مشتمل قریبا سو صفحات بھرپور معلومات مہیا کرتے ہیں ۔ غالب کی پنشن کے سلسلہ میں جن انگریز افسران کا ذرا سا تعلق بھی رہا ہے ان کا تعارف درج کیا گیا ہے ۔ اسی طرح پنشن کے قضیہ سے متعلق دیگر جتنے حضرات کا کسی بھی طریقہ سے ذکر ہوا ہے ان کے مختصر حالات درج کئے گئے ہیں اس تعارف اور حالات سے بہت مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں ۔ ان حضرات کا غالب کے ساتھ کیا تعلق اور رشتہ تھا ۔ غالب کو ان سے کس حد تک مدد یا مخالفت ملی ا ۔ غالب کی زندگی پر ان کے اچھے یا برے سلوک سے کیا اثرات مرتب ہوئے ۔ کتاب کے خاتمہ سے پہلے

اشخاص، مقامات، کتب اور رسالوں کے اشارے بھی دیئے گئے اور ان کے ساتھ ہی تعلیقات کی فہرست دی گئی ہے۔ اس طرح کتاب کو بالکل جدید تقاضوں کے مطابق مرتب کرکے اس کی افادیت میں بہت اضافہ کر دیا گیا ہے۔

غالب کی پنشن کے بارے میں کتاب کے صفحہ 25 پر لکھا ہے

'' غالب کی پوری زندگی ان کی خاندانی پنشن کے گرد گھومتی رہی تھی۔ اختصار کیساتھ یہ بتانا ضروری ہے کہ غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خان برطانوی فوج میں چار سو سوار کے رسالدار تھے اور سترہ سو روپے ماہانہ ان کی تنخواہ تھی۔ بھرت پور کے قریب دو پرگنے سونک اور سونسا مرہٹے سردار بللر کے قبضے میں تھے۔ نصر اللہ بیگ خاں نے فوج کشی کرکے ان دونوں پرگنوں پر قبضہ کر لیا۔ لارڈ لیک نے نصر اللہ خاں کی بہادری سے خوش ہو کر انہیں یہ دونوں پرگنے عین مقرری جاگیر میں دے دیئے۔ اتفاق سے نصر اللہ بیگ ہاتھی سے گر گئے۔ اتنی چوٹیں آئیں کہ جانبر نہ ہو سکے۔ لارڈ لیک نے دونوں پرگنے واپس لے کر پس ماندگان کیلئے پنشن مقرر کر دی اور نواب احمد بخش خاں سے برطانوی سرکار نے یہ طے کیا کہ فیروز پور جھرکا ان کی جاگیر رہے گی۔ اور وہ پچیس ہزار سالانہ حکومت کو ادا کرتے رہیں گے۔ 4 مئی 1806ء کو لارڈ لیک نے طے کیا کہ نواب احمد بخش خاں پچاس سواروں کا ایک دستہ رکھیں گے جس پر پندرہ ہزار روپیہ سالانہ خرچ کریں گے اور دس ہزار روپے سالانہ نصر اللہ خاں کے پسماندگان کو وظیفہ کے طور پر دیں گے۔ بقول غالب نواب احمد بخش خاں نے پچاس سواروں کا دستہ تحلیل کر دیا اور دس ہزار وظیفہ کی رقم گھٹا کر پانچ ہزار سالانہ کر دی۔ مزید ستم یہ کیا کہ نصر اللہ بیگ کے پسماندگان میں اپنے ایک ملازم خواجہ حاجی کو بھی شامل کر دیا۔ پنشن کی تقسیم اس طرح کی گئی

خواجہ حاجی	دو ہزار روپے
نصر اللہ بیگ خان کی والدہ اور تین بہنیں	ڈیڑھ ہزار روپے سالانہ
غالب او ان کے بھائی مرزا یوسف	ڈیڑھ ہزار روپے سالانہ

اس وقت غالب کی عمر نو سال اور مرزا یوسف کی سات سال تھی۔ جب غالب نے ہوش سنبھالا اور انہیں اس بے ایمانی کا علم ہوا تو ان کا کہنا تھا کہ وظیفہ کی رقم پانچ ہزار روپے سالانہ نہیں دس ہزار روپے سالانہ تھی۔ نیز خواجہ حاجی کا ان سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ خواجہ حاجی کے والد خواجہ مرزا، غالب کے دادا کے باربردار تھے اور خواجہ حاجی ان کے خانہ زاد تھے۔''

اپنے اس مدعا کو مطالبہ کی صورت دے کر غالب نے سب سے پہلے نواب احمد بخش سے رابطہ کر کے اس زیادتی کے ازالہ کی درخواست کی۔ ان کا غالب سے رشتہ داری کا تعلق بھی تھا۔ ان کے بھائی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی امراؤ بیگم غالب کی بیوی تھیں۔ مگر وہاں سے

غالب کو تسلیوں کے سوا کچھ نہیں ملا۔ پہلے انہوں نے وعدہ کیا کہ خواجہ حاجی کے مرنے کے بعد ان کا وظیفہ غالب کو دے دیا جائے گا۔ مگر خواجہ حاجی کا انتقال 1823ء ہو گیا تو ان کا وظیفہ اسکے بیٹوں کو منتقل کر دیا گیا۔ اس پر غالب نے انگریز حاکموں تک اپنی فریاد پہنچانے کا ارادہ کر لیا۔ پہلے وہ ریذیڈنٹ دہلی سے ملاقات کی کوشش کرتے رہے۔ اس میں کامیابی نہ ہوئی کلکتہ کا سفر اختیار کیا جو گورنر جنرل کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ غالب کو اپنے موقف کی سچائی اور انگریز کے انصاف پر بڑا بھروسہ تھا اس لئے وہ پر امید تھے۔

کلکتہ کا یہ سفر بے انتہا مشکلات اور کٹھنائیوں سے بھرپور تھا۔ اول تو اس کیلئے جو راستہ اختیار کیا گیا وہ بہت طویل تھا۔ دہلی سے کانپور، لکھنؤ، باندہ، الہ آباد، بنارس اور مرشد آباد کے راستہ سے یہ سفر کئی مہینوں میں طے ہوا۔ پھر اس زمانہ میں سفر کے ذرائع آسانی سے مہیا نہیں تھے۔ گھوڑا، بیل گاڑی اور کشتی جیسے ذرائع استعمال کرنے پڑے، مزید یہ کہ اس زمانہ میں غالب بیمار ہو گئے۔ سفر کے دوران ہی علاج کی تدابیر بھی کرنی پڑیں۔ مالی مشکلات ہمیشہ غالب کیلئے بلائے جان رہیں۔ اس سفر کے دوران بھی ہر مرحلہ پر قرض کیلئے کوشش کرتے رہے۔ یہاں تک کہ یہ کوشش کلکتہ پہنچ کر بھی جاری رہی۔ کسی مرحلہ پر یہ کامیاب ہو گئی اور کسی مرحلہ پر ناکام رہی۔ زیر نظر کتاب کے ذریعے اس سفر کی قدم بہ قدم تمام روداد پوری تفصیلات کے ساتھ پہلی بار منظر عام پر آئیں اور معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو یہ سفر کس قدر دشواریوں اور مصیبتوں کو برداشت کر کے طے کرنا پڑا تھا۔ ان تمام صعوبتوں کو برداشت کر کے غالب کلکتہ پہنچے تو وہاں ان کی مخالفت کا پورا سامان پہلے سے موجود تھا۔ مرزا افضل بیگ وہاں اکبر شاہ ثانی کے وکیل کی حیثیت سے مقیم تھے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدیداروں میں رسوخ رکھتے تھے۔ یہ غالب کے بہنوئی مرزا اکبر بیگ کے چھوٹے بھائی تھے۔ اس کے ساتھ خواجہ حاجی کے ان بچوں کے ماموں تھے جن کو غالب پنشن کے حصہ داروں میں شمار نہیں کرتے تھے۔ اس طرح مرزا افضل بیگ نے اپنے بھانجوں کی حمایت میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا اور پنشن کے مقدمہ میں غالب کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب یہی شخص تھا۔

اس نے صرف سرکاری سطح پر مخالفت تک خود کو محدود نہیں رکھا بلکہ پروپیگنڈے کے روایتی حربوں کے ذریعے وہاں ایسی فضا پیدا کر دی کہ غالب کو بہت ناخوشگوار اور مخالفانہ صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے سنیوں کو یقین دلایا کہ غالب رافضی ہیں اور شیعوں کو بتایا کہ غالب صوفی یا ملحد ہیں۔ کلکتہ کے ادب و شعر کے حلقوں میں مشہور کر دیا کہ غالب قتیل کے علمی مرتبے کو تسلیم نہیں کرتے ہیں اور کلکتہ کے ادیبوں او شاعروں کو کسی شمار میں نہیں گردانتے غرض پروپیگنڈا کے تمام حربے استعمال کئے گئے اس پر مستزاد یہ کہ ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا۔

اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں مصرعے دئے گئے غالب نے دونوں زبانوں میں غزلیں کہیں اور مشاعرہ میں پڑھیں۔ ان کی غزلوں پر تین اعتراض کئے گئے اور بات کو علمی سطح سے الگ کر کے غالب کی بے عزتی کرنے کوکوشش کی گئی۔ یہاں تک کہ بقول غالب

''شور مچانا شروع کیا اور میرے خلاف ہنگامے پر اتر آئے۔ اسی میں انہیں اپنی برتری نظر آئی''

یہاں غالب کے معترضین میں اکثریت مرزا قتیل کے شاگردوں اور معتقدین کی تھی۔ انہوں نے اپنے اعتراضات کی بنیاد بھی قتیل کی کتابوں میں بیان کئے گئے زبان و شعر کے اصولوں پر رکھی تھی۔ چنانچہ غالب قتیل کے اس قدر خلاف ہو گئے کہ تمام عمر اسے معاف نہیں کیا بلکہ عبد الواسع ہانسوی کے محض اس لئے خلاف ہو گئے کہ اس نے اپنی تصنیف کردہ لغت میں قتیل کے شعروں سے اسناد پیش کئے تھے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ مرزا قتیل کا انتقال غالب کے کلکتہ پہنچنے سے دس گیارہ سال قبل ہو چکا تھا۔ پروفیسر خلیق انجم کا کہنا ہے

''غنڈہ گردی اور مشتہرین پر آمادہ لوگوں نے غالب کی یہ حالت کر دی کہ جب وہ بازار میں نکلتے تو لوگ ان پر آوازے کستے، اس ذلت و رسوائی کی وجہ سے اردو اور فارسی کا یہ عظیم شاعر نفسیاتی مرض میں مبتلا ہو گیا''

اسی نفسیاتی مرض کا اظہار کتاب کے مصنف کی نظر میں اس طرح ہوا کہ غالب نے نہ صرف قتیل بلکہ ہندوستان کے تمام فارسی گو شعراء کے مرتبہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور خود کو ان سب سے برتر ثابت کرنے کی ایک سب سے بڑی دلیل یہ وضع کی گئی کہ فارسی زبان پر ان جیسی دسترس کسی کو حاصل نہیں ہے۔ اس کیلئے عبد الصمد ایرانی کی فرضی شخصیت وضع کی گئی جس سے انہوں نے فارسی سیکھی تھی۔ اس طرح سفیر ہرات کی زبان سے اپنی کلام میں پڑھی گئی غزل کی فرضی تعریف کرائی اور زبان کا عالم ہونے کی تعریف کرائی۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ سفیر ہرات اس مشاعرہ میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ ان مفروضوں کو انہوں نے خطوں میں حقیقت بنا کر اپنے دوستوں تک پہنچایا ہے۔

اس نابغۂ روزگار اور دنیا کے عظیم شعرا میں شامل شاعر کو ایسی ہی نفسیاتی گھنڈی سے اس وقت واسطہ پڑا جب آخری مغل حکمران بہادر شاہ ظفر کے استاد ذوق سے انہیں اپنا مقابلہ کرنا پڑا پروفیسر خلیق انجم کے مطابق ''یہ بات پورے وثوق سے کہنا مشکل ہے ذوق کو واقعی خاقانی ہند کا خطاب ملا تھا۔ یا ان کے مداحوں اور شاگردوں نے انہیں خاقانی ہند کہنا شروع کر دیا تھا۔ امکان قوی یہ ہے کہ غالب کو اردو سے برگشتہ کرنے میں اس خطاب کو بھی اچھا خاصا دخل تھا۔ کچھ عرصہ بعد غالب اس پر فخر کرنے لگے کہ ان کا اصل میدان فارسی ہے۔ انہوں نے ایک

فارسی قطعے میں اپنی فارسی گوئی پر فخر کرتے ہوئے غالب ذوق پر چوٹ کی ہے۔'' انیس اشعار کے اس قطعہ میں ہی وہ شعر شامل ہے جو سیاق وسباق سے علیحدہ کرکے اکثر غالب کے مزاج کی ترجمانی کیلئے پیش کیا جاتا ہے۔ یعنی

فارسی ہیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگو راز مجموعہ اردو کے ہے رنگ منست

حقیقت ہے کہ غالب نے شعر گوئی کا آغاز اردو سے کیا اور اس زبان میں اپنی شاعری پر انہیں بڑا ناز تھا۔ وہ کہتے ہیں۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا انداز بیاں اور
جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکر ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

مگر یہ نفسیاتی گھنڈی تھی کہ وہ اردو سے برگشتہ ہوگئے۔ زیرِ نظر کتاب کے فاضل مصنف نے درست لکھا ہے۔

'' غالب کی مشکل یہ ہے کہ وہ ایک عظیم فنکار ہیں۔ لیکن اس پائے کے فنکار کا جو رویہ زندگی کی طرف ہونا چاہیے۔ وہ اس سے محروم ہیں۔ عام طور پر عظیم فنکار '' شوق ہر رنگ رقیب سروسامان نکلا'' کی تفسیر ہوتا ہے۔ وہ فن کو خون جگر سے سینچتا ہے اور ایسا کرنے کیلئے اسے تمام مادی ضرورتوں اور آسائشوں سے بے نیاز ہونا پڑتا ہے۔ غالب کا المیہ یہ ہے کہ ایک طرف ان کا آدرش عظیم فن کی تخلیق ہے۔ لیکن دوسری طرف ذوق کا سماجی وقار بھی ان کیلئے ناقابل برداشت ہے۔ غالب بخوبی واقف تھے کہ ان کا فن ذوق اور ظفر دونوں کے فہم وادراک سے بالا ہے۔ لیکن بادشاہ کی قربت حاصل کرنے کی تمنا نے انہیں زندگی بھر انگاروں پر لوٹایا۔''

غالب کی نفسیاتی کیفیات اور الجھنوں کا جو جائزہ کتاب کے مصنف نے لیا ہے اور اس کی گہرائی اور جزئیات تک پہنچنے کی جو کوشش انہوں نے خود غالب کے خطوط کی روشنی میں کی ہے اسے غالب شناسی کے میدان میں ایک نئے باب کا اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اول تو زیرنظر کتاب پوری کی پوری تحقیق اور تجزیہ کا ایسا شاہکار ہے کہ لگتا ہے اس سے قبل ہم غالب کی شخصیت اور زندگی کے بارے میں ادھوری باتیں ہی پڑھتے رہے ہیں۔ اس کی زندگی اور شخصیت کی پوری داستان اور تصویر اب اس کتاب نے مکمل کی ہے۔ یہ کتاب غالب کی فنی عظمت اور بے

بدل شاعری اور لازوال نثر نگاری کو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی انسانی خامیوں کا بھی پوری طرح اظہار کرتی ہے۔ اس طرح غالب کی حقیقی شخصیت کا ایسا بھرپور تصور ابھرتا ہے جس کے تمام اجزاء مکمل ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ بڑے لوگوں کی زندگی کے بارے میں تحقیق اور کھوج کا سلسلہ صدیوں چلتا رہتا ہے اور نئے سے نئے پہلو سامنے آتے رہتے ہیں۔ اس طرح ان بڑے لوگوں کی شخصیت اور فن کو درست طور پر سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ زیر نظر کتاب نے اسی کام کو بہت خوبصورتی سے انجام دیا ہے۔ غالب کی وفات کو سو سال سے زائد عرصہ گزرنے کے بعد اس کتاب کے ذریعہ ان کی شخصیت کے ایسے پہلو سامنے آئے ہیں جن کے اوجھل رہنے سے ان کی شاعری کی تفہیم میں بھی مشکل پیش آتی تھی۔ اس لحاظ سے پروفیسر خلیق انجم نے بہت اہم تحقیقی اور تجزیاتی کارنامہ انجام دیا ہے۔ غالب پر انہوں نے پہلے بھی دقیع کام کیا ہے۔ خاص طور پر غالب کے تمام اردو خطوط کی تدوین اتنا بڑا کام ہے کہ غالب دوست ان کے ہمیشہ احسان مند رہیں گے۔ اب یہ زیر نظر کتاب گویا اس سے کچھ بلند کام کا درجہ رکھتی ہے۔ اس سے غالب کی زندگی، ان کے طرز فکر، ان کی افتاد طبع اور ان کے فن کی بلندی کے ایسے گوشے واضح ہوتے ہیں جن پر اب تک گویا روشنی نہیں ڈالی گئی تھی۔ غالب شناسی میں اس کتاب کا درجہ اس قدر بلند ہے کہ اس کے بغیر غالب شناسی کا کام قطعاً نامکمل رہتا ہے۔

کتاب دبیز سفید کاغذ پر خوبصورت کمپوزنگ کے ساتھ اہتمام سے شائع کی گئی ہے لیکن اتنی اہم کتاب میں پروف کی غلطیاں بہت کھٹکتی ہیں۔ بعض جگہ تو یہ غلطیاں اس حد تک ہیں کہ عبارت ہی بے ربط ہو جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں احتیاط کر لی جاتی تو زیادہ بہتر تھا۔ اب آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح کر لینی چاہیے۔ کتاب کی جلد بھی مضبوط نہیں باندھی گئی۔

اس کتاب کے مطالعہ کے بعد مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس سے قبل غالب کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں میری تفہیم کافی ناقص تھی۔ اب اس کتاب کو پڑھنے کے بعد غالب کی شخصیت کو بہت بہتر طریقہ سے پہچاننے لگا ہوں اور ان کی شاعری کی بھی نئی پرتیں مجھ پر واضح ہو گئی ہیں اس کیلئے میں پروفیسر خلیل انجم کا ہمیشہ شکر گزار رہوں گا۔ اردو ادب شعر سے شغف رکھنے والے ہر شخص کا غالب کے ساتھ کسی نہ کسی سطح کا تعلق ضرور ہے۔ اسی تعلق میں نزدیکی اور گہرائی پیدا کرنے کا سبب بننے والے ہر دانشور کا ہم پر احسان ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ پروفیسر خلیق انجم نے اس سلسلہ میں بہت اہم حیثیت حاصل کر لی ہے۔ اس لئے ان کا ایک دفعہ پھر شکریہ ادا کرتا ہوں

☆☆☆☆☆☆

رپورٹ: حُر حامیم، لاہور

پاکستان کا خیال سب سے پہلے غالب نے پیش کیا تھا

——مصورِ اقبال اسلم کمال

غالب میموریل ٹرسٹ کے زیر اہتمام غالب کے پورٹریٹ کی تقریب رونمائی

شہرہ آفاق مصور اسلم کمال کے اعزاز میں غالب میموریل ٹرسٹ نے 24 مارچ 2006ء کی شام لاہور جم خانہ میں ایک خصوصی تقریب کا اہتمام کیا۔ تقریب میں ابوسعید احسن اصلاحی، شاہد علی خاں، حمید اختر، عذرا اصغر، ثروت محی الدین، شبہ طراز، طاہر علی زیدی، کرنل (ر) سعادت مہدی، محمد سعید شیخ، خواجہ محمد ہارون، شمشاد احمد خاں، سعدیہ قریشی، حسین احمد شیرازی، ظفر علی راجا، پروین عاطف، اور دیگر ممتاز علمی و ادبی شخصیات کے علاوہ مرزا غالب کے عزیز شاگرد امو جان کے پوتے ڈاکٹر انیس الرحمٰن اور بیگم بشریٰ انیس الرحمٰن کی شرکت قابل ذکر ہے۔

اس موقع پر مہمان خصوصی سابق سیکرٹری خارجہ شمشاد احمد خاں نے مصور اقبال اسلم کمال کے تیار کردہ غالب کے پورٹریٹ کی رونمائی کی جو مصور کی جانب سے غالب ٹرسٹ کو عطیہ کیا گیا ہے۔ تقریب کے اختتام پر غالب ٹرسٹ کے سرپرست ابوسعید احسن اصلاحی نے مہمانان خصوصی سیکرٹری خارجہ شمشاد احمد خاں اور اسلم کمال کو نشان غالب کی یادگاری شیلڈز پیش کیں۔

تقریب کا آغاز کرتے ہوئے غالب ٹرسٹ کے چیئرمین تسلیم احمد تصور نے مرزا غالب کی جو تصاویر اب تک منظر عام پر آتی رہی ہیں اُن کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ چند تصویروں کے علاوہ بیشتر تصاویر مستند نہیں ہیں۔ البتہ ایک تصویر وہ ہے۔ جو کسی مصور نے نہیں بنائی بلکہ یہ عکسی تصویر ہے جو نواب مرزا علائی نے مرزا غالب کی زندگی کے آخری ایام میں کھنچوائی تھی۔ اس تصویر کا اعلان 28 مئی 1868ء کے اکمل الاخبار میں شائع ہوا تھا۔ اس لیے اسے مرزا غالب کی آخری تصویر قرار دیا جا سکتا ہے۔ تسلیم احمد تصور نے بتایا۔ کہ انھوں نے اس تصویر کو پورٹریٹ کے معروف مصور ایس۔ ایم۔ خالد سے تیار کروا کے پہلی مرتبہ 'سورج' کے غالب نمبر کے سرورق کی زینت بنایا تھا۔ اور اب یہ تصویر 35 مربع فٹ سائز میں غالب ٹرسٹ کی گیلری میں آویزاں ہے۔ تسلیم احمد تصور نے مصور اقبال اسلم کمال کا شکریہ ادا کیا کہ اُن کا عطا کردہ پورٹریٹ ٹرسٹ

میں موجود غالب کی تصاویر میں ایک گرانقدر اضافہ ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے پورٹریٹ کے خالق کو اظہار خیال کی دعوت دی۔ اسلم کمال نے کہا کہ غالب سب سے پہلا شاعر تھا جس نے پاکستان کا خیال پیش کیا۔ بعد میں اقبال نے غالب کے اس خیال کو مزید نکھارا اور واضح کیا انھوں نے کہا ہمیں یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہیے کہ ہم آج تک دیوان غالب کی شرحیں تو پڑھتے رہے۔ مگر اُسے اپنے طور پر پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔

مصور اقبال اسلم کمال نے کہا مرزا غالب کی شاعری واقعی گنجینہ معانی کا ایک طلسم ہے غالب نے بلاشبہ ہر حرف کی تہ میں ایک میخانہ آباد کر رکھا ہے جو ماہ و سال کے ایک طویل عرصے سے دیوانِ غالب کے ہر ایک قاری کو سرمستِ سخن بناتا چلا آرہا ہے۔ میں بھی بطور ایک قاری جھوم جھوم اٹھتا ہوں اور بطور ایک مصور میں نے آج تک جو کلام غالب مصور کیا ہے وہ غالب کے مقام و مرتبہ سخنوری کے حضور ایک مصورانہ خراج ہے۔ شاعر کی شاعرانہ شخصیت کے مرکز میں بھی ایک شخص ہوتا ہے اور اس کے ساتھ عقیدت کا جو رشتہ اس کے جمالِ فن کے حوالے سے قاری کے ساتھ طے پا جاتا ہے، وہ بھی اظہار چاہتا ہے۔ چنانچہ غالب کی شبیہ کی طرف راغب ہو جانا ایک فطری امر ہے پورٹریٹ اگرچہ میرا خاص شعبہ نہیں ہے تاہم غالب شخص اور غالب شاعر کو ایک کینوس میں یکجا کرنا غالب اور غالب شناسی کے احیاء کے لیے ایک اہم عصری ضرورت ہے۔

غالب کے پورٹریٹ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے کہا آپ کے سامنے غالب کے اس پورٹریٹ میں غالب کے دائیں ہاتھ نیچے کونے میں دو باہم مماثل گنبد واقع ہیں۔ یہ مغل طرزِ تعمیر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے عقب میں زرد روشنی اوپر کی جانب آہستہ آہستہ کمزور پڑتی جا رہی ہے۔ جو مغل سلطنت کے زوال کی علامت ہے۔ زوال کی یہ علامت تصویر کے نصف میں جہاں اپنی انتہا کو پہنچ رہی ہے، وہاں اس میں سے کچھ حروف و الفاظ ظاہر ہوتے نظر آتے ہیں، جو کینوس کے مغرب سے کینوس کے مشرق تک شبیہ غالب کے پسِ منظر میں افق پر ایک منظر نامہ روشن کرتے ہیں جس کو غالب کا تعارفی شعر ناطق کر رہا ہے۔

غالب نام آورم نام و نشانم مپرس
ہم اسداللّٰھم و ہم اسد اللّٰھیم

یہ سارا منظر نامہ فنِ خطاطی، فنِ شاعری اور فارسی زبان سے عبارت ہے۔ فنِ خطاطی، فنِ شاعری اور فارسی زبان کی جو روایات مغل اپنے ساتھ ملکِ فارس سے برصغیر میں لے کر آئے اور یہاں کی سیاسی اور معاشرتی آب و ہوا اور تہذیبی اور ثقافتی رنگ و بو میں ان روایات کے خدوخال کی جو تہذیب نو عہدِ غالب تک ہوئی غالب نے اِس کے حسن و جمال کو فارسی اور اردو زبان میں اپنی نظم و نثر کے ذریعے انیسویں صدی میں بڑی کامیابی سے منتقل کیا۔ میں نے اس تصویر میں اردو

اور فارسی زبان اور ان میں نظم ونثر کے اس تہذیبی اور ثقافتی اثاثے کی تصویریت کو فنِ خطاطی کے جدید ترین اسالیب میں سے ایک خط "خطِ کمال" کے پیرائے میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

میں یہ تصویر غالب میموریل ٹرسٹ کو پیش کرتا ہوں۔ اس ٹرسٹ کے چیئرمین جناب تسلیم احمد تصور ایک مستند اور فعال عملی، ادبی اور صحافتی شخصیت ہیں، وہ غالب شناسی کے لیے جس سرگرمی اور خلوصِ نیت سے سرگرم عمل ہیں۔ اس کے حوالے سے وہ ہر غالب پسند اور غالب شناس کی ستائش فراواں کے مستحق ہیں۔ اس تصویر کا وہ جو بھی اپنے "مقاصد غالب" کے لیے استعمال کریں۔ اس کا انھیں میں پورا اختیار دیتا ہوں۔ اس مشورہ نما درخواست کے ساتھ کہ عظیم سخنور نجم الدولہ دبیر الملک نواب مرزا اسد اللہ خان دہلوی کو ازسرِنو دریافت کرنے کی ضرورت ہے وہ ایک انسان ہے عہد زوال کے شہر دہلی کے کوچہ بلی ماراں میں بود و باش کے حوالے سے جس کا دل جب گردش ایام سے بے حد گھبرا جاتا تھا تو وہ تلخ نوائی پر اتر آتا تھا۔

دیر نہیں ، حرم نہیں ، در نہیں ، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں

اور

ہاں وہ نہیں خدا پرست ، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو، دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

غالب کوئی پیالہ و ساغر نہیں تھا ایک انسان تھا عہد زوال میں دن بدن کمزور ہوتا ہوا انسان جو کبھی کبھی جوا کھیل لیتا تھا، شراب پی لیتا تھا۔ اس کے بس اس ایک جرم میں عام لوگوں نے نہیں کیونکہ وہ عام شاعر نہیں تھا۔ خاص الخاص سخن شناس لوگوں نے شاعر بے بدل کو تب سے اب تک کوتوال کے رحم و کرم پر چھوڑ رکھا ہے۔

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہ گار ہوں ، کافر نہیں ہوں میں

مرزا غالب کی یہ تصویر جو آپ کے سامنے ہے۔ میرے لیے اس تصویر کے بارے میں آپ کے ساتھ ہم کلام ہونے کا یہ موقعہ بہت خوشگوار ہے جس کا اہتمام غالب میموریل ٹرسٹ نے کیا ہے۔ غالب میموریل ٹرسٹ کے چیئرمین جناب تسلیم احمد تصور ہر ایک سخن فہم کی تحسین و ستائش کے حق دار ہیں۔ اس ٹرسٹ کے قابل صد احترام عہدہ داران کا بے حد شکریہ ادا کرتے ہوئے میں غالب کی پینٹنگ کے بارے میں کچھ عرض کرنے کے علاوہ آپ کو لندن میں دریائے ٹیمز کے کنارے ٹیٹ آرٹ گیلری لیے چلتا ہوں۔ یہ ایک وسیع و عریض گیلری ہے اس کی سیاحت کے لیے ایک نہیں، دو نہیں، کئی دن چاہئیں، یہاں مجھے ایک رضا کار گائیڈ مسز وائٹ ملی تھی۔ جو مجھے

اس گیلری کی تفصیلی سیاحت کے بعد اپنی آنٹی میڈم کلاڈیہ ڈورس کے گھر لے گئی۔ میڈم کلاڈیہ ڈورس کا گھر ایک گھر سے کہیں زیادہ ایک آرٹ میوزیم تھا۔ وہ اس میوزیم کا سب سے قیمتی اثاثہ خود تھی اس وقت میڈم کلاڈیہ ڈورس کی عمر ایک سو بیس برس تھی۔ وہ اپنے عہدِ شباب کا اپنا عریاں مجسمہ بطور خاص مجھے دکھاتی ہے۔ میں اس کے سامنے انگشتِ بدنداں ہوں اور وہ اپنی عمر کے ماہ و سال کو یورپ میں صنعتی انقلاب اور سائنسی ترقی کے سنگِ ہائے میل کے حوالوں سے بیان کرتی رہی۔ میری حیرت اور اس کی یاد افروزی کے دوران نہ جانے کتنے زمانے گزر گئے۔

میں جب وہاں سے رخصت ہونے لگا تو اُس نے مجھے ایک چوسنے والی گولی دی اور منہ میں رکھنے کو کہا اور اس کے بعد یوں گویا ہوئی:

''جب تک یہ گولی تمھارے منہ میں گھلتی رہے گی۔ تمھاری سانس خوشبودار رہے گی، تمھاری سوچ خوشبودار رہے گی اور تمھارے خیالات اور خواب خوشبودار ہوتے رہیں گے۔ اسی طرح انسان کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ کسی دانا کا قول، صداقت کی کوئی کہانی، معرفت کی کوئی مثال، کوئی نکتہ، کوئی تلمیح، کوئی استعارہ، کوئی شعر یا کوئی آسمانی آیت ہر وقت اپنے ذہن میں ضرور رکھے۔ تاکہ صداقت، حکمت اور خیر ذہن میں گھلتے رہیں اور ان کے ذرات اس کی سوچ اور فکر میں شامل ہوتے رہیں۔ یہ کہنے کے بعد وہ میری طرف کچھ دیر بڑی شفیق نظروں سے دیکھتی رہی اور پھر الوداعیہ انداز میں بولی۔'' میں ایک سو بیس برس کی ہوں۔ ایک سو بیس برس کے تجربہ کا نچوڑ یہ چند الفاظ میں تحفہ کے طور پر تجھے دے رہی ہوں۔ شب بخیر! میں نے میڈم کلاڈیہ ڈورس کے جھریوں بھرے ہاتھ پر تعظیمی بوسہ دیا تو مجھے اپنے اندر کسی جشنِ چراغاں کا جو نادر احساس ہوا تھا کاش وہ بیان کیا جا سکتا۔

مصور اقبال اسلم کمال نے کہا۔ انسان کی ہر سوچ میں اُس وقت ذہن میں خفتہ اور نیم خفتہ اِدھر اُدھر بکھری پڑی ان گنت سوچوں کے ذرات شامل ہوتے رہتے ہیں۔ انسان کا ایک لاشعور ہوتا ہے اور اس لاشعور کا بھی ایک لاشعور ہوتا ہے۔ چنانچہ انسان کا ماضی لاشعور اور لاشعور در لاشعور کا ایک غیر مختتم سلسلہ ہے اسی طرح جب انسان دور اندیشی یا مستقبل بینی کرتا ہے تو وہ بھی ایسا ایک سلسلہ دراز کرتا ہے جو شعور در شعور اور شعورِ اعلیٰ ترین سے عبارت ہوتا ہے۔ میرا اور آپ کا شاعر نجم الدولہ دبیر الملک نواب مرزا اسد اللہ غالب دہلوی نظارۂ آرائش خم کا کل کے جمالیاتی ردعمل میں اندیشہ ہائے درر دراز سے دراصل آنے والے زمانوں میں ایک شاعرانہ پیش قدمی مراد لیتا ہے۔ جو ایک اوسط درجے کے ذہن کی رسائی سے پرے ہے۔ چنانچہ اوسط درجے کے قارئین کے لیے غالب ایک غیر دلچسپ اور بے حد مشکل شاعر ہے۔ ہر قوم ہر ملک اور ہر شعبہ ہائے علم و فضل یا فنون لطیفہ کے ہر ایک زمانے میں کچھ لوگ صفِ اول میں شمار ہوتے ہیں اس صفِ اول

میں غیر معمولی افراد کا ایک حلقہ ہوتا ہے اور غیر معمولی افراد کے اس حلقے میں کوئی ایک مثالی ہوتا ہے۔ غالب ایک مثالی شاعر ہے جو اس سے بھی آگے کہیں فن شاعری کا ایک عجوبہ (ونڈر-Wonder) ہے۔ جس کی شاعرانہ عظمت اس کے عہد سے جڑے ہوئے کئی مشکل، مختلف اور متضاد زمانوں میں سے حیرت انگیز طور پر سالم و ثابت گزر کر عہدِ اقبال تک پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ غالب اقبال کا پیشرو اور اقبال غالب کی توسیع بن جاتا ہے۔ اقبال ایک شاعر اور مفکر بھی ہے جو غالب کے شعر سے ایک مفکرانہ رشتہ رکھتا ہے۔ اقبال کی فکر سے غالب کا شاعرانہ تعلق بنتا ہے اقبال کے فکری کمال میں شعریتِ غالب سے رشک پایا جاتا ہے اور غالب کے شعری جمال میں اقبال کی جانب لپک پائی جاتی ہے۔

شاعر غالب کہتا ہے ؂

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آن پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

مفکر شاعر اقبال کہتا ہے ؂

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں؟
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

شاعر غالب کہتا ہے ؂

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

مفکر شاعر اقبال کہتا ہے ؂

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکون

غالب ایک شاعر ہے وہ انسانی زندگی کا از حد ہمدرد اور اس کی جانب بصدقِ دل متوجہ بھی ہے۔ اگرچہ اس کے ہاں کوئی باقاعدہ نظامِ فکر موجود نہیں ہے لیکن جو شاعر یہ کہتا ہے ؂

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

اور جو شاعر یہ پوچھتا ہو ؂

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

کیا ایسا شاعر کسی شارح کے ہاتھ آسانی سے آ سکتا ہے؟ مطالعہ غالب کا حاصل اس کا

جواب نفی میں دیتا ہے۔ تصدیق کرتا ہے کہ شارحین نے ظلم کیا ہے انھوں نے غالب کے مندرجہ ذیل شعر کو بھی احساس ناقدری، ناشناسی، کسمپرسی، بے اختیاری اور بے بسی سے تعبیر کیا ہے۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

شارحین نے قارئین کو لغت پڑھائی ہے دیوان غالب نہیں پڑھایا۔ اور غضب یہ ہوا کہ قارئین نے شارحین کا کہا مان لیا اور شاعر سے برتر اس کے شارح کو جان لیا اور اس کی نیاز مندی میں غالب سے علیک سلیک نہیں کی، غالب سے معانقہ نہیں کیا اور مکالمہ نہیں کیا۔ کاش ہم غالب سے ہم کلام ہوئے ہوتے تو ہم پر کھلتا کہ ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

اس شعر میں جہاں سے خبر نہ آنے کی بات کی گئی ہے وہ مقام شعر کے زمانہ حال کے کسی گمنام کوچے میں ہے اور نہ اس کے ماضی کی کسی گہرائی میں بلکہ وہ مقام آئندہ کی کسی انتہا پر واقع ہے۔ عبقری ہمیشہ دیگر یا مابعد زمانوں میں رہائش رکھتے ہیں۔ اقبال کہتا ہے ؎

عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

غالب اور اقبال تو شاعر اور مفکر شاعر ہیں ریاضی دان آئن سٹائن کہتا ہے۔ ''مجھے کتنے ہی تیر مارے گئے ہیں، مجھے ایک بھی نہیں لگا۔ میری تو دنیا ہی اور تھی۔''

کون نہیں جانتا کہ آئن سٹائن کی دنیا دیکھنے جانے کے لیے سب سے پہلے روشنی کی رفتار سے سفر کرنے کی اہلیت ضروری ہے۔

مجھے یہاں میڈم کلاڈیا ڈورس یاد آتی ہے۔ منہ میں خوشبودار گولی رکھنے کے فوائد جو اس نے بیان کیے تھے ان کے حوالے سے اقبال کے ذہن میں جہاں رومی، عطار، سنائی، نظیری، بیدل، بائرن، ورڈزورتھ کے اشعار حشر سامانی کرتے تھے۔ وہاں گوئٹے کے دم آخریں کے الفاظ ''مزید روشنی'' (More Light) بھی ہر دم جگمگ جگمگ کرتے تھے ساتھ ہی کہیں قریب ہی وہاں گوئٹے کے ہندی ہمنوا غالب کے اس شعر نے تو بلاشبہ ایک مستقل گھونسلہ بنا رکھا تھا ؎

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بگردشِ رطلِ گراں بگردانیم

غالب ایک عہدِ زوال میں زندہ شاعر ہے وہ اپنے آشوبِ عصر کا بھرپور احساس بھی اور ادراک بھی رکھتا ہے وہ اس آشوب کی تصویرکشی یوں کرتا ہے ؎

ممکن نہیں کہ بھول کے کہیں آرمیدہ ہوں
میں دشت غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں

وہ کہتا ہے میرے چار سو پھیلا ہوا ایک دشت غم (آشوب عصر) ہے۔ جس میں ایک ایسا ہرن میں ہوں جس نے اپنے شکاری (فرنگی) کو دیکھ لیا ہے کہ وہ میرا مسلسل پیچھا کر رہا ہے۔ اس لیے ممکن نہیں کہ مجھے کسی جگہ چین سے بیٹھنا نصیب ہو سکے۔ چنانچہ غالب اپنے پیچھے لگے ہوئے شکاری (فرنگی) اور اس کے ترکش کے تیروں کی زد سے بچ نکلنے کے لیے روشنی کی رفتار سے بھی کہیں تیز پرواز تخیل کا سہارا لیتا ہے، اور مستقبل کے کسی زمانے میں واقع ہونے والے ایک ایسے گلشن میں پہنچ جاتا ہے جہاں کی پر سکون فضا کے نشاط و انبساط کی گرمی سے ایک عندلیب کی طرح وہ نغمہ سنج ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی فراریت نہیں ہے بلکہ اپنے آشوب عصر کا وہ حکیمانہ ردعمل ہے جو مستقبل میں جھانکنے کی اہمیت اور اہلیت پیدا کرتا ہے۔

غالب ایک مشکل انسان ہے اس مشکل شخصیت کے پیچھے اس کی ذاتی زندگی ہے جو دکھ اور خوشی، انانیت اور خوشامد، رواداری، اور سرکشی، ذمہ داری اور لاابالی پن، ہمدردی اور بے اعتنائی، گرم جوشی اور کم آمیزی، خلوص اور بیزاری اور محبت اور نفرت کے انبوہ ضدین سے عبارت ہے۔ ایک مشکل انسان کے علاوہ غالب ایک بے حد مشکل شاعر بھی ہے اس کی اردو زبان میں شاعری بھی فارسی اوڑھے ہوئے ہے۔ مشکل اصطلاحیں، پیچیدہ تراکیب اور تہہ دار اسلوب بیان کے پس منظر میں بھی دراصل اس کے عصری آشوب کا وہ جبر ہے جس کا اظہار عام فہم سیدھی سادھی زبان میں کر کے حالات کو مزید ناسازگار بنا لینے سے گریز کے پیش نظر وہ مشکل گوئی اختیار کرتا نظر آتا ہے۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ کلام غالب کا مطالعہ بیشتر قارئین شارحین کے توسط سے کرتے ہیں۔ اور وہ غالب شناس نہیں ہو پاتے۔ چنانچہ ان مضامین سے محروم رہ جاتے ہیں جن کو غیب سے لا کر صریر خامہ نوائے سروش میں ادا کرتا ہے۔ نوائے سروش کا شناسا اقبال غالب سے ہم کلام براہ راست ہوا۔ اسی لیے اُس پر وہ غالب منکشف ہوا ہے۔ جو کہتا ہے ۔

در تہِ ہر حرف غالب چیدہ ام میخانہ
تاز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن

چنانچہ اقبال نے اپنی شہکار کتاب جاوید نامہ کے فلک مشتری پر ارواح جلیلہ میں قرۃ العین طاہرہ اور منصور ابنِ حلاج کے ساتھ غالب کو اس کے کمال سخنوری کی وجہ سے شامل کر کے ان کے ذریعے جو مسائل اور مباحث پیش کیے ہیں وہ جاوید نامہ کی روح شمار کیے جاتے ہیں۔ تینوں سرخ عبائیں پہنے ہوئے ہیں ان کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ انھیں جنت کی پیشکش کی گئی۔ مگر انھوں نے جنت میں مستقل قیام پر کائنات کی سیر جاوداں کو ترجیح دی ہے۔ یہاں اقبال نے

غالب کی وہ غزل شامل کی اور بزبان غالب ادا کروائی ہے۔ جس کا مطلع ہے ؎

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بگردش رطلِ گراں بگردانیم

اس شعر میں قاعدہ آسماں کو بدل دینے کا عزم اور قضا کو گردشِ رطلِ گراں سے واپس لوٹا دینے کا جذبہ اقبال کے گوش سماعت کے لیے وہ نغمہ سرمدی ہے جس کی گونج اقبال کی فارسی اور اردو شاعری کے پس منظر میں جابجا سنائی دیتی ہے۔ چنانچہ اس مطلع کی ضوفشانی اس غزل کے مقطع کو بھی بالکل نیا تناظر فراہم کرتی نظر آتی ہے ؎

ز حیدریمؑ من و تو زما عجب نبود
گر آفتاب سوئے خاوراں بگر دانیم

شارحین کی کلام غالب کی شرحوں کو ایک طرف رکھ کر اور مرزا غالب کے شیعہ مسلک سے بلند ہو کر ہی اس شعر کا حشر سماں شور سنا جا سکتا ہے۔ غالب اس شعر میں کہتا ہے کہ اگر ہم غروب ہوتے ہوئے آفتاب کا رخ الٹے پاؤں مشرق (جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے) کے رہنے والوں کی طرف (برائے طلوع نو) موڑ دیں تو حیدر کرارؓ سے نسبت کی باوصف میرا اور تیرا (اے اقبال) یہ کارنامہ خلق خدا کے لیے باعث حیرت نہیں ہوگا۔ آیئے اب یہ مطلع اور یہ مقطع ایک بار اس طرح پڑھتے ہیں ؎

بیا (اے اقبال) کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بگردش رطلِ گراں بگردانیم

ز حیدریمؑ من و تو (غالب اور اقبال) زما عجب نبود
گر آفتاب سوئے خاوراں بگر دانیم

غالب نے اس غزل کے مقطع کو خاوراں (اہل مشرق یعنی اقوام شرق) سے منسوب کر کے اپنے ذاتی احساس کو اجتماعی بلکہ تہذیبی احساس میں بدل دیا ہے اقبال نے اس غزل کو "جاوید نامہ" میں شامل کر کے غالب کے اس احساس کو اپنایا اور فلک مشتری پر اس کی گونج بلند کر کے اسے ایک بین الافلاکی مسئلہ کے طور پر اپنے ایجنڈے میں سرفہرست رکھ کر وہ بحضور خالق کائنات لے گیا اور وہاں سے عطا کردہ یزدانی حکمت و دانش کے تمام موتی اُس نے اپنی آخری مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" میں بکھیر دیئے ہیں۔ اقبال کی ساری شاعری کو اگر جسم تصور کر لیا جائے تو اقبال شناسوں کی رائے میں یہ مثنوی اس جسم میں دماغ کی طرح ہے۔

مرزا غالب علامہ اقبال کی پیدائش سے آٹھ برس پہلے فوت ہوا۔ دشتِ غم میں اس کے

پہچانے ہوئے صیاد (فرنگی) کی غلامی سے آزادی ملنے سے نو سال قبل علامہ اقبال نے غلام ہندوستان میں وفات پائی۔ ہم انھیں بجا طور پر شاعر پاکستان کہتے ہیں کہ انھوں نے اپنے کلام میں جا بجا اپنے خواب آزادی کے شرمندہ تعبیر ہو جانے کی پیش گوئیاں کی ہیں جیسے ؎

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغام سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی

میں نے غالب کو گاہے گاہے پینٹ کیا ہے لیکن کلام اقبال کو اپنا ایک مستقل موضوع فن بنائے رکھا ہے ایوان اقبال لاہور میں کلام اقبال کی میری مصوری پر مشتمل ایک مستقل آرٹ گیلری حکومت نے قائم کر کے اس عاجز کے فن کا اعتراف کیا ہے۔ اس گیلری کی ایک تصویر میں علامہ اقبال کو نصف شب کے قریب ایک جگہ مشق سخن میں محو دکھایا گیا ہے۔ قریب گلی میں روشنی کا کھمبا ہے، ستاروں کا کارواں اُفق کے متوازی علامہ اقبال کے شانوں کو چھو کر گزر رہا ہے اوپر پورے آسمان پر کسی شہر کا مجوزہ نقشہ (Town Planning) اُبھر رہا ہے جس میں مکانوں کے روزنوں روشن دانوں اور کھڑکیوں کی ڈرائنگ سے پاکستان کے پرچم کا چاند اور ستارہ آہستہ آہستہ روشن ہوتا نظر آ رہا ہے۔ یہ تصویر جس شعر کی میں نے بنائی ہے۔ وہ شعر یہ ہے ؎

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

اس شعر کی شرح شارحین نے یہی لکھی ہے کہ وہ واقعہ جو ابھی پیش نہیں آیا میں اس کا عکس اپنے آئینہ ادراک میں دیکھ رہا ہوں۔ شارح وہ شاعر نہیں ہے جو نفس جبرائیل کے لیے دعا کرتا ہے چنانچہ وہ اس حادثے کی ماہیت کا اندازہ نہیں کر سکا جو مستقبل میں واقعہ ہونے کے لیے ابھی پردۂ افلاک میں ہے جبکہ اس شعر میں پاکستان کے معرض وجود میں آنے کی پیشین گوئی پوری طرح موجود ہے۔ اس پیش گوئی کو باوثوق اور نمایاں صحافیانہ خبر بنانے کے لیے علامہ اقبال کا ایک اور شعر پڑھتے ہیں ؎

پس از من شعرِ من خوانند و دریا بندومی گویند
جہانے را دگرگوں کردیک مردِ خود آگاہے

اب دوبارہ پیش گوئی والا شعر پڑھتے ہیں ؎

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

اس شعر کو پڑھنے کے بعد آیئے اب وہ غزل جس کے مطلع میں غالب نے صیاد (فرنگی) کو پہچان لیا ہے اس کا اگلا یہ شعر پڑھتے ہیں ۔

ہوں گرمئ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشنِ نا آفریدہ ہوں

ان دونوں اشعار کو جوں جوں گنگنائیں گے۔ پہلے یہ ہم آہنگ ہوں گے، پھر ہم مفہوم اور پھر ہم معنی ہو جائیں گے، اور غالب کے گلشنِ نا آفریدہ کا جو حادثہ ابھی تک افلاک کے پردے میں ہے اس کا عکس ہم اقبال کے آئینہ ادراک میں دیکھنے لگیں گے۔ علامہ اقبال سے جو مجھے روحانی عشق اور علمی عقیدت ہے اس کے عطا کردہ شعور کی روشنی میں غالب کو میں اقبال کے پیشرو کے طور پر ایک آزاد وطن پاکستان کا خواب دیکھنے والا پہلا شاعر شمار کرتا ہوں۔ بے حد شکریہ

تقریب کے مہمانِ خصوصی سابق سیکرٹری خارجہ شمشاد احمد خاں نے اپنے خطاب میں فروغ غالبیات کے لیے ٹرسٹ کی خدمات کو سراہا۔ انھوں نے کہا۔ معزز خواتین و حضرات! فکر انگیز باتیں بہت ہو چکیں اور میرے خیال میں اب مزید کچھ کہنے کی گنجائش تو نہیں لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ آج کی اس تقریب میں میری موجودگی جتنی ناگہانی اور اچانک ہے اتنی باعثِ فخر بھی، میں نہ ادیب ہوں، نہ شاعر اور نہ ہی مصور۔ اس کے باوجود میں آج بے ساختہ طور پر اہل علم وفن کی اس محفل میں کھنچا چلا آیا۔

غالب میموریل ٹرسٹ اور ادب کی روشنی پھیلانے والے ''سورج'' کے سربراہ اور مدیر جناب تسلیم احمد تصور صاحب اور محترم اسلم کمال صاحب جن کی مصوری اور خطاطی کے کمالات کا میں مداح ہوں۔ یہ ان کی کشش تھی کہ وہ غالب کے حوالے سے مجھے آج یہاں کھینچ لائی ہے۔ اور اسی حوالے سے خواتین و حضرات! آج میری یہاں موجودگی میرے لیے نہ صرف باعث مسرت ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ میرے لیے ایک چیلنج بھی ہے۔

اس سے پہلے کہ میں اس چیلنج کی نوعیت بیان کروں میں اپنے نہایت قابل احترام اور معزز میزبانوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے اتنی عقیدت اور محبت کے ساتھ اس تقریب میں شمولیت کا موقع دے کر میری عزت افزائی کی ہے، میں آپ کا بے حد مشکور ہوں۔

جہاں تک میرے لیے چیلنج کا تعلق ہے میں پھر یہی کہوں گا کہ میں نہ ادیب ہوں، نہ شاعر اور نہ مصور چالیس سال حکومتی کولہو کے بیل کے طور پر کام کرنے کے بعد میں نے حال ہی میں اپنی

''باز نشستنی'' کے بعد عدت پوری کی ہے۔ یا پھر بقول کسے زندگی کے اس دور میں داخل ہوا ہوں جسے ''بازن نشیدن'' بھی کہا جا سکتا ہے اور اب آہستہ آہستہ اپنی آنکھوں کی پٹی اتار کر اپنے اردگرد کے حالات، ملکی مسائل اور زمینی حقائق کو اپنی آنکھوں کے ساتھ، اپنے ذہن کے ساتھ اور اپنی سوچ کے ساتھ دیکھ رہا ہوں۔ وقت کی فضا میں جو گرد و غبار ہے اس کو اپنی سانسوں میں محسوس کر رہا ہوں۔ بہت کچھ دیکھ لیا ہے، محسوس کیا ہے اس مختصر عرصے میں۔ کرب و اضطراب کا عجب ماحول ہے۔ زندگی کی عجب سیمابی رفتار ہے۔ ہر طرف ہیجان آمیز کیفیت نظر آتی ہے۔ سڑکوں پر، گلیوں میں، دکانوں میں، کھیل کے میدان، شادی گھروں میں، سیاسی جلسوں میں اور پارلیمانی ایوانوں میں غرض کہ ہر جگہ ایک Chaos کا نظارہ ہے۔ میدان کارزار کا نقشہ ہے۔ ہر شخص بے حد عجلت میں نظر آتا ہے۔ قطعی بے سبب جلدی میں۔ خواہ پیدل ہو یا گاڑی میں یا سائیکل یا موٹر سائیکل سوار ہو حتیٰ کہ آج کل تو گدھا گاڑی بھی بہت ہی تیزی سے بھاگتی نظر آتی ہے۔ کس منزل کی تلاش میں ہیں ہم؟ اس افراتفری کے عالم میں۔ اس بے تحاشا اور بلا مقصد مصروفیت میں نظم و ضبط کا کہیں نشان نہیں۔

اس ماحول میں آج میری یہاں موجودگی میرے لیے ایک منفرد، مختلف اور خوش گوار تجربہ ہے۔ ایک تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح۔ اس لحاظ سے آج ارباب علم و فن کی موجودگی میں ایک نہایت خوش گوار احساس ہو رہا ہے یہ دیکھ کر کہ ہماری شاعری ادب اور فنون لطیفہ کی روایات کے حوالے سے خواتین و حضرات! آپ سارے دوستوں کو اپنے تہذیبی ورثے کے ساتھ اتنا پر خلوص لگاؤ ہے۔

اپنے چیلنج کے ضمن میں ایک دُکھ بھی محسوس کر رہا ہوں کہ کسی بھی قوم کا تہذیبی ورثہ، اس کا ادب، اس کی مصوری، اس کی شاعری، اس کی موسیقی، اس کے تمام فنون لطیفہ کی روایات یہ سب اس قوم کے خوش نما چہرے ہوتے ہیں۔ جن سے اس کی عظمت، اس کی تاریخ، اس کے تمدن اور ترقی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے ہم نے اپنی قومی زندگی میں ان میں سے ایک بھی چہرہ اپنے کندھوں پر نہیں رکھا۔ ہم نے بہت سارے دوسرے روپ اپنا لیے۔

کتنے لبادے اوڑھے ہم نے! کبھی نظریاتی مملکت، کبھی عالمی مصلحت، کبھی جمہوریت کے نام لیوا، کبھی آمریت کے شیدائی، کبھی امت اسلامیہ کی قیادت کے علمبردار، کبھی مغربی روایات کے پاسدار، کبھی کشمیریوں کے حق خودارادیت کی بات کرتے ہیں اور کبھی مصلحتوں اور لچک دار Options کی۔ کبھی مذہب میں شدت پسندی کے مخالف اور کبھی مذہبی شدت پسندوں کو اپنے سٹریٹیجک مقاصد کے حصول کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اور تو اور اسلامی اقدار پر مبنی باہمی نفرتوں، تعصبات، فرقہ واریت کی شناخت، کلاشنکوف اور Drugs کی شناخت، کرپشن اور بدنظمی کی

شناخت، مغرب کی بے راہروی اور میراتھن ریسز کی شناخت۔ غرض کے ابھی تک پاکستان کا کوئی ایک صحیح سلامت رخ سامنے نہیں آیا۔ کتنے چہرے بدلے ہم نے۔ کہ بقول کے کوئی تو ہم سے پوچھے:

کہ اپنے کون سے چہرے میں تم ہو؟

اپنی آزادی کے بعد ہم نے بہت بحران دیکھے۔ اتنے حادثات ہوئے ہیں ہماری مختصر قومی زندگی میں کہ اب تو ہم نے بے حسی اور لاتعلقی کو ہی اپنی نجات کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ کچھ بھی ہوتا رہے ہم بے فکر ہیں نہ ہم نے اپنے ماضی سے کچھ سیکھا نہ اپنے مستقبل کی جہت کا تعین کیا۔ ہم تو اپنے حال کی بے حالی میں مگن ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم نے اپنے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ اوروں کی سوچ پر غیروں کی تدبیر پر انحصار کرنے لگے ہیں۔ ہماری بے حسی عروج پر ہے۔ One wheeling کے عادی ہوگئے ہیں ہم لوگ۔ قوم واقعی ایک پہیے پر چل رہی ہے۔

بدقسمتی سے آج ہماری عالمی پہچان صرف اور صرف انتہا پسندی اور دہشت گردی کے حوالے سے ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایک قوم اتنی اقدار کی مالک ہوتے ہوئے بھی رجعت پسندی کا شکار ہے۔ اپنی تہذیب کے جن خوش نما چہروں کی بدولت ہم اپنے ملک کو دنیا میں ایک مہذب اور معتدل مملکت کے طور پر متعارف کرا سکتے تھے۔ انھیں ہم نے پس پشت ڈال دیا ہے۔ ہماری شناخت اور قومی زندگی میں سب تضادات صرف اس وجہ سے پیدا ہوئے کہ ہم نے اپنا جو تہذیبی اور ثقافتی سرمایہ تھا اس کو استعمال ہی نہیں کیا یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے۔

آخر میں غالب کے حوالے سے میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ اس کی مشکل پسندی کی زندگی، اس کی شخصیت اور شاعری سے ہمیں صرف ایک ہی پیغام ملتا ہے کہ غمی ہو یا خوشی، تنگی ہو یا آسانی ہر حال میں سر اٹھا کر چلو اور اس بات کا اطلاق فرد اور ملت دونوں پر یکساں طور سے ہوتا ہے آج ہمیں صرف یہ سوچنا ہے کہ اگر آج غالب زندہ ہوتا تو وہ پاکستان کے حوالے سے کیا کہتا؟ یہ سوال میں اپنے سب دوستوں پر چھوڑتا ہوں اس کا جواب تلاش کرنے کے لیے پھر کبھی وقت ملا تو انشاءاللہ اس پر بھی بات ہوگی۔

فی الحال میں ایک بار پھر شکر گزار ہوں آپ سب کا۔ آپ نے میری عزت افزائی کی ہے۔ اور اسلم کمال صاحب کے حوالے سے میں اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ مین ہمیشہ سے ان کی مصوری کا، ان کی خطاطی کا مداح رہا ہوں اور اگر آج میں آپ کے ساتھ ایک اسٹیٹ سیکرٹ شیئر کروں تو وہ یہ ہے کہ ہمارے پاکستان کے جتنے بھی سفارت خانے ہیں ان میں نوے فیصد کے دفاتر یا سفیر کی رہائش گاہوں میں اسلم کمال کی کیلیگرافی اور پینٹنگز پاکستان کی نمائندگی کر رہی ہیں۔ بہت بہت شکریہ۔ بڑی نوازش۔
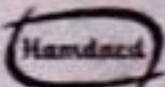
☆☆☆

رپورٹ: کفایت دہلوی
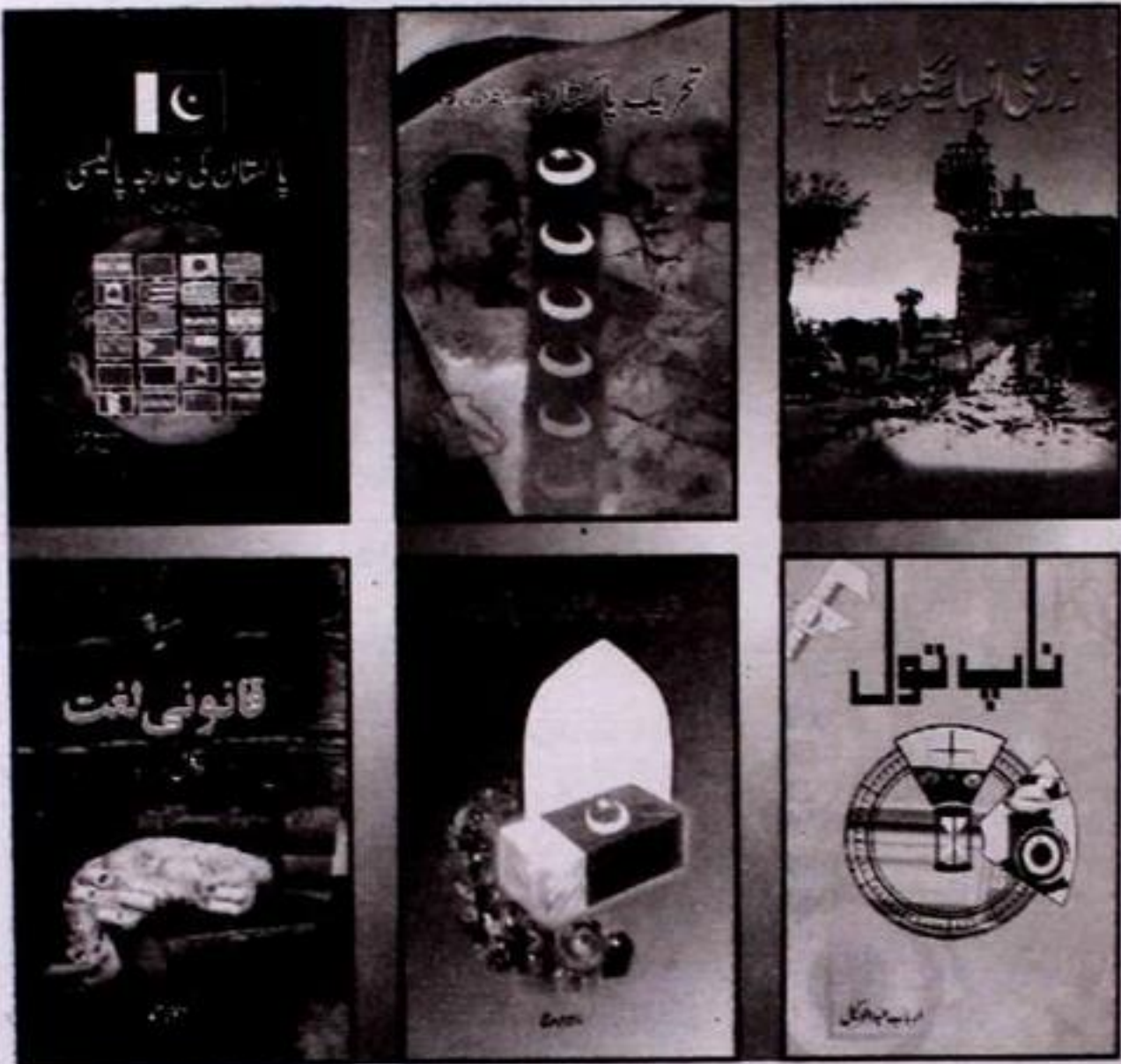
تفہیم و تعبیرِ غالب کے امکانات

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے زیرِ اہتمام بین الاقوامی غالب سیمینار کا انعقاد

نئی دہلی میں ماتا سندری لین پا واقع غالب انسٹی ٹیوٹ کی پر شکوہ عمارت رنگا رنگ قمقموں سے جگمگا رہی تھی۔ آج یہاں بین الاقوامی غالب سیمینار کی افتتاحی تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جس میں شرکت کیلئے دنیا بھر کے مختلف ممالک سے ممتاز ماہرین غالبیات تشریف لا چکے تھے۔ سیمینار جو 16، دسمبر سے 18 دسمبر 2005ء تک جاری رہا کا افتتاح ہندوستان کے سابق وزیرِ اعظم شری اندر کمار گجرال نے کیا۔ اس موقع پر 2005ء کے غالب ایوارڈ دیئے گئے۔ بعد ازاں عالمی شہرت یافتہ گلوکار جگجیت سنگھ نے اپنی آواز کا جادو جگایا۔ یہ محفل رات گئے تک جاری رہی۔

تفہیم و تعبیرِ غالب کے امکانات'' کے موضوع پر غالب انسٹی ٹیوٹ میں منعقد ہونے والے بین الاقوامی غالب سیمینار کے دوسرے دن (۱۷ دسمبر) کا اجلاس پروفیسر امیر حسن عابدی کی صدارت میں ہوا اور اس اجلاس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے پاکستان سے تشریف لائے جناب پرتو روہیلہ موجود تھے اس اجلاس میں ۵ مقالے پیش کئے گئے پہلا مقالہ ڈاکٹر سرور الہدیٰ کا تھا۔ آپ نے ''نئی نسل کا غالب سے مکالمہ'' کے موضوع پر اپنا گراں قدر مقالہ پیش کیا۔ ایران سے تشریف لائے مہمان اسکالر پروفیسر کریمی نے ''تفہیم غالب در ایران'' کے موضوع پر مقالہ خوانی کی۔ ازبکستان کے معروف اسکالر اور تاشقند یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے استاد ڈاکٹر انصار الدین ابرہیمو نے بابر اور غالب کا ایک خوبصورت تقابلی مطالعہ پیش کیا اس اجلاس میں پروفیسر وارث کرمانی نے بھی ''کلام غالب میں تشریح کے مسائل'' کے

عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ اس اجلاس کا آخری مقالہ ماہنامہ صدا (لندن) کے ایڈیٹر ڈاکٹر اقبال مرزا کا تھا آپ نے ''غالب کے سوالیہ اشعار'' کے موضوع پر خوبصورت مقالہ پیش کیا اس اجلاس کی نظامت کا فریضہ ڈاکٹر رضا حیدر نے انجام دیا۔

دوسرے اجلاس میں صدر کی حیثیت سے ڈاکٹر خلیق انجم اور فضیل جعفری تھے۔ پروفیسر ضیاء الدین شکیب مہمان خصوصی کی حیثیت سے موجود تھے اس اجلاس کا پہلا مقالہ افغانستان کے اسکالر افسر رہبین کا تھا آپ نے ''کلام غالب میں بیدلانہ جنوں'' کے موضوع پر علمی مقالہ پیش کیا،، تفہیم غالب کے امکانات اور نئی نسل،، کے عنوان سے ڈاکٹر احمد محفوظ نے بھی اس اجلاس میں اپنا مضمون پڑھا۔ پروفیسر ابوالکلام قاسم نے ''تفہیم غالب کے امکانی حیات'' کے موضوع پر نہایت پُر مغز مقالہ پیش فرمایا۔ اس اجلاس کا آخری مقالہ پاکستانی ادیب ڈاکٹر انوار احمد کا تھا آپ نے غالب کی مختلف شرحوں کا ایک علمی تجزیہ پیش کیا۔ اس اجلاس میں نظامت کا فریضہ ڈاکٹر ارتضی کریم نے انجام دیا۔

سیمینار کے تیسرے اجلاس میں پروفیسر عبدالودود اظہر دہلوی بحیثیت صدر شریک سیمینار تھے اور مہمان خصوصی کا فریضہ پاکستانی اسکالر تبسم کاشمیری انجام دے رہے تھے۔ اس اجلاس میں سب سے پہلا مقالہ پروفیسر ضیاء الدین شکیب نے پڑھا۔ آپ نے ''تفہیم وتعبیر غالب کے امکانات فکری ارتقاء کی روشنی میں'' کے موضوع پر کلام غالب میں فکر کے مزید امکانات پر روشنی ڈالی۔ دوسرا مقالہ ڈاکٹر امتیاز احمد کا تھا۔ آپ نے ''تفہیم غالب کے ایک متبادل رویے کی تلاش'' کے موضوع پر مقالہ پیش فرمایا۔ اس اجلاس کا تیسرا مقالہ ڈاکٹر حسن عباس کا تھا آپ نے ''ایران اور تفہیم غالب'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ پیش کیا اس اجلاس کا آخری مقالہ ڈاکٹر کاظم علی خاں کا تھا آپ نے کلام غالب کی شرحوں سے متعلق عالمانہ گفتگو کی۔ اس سیمینار کے دوسرے دن کے آخری اجلاس میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے صدارت کی اور مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے کینڈا سے تشریف لائے اسکالر ڈاکٹر عروج اختر زیدی موجود تھے۔ اس اجلاس میں تین مقالے پیش کیے گئے پہلا مقالہ ازبکستان کی ایک اسکالر دل آرام کراماتوا نے پڑھا۔ آپ نے ،، غالب اور زبان ترکی،، کے عنوان سے اپنے مقالے میں چند نئے گوشوں کی طرف اشارہ کیا۔ دوسرا مقالہ پروفیسر قاضی افضال حسین کا تھا۔ آپ نے اپنے مضمون میں تعبیر متن کے مسائل اور امکانات کے موضوع پر علمی نکات پیش کیے اجلاس کا آخری مقالہ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کا تھا۔ آپ نے ''حالی اور تفہیم غالب'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ اس اجلاس کی نظامت کا فریضہ ابوظہیر ربانی نے انجام دیا۔ آخری دن (۱۸) دسمبر کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر قمر رئیس نے کی اور ایران سے تشریف لائے مہمان اسکالر پروفیسر نصیری مہمان

خصوصی کی حیثیت سے موجود تھے۔ اس اجلاس میں ازبک اسکالر شفاعت صادق نوا نے ''تفہیم غالب خطوط میں شامل شعار کے حوالے سے'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ ایران سے تشریف لائے ادیب ڈاکٹر عبداللہ عطائی نے بھی اس اجلاس میں ''ایران میں آثارِ غالب کے امکانات'' پر گفتگو کی۔ آذرمی ڈخت صفوی اس اجلاس کی تیسری مقالہ نگار تھیں آپ نے ''ایران میں نقد تفہیم غالب پر ایک نظر'' کے عنوان سے علمی مقالہ پیش فرمایا۔ اس اجلاس میں پاکستان سے تشریف لائی ادیبہ ڈاکٹر عالیہ امام نے ''جدید عہد میں غالب کی معنویت'' کے موضوع پر عالمانہ تقریر کی۔ اس اجلاس کا آخری مقالہ پاکستانی دانشور محمد علی صدیقی کا تھا آپ نے ''خلیفہ عبدالحکیم اور مطالعہ غالب'' کے موضوع پر گراں قدر گفتگو کی۔ اس اجلاس میں نظامت کا فریضہ ڈاکٹر حسن مثنّی نے انجام دیا۔ اس سیمینار کا چھٹا اجلاس پروفیسر صادق اور ڈاکٹر اسلم پرویز کی صدارت میں ہوا اور پاکستانی ادیب جناب تسلیم احمد تصور مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے اجلاس میں موجود تھے۔

پہلا مقالہ ''تشکیک، نئی نسل اور غالب'' کے موضوع پر ڈاکٹر سراج اجملی کا تھا دوسرا مقالہ عروج اختر زیدی نے ''کلامِ غالب فخر و مباہات کی جہت'' کے عنوان سے پیش کیا۔ پرتو روہیلہ نے بھی اس اجلاس میں مقالہ خوانی کی آپ کے مقالے کا عنوان ''غالب کی انشا نگاری و فارسی نامہ نویسی'' تھا۔ پروفیسر شمیم حنفی نے ''ہر سخن اس کا ایک مقام سے ہے'' اس عنوان سے عالمانہ مقالہ پیش کیا چھٹے اجلاس کا آخری مقالہ تبسم کاشمیری کا تھا آپ نے ''تفہیم غالب کا ایک دور'' کے موضوع پر علمی گفتگو کی، اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر مظہر مہدی نے کی۔ ساتواں اجلاس پروفیسر قاضی افضال حسین کی صدارت میں شروع ہوا اس اجلاس میں پاکستانی ادیب آصف فرخی مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے موجود تھے۔ اس اجلاس میں پہلا مقالہ پروفیسر حنیف نقوی نے پیش کیا آپ نے فارسی خطوط کے حوالے سے تفہیم غالب کی جو دشواریاں ہو رہی ہیں اُس سے متعلق تحقیقی مقالہ پیش کیا دوسرا مقالہ ''غالب کے اختصاص کے چند پہلو'' کے موضوع پر پروفیسر عتیق اللہ نے پیش کیا تیسرا مقالہ پروفیسر قاضی عبید الرحمن ہاشمی نے پیش کیا۔ آپ نے ''حالی اور تفہیم غالب'' کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ چوتھا مقالہ پروفیسر علی احمد فاطمی نے ''نقد غالب کے نقش ہائے رنگ رنگ'' کے عنوان سے پیش کیا۔ پانچواں مقالہ پروفیسر قاضی جمال حسین نے پڑھا۔ آپ نے ''غالب کی مشکل پسندی'' کے موضوع پر علمی اور تنقیدی باتیں پیش کیں۔ اس اجلاس کا آخری مقالہ ڈاکٹر اسلم پرویز نے پڑھا آپ نے ''تفہیم غالب اور غالب کا ایک شعر'' کے موضوع پر گفتگو کی اس اجلاس کی نظامت کا فریضہ ڈاکٹر شاہینہ تبسم نے انجام دیا۔ سیمینار کے آخری اجلاس کی صدارت ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے کی تھی اور مہمان خصوصی کی

حیثیت سے پاکستانی ادیب ڈاکٹر انوار احمد کو زحمت دی گئی تھی۔ اس اجلاس میں تین مقالے پیش کئے گئے۔ پہلا مقالہ پروفیسر نصیری (ایران) نے ''غالب در ایران'' کے عنوان سے پڑھا دوسرا مقالہ تسلیم احمد تصور (پاکستان) کا تھا آپ نے ''ابوالکلام آزاد کی تحریروں میں اشعار غالب'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا سیمینار کا آخری مقالہ آصف فرخی نے ''غالب اور افسانے میں تعبیریں'' کے عنوان سے پیش کیا۔ اس اجلاس میں نظامت ڈاکٹر علیم اشرف کی تھی۔ سیمینار کے اختتام سے پہلے ایک تاثراتی اجلاس بھی منعقد ہوا جس کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی اور شاہد ماہلی نے کی اس اجلاس میں بیرونِ ہند کے علما و دانشور نے سیمینار سے متعلق خیالات کا اظہار کیا جن قابلِ ذکر ادیبوں نے اس اجلاس میں گفتگو کی اُن میں ڈاکٹر اقبال مرزا (لندن)، پروفیسر نصیری (ایران) انوار احمد، تبسم کاشمیری، آصف فرخی، پرتو روہیلہ، محمد علی صدیقی، تسلیم احمد تصور (پاکستان) قابلِ ذکر ہیں۔ ان بیرونِ ہند کے تمام مندوبین کو غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے انسٹی ٹیوٹ کی کتابوں کا تحفہ پیش کیا یہ تحفہ انسٹی ٹیوٹ کے سیکریٹری پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی صاحب کے دستِ مبارک سے پیش کیا گیا۔ سیمینار کا اختتام پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی کے تشکرانہ کلمات سے ہوا۔

عالمی مشاعرہ

بین الاقوامی غالب سیمنار جو ''تفہیم و تعبیر غالب کے امکانات'' کے موضوع پر منعقد کیا گیا تھا اُس کے دوسرے دن یعنی ۷ ادسمبر کو شام ساڑھے چھ بجے ایوانِ غالب کے غالب آڈیٹوریم میں ایک عالمی مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں ملک اور بیرون ملک کے ممتاز شعرا نے اپنے اشعار سے سامعین کو محظوظ کیا۔ اس مشاعرہ کی صدارت بھوپال سے تشریف لائے مشہور شاعر جناب اختر سعید خاں نے کی۔ واضح رہے کہ جناب اختر سعید خاں کو اس دفعہ غالب انسٹی ٹیوٹ نے اپنے سب سے اہم ایوارڈ،، غالب انعام برائے اردو شاعری،، سے نوازا ہے۔ اس مشاعرہ میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے دلی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جناب مارکنڈے کارجو بھی موجود تھے۔ یہ مشاعرہ رات ۱۲ بجے کامیابیوں کی منزلیں طے کرتا ہوا اختتام پذیر ہوا۔ اس مشاعرہ میں جن اہم شعراء نے اپنے کلام پیش کئے اُن کے ایک ایک شعر پیش کئے جارہے ہیں:

بستی سے اٹھ رہا ہے دھواں نفرتوں کا پھر
آیا ہے کون امن کا لشکر لئے ہوئے
(قیصر ماہلی)

پھیلا ہوا ہے جسم میں تنہائیوں کا زہر
رگ رگ میں جیسے ساری اُداسی اُتر گئی
(شاہد ماہلی)

ہر ایک شخص کے ہاتھوں کو کیسے کاٹو گے
لکھے گا کوئی تو قصہ انا فروشی کا
(رئیس الدین رئیس)

بہت خراب ہے ماحول اس زمانے کا
نکلتا گھر سے تو ماں باپ کی دُعا لے کر
(منظر بھوپالی)

کوئی بھی غم ہو بہت دیر تک نہیں رہتا
محبتوں میں بچھڑ کر بھی لوگ جیتے ہیں
(شکیل اعظمی)

کبھی کبھی تو وہ اتنی رسائی دیتا ہے
کہ سوچتا ہے تو مجھ کو سنائی دیتا ہے
(منظور ہاشمی)

ایسا لمحہ نہیں کوئی دن رات میں
جو نہ گزرا ہو تیرے خیالات میں
(ڈاکٹر آفاق فاخری)

اُس کو دیکھا ملی پلک سے پلک
جان سی آگئی ہے جان میں کچھ
(فاروق انجینئر)

ہوا ناراض تھی ہم سے کنارا دور تھا ہم سے
سمندر تھا کہ یاں سے واں تلک بھر پور تھا ہم سے
(مظفر حنفی)

اجنبی ملک، اجنبی چہرے
کس سے بولیں، کہاں کی بات کریں
(ڈاکٹر عروج اختر زیدی)

اک عمر گزاریں گے سر نوک قلم ساز
اک شعر کسی دل میں چبھو جائیں گے اک دن
(عبدالاحد ساز)

آپ کے مُنھ سے اچھا لگتا ہے
پھر مرا نام لیجیے صاحب
(کمال احمد صدیقی)

اس زمین پر ہوں کہ جس کا آسماں گم ہو گیا ہے
چلچلاتی دھوپ سر پر سائباں گم ہو گیا ہے
(رفعت سروش)

سحر سے سوچ رہا ہوں کہ شام کیسے ہو
یہ دائروں کا سفر ہے تمام کیسے ہو
(پرتو روہیلہ)

رقص وہ رقص تھرکتا ہوا شعلہ جیسے
ذہن کو چھو لے تو ہم لمس صبا کہتے ہیں
(نور جہاں ثروت)

وہ کس قبیلے سے ہے کون سے گھرانے سے
سب اس کے لہجے کی شائستگی میں لکھا ہے
(مجاہد فراز)

بدل سکے نہ شب و روز ان کی فطرت کو
گلوں کے ساتھ تھے لیکن وہ خار خار رہے
(اقبال مرزا)

تیرہ راتوں کے عذابوں سے ڈراتا ہے مجھے
جل کے بجھتا ہوں تو وہ پھر سے جلاتا ہے مجھے
(ولی بجنوری)

بہت طویل سفر یہ طے ہوا کیسے
ترے بغیر یہاں تک میں آ گیا کیسے
(اختر سعید خاں)

غیرملکی مندوبین کے اعزاز میں انجمن ترقی اردو کا استقبالیہ:

انجمن ترقی اردو (ہند) نے ۱۹ ردسمبر کو اردو گھر میں اُن غیر ملکی مہمانوں کے ایک اعزاز میں ایک استقبالیہ جلسہ منعقد کیا جس میں پاکستان کے جناب انتظار حسین، جناب آصف فرخی، جناب انوار احمد، جناب تبسم کاشمیری، جناب پرتو روہیلہ، جناب تسلیم احمد تصور، امریکہ کے جناب افروز تاج اور جناب جان کاٹویل، لندن کے اقبال مرزا، کنیڈا کے جناب بیدار بخت اور ازبکستان کے انصارالدین ابراہیموف نے شرکت کی اور اپنے اپنے ممالک میں اردو زبان وادب کی صورت حال پر مختصراً روشنی ڈالی۔ سب سے پہلے پروفیسر شمیم حنفی نے تمام مہمانوں کا بہت عمدہ تعارف پیش کیا۔ جناب انوار احمد، جناب پرتو روہیلہ، جناب آصف فرخی، جناب تبسم کاشمیری اور جناب اختر حسین وغیرہ نے ہندوستان اور پاکستان ے درمیان بہتر ہوتے تعلقات پر خوشی کا اظہار کیا اور اس بات پر زور دیا کہ دونوں ملکوں کے درمیان ادیبوں اور اسکالروں کی آمدورفت کے ساتھ کتابوں اور رسالوں کے آدان پردان کی بھی کوئی بہتر صورت نکالی جائے تاکہ دونوں ملکوں کے ادیب۔ اساتذہ اور طلبہ ایک دوسرے کی تخلیقات، تحقیقات اور تنقیدات سے مستفید ہوسکیں۔

جناب افروز تاج اور جناب کاٹویل نے امریکہ میں اردو زبان کی تعلیم وتدریس کی صورت حال پر روشنی ڈالی اور تدریس کے سلسلے میں آج کے زمانے کی نئی ایجادات اور ٹیکنالوجی سے استفادے کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ نیز اردو اور ہندی کے اپنے پروجیکٹ سے بھی واقف کروایا۔ جناب انصار الدین ابراہیموف (تاشقند) نے بتایا کہ تاشقند مشرقیاتی انسٹی ٹیوٹ میں اردو، ہندی اور دوسری مشرقی زبانیں پڑھائی جاتی ہیں، اس وقت چالیس طلبہ اردو پڑھ رہے ہیں۔ اسی طرح سے تاشقند اسلامک یونیورسٹی میں کچھ طلبہ اردو کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس سلسلے میں ہندوستانی سفارت خانہ ہماری ہر طرح کی مدد کرتا ہے۔ انصارالدین صاحب نے اپنے ادبی سفر اور انسٹی ٹیوٹ کی دوسری درگرمیوں پر بھی

روشنی ڈالی۔

ماہنامہ ،صدا، لندن کے مدیر جناب اقبال مرزا نے بھی مغربی ممالک میں اردو زبان و ادب کی ترقی ،فروغ اور تحفظ کے کاموں پر مختصراً اظہار خیال کیا۔ اس موقع پر سہ ماہی ،سورج، لاہور کے ضخیم غالب نمبر کی رسم اجرا ڈاکٹر خلیق انجم کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ سہ ماہی ،سورج، کے مدیر جناب تسلیم احمد تصور نے اپنی اور غالب میموریل ٹرسٹ کی علمی و ادبی خدمات پر روشنی ڈالی اور کہا کہ دو ضخیم جلدوں میں ، غالب شناسوں کا تذکرہ ،ٹرسٹ کی طرف سے بہت جلد منظر عام پر آرہا ہے۔

جناب پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی ، پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی اور ڈاکٹر خلیق انجم نے تمام مہمانوں کا استقبال کیا اور ہندوستان میں اردو زبان و ادب کی صورت حال اور مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور کچھ مفید مشورے اور تجویز بھی پیش کیے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ اردو زبان و ادب کا دائرہ وسیع ہوتا جارہا ہے ،اس کا ثبوت اس جلسے میں موجود غیر ملکی اسکالر اور ادیب ہیں جو اپنے اپنے ملکوں میں اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں سرگرم ہیں۔ اس موقع پر تمام غیر ملکی مہمانوں کی خدمت میں انجمن کی مطبوعات کا ایک ٹرسٹ ، کلینڈر اور ہفت روز ، ہماری زبان ، کا مشفق خواجہ نمبر پیش کیا گیا۔

تسلیم احمد تصور

مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں میں اشعارِ غالب

مولانا ابوالکلام آزاد وہ نابغہ روزگار شخصیت ہیں جنھیں قدرت کی فیاضی نے بیک وقت بے شمار اعلیٰ ترین شخصی اوصاف اور ذہنی صلاحیتوں سے کھلے دل کے ساتھ مزین کر دیا تھا۔ وہ اس مرتبہ کے جید عالم تھے کہ نوعمری میں امام الہند کا خطاب حاصل کرنے کے مرتبہ تک پہنچے۔ خطابت میں ان کی شعلہ بیانی اور سحر نوائی کا ایک زمانہ گرویدہ تھا۔ سیاسی رہنمائی میں ان کا مقام برعظیم کے چند بلند ترین رہنماؤں کے ساتھ گنا جاتا ہے۔ مدبرانہ جدت طرازی میں ان کا سکہ اب تک مسلم ہے۔ ادب اور انشا میں ان کی سحر نگاری بے مثال ہے۔ ان کی طرز انشا انھی کے ساتھ مخصوص ہے۔ نہ اس سے قبل اس جواہر نگاری کی کوئی مثال ملتی ہے نہ بعد میں اس کی پیروی ہو سکی ہے۔ یہ منفرد اسلوب نگارش انھی کا خاصہ تھا اور انھی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ ان کی نثر متانت، رنگینی، دلآویزی اور شگفتگی کا ایسا مرقع ہے کہ قاری اس کے سحر کا اسیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ انھوں نے اردو انشا پردازی کو بالکل نئی جہت سے آشنا کیا۔ لیکن اس طرز تحریر کی پیروی ممکن نہ تھی۔ ''تذکرہ'' ''قولِ فیصل'' اور ''ترجمان القرآن'' کی تحریر ان کی بے مثال انشا پردازی کے ساتھ ساتھ علم و دانش میں ان کے بہت بلند مرتبہ کی عکاس ہے۔ جبکہ ''غبار خاطر'' اور دیگر مجموعوں میں شامل ان کے مکاتیب میں ان کے اسلوب تحریر کی تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ ان کی دلربا شخصیت کا پرتو بھی شامل ہو گیا ہے:۔

مولانا کیسے لکھتے تھے اور لکھتے وقت ان پر کیسی کیفیتیں طاری ہوتی تھیں۔ اس کے بارے میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ''ذکر آزاد'' میں بتاتے ہیں:

> ''مولانا کو لکھتے دیکھ کر مجھے عجیب قسم کا حظ حاصل ہوتا تھا۔ ہونٹوں پر ایک خفیف سا تبسم کھلتا ہوتا۔ اور انگلیوں میں قلم ناچتا ہوا۔ کاغذ کے میدان پر بے روک دوڑا کرتا۔ لکھتے وقت چہرہ ہی نہیں پورا سراپا دیکھنے کے لائق ہوتا۔ حسن مجسم بن جاتے تھے۔ شاید اپنی تحریر سے خود بھی لطف اٹھاتے

تھے۔ لیکن لکھ چکتے تو اتنے چاؤ سے سنوری ہوئی تحریر پر بے رحمی سے ٹوٹ پڑتے۔ سطروں پر سطریں کٹتی چلی جا رہی ہیں۔ لفظوں کا قتل عام ہو رہا ہے۔ پھر نظر ثانی کی گئی۔ تو پہلی نظر ثانی سے بھی غیر مطمئن۔ پھر چھری چلنے اور قیمہ بنانے لگی۔ اُن کے ہزاروں صفحے نقل کر چکا ہوں۔ مسودہ کٹا پھٹا ہوتا کہ بار بار خود انھی سے رجوع کرنا پڑتا اور وہ بتانے لگتے، واہ مولوی صاحب! آخر آپ اتنی عمر کرتے کیا رہے؟ صاف عبارت بھی پڑھی نہیں جاتی! مسودہ کس طرح نقل ہوگا، مگر دوسرے دن نقل بھی قیمہ بنی چلی آ رہی ہے۔ ''ذرا صاف کر دیجیے'' بات یہ ہے کہ مولانا اپنی تحریر پر بڑی محنت کرتے تھے۔ ایک ایک لفظ چن چن کر تول تول کر بٹھاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تحریریں ادبی اسقام و معائب سے پاک ہوتیں، لفظوں کا ایک طلسم ہوتا تھا۔ ایک لفظ بھی بے محل ہو جائے تو سارا طلسم ہی ٹوٹ جائے۔''

ذکر آزاد ص ۴۲۱ تا ۴۱۴

مولانا کے بے مثال انداز نگارش کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اسے جابجا اردو، فارسی، اور عربی اشعار سے اس طرح مزین کرتے چلے جاتے ہیں جیسے مرصع ساز مختلف رنگ کے نگینوں کو ان کے موقع کی مناسبت سے جڑتا ہے۔ ان کے تبحر علمی اور مطالعہ کی وسعت نے ان کے غیر معمولی حافظہ کو اعلیٰ معیار کے منتخب اشعار کا لامحدود ذخیرہ مہیا کر دیا تھا۔ ان کی طبیعت فطری طور پر ادب اور موزونیت کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی تھی۔ چنانچہ ان کی یادداشت میں ہر قسم کے حالات و واقعات کے حوالہ سے اس قدر اشعار جمع تھے کہ کسی بھی تحریر کے دوران حسب موقع یکے بعد دیگرے سامنے آتے رہتے تھے۔ موقع اور محل کی مناسبت سے مولانا ان اشعار کو اس سلیقہ سے استعمال کرتے تھے کہ ان کا مافی الضمیر زیادہ واضح اور موثر شکل میں سامنے آ جاتا تھا۔ اسی طرح ان کی بے مثل جمالیاتی حس ان کی نثر کو اعلیٰ معیار عطا کرنے کے لیے اس ادبی چاشنی سے آراستہ کرتی چلی جاتی ہے۔ شعریت کی روح سے وہ اس طرح باخبر ہیں کہ شعر کو جس موقع پر استعمال کرتے ہیں اس سے بہتر گویا اس کا محل استعمال ممکن ہی نہیں تھا۔ اپنے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے وہ بعض اوقات پوری پوری غزل استعمال کر لیتے ہیں اور یوں لگتا ہے کہ وہ غزل ان کی تحریر میں اسی موقع پر استعمال کے لیے لکھی گئی تھی۔ مختصر یہ کہ ابوالکلام آزاد مختلف اشعار کو اپنی تحریر میں بڑی کثرت سے اور بے محابا استعمال کرتے ہیں۔ انھیں اس استعمال کا وہ سلیقہ اور کمال حاصل ہے کہ اشعار کے برمحل استعمال میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کا خیال ہے کہ:

اشعار کی بھرمار مولانا آزاد کی نثر کو اگرچہ جابجا چھلنی کرتی ہے۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ وہ اکثر کھل اٹھتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ جیسے مولانا کی نثر میں آنے سے پہلے اپنے معانی کی تلاش میں تھے۔ اپنے اصل موقعہ و محل کو ڈھونڈ رہے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت و کارنامے مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم ص ۳۳۴

مولانا ماہر القادری نے کیا خوب فرمایا ہے:

اپنی تحریر میں وہ اکثر اشعار کا استعمال کرتے ہیں۔ اگر شعرائے کرام معاف فرمائیں تو میں یہ لکھنے کی جرأت کروں گا کہ ان کی گوہر شب چراغ نثر شعر کے موتیوں کو اور زیادہ چمکا دیتی ہے۔ اور شعر کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ وہ شاعر بڑا خوش نصیب ہے۔ جس کو ابوالکلام جیسا شاعر اور مفسر ملا ہو۔

ابوالکلام ادبی و شخصی مطالعہ مرتبہ افضل حق قرشی صفحہ ۶۱۴

بقول ماہر القادری اردو عربی فارسی کے جن ''خوش نصیب'' شعرأ کے اشعار ابو الکلام نے اپنی بے مثال نثر کی زینت بنائے ہیں ان میں حکیم سنائی، شاہی سبزواری، شرف الدین بخاری، شیریں مغربی، طالب آملی، عبدالحق محدث دہلوی، عرفی، عطار عمادی، غنی، فغانی، فیضی، قمری آملی، کامل خراسانی، کلیم کاشانی، محمود شبستری، مخلص خاں، مظہر جان جاناں، ناصر علی، خوشی محمد ناظر، نسبتی، نظامی، نظیری، نور جہاں، واقف، والہ داغستانی، بلال چغتائی، یغما جندقی اور میرزا اسد اللہ خاں غالب شامل ہیں۔ میرے اس مقالہ کا موضوع مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں میں غالب کے اشعار کا جائزہ ہے۔ اس موقع پر مولانا ابوالکلام آزاد اور غالب کے حوالے سے چند آراء مقتدران اردو ادب کی ملاحظہ فرمایئے۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے فرمایا:

غالب کی طرح مولانا بھی رعایت لفظی اور صنعت مراعاۃ النظیر کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرنے والے تھے۔ لیکن آخر ذوق زبان کے مارے ہوئے تھے۔ اور لطف بیان کے گھائل، ایسے چٹخارے سے بچ کر کہاں جا سکتے تھے۔ بہ قول شخصے:

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے

غالب ہی کی طرح جب کبھی اس شجر ممنوعہ کو ہاتھ لگایا تو جسدِ بے جان میں روح پھونک دی۔ پتھر کو ہیرا بنا دیا۔ آبنوس کو کندن کی طرح چمکا دیا۔ ذرہ

بے نوا کو آفتاب کی تپش و تابش دے دی۔

ابوالکلام آزاد ادبی و شخصی مطالعہ مرتبہ افضل حق قرشی ص ۵۵۳

آل احمد سرور کی رائے ہے:

غالب نے جہاں اقبال کو متاثر کیا وہاں مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی، یہ اثر صرف غالب کے اشعار کا حوالہ دینے تک محدود نہیں ہے۔ مولانا کی پوری ادبی شخصیت میں اس کا پرتو نظر آتا ہے۔

ابوالکلام آزاد ادبی و شخصی مطالعہ مرتبہ افضل حق قرشی ص ۶۰۲

اور مولانا ماہر القادری نے کہا:

جس طرح اردو شاعری کی غالب کے کلام سے عزت ہے۔ اگر غالب کے کلام کو اردو تغزل سے خالی کر دیا جائے تو اردو شاعری جسدِ بے روح اور پیکر بے جان ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اردو ادب میں مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر کا درجہ ہے۔ کہ اس شمع کے بغیر بزم اردو میں اجالا نہیں ہو سکتا۔

ابوالکلام آزاد ادبی و شخصی مطالعہ مرتبہ افضل حق قرشی ص ۶۰۷

اس سے پہلے کہ ہم مولانا کے مختلف مضامین، خطوط اور کتب میں اشعار غالب کی تلاش پر نکلیں۔ یہ بتانا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ مولانا تحریر ہی میں نہیں بلکہ گفتگو کے دوران بھی شعروں کا استعمال کیا کرتے تھے۔

مرزا مسعود بیگ جو مولانا آزاد کے دس برس سیکرٹری رہے۔ ایک انٹرویو میں بتاتے ہیں:

مولانا صاحب گفتگو کے دوران بھی کبھی کبھی اشعار کوٹ کیا کرتے تھے، لیکن یہ ضرور سنا تھا کہ ایک زمانے میں مولانا کو اشعار کوٹ کرنے کی عادت بہت زیادہ تھی۔ یہ اشعار اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ہوا کرتے تھے۔

ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم ص ۱۸۴

مولانا اپنی تمام تحریروں میں عموماً اور غبار خاطر میں خاص طور پر ان گنت شعروں کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ شعر اردو، فارسی اور عربی کے اعلیٰ معیار کے اشعار ہیں۔ گویا ان زبانوں کی شاعری کا بہترین انتخاب ہیں۔ بعض جگہ ان اشعار اور مروجہ دیوان یا کلیات میں درج انہی اشعار میں لفظی اختلاف موجود ہے۔ اب مولانا کے بے مثال حافظہ کو یہ الزام تو نہیں دیا جا سکتا کہ اس نے شعر کو اصل صورت میں محفوظ نہیں رکھا ہوگا۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے شعر کو جس نسخہ میں دیکھا وہاں اسی طرح چھپا ہو جس طرح انھوں نے لکھا ہے۔

کسی جگہ انھوں نے پورا شعر نقل کرنے کے بجائے صرف ایک مصرعہ استعمال کیا ہے۔ ایسے مواقع پر غور کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہاں صرف وہ مصرعہ کافی تھا جو انھوں نے نقل کیا ہے۔ مطلب کی وضاحت کے لیے دوسرا مصرعہ غیر ضروری تھا۔ ان کی بلند پایہ تحریر کی یہ خوبی ہے کہ زوائد سے پوری طرح پاک ہے۔ ہر لفظ، ہر ترکیب، ہر تشبیہ اپنی جگہ یوں جڑی ہوئی ہے جیسے سچے موتیوں کی کندہ کاری ہو۔

میں نے مولانا آزاد کی تحریروں میں غالب کے اشعار کی نشاندہی کرتے وقت اول تو شعر یا مصرع کے محل استعمال کو اس کے سیاق و سباق کی روشنی میں واضح کیا ہے۔ دوم یہ کہ جہاں ایک مصرعہ استعمال کیا گیا ہے وہاں شعر کو مکمل کرنے کے لیے پہلے یا دوسرے مصرعہ کو بھی درج کر دیا ہے اور سوئم یہ کہ فارسی اشعار کے معانی ان کے ساتھ ساتھ درج کر دیے ہیں تا کہ تفہیم میں آسانی ہو سکے۔

ابتدا میں ترجمان القرآن (جلد اوّل) کے دیباچے پر ایک نظر ڈالیے۔ مولانا نے مختلف اشعار کا استعمال کیا ہے جن میں غالب کے درج ذیل اشعار بھی ہیں:

شوریست نوا ریزیِ تارِ نفسم را
پیدا نہ ای اے جنبشِ مضراب کجائی

(میرے تار نفس کے نغمے بکھیرنے کا شور برپا ہے۔ لیکن اے مضراب کی جنبش تو نظر نہیں آتی)

کلیات غالب فارسی جلد سوم ص ۳۲۸ غزل ۳۲۹

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"یہ میرے صبر و شکیب کے لیے زندگی کی سب سے بڑی آزمائش تھی۔ لیکن میں نے کوشش کی کہ اس میں بھی پورا اتروں۔ یہ سب سے زیادہ تلخ گھونٹ تھا۔ جو جام حوادث نے میرے لبوں سے لگایا لیکن میں نے بغیر کسی شکایت کے پی لیا البتہ اس سے انکار نہیں کرتا کہ اس کی تلخی آج تک گلوگیر ہے۔"

رگ و پے میں جب اُترے زہر غم تب دیکھیے کیا ہو
ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے

"الہلال" اور "البلاغ" کے فائلوں کی ورق گردانی کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں میں غالب کے درج ذیل اشعار ملتے ہیں۔

الہلال نمبر ۶ جلد ۳، ۱۶۔ اگست ۱۹۳۱ء شذرات صفحہ ۲،

مسٹر عبدالماجد (مولانا عبدالماجد دریابادی) کے گذشتہ اشاعت میں شائع ہونے والے خطوط کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اردو اور شاید فارسی میں غلطی سے ''حظ'' کو بمعنی ''لذت'' بولا جاتا ہے لیکن اب سے مسٹر موصوف کو یقین دلاتا ہوں کہ فارسی میں کبھی کوئی پڑھا لکھا آدمی ''حظ'' کو ''لذت'' کے معنی میں بولنے کی افسوس ناک غلطی نہیں کرسکتا۔ حظ فارسی میں بھی حصہ اور نصیب کے معنی میں بولا جاتا ہے۔

دِگر ز ایمنی راہ و قرب کعبہ چہ
مرا کہ ناقہ زرفتار ماند و پا خفتست

(اب مرا رستہ محفوظ ہونے اور کعبہ کے قریب ہونے کا کیا فائدہ جب کہ میری اونٹنی تھک چکی اور میرا پاؤں بھی سو گیا)

کلیات غالب فارسی جلد سوم صفحہ ۱۹۶، غزل ۸۵

الہلال نمبر ۱۳ جلد ۳، ۲۴ ستمبر ۱۹۱۳ء ''الہلال پریس کی ضمانت'' صفحہ ۱

''ضمانت کا روپیہ تو اُسی تاریخ سے بطور ایک سرکاری امانت کے علیحدہ رکھ دیا گیا تھا۔ جس دن الہلال پریس کا ابتدائی سامان خریدنے کے لیے ہم نے سامان نکالا تھا۔ سچ یہ ہے کہ اس امانت کی حفاظت کرتے کرتے ہم اُکتا گئے تھے۔ اور اب تو وہ وقت آ گیا تھا کہ کوئی مانگنے کے لیے نہ آتا تو ہم خود ہی پیش کش کرنے کے لیے آگے بڑھتے۔ بارہا ہمیں خیال ہوا کہ یہ ذوقِ عتاب صرف اوروں ہی کے حصے میں آیا ہے اور ہم اصلی مستحقین نظر کے لیے کچھ بھی نہیں۔''

نہ کُنی چارہ لب خشک مسلمانی را
اے بہ ترسا بچگاں کردہ مئے ناب سبیل

(تو مسلمان کے سوکھے ہونٹوں کا درماں نہیں کرتا۔ اے وہ ہستی کہ عیسائی مذہب رکھنے والوں کے لیے تو نے شراب ناب کی سبیل لگا رکھی ہے۔)

کلیات فارسی جلد سوم ص ۱۵۴، غزل ۱۳۹

الہلال نمبر ۱۱ جلد ۴، ۱۸-مارچ ۱۹۱۴ء ''مسئلہ قیام الہلال کا آخری فیصلہ (۱)'' ص ۴۔

مولانا ابوالکلام آزاد ''الہلال'' کے روز افزوں اخراجات کا ذکر قارئین سے کرنا چاہتے ہیں مگر خودداری آڑے آجاتی ہے۔ لکھتے ہیں:

''کئی بار ارادہ ہوا کہ چند کلمات اس بارے میں بھی عرض کروں لیکن ہر

مرتبہ طبیعت نے نہایت کراہیت کے ساتھ انکار کر دیا کہ خدا کی تلاش کے ساتھ اس کے بندوں کے آگے ہاتھ پھیلانا زیبا نہیں۔ پچھلے دنوں ایک دو سطریں اس بارے میں لکھیں بھی تو وہ اس قدر مجمل اور مبہم اشارہ تھیں کہ شاید بہت سے لوگ سمجھے بھی نہ ہوں گے۔ گزشتہ جلد کے کسی آخری نمبر میں ''صدا بہ صحرا'' کے عنوان سے ''الہلال'' کے روز افزوں مخارج کی طرف اشارہ کیا تھا دراصل مقصود اس سے بھی یہی تھا۔ مگر طبیعت کے غیر تجارتی مذاق نے کھل کر صاف صاف کہنے نہ دیا۔''

دوش کز گردش بختم گلہ برروئے تو بود
چشم سوئے فلک و روئے سخن سوئے تو بود

(رات جب میں تیرے روبرو اپنے نصیب کی گردش کا شکوہ کر رہا تھا۔
اُس وقت میری نظر آسمان کی طرف تھی اور روئے سخن تیری طرف تھا۔)

کلیات فارسی جلد سوم ص ۱۵۴، غزل ۱۳۹

آگے چل کر لکھتے ہیں:

''یا پھر یہ کہ بقدر اخراجات لینے والوں سے قیمت لینا گوارا کیا جائے دوسری صورت کے اختیار کرنے پر مجبور تھا اور اختیار کی۔ مگر وہ عالم السرائر خوب جانتا ہے کہ اگر اس کی خدمت کی شیفتگی غالب نہ آتی تو میں اس طرح کی اخبار نویسی کے لیے کسی طرح بھی راضی نہ تھا۔ مرحوم غالب نے میری زبانی کہا ہے جب کہ درد اور حسرت میں ڈوب کر کہا ہے۔''

ما نبودیم بدین مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آن کرد کہ گردد فن ما

الہلال نمبر ۶، ۷، ۸ جلد نمبر ۱۔ ۱۴، ۲۱، ۲۶ جنوری ۱۹۱۶ء میں البلاغ کی اشاعت میں تاخیر کے ضمن میں ''عہد التواؤ انتظار'' کے عنوان سے صفحہ ۲ پر شائع شدہ تحریر کا آغاز بھی اسی شعر سے ہوا ہے۔ اسی تحریر میں یہ شعر ذیل کے سیاق وسباق کے ساتھ دوبارہ درج ہے۔

''میری اخبار نویسی کو تم اخبار نویسی نہ قرار دو کیونکہ میں نے اس کو ضمناً اختیار کیا ہے اور وہ میرا اصلی کام نہیں ہے۔ میں نے اگر اسے اختیار کیا تو یہ ہندوستان کی اخبار نویسی اور مطبوعہ اشاعت کے لیے بہتر ہوا اور اس کے لیے ترقی کی ایک بالکل نئی راہ کھلی مگر خود میرے لیے اس میں کوئی شرف نہیں۔ کیونکہ میرے کاموں کے لیے اصل راہیں دوسری تھیں۔''

ما نبودیم بدین مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد گرد د فن ما!

(غالب ہم تو اس شاعری کے منصب کے خواہاں نہ تھے، ہاں شعر نے خود ہمارا فن بننے کی خواہش کی تھی)

کلیات فارسی جلد سوم ص ۱۵، غزل ۱۰

الہلال نمبر ۱۲ جلد ۴، ۲۵ مارچ ۱۹۱۴ء

''مقالہ افتتاحیہ صدا بصحرا! مسئلہ قیام الہلال کا آخری فیصلہ (۲)'' اس تحریر کا آغاز غالب کے درج ذیل شعر سے کیا گیا ہے:

پہلو بشگافید و بہ بینید دلم را
تا چند بگویم کہ چُنانست و چُناں نیست

(پہلو چیر کر میرا دل خود دیکھ لو میں کہاں تک بتاتا رہوں کہ ایسا ہے اور ایسا نہیں ہے۔)

کلیات فارسی جلد سوم ص ۹۱، غزل ۸۱

اسی افتتاحیہ مقالے میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

''میرے پاس ایک ہی زندگی ہے اور میں نے بہت چاہا لیکن ایک زندگی بہت سے کاموں کے لیے تیار نہ ہو سکی اور اب تک جو کچھ ہوا۔ یہ محض اللہ کا ایک مخصوص فضل تھا۔

خوش است افسانۂ درد جدائی مختصر غالب
بہ محشر می تواں گفت آنچہ در دل ماندہ است امشب!

(غالب فسانۂ ہجراں مختصر بیان کرنا ہی بہتر ہے۔ آج رات جتنا قصہ باقی رہ گیا وہ اب روز حشر ہی کہا جا سکے گا۔)

کلیات فارسی سوم ص ۵۶

الہلال شمارہ ۲۵ جلد ۴، ۲۴ جون ۱۹۴۱ء۔ ایک طویل مضمون میں شذرات صفحہ ۲ ''خاتمہ جلد چہارم'' کے عنوان سے رقم طراز ہیں:

''انسان کو اگر صرف اپنی نیت اور ارادہ کے احتساب کی مہلت مل جائے تو یہی بہت بڑی توفیق ہے، کاموں اور ان کے نتائج کا احتساب دوسرے ہی صحیح کر سکتے ہیں اور انھیں پر چھوڑ دینا چاہیے۔''

بے پردہ تاب محرمیٔ راز ما مجوئے
خوں گشتنِ دل از مژہ و آستیں شناس

(تو ہم سے کھلم کھلا نہ پوچھ کہ ہم میں راز داری کی تاب کس حد تک ہے۔
بس ہماری پلکوں اور آستین پر خون دل کی لالہ کاری سے اندازہ لگا لے۔)

کلیات فارسی سوم ص ۲۲۹، غزل ۲۰۷

الہلال نمبر ۱۸ جلد ۵، ۲۸-اکتوبر ۱۹۱۴ء

"قطرات اشک" کے عنوان سے صفحہ ا پر شائع ہونے والی تحریر کا آغاز غالب کے درج ذیل شعر سے کیا گیا ہے:

درکارِ ماست نالہ و مادر ہوائے او
پروانۂ چراغِ مزار خودیم ما

(ہمیں اظہار غم دل کے لیے نالہ وزاری کی حاجت ہے لیکن اس کی محبت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ لہٰذا ہم اپنے ہی مزار پر جلنے والے چراغ کا پروانہ بن کے رہ گئے ہیں، جس کو جلتے ہوئے دیکھنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا۔)

کلیات فارسی سوم ص ۷ غزل ۱۲

الہلال نمبر ۲۳، جلد ۳، ۳ دسمبر ۱۹۱۳ء

شذرات صفحہ ۲ پر ایک تحریر "فتنہ اجودھیا" شائع ہوئی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"یا سبحان اللہ! اظہار ناراضگی کا لے دے کے یہی ایک طریقہ رہ گیا تھا کہ اگر مجسٹریٹ نے قربانی روک دی ہے تو ہم نماز بھی نہیں پڑھتے۔"

نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اُس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں تک

مگر گریبان کس کا تار تار ہوا؟

الہلال نمبر ۲۰، ۲۱ جلد ۳، ۱۲۔ ۱۹ نومبر ۱۹۱۳ء

شذرات میں "فتنہ اجودھیا" سے ایک اور اقتباس:

"(اجودھیا) میں اب کے قربانی حکماً روک دی گئی۔ میں نے یہ سنا اور اس پر چنداں افسوس نہ ہوا۔ کیونکہ بہت سے مسلمان خود بھی ارادہ کر رہے تھے کہ برضا و رغبت اس حق سے دستبردار ہو جائیں لیکن کہہ نہیں سکتا کہ شدت غم و غصہ سے میرے دماغ کا کیا حال ہوا۔ جب میں نے پڑھا کہ

مسلمانان اجودھیا قربانی کے ماتم میں نماز عید سے بھی دستبردار ہو گئے۔
اگر قربانی کو مجسٹریٹ روک سکتا ہے تو نماز کو ہم بھی روک سکتے ہیں۔

ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر!

مجھے معلوم نہیں کہ اجودھیا کے مسلمانوں میں پڑھے لکھے لوگ بھی ہیں یا نہیں اور انھیں اپنے دین و مذہب کی بھی کچھ خبر ہے یا نہیں؟ بظاہر اس واقعہ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی مسلمانی گوشت کھانے ہی تک ہے اور بس۔"

الہلال نمبر ۱۲، جلد ۴، ۲۵ مارچ ۱۹۱۴ء

اس شمارے کا مقالہ افتتاحیہ صفحہ ۴ کا عنوان ہے مسئلہ قیام الہلال کا آخری فیصلہ (۲) اس تحریر میں غالب کا یہ مصرع ہمیں دوبارہ ملتا ہے۔

"لوگ چونکہ میری طبیعت سے واقف نہیں ہیں اور عام حالت کے خوگر ہیں اس لیے سفر میں اکثر ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ ہر روز دو چار شخص مجھے فرمائش کر دیتے ہیں کہ ہمارے نام اخبار جاری کر دیجیے گا۔ اور سمجھتے ہیں کہ انھوں نے مجھ پر احسان کیا۔ حالانکہ مجھے اس قدر تکلیف ہوتی ہے کہ بیان نہیں کر سکتا۔ میں کچھ الہلال کا ایجنٹ نہیں ہوں کہ اس کی خریداری کی درخواست مجھے دے کر خوش کیا جائے۔ یہ امور دفتر کے منتظمین کے متعلق ہیں اور جس کو خواہش ہو وہ ایک پیسے کا کارڈ بھیج کر اخبار منگوا سکتا ہے۔ بہر حال کئی سو اشخاص ایسے ہیں جنھوں نے مجھے زبانی کہا اور میں نے اس غلطی کا یوں کفارہ کیا کہ کبھی ان کے نام اخبار جاری نہ کیا۔"

ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

الہلال نمبر ۲۴، جلد ۴، ۱۷-جون ۱۹۱۴ء واقعہ لاہور صفحہ ۴

یہ واقعہ مولانا ظفر علی خاں کی گرفتاری کا تھا۔ مولانا ابوالکلام نے اس موقع پر اپنے شذرہ میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا:

"تعجب اس چیز پر ہوتا ہے جو ناگہانی ہو۔ اور شکایت وہاں کی جاتی ہے جہاں توقع ہو۔ رہا طلب و سوال تو اس کے لیے پہلی شرط اُمید ہے اور اب امید ہی کس کو رہی ہے۔"

نہیں ہے طاقت گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس اُمید پر کہیے کہ مدعا کیا ہے؟

الہلال نمبر۲، جلد۱، ۲۴ جون ۱۹۱۷ء ''الہلال'' کا تیسرا دور (ص۲)

اس تحریر میں مولانا بار بار کی رہائی و گرفتاری اور اس سلسلے میں پولیس کی خانہ تلاشیوں کا تفصیل سے ذکر کرتے ہیں وہ اظہار افسوس کرتے ہیں کہ پولیس کے ہرکارے ان کے قیمتی مسودات بھی اٹھا کر لے گئے تھے مگر ہوا یہ ہے کہ —

''جو کاغذات کلکتہ سے لیے گئے تھے بیان کیا جاتا ہے کہ کچھ دنوں تک پولیس کمشنر کے دفتر میں رکھے گئے، اتفاقاً وہاں کے گوشہ میں آگ لگ گئی اور دفتر کے سامان کے ساتھ بعض اوراق بھی جل گئے پولیس کے دفتر میں آگ بھی لگنی تھی تو اسی وقت جبکہ یہ دفتر پریشاں وہاں جمع تھا''

گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو؟

البلاغ نمبر۳ جلد۱، ۱۰ دسمبر ۱۹۱۵ء

''عہد التواءُ و انتظار'' (۱) کے تحت بعنوان ''یاد رفتہ کا ایک لمحہ فکریہ!'' مضمون کا آغاز غالب کے درج ذیل شعر سے ہوا ہے:

رند ہزار شیوہ را طاعت حق گراں نبود
لیک صنم بہ سجدہ در ناصیہ مشترک نخواست!

(ایک وسیع المشرب آزاد منش کے لیے خدا کی بندگی بھی دشوار نہ تھی تاہم ہمارے محبوب نے پرستش میں یہ اشتراک گوارا نہ کیا۔)

کلیات فارسی سوم ص۳۷ غزل ۶۳

البلاغ نمبر ۱۵، ۱۶، ۱۷ جلد نمبر ۱۔ ۱۷، ۲۴ فروری ۱۹۱۶ء

بعنوان ''الہلال کی مکمل جلدیں'' ص ۱۵ پر لکھتے ہیں:

''وہ وقت دور نہیں جب مرحوم الہلال کے ایک ایک پرچے کو لوگ ڈھونڈیں گے اور کہیں گے کہ وہ ایک تاریخی وجود تھا۔ جو اب نہیں مل سکتا۔''

کوکبم را در عدم اوج قبولی بودہ است
شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

(میری قسمت کے ستارے کو عدم میں اوج قبول حاصل تھا۔ لہٰذا میری شاعری کی شہرت میرے عدم میں پہنچنے یعنی میرے مرنے کے بعد ہی ہوگی۔)

کلیات فارسی سوم ص۳۲۴، غزل ۲۹۵

مولانا آزاد نے اپنے مکاتیب میں سے اکثر میں اشعار کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ ''غبارِ خاطر'' میں کم وبیش ۲۷۵ اشعار ہیں جن میں بیشتر غالب کے اردو اور فارسی اشعار ہیں۔ میرے پیش نظر مالک رام کا مرتبہ نسخہ ہے۔ جس سے میں نے بھرپور استفادہ کیا۔ ''غبار خاطر'' کا دیباچہ ہی غالب کے شعر پر ختم ہوتا ہے۔ دیباچے کی آخری سطور مجموعے میں شامل خطوط کے بارے میں ہیں۔

''جس حالت میں یہ قلم برداشتہ لکھے ہوئے موجود تھے۔ اُسی حالت میں طباعت کے لیے دے دیئے ہیں۔ نظر ثانی کا موقع نہیں ملا۔

نسخۂ شوق بہ شیرازہ نہ گنجد زنہار
بگذارید کہ ایں نسخہ مجزا ماند!

(فسانہ غم کو ایک مربوط صورت میں پیش کرنا مشکل کام ہے۔ ایسا کیجیے کہ دل کے ان ریزہ ریزہ ٹکڑوں کو یونہی منتشر صورت میں رہنے دیجیے)

کلیات غالب (فارسی) ص ۲۷۵ مطبوعہ دیوان میں مصرع اُولیٰ میں ''نسخہ'' کی جگہ ''قصہ'' ہے اور یہی ٹھیک ہے۔

غبار خاطر میں شامل مکتوب نمبر۲ میں لکھتے ہیں:

گلمرگ سے سری نگر آ گیا ہوں اور ایک ہاؤس بوٹ میں مقیم ہوں کل گلمرگ سے روانہ ہو رہا تھا کہ ڈاک آئی اور اجمل خاں صاحب نے آپ کا ایک مکتوب منظوم حوالہ کیا۔ کہہ نہیں سکتا کہ اس پیام محبت کو دل دردمند نے کن آنکھوں سے پڑھا اور کن کانوں سے سنا۔ میرا آپ کا معاملہ تو وہ ہو گیا ہے جو غالب نے کہا تھا:

باچوں توئی معاملہ ، بر خویش منت ست
از شکوۂ تو شکر گزارِ خودیم ما!

(آپ کے ساتھ تو ہمارا تعلق نیاز مندانہ ہے اور ہمیں اس تعلق پر فخر ہے۔ ہماری ذات سے آپ کو شکایت دراصل آپ کے احسان سے معمور روش کا ایک حسین انداز ہے)

مولانا آزاد کی اہلیہ محترمہ کا انتقال پُرملال ۹/اپریل ۱۹۴۳ء کو ہوا تھا۔ اسی حادثے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مکتوب نمبر۳ میں لکھتے ہیں:

۱۰/اگست ۱۹۴۲ء سے مئی ۱۹۴۳ء تک ان مکتوبات کی نگارش کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن اس کے بعد رُک گیا کیونکہ ۹/اپریل ۱۹۴۳ء کے حادثہ کے بعد

طبع درماندۂ حال بھی رک گئی تھی اور اپنی واماندگیوں میں گم تھی۔ اگرچہ اس کے بعد بعض مصنفات کی تسوید و ترتیب کا کام بدستور جاری رہا۔ اور قلعہ احمد نگر کے اور تمام معمولات بھی بغیر کسی تغیر کے جاری رہے۔ تاہم یہ حقیقت حال چھپانی نہیں چاہتا کہ قرار اور سکون کی یہ جو کچھ نمائش تھی۔ جسم و صورت کی تھی۔ قلب و باطن کی نہ تھی۔ جسم کو میں نے ہلنے سے بچا لیا تھا مگر دل کو نہیں بچا سکا تھا۔

دل دیوانہ دارم کہ در صحرا ست پنداری

(میں اس راز سے واقف ہوں کہ میرے دل کی دیوانگی بیابانوں کی وسعتوں ہی میں سما سکتی ہے۔)

کلیاتِ غالب صفحہ ۵۲۵ صحیح پر ''دل گم گشتہ'' ہے اگرچہ بعض مطبوعہ نسخوں میں ''سرگشتہ'' بھی ملتا ہے۔ پہلا مصرعہ ہے:

بگوشم می رسد از دور آواز درا امشب

(میرے کانوں میں آج رات دور سے آواز درا آ رہی ہے۔)

اسی مکتوب میں تحریر کرتے ہیں:

''رہائی کے بعد جب کانگریس ورکنگ کمیٹی کی صدارت کے لیے ۲۱ر جون کو کلکتہ سے بمبئی آیا اور اسی مکان اور اسی کمرہ میں ٹھہرا۔ جہاں تین برس پہلے اگست ۱۹۴۲ء میں ٹھہرا تھا۔ تو یقین کیجیے ایسا محسوس ہونے لگا تھا۔ جیسے ۹ر اگست اور اس کے بعد کا سارا ماجرا کل کی بات ہے۔ (مولانا کو ۹ر اگست کو گرفتار کر کے احمد نگر لے جایا گیا تھا) اور یہ پورا زمانہ ایک صبح شام سے زیادہ نہ تھا۔ حیران تھا کہ جو کچھ گزر چکا وہ خواب تھا یا جو کچھ گزر رہا ہے یہ خواب ہے۔

ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں

مکمل شعر یوں ہے:

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں

مزید لکھتے ہیں:

شملہ میں اخبار ''مدینہ'' بجنور کے ایڈیٹر صاحب آئے تھے۔ انھوں نے مولوی اجمل خاں صاحب سے اس سلسلہ کے پہلے مکتوب کی نقل لے لی

تھی۔ وہ اخبارات میں شائع ہو گیا ہے۔ شاید آپ کی نظر سے گزرا ہو۔ ''صدیق مکرم'' کے تخاطب سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ روئے سخن آپ ہی کی طرف ہے:

چشم سوئے فلک و رُوئے سخن سوئے تو بود

کلیات غالب صفحہ ۴۲۹۔ پورا شعر:

دوش کز گردشِ بختم گلہ بر روئے تو بود
چشم سوئے فلک و رُوئے سخن سوئے تو بود

(اس شعر کا ترجمہ گذشتہ صفحات میں درج ہو چکا ہے۔)

مکتوب نمبر ۴ کا آغاز یوں ہوا ہے:

دہلی اور لاہور میں انفلوئنزا کی شدت نے بہت خستہ کر دیا تھا۔ ابھی تک اس کا اثر باقی ہے۔ سر کی گرانی کسی طرح کم ہونے پر نہیں آتی۔ حیران ہوں اس وبال دوش سے کیونکر سبک دوش ہوں؟ دیکھیے ''وبال دوش'' کی ترکیب نے غالب کی یاد تازہ کر دی۔

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبال دوش
صحرا میں اے خدا، کوئی دیوار بھی نہیں

۲۹ر جولائی کو اس وبال کے ساتھ کلکتہ واپس ہوا تھا۔ چار دن بھی نہیں گزرے کہ کل ۲ر اگست کو بمبئی کے لیے نکلنا پڑا۔ جو وبال ساتھ لایا تھا اب بھی اپنے ساتھ واپس لیے جا رہا ہوں۔

رو میں ہے رخش عمر، کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں

بمبئی میں مولانا شری بھولا بھائی ڈیسائی کے ہاں ٹھہرا کرتے تھے۔ انھیں کے ہاں سے مولانا کو گرفتار کر کے قلعہ احمد نگر لے جایا گیا۔ اس روز ان کی طبیعت ناساز تھی۔ شب ڈھلے کچھ دیر ہی سے سوئے تھے کہ صاحب مکان کے بیٹے دھیرج لال ڈیسائی نے انھیں بیدار کیا اور ڈپٹی کمشنر پولیس کے آنے کی اطلاع دی۔ مکتوب نمبر ۵ میں مولانا رقم طراز ہیں:

''میں نے دھیرو سے کہا۔ مجھے ڈیڑھ گھنٹہ تیاری میں لگے گا۔ ان سے کہہ دو کہ انتظار کریں۔ پھر غسل کیا۔ کپڑے پہنے، چند خطوط لکھے اور باہر نکلا تو پانچ بج کر پینتالیس منٹ ہوئے تھے۔''

کارِ مشکل بود، ما بر خویش آساں کردہ ایم!

(مسئلہ تو بہت گنجلک صورت اختیار کر گیا تھا۔ مگر ہم نے اس میں آسانی کی صورتیں پیدا کر لی ہیں۔)

بتغیر الفاظ غالب کا مصرعہ ہے۔ (کلیاتِ غالب ص ۴۹۴) پورا شعر ہے:

پشت بر کوہ ست طاقت تکیہ تا بر رحمت

کارِ دشوار ست و مابر خویش آساں کردہ ایم

(پہلے مصرعہ کا ترجمہ یوں ہے۔ ہمارا بھروسہ اللہ کی رحمت پر ہے اور یہی ہماری طاقت کا ذریعہ ہے۔)

مولانا نے کار دشوار ست کی جگہ کار مشکل بود لکھا ہے۔

ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''بعض احباب مجھ سے پہلے پہنچائے جا چکے تھے۔ ان کے چہروں پر بے خوابی اور نا وقت کی بیداری بول رہی تھی۔ کوئی کہتا تھا۔ رات دو بجے سوئے اور چار بجے اٹھا دیا گیا۔ کوئی کہتا تھا بمشکل ایک گھنٹہ تکیہ ملا ہو گا۔ میں نے کہا معلوم نہیں سوئی ہوئی قسمت کا کیا حال ہے؟ اسے بھی کوئی جگائے کہتے ہیں

درازی شب و بیدارئ من این ہمہ نیست

ز بختِ من خبر آرید تا کجا خفتست

(بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ کہ میری فرقت کی رات طویل ہے یا میرے رتجگوں نے مجھ سے سکون کی دولت چھین رکھی ہے۔ مجھے صرف اس امر سے آگاہ کر دو کہ میری قسمت کہاں سو گئی ہے۔)

مولانا کے اسلوب نگارش کا ایک اور خوبصورت ٹکڑا ملاحظہ کیجیے:

''صرف ایک شام اور صبح کے اندر صورتِ حال کیسی منقلب ہو گئی؟ کل شام کو جو بزم کیف و سرور آراستہ ہوئی تھی۔ اس کی بادہ گساریوں اور سیہ مستیوں نے دوپہر رات تک طول کھینچا تھا لیکن اب صبح کے وقت دیکھیے تو:

نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

غالب کی مشہور غزل کا مصرع ہے۔ (دیوان غالب ص ۱۹۰) پہلا مصرعہ ہے:

یاں صبح دم جو دیکھیے آ کر، تو بزم میں

قلعہ احمد نگر کا اندرونی احوال لکھتے ہیں:

دروازے کے اندر داخل ہوئے تو ایک مستطیل احاطہ سامنے تھا۔ غالباً دو سو

فٹ لمبا اور ڈیڑھ سو فٹ چوڑا ہوگا۔ اس کے تینوں طرف پارک کی طرح کمروں کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ کمروں کے سامنے برآمدہ ہے۔ اور بیچ میں کھلی جگہ ہے۔ اگرچہ اتنی وسیع نہیں کہ اسے میدان کہا جا سکے۔ تاہم احاطہ کے زندانیوں کے لیے میدان کا کام دے سکتی ہے۔ آدمی کمرہ سے باہر نکلے گا تو محسوس کرے گا کہ کھلی جگہ میں آگیا۔ کم از کم اتنی جگہ ضرور ہے کہ جی بھر کے خاک اڑائی جا سکتی ہے۔

سر پر ہجوم دردِ غریبی سے ڈالیے
وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

زنداں میں سونے کا تجربہ کیسا رہا۔ لکھتے ہیں:

''تقریباً تین بجے سے چھ بجے تک سوتا رہا۔ پھر رات کو نو بجے تکیہ پر سر رکھا تو صبح تین بجے آنکھ کھولی۔''

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

زیرِ نظر طویل خط کا اختتام بھی غالب کے ایک مصرع پر ہوا ہے۔ مولانا آزاد رقم طراز ہیں:

''یہ بھی نہیں معلوم، بحالت موجودہ میری صدائیں آپ تک پہنچ بھی سکیں گی یا نہیں؟ تاہم کیا کروں افسانہ سرائی سے اپنے آپ کو باز نہیں رکھ سکتا۔ یہ وہی حالت ہوئی جسے مرزا غالب نے ذوق خامہ فرسا کی ستم زدگی سے تعبیر کیا تھا۔''

مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا!''

غالب کا پورا شعر یوں ہے (دیوان غالب، ص ۵۶)

یہ جانتا ہوں کہ، تو اور پاسخ مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

مکتوب نمبر ۶ میں لکھتے ہیں:

''وقت کے جو حالات ہیں چاروں طرف سے گھرے ہوئے ہیں۔ اُن میں اس ملک کے باشندوں کے لیے زندگی بسر کرنے کی دو ہی راہیں رہ گئی ہیں بے حسی کی زندگی بسر کریں یا احساس حال کی۔ پہلی زندگی ہر حال میں ہر جگہ بسر کی جا سکتی ہے۔ مگر دوسری کے لیے قید خانہ کی کوٹھری کے سوا کہیں جگہ نہ نکل سکی۔ ہمارے سامنے بھی دونوں راہیں کھلی تھیں۔ پہلی ہم

اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ ناچار دوسری اختیار کرنی پڑی۔"

رند ہزار شیوہ را طاعتِ حق گراں نہ بود
لیک صنم بہ سجدہ در ناصیہ مشترک نخواست

(اس شراب کے خوگر کے لیے خدا تعالیٰ کی اطاعت کوئی مشکل بات نہ تھی لیکن بات اتنی ہے۔ کہ صنم نہیں چاہتا کہ ایک ہی پیشانی دو طرح کے سجدوں کی عادی بن جائے)

(یہ شعر گذشتہ صفحات میں بھی درج ہو چکا ہے)

زندگی میں جتنے جرم کیے اور ان کی سزائیں پائیں۔ سوچتا ہوں تو ان سے کہیں زیادہ مقدار ان جرموں کی تھی جو نہ کر سکے اور جن کے کرنے کی حسرت دل میں رہ گئی۔ یہاں کردہ جرموں کی سزائیں تو مل جاتی ہیں لیکن ناکردہ جرموں کی حسرتوں کا صلہ کس سے مانگیں؟

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب ، اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ملے

"طرح طرح کی سرگرمیوں میں دل اٹکا ہوا اور علاقوں اور رابطوں کی گرانیوں سے بوجھل تھا۔ اچانک ایک دن دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہونا پڑا درمشغولیت کی ڈوبی ہوئی زندگی کی جگہ قیدو بند کی تنہائی اور بے تعلقی اختیار کر لینی پڑی۔ بظاہر اس ناگہانی انقلاب حال میں طبیعت کے لیے بڑی آزمائش ہونی تھی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ نہیں ہوئی۔ آباد گھر چھوڑا اور ایک ویرانہ میں جا بیٹھا۔"

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
دو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

اسی خط میں رقم طراز ہیں۔"زندگی کے وہ بنیادی مسائل جو عام حالات میں بہت کم ہمیں یاد آتے ہیں ایک ایک کر کے اُبھرے اور دل و دماغ پر چھا گئے، حقیقت کیا ہے؟ اور کہاں ہے؟ اور ہے بھی یا نہیں؟ اگر ہے اور ایک ہی ہے کیونکہ ایک سے زیادہ حقیقتیں ہو نہیں سکتیں تو پھر راستے مختلف کیوں ہوئے؟ کیوں صرف مختلف ہی نہیں ہوئے بلکہ باہم متعارض اور متصادم ہوئے؟ پھر یہ کیا ہے کہ خلاف و نزع کی ان تمام لڑتی ہوئی راہوں کے سامنے علم اپنے بے لچک فیصلوں اور ٹھوس حقیقتوں کا چراغ ہاتھ میں لیے کھڑا ہے اور اُس کی بے رحم روشنی میں قدامت اور روایت کی وہ تمام پُراسرار تاریکیاں جنھیں نوع انسانی عظمت و تقدیس کی نگاہ سے دیکھنے کی خوگر ہو گئی تھی۔ ایک ایک

کر کے نابود ہو رہی ہیں۔

یہ راہ ہمیشہ شک سے شروع ہوتی ہے اور انکار پر ختم ہوتی ہے۔ اور اگر قدم اُسی پر رُک جائیں تو پھر مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

تھک تھک کے ہر قدم پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں؟

مجھے بھی ان منزلوں سے گزرنا پڑا، مگر میں رُکا نہیں، میری پیاس مایوسی پر قانع ہونا نہیں چاہتی تھی۔ بالآخر حیرانگیوں اور سرگشتگیوں کے بہت مرحلے طے کرنے کے بعد جو مقام نمودار ہوا اُس نے ایک دوسرے ہی عالم میں پہنچا دیا۔ معلوم ہوا کہ اختلاف و نزاع کی انھی متعارض راہوں اور اوہام و خیالات کی انھی گہری تاریکیوں کے اندر ایک روشن اور قطعی راہ بھی موجود ہے۔ جو یقین اور اعتقاد کی منزل مقصود تک چلی گئی ہے۔ اور اگر سکون وطمانیت کے سرچشمے کا سراغ مل سکتا ہے تو وہیں مل سکتا ہے۔

مولانا آزاد آگے چل کر لکھتے ہیں:

''راہ مقصد کی خاک بڑی ہی غیور واقع ہوئی ہے۔ وہ راہرو کی جبین نیاز کے سارے سجدے اس طرح کھینچ لیتی ہے کہ پھر کسی چوکھٹ کے لیے کچھ باقی نہیں رہتا۔ دیکھیے میں نے یہ تعبیر غالب سے مستعار لی۔''

خاک کویش خود پسند افتاد در جذب سجود
سجدہ از بہر حرم نہ گزاشت در سیمائے من

(اُس کی بستی کی خود پسند مٹی نے پیشانی کے سارے سجدے اپنی جانب کھینچ لیے اور میری پیشانی میں حرم میں ادا کرنے کے لیے ایک سجدہ بھی باقی نہ چھوڑا۔)

مولانا آزاد نے مکتوب نمبر ۸ کا آغاز ان سطور سے کیا ہے:

''وہی صبح چار بجے کا وقت ہے۔ چائے سامنے دھری ہے۔ جی چاہتا ہے آپ کو مخاطب تصور کروں اور کچھ لکھوں۔ مگر لکھوں تو کیا لکھوں؟ مرزا غالب نے رنج گراں نشین کی حکایتیں لکھی تھیں، صبر گریز پا کی شکایتیں کی تھیں۔''

کبھی حکایت رنج گراں نشیں لکھیے
کبھی شکایت صبر گریز پا لکھیے

لیکن یہاں نہ رنج کی گراں نشینیاں ہیں کہ لکھوں۔ نہ صبر کی گریز پائیاں

ہیں کہ سناؤں۔ رنج کی جگہ صبر کی گراں نشینیوں کا خوگر ہو چکا ہوں۔ صبر
کی جگہ رنج کی گریز پائیوں کا تماشائی رہتا ہوں۔

دیوان غالب ص ۲۲۲ پر فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے مصرع میں ''شکایت''
ہونا چاہیے اور دوسرے میں ''حکایت''

قلعہ احمد نگر کی جس عمارت میں مولانا آزاد محبوس رہے۔ اس کی تعمیر کے بارے میں بتاتے
ہیں:

''دیواریں اس طرح چنی گئی ہیں کہ اوپر تلے داہنے بائیں کوئی رخنہ باقی
نہیں چھوڑا۔ روشندان تک چھپ گئے۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر کھڑکیاں کھلی بھی
ہوتیں تو کونسا بڑا میدان سامنے کھل جاتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ قلعہ کی تنگی
دیواروں تک نگاہیں جاتیں اور ٹکرا کر واپس آ جاتیں۔ لیکن ہماری نگاہوں
کی اتنی رسائی بھی خطرناک سمجھی گئی۔ روشندان کے آئینے تک بند کر دیئے
گئے۔''

ہوس گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پروبالی نے مجھے

قلعہ احمد نگر میں اسیری کے دوران مولانا اور ان کے ساتھیوں کے لیے کسی ڈھنگ کے
باورچی کا انتظام نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس مشکل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جو قیدی یہاں چن کر کام کرنے کے لیے بھیجے گئے ہیں ان میں دو
قیدیوں پر باورچی ہونے کی تہمت لگائی گئی ہے۔

ستم رسیدہ یکے ، نا امیدوار یکے

(ایک تو ستم خوردۂ محبوب ہے جبکہ دوسرے کو محبوب کے حصول کی کوئی امید
نہیں۔)

غالب کا مصرع ہے (کلیاتِ غالب ص ۵۲۸ پہلا مصرع ہے:

چگویم از دل و جانے کہ در بساط نست

(اپنے دل و جان کی بے مائیگی کا کیا ذکر کروں)

بالآخر ایک اور باورچی لایا گیا۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں:

''مگر نہیں معلوم اس غریب پر کیا بیتی تھی کہ آنے کو تو آ گیا۔ لیکن کچھ ایسا
کھویا ہوا سراسیمہ حال تھا۔ جیسے مصیبتوں کا پہاڑ سر پر ٹوٹ پڑا ہو۔ وہ
کھانا کیا پکاتا اپنے ہوش حواس کا مسالہ کوٹنے لگتا۔

اڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا

غالب کا مصرع ہے البتہ 'ہی' کی جگہ 'بھی' چاہیے (دیوانِ غالب ص ۴۵) پورا شعر ہے:

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

زیرِ نظر مکتوب کا اختتامیہ یوں ہوا:

''یہ تو باورچی کی سرگزشت ہوئی۔ لیکن یہاں کوئی دن نہیں جاتا کہ کوئی نہ کوئی نئی سرگزشت پیش نہ آتی ہو۔ باورچی کے بعد حجام کا مسئلہ پیش آیا۔ ابھی وہ حل نہیں ہوا تھا۔ کہ دھوبی کے سوال نے سر اٹھایا۔ چیتا خاں کا سارا وقت ناخن تیز کرنے میں بسر ہوتا ہے۔ مگر رشتہ کار میں کچھ ایسی گانٹھیں پڑ گئی ہیں کہ کھلنے کا نام نہیں لیتیں۔ یہ وہی غالب والا حال ہوا کہ:

پہلے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اُمید میں گانٹھ
پیچھے ٹھونکی ہے ناخن تدبیر میں کیل

دیوان غالب ص ۲۶۴ اصلی شعر میں ''پہلے'' اور ''پیچھے'' کی آپس میں جگہ بدلی ہوئی ہے۔ اور ''امید'' کی جگہ ''اوقات'' ہے۔

مکتوب نمبر ۹ میں ہمیں غالب کا حوالہ کچھ اس انداز سے ملتا ہے:

''حریم دل کے طاقوں کو دیکھتا ہوں کہ خالی ہو گئے ہیں تو کوشش کرتا ہوں کہ نئے نقش و نگار بناؤں اور انھیں پھر سے آراستہ کر دوں

وقتست دگر بتکدہ سازند حرم را

(اگر وہ حرم کو صنم کدہ کی شکل دینا چاہیں تو ایسا کرنے کے لیے کوئی بھی امر مانع نہیں اور ابھی ایسا کرنے کا وقت بھی باقی ہے)

غالب کا مصرع ہے۔ (کلیاتِ غالب ص ۲۰۶) البتہ مطبوعہ دیوان میں ''وقتست'' کی بجائے ''خواہم کہ'' ہے۔ پہلا مصرع ہے۔

آوارۂ غربت نتواں دید صنم را

(صنم کو بے گھر دیکھنا ہمیں گوارا نہیں۔)

''فطرت نے انسان کی طرح کبھی یہ نہیں کیا کہ کسی کو شاد کام رکھے کسی کو محروم کر دے۔ وہ جب بھی اپنے چہرہ سے نقاب اُلٹتی ہے تو سب کو یکساں طور پر نظارۂ حسن کی دعوت دیتی ہے۔ یہ ہماری غفلت اندیشی ہے۔ کہ نظر اُٹھا کر دیکھتے نہیں اور صرف اپنے گرد و پیش ہی میں کھوئے رہتے ہیں۔''

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ، ورنہ جو حجاب ہے ، پردہ ہے ساز کا

مکتوب نمبر ۱۰ میں مولانا آزاد قید و بند کے گذشتہ تجربات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جہاں تک خط و کتابت اور ملاقاتوں کا تعلق ہے۔ مجھے ہمیشہ زیادہ سہولتیں حاصل رہیں۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ تھا۔ کہ گو ہاتھوں میں زنجیریں اور پاؤں میں بیڑیاں پڑ جاتی تھیں۔ لیکن کان بند نہیں ہو جاتے تھے۔ اور آنکھوں پر پٹیاں نہیں بندھتی تھیں۔ قید و بند کی ساری رکاوٹوں کے ساتھ بھی آدمی محسوس کرتا تھا کہ ابھی تک اسی دنیا میں بس رہا ہے جہاں گرفتاری سے پہلے رہا کرتا تھا۔

زندان میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

یہ مصرع غالب کا ہے۔ (دیوانِ غالب ص ۳۵) پورا شعر ہے:

احباب چارہ سازئ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

مزید لکھتے ہیں:

یہ حالت انقطاع و تجرد کا ایک نقشہ بناتی تھی۔ مگر نقشہ ادھورا ہوتا تھا کیونکہ نہ تو باہر کے علاقے پوری طرح منقطع ہو جاتے تھے۔ نہ باہر کی صداؤں کو زندان کی دیواریں روک سکتی تھیں۔

قید میں بھی ترے وحشی کو رہی زلف کی یاد
ہاں ، کچھ اک رنج گرنبارئ زنجیر بھی تھا

دراصل مصرع اُولیٰ یوں ہے۔ (دیوانِ غالب ص ۷۳)

قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد

اسیری کے دوران مولانا اپنے محسوسات کے بارے میں بتاتے ہیں:

"اب معلوم ہوا کہ اگرچہ نگاہوں اور کانوں کی ایک محدود دنیا کھوئی گئی ہے۔ فکر و تصور کی کتنی ہی نئی دنیائیں اپنی ساری پہنائیوں اور بے کناریوں کے ساتھ سامنے آ کھڑی ہوئی ہیں، اگر ایک دروازے کے بند ہونے پر اتنے دروازے کھل سکتے ہیں تو کون ایسا زیان عقل ہوگا جو اس سودے پر فکر مند ہو۔

نقصان نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
دو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

(دیوان غالب ص ۱۱۹ جیسا کہ اوپر بھی ذکر ہوا مصرع ثانی میں ''دو گز'' کی جگہ ٹھیک ''سو گز'' ہے)

ابتدا ہی سے طبیعت کی افتاد کچھ ایسی ہوئی تھی۔ کہ خلوت کا خواہاں اور جلوت سے گریزاں رہتا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ زندگی کی مشغولیتوں کے تقاضے اس طبع وحشت سرشت کے ساتھ نبھائے نہیں جا سکتے۔ اس لیے بہ تکلف خود کو انجمن آرائیوں کا خوگر بنانا پڑتا ہے۔ مگر دل کی طلب ہمیشہ بہانے ڈھونڈتی رہتی ہے۔ جونہی ضرورت کے تقاضوں سے مہلت ملی اور وہ اپنی کاجوئیوں میں لگ گئی۔

در خراباتم نہ دیدتی خراب
بادہ پنداری کہ پنہاں می زنم

(تو نے میخانے میں مجھے شراب کے نشے میں لن ترانی کہتے نہیں سنا ہوگا۔
تو اس بات سے باخبر ہے کہ میں شراب چھپ چھپ کر پیا کرتا ہوں)

مولانا آزاد معروف پیر خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ اسی حوالے سے فرماتے ہیں:

''میں خاندانی مریدوں کی ان عقیدت مندانہ پرستاریوں سے خوش نہیں ہوتا تھا بلکہ طبیعت میں ایک طرح کا انقباض اور توحش رہتا تھا۔ میں چاہتا تھا۔ کہ کوئی ایسی راہ نکل آئے کہ اس فضا سے بالکل الگ ہو جاؤں اور کوئی آدمی آ کر میرے ہاتھ پاؤں نہ چومے۔ لوگ یہ کمیاب جنس ڈھونڈتے ہیں اور ملتی نہیں۔ مجھے گھر بیٹھے ملی اور اس کا قدر شناس نہ ہو سکا۔

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

سیاست کے میدان میں کیسے آنا ہوا۔ لکھتے ہیں:

''میں نے سیاسی زندگی کے ہنگاموں کو نہیں ڈھونڈا تھا۔ سیاسی زندگی نے مجھے ڈھونڈ نکالا۔ میرا معاملہ سیاسی زندگی کے ساتھ وہ ہوا۔ جو غالب کا شاعری کے ساتھ ہوا تھا۔

ما نہ بودیم بدین مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

(یہ شعر گذشتہ صفحات میں دو مرتبہ درج ہو چکا ہے)

ایام اسیری کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہیں:

''ایک مرتبہ قید کی حالت میں ایسا ہوا کہ ایک صاحب نے جو میرے آرام و راحت کا بہت خیال رکھنا چاہتے تھے۔ مجھے ایک کوٹھری میں تنہا دیکھ کر سپرنٹنڈنٹ سے اس کی شکایت کی۔ سپرنٹنڈنٹ فوراً تیار ہو گیا۔ کہ مجھے ایسی جگہ رکھے جہاں اور لوگ بھی رکھے جا سکیں اور تنہائی کی حالت باقی نہ رہے۔ مجھے معلوم ہوا تو میں نے اُن حضرت سے کہا آپ نے مجھے راحت پہنچانی چاہی۔ مگر آپ کو معلوم نہیں کہ جو تھوڑی سے راحت یہاں حاصل تھی وہ بھی آپ کی وجہ سے اب چھنتی جا رہی ہے۔ یہ تو وہی غالب والا معاملہ ہوا کہ:

کی ہم نفسوں نے اثر گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اس سے، مگر مجھ کو ڈبو آئے

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

بہر حال جو صورت حال پیش آئی ہے۔ اس سے جو کچھ بھی انقباض خاطر ہوا تھا۔ وہ صرف اس لیے ہوا تھا کہ باہر کے علائق اچانک یک قلم قطع ہو گئے ریڈیو سیٹ اور اخبار تک روک دیئے گئے۔ ورنہ قید و بند کی تنہائی کا کوئی شکوہ نہ پہلے ہوا ہے نہ اب ہے۔

دماغ عطر پیرہن نہیں ہے
غم آوارگی ہائے صبا کیا؟

ایام اسیری کے حالات کے بارے میں مزید لکھتے ہیں:

''مزید کتابوں کے منگوانے کی کوئی راہ نہیں نکلی لیکن اگر پڑھنے کے سامان کا فقدان ہوا تو لکھنے کے سامان کی کمی نہیں ہوئی۔ کاغذ کا ڈھیر میرے ساتھ ہے۔ اور روشنائی کی احمد نگر کے بازار میں کمی نہیں تمام وقت خامہ فرسائی میں خرچ ہوتا ہے۔

در جنوں بیکار نہ تواں زیستن
آتشم تیز ست و داماں می زنم!

(عشق کی مستی میں فضول زندگی نہیں گزاری جا سکتی۔ میرا جگر اپنے اندر تیز آنچ رکھتا ہے، اور میں اپنے دامن سے اسے ہوا دے رہا ہوں)

جب تھک جاتا ہوں تو کچھ دیر کے لیے برآمدہ میں نکل کر بیٹھ جاتا ہوں یا

صحن میں ٹہلنے لگتا ہوں۔''

بیکاری جنوں میں ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

مکتوب نمبر ۱۱ عید کے روز تحریر کیا گیا ہے۔ اسی خط میں مولانا آزاد نے اپنی مرصع تحریر کو غالب کے اس شعر سے مزید روشن کر دیا ہے۔

''اس تیز رفتاری سے تلووُں میں چھالے پڑ گئے لیکن عجیب نہیں راہ کے خس و خاشاک بھی صاف ہو گئے ہوں۔

خارہا از اثرِ گرمیِ رفتارم سوخت
منتے بر قدمِ راہ روانست مرا

(میری سرعت رفتاری کی حدت نے راستے میں موجود کانٹوں کا جلا کر بھسم کر دیا ہے اور میرا یہ عمل اس راستے کے رہروؤں کے پاؤں کے لیے راحت کا موجب بن گیا ہے۔ نہ کانٹے ہوں گے نہ پاؤں زخمی ہونے کا اندیشہ ہوگا)

اس طویل مکتوب کا اختتام عید کے ذکر سے ہوا ہے۔ لکھتے ہیں:

''اب صبح عید نے اپنے چہرہ سے صبح صادق کا ہلکا نقاب بھی اُلٹ دیا ہے۔ اور بے حجابانہ مسکرا رہی ہے۔''

اک نگار آتشیں رخ ، سر کھلا

دیوان غالب ص ۲۵۷ مصرعہ اُولیٰ ہے

صبح آیا جانب مشرق نظر

اس مکتوب کا اختتام یوں ہوتا ہے:

''میں اب آپ کو اور زیادہ اپنی طرف متوجہ رکھنے کی کوشش نہیں کروں گا کیونکہ صبح عید کی اس جلوہ نمائی کا آپ کو جواب دینا ہے، کئی سال ہوئے ایک مکتوب گرامی میں شبہائے رمضان کی ''عنبریں چائے'' کا ذکر آیا تھا۔ بے محل نہ ہوگا اگر اس کے جرعہ ہائے پیہم سے قبل صلوۃ عید افطار کیجیے۔ کہ عید الفطر میں تعجیل مسنون ہوئی اور عید الاضحیٰ میں تاخیر۔''

عید ست و نشاط و طرب و زمزمہ عام ست
مے نوش ، گنہ بر من اگر بادہ حرام ست

از روزہ اگر کوفتہ ء بادہ روا گیر
ایں مسئلہ حل گشت ز ساقی کہ امام ست

(خوشی (عید) کا موقع ہے۔ عیش و مستی اور رقص و سرور کی ہماہمی ہے۔
ڈٹ کر شراب کے جام لنڈھا۔ اگر شراب پینا حرام ہے تو اس گناہ کی ذمہ
داری مجھ پر ہے۔ اگر روزوں کی فاقہ مستی نے تجھے نحیف و نزار کر دیا
ہے۔ تو شراب کو حلال سمجھ کر پی کیونکہ ساقی جو کہ ہمارے لیے مقتدا کی
حیثیت رکھتا ہے۔ ہمیں اس مسئلے کا حل فراہم کر رہا ہے)

یہ غالب کے ایک قصیدے (بتسمین قصیدہ در مدح بہادر شاہ ظفر) کے دونوں شعر ہیں۔ پہلا مطلع ہی ہے (کلیات ص ۲۳۲ دوسرا درمیان سے لیا گیا ہے (ص ۲۳۳) دوسرے شعر کے مصرع اُولیٰ میں غبار خاطر کی تمام اشاعتوں میں ''روا گیر'' چھپا ہے۔ لیکن دیوان میں ''دوا گیر'' ملتا ہے۔ 'روا گیر' بہتر قرأت ہے۔ اور عین ممکن ہے دیوان میں سہو کتابت ہو۔

مولانا آزاد نے مکتوب نمبر ۱۵ کا آغاز اپنی پسندیدہ چائے سے محرومی سے کیا ہے۔

''وقت وہی ہے۔ مگر افسوس وہ چائے نہیں ہے۔ جو صبح شورش پسند کو
سرمستیوں کی اور فکر عالم آشوب کو آسودگیوں کی دعوت دیا کرتی تھی۔

پھر دیکھیے انداز گل افشانی گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

پھر مکتوب الیہ سے استفسار کرتے ہیں:

''امید ہے آپ کی ''عنبریں چائے'' کا ذخیرہ جس کا ایک مرتبہ رمضان
میں آپ نے ذکر کیا تھا۔ اس نایابی کی گزند سے محفوظ ہوگا۔

امید کہ چوں بندہ تنک مایہ نہ باشی
مے خوردنِ ہرروزہ ز عاداتِ کرام است

(میں امید رکھتا ہوں کہ تجھے تنگ ظرفی کا موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جائے گا۔
اس لیے کہ یہاں تو مے نوشی شرفاء کا روزانہ کا معمول ہے)

مولانا آزاد نے اسی مکتوب میں لکھا ہے کہ عام طور پر لوگ ایک خاص طرح کی پتی کو جو ہندوستان اور سیلون میں پیدا ہوتی ہے۔ سمجھتے ہیں چائے ہے۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں وہ لکھتے ہیں:

''انیسویں صدی کے اوائل میں جب چائے کی مانگ ہر طرف بڑھ رہی
تھی۔ ہندوستان کے بعض انگریز کاشت کاروں کو خیال ہوا۔ کہ سیلون اور
ہندوستان کے بلند اور مرطوب مقامات میں چائے کی کاشت کا تجربہ

کریں۔ انھوں نے چین سے چائے کے پودے منگوائے اور یہاں کاشت شروع کی۔ یہاں کی مٹی نے چائے پیدا کرنے سے انکار کر دیا۔ مگر تقریباً اسی شکل وصورت کی ایک دوسری چیز پیدا کر دی۔ ان زیاں کاروں نے اسی کا نام چائے رکھ دیا۔ اور اس غرض سے کہ اصلی چائے سے ممتاز رہے۔ اسے کالی چائے کے نام سے پکارنے لگے۔

غلطی ہائے مضامین مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

مولانا آزاد بغیر دودھ کی چائے کے لیے خاص شکر کا اہتمام ضروری خیال کرتے ہیں:

''اس کے لیے ایسی شکر چاہیے جو بلور کی طرح بے میل اور برف کی طرح شفاف ہو۔ ایسی شکر ڈلیوں کی شکل میں بھی آتی ہے اور بڑے دانوں کی شکل میں بھی۔ میں ہمیشہ بڑے دانوں کی شفاف شکر کام میں لاتا ہوں۔ اور اس سے وہ کام لیتا ہوں۔ جو مرزا غالب گلاب سے لیا کرتے تھے۔''

آسودہ باد خاطر غالب کے خوئے اوست
آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب مرا

(غالب کا دل اُس کے اس رویے سے بہت مسرت حاصل کیا کرتا ہے کہ وہ مئے ناب میں گلاب بھی ملا لیا کرتا ہے)

''میرے جغرافیہ میں اگر چین کا ذکر کیا گیا ہے، تو اس لیے نہیں کہ جنزل چنگ کائی شیک اور میڈم چنگ وہاں سے آئے تھے، بلکہ اس لیے کہ چائے وہیں سے آتی ہے۔

مئے صافی ز فرنگ آید و شاہد ز تتار
ما ندانیم کو بسطامے و بغدادے ہست

(صاف ستھری مئے دیار فرنگ سے ہی میسر آتی ہے۔ اور محبوب تاتار سے مل پاتے ہیں۔ ہم بایزد بسطامی سے واقف نہیں اور نہ ہی بغداد کے محل و وقوع کی ہمیں خبر ہے)

مولانا چائے بہت اہتمام سے پیتے تھے۔ چینی چائے ''وائٹ جسمین'' انھیں مرغوب تھی۔ چائے میں دودھ نہیں ڈالتے تھے۔ مولانا نے ''غبار خاطر'' کے کئی خطوط میں چائے نوشی کی تفصیل بیان کی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''ایک صاحب ایسے نکلے جنھوں نے ایک مرتبہ میرے ساتھ سفر کرتے

ہوئے یہ چائے پی تھی اور محسوس کیا کہ اگرچہ بغیر دودھ کی ہے۔ مگر اچھی ہے .... ان کے لیے یہ صرف اچھی ہوئی یہاں چائے کا سارا معاملہ ہی ختم ہو جائے اگر یہ "اچھی ہے" ختم ہو جائے۔ غالب کیا خوب کہہ گیا ہے:

زاہد از ما خوشہ تاکے بہ چشم کم مبیں
ہیں، نمی دانی کہ یک پیانہ نقصان کردہ ایم

(اے زاہد، تو ہم کو میسر اس خوشۂ انگور کو حقارت کی نظر سے مت دیکھو، تجھے کیا خبر کہ ہم ایک پیانے کا نقصان کیے بیٹھے ہیں)

کلیات غالب ۴۹۴، 'ہیں' کی جگہ ہی چاہیے

"مگر ایک ڈبہ کب تک کام دے سکتا تھا! آخر ختم ہو جانے پر آیا۔ چھتا خاں نے یہاں دریافت کرایا۔ پونا بھی لکھا، لیکن اس قسم کی چائے کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اب بمبئے اور کلکتہ لکھوایا ہے۔ دیکھیے کیا نتیجہ نکلتا ہے ایک ہفتہ سے یہی ہندوستانی سیاہ پتی پی رہا ہوں اور مستقبل کی امیدوں پر جی رہا ہوں۔

نہ کنی چارہ لب خشک مسلمانے را
اے بہ ترسا بچگان کردہ مئے ناب سبیل!

(یہ شعر اس سے پہلے بھی درج ہو چکا ہے)

مولانا نے ایک قیدی سے مصری کی ڈلیاں کوٹنے کے لیے کہا۔ لکھتے ہیں:

"یہ گرفتار آلات و وسائل بھی کچھ ایسا:

سر گشتہ خمار رسوم و قیود تھا!

کہ ایک چوٹ بھی قرینے کی نہ لگا سکا۔"

پورا شعر یوں ہے:

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن، اسد!
سر گشتہ خمار رسوم و قیود تھا

"کب قلعہ احمد نگر کے زندانیوں کا قافلہ یہاں پہنچتا ہے اور کب ایسا ہوتا ہے کہ انھیں سر پھوڑنے کے لیے تیشہ کی جگہ ہاون دستہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا، کوئی دیوار بھی نہیں

(یہ شعر پہلے بھی درج ہو چکا ہے)

مکتوب نمبر ۱۶ میں رقم طراز ہیں:

''ہندوستان کا موسم سرما اس درجہ تنک مایہ ہے کہ ابھی آیا نہیں کہ جانا شروع کر دیتا ہے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو جاتا ہے۔ میری طبع سراسیمہ کے لیے اس صورتِ حال میں صبر وشکیب کی ایک عجیب آزمائش پیدا ہو گئی ہے۔ جب تک وہ آتا نہیں اس کے انتظار میں دن کاٹتا ہوں، جب آتا ہے۔ تو اس کی آمد کی خوشیوں میں محو ہو جاتا ہوں لیکن اس کا قیام اتنا مختصر ہوتا ہے کہ ابھی اس کی پذیرائیوں کے سروبرگ سے فارغ نہیں ہوا کہ اچانک ہجران و وداع کا ماتم سر پر آ کھڑا ہوتا ہے۔''

ہمچو عیدے کہ در ایام بہار آمد و رفت

(اس عید کی مانند جو موسم بہار میں اپنی جلوہ گری دکھا کر چلی جاتی ہے)

غالب کے مطلع کا مصرع ثانی ہے (کلیات غالب ص ۳۹۳) مطلع ہے:

یار در عید شبابم بکنار آمد و رفت
ہمچو عیدے کہ در ایام بہار آمد و رفت

اس مکتوب میں لکھتے ہیں:

معلوم نہیں بہشت کے موسم کا کیا حال ہوگا، وہاں کی نہروں کا ذکر بہت سنتے ہیں، ڈرتا ہوں کہ کہیں گرمی کا موسم نہ رہتا ہو

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

(دیوان غالب ص ۱۵۳، مصرع ثانی میں صحیح غالباً 'تری' کی جگہ 'ترا' ہے)

''ضلع کا کلکٹر اسی علاقہ کا باشندہ ہے۔ وہ آیا تو کہنے لگا کہ سالہا سال گزر گئے ہیں میں نے ایسا جاڑہ اس علاقے میں نہیں دیکھا، پارا چالیس درجے سے بھی نیچے اُتر چکا ہے۔ یہاں سب حیران ہیں کہ اس سال کون سی نئی بات ہو گئی ہے کہ اچانک پنجاب کی سردی احمد نگر پہنچ گئی۔ میں نے جی میں کہا ان بے خبروں کو کیا معلوم کہ زندانیوں اور خراباتیوں کی دعائیں کیا اثر رکھتی ہیں:

فدائے شیوۂ رحمت کہ در لباس بہار
بہ عذر خواہی زندانِ بادہ نوش آمد

(میں تیری نوازشوں کے اس دلربا انداز پر نثار ہو جاؤں کہ وہ بہار کا لبادہ اوڑھے شراب کے خوگروں سے معذرت خواہانہ انداز اپناتے ہوئے آن موجود ہوئی)

(کلیات غالب ص ۴۳۲)

مکتوب نمبر ۱۸ کا آغاز یوں ہوتا ہے:

''صدیق مکرم
کل عالم تصور میں حکایت زاغ و بلبل ترتیب دے رہا تھا۔''

مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

دیوان غالب ص ۴۵، پورا شعر ہے:

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

''اس وقت خیال ہوا، ایک فصل آپ کو بھی سنا دوں:

تا فصلے از حقیقتِ اشیاء نوشتہ ایم
آفاق را مرا دفِ عنقا نوشتہ ایم

(ہمارے نزدیک پوری دنیا عنقا کے مترادف ہے۔ جب سے ہم نے اس امر کا خیال باندھا ہے۔ تب کہیں جا کر اشیاء کی حقیقت کا باب رقم ہو سکا ہے۔)

(کلیات غالب فارسی، ص ۴۹۱)

''چھپرہ'' میں ایک مرتبہ انھوں نے مرغیاں پالی تھیں۔ دانہ ہاتھ میں لے کر آ، آ کرتے تو ہر طرف سے دوڑتی ہوئی چلی آتیں۔ یہی نسخہ چڑیوں پر بھی آزمانا چاہا، لیکن چند دنوں کے بعد تھک کر بیٹھ رہے۔ کہنے لگے عجیب معاملہ ہے۔ دانہ دکھا دکھا کر جتنا پاس جاتا ہوں۔ اتنی ہی تیزی سے بھاگنے لگتی ہیں۔ گویا دانہ کی پیش کش بھی ایک جرم ہوا۔

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اُتنا کھنچتا جائے ہے مجھ سے

(دیوانِ غالب، ص ۲۱۸)

''صحن کے شمالی کنارے میں نیم کا ایک تناور درخت ہے۔ اس پر گلہریوں کے جھنڈ کودتے پھرتے ہیں۔ انھوں نے جو دیکھا کہ:

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

تو فوراً لبیک لبیک اور ''مرحمت عالی زیاد'' کہتے ہوئے اس دستر خوان کرم پر ٹوٹ پڑیں

دیوان غالب ص ۲۵۳ پورا شعر ہے:

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

''اسی اثنا میں موسم نے پلٹا کھایا۔ جاڑے نے رختِ سفر باندھنا شروع کیا۔ بہار کی آمد آمد کا غلغلہ برپا ہوا۔ اگرچہ ابھی تک:

اُڑتی ہے اک خبر تھی زبانی طیور کی!

غالب کا مصرع ہے، جس کا فعل موقع کی مناسبت سے حال کی جگہ ماضی کر دیا گیا ہے۔ (دیوان غالب ۲۳۶) پورا شعر ہے:

آمد بہار کی ہے، جو بلبل ہے نغمہ سنج
اُڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

''ناچار تختوں کی داغ بیل ڈال کر دو دو تین فٹ زمین کھودی گئی اور باہر سے مٹی اور کھاد منگوا کر انھیں بھرا گیا۔ کئی ہفتے اس میں نکل گئے۔ جواہر لال صبح و شام پھاوڑا اور کدال ہاتھ میں لیے کوہ کندن اور کاہ برآوردن میں لگے رہتے۔

آغشتہ ایم ہر سر خارے بہ خون دل
قانون باغبانی صحرا نوشتہ ایم

(یہاں پر خار کی آبیاری ہمارے خونِ جگر سے ہوئی ہے اور ہم نے صحرا کے اس چمنستان کی باغبانی کے لیے ایک خاص طریقِ کار وضع کر رکھا ہے)

(کلیات غالب، ص ۴۹۲)

''ہمارے اس چھوٹے سے گوشۂ چمن میں ابھی صرف ایک ہی پھول ایسا ہے جسے اس قسم کے غیر معمولی پھولوں میں سے شمار کیا جا سکتا ہے۔ یعنی گلوری اوسا سپوپربا (Gloriosa Superba) اس کی پانچ جڑیں گملوں میں لگائی گئی تھیں۔ چار بار آور ہوئیں۔ اب ان کی شاخیں کلیوں سے لدی

ہوئی ہیں۔ ان کا پھول پہلے پنجے کی طرح کھلے گا۔ پھر پیالے کی طرح اُلٹ جائے گا۔ پھر فانوس کی طرح مدّور ہونے لگے گا۔ پھر تھوڑی دیر دم لینے کے لیے رُک جائے گا اور پھر دیکھیے تو جن منزلوں سے گزرتا ہوا آیا تھا۔ انھیں منزلوں سے گزرتا ہوا اُلٹے پاؤں واپس ہونے لگے گا۔ واپسی میں پہلے فانوس کی اُٹھی ہوئی شاخیں پھیل کر ایک پیالہ بنائیں گی۔ پھر اچانک یہ پیالہ اُلٹ جائے گا۔ گویا زندگی کے جام واژگوں میں کچھ باقی نہ رہا۔

لیے بیٹھا ہے اک دوچار جام واژگوں وہ بھی

(دیوان غالب ص ۱۶۰، مصرع اُولی ہے)

مئے عشرت کی خواہش ساقیٔ گردوں سے کیا کیجیے

''ہر پھول کی آمد و رفت کی یہ مسافرت دس سے بارہ دن کے اندر طے ہوا کرتی ہے۔ چھ دن آنے میں لگتے ہیں۔ چھ دن واپسی میں اور دراصل اس کا آنا بھی جانے ہی کے لیے ہوتا ہے۔''

ترا آنا نہ تھا ظالم، مگر تمہید جانے کی

دیوان غالب، ص ۱۶۲ پہلا مصرع ہے:

ہماری سادگی تھی، التفات ناز پر مرنا

مکتوب ۱۹ میں لکھتے ہیں:

''یہاں کمرے جو ہمیں رہنے کو ملے ہیں۔ پچھلی صدی کی تعمیرات کا نمونہ ہیں۔ چھت لکڑی کے شہتیروں کی ہے اور شہتیروں کے سہارے کے لیے محرابیں ڈال دی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جابجا گھونسلہ بنانے کے قدرتی گوشے نکل آئے ہیں اور گوریاؤں کی بستیاں آباد ہوگئیں دن بھر ان کا ہنگامہ تگ و دو گرم رہتا ہے .... یہاں کی ویرانی دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آگئی۔

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

(دیوان غالب، ص ۱۷۷)

مولانا نے چڑیوں کے چگنے کے لیے دانہ ڈالا ہے اور اب ایک چڑیا کا دانے کی طرف بڑھنے کا منظر بیان کر رہے ہیں:

''ایک قدم آگے بڑھتا تھا، تو دو قدم پیچھے ہٹتے تھے۔ میں جی ہی جی میں کہہ رہا تھا کہ التفات و تغافل کا یہ ملا جلا انداز بھی کیا خوب انداز ہے۔ کاش تھوڑی سی تبدیلی اس میں کی جا سکتی۔ دو قدم آگے بڑھتے ایک قدم پیچھے ہٹتا۔ غالب کیا خوب کہہ گیا ہے:

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

(وصل کی مٹھاس اور جدائی کی تلخی کا اپنا اپنا انداز ہے۔ تو بار بار وصل کی دولت سے مالا مال کر اور پھر مجھے جدائیوں کے تلخ لمحات کے سپرد بھی کرتا رہ۔)

کلیات غالب، ص ۳۶۳

مکتوب ۲۰ میں بھی چڑیا چڑے کی کہانی جاری ہے۔ ایک چڑیا مولانا کی ہتھیلی پر آ بیٹھی اور دانہ چگنے لگی۔ لکھتے ہیں:

''درد کا حال تو معلوم نہیں، مگر چونچ کی ہر ضرب جو پڑتی تھی ہتھیلی کی سطح پر ایک گہرا زخم ڈال کر اٹھتی تھی۔''

رسیدن ہائے منقار ہما بر استخوان غالب
پس از عمرے بیادم داد رسم و راہ پیکاں را

(غالب کے استخواں وجود پر ہما نے کچھ اس طور پر ٹھونگیں لگائی ہیں کہ ایک عرصے کے بعد مجھے نیزوں کی انی سے زخمی ہونے کا انداز یاد آ گیا۔)

کلیات غالب، ص ۳۷۲

چڑوں کی لڑائی کا حال ملاحظہ فرمائیے:

''کچھ فاصلہ پر وہ حسب معمول کسی حریف سے کشتی لڑنے میں مشغول ہے۔ ان کے لڑنے کی خود فروشیوں کا بھی عجیب حال ہوتا ہے۔''

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

دیوان غالب، ص ۱۳۹ پہلا مصرع ہے:

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا!

مکتوب ۲۲ میں لکھتے ہیں:

''انسان کے دل کی سرزمیں کا بھی یہی حال ہے۔ اس باغ میں بھی امید و طلب کے بے شمار درخت اُگتے ہیں اور بہار کی آمد آمد کی راہ تکتے ہیں،

لیکن جن ٹہنیوں کی جڑ کٹ گئی ان کے لیے بہار و خزاں کی تبدیلیاں کوئی اثر نہیں رکھتیں۔ کوئی موسم بھی انھیں شادابی کا پیغام نہیں پہنچا سکتا۔''

خزاں کیا، فصل گل کہتے ہیں کس کو، کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

دیوان غالب، ص ۱۷۰

مکتوب ۲۴ میں لکھتے ہیں:

''کل رات ایک عجیب طرح کی حالت پیش آئی۔ کچھ دیر کے لیے محسوس ہونے لگا کہ سوئی چبھ رہی ہے اور شاید دل کی بھاپ پانی بن کر بہنا شروع ہو جائے، لیکن یہ محض ایک سانحہ تھا۔ جو آیا اور گزر گیا، اور طبیعت پھر بند کی بند رہ گئی۔ دیگ نے جوش کھایا لیکن پھوٹ کر بہہ نہ سکی۔''

ضعف سے گریہ مبدل بہ دم سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

دیوان غالب، ص ۸۰

''موسیقی کا ذوق اور تاثر جو دل کے ایک ایک ریشے میں رچ گیا تھا۔ دل سے نکالا نہیں جا سکتا تھا اور آج تک نہیں نکلا۔

جاتی ہے کوئی کش مکش اندوہِ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

دیوان غالب، ص ۴۵

مولانا آزاد کو آگرے کے سفر کا اتفاق ہوا۔ ''اپریل کا مہینہ تھا اور چاندنی کی ڈھلتی ہوئی راتیں تھیں۔ میں رات کو ستار لے کر تاج چلا جاتا اور اُس کی چھت پر جمنا کے رُخ بیٹھ جاتا اور جوں ہی چاندنی پھیلنے لگتی ستار پر کوئی گیت چھیڑ دیتا۔'' ایسی ہی ایک رات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''رات کا سناٹا، ستاروں کی چھاؤں، ڈھلتی ہوئی چاندنی اور اپریل کی بھیگی ہوئی رات، چاروں طرف تاج کے منارے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ برجیاں دم بخود بیٹھی تھیں۔ بیچ میں چاندنی سے دھلا ہوا مرمریں گنبد اپنی کرسی پر بے حس و حرکت متمکن تھا۔ نیچے جمنا کی رو پہلی جدولیں بل کھا کھا کر دوڑ لگا رہی تھیں اور اوپر ستاروں کی ان گنت نگاہیں حیرت کے عالم میں تک رہی تھیں۔ نور و ظلمت کی اس ملی جلی فضا میں اچانک پردہ ہائے

ستار سے نالہ ہائے بے حرف اُٹھتے اور ہوا کی لہروں پر بے روک تیرنے لگتے، آسمان سے تارے جھڑ رہے تھے اور میری انگلی کے زخموں سے نغمے۔''

زخمہ بر تارِ رگ جاں می زنم
کس چہ داند تا چہ دستاں می زنم

(میں مضراب کو اپنی رگ جاں کے تار پر مار رہا ہوں کوئی اس سے باخبر نہیں کہ اس سے کیا نغمے نکل رہے ہیں)

کلیات غالب، ص ۳۳۹

''مصر کی ایک مشہور ''عالمہ'' طاہرہ نامی باشندۂ طنطا تھی۔ ''عالمہ'' مصر میں مغنیہ کو کہتے ہیں۔ یعنی موسیقی کا علم جاننے والی۔ ہمارے علماء کو اس اصطلاح سے غلط فہمی نہ ہو۔ یورپ کی زبانوں میں یہی لفظ (ALMA) ہوگیا۔ شیخ سلامہ بھی اس عالمہ کی فن دانی کا اعتراف کرتا تھا۔ وہ خود بھی بلائے جان تھی، مگر اس کی آواز اس سے بھی زیادہ آفتِ ہوش و ایمان تھی۔ میں نے اس سے بھی شناسائی بہم پہنچائی اور عربی موسیقی کے آلات سنے۔ دیکھیے اس خانماں خراب شوق نے کن کن گلیوں کی خاک چھنوائی۔

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہگذر کو میں

دیوانِ غالب، ص ۱۲۶

مولانا ابوالکلام آزاد کی معروف تصنیف ''تذکرہ'' بھی اردو، عربی اور فارسی کے مختلف اشعار سے مزین ہے۔ جن میں غالب کے درج ذیل اشعار بھی شامل ہیں جو مختلف صفحات سے سیاق و سباق کے ساتھ نذر قارئین ہیں:

''دنیا میں جس وقت سے نوع انسانی آباد ہوئی ہے ہمیشہ گمراہی کے یہ دو بھیس رہے ہیں یا افراط بغض نے لوگوں کو گمراہ کیا ہے یا افراط محبت نے۔''

ناہید بغمزہ کشت و مریخ بقہر،

(ناہید ستارہ کے عہد میں ہم حسن کے ناز و ادا سے قتل ہوئے اور مریخ ستارہ کے عہد میں سختیوں کا شکار رہے)

شعر کا پہلا مصرعہ ہے:

بگزر ز سعادت و نحوست کہ مرا

(خوش بختی اور بد بختی کی باتوں کو چھوڑ کر ہمارے ساتھ دونوں حالتوں میں یکساں سلوک ہوا ہے)

تذکرہ صفحہ ۵۶ کلیات غالب فارسی صفحہ ۵۴۳

''افسوس جزئیات مزعومہ عقائد کے غرور باطل نے مسلمانوں کو جس قدر نقصان پہنچایا۔ کسی چیز نے نہیں پہنچایا۔ عمل صالح کی اہمیت بالکل جاتی رہی اور سارا دارومدار چند مذموعہ عقائد پر آکر رہ گیا۔ ایک شخص صرف اس غرور میں کہ میں الف سے لے کر ے تک ٹھیک ٹھیک عقائد نفسی کا مجسمہ ہوں۔ تمام عمل صالح اور ایثار و محبت فی اللہ کوئی شے نہیں۔ ایک شخص تقویٰ و طہارت میں کتنا ہی اصلح ہو۔ لیکن اگر کسی ایک جزئی و ضمنی عقیدہ میں بھی مخالف ہوا تو اس کی ساری عمر کی کمائی رائیگاں گئی اور باوجود عمر بھر کے ایمان و عمل صالح کے کافر کا کافر ہی رہا۔ جس کلمہ کے ایک بار اقرار کر لینے سے ابوسفیان اعدیٰ عدوئے اسلام اور وحشی قاتل حمزہؓ کا خون حرام ہو گیا تھا۔ اور اگر ابوجہل بھی اقرار کر لیتا تو اس کی ساری عمر کا کفر و طغیان محو ہو جاتا۔ آج ساری عمر اس کی عمر ایمان و عمل میں بسر کر دیجیے۔ لیکن پھر بھی مومنوں کے گروہ میں شمار ہونے کا حق حاصل نہیں کر سکتے! افسوس تیرہ سو برس گزر گئے، مگر کفر و ایمان کی گتھی آج تک نہ سلجھی۔''

جز سخن کفرے و ایمانے کجاست

خود سخن در کفر و ایماں میرود

(کفر اور ایمان کے بارے میں ہمارے پاس سوائے زبانی مباحثہ کے کیا باقی رہ گیا ہے۔ حالت یہ ہے کہ خود ایمان اور کفر کی حقیقت تک ہم نہیں پہنچ پائے)

تذکرہ صفحہ ۷۱ کلیات غالب فارسی ۴۳۸

''شیخ علائی اپنے ساتھیوں کے ساتھ دربار میں پہنچے تو پھٹے پرانے کپڑوں اور فقیرانہ و نامرادانہ وضع و صورت میں درویشوں کی ایک شکستہ حال جماعت تھی۔ لیکن کبر و علوحق کا یہ حال تھا کہ صرف سلام مسنون کر کے ایک گوشے میں بیٹھ گئے اور تمام دربار پر اس حقارت و بے پروائی سے نظر ڈالی گویا مغرور انسانوں کی جگہ پتھروں کا ڈھیر ہے۔ یہ خودداری سلیم شاہ پر

بہت گراں گزری۔ بحث شروع ہوئی۔ تو سب سے پہلے شیخ علائی نے قرآن حکیم کی چند آیات تلاوت کیں اور ان کی تفسیر کا وعظ شروع کر دیا کہ:

جز نغمۂ محبت سازم نوا نہ دارد!

(میرے ساز سے محبت کے نغمے کے سوا اور کوئی آواز نہیں نکلتی ہے)

شعر کا پہلا مصرعہ ہے:

ہر مطلع کہ ریز داز خامہ ام ، فغانیست

(میرے قلم سے جو مطلع بھی لکھا جاتا ہے وہ پکار کر کہتا ہے)

تذکرہ صفحہ ۴۷ کلیات غالب فارسی صفحہ ۴۳۴

''ظاہر ہے کہ چمڑے کے کوڑے اور لوہے کی دھار ان کی استقامت پر کب غالب آنے والی ہے؟ یہ تو اس کے مقابلے میں محض ایک ابتدائی اور آزمائشی منزل ہے۔''

کریں گے کوہ کن کے جذب دل کا امتحاں آخر

ابھی اس خستہ کے نیروے تن کی آزمائش ہے

تذکرہ صفحہ ۱۵۷ دیوان غالب ۲۱۷ دوسرے مصرعے میں 'ابھی' کی جگہ 'ہنوز' ہے)

''جس دن امام علی رضا نیشا پور میں داخل ہوئے، بیس ہزار آدمی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تا کہ صرف ایک حدیث ان کے آبائی سلسلے سے سن لیں اور اہل بیت کرام کے سلسلہ علیہ اسناد سے مشرف و مفتخر ہوں۔ ان بیس ہزار آدمیوں میں حافظ ابو زرعہ اور امام مسلم بھی تھے۔ حاکم نے تاریخ میں لکھا ہے کہ اُس دن نیشا پور کا عجیب حال تھا۔ بہ یک وقت ہزاروں آدمیوں کے ہجوم و مرور سے تمام شہر گرد و غبار میں چھپ گیا۔ راستوں میں راہگیر ایک دوسرے کو بجھائی نہیں دیتے تھے۔

رشک آیدم بہ روشنِ دیدہ ہائے خلق

دانستہ ام کہ از اثرِ گردِ راہِ کیست

(مجھے لوگوں کی آنکھوں کی چمک اور تیزی پر رشک آتا ہے۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ یہ برکت انھیں کس ہستی کی گرد راہ کے فیض سے حاصل ہوئی ہے)

تذکرہ صفحہ ۱۷۳ کلیات غالب فارسی ۳۸۲

حتیٰ کہ بعض عرفاً و اصحاب اشارت نے کہا۔ باے بسم اللہ سے سینِ ولناس

تک جو کچھ ہے، گو حکایت موسیٰ کلیمؑ کی ہو اور یوسف صدیقؑ کی۔ لیکن ان سب سے مقصود ایک ہی ہے۔ اور گو نام دوسروں کے ہوں مگر روئے سخن اُسی طرف ہے۔

چشم سُوئے فلک و روئے سخن سُوئے تو بود!

(میرے لب پر گلہ تو آسمان کے ستم کا تھا۔ مگر حقیقتاً اس کا مخاطب آپ تھے)

شعر کا پہلا مصرعہ ہے:

دوش کز گردش بختم گلہ بر روئے تو بود

(کل جب میں آپ کے سامنے اپنی بدبختی کے بارے میں آپ کے سامنے شکوہ کر رہا تھا)

یہ شعر غبار خاطر کے حوالہ سے دوبارہ گزشتہ صفحات میں درج ہو چکا ہے۔

تذکرہ صفحہ ۱۹۹ کلیات غالب فارسی صفحہ ۴۲۹

"حقیقت یہ ہے کہ شک وشبہ کا فتنہ خود اس تیزی سے نہیں آتا۔ جس قدر جلد شک وشبہ دور کرنے والے اسے بلا لیتے ہیں۔ ہمیشہ مدعیان تطبیق نقل وعقل و دفع شبہات وشکوک نے ایسا ہی کیا ہے۔ علوم قدیمہ کی اشاعت کے زمانے میں ایک نہایت ہی محدود جماعت نے یونانی فلسفہ وغیرہ کو پڑھا تھا۔ اور متوسلین دربارِ خلفا ومشغولین تراجم ونظر کے علاوہ عام امت اس کے اثر سے محفوظ تھی۔ سب سے پہلے خود معتزلہ اس کے تیروں سے زخمی ہوئے۔ پھر خود بخود یہ ظاہر کر کے کہ تمام امت زخمی ہوگئی ہے۔ اور اس کا علاج علمائے قرآن وسنت نہیں کر سکتے۔ اپنے آپ کو خود ساختہ معلم ومعالج قرار دیا۔ اور جس بیماری کا ابھی وجود ہی نہ تھا۔ خود کوشش کر کے اور بلاوے بھیج کر بالآخر اُسے بلا ہی لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے ردّ وکد اور بحث ونظر نے خواہ مخواہ ہزاروں انسانوں کے عقائد متزلزل کر دیے۔ عامۂ متکلمین وحکماء کا بھی یہی حال رہا۔ ہمارے زمانے میں بھی بعینہٖ یہی صورت حال پیش آئی ہے۔ جس پر آج تک کسی نے غور نہیں کیا۔ ابھی نہ تو مسلمانوں میں نئے علوم کی بناء پر کوئی نیا چرچا پھیلا تھا۔ نہ شک وشبہات پیدا ہوئے تھے۔ محض چند لوگ تھے جنھوں نے نہ تو یورپ کی کوئی زبان پڑھی تھی نہ علوم مادّیہ سے واقفیت حاصل کی تھی۔ صرف سنی سنائی باتوں اور

مقلدانہ جوش عقیدت و حسن ظن بہ یورپ سے اپنے جی میں شکوک و شبہات پیدا کیے۔ اور پھر خود ہی پکارنا شروع کر دیا کہ علوم جدیدہ نے اسلام کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے سیلاب نے مسلمانوں کے سیزدہ صد سالہ عقائد زیر و زبر کر دیئے۔ اب بجز اس کے چارہ نہیں کہ اسلامی عقائد میں از سر نو ترمیم و تنسیخ کی جائے۔ پچھلے کل پرزے نکال کر ایک نیا کارخانہ ڈھالا جائے۔

خواہم کہ دگر بت کدہ سازند حرم را!

(میں چاہتا ہوں کہ حرم کعبہ کو پھر سے بت کدہ میں تبدیل کر دیا جائے)

نتیجہ یہ نکلا کہ شکوک و شبہات خود تو ابھی نہیں آئے تھے مگر ان لوگوں نے بلاوے بھیج کر بلا ہی لیا۔ اور کہہ کہہ کر کہ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان مذہب کو خیر باد کہہ دیتے ہیں۔ سچ مچ پوری نسل کو شکوک و شبہات میں غرق کر دیا۔

شعر کا پہلا مصرعہ ہے:

دوش کز گردش نجتم گلہ بر روئے تو بود

(مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا کہ بتوں کو بے گھر اور بے وطن دیکھتا رہوں)

یہ شعر بھی غبار خاطر کے حوالہ سے پہلے درج ہو چکا ہے۔

تذکرہ صفحہ ۲۴۰ کلیات غالب ۲۰۶

''قاضی القضاۃ تقی الدین سبکی کی شہادت امام بن تیمیہ کی نسبت، جن کی مخالفت پر شیخ ابن حجر مکی رحمتہ اللہ علیہ اور ان کے ہم مشربوں کو ناز ہے۔ اور بار بار حوالہ دیتے ہیں کہ شیخ الاسلام سبکی نے اُن کا رد کیا ہے۔ تو یہ ہیں شیخ الاسلام سبکی اور وہ تھے امام ابن تیمیہ''

متفق رائے بو علی بار اے من!

(بو علی سینا کی رائے بھی وہی ہے۔ جو اس سلسلہ میں میں کہتا ہوں)

شعر کا پہلا مصرعہ ہے:

آں کہ ہر یکتائی وے در فن فرازنگی

(عقل و دانش کے میدان میں ان کی یکتائی اور بے مثالی کے بارے میں)

غالب نے مفتی محمد صدر الدین آزاد کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اس کا شعر ہے

تذکرہ صفحہ ۲۴۹

"سچ ہے۔ "کمال" اور "حسن" ہی میں یہ اعجاز ہے۔ کہ اگر تم پہاڑ کا جماؤ اور سمندروں کا طوفان بھی اپنے اندر پیدا کرلو جب بھی اس کے سامنے ایک اڑتے ہوئے تنکے کی طرح گر جانے سے اپنے تئیں نہیں روک سکتے۔ اگر تم اپنے سر کو جھکنے سے اور زبان کو بولنے سے روکو گے، تو سچائی کا فرشتہ اپنے آہنی پنجوں سے تم کو گرادے گا۔ اور حقیقت کا ہاتھ تمھارے حلق کے اندر بیٹھ کر تمھاری زبان کو ایک مدہوش و بے اختیار آدمی کی طرح کھول دے گا۔ سچائی جب اپنی گواہی پتھروں کو چلا کر دے سکتی ہے اور درختوں کو بلوا کر دے سکتی ہے تو انسان کی روح و زبان کب اس کے فرمانِ قضا سے باہر رہ سکتی ہیں۔ دنیا میں کامل طاقت اور بیباک حکم صرف سچائی کا ہے۔ یا اس کے دوسرے عرف میں کہہ سکتے ہیں کہ حسن کا۔ اس کے سوا کون ہے؟"

اپنے سنگ بر تو دعویٰ طاقت مسلم ست
خود را نہ دیدۂ بہ کفِ شیشہ گر ہنوز!

(اے پتھر تیری طاقت اور سختی کا دعویٰ تسلیم شدہ ہے۔ کیونکہ تو نے اب تک کسی شیشہ ساز کے ہنر سے فیض نہیں اٹھایا ہے)

تذکرہ ۲۵۴ کلیات غالب ۴۶۴

"یہ بات نہ تھی کہ امتیاز نے بالکل ساتھ چھوڑ دیا ہو اور دیدۂ اعتبار یک لخت کور ہو۔ برق نے بارہا چشمک کی، ستاروں نے بھی کبھی کبھی پردۂ شب کی اوٹ سے جھانکا، لیکن رات کی تاریکی اور طوفان کی تیرگی ایسی نہ تھی جو ان چنگاریوں سے روشن ہو جاتی۔ وہ برابر بڑھتی ہی گئی۔"

فرصت ز دست رفتہ و حسرت فشردہ پاے
کار از دو گزشتہ و افسوں نہ کردہ کس!

(مایوسی کا یہ عالم ہے۔ کہ کچھ کرنے کا وقت ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ اس پر افسوس کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ جیسے مریض پر دوا کارگر نہ ہو رہی ہو اور کسی دُعا میں اثر نہ رہا ہو)

تذکرہ صفحہ ۳۱۵ کلیات غالب ۴۶۶

کلکتہ جہاں مولانا کا طویل عرصے تک قیام رہا تھا۔ کو چھوڑنے کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

''۳۰ مارچ کو کلکتے سے کہ سالہا سال کے قیام کی بناء پر بے جا۔ اگر وطن کہوں، نکلا اور رانچی پہنچا۔

نگہم نقب ہمی زد بہ بناں خانۂ دل
مژدہ باد اہل ریا را کہ ز میداں رفتم!

(میری نظر لوگوں کے دلوں کے اندر جھانک لینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ ان ریا کار لوگوں کے لیے خوش خبری کی بات ہے کہ میں اس میدان کو چھوڑ رہا ہوں)

تذکرہ صفحہ ۲۳۲ کلیات غالب ۳۰۹

اگرچہ اکثر احباب واقارب آمادۂ ہمری تھے۔ لیکن دل ہمت خواہ نے گوارا نہ کیا کہ اس منزل انقطاع کی عزت کو شرکت رفقاء کے داغ ناتمامی سے بٹہ لگاؤں۔''

اس مقالہ کو ختم کرتے وقت میں صرف اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ مقالہ کا خاکہ بناتے اور اس پر کام کا آغاز کرتے ہوئے مجھے اس موضوع کی وسعت کے امکانات کا قطعاً اندازہ نہیں تھا۔ مگر لکھتے وقت اس کے پھیلاؤ کا احاطہ کرنا دشوار ہوتا چلا گیا۔ اسی سے اندازہ ہوا کہ اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کام کیوں نہیں ہو سکا ہے۔ اس سلسلہ میں صرف ایک آدھ مضمون لکھا گیا ہے اور وہ بھی محض متعلقہ اشعار کو جمع کرنے کی کوشش تک محدود ہے۔ اشعار کے محل استعمال، ان کے ترجمہ، ان کے معانی کے انطباق اور ان کے سیاق و سباق سے قطعاً تعرض نہیں کیا گیا۔ میں نے ان تمام پہلوؤں کو روشن کرنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے، اگرچہ ہر انسانی کوشش میں مزید بہتری کی گنجائش ہمیشہ باقی رہتی ہے مگر میں اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ موضوع کے ساتھ پورا انصاف کرنے میں بڑی حد تک کامیاب رہا ہوں۔

غالب کے اشعار اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں کی روشنی میں ان دونوں نابغہ روزگار ہستیوں کی شخصیات اور مزاجوں میں ہم آہنگی کے عناصر کی تلاش بھی ایک بہت اہم اور دلچسپ موضوع ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے علیحدہ سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ میرے مقالہ کا دامن اس موضوع تک وسیع نہیں تھا اس لیے اس کی حدود تک پہنچے بغیر ہی میں اپنے مقالہ کو ختم کر رہا ہوں۔

کتابیات :

۱- غبار خاطر مرتبہ مالک رام مکتبہ جمال اردو بازار لاہور طبع ۲۰۰۵ء

۲- تذکرہ مرتبہ مالک رام مکتبہ جمال اردو بازار لاہور طبع ۲۰۰۵ء

۳- مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم، اعلم پبلشرز کراچی ۱۹۸۸ء

۴- ابوالکلام آزاد ادبی وشخصی مطالعہ، مرتبہ فضل حق قریشی، الفیصل پبلشرز طبع ۱۹۹۲ء

۵- ترجمان القرآن (جلد اوّل) ابوالکلام آزاد نئی دہلی طبع ۱۹۸۰ء

۶- الہلال کے مختلف شمارے ناشر مکتبہ رشیدیہ لوئر مال لاہور

۷- الہلال اور البلاغ کے ارشادات و مباحث جاوید اختر بھٹی بیکن بکس ملتان طبع ۲۰۰۵ء

۸- نقش آزاد مولانا غلام رسول مہر ناشر شیخ غلام رسول اینڈ سنز لاہور طبع ۱۹۶۸ء

۹- فیضان آزاد مرتب جاوید اختر بھٹی دارلکتاب اردو بازار لاہور، طبع ۲۰۰۵ء

۱۰- خطوط آزاد مرتبہ مالک رام بک ٹاک ٹمپل روڈ لاہور طبع ۲۰۰۳ء

۱۱- مکاتیب ابوالکلام آزاد مرتبہ ابوسلمان شاہجہان پوری اردو اکیڈمی کراچی طبع ۱۹۶۸ء

(یہ مقالہ غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے زیر اہتمام منعقدہ بین الاقوامی غالب سیمینار ۱۸ دسمبر ۲۰۰۵ء میں پڑھا گیا)

دیوانِ غالب مطبوعہ ۱۸۶۳ء

''دیوان غالب کا یہ نادر نسخہ غالب کے انتقال سے صرف چھ
برس پیشتر اشاعت پذیر ہوا اور اس کی ترتیب و تصحیح غالب
ہی کی نگرانی میں ہوئی۔ پروفیسر حکیم ظل الرحمن علی گڑھ کے
باسی ہیں اور گراں قدر ذخیرہ غالبیات کے مالک و مہتمم۔
ہماری درخواست پر انھوں نے اس نایاب نسخے کی فوٹو کاپی
بھجوائی اور اس پر دیباچہ بھی رقم فرمایا۔
نسخے کے بہت سے صفحات پر نسخے کی قدامت اثر انداز
ہوئی اور حروف دھندلا گئے تھے۔ جنھیں روشن کرنے کی
کوشش کی گئی ہے جبکہ جو اشعار ادھورے یا پڑھے نہیں
جاتے تھے انھیں الگ سے کمپوز کر دیا گیا ہے۔ دیوان
غالب مطبوعہ 1863ء قارئین ''سورج'' کی نذر ہے جبکہ
اس کا ڈی لکس ایڈیشن غالب میموریل ٹرسٹ کی جانب سے
شائع کیا جا رہا ہے۔

پیش لفظ

غالب کی زندگی میں ان کے جو اردو دیوان شائع ہوئے ان کی تفصیل اس طرح ہے۔

۱۔ شعبان ۱۲۵۷ھ/ اکتوبر ۱۸۴۱ء

پہلا ایڈیشن سرسید احمد خاں کے بھائی سید محمد خان بہادر کے مطبع سید المطابع عرف مطبع سید الاخبار سے سید عبدالغفور کے زیر اہتمام شائع ہوا۔

نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر و رخشاں کی تقریظ کے ساتھ ۱۰۸ صفحات کا یہ دیوان 1070 اشعار پر مشتمل ہے۔ ضیاء الدین نیّر و رخشاں نے یہ تقریظ ۱۲۵۴ھ میں لکھی تھی۔ اس میں انہوں نے شعروں کی تعداد 1095 لکھی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوان ۱۰۵۴ھ بمطابق ۱۸۳۸ء میں مکمل ہو چکا تھا اور جب تین برس بعد ۱۲۵۷ھ/ ۱۸۴۱ء میں یہ شائع ہوا تو اس میں ۱۲۵ اشعار کا اضافہ کر دیا گیا۔ مرزا نے جس اصل دیوان سے انتخاب کر کے اپنا اردو دیوان تیار کیا تھا، خوش قسمتی سے اس کا ایک نسخہ میاں فوجدار محمد خاں بہادر بھوپالی کے کتب خانہ میں محفوظ تھا، جہاں سے یہ نسخہ حمیدیہ کے نام سے شائع ہوا ہے۔[۱] اصل مخطوطہ ۱۸۲۱ء کا کتابت کردہ ہے۔

۱۸۴۱ء کے مطبوعہ دیوان کے نسخے پنڈت مہیش پرشاد، خان بہادر ابو محمد اور صولت پبلک لائبریری رامپور میں محفوظ ہیں۔ خان بہادر ابو محمد کا نسخہ اب مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کی زینت ہے۔

امتیاز علی عرشی نے رامپور میں موجود نسخہ کے مطابق بیان کیا ہے کہ اس کے سرورق پر حسب ذیل عبارت اس طرح پانچ سطروں میں لکھی ہے۔[۲]

دیوان اسد اللہ خانصاحب غالب تخلص

مرزا نوشہ صاحب مشہور کا دیوان دہلی میں سید محمد خان بہادر کے چھاپے خانے کے

لیتھوگرافک پریس میں شعبان

۱۲۵۷ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۸۴۱ء کو سید عبدالغفور کے اہتمام میں چھاپا گیا۔

۲۔ جمادی الاول ۱۲۶۳ھ/مئی ۱۸۴۷ء

دوسری بار مطبع دارالسلام عرف مطبع صادق الاخبار حوض قاضی دہلی سے شائع ہوا۔ اس مطبع کے مالک منشی نورالدین احمد لکھنوی تھے۔ اس اشاعت میں بھی نواب ضیاء الدین احمد کی تقریظ شامل ہے۔ اشعار کی تعداد ۱۱۵۹ ہے۔ یعنی پہلی اشاعت پر ۴۷ اشعار کا اضافہ۔

۳۔ ۲۰ محرم ۱۲۷۸ھ/ ۲۹ جولائی ۱۸۶۱ء

تیسری مرتبہ مطبع احمدی شاہدرہ دہلی سے امو جان کے اہتمام میں طبع ہوا۔ اس مطبع کے مالک محمد حسین خاں تحسین تھے۔ اس میں بھی نواب ضیاء الدین احمد خاں کی تقریظ شامل ہے۔ اشعار کی تعداد ۱۷۹۶ ہے۔ اس کے سرورق پر خدا جانے کس مناسبت سے قرآن مجید کی یہ آیت ''وَالشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ'' لکھی گئی ہے۔ وسط میں: در مطبع احمدی باہتمام امو جان طبع شد" تحریر ہے۔ نواب ضیاء الدین احمد نے اس شعر سے تاریخ تصنیف نکالی ہے۔

۱۲۷۸
بنائے ریختہ ایک، اور دوسری تاریخ

۱۲۷۸
بذہن نیر رخشاں، بیاں ریختہ ہے

"کاتب اگرچہ بد خط نہیں، لیکن بیحد غلط نویس ہے" مرزا اس کی غلطیاں دیکھ کر بہت جھلائے۔ ان کی ناراضگی ان کے خطوط سے ظاہر ہے۔ ۱۸ اگست ۱۸۶۱ء کے خط میں میر مہدی مجروح کو لکھا ہے۔

"دیوان اردو چھپ چکا۔ ہائے! لکھنؤ کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان چھاپا اس کو آسمان پر چڑھا دیا۔ حسن خط سے الفاظ کو چمکا دیا۔ دلی پر اور اس کے پانی پر اور اس کے چھاپے پر لعنت! صاحب دیوان کو اس طرح یاد کرنا، جیسے کوئی کتے کو آواز دے۔ ہر کاپی دیکھتا رہا ہوں۔ کاپی نگار اور تھا، متوسط جو کاپی میرے پاس لایا کرتا تھا، وہ اور تھا۔ اب جو دیوان چھپ چکے، حق التصنیف ایک مجھ کو ملا۔ غور کرتا ہوں تو وہ الفاظ جوں کے توں ہیں۔ یعنی کاپی نگار نے نہ بنائے۔ ناچار غلط نامہ لکھا۔ بہرحال خوش و ناخوش کئی جلدیں مول لوں گا۔ نہ میں خوش ہوا ہوں، نہ تم خوش ہو گے۔"[۳]

۴۔ ذی الحج ۱۲۷۸ھ/جون ۱۸۶۲ء

مطبع احمدی کے مطبوعہ نسخہ کی غلطیوں پر سر پیٹنے کے بعد غالب نے اس کی غلطیوں کو

درست کیا اور مطبع احمدی کے مالک مولوی محمد حسین خاں کو کسی دوسرے مطبع میں چھپوانے کے لئے دیا جسے انہوں نے مطبع نظامی کانپور بھیجا۔

مولوی محمد حسین خاں کو خط میں کہا ہے۔

"دو رات دن کی محنت میں، میں نے اس نسخہ کو صحیح کیا ہے...... کس واسطے کہ اب یہ کتاب، اور مطبع میں چھاپی جائے گی۔ یہ مجلد گویا مسودہ ہے، اسی کو بھیج دیجئے"۔[۴]

غالب کا تصحیح کردہ مطبع احمدی کا یہ مطبوعہ نسخہ حیدرآباد میں اسٹیٹ سنٹرل لائبریری میں محفوظ ہے۔ محمد حسین خاں کی معرفت یہ تصحیح شدہ نسخہ محمد عبدالرحمن مالک مطبع نظامی کانپور کو موصول ہوا اور انہوں نے اپنے اہتمام میں دیوان کا چوتھا ایڈیشن شائع کیا۔ یہ ایڈیشن ۲۱ سطری مسطر کے ۱۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں نواب ضیاء الدین خاں کی تقریظ موجود نہیں ہے۔ آخری صفحہ پر مہتمم مطبع کی جانب سے یہ عبارت طبع ہوئی ہے۔

"بخدمت ارباب سخن عرض کرتا ہے امیدوار رحمت و غفران محمد عبدالرحمن بن حاجی محمد روشن خاں طیب اللہ ثراہ کہ اس سے پہلے دیوان بلاغت نشان جناب نواب اسداللہ خاں غالب کا دہلی میں چھپا لیکن بہ سبب سہو ونسیان کے بعد مقام میں تغیر وتبدل ہوا۔ اس لئے جناب مجمع لطف بیکراں محمد حسین خاں صاحب دہلوی نے بعد نظر ثانی اور تصحیح جناب مصنف کے ایک نسخہ میرے پاس بھیجا۔ میں نے باقضال ایزدی مطابق اس نسخہ کے ذی الحجہ ۱۲۷۸ ہجری مطبع نظامی واقع شہر کانپور میں صحت تمام اور درستی کمال سے چھاپا۔ امید کہ جب ناظرین اس کے مطالعہ سے حلاوت سخن کی پائیں، مہتمم کو دعائے خیر سے یاد فرمائیں"۔

آخر میں خواجہ طالب حسین طالب کا قطعہ تاریخ درج ہے۔

کیا ہی دیوان چھپا غالب کا
دیکھ کر سب نے کہا خوب ہے یہ
بسکہ کے ہر ایک مرغوب ہوا
ٹھہری تاریخ کہ مرغوب ہے یہ

۱۲۷۸ھ

گذشتہ نسخہ سے اس میں درج ذیل ۶ شعر زیادہ ہیں۔ اس طرح یہ نسخہ ۱۸۰۲ اشعار پر مشتمل ہے۔

کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

دل سے نکلا، پہ نہ نکلا دل سے
ہے ترے تیر کا پیکان عزیز
تاب لاتے ہی بنے گی، غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز
بہت سہی غم گیتی، شراب کم کیا ہے
غلام ساقی کوثر ہوں، مجھ کو غم کیا ہے
تمہاری طرز و روش جانتے ہیں ہم کیا ہے
رقیب پر ہے اگر لطف، تو ستم کیا ہے
سخن میں خامہ غالب کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

۵۔ ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء

مطبع مفید خلایق آگرہ باہتمام منشی شیونرائن آرام۔ یہ پانچویں اشاعت مطبع احمدی کے اغلاط سے بھرے ۱۸۶۱ء کے نسخہ کی اگرچہ نقل ہے لیکن شیونرائن نے اپنے مطبوعہ نسخہ میں تصحیح کا خاص خیال رکھا ہے۔

غلام رسول مہر کو اس اشاعت کا علم نہیں تھا۔ انہوں نے اس سے بے خبری کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ "منشی شیونرائن صاحب بھی طباعت شروع کر چکے ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے چھاپا مکمل کیا یا نہ کیا"۔[۵]

غلام رسول مہر نے دیوان غالب کی اشاعتوں کے تعلق سے جو اطلاعات دی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے دوسروں کے بیانات پر اکتفا کیا ہے اور خود ان اشاعتوں کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا ہے۔ انہوں نے کہا ہے "(دیوان) پہلی بار ۱۲۵۴ھ (۴۳-۱۸۴۲ء) میں چھپا تھا۔ اس دیوان کے کل ۱۰۷۲ شعر تھے۔ دوسرا ایڈیشن ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) میں چھپا۔ اس نسخہ میں ۱۷۹۳ شعر تھے"۔[۶] جب کہ یہ دونوں اطلاعات درست نہیں ہیں۔ ۱۲۵۴ھ کی ۱۸۴۲ء اور ۱۸۴۳ء سے مطابقت بھی صحیح نہیں ہے۔

مالک رام کے مطابق "اس نسخہ کی ترتیب دوسرے نسخوں سے مختلف اور بالکل اس قلمی دیوان کی ہے جو غالب نے لکھوا کر رامپور بھیجا تھا اور جس کی نقل سے یہ شائع ہوا۔ اس کا سائز 1/2 10"x 1/2 6" (3/4 8" x 5") ہے۔ اس کا سرورق بھی پھولوں سے مزین ہے۔ اس

کی پیشانی پر لکھا ہے "العلم القوۃ"۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بعد غالب کا اپنا فارسی دیباچہ صفحہ ۳ تک چلا گیا ہے۔ اس کے بعد دیوان صفحہ ۴ سے شروع ہوتا ہے۔ سب سے پہلے قطعات ہیں۔ عنوان کی عبارت کسی جگہ نہیں ملتی۔ البتہ بعض جگہ لفظ "قطعہ" لکھا گیا ہے۔ قطعات صفحہ ۱۲ پر ختم ہوتے ہیں۔ اس کے صفحہ ۱۳ سے ۱۵ تک آموں والی مثنوی ہے۔ اس پر بھی صرف "مثنوی" کا لفظ دیا ہے۔ صفحہ ۱۵ سے جہاں مثنوی ختم ہوتی ہے' قصیدوں کا آغاز ہے۔ یہ معروف چاروں قصیدے ہیں اور صفحہ ۲۶ پر ختم ہوتے ہیں۔ صفحہ ۲۷ سے ۱۳۹ تک غزلیات ہیں اور ان کے بعد صفحہ ۱۴۲ تک وہی ۱۶ رباعیاں درج ہیں۔ خاتمہ میں نواب ضیاء الدین احمد خاں کی تقریظ ہے صفحہ ۱۴۲ تا ۱۴۶۔ کاتب اچھا خوشخط ہے۔ پوری کتاب پندرہ سطری مسطر پر لکھی گئی ہے اور اس میں ۱۷۹۵ اشعر ہیں۔ یعنی مطبع احمدی والے نسخہ سے ایک کم۔ مندرجہ ذیل شعر غالباً سہواً کتابت ہونے سے رہ گیا ہے۔[۷]

مقطع سلسلہ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزم سیر نجف و طوف حرم ہے ہم کو

۱۸۶۳ء کی کس تاریخ کو یہ دیوان شائع ہوا' اس کی وضاحت نہیں ملتی لیکن مرزا کے بعض خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ جون ۱۸۶۳ء سے پہلے اس کی اشاعت عمل میں نہیں آئی تھی۔ سید بدر الدین احمد کاشف المعروف بہ فقیر کو جون ۱۸۶۳ء کے خط میں انہوں نے لکھا ہے "رہا دیوان' اگر ریختہ کا منتخب کہیے تو وہ اس عرصہ میں دلی اور کانپور دو جگہ چھاپا گیا اور تیسری جگہ آگرے میں چھپ رہا ہے"۔[۸]

۶۔ "نگارستان سخن" کے نام سے ایک کتاب میرے ذخیرہ میں محفوظ ہے۔ اس میں ذوق' غالب اور مومن کے دیوان یکجا طور پر شائع کیے گئے ہیں۔ یہ مجموعہ انتخاب دواوین مطبع احمدی شاہدرہ دہلی سے ۲۷ صفر ۱۲۷۹ھ مطابق اگست ۱۸۶۲ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کے پہلے صفحے پر تحریر ہے "حسب فرمائش لالہ جے نرائن صاحب در مطبع "مطبع العلوم" سنٹ سٹیفنز کالج دہلی باہتمام قاسم علی طبع" اور آخری صفحہ پر حسب فرمائش لالہ جے نرائن صاحب سوداگر کتب در مطبع احمدی واقع شاہدرہ باہتمام عموجان طبع شد کے علاوہ مزید تحریر ہے "در خدمت ہمہ صاحبان عرض است کہ سہ جزو کتاب ہذا از جانب شروع در مطبع دیگر اولا طبع شدہ بود و بعد از سہ جزو تا تمام در مطبع بندہ طبع گردید۔ فقط الراقم بندہ اموجان مہتمم مطبع احمدی"۔

یہ مطبوعہ نسخہ ۷۶ اصفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ پر تینوں شاعروں کا کلام تین کالموں میں ترچھے طور پر چھاپا گیا ہے۔ غالب کا درمیان میں اور ذوق و مومن کا کلام دائیں اور بائیں نقل

ہے۔ صفحہ ۱۶۴ تک یہی ترتیب قائم ہے۔ اس صفحہ پر ذوق کا کلام ختم ہو گیا ہے اور نیچے یہ عبارت درج ہے۔

"الحمد للہ والمنہ کہ بیمن تائیدایز دمنان انتخاب دیوان ہرسہ شعرای جادو بیان شہسواران عرصہ سخن دانی شہر یاران شہرستان نکتہ دانی کہ گوئی سبقت از قدما و متاخرین ربودہ وعلم استادی درمیدان فصاحت و بلاغت از فراشتہ اند۔ اولا کلام معجز نظام خداوند سخن خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق اوستاد حضور والا۔ ثانیا طوطی شکرستان معانی چراغ افروز شبستان زبان دانی نجم الدولہ دبیر الملک میرزا اسداللہ خان غالب نظام جنگ بہادر۔ ثالثا فلاطون دوران سحبان زمان حکیم محمد مومن خان متخلص بہ مومن درین چند اوراق حسب فرمائش لالہ جی نرائن صاحب سوداگر کتب در مطبع احمدی واقع شاہدرہ دھلی بحسن اہتمام میرزا امو جان حلیہ انطباع پوشید۔ بتاریخ بست ہفتم صفحہ ۱۲۷۸ ہجری تمام شد"۔

اس کے بعد اسی طرح ترچھے طور پر مومن وغالب کے ساتھ ذوق کے بجائے ظہیر کا کلام شامل کیا گیا ہے اور یہ مجموعہ صفحہ ۱۶۴ سے ۱۷۶ تک غالب مومن اور ظہیر کے کلام سے آراستہ ہے۔

مطبع احمدی سے جون ۱۸۶۱ء کی اشاعت کے سال بھر بعد ہی یہ دوسرا ایڈیشن نکلا تھا' جس میں غالب کے ساتھ ذوق اور مومن کا کلام بھی شامل تھا۔ مطبع احمدی کی پہلی اشاعت کی طرح یہ مجموعہ بھی اغلاط سے بھرا ہوا ہے اور تصحیح متن کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔

غالب کے ساتھ ایک افسوسناک پہلو یہ رہا کہ ان کے اردو دیوان کا کوئی ایڈیشن ان کے حسب دلخواہ شائع نہیں ہوا۔ وہ ۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۷ء کے مطبوعہ نسخوں سے بہت غیر مطمئن اور ان کی غلطیوں سے بہت دل برداشتہ تھے۔ ان کے خطوط کی روشنی میں غلام رسول مہر' مالک رام اور دوسرے تذکرہ نگاروں نے اردو دیوان کی بعد کی اشاعتوں کے تعلق سے تقریبا یکساں درج ذیل باتیں کہی ہیں۔

۱۸۶۰ء میں غالب کو دیوان کا نیا ایڈیشن چھاپنے کا خیال پیدا ہوا۔ مئی ۱۸۵۷ء میں اپنے اردو دیوان کا ایک نسخہ خوشخط لکھوا کر انہوں نے نواب یوسف علی خاں والی رامپور کے لئے بھیجا تھا۔ جنوری ۱۸۶۰ء میں وہ رامپور گئے تو اس کی ایک نقل لے کر نواب ضیاء الدین خاں کی فرمائش کے مطابق ان کے پاس ارسال کر دی۔ رامپور ہی میں تھے کہ عظیم الدین میرٹھی نے اردو دیوان کے چھاپنے کی اجازت کے لئے خط لکھا۔ واپسی پر وہ میرٹھ پہنچے تو منشی ممتاز علی خاں صاحب جو غالب کے عزیز دوست تھے' عظیم الدین کے سفارشی بن گئے اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ [illegible] دیکھنے کا ذمہ اٹھا لیا۔ غالب راضی ہو گئے اور دہلی پہنچ کر نواب ضیاء الدین

خاں والا قلمی نسخہ نواب مصطفیٰ خاں کے پاس میرٹھ بھیج دیا۔ عظیم الدین نے دیوان کا چھاپا ابھی شروع نہیں کیا تھا کہ منشی شیونرائن صاحب اکبر آبادی نے دیوان کے لئے اصرار کیا اور کہا کہ بڑے اہتمام سے اسے اپنے مطبع میں چھاپوں گا۔ غالب نے تقاضہ کر کے دیوان عظیم الدین سے واپس لے لیا اور منشی شیونرائن کے پاس آگرہ بھیج دیا۔ وہاں بھی اس کی اشاعت میں تاخیر ہوئی تو دلی میں محمد حسین خاں صاحب کے مطبع احمدی میں دیوان چھپوالیا۔

مگر یہ ایڈیشن اتنا غلط چھپا کہ مرزا نے خود ایک نسخہ کی نظر ثانی و تصحیح کر کے مطبع احمدی کے مالک محمد حسین خاں کو دیا جنہوں نے اسے محمد عبدالرحمٰن خاں مہتمم مطبع نظامی کانپور کے پاس بھیج دیا۔ اس دوران میں منشی شیونرائن بھی دیوان کا چھاپا شروع کر چکے تھے۔ لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ دیوان دہلی اور کانپور دو جگہ سے شائع ہو گیا ہے تو انہوں نے اس کا چھاپا کچھ دنوں کے لئے ملتوی کر دیا اور آخر اسے اگلے برس ۱۸۶۳ء میں پورا کر کے شائع کیا۔ وہ دیوان کے ساتھ مرزا کی تصویر بھی چھاپنا چاہتے تھے چنانچہ غالب نے اپنی قلمی تصویر ان کی نذر کی تھی۔ مگر ان کے شائع کردہ دیوان کے ساتھ تصویر نہیں چھپی ہے۔[9]

منشی شیونرائن جن کے مطبع سے غالب کا دیوان ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا ہے' ان کے پاس دراصل غالب نے اپنا دیوان ۱۸۶۰ء کے شروع میں چھپنے کے لئے بھیجا تھا' لیکن اس کی طباعت میں تاخیر سے غالب کو غلط فہمی ہوئی کہ شاید مطبع اسے چھاپنا نہیں چاہتا ہے اسی لئے انہوں نے اسے دہلی میں چھپوایا۔ لیکن پہلی دو اشاعتوں کی طرح یہ تیسری اشاعت بھی غلطیوں سے بھری ہوئی تھی۔ بلکہ اس اشاعت نے انہیں اور زیادہ بدحظ کیا تھا۔ ان کے خطوط میں اس کی خراب چھپائی اور اغلاط کا ذکر ہے۔ انہوں نے مطبع احمدی کے مالک محمد حسین ہی کی معرفت اسے جون ۱۸۶۲ء میں مطبع نظامی کانپور سے چھپوانے کا اہتمام کیا۔ یہ سب تفصیل غالب نے خود اپنے خط میں تحریر کی ہے۔

اصل میں دیوان کے میرٹھ سے چھپنے کی خبر سن کر شیونرائن نے بربنائے تعلق غالب سے ان کے مطبع کے ہوتے ہوئے دوسری جگہ چھپنے کی شکایت کی تھی۔ اس کے جواب میں اپریل ۱۸۶۰ء کو غالب نے وضاحت کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"دیوان کے میرٹھ میں چھاپے جانے کی حقیقت سن لو' تب کچھ کلام کرو۔ میں رامپور میں تھا کہ ایک خط پہنچا۔ سرنامہ پر لکھا تھا "عرضداشت عظیم الدین احمد من مقام میرٹھ"' واللہ باللہ اگر میں جانتا ہوں کہ عظیم الدین کون ہے اور کیا پیشہ رکھتا ہے۔ بہرحال پڑھا۔ معلوم ہوا کہ ہندی دیوان اپنی سوداگری اور فائدہ اٹھانے کے واسطے چھاپا چاہتے ہیں۔ خیر' چپ ہو رہا۔ جب میں رامپور سے میرٹھ آیا۔ بھائی مصطفیٰ خاں صاحب کے ہاں اترا۔ وہاں منشی ممتاز علی

صاحب میرے دوست قدیم مجھ کو ملے' انہوں نے کہا کہ اپنا اردو کا دیوان مجھ کو بھیج دیجئے گا۔ عظیم الدین ایک کتب فروش' اس کو چھاپنا چاہتا ہے۔ اب تم سنو! دیوان ریختہ اتم واکمل کہاں تھا؟ مگر ہاں میں نے غدر سے پہلے لکھوا کر نواب یوسف علی خاں بہادر کو رامپور بھیج دیا تھا۔ اب جو میں دلی سے رامپور جانے لگا تو بھائی ضیاء الدین خاں صاحب نے مجھ کو تاکید کر دی تھی کہ تم نواب صاحب کی سرکار سے دیوان اردو لے کر اس کو کسی کاتب سے لکھوا کر مجھ کو بھیج دینا۔ میں نے رامپور میں کاتب سے لکھوا کر بہ سبیل ڈاک ضیاء الدین خاں کو دلی بھیج دیا تھا۔

آمدم برسر مدعائے سابق۔ اب جو منشی ممتاز علی صاحب نے مجھ سے کہا تو مجھے کہتے بن آئی کہ اچھا' دیوان تو میں ضیاء الدین خاں سے لے کر بھیج دوں گا' مگر کاپی کی تصحیح کا ذمہ کون کرتا ہے؟ نواب مصطفیٰ خاں نے کہا کہ "میں"۔ اب کہو میں کیا کرتا؟ دلی آ کر ضیاء الدین خاں سے دیوان لے کر ایک آدمی کے ہاتھ نواب مصطفیٰ خاں کے پاس بھیج دیا۔ [۱۰] اگر میں اپنی خواہش سے چھپواتا تو اپنے گھر کا مطبع چھوڑ کر پرائے چھاپے خانہ میں کتاب کیوں بھجواتا؟ آج اسی وقت میں نے تم کو یہ خط لکھا اور اسی وقت بھائی مصطفیٰ خاں صاحب کو ایک خط بھیجا ہے اور ان کو لکھا ہے "اگر چھاپا شروع نہ ہوا ہو' تو نہ چھاپا جائے اور دیوان جلد میرے پاس بھیجا جائے"۔ اگر دیوان آیا تو فوراً تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ اور اگر وہاں کاپی شروع ہو گئی ہے تو میں ناچار ہوں' میرا کچھ قصور نہیں ہے اور اگر سرگذشت کو بھی سن کو مجھ کو گنہگار ٹھہراؤ' تو اچھا' میرا بھائی' میری تقصیر معاف کیجیو۔ رمضان اور عید کا قصہ لگا ہوا ہے۔ یقین ہے کہ کاپی شروع نہ ہوئی ہو اور دیوان میرے پاس آئے اور تم کو پہنچ جائے"۔ [۱۱]

دوشنبہ ۲۵ جون ۱۸۶۰ء کے خط میں انہیں لکھتے ہیں۔

"میں تمہارا گنہگار ہوں۔ تمہاری کتاب میں نے دبا رکھی ہے۔ بڑی کوشش اور محنت سے اس کو وہاں نہ چھپنے دیا اور منگوا لیا۔ آج پیر کے دن پچیس جون کو پارسل کی ڈاک میں روانہ کیا ہے۔ لو اب میری تقصیر معاف کرو اور مجھ سے راضی ہو جاؤ اور اپنی رضامندی کی مجھے اطلاع دو۔

یہ کتاب یعنی دیوان ریختہ تم کو میں نے دے ڈالا۔ اب اس کے مالک تم ہو۔ میں نہیں کہتا کہ چھاپو' میں نہیں کہتا کہ نہ چھاپو' جو تمہاری خوشی ہو سو کرو۔ اگر چھاپو تو بیس جلد کا خریدار مجھ کو لکھ لو' اور اچھا۔ میرم میاں' ذرا تصحیح کا بہت خیال رکھیو"۔ [۱۲]

سہ شنبہ ۳ جولائی ۱۸۶۱ء کو لکھتے ہیں۔

"تمہاری باتوں پر ہنسی آتی ہے۔ یہ دیوان جو میں نے تم کو بھیجا ہے' اتم واکمل ہے۔ وہ اور کونسی دو چار غزلیں ہیں جو مرزا یوسف علی خاں عزیز کے پاس ہیں اور اس دیوان میں نہیں؟

اس طرف سے آپ اپنی خاطر جمع رکھیں کہ کوئی مصرع میرا اس دیوان سے باہر نہیں۔ معہذا ان سے بھی کہوں گا اور وہ غزلیں ان سے منگا کر دیکھ لوں گا۔ تصویر میری لے کر کیا کرو گے؟ بیچارہ عزیز کیوں کر کھنچوا سکے گا؟ اگر ایسی ہی ضرورت ہے تو مجھ سے کہو' میں مصور سے کھنچوا کر بھیج دوں۔ نہ نذر درکار نہ نیاز۔ میں تم کو اپنے فرزندوں کے برابر چاہتا ہوں اور شکر کی جگہ ہے کہ تم فرزند سعادتمند ہو۔ خدا تم کو جیتا رکھے اور مطالب عالیہ کو پہنچائے"۔[۱۳]

۱۰ جنوری ۱۸۶۲ء کو ایک اور خط میں لکھا ہے۔

"میں جانتا ہوں کہ مولوی میر نیاز علی صاحب نے وکالت اچھی نہیں کی۔ میرا مدعا یہ تھا کہ وہ تم پر اس امر کو ظاہر کریں کہ دلی میں ہندی دیوان کا چھپنا پہلے اس سے شروع ہو جائے کہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب تمہارا بھیجا ہوا فرما مجھ کو دیں اور وہ جو میں نے یہاں کے مطبع میں چھاپنے کی اجازت دی تھی' یہ سمجھ کر دی تھی کہ اب تمہارا ارادہ اس کے چھاپنے کا نہیں۔ غور کرو میرٹھ کے چھاپے خانے والے محمد عظیم نے کس عجز و الحاح سے دیوان لیا تھا اور میں نے نظر تمہاری ناخوشی پر بہ جبر اس سے پھیر لیا۔ یہ کیوں کر ہو سکتا تھا کہ اور کو چھاپنے کی اجازت دوں؟ تم نے جو خط لکھنا موقوف کیا' میں سمجھا کہ تم خفا ہو۔ میں نے مولوی نیاز علی صاحب سے کہا کہ برخوردار شیو نرائن سے میری تقصیر معاف کروا دینا۔

بھائی' خدا کی قسم میں تم کو اپنا فرزند دلبند سمجھتا ہوں۔ اس دیوان اور تصویر کا ذکر کیا ضرور ہے؟ رامپور سے وہ دیوان صرف تمہارے واسطے لکھوا کر لایا۔ دلی میں تصویر ہزار جستجو بہم پہنچا کر مول لی اور دونوں چیزیں تم کو بھیج دیں۔ وہ تمہارا مال ہے چاہو اپنے پاس رکھو' چاہے کسی کو دے ڈالو' چاہو پھاڑ کر پھینک دو۔ تم نے دستنبو کی جدول اور جلد بنوا کر ہم کو سوغات بھیجی تھی۔ ہم نے اپنی تصویر اور اردو کا دیوان تم کو بھیجا۔ میرے پیارے دوست ناظر بنسی کی تم یادگار ہو۔

اے گل بہ تو خرسند' تو بوے کسے داری"۔[۱۴]

منشی شیو نرائن کے نام غالب کے لکھے ہوئے ۳۶ خط محفوظ ہیں۔ ان کی ایک ایک سطر سے مہر و محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کے یہ تعلقات نئے نہیں تھے۔ دونوں خاندانوں میں سو سوا سو برس سے وداد باہمی اور مخلصانہ و عزیزانہ مراسم چلے آرہے تھے۔ ۳ مئی ۱۸۶۳ء کے خط میں غالب نے اس قدیم تعلق پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے۔

"برخوردار منشی شیو نرائن کو دعا کے بعد معلوم ہو' تصویر پہنچی' تحریر پہنچی۔ سنو میری عمر ستر برس کی ہے اور تمہارا دادا میرا ہم عمر اور ہم باز تھا اور میں نے اپنے نانا صاحب' خواجہ غلام حسین مرحوم سے سنا کہ تمہارے پردادا کو اپنا دوست بتاتے تھے اور فرماتے تھے کہ میں بنسی دھر کو اپنا فرزند سمجھتا ہوں۔ غرض اس بیان سے یہ ہے کہ سو سوا سو برس کی ہماری تمہاری ملاقات ہے۔"[۱۵]

خاندانی تعلقات کے علاوہ سیوزرائن آرام غالب کے شاگرد بھی تھے۔ غالب کی کتاب دستنبو کا پہلا ایڈیشن بھی ان کے مطبع مفید خلایق آگرہ سے نومبر ۱۸۵۸ء میں چھپا تھا۔

غالب کی زندگی میں اردو دیوان کے جو ایڈیشن نکلے ان میں ۱۸۴۱ء کی اشاعت کا عکسی ایڈیشن کالی داس رضا گپتا نے اپنے پیش لفظ کے ساتھ ول پبلیکیشنز بمبئی سے ۱۹۸۶ء میں شائع کر کے اپنی ادب دوستی اور غالب نوازی کا اظہار کیا ہے۔ اس کی رونمائی مداحان غالب کے لئے باعث مسرت ہے۔

مطبع دارالسلام کے ۱۸۴۷ء کے اڈیشن کا متن درس غالب کے نام سے پیرزادہ ابراہیم محمد حنیف نے اردوئے معلیٰ اکادمی لاہور سے ۱۹۳۸ء میں شائع کیا تھا۔

مطبع نظامی کانپور کا جون ۱۸۶۲ء کا اڈیشن نسبتاً زیادہ صحیح ہونے کی بنا پر محققین غالب کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ سب سے پہلے اس کا متن مالک رام نے قاضی معزالدین کے آزاد کتاب گھر، کلاں محل دہلی سے پہلی بار مارچ ۱۹۵۷ء میں شائع کیا تھا۔ ان کا مرتبہ یہ متن آزاد کتاب گھر سے دوسری بار ۱۹۶۰ء میں طبع ہوا۔ صدی ایڈیشن کے طور پر اسی مکتبہ سے ۱۹۶۹ء میں اس کی تیسری اشاعت عمل میں آئی۔ مالک رام کا مرتبہ یہ متن غالب صدی ہی کے موقع پر "صد سالہ یادگار غالب کمیٹی دہلی" سے بھی فروری ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ لاہور میں ۱۹۷۶ء میں چھپنے کے علاوہ غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی سے بھی ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔

مولانا حامد علی نے بھی اس متن کی تصحیح کے فرائض انجام دیئے ہیں اور یہ مجلس یادگار غالب پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ۱۹۶۹ء اور ۱۹۸۰ء میں چھپا ہے۔ الفیصل لاہور سے بھی ۱۹۹۵ء میں اس کی ایک اشاعت نکلی ہے۔ ۱۸۶۲ء اور بالخصوص حامد علی خاں کے مصحح نسخہ کو پروفیسر نورالحسن نقوی کے مقدمہ کے ساتھ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ نے ۱۹۸۰ء، ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۶ء میں شائع کیا ہے۔

پروفیسر احتشام حسین نے مطبع نظامی ۱۸۶۲ء کے متن کا ایک پاکٹ ایڈیشن پہلے تنظیم پریس لکھنؤ سے جنوری ۱۹۵۸ء میں اور دوبارہ کتاب نگر لکھنؤ سے ۱۹۷۲ء میں چھپوایا تھا۔ غالب اکاڈمی نئی دہلی سے حکیم عبدالحمید کے اہتمام میں ۱۹۹۳ء میں جو خوبصورت اڈیشن شائع ہوا ہے، وہ بھی مطبع نظامی کانپور کے متن کی بنیاد پر ہے۔ فضلی سنز کراچی کے دسمبر ۱۹۹۷ء کے دیوان کے لئے بھی ۱۸۶۲ء کے مطبوعہ نسخہ کو بنیاد بنایا گیا ہے۔

کالی داس رضا گپتا نے ایک بڑا کام یہ کیا کہ ۱۸۴۱ء کے مطبوعہ نسخہ کی طرح ۱۸۶۲ء کے نظامی پریس کے مطبوعہ نسخہ کا عکسی ایڈیشن بھی ول پبلیکیشنز بمبئی سے جنوری ۱۹۸۷ء میں شائع کر دیا۔ ۱۸۴۱ء اور ۱۸۶۲ء کے نایاب مطبوعہ نسخوں کی ان کی فراہم کردہ عکسی اشاعتیں قدر

دانوں سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔

میرے ذخیرہ کتب میں غالبیات سے متعلق ۷۰۰ کے قریب کتابیں اور یادگاری مجلات محفوظ ہیں۔ ایک روز تسلیم احمد تصور نے مجھے ٹیلیفون کر کے فرمائش کی کہ اگر غالب سے متعلق کوئی یادگار چیز میرے ذخیرہ میں ہو تو وہ اسے طبع کرنے کے خواہشمند ہیں۔ میں نے ۱۸۶۳ء کے مطبوعہ نسخہ کی موجودگی کا تذکرہ کیا' انہوں نے اس کی عکسی اشاعت کے لئے اصرار اور دلی مسرت کا اظہار کیا۔ ان کی شدید خواہش اور شوق بے پایاں کا احترام کرتے ہوئے سورج لاہور کے زیر اہتمام اس کا عکسی ایڈیشن پیش کیا جا رہا ہے۔

تسلیم احمد تصور نے غالبیات میں بڑے قیمتی اضافے کئے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف سورج کے دو ضخیم غالب نمبر نکالے ہیں' بلکہ غالب میموریل ٹرسٹ کے ذریعے غالب کے بارے میں بہت سے نئے منصوبے ان کے پیش نظر ہیں۔ ان میں غالب کے کل فارسی کلام کا ترجمہ و شرح' غالب کے معاصرین' متعلقین اور تلامذہ کی توضیحی فہرست' عالمی سطح پر ہونے والے غالب پر کام کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ' نوادرات غالب کی جمع آوری اور غالب میوزیم کا قیام' انٹرنیٹ پر غالب کے فن' کلام' زندگی اور کتب پر ویب سائٹ اور غالب ونڈوز پر فراہمی' غالب پر کمپیوٹرائزڈ مواد' غالب کے بارے میں ہندوستانی و پاکستانی فلموں اور تمام ٹی وی اور تھیٹر ڈراموں کی سی ڈیز پر منتقلی وغیرہ شامل ہیں۔

۱۸۶۳ء کے اڈیشن کی اس عکسی اشاعت کے ذریعہ غالب دوستوں کو غالب کی وفات سے ۶ برس پہلے چھپنے والے دیوان کی زیارت کا موقع ملے گا اور ذخیرہ غالبیات میں اسے ایک قیمتی اضافہ سمجھا جائے گا۔

سید ظل الرحمٰن

۱۶راپریل ۲۰۰۶

ابن سینا اکاڈمی۔ علی گڑھ

مآخذات

۱۔ ذکرِ غالب' مالک رام صفحہ ۱۳۱ مکتبہ جامعہ نئی دہلی' اکتوبر ۱۹۵۰ء

۲۔ علی گڑھ میگزین غالب نمبر ۴۹' ۱۹۴۸ء مضمون امتیاز علی عرشی صفحہ ۱۱۱

۳۔ غالب کے خطوط' مرتبہ خلیق انجم' جلد دوم۔ صفحہ ۵۳۱' انجمن ترقی اردو کراچی۔ ۱۹۸۹ء

۴۔ غالب کے خطوط' جلد۴۔ صفحہ۱۴۷۳

۵۔ غالب' غلام رسول مہر صفحہ۳۸۹۔ علمی پرنٹنگ پریس' لاہور

۶۔ ایضاً۔ صفحہ نمبر۳۸۶

۷۔ دیوانِ غالب مرتبہ مالک رام۔ صفحہ۳۰' آزاد کتابت گھر' دہلی۔ ۱۹۶۹ء (صدی ایڈیشن)

۸۔ غالب کے خطوط۔ جلد۳' صفحہ۱۰۴۴

۹۔ ذکرِ غالب مالک رام۔ صفحہ۱۲۳۔ غالب' غلام رسول مہر صفحہ۳۸۶

۱۰۔ غالب نے یہ دیوان جن صاحب کے ذریعے بھیجا تھا ان کا نام سکندر شاہ تھا۔ یوسف مرزا کے نام خط میں انہوں نے کہا ہے میرا اردو دیوان میرٹھ گیا۔ سکندر شاہ لے گئے' مصطفی خاں کو دے آئے۔ ڈاک میں اس کی رسید آ گئی۔ غالب کے خطوط جلد۲' صفحہ۸۳۷

۱۱۔ غالب کے خطوط جلد۳' صفحہ۱۰۸۱

۱۲۔ ایضاً۔ صفحہ۱۰۸۳

۱۳۔ ایضاً۔ صفحہ۱۰۸۳

۱۴۔ ایضاً۔ صفحہ۱۰۸۴

۱۵۔ ایضاً۔ صفحہ۱۰۸۵

۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم
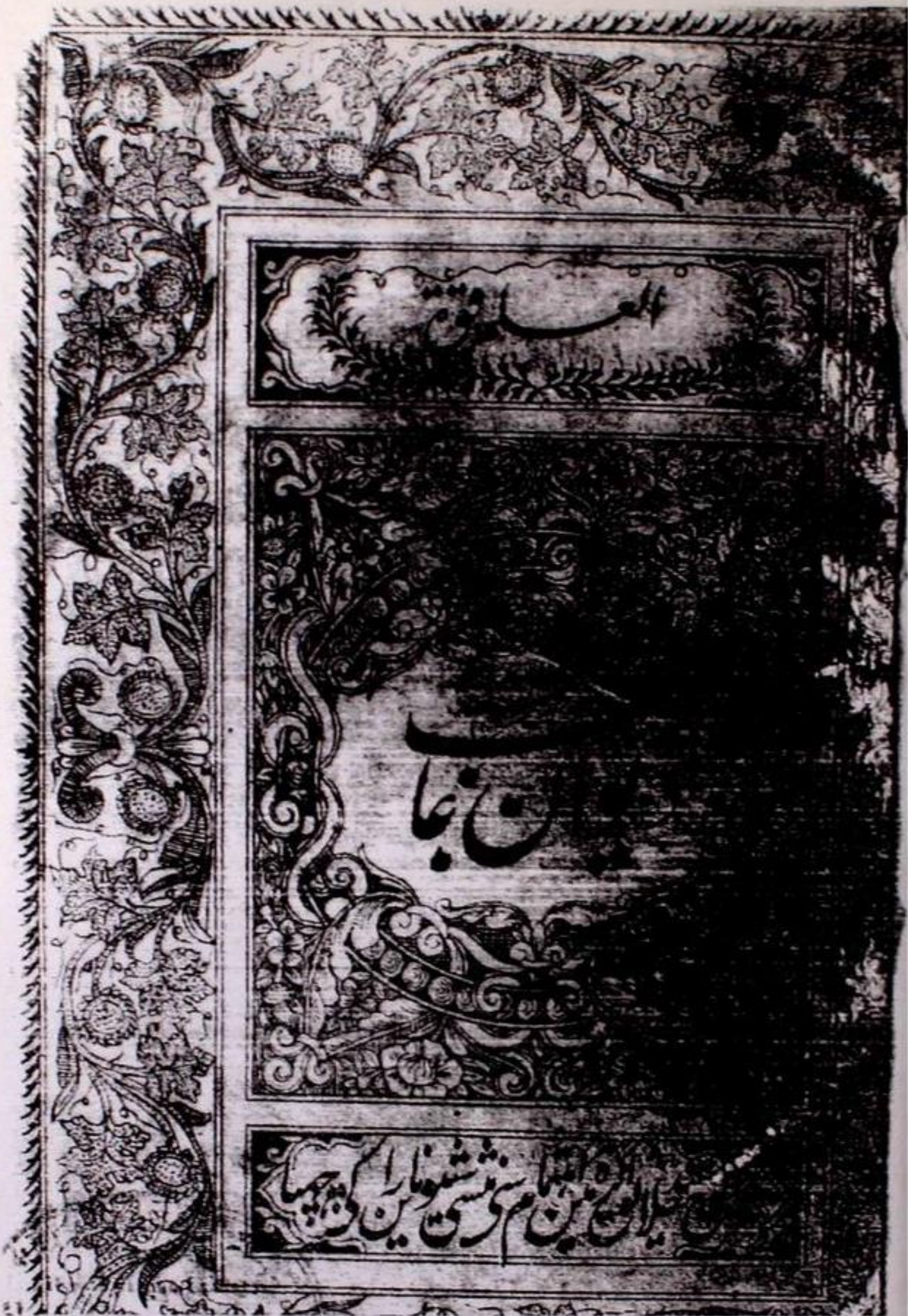
مشام شمیم آشنایان را صلای تماشا و انجمن نشینان را مژده که لختی از سامان
مجمره گردانی آماده و دامنی از عود هندی دست بهم داده است نه چوبهای
سنگ تراش خورده بهنجار نا طبعی شکسته بی اندام تراشیده بلکه به تیز نگاه خامه
بکار در ریز ریز کرده و بسوهان خراشیده ایدون نفس گداختگی شوق به جستجوی
آتش بر بار رسیست نه آتشی که در گلخنهای هند افسرده و خاموش

گسستهٔ آویختن هر آئینه بدل گداختن نیرزد و بزم افروختن را نشاید رخ آتش به چنین
برافروزنده و آتش پرست را یاد افراه هم در آتش سوزنده نیک میداند که بزوبن
در هوای آن رخشنده آذر لعل در آتش ست که بچشم روشنی هوشنگ از سنگ
برون تافته و در ایوانِ لهراسپ نشو و نما یافته نخست ازو فروغ ست و لاله را رنگ
و نرگس را چشم و گل را چراغ بخشنده یزدان درون سخن برافروز را سپاسم که شرار
آتش تابناک بخاکستر خویش یافته بکاو کاو سینه شکافته ام و از نفس دمه
باد و دودی که در آن تنگ مایه روزگاران آنمایه فراهم تواند آمد که مجمره افروز روشنائی چراغ
بود را بالِ شناسائی داغ تواند بخشید بنابر نگارش این نامه آن درست
انتخاب دیوانِ ریخته به گرد آوردن سرمایه دیوان فارسی برخیزد و باستفاضه کمال
گر در فن پیش زانوی خویشتن نشیند امید که سخن سرایانِ سخنور ستای پراگنده ابیاتی را
که ازین اوراق یابند از آثار تراوش رگِ کلک این نامه سیاه شناسند و جامه
گرد آور را در ستایش و نکوهش آن اشعار ممنون و ماخوذ نسگالند یا رب این گوی
هستی ناشنیده از نیستی به پیدائی نارسیده یعنی نقشِ ضمیر آموز نقاش که

قطعات

اى شہنشاہِ فلک منظرِ بیمثل و نظیر
اى جہاندارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل

پاوں سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ
فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکلیل

تیرا اندازِ سخن شانۂ زلفِ الہام
تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل

تجھسے عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیم
تجھسے دنیا مین بچھا مائدۂ بذلِ خلیل

بسخن اوج دہ مرتبۂ معنے و لفظ
بکرم داغ نہ ناصیۂ قلزم و نیل

ق

تا ترے وقت مین ہو عیش و طرب کی توقیر
تا ترے عہد مین ہو رنج و الم کی تقلیل

ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر
زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل

تیری دانش میری اصلاحِ مفاسد کی رہین
تیری بخشش میرے انجاحِ مقاصد کی کفیل

تیرا اقبالِ ترحم میرے جینے کی نوید
تیرا اندازِ تغافل مرے مرنے کی دلیل

بختِ ناساز نے چاہا کہ ندے مجکو امان
چرخِ کجباز نے چاہا کہ کرے مجکو ذلیل

تپ نے ڈالی ہے سر رشتۂ اوقات میں گانٹھ
پہلے ٹھونکی ہے بنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم
کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِ ثقیل

درِ معنی سے مرا صفحہ لقا کی ڈاڑھی
غمِ گیتی سے مرا سینہ عمر کی زنبیل

فکر میری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر
کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف
جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل

قبلۂ کون و مکاں خستہ نوازی میں یہ دیر
کعبۂ امن و اماں عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

قطعہ

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

مہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے
حرزِ بازوی شگرفانِ خود آرا کہیے

مسی آلودہ سر انگشتِ حسیناں لکھیے
داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے

خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیے
سرِ پستانِ پریزادے مانا کہیے

اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے
خالِ مشکینِ رخِ دلکشِ لیلا کہیے

حجر الاسودِ دیوارِ حرم کیجے فرض
نافہ آہوی بیابانِ ختن کا کہیے

وضع مین اسکو اگر سمجھیے قاف تریاق
رنگ مین سبزۂ نوخیز مسیحا کہیے

صومعے مین اسے ٹھہرائیے گر مہرِ نماز
میکدے مین اسے خشتِ خُمِ صہبا کہیے

کیون اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے
کیون اسے نقطۂ پرکارِ تمنا کہیے

کیون اسے گوہرِ نایاب تصوّر کیجے
کیون اسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہیے

کیون اسے تکمۂ پیراہنِ لیلی لکھیے
کیون اسے نقشِ پئی ناقۂ سلمی کہیے

بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

قطعہ

منظور ہی گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہین مجھے

سو پشت سے ہی پیشۂ آبا سپہگری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہین مجھے

آزادہ رو ہون اور مرا مسلک ہی صلحِ کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہین مجھے

کیا کم ہی یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہون
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہین مجھے

استادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہین مجھے

جامِ جہان نما ہی شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہین مجھے

مین کون اور ریختہ ہان اس سے مدعا
جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہین مجھے

سہرا لکھا گیا ز رہِ امتثالِ امر
دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہین مجھے

مقطع مین آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اوس سے قطعِ محبت نہین مجھے

روئے سخن کسیکی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہین جنون نہین وحشت نہین مجھے

قسمت بری سہی پہ طبیعت بری نہین
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہین مجھے

صادق ہون اپنے قول مین غالب خدا گواہ
کہتا ہون سچ کہ جھوٹ کی عادت نہین مجھے

ای شاہِ جہانگیر جہان بخش جہاندار
ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت

جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو
تو وا کرے اوس عقدے کو سو بھی باشارت

ممکن ہی کرے خضر سکندر سے ترا ذکر
گر لب کو نہ دے چشمۂ حیوان سے طہارت

آصف کو سلیمان کی وزارت سے شرف تھا
ہے فخرِ سلیمان جو کرے تیری وزارت

ہے نقشِ مریدی ترا فرمانِ الٰہی
ہے داغِ غلامی ترا توقیعِ امارت

تو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلان
تو آگ سے گر دفع کرے تابِ شرارت

ڈھونڈھے نہ ملے موجۂ دریا مین روانی
باقی نہ رہے آتشِ سوزان مین حرارت

ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی مین توغل
ہے گرچہ مجھے سحر طرازی مین مہارت

کیونکر نکرون مدح کو مین ختم دعا پر
قاصر ہے ستایش مین تری میری عبارت

نو روز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہین
نظارگیِ صنعتِ حق اہلِ بصارت

تجکو شرفِ مہرِ جہانتاب مبارک
غالب کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

اے شہنشاہِ آسمان اورنگ
اے جہاندارِ آفتاب آثار

تھا مین اک بینوائے گوشہ نشین
تھا مین اک دردمندِ سینہ فگار

تمنے مجکو جو آبرو بخشی
ہوئی میری وہ گرمیِ بازار

کہ ہوا مجہ سا ذرۂ ناچیز
روشناسِ ثوابت و سیار

گرچہ از روے ننگِ بے ہنری
ہون خود اپنی نظر مین اتنا خوار

کہ اگر اپنے کو مین کہون خاکی
جانتا ہون کہ آئے خاک کو عار

شاد ہون لیکن اپنے جی مین کہ ہون
بادشہ کا غلامِ کارگزار

خانہ زاد اور مرید اور مداح
تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

بارے نوکر بھی ہوگیا صد شکر
نسبتین ہوگئین مشخص چار

کہون آپ سے تو کس سے کہون
مدعاے ضروری الاظہار

پیر و مرشد اگرچہ مجکو نہین
ذوقِ آرایشِ سر و دستار

کچھ تو جاڑے مین چاہیے آخر
تا نہ دے بادِ زمہریر آزار

کیون نہ درکار ہو مجھے پوشش
جسم رکھتا ہون ہے اگرچہ نزار

۵

کچھ خریدا نہیں ہے ابکی سال — کچھ بنایا نہیں ہے ابکی بار

رات کو آگ اور دن کو دھوپ — بھاڑ مین جائین ایسے لیل و نہار

آگ تاپے کہان تلک انسان — دھوپ کھاوے کہان تلک جاندار

دھوپ کی تابش آگ کی گرمی — وقنا ربنا عذاب النار

میری تنخواہ جو مقرر ہے — اوسکے ملنے کا ہے عجب ہنجار

رسم ہے مردے کی چھہ ماہی ایک — خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

مجھکو دیکھو کہ ہون بقید حیات — اور چھہ ماہی ہو سال مین دوبار

بسکہ لیتا ہون ہر مہینے قرض — اور رہتی ہے سود کی تکرار

میری تنخواہ مین چہارم کا — ہوگیا ہے شریک ساہوکار

آج مجھسا نہیں زمانے مین — شاعر نغز گوے خوش گفتار

رزم کی داستان گر سنیے — ہے زبان میری تیغ جوہردار

بزم کا التزام گر کیجے — ہے قلم میری ابر گوہر بار

ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد — قہر ہے گر کرو نہ مجھکو پیار

آپکا بندہ اور پھرون ننگا — آپ کا نوکر اور کھاؤن ادھار

میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ — تا نہ ہو مجھکو زندگی دشوار

میری تنخواہ کیجیے ماہ بہ ماہ — تا نہ ہو مجھکو زندگی دشوار

ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام — شاعری سے نہیں مجھے سروکار
تم سلامت رہو ہزار برس — ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

قطعہ

نصرت الملک بہادر مجھے بتلا کہ مجھے — تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے
گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے — رونقِ بزمِ مہ و مہر تری ذات سے ہے
اور میں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں — غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے
خستگی کا ہو بھلا جس کے سبب سے سرِ دست — نسبت اک گونہ مرے دل کو ترے ہات سے ہے
ہاتھ میں تیرے رہے توسنِ دولت کی عنان — یہ دعا شام و سحر قاضیِ حاجات سے ہے
تو سکندر ہے مرا فخر ہے ملنا تیرا — گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

اس پہ گزرے نہ گماں ریو و ریا کا زنہار
غالبِ خاک نشیں اہلِ خرابات سے ہے

ہے چار شنبہ آخرِ ماہِ صفر چلو — رکھ دیں چمن میں بھر کے مئے مشک بو کی ناند
جو آئے جام بھر کے پیے اور ہو کے مست — سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند
غالب یہ کیا بیاں ہے بجز مدحِ بادشاہ — بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشتہ خواند
بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلے حضور میں — ہے جن کے آگے سیم و زر مہر و ماہ ماند

یون سمجھیے کہ بیچ سے خالی کیے ہوے	لاکھون ہی آفتاب ہین و بیشمار چاند

قطعہ

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشین	اک تیر میرے سینے مین مارا کہ ہاے ہاے
وہ سبزہ زار ہاے مطرا کہ ہے غضب	وہ نازنین بتانِ خود آرا کہ ہاے ہاے
صبر آزما وہ اونکی نگاہین کہ حف نظر	طاقت ربا وہ اونکا اشارا کہ ہاے ہاے
وہ میوہ ہاے تازہ شیرین کہ واہ وا	وہ بادہ ہاے ناب گوارا کہ ہاے ہاے

قطعہ

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیرونکی وفاداری	کیا کہتے تھے تم تقریر ہم خاموش رہتے تھے
بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی جانے دو ملجاو	قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہین کیون ہم نہ کہتے تھے

قطعہ

نہ پوچھ اسکی حقیقت حضورِ والا نے	مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہون نکلتے نہ خلد سے باہر	جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

قطعہ

افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو	اوس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھولکے کھانیکو کچھ نہو	روزہ اگر نکھاے تو ناچار کیا کرے

جس کے پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو — روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

قطعہ ۱۲

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے ｜ جہان مین جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے

ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے ｜ کہ جو شریک ہو میرا شریک غالب ہے

قطعہ

سہل تھا مسہل ولے یہ سخت مشکل آ پڑی ｜ مجھ پہ کیا گذرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے

تین دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد ｜ تین مسہل تین تبریدین یہ سب کے دن ہوئے

قطعہ

خجستہ انجمن طوے میرزا جعفر ｜ کہ جسکے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محظوظ

ہوئی ہے ایسی ہی فرخندہ سال مین غالب ｜ نہ کیون ہو مادۂ سال عیسوی محظوظ

قطعہ

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی ｜ ہوا بزم طرب مین رقص ناہید

کہا غالب سے تاریخ اسکی کیا ہے ｜ تو بولا انشراح جشن جمشید

قطعہ

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہین ｜ دربار دار لوگ بہم آشنا نہین

کانون پہ ہاتھ دھرتے ہوے کرتے ہین سلام ｜ اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہین

کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام　　اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

مثنوی

ہان دلِ دردمندِ زمزمہ ساز — کیون نہ کھولے درِ خزینۂ راز

خامے کا صفحے پر روان ہونا — شاخِ گل کا ہے گلفشان ہونا

مجھسے کیا پوچھتا ہے کیا لکھیے — نکتہ ہاے خرد فزا لکھیے

بارے آمون کا کچھ بیان ہو جاے — خامہ نخلِ رطب فشان ہو جاے

آم کا کون مردِ میدان ہے — ثمر و شاخ گوے و چوگان ہے

تاک کے جی مین کیون رہے ارمان — آئے یہ گوے اور یہ میدان

آم کے آگے پیش جاوے خاک — پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک

نچلا جب کسیطرح مقدور — بادۂ ناب بنگیا انگور

یہ بھی ناچار جیکا کھونا ہے — شرم سے پانی پانی ہونا ہے

مجھسے پوچھو تمھین خبر کیا ہے — آم کے آگے نیشکر کیا ہے

نہ گل اس مین نہ شاخ و برگ نہ بار — جب خزان آئے تب ہو اُسکی بہار

اور دوڑایے قیاس کہان — جانِ شیرین مین یہ مٹھاس کہان

جان مین ہوتی گر یہ شیرینی — کوہکن باوجود غمگینی

جان دینے مین اوسکو یکتا جان — پر وہ یون سہل دے نسکتا جان
نظر آتا ہے یون مجھے یہ ثمر — کہ دواخانۂ ازل مین مگر
آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام — شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام
یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے — باغبانون نے باغِ جنت سے
انگبین کے بحکمِ رب الناس — بھرکے بھیجے ہین سربمہر گلاس
یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات — مدتون تک دیا ہے آبِ حیات
تب ہوا ہے ثمرفشان یہ نخل — ہم کہان ورنہ اور کہان یہ نخل
تھا ترنجِ زر ایک خسرو پاس — رنگ کا زرد پر کہان بوباس
آم کو دیکھتا اگر یکبار — پھینک دیتا طلائے دست افشار
رونقِ کارگاہِ برگ و نوا — نازشِ دودمانِ آب و ہوا
رہروِ راہِ خلد کا توشہ — طوبیٰ و سدرہ کا جگرگوشہ
صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم — نازپروردۂ بہار ہے آم
خاص وہ آم جو نہ ارزان ہو — نوبرِ نخلِ باغِ سلطان ہو
وہ کہ ہے والیِ ولایتِ عہد — عدل سے اوسکے ہے حمایتِ عہد
فخرِ دین عزِ شان و جاہِ جلال — زینتِ طینت و جمالِ کمال

کارفرمائے دین و دولت و بخت
چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت

سایہ اوسکا ہما کا سایہ ہے
خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے

ای مفیضِ وجود سایہ و نور
جب تلک ہے نمود سایہ و نور

اس خداوند بندہ پرور کو
وارثِ گنج و تخت و افسر کو

شاد و دلشاد و شادمان رکھیو
اور غالب پہ مہربان رکھیو

قصائد

ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بیکار
سایۂ لالۂ بیداغ سویدائے بہار

مستی باد صبا سے ہے بعرضِ سبزہ
ریزۂ شیشۂ مے جوہرِ تیغِ کہسار

سبز ہے جامِ زمرد کی طرح داغِ پلنگ
تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت روئے شرار

مستئ ابر سے گلچین طرب ہے حسرت
کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار

کوہ و صحرا ہمہ معموریٔ شوقِ بلبل
راہِ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار

سونپے ہے فیض ہوا صورتِ مژگانِ یتیم
سرنوشتِ دو جہان ابر بیک سطرِ غبار

کاٹ کر پھینکیے ناخن تو باندازِ ہلال
قوتِ نامیہ اوسکو بھی نہ چھوڑے بیکار

کفِ ہر خاک بگردون شدہ قمری پرواز
دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤس شکار

میکدے مین ہو اگر آرزوئے گل چینی
بھول جا یک قدحِ بادہ بطاقِ گلزار

موجِ گل ڈھونڈھ بخلوتکدۂ غنچۂ باغ
گم کرے گوشۂ میخانہ مین گر تو دستار

کھینچے گر مانیِ اندیشہ چمن کی تصویر
سبز مثلِ خطِ نوخیز ہو خطِ پرکار

لعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ
طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

وہ شہنشاہ کہ جسکی پئے تعمیرِ سرا
چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار

فلک العرش ہجومِ خمِ دوشِ مزدور
رشتۂ فیضِ ازل سازِ طنابِ معمار

سبزۂ نہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام
رفعتِ ہمتِ صد عارف و یک اوجِ حصار

وان کے خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرِ کاہ
وہ رہے مروحۂ بالِ پری سے بیزار

خاکِ صحرائے نجف جوہرِ سیرِ عرفا
چشمِ نقشِ قدم آئینۂ بختِ بیدار

ذرہ اوس گرد کا خورشید کو آئینۂ ناز
گرد اوس دشت کی امید کو احرامِ بہار

آفرینش کو ہے وان سے طلبِ مستیِ ناز
عرضِ خمیازۂ ایجاد ہے ہر موجِ غبار

مطلع

فیض سے تیرے ہے اے شمعِ شبستانِ بہار
دلِ پروانہ چراغان پرِ بلبل گلزار

شکلِ طاؤس کرے آئنہ خانہ پرواز
ذوق مین جلوے کے تیرے بہوائے دیدار

تیری اولاد کے غم سے ہے بروئے گردون
سلکِ اختر مین مہِ نو مژۂ گوہر بار

ہم عبادت کو ترا نقشِ قدم مہرِ نماز
ہم ریاضت کو ترے حوصلے سے استظہار

مدح مین تیرے نہان زمزمۂ نعتِ نبی
جام سے تیرے عیان بادۂ جوشِ اسرار

جوہرِ دستِ دعا آئنہ یعنی تاثیر
یکطرف نازشِ مژگان و دگر سو غمِ خار

مردمک سے ہو عزاخانۂ اقبالِ نگاہ
خاکِ در کی ترے جو چشم نہ ہو آئنہ دار

دشمنِ آلِ نبی کو بطربخانۂ دہر
عرضِ خمیازۂ سیلاب ہو طاقِ دیوار

دیدہ تا دل اسد آئینۂ یک پرتوِ شوق
فیضِ معنی سے خطِ ساغرِ راقم سرشار

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہین
ہم کہان ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبین

بیدلیہاے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بیکسیہاے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دین

ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم
لغو ہے آئنۂ فرقِ جنون و تمکین

نقشِ معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت
سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسین

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم
دُردِ یکساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دین

مثلِ مضمونِ وفا باد بدستِ تسلیم
صورتِ نقشِ قدم خاک بفرقِ تمکین

عشق بے ربطیِ شیرازۂ اجزاے حواس
وصل زنگارِ رخِ آئنۂ حسنِ یقین

کوہکن گرسنہ مزدورِ طربگاہِ رقیب
بیستون آئنۂ خوابِ گرانِ شیرین

کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز
کس نے پایا اثرِ نالۂ دلہائے حزیں

سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں لیکن
نہ سر و برگِ ستایش نہ دماغِ نفریں

کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ
یک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکیں

نقشِ لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر
یا علی عرض کر اے فطرتِ وسواس قریں

مظہرِ فیضِ خدا جان و دلِ ختمِ رسل
قبلۂ آلِ نبی کعبۂ ایجادِ یقیں

ہو وہ سرمایۂ ایجاد جہاں گرمِ خرام
ہر کفِ خاک ہے واں گردۂ تصویرِ زمیں

جلوہ پرداز ہو نقشِ قدم اوسکا جس جا
وہ کفِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی امیں

نسبتِ نام سے اوسکی ہے یہ رتبہ کہ رہے
ابداً پشتِ فلک خم شدۂ نازِ زمیں

فیضِ خلق اوسکا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا
بوئے گل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگیں

برشِ تیغ کا اوسکی ہے جہاں میں چرچا
قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں

کفر سوز اوسکا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے
رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بتخانۂ چیں

جاں پناہا دل و جاں فیض رسانا شاہا
وصیِ ختمِ رسل تو ہے بفتوائے یقیں

جسمِ اطہر کو ترے دوشِ پیمبر منبر
نامِ نامی کو ترے ناصیۂ عرش نگیں

کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب
شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں

آستاں پر ہے ترے جوہرِ آئینۂ سنگ
رقمِ بندگیِ حضرتِ جبریلِ امیں

تیرے در کے لیے اسبابِ نثار آمادہ
خاکیوں کو جو خدا نے دیے جان و دل و دیں

تیری مدحت کے لیے ہیں دل و جان کام و زبان
تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبیں

کس سے ہو سکتی ہے مداحیِ ممدوحِ خدا
کس سے ہو سکتی ہے آرائشِ فردوسِ بریں

جنسِ بازارِ معاصی اسد اللہ اسد
کہ سوا تیرے کوئی اوسکا خریدار نہیں

شوخیِ عرضِ مطالب میں ہے گستاخِ طلب
ہے ترے حوصلۂ فضل پہ از بسکہ یقیں

دے دعا کو مری وہ مرتبۂ حسنِ قبول
کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمیں

غمِ شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز
کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں

طبع کو الفتِ دلدل میں یہ سرگرمیِ شوق
کہ جہاں تک چلے اوس سے قدم اور مجھ سے جبیں

دلِ الفت نسب و سینۂ توحید فضا
نگہِ جلوہ پرست و نفسِ صدق گزیں

صرفِ اعدا اثرِ شعلہ و دودِ دوزخ
وقفِ احباب گل و سنبلِ فردوسِ بریں

ہاں مہِ نو سنیں ہم اوسکا نام
جسکو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح
یہی انداز اور یہی اندام

بارے دو دن کہاں رہا غائب
بندہ عاجز ہے گردشِ ایام

اوڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا
آسماں نے بچھا رکھا تھا دام

اوڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا
آسمان نے بچھا رکھا تھا دام

مرحبا اے سرورِ خاصِ خواص ‏— حبذا اے نشاطِ عامِ عوام

عذر مین تین دن نہ آنے کے ‏— لیکے آیا ہے عید کا پیغام

اوسکو بھولا نچاہیے کہنا ‏— صبح جو جاوے اور آوے شام

ایک مین کیا کہ سب نے جان لیا ‏— تیرا آغاز اور ترا انجام

رازِ دل مجھسے کیون چھپاتا ہے ‏— مجھکو سمجھا ہے کیا کہین نمام

جانتا ہون کہ آج دنیا مین ‏— ایک ہی ہے امید گاہِ انام

مین نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش ‏— غالب اوسکا مگر نہین ہے غلام

جانتا ہون کہ جانتا ہے تو ‏— تب کہا ہے بطرزِ استفہام

مہرِ تابان کو ہو تو ہو اے ماہ ‏— قربِ ہر روزہ بر سبیلِ دوام

تجھکو کیا پایہ روشناسی کا ‏— جز بتقریبِ عیدِ ماہِ صیام

جانتا ہون کہ اوسکے فیض سے تو ‏— پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام

ماہ بن ماہتاب بن مین کون ‏— مجھکو کیا بانٹ دیگا تو انعام

میرا اپنا جدا معاملہ ہے ‏— اور کے لین دین سے کیا کام

ہے مجھے آرزوے بخششِ خاص ‏— گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام

جو کہ بخشیگا تجھکو فرِ فروغ ‏— کیا نہ دیگا مجھے مے گلفام

جبکہ چودہ منازلِ فلکی — کر چکی قطع تیری تیزیِ گام

تیرے پرتوے سے ہون فروغ پذیر — کوی و مشکوی و صحن و منظر و بام

دیکھنا میرے ہاتہ مین لبریز — اپنی صورت کا اک بلورین جام

پھر غزل کی روش پہ چل نکلا
توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

زہر غم کر چکا تھا میرا کام — تجکو کسنے کہا کہ ہو بدنام

می ہی پھر کیون نہ مین پیے جاون — غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام

بوسہ کیسا یہی غنیمت ہے — کہ نہ سمجھین وہ لذت دشنام

کعبے مین جا بجائینگے ناقوس — اب تو باندھا ہے دیر مین احرام

اوس قدح کا ہے دَور مجکو نقد — چرخ نے لی ہے جس سے گردش وام

بوسہ دینے مین اونکو ہے انکار — دل کے لینے مین جنکو تھا ابرام

چھیڑتا ہون کہ اونکو غصہ آے
کیون رکھون ورنہ غالب اپنا نام

کہہ چکا مین تو سب کچہ اب تو کہہ — اے پری چہرہ پیک تیز خرام

کون ہے جسکے در پہ ناصیہ سا — ہین مہ و مہر و زہرہ و بہرام

تو نہین جانتا تو مجھ سے سن — نام شاہنشہِ بلند مقام

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ — مظہر ذو الجلال والاکرام

شہسوارِ طریقۂ انصاف — نو بہارِ حدیقۂ اسلام

جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز — جس کا ہر قول معنیِ الہام

بزم مین میزبان قیصر و جم — رزم مین اوستادِ رستم و سام

اے ترا لطف زندگی افزا — اے ترا عہد فرخی فرجام

چشم بد دور خسروانہ شکوہ — لوحش اللہ عارفانہ کلام

جان نثارون مین تیرے قیصر روم — جرعہ خوارون مین تیرے مرشد جام

وارثِ ملک جانتے ہین تجھے — ایرج و تور و خسرو و بہرام

زورِ بازو مین مانتے ہین تجھے — گیو و گودرز و بیژن و رہام

مرحبا موشگافیِ ناوک — ق — آفرین آبداریِ صمصام

تیر کو تیرے تیرِ غیر ہدف — تیغ کو تیری تیغِ خصم نیام

رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند — ق — برق کو دے رہا ہے کیا الزام

تیرے فیلِ گران جسد کی صدا — ق — تیرے رخشِ سبک عنان کا خرام

فن صورت گری مین تیرا گرز — گر نہ رکھتا ہو دستگاہ تمام

اوسکے مضروب کے سر و تن سے
کیون نمایان ہو صورت ادغام

جب ازل مین رقم پذیر ہوے
صفحہ ہای لیالی و ایام

اور اون اوراق مین بکلک قضا
مجملاً مندرج ہوے احکام

لکھدیا شاہدونکو عاشق کش
لکھدیا عاشقون کو دشمن کام

آسمان کو کہا گیا کہ کہین
گنبد تیز گرد نیلی فام

حکم ناطق لکھا گیا کہ لکھین
خال کو دانہ اور زلف کو دام

آتش و آب و باد و خاک نے لی
وضع سوز و نم و رم و آرام

مہر رخشان کا نام خسرو روز
ماہ تابان کا اسم شحنۂ شام

تیری توقیع سلطنت کو بھی
دی بدستور صورت ارقام

کاتب حکم نے بموجب حکم
اوس رقم کو کیا طراز دوام

ہے ازل سے روائی آغاز
ہو ابد تک رسائی انجام

صبحدم دروازہ خاور کھلا
مہر عالمتاب کا منظر کھلا

خسرو انجم کے آیا صرف مین
شب کو تھا گنجینہ گوہر کھلا

وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود ｜ صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا

ہین کواکب کچھ نظر آتے ہین کچھ ｜ دیتے ہین دھوکا یہ بازیگر کھلا

سطحِ گردون پر پڑا تھا رات کو ｜ موتیون کا ہر طرف زیور کھلا

صبح آیا جانبِ مشرق نظر ｜ اک نگارِ آتشین رخ سر کھلا

تھی نظر بندی کیا جب ردِ سحر ｜ بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا

لا کے ساقی نے صبوحی کے لیے ｜ رکھدیا ہے ایک جامِ زر کھلا

بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ ｜ کعبۂ امن و امان کا در کھلا

تاجِ زرین مہرِ تابان سے سوا ｜ خسروِ آفاق کے منہ پر کھلا

شاہِ روشندل بہادر شہ کہ ہے ｜ رازِ ہستی اوسپہ سرتاسر کھلا

وہ کہ جسکی صورتِ تکوین مین ｜ مقصدِ نہ چرخ و ہفت اختر کھلا

وہ کہ جسکے ناخنِ تاویل سے ｜ عقدۂ احکامِ پیغمبر کھلا

پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام ｜ اوسکے سرہنگون کا جب دفتر کھلا

روشناسون کی جہان فہرست ہے ｜ وان لکھا ہے چہرۂ قیصر کھلا

توسنِ شہ مین ہے وہ خوبی کہ جب ｜ تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھلا

نقشِ پا کی صورتین وہ دلفریب ｜ تو کہے بتخانۂ آزر کھلا

تجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کے
منصبِ مہر و مہ و محور کھلا

لا کہ عقدے دل مین تھے لیکن ہر ایک
میری حدِ وسع سے باہر کھلا

تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید
کس نے کھولا کب کھلا کیونکر کھلا

باغِ معنی کی دکھاؤن گا بہار
مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کھلا

ہو جہان گرمِ غزل خوانی نفس
لگ جائین طبلۂ عنبر کھلا

گنج مین بیٹھا رہون یون پر کھلا
کاش کے ہوتا قفس کا در کھلا

ہم پکارین اور کھلے یون کون جائے
یار کا دروازہ پاوین گر کھلا

ہم کو ہے اس رازداری پر گھمنڈ
دوست کا ہے راز دشمن پر کھلا

واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ
زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا

ہاتھ سے رکھدی کب ابرو نے کمان
کب کمر سے غمزے کی خنجر کھلا

مفت کا کس کو برا ہے بدرقہ
رہروی مین پردۂ رہبر کھلا

سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک
آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھلا

نامے کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ
رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

دیکھو غالب سے گر الجھا کوئی

ہے دلی پوشیدہ اور کافر کھلا

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال
پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا

خامے نے پائی طبیعت سے مدد
بادباں بھی اوٹھتے ہی لنگر کھلا

مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ
یاں عرض سے رتبۂ جوہر کھلا

مہر کانپا چرخ چکر کھا گیا
بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا

بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب
اب علوِ پایۂ منبر کھلا

سکۂ شہ کا ہوا ہے روشناس
اب عیارِ آبروئے زر کھلا

شاہ کے آگے دھرا ہے آئنہ
اب مآلِ سعیِ اسکندر کھلا

ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے
اب فریبِ طغرل و سنجر کھلا

ہو سکے کیا مدح ہاں اک نام ہے
دفترِ مدحِ جہاں داور کھلا

فکر اچھی پر ستائش نا تمام
عجزِ اعجازِ ستائش گر کھلا

جانتا ہوں ہے خطِ لوحِ ازل
تم پہ اے خاقانِ نام آور کھلا

تم کرو صاحبقرانی جب تلک
ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا

غزلیات

نقش فریادی ہے کسکی شوخی تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

کاو کاو سخت جانیہاے تنہائی نہ پوچھ — صبح کرنا شام کا لانا ہے جوے شیر کا

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے — سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

آگہی دام شنیدن جسقدر چاہے بچھاے — مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

بسکہ ہون غالب اسیری مین بھی آتش زیر پا
موی آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

جراحت تحفہ الماس ارمغان داغ جگر ہدیہ — مبارکباد اسد غمخوار جان دردمند آیا

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروے کار — صحرا مگر بہ تنگی چشم حسود تھا

آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست — ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

تھا خواب مین خیال کو تجھسے معاملہ — جب آنکھ کھل گئی نہ زیان تھا نہ سود تھا

لیتا ہون مکتب غم دل مین سبق ہنوز — لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی — مین ورنہ ہر لباس مین ننگ وجود تھا

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

مطلع ثانی

کہتے ہو ندینگے ہم دل اگر پڑا پایا — دل کہان کہ گم کیجے ہمنے مدعا پایا
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا — درد کی دوا پائی درد بیدوا پایا
دوستدار دشمن ہے اعتماد دل معلوم — آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا
سادگی و پرکاری بیخودی و ہشیاری — حسن کو تغافل مین جرأت آزما پایا
غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہمنے اپنا دل — خون کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا
حال دل نہین معلوم لیکن اسقدر یعنی — ہمنے بارہا ڈھونڈا تمنے بارہا پایا

شور پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تمنے کیا مزا پایا

دل مرا سوز نہان سے بے محابا جل گیا — آتش خاموش کی مانند گویا جل گیا
دل مین ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہین — آگ اس گھر مین لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
مین عدم سے بھی پرے ہون ورنہ غافل بارہا — میری آہ آتشین سے بال عنقا جل گیا
عرض کیجے جوہر اندیشہ کی گرمی کہان — کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا
دل نہین تجکو دکھاتا ورنہ داغون کی بہار — اس چراغان کا کرون کیا کارفرما جل گیا

مین ہون اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھکر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

شوق ہر رنگ رقیبِ سر و سامان نکلا
قیس تصویر کے پردے مین بھی عریان نکلا

زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی یارب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشان نکلا

بوی گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشان نکلا

دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد
کام یارون کا بقدرِ لب و دندان نکلا

تھی نوآموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آسان نکلا

دل مین پھر گریے نے اک شور اوٹھایا غالب
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفان نکلا

دھمکی مین مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

تھا زندگی مین مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اوڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

تالیفِ نسخہ ہاے وفا کر رہا تھا مین
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

دل تا جگر کہ ساحلِ دریای خون ہے اب
اس رہگذر مین جلوۂ گل آگے گرد تھا

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے
زندان مین بھی خیال بیابان نورد تھا

یہ لاش بے کفن اسدؔ خستہ جان کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشای بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

بہ فیض بیدلی نومیدی جاوید آسان ہے
کشایش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

ہوای سیر گل آئینۂ بے مہری قاتل
کہ انداز بخون غلطیدن بسمل پسند آیا

دہر مین نقش وفا وجہ تسلی نہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہوا

سبزۂ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریف دم افعی نہوا

مین نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹون
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہوا

دل گذرگاہ خیال می و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سر منزل تقوی نہوا

ہون ترے وعدہ نکرنے مین بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کش گلبانگ تسلی نہوا

کس سے محرومی قسمت کی شکایت کیجے
ہمنے چاہا تھا کہ مرجائین سو وہ بھی نہوا

مر گیا صدمۂ یک جنبش لب سے غالب
ناتوانی سے حریف دم عیسی نہوا

ستایشگر ہے زاہد اسقدر جس باغ رضوان کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودون کے طاق نسیان کا

بیان کیا کیجیے بیداد کاوشہاے مژگان کا
(مطلع ثانی) کہ ہر یک قطرہ خون دانہ ہے تسبیح مرجان کا

نہ آئی سطوت قاتل بھی مانع میرے نالونکو
لیا دانتون مین جو تنکا ہوا ریشہ نیستان کا

دکھاؤنگا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغ دل اک تخم ہے سرو چراغان کا

کیا آئینہ خانیکا وہ نقشا تیرے جلوے نے
کرے جو پرتو خورشید عالم شبنمستان کا

مری تعمیر مین مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولے برق خرمن کا ہے خون گرم دہقان کا

اوگا ہی گھر مین ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے دربان کا

خموشی مین نہان خون گشتہ لاکھون آرزوئین ہین
چراغ مردہ ہون مین بے زبان گور غریبان کا

ہنوز اک پرتو نقش خیال یار باقی ہے
دل افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زندان کا

بغل مین غیر کی آج آپ سوتے ہین کہین ورنہ
سبب کیا خواب مین آکر تبسمہاے پنہان کا

نہین معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگان کا

نظر مین ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزاے پریشان کا

محرم نہین ہے تو ہی نواہاے راز کا
یان ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتن گلہاے ناز کا

تو اور سوی غیر نظرہاے تیز تیز
مین اور دکھ تری مژہ ہاے دراز کا

صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا وگرنہ میں
طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اس گرہِ نیمباز کا

تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسد
سینہ کہ تھا دفینہ گہرہاے راز کا

نہ ہوگا یک بیابان ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بیدماغی ہے
کہ موجِ بوی گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو دریاے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا
رکھیو یارب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا

شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا
اس تکلف سے کہ گویا بتکدے کا در کھلا

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستین میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا

گو نہ سمجھوں اسکی باتیں گو نہ پاؤں اسکا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

ہے خیال حسن مین حسن عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہین
زلف سے بڑھکر نقاب اوس شوخ کے منہ پر کھلا

در پہ رہنے کو کہا اور کہکے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے مین مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

کیون اندھیری ہے شب غم ہے بلاؤن کا نزول
آج اودھر ہی کو رہیگا دیدۂ اختر کھلا

کیا رہون غربت مین خوش جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

اوسکی امت مین ہون مین میرے رہین کیون کام بند
واسطے جس شہ کے غالب گنبد بیدر کھلا

شب کہ برق سوز دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا

وان کرم کو عذر بارش تھا عنان گیر خرام
گریے سے یان پنبۂ بالش کف سیلاب تھا

وان خود آرائی کو تھا موتی پرونیکا خیال
یان ہجوم اشک مین تار نگہ نایاب تھا

جلوۂ گل نے کیا تھا وان چراغان آبجو
یان رواں مژگان چشم تر سے خون ناب تھا

یان سر پر شور بیخوابی سے تھا دیوار جو
وان وہ فرق ناز محو بالش کمخواب تھا

یان نفس کرتا تھا روشن شمع بزم بیخودی
جلوۂ گل وان بساط صحبت احباب تھا

فرش سے تا عرش وان طوفان تھا موج رنگ کا
یان زمین سے آسمان تک سوختن کا باب تھا

ناگہان اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا
دل کہ ذوق کاوش ناخن سے لذت یاب تھا

نالۂ دل مین شب انداز اثر نایاب تھا		تھا سپند بزم وصل غیر گو بیتاب تھا
مقدم سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے		خانۂ عاشق مگر ساز صداے آب تھا
نازش ایام خاکستر نشینی کیا کہون		پہلوے اندیشہ وقف بستر سنجاب تھا
کچھ نکی اپنی جنون نارسا نے ورنہ یان	قطعہ	ذرہ ذرہ روکش خورشید عالمتاب تھا
آج کیون پروا نہین اپنے اسیرون کی تجھے		کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا
یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا		انتظار صید مین اک دیدۂ بیخواب تھا

مین نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے
اسکے سیل گریہ مین گردون کف سیلاب تھا

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب	خون جگر ودیعت مژگان یار تھا
اب مین ہون اور ماتم یک شہر آرزو	توڑا جو تونے آینہ تمثال دار تھا
گلیون مین میری نعش کو کھینچے پھرو کہ مین	جانداده ہواے سر رہگذار تھا
موج سراب دشت وفا کا نہ پوچھ حال	ہر ذرہ مثل جوہر تیغ آبدار تھا

کم جانتے تھے ہم بھی غم عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوے پہ غم روزگار تھا

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آسان ہونا	آدمی کو بھی میسر نہین انسان ہونا

گریہ چاہے ہے خرابی میرے کاشانیکی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیابان ہونا

واے دیوانگیِ شوق کہ ہر دم مجھکو
آپ جانا اودھر اور آپ ہی حیران ہونا

جلوہ ازبسکہ تقاضاے نگہ کرتا ہے
جوہرِ آینہ بھی چاہے ہے مژگان ہونا

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریان ہونا

لیگئے خاک مین ہم داغِ تمناے نشاط
تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستان ہونا

عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنا کھانا
لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکدان ہونا

کی مرے قتل بعد اوسنے جفا سے توبہ
ہاے اوس زود پشیمان کا پشیمان ہونا

حیف اوس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جسکی قسمت مین ہو عاشق کا گریبان ہونا

شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیطِ بادہ صورتخانۂ خمیازہ تھا

اک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکان کھلا
جادہ اجزاے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

مانعِ وحشت خرامیہاے لیلی کون ہے
خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا

پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغناے حسن
دست مرہونِ حنا رخسار رہنِ غازہ تھا

نالۂ دل نے دیے اوراقِ لختِ دل بباد
یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

مطلع

دوست غمخواری مین میری سعی فرمائین گے کیا
زخم کے بھرتے تلک ناخن نہ بڑھ جائین گے کیا

بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک
ہم کہین گے حال دل اور آپ فرمائین گے کیا

حضرتِ ناصح گر آوین دیدہ و دل فرش راہ
کوئی مجکو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائین گے کیا

آج وان تیغ و کفن باندھے ہوے جاتا ہون مین
عذر میرے قتل کرنے مین وہ اب لائین گے کیا

گر کیا ناصح نے ہمکو قید اچھا یون سہی
یہ جنون عشق کے انداز چھٹ جائین گے کیا

خانہ زاد زلف ہین زنجیر سے بھاگینگے کیون
ہین گرفتار وفا زندان سے گھبرائین گے کیا

ہے اب اس معمورے مین قحط غم الفت اسد
ہمنے یہ مانا کہ دلی مین رہین کھائین گے کیا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیمکش کو
یہ خلش کہان سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہان کی دوستی ہے کہ بنے ہین دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

غم اگرچہ جانگسل ہے یہ کہان بچین کہ دل ہے
غم عشق گر نہوتا غم روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے ... مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایکبار ہوتا

ہوئے مرکے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا ... نہ کبھی جنازہ اوٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا ... جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا ... نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

تجاہل پیشگی سے مدعا کیا ... کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

نوازشہائے بیجا دیکھتا ہوں ... شکایتہائے رنگیں کا گلا کیا

نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں ... تغافلہائے تمکیں آزما کیا

فروغِ شعلۂ خس یکنفس ہے ... ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا

نفس موجِ محیطِ بیخودی ہے ... تغافلہائے ساقی کا گلا کیا

دماغِ عطر پیراہن نہیں ہے ... غمِ آوارگیہائے صبا کیا

سن اے غارتگرِ جنسِ وفا سن ... شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر ... ہم اوسکے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ ... شہیدانِ نگہ کا خونبہا کیا

کیا کسنے جگر داری کا دعوی — شکیب خاطرِ عاشق بھلا کیا

یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیون — یہ کافر فتنۂ طاقت ربا کیا

بلاے جان ہے غالب اوسکی ہربات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہمسا نہوا — پھر غلط کیا ہے کہ ہمسا کوئی پیدا نہوا

بندگی مین بھی وہ آزادہ و خودبین ہین کہ ہم — اولٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہوا

سبکو مقبول ہے دعوی تری یکتائی کا — روبرو کوئی بتِ آئینہ سیما نہوا

کم نہین نازشِ ہمنامیِ چشمِ خوبان — تیرا بیمار برا کیا ہے گر اچھا نہوا

سینے کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نگیا — خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہوا

نام کا میرے ہے وہ دکھ کہ کسیکو نملا — کام مین میرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہوا

ہر بنِ مو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خوناب — حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہوا

قطرے مین دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو مین کل — کھیل لڑکون کا ہوا دیدۂ بینا نہوا

تھی خبر گرم کہ غالب کے اوڑینگے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہوا

اسد ہم وہ جنون جولان گداے بیسروپا ہین — کہ ہے سرپنجۂ مژگان آہو پشت خار اپنا

پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا
بخون غلطیدۂ صد رنگ دعوی پارسائی کا

نہو حسنِ تماشا دوست رسوا بیوفائی کا
بمہرِ صد نظر ثابت ہے دعوی پارسائی کا

زکاتِ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا
چراغِ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا

نمارا جانکر بیجرم غافل تیری گردن پر
رہا مانندِ خونِ بیگنہ حق آشنائی کا

تمنائے زبان محوِ سپاسِ بیزبانی ہے
مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بیدست و پائی کا

وہی اک بات ہے جو یان نفس وان نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگین نوائی کا

دہانِ ہر بتِ پیغارہ جو زنجیرِ رسوائی
عدم تک بیوفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا

نہ دے نامے کو اتنا طول غالب مختصر لکھدے
کہ حسرت سنج ہون عرضِ ستمہائے جدائی کا

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیان ہوجائیگا
بے تکلف داغِ مہ مہرِ دہان ہوجائیگا

زہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر مین ہوتا ہے آب
پرتوِ مہتاب سیلِ خانمان ہوجائیگا

لے تو لون سوتے مین اوسکے پاؤنکا بوسہ مگر
ایسی باتون سے وہ کافر بدگمان ہوجائیگا

دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا
یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحان ہوجائیگا

سبکے دل مین ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
مجھپہ گویا اک زمانہ مہربان ہوجائیگا

گر نگاہِ گرم فرماتی رہے تعلیمِ ضبط
شعلہ خس مین جیسے خون رگ مین نہان ہوجائیگا

باغ مین مجھکو نہ لیجا ورنہ میرے حال پر — ہر گل تر ایک چشم خون فشان ہوجائیگا

وائے گر میرا ترا انصاف محشر مین نہو — ابتلک تو یہ توقع ہے کہ وان ہوجائیگا

فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسد

دوستی نادان کی ہے جی کا زیان ہوجائیگا

درد منت کش دوا نہوا — مین نہ اچھا ہوا برا نہوا

جمع کرتے ہو کیون رقیبون کو — اک تماشا ہوا گلا نہوا

ہم کہان قسمت آزمانے جائین — تو ہی جب خنجر آزما نہوا

کتنے شیرین ہین تیرے لب کہ رقیب — گالیان کھاکے بے مزا نہوا

ہے خبر گرم اون کے آنے کی — آج ہی گھر مین بوریا نہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی مین مرا بھلا نہوا

جان دی دی ہوئی اوسیکی تھی — حق تو یون ہے کہ حق ادا نہوا

زخم گر دب گیا لہو نہ تھما — کام گر رک گیا روا نہوا

رہزنی ہے کہ دلستانی ہے — لیکے دل دلستان روانہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہین

آج غالب غزلسرا نہوا

گلا ہے شوق کو دل مین بھی تنگیِ جا کا
گہر مین محو ہوا اضطراب دریا کا

یہ جانتا ہون کہ تو اور پاسخِ مکتوب
مگر ستم زدہ ہون ذوقِ خامہ فرسا کا

حنائے پائے خزان ہے بہار اگر ہے یہی
دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا

غمِ فراق مین تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو
مجھے دماغ نہین خندہ ہائے بیجا کا

ہنوز محرمیِ حسن کو ترستا ہون
کرے ہے ہر بُنِ مو کام چشمِ بینا کا

دل اوسکو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے
ہمین دماغ کہان حسن کے تقاضا کا

نہ کہہ کہ گریہ بمقدارِ حسرتِ دل ہے
مری نگاہ مین ہے جمع و خرچ دریا کا

فلک کو دیکھ کے کرتا ہون اوسکو یاد اسد
جفا مین اوسکی ہے اندازِ کارفرما کا

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

جب بتقریبِ سفر یار نے محمل باندھا
تپشِ شوق نے ہر ذرے پہ اک دل باندھا

اہلِ بینش نے بحیرت کدۂ شوخیِ ناز
جوہرِ آئینہ کو طوطیِ بسمل باندھا

یاس و امید نے اک عربدہ میدان مانگا
عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا

نہ بندھے تشنگیٔ شوق کے مضمون غالب
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

مین اور بزم مے سے یون تشنہ کام آؤن
گر مین نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

ہے ایک تیر جسمین دونون چھدے پڑے ہین
وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

درماندگی مین غالب کچھ بن پڑے تو جانون
جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویران ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیابان ہوتا

تنگیٔ دل کا گلا کیا یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشان ہوتا

بعد یک عمر ورع بار تو دیتا بارے
کاش رضوان ہی در یار کا دربان ہوتا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجکو ہونے نے نہ ہوتا مین تو کیا ہوتا

ہوا جب غم سے یون بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یون ہوتا تو کیا ہوتا

اک ذرۂ زمین نہین بیکار باغ کا
یان جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

۴۳

نے دے سکے سبب طاقت آشوب آگہی
کھینچا ہے عجز حوصلہ نے خط ایاغ کا

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

تازہ نہیں ہے نشۂ فکر سخن مجھے
تریاکی قدیم ہوں دود چراغ کا

سو بار بند عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

بے خون دل ہے چشم میں موج نگہ غبار
یہ میکدہ خراب ہے مے کے سراغ کا

باغ شگفتہ تیرا بساط نشاط دل
ابر بہار خمکدہ کس کے دماغ کا

وہ مری چین جبیں سے غم پنہاں سمجھا
راز مکتوب بہ بے ربطی عنوان سمجھا

اک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

شرح اسباب گرفتاری خاطر مت پوچھ
اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

بدگمانی نے نہ چاہا اسے سرگرم خرام
رخ پہ ہر قطرہ عرق دیدۂ حیراں سمجھا

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا
نبض خس سے تپش شعلۂ سوزاں سمجھا

سفر عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی
ہر قدم سائے کو میں اپنے شبستاں سمجھا

تھا گریزاں مژۂ یار سے دل تا دم مرگ
دفع پیکان قضا اس قدر آساں سمجھا

دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اسد

غلطی کی کہ جو کافر کو مسلمان سمجھا

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا — دل جگر تشنۂ فریاد آیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز — پھر ترا وقت سفر یاد آیا

سادگیہاے تمنا یعنے — پھر وہ نیرنگ نظر یاد آیا

عذر واماندگی اے حسرت دل — نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا

زندگی یون بھی گذر ہی جاتی — کیون ترا راہگذر یاد آیا

آہ وہ جرأت فریاد کہان — دل سے تنگ آکے جگر یاد آیا

پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال — دل گم گشتہ مگر یاد آیا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

کیا ہی رضوان سے لڑائی ہوگی — گھر ترا خلد مین گر یاد آیا

مین نے مجنون پہ لڑکپن مین اسد
سنگ اوٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا — آپ آتے تھے مگر کوئی عنانگیر بھی تھا

تمسے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلا — اوسمین کچھ شائبۂ خوبی تقدیر بھی تھا

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دون — کبھی فتراک مین تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

قید مین ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد
ہان کچھ اک رنج گرانباری زنجیر بھی تھا

بجلی اک کوند گئی آنکھون کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ مین لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یوسف اوسکو کہون اور کچھ نکہے خیر ہوئی
گر بگڑ بیٹھے تو مین لائق تعزیر بھی تھا

دیکھکر غیر کو ہو کیون نہ کلیجا ٹھنڈا
نالہ کرتا تھا ولے طالب تاثیر بھی تھا

پیشے مین عیب نہین رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سرون مین وہ جوان میر بھی تھا

ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی
آخر اوس شوخ کے ترکش مین کوئی تیر بھی تھا

پکڑے جاتے ہین فرشتون کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

ریختے کے تمھین استاد نہین ہو غالب
کہتے ہین اگلے زمانے مین کوئی میر بھی تھا

لب خشک در تشنگی مردگان کا
زیارتکدہ ہون دل آزردگان کا

ہمہ ناامیدی ہمہ بدگمانی
مین دل ہون فریب وفا خوردگان کا

تو دوست کسیکا بھی ستمگر نہوا تھا
اورون پہ ہے وہ ظلم کہ مجھپر نہوا تھا

چھوڑا مہ نخشب کی طرح دست قضا نے
خورشید ہنوز اوسکے برابر نہوا تھا

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھون مین ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہوا تھا

جبتک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
مین معتقدِ فتنۂ محشر نہوا تھا

مین سادہ دل آزردگیِ یار سے خوش ہون
یعنی سبقِ شوق مکرر نہوا تھا

دریاے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہوا تھا

جاری تھی اسد داغِ جگر سے مری تحصیل
آتشکدہ جاگیرِ سمندر نہوا تھا

شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا
رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا

مشہدِ عاشق سے کوسون تک جو اگتی ہے حنا
کسقدر یارب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

حاصلِ الفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو
دل بہ دل پیوستہ گویا اک لبِ افسوس تھا

کیا کہون بیمارے غم کی فراغت کا بیان
جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لیکے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے
اوسکی خطا نہین ہے یہ میرا قصور تھا

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہین رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہین رہا

جاتا ہون داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوے
ہون شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہین رہا

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ مین
شایان دست و خنجر قاتل نہین رہا

ہر روے شش جہت در آئینہ باز ہے
یان امتیاز ناقص و کامل نہین رہا

وا کر دیے ہین شوق نے بند نقاب حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہین رہا

گو مین رہا رہین ستمہاے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہین رہا

دل سے ہواے کشت وفا مٹ گئی کہ وان
حاصل سواے حسرت حاصل نہین رہا

بیداد عشق سے نہین ڈرتا مگر اسد
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہین رہا

رشک کہتا ہے کہ اوسکا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کسکا آشنا

ذرہ ذرہ ساغر میخانۂ نیرنگ ہے
گردش مجنون بچشمکہاے لیلا آشنا

شوق ہے سامان طراز نازش ارباب عجز
ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

مین اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دل وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

شکوہ سنج رشک ہمدیگر نہ رہنا چاہیے
میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا

کوہکن نقاش یک تمثال شیرین تھا اسد
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

ذکر اوس پریوش کا اور پھر بیان اپنا
بنگیا رقیب آخر تھا جو رازدان اپنا

مے وہ کیون بہت پیتے بزم غیر مین یارب
آج ہی ہوا منظور اون کو امتحان اپنا

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اودہر ہوتا کاشکے مکان اپنا

دے وہ جسقدر ذلت ہم ہنسی مین ٹالینگے
بارے آشنا نکلا اونکا پاسبان اپنا

درد دل لکہون کب تک جاؤن اونکو دکہلاؤن
انگلیان فگار اپنی خامہ خونچکان اپنا

گہستے گہستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا
ننگ سجدہ سے میرے سنگ آستان اپنا

تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت مین ہمنے ہمزبان اپنا

ہم کہان کے دانا تہے کس ہنر مین یکتا تہے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسمان اپنا

سرمۂ مفت نظر ہون میری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشم خریدار پہ احسان میرا

رخصت نالہ مجہے دے کہ مبادا ظالم
تیرے چہرے سے ہو ظاہر غم پنہان میرا

غافل بوہم ناز خود آرا ہے ورنہ یان
بے شانۂ صبا نہین طرۂ گیاہ کا

بزم قدح سے عیش تمنا نہ رکہ کہ رنگ
صید ز دام جستہ ہے اس دامگاہ کا

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نکرنا گناہ کا

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہون مین کہ ہے
پرگل خیال زخم سے دامن نگاہ کا

۷۹

جان در ہوائے یک نگہ گرم ہے اسد
پروانہ ہے وکیل ترے دادخواہ کا

ہو رہے بازائے پر باز آئین کیا　　کہتے ہین ہم تجھکو مُنہ دکھلائین کیا
رات دن گردش مین ہین سات آسمان　　ہو رہیگا کچھ نہ کچھ گھبرائین کیا
لاگ ہو تو اوسکو ہم سمجھین لگاو　　جب نہو کچھ بھی تو دھوکا کھائین کیا
ہولیے کیون نامہ بر کے ساتھ ساتھ　　یارب اپنے خط کو ہم پہنچائین کیا
موج خون سر سے گذر ہی کیون نجائے　　آستانِ یار سے اوٹھ جائین کیا
عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ　　مر گئے پر دیکھیے دکھلائین کیا

پوچھتے ہین وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائین کیا

لطافت بیکثافت جلوہ پیدا کر نہین سکتی　　چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

حریف جوشش دریا نہین خودداری ساحل
جہان ساقی ہو تو باطل ہے دعوی ہوشیاری کا

عشرتِ قطرہ ہے دریا مین فنا ہو جانا　　درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

تجھ سے قسمت میں مری صورت قفل ابجد　　تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

دل ہوا کشمکشِ چارۂ زحمت مین تمام
مٹ گیا گھسنے مین اس عقدے کا وا ہو جانا

اب جفا سے بھی ہین محروم ہم اللہ اللہ
اسقدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

ضعف سے گریہ مبدل بدمِ سرد ہوا
باور آیا ہمین پانی کا ہوا ہو جانا

دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا
روتے روتے غمِ فرقت مین فنا ہو جانا

گر نہین نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس
کیون ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا

ق
بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب
چشم کو چاہیے ہر رنگ مین وا ہو جانا

تاکہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل
دیکھ برسات مین سبز آئنے کا ہو جانا

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب
دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب

پوچھ مت وجہِ سیہ مستیِ اربابِ چمن
سایۂ تاک مین ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

جو ہوا غرقۂ مے بختِ رسا رکھتا ہے
سر سے گذرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب

ق
ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر
موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب

چار موج اوٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو
موجِ گل موجِ شفق موجِ صبا موجِ شراب

جس قدر روح نباتی ہے جگر تشنۂ ناز
دے ہے تسکیں بہ دمِ آبِ بقا موجِ شراب

بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک مین خون ہو ہو کر
شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب

موجۂ گل سے چراغان ہے گذرگاہِ خیال
ہے تصور مین زبس جلوہ نما موجِ شراب

نشے کے پردے مین ہے محوِ تماشاے دماغ
بسکہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب

ایک عالم پہ ہین طوفانیِ کیفیتِ فصل
موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب

شرحِ ہنگامۂ مستی ہے زہے موسمِ گل
رہبرِ قطرہ بدریا ہے خوشا موجِ شراب

ہوش اڑتے ہین مرے جلوۂ گل دیکھ اسد
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

افسوس کہ دندان کا کیا رزق فلک نے
جن لوگون کی تھی درخورِ عقدِ گہر انگشت

کافی ہے نشانی ترا چھلے کا نہ دینا
خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت

لکھتا ہون اسد سوزشِ دل سے سخنِ گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت
پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت

جگر کو مرے عشقِ خونابہ مشرب
لکھے ہے خداوندِ نعمت سلامت

علی الرغمِ دشمن شہیدِ وفا ہون
مبارک مبارک سلامت سلامت

نہین گر سر و برگِ ادراکِ معنی
تماشاے نیرنگِ صورت سلامت

نہیں گر سر و برگِ ادراکِ معنی
تماشائے نیرنگِ صورت سلامت

مند گئین کھولتے ہی کھولتے آنکھین غالب
یار لائے مری بالین پہ اوسے پر کس وقت

آمد خط سے ہوا ہے سرد جو بازار دوست
دود شمع کشتہ تھا شاید خط رخسار دوست

ای دل نا عاقبت اندیش ضبط شوق کر
کون لا سکتا ہے تاب جلوۂ دیدار دوست

خانہ ویران سازی حیرت تماشا کیجیے
صورت نقش قدم ہون رفتۂ رفتار دوست

عشق مین بیداد رشک غیر نے مارا مجھے
کشتۂ دشمن ہون آخر گرچہ تھا بیمار دوست

چشم ما روشن کہ اوس بیدرد کا دل شاد ہے
دیدۂ پر خون ہمارا ساغر سرشار دوست

غیر یون کرتا ہے میری پرسش اوسکے ہجر مین
بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوار دوست

تاکہ مین جانون کہ ہے اسکی رسائی وان تلک
مجھکو دیتا ہے پیام وعدۂ دیدار دوست

جب کہ مین کرتا ہون اپنا شکوۂ ضعف دماغ
سر کرے ہے وہ حدیث زلف عنبر بار دوست

چپکے چپکے مجکو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے کرتا ہے بیان شوخی گفتار دوست

مہربانیہاے دشمن کی شکایت کیجیے
یا بیان کیجے سپاس لذت آزار دوست

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ
ہے ردیف شعر مین غالب ز بس تکرار دوست

گلشن میں بندوبست بہ رنگ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقہ بیرون در ہے آج

آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ — تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج

اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل — سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

ولہ

تو ہم مریضِ عشق کے بیماردار ہین — اچھا اگر نہو تو مسیحا کا کیا علاج

ولہ

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ — اگر شراب نہین انتظارِ ساغر کھینچ

کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ — برنگِ خار مرے آئنے سے جوہر کھینچ

تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار اے دل — کیا ہے کسنے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ

تری طرف ہے بحسرت نظارۂ نرگس — بکوریِ دل و چشمِ رقیب ساغر کھینچ

بہ نیم غمزہ ادا کر حقِ ودیعتِ ناز — نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ

مرے قدح مین ہے صہبائے آتشِ پنہان
بروئے سفرہ کبابِ دلِ سمندر کھینچ

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد — بارے آرام سے ہین اہلِ جفا میرے بعد

منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا — ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد

شمع بجھتی ہے تو اس مین سے دھوان اوٹھتا ہے — شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

خون ہے دل خاک مین احوال بتان پر یعنی
اِنکے ناخن ہوے محتاج حنا میرے بعد

در خور عرض نہین جوہر بیداد کو جا
نگہِ ناز ہے سُرمے سے خفا میرے بعد

ہے جنون اہل جنون کیلیے آغوش وداع
چاک ہوتا ہے گریبان سے جدا میرے بعد

کون ہوتا ہے حریف مے مردافگن عشق
ہے مکرر لب ساقی مین صلا میرے بعد

غم سے مرتا ہون کہ اتنا نہین دنیا مین کوئی
کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد

آئے ہے بیکسی عشق پہ رونا غالب
کسکے گھر جائیگا سیلاب بلا میرے بعد

بلاسے ہین یہ جو پیش نظر در و دیوار
نگاہِ شوق کو ہین بال و پر در و دیوار

وفور اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ
کہ ہوگئے مرے دیوار و در در و دیوار

نہین ہے سایہ کہ سُنکر نوید مقدم یار
گئے ہین چند قدم پیشتر در و دیوار

ہوئی ہے کسقدر ارزانیِ مےِ جلوہ
کہ مست ہے ترے کوچے مین ہر در و دیوار

جو ہے تجھے سر سودائے انتظار تو آ
کہ ہین دکان متاع نظر در و دیوار

ہجوم گریہ کا سامان کب کیا مین نے
کہ گر پڑے نہ مرے پاؤن پر در و دیوار

وہ آرہا مرے ہمسایے مین تو سایے
ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار

نظر مین کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی
ہمیشہ روتے ہین ہم دیکھکر در و دیوار

نپوچھ بیخودیِ عیش مقدم سیلاب
کہ ناچتے ہین پڑے سر بسر درودیوار

نکہ کسی سے کہ غالب نہین زمانے مین
حریف راز محبت مگر درودیوار

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
جانیگا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

کہتے ہین جب رہی نہ مجھے طاقت سخن
جانون کسی کے دلکی مین کیونکر کہے بغیر

کام اوس سے آپڑا ہے کہ جسکا جہان مین
لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

جی مین ہی کچھ نہین ہے ہمارے وگرنہ ہم
سر جاے یا رہے نہ رہین پر کہے بغیر

چھوڑونگا مین نہ اوس بت کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ وے گفتگو مین کام
چلتا نہین ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہین ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بہرا ہون مین تو چاہیے دونا ہو التفات
سنتا نہین ہون بات مکرر کہے بغیر

غالب نکر حضور مین تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب اوس پر کہے بغیر

کیون جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھکر
جلتا ہون اپنی طاقت دیدار دیکھکر

آتش پرست کہتے ہین اہل جہان مجھے
سرگرم نالہ ہاے شرربار دیکھکر

کیا آبروے عشق جہان عام ہو جفا
رکتا ہون تمکو بے سبب آزار دیکھکر

آتا ہے میرے قتل کو پر جوش رشک سے
مرتا ہون اوسکے ہاتہ مین تلوار دیکھکر

ثابت ہوا ہے گردن مینا پہ خون خلق
لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھکر

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتہ
ہمکو حریص لذت آزار دیکھکر

بکجاتے ہین ہم آپ متاع سخن کے ساتہ
لیکن عیار طبع خریدار دیکھکر

زنار باندہ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھکر

ان آبلون سے پاؤن کے گھبرا گیا تہا مین
جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھکر

کیا بدگمان ہے مجہسے کہ آئینے مین مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھکر

گرتی تہی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر
دیتے ہین بادہ ظرف قدح خوار دیکھکر

سر پہوڑنا وہ غالب شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھکر

لرزتا ہے مرا دل زحمت مہر درخشان پر
مین ہون وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خار بیابان پر

نچہوڑی حضرت یوسف نے یان بہی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پہرتی ہے زندان پر

فنا تعلیم درس بیخودی ہون اوس زمانے سے
کہ مجنون لام الف لکہتا تہا دیوار دبستان پر

فراغت کسقدر رہتی مجہے تشویش مرہم سے
بہم گر صلح کرتے پارہ ہاے دل نمکدان پر

نہین اقلیم الفت مین کوئی طومار ناز ایسا
کہ پشت چشم سے جسکے نہ ہووے مہر عنوان پر

مجھے اب دیکھکر ابر شفق آلودہ یاد آیا
کہ فرقت مین تری آتش برستی تھی گلستان پر

بجز پرواز شوق ناز کیا باقی رہا ہوگا
قیامت اک ہواے تند ہے خاک شہیدان پر

نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اوسنے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریبان پر

ہے بسکہ ہر اک اونکے اشارے مین نشان اور
کرتے ہین محبت تو گذرتا ہے گمان اور

یارب وہ نہ سمجھے ہین نہ سمجھین گے مری بات
دے اور دل اونکو جو نہ دے مجھکو زبان اور

ابرو سے ہے کیا اوس نگہ ناز کو پیوند
ہے تیر مقرر مگر اسکی ہے کمان اور

تم شہر مین ہو تو ہمین کیا غم جب اوٹھینگے
لے آئین گے بازار سے جاکر دل و جان اور

ہرچند سبکدست ہوے بت شکنی مین
ہم ہین تو ابھی راہ مین ہے سنگ گران اور

ہے خون جگر جوش مین دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشان اور

مرتا ہون اس آواز پہ ہرچند سر اوڑ جاے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائین کہ ہان اور

لوگون کو ہے خورشید جہانتاب کا دہوکا
ہر روز دکھاتا ہون مین اک داغ نہان اور

لیتا نہ اگر دل تمھین دیتا کوئی دم چین
کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغان اور

پاتے نہین جب راہ تو چڑھ جاتے ہین نالے
رکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے روان اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

صفائے حیرت آئینہ ہے سامان زنگ آخر
تغیر آب بر جا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر

نہ کی سامان عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
ہوا جام زمرد بھی مجھے داغ پلنگ آخر

جنون کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عریانی
گریبان چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر

برنگ کاغذ آتش زدہ نیرنگ بیتابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بال یک تپیدن پر

فلک سے ہمکو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاع بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے
شعاع مہر سے تہمت نگہ کی چشم روزن پر

فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغ طالع خاشاک ہے موقوف گلخن پر

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
کہ مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

کشمکش مصلحت سے ہوں کہ خوبان تجھ پہ عاشق ہیں
تکلف بر طرف ملجائیگا تجھسا رقیب آخر

[illegible] دیکھو مرا رستا کئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

لازم ہے کہ دیکھو مرا رستا کئی دن اور

مٹ جائیگا سر گر ترا پتھر نہ گھسیگا
ہون در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤن
مانا کہ ہمیشہ نہین اچھا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملینگے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہان اے فلک پیر جوان تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہ شب چاردہم تھے مرے گھر کے
پھر کیون نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھسے تمھین نفرت سہی نیر سے لڑائی
بچون کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گذری نہ بہرحال یہ مدت خوش و ناخوش
کرنا تھا جوانمرگ گذارا کوئی دن اور

نادان ہو کہ کہتے ہو کہ کیون جیتے ہین غالب
قسمت مین ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

فارغ مجھے نہ جان کہ مانند صبح و مہر
ہے داغ عشق زینت جیب کفن ہنوز

ہے ناز مفلسان زر از دست رفتہ پر
ہون گلفروش شوخی داغ کہن ہنوز

میخانۂ جگر مین یہان خاک بھی نہین
خمیازہ کھینچے ہے بت بیداد فن ہنوز

حریف مطلب مشکل نہیں فسوں نیاز
دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز

ہنوز بہرزہ بیابان نورد وہم وجود
ہنوز تیرے تصور مین ہے نشیب و فراز

وصال جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہان
کہ دیجے آینۂ انتظار کو پرداز

ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست
گئی نہ خاک ہوئے پر ہواے جلوۂ ناز

نپوچھ وسعت میخانۂ جنون غالب
جہان یہ کاسۂ گردون ہے ایک خاک انداز

وسعت سعی کرم دیکھ کہ سرتاسر خاک
گذرے ہے آبلہ پا ابر گہربار ہنوز

یک قلم کاغذ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت
نقش پا مین ہے تپ گرمیِ رفتار ہنوز

نہ گل نغمہ ہون نہ پردۂ ساز
مین ہون اپنی شکست کی آواز

تو اور آرایش خم کاکل
مین اور اندیشہاے دور دراز

لاف تمکین فریب سادہ دلی
ہم ہین اور رازہاے سینہ گداز

ہون گرفتارِ الفتِ صیاد
ورنہ باقی ہے طاقت پرواز

وہ بھی دن ہو کہ اوس ستمگر سے
ناز کھینچون بجاے حسرت ناز

نہین دل مین مرے وہ قطرۂ خون
جس سے مژگان ہوئی نہو گلباز

اے ترا غمزہ یک قلم انگیز
اے ترا ظلم سربسر انداز

اے ترا غمزہ یک قلم انگیز
اے ترا ظلم سربسر انداز

تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو
ریزشِ سجدہ جبینِ نیاز

مجکو پوچھا تو کچھ غضب نہوا
مین غریب اور تو غریب نواز

اسد اللہ خان تمام ہوا
اے دریغا وہ رند شاہد باز

مژدہ اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے
دامِ خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس

جگرِ تشنۂ آزار تسلی نہوا
جوئے خون ہمنے بہائی بنِ ہر خار کے پاس

مند گئین کھولتے ہی کھولتے آنکھین ہے ہے
خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس

مین بھی رک رک کے نہ مرتا جو زبان کے بدلے
دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس

دہنِ شیر مین جا بیٹھیے لیکن اے دل
نہ کھڑے ہوجیے خوبانِ دل آزار کے پاس

دیکھ کر مجکو چمن بسکہ نمو کرتا ہے
خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس

مر گیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی ہے ہے
بیٹھنا اوسکا وہ آکر تری دیوار کے پاس

لیوے گر خس جوہر طراوت سبزۂ خط سے
لگادے خانۂ آئینہ مین روئے نگار آتش

فروغِ حسن سے ہوتی ہے حلِ مشکلِ عاشق
نہ نکلے شمع کے پا سے نکالے گر نہ خار آتش

جادۂ رہ خور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع
چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع

رخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیِ شمع
ہوئی ہے آتشِ گل آبِ زندگانیِ شمع

زبانِ اہلِ زبان مین ہے مرگ خاموشی
یہ بات بزم مین روشن ہوئی زبانیِ شمع

کرے ہے صرف بایمائے شعلہ قصہ تمام
بطرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیِ شمع

غم اسکو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ
ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیِ شمع

ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے
بجلوہ ریزیِ باد و بہ پرفشانیِ شمع

نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ
شگفتگی ہے شہیدِ گلِ خزانیِ شمع

جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجکو
نکیون ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیِ شمع

بیمِ رقیب سے نہین کرتے وداعِ ہوش
مجبور یہان تلک ہوئے اے اختیار حیف

جلتا ہے دل کہ کیون نہ ہم اکبار جل گئے
اے ناتمامیِ نفسِ شعلہ بار حیف

زخم پر چھڑکین کہان طفلانِ بے پروا نمک
کیا مزا ہوتا اگر پتھر مین بھی ہوتا نمک

گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل
ورنہ ہوتا ہے جہان مین کسقدر پیدا نمک

مجھکو ارزانی رہے تجھکو مبارک ہوجیو
نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک

شورِ جولان تھا کنارِ بحر پر کسکا کہ آج
گردِ ساحل ہے بزخمِ موجۂ دریا نمک

داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی واہ واہ
یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وہ جسجا نمک

چھوڑکر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے
دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہین اعضا نمک

غیر کی منت نکھینچون گا پئے توفیرِ درد
زخم مثلِ خندۂ قاتل ہے سراپا نمک

یاد ہین غالب تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق مین
زخم سے گرتا تو پلکون سے مین چنتا تھا نمک

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

دامِ ہر موج مین ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھین کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کرون خونِ جگر ہونے تک

ہمنے مانا کہ تغافل نکروگے لیکن
خاک ہوجاینگے ہم تمکو خبر ہونے تک

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
مین بھی ہون ایک عنایت کی نظر ہونے تک

یک نظر بیش نہین فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ مین جلتی ہے سحر ہونے تک

گو مجھکو ہے یقین اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دل بیمدعا نہ مانگ

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھسے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ہے کس قدر ہلاک فریب وفاے گل
بلبل کے کاروبار پہ ہین خندہاے گل

آزادی نسیم مبارک کہ ہر طرف
ٹوٹے پڑے ہین حلقۂ دام ہواے گل

جو تھا سو موج رنگ کے دھوکے مین مر گیا
اے واے نالۂ لب خونین نواے گل

خوش حال اس حریف سیہ مست کا کہ جو
رکھتا ہو مثل سایۂ گل سر بپاے گل

ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لیے بہار
میرا رقیب ہے نفس عطرساے گل

شرمندہ رکھتے ہین مجھے باد بہار سے
میناے بے شراب و دل بے ہواے گل

سطوت سے تیرے جلوۂ حسن غیور کے
خون ہے مری نگاہ مین رنگ اداے گل

تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آجتک
بے اختیار دوڑے ہے گل در قفاے گل

غالب مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو
جسکا خیال ہے گل جیب قباے گل

غم نہین ہوتا ہے آزادون کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہین روشن شمع ماتم خانہ ہم

محفلین برہم کرے ہے گنجفہ باز خیال
ہین ورق گردانی نیرنگ یک بتخانہ ہم

۶۵

...او جو دیک جہان ہنگامہ پیدائی ہین　　ہین چراغان شبستان دل پروانہ ہم

ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترک جستجو　　ہین وبال تکیہ گاہ ہمت مردانہ ہم

دائم الحبس اسمین ہین لاکھون تمنائین اسد
جانتے ہین سینہ پرخون کو زندان خانہ ہم

نالہ حاصل دلبستگی فراہم کر　　متاع خانہ زنجیر جز صدا معلوم

...و دیار غیر مین مارا وطن سے دور　　رکھلی ہے خدا نے مری بیکسی کی شرم

وہ حلقہ ہاے زلف کمین مین ہین اے خدا　　رکھیو میرے دعوی وارستگی کی شرم

لون دام بخت خفتہ سے اک خواب خوش ولے　　غالب یہ خوف ہے کہ کہان سے ادا کرون

وہ فراق اور وہ وصال کہان　　وہ شب و روز و ماہ و سال کہان

فرصت کاروبار شوق کسے　　ذوق نظارہ جمال کہان

دل تو دل وہ دماغ بھی نرہا　　شور سوداے خط و خال کہان

تھی وہ اک شخص کے تصور سے　　اب وہ رعنائے خیال کہان

ایسا آسان نہین لہو رونا / دل مین طاقت جگر مین حال کہان

ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق / وان جو جاوین گرہ مین مال کہان

فکر دنیا مین سر کھپاتا ہون / مین کہان اور یہ وبال کہان

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب / وہ عناصر مین اعتدال کہان

کی وفا ہم سے تو غیر اسکو جفا کہتے ہین / ہوتی آئی ہے کہ اچھونکو برا کہتے ہین

آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر اونسے / کہنے جاتے تو ہین پر دیکھیے کیا کہتے ہین

اگلے وقتونکے ہین یہ لوگ انھین کچھ نہ کہو / جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہین

دل مین آجاے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے / اور پھر کونسے نالیکو رسا کہتے ہین

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود / قبلے کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہین

پاے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے / خار رہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہین

اک شرر دلمین ہے اوس سے کوئی گھبرایگا کیا / آگ مطلوب ہے ہمکو جو ہوا کہتے ہین

دیکھیے لاتی ہے اوس شوخ کی نخوت کیا رنگ / اوسکی ہر بات پہ ہم نام خدا کہتے ہین

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہوین شاید / مر گیا غالب آشفتہ نوا کہتے ہین

آبرو کیا خاک اُس گل کی کہ گلشن مین نہین — ہے گریبان ننگ پیراہن جو دامن مین نہین

ضعف سے ای گریہ کچھ باقی مرے تن مین نہین — (مطلع ثانی) رنگ ہو کر اوڑ گیا جو خون کہ دامن مین نہین

ہو گئے ہین جمع اجزاے نگاہ آفتاب — ذرّے اوسکے گھر کی دیوارونکے روزن مین نہین

کیا کہون تاریکی زندان غم اندھیر ہے — پنبہ نور صبح سے کم جسکے روزن مین نہین

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویران ساز سے — انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن مین نہین

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن — غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن مین نہین

بسکہ ہین ہم اک بہار ناز کے مارے ہوئے — جلوہ گل کے سوا گرد اپنے مدفن مین نہین

قطرہ قطرہ اک ہیولی ہے نئے ناسور کا — خون بھی ذوق درد سے فارغ مرے تن مین نہین

لیگئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری — موج مے کی آج رگ مینا کی گردن مین نہین

ہو فشار ضعف مین کیا ناتوانی کی نمود — قد کے جھکنے کی بھی گنجایش مرے تن مین نہین

تھی وطن مین شان کیا غالب کہ ہو غربت مین قدر
بے تکلف ہون وہ مشت خس کہ گلخن مین نہین

عہدے سے مدح ناز کے باہر نہ آسکا — گر اک ادا ہو تو اوسے اپنی قضا کہون

حلقے ہین چشمہاے کشادہ بسوے دل — ہر تار زلف کو نگہ سرمہ سا کہون

مین اور صد ہزار نواے جگر خراش — تو اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہون

کہ کیا کہون

ظالم مرے گمان سے مجھے منفعل نچاہ
ہے ہے خدا نکردہ تجھے بیوفا کہون

مہربان ہو کے بلا لو مجھے چاہو جسوقت
مین گیا وقت نہین ہون کہ پھر آ بھی نسکون

ضعف مین طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سر تو نہین ہے کہ اوٹھا بھی نسکون

زہر ملتا ہی نہین مجکو ستمگر ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نسکون

ہمسے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایکدن
ورنہ ہم چھیڑینگے رکھکر عذر مستی ایکدن

غرۂ اوج بناے عالم امکان نہو
اس بلندی کے نصیبون مین ہے پستی ایکدن

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہان
رنگ لاویگی ہماری فاقہ مستی ایکدن

نغمہ ہاے غم کو بھی ایدل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائیگا یہ ساز ہستی ایکدن

دھول دھپا اوس سراپا ناز کا شیوہ نہین
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیشدستی ایکدن

ہمپر جفا سے ترک وفا کا گمان نہین
اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحان نہین

کس منہ سے شکر کیجیے اس لطف خاص کا
پرسش ہے اور پاے سخن درمیان نہین

ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز
نامہربان نہین ہے اگر مہربان نہین

بوسہ نہین نہ دیجیے دشنام ہی سہی — آخر زبان تو رکھتے ہو تم گر دہان نہین

قطعہ

ہر چند جانگدازیِ قہر و عتاب ہے — ہر چند پشت گرمیِ تاب و توان نہین

جان مطربِ ترانۂ ہل من مزید ہے — لب پردہ سنجِ زمزمۂ الامان نہین

خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہو دو نیم — دل مین چھری چبھو مژہ گر خون چکان نہین

ہے ننگِ سینہ دل اگر آتشکدہ نہو — ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشان نہین

نقصان نہین جنون مین بلا سے ہو گھر خراب — سو گز زمین کے بدلے بیابان گران نہین

کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سرنوشت مین — گویا جبین پہ سجدۂ بت کا نشان نہین

پاتا ہون اوس سے داد کچھ اپنے کلام کی — روح القدس اگرچہ مرا ہمزبان نہین

جان ہے بہاے بوسہ ولے کیون کہے ابھی — غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جان نہین

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہین — ایک چکر ہے مرے پاؤن مین زنجیر نہین

شوق اوس دشت مین دوڑائے ہے مجھکو کہ جہان — جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہین

حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے — جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہین

رنجِ نومیدیِ جاوید گوارا رہیو — خوش ہون گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہین

سر کھجاتا ہے جہان زخمِ سر اچھا ہو جاے — لذتِ سنگ باندازۂ تقریر نہین

جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے — کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

مت مردمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں — ہیں جمع سویدائے دلِ چشم میں آہیں

برشکال گریۂ عاشق ہے دیکھا چاہیے — کھل گئی مانندِ گل سو جا سے دیوارِ چمن
الفتِ گل سے غلط ہے دعویٔ وارستگی — سرو ہے با وصفِ آزادی گرفتارِ چمن

عشق تاثیر سے نومید نہیں — جاں سپاری شجرِ بید نہیں
سلطنت دست بدست آئی ہے — جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں
ہے تجلی تری سامانِ وجود — ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں
رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے — ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں
گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے — غمِ محرومیٔ جاوید نہیں

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

جہان تیرا نقش قدم دیکھتے ہین
خیابان خیابان ارم دیکھتے ہین

دل آشفتگان خال کنج دہن کے
سویدا مین سیر عدم دیکھتے ہین

ترے سرو قامت سے اک قد آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہین

تماشا کہ اے محو آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہین

سراغ تف نالہ لے داغ دل سے
کہ شبرو کا نقش قدم دیکھتے ہین

بنا کر فقیرون کا ہم بھیس غالب
تماشاے اہل کرم دیکھتے ہین

ملتی ہے خوے یار سے نار التہاب مین
کافر ہون گر نملتی ہو راحت عذاب مین

کب سے ہون کیا بتاؤن جہان خراب مین
شبہاے ہجر کو بھی رکھون گر حساب مین

تا پھر نہ انتظار مین نیند آئے عمر بھر
آنیکا عہد کر گئی آئے جو خواب مین

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھون
مین جانتا ہون جو وہ لکھین گے جواب مین

مجھ تک کب انکی بزم مین آتا تھا دور جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب مین

جو منکر وفا ہو فریب اوسپہ کیا چلے
کیون بدگمان ہون دوست سے دشمن کی باب مین

مین مضطرب ہون وصل مین خوف رقیب سے
ڈالا ہے تمکو وہم نے کس پیچ تاب مین

مین اور حظِ وصل خدا ساز بات ہے
جان نذر دینی بھول گیا اضطراب مین

ہی تیوری چڑہی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب مین

لاکھون لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھون بناؤ ایک بگڑنا عتاب مین

وہ نالہ دل مین خس کی برابر جگہ نپاے
جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب مین

وہ سحر مدعا طلبی مین نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ روان ہو سراب مین

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہون روزِ ابر و شبِ ماہتاب مین

کل کے لیے کر آج نہ خست شراب مین
یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کی باب مین

ہین آج کیون ذلیل کہ کل تک نتھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب مین

جان کیون نکلنے لگتی ہی تن سے دمِ سماع
گر وہ صدا سمائی ہی چنگ و رباب مین

رَو مین ہی رخشِ عمر کہان دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب مین

اوتنا ہی مجکو اپنی حقیقت سے بعد ہے
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہون پیچ و تاب مین

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیران ہون پھر مشاہدہ ہی کس حساب مین

ہی مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر
یان کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب مین

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہین کتنے بے حجاب کہ یون ہین حجاب مین

آرائش جمال سے فارغ نہین ہنوز
پیش نظر ہے آئنہ دائم نقاب مین

ہے غیب غیب جسکو سمجھتے ہین ہم شہود
ہین خواب مین ہنوز جو جاگے ہین خواب مین

غالب ندیم دوست سے آتی ہی بوے دوست
مشغول حق ہون بندگی بوتراب مین

حیران ہون دل کو روؤن کہ پیٹون جگر کو مین
مقدور ہو تو ساتھ رکھون نوحہ گر کو مین

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لون
ہر اک سے پوچھتا ہون کہ جاؤن کدھر کو مین

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
ای کاش جانتا نہ تری رہگذر کو مین

ہے کیا جو کسکے باندھیے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہین ہون تمھاری کمر کو مین

لو وہ بھی کہتے ہین کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو مین

چلتا ہون تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہین ہون ابھی راہبر کو مین

خواہش کو احمقون نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہون اوس بت بیداد گر کو مین

پھر بیخودی مین بھول گیا راہ کوی یار
جاتا وگرنہ ایکدن اپنی خبر کو مین

اپنے پہ کر رہا ہون قیاس اہل دہر کا
سمجھا ہون دلپذیر متاع ہنر کو مین

غالب خدا کرے کہ سوار سمند ناز
دیکھون علی بہادر عالی گہر کو مین

ذکر میرا بہ بدی بھی اوسے منظور نہین
غیر کی بات بگڑ جاے تو کچھ دور نہین

وعدہ سیر گلستان ہے خوشا طالع شوق
مژدہ قتل مقدر ہے جو مذکور نہین

شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہین کہ ہے پر ہمین منظور نہین

قطرہ اپنا بھی حقیقت مین ہی دریا لیکن
ہمکو تقلید تنکظرفی منصور نہین

حسرت ای ذوق خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی
عشق پر عربدہ کی گون تن رنجور نہین

مین جو کہتا ہون کہ ہم لینگے قیامت مین تمھین
کس رعونت سے وہ کہتے ہین کہ ہم حور نہین

ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ اتا ہے
تو تغافل مین کسی رنگ سے معذور نہین

صاف دردی کش پیمانہ جم ہین ہم لوگ
واے وہ بادہ کہ افشردہ انگور نہین

ہون ظہوری کے مقابل مین خفائی غالب
میرے دعوی پہ یہ حجت ہی کہ مشہور نہین

نالہ جز حسن طلب ای ستم ایجاد نہین
ہی تقاضای جفا شکوہ بیداد نہین

عشق و مزدوری عشرتگہ خسرو کیا خوب
ہمکو تسلیم نکونامی فرہاد نہین

کم نہین وہ بھی خرابی مین پہ وسعت معلوم
دشت مین ہی مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہین

اہل بینش کو ہے طوفان حوادث مکتب
لطمہ موج کم از سیلی استاد نہین

وای محرومی تسلیم و بدا حال وفا
جانتا ہے کہ ہمین طاقت فریاد نہین

رنگ تمکین گل و لالہ پریشان کیون ہے
گر چراغان سر رہگذر باد نہین

سبد گل کے تلے بند کرے ہی گلچین
مژدہ اے مرغ کہ گلزار مین صیاد نہین

نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا
دی ہے جاے دہن اوسکو دم ایجاد نہین

کم نہین جلوہ گری مین ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہی ولے اسقدر آباد نہین

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تمکو بیمہری یاران وطن یاد نہین

دونون جہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یان آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کرین

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتا نپائین تو ناچار کیا کرین

کیا شمع کے نہین ہین ہوا خواہ اہل بزم
ہو غم ہی جانگداز تو غمخوار کیا کرین

ہوگئی ہی غیر کی شیرین بیانی کارگر
عشق کا اوسکو گمان ہم بیزبانون پر نہین

قیامت ہی کہ سن لیلی کا دشت قیس مین آنا
تعجب سے وہ بولا یون بھی ہوتا ہی زمانے مین

دل نازک پہ اوسکے رحم آتا ہی مجھے غالب
نکر سرگرم اوس کافر کو الفت آزمانے مین

دل لگا کر لگ گیا اونکو بھی تنہا بیٹھنا
بارے اپنی بیکسی کی ہمنے پائی داد یان

ہین زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردون ہے چراغِ رہگذرِ باد یان

یہ ہم جو ہجر مین دیوار و در کو دیکھتے ہین
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہین

وہ آئے گھر مین ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اونکو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہین

نظر لگے نہ کہین اوسکے دست و بازو کو
یہ لوگ کیون مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہین

ترے جواہرِ طرفِ کلہ کو کیا دیکھین
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہین

نہین کہ مجھکو قیامت کا اعتقاد نہین
شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہین

کوئی کہے کہ شبِ مہ مین کیا برائی ہے
بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہین

جو آؤن سامنے اونکے تو مرحبا نکہین
جو جاؤن وان سے کہین کو تو خیر باد نہین

کبھی جو یاد بھی آتا ہون مین تو کہتے ہین
کہ آج بزم مین کچھ فتنہ و فساد نہین

علاوہ عید کے ملتی ہی اور دن بھی شراب
گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہین

جہان مین ہو غم و شادی بہم ہمین کیا کام
دیا ہے ہمکو خدا نے وہ دل کہ شاد نہین

تم اونکے وعدے کا ذکر اون سے کیون کرو غالب

یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہین

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہین
ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہین

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے
ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہین

تیری فرصت کے مقابل اے عمر
برق کو پا بہ حنا باندھتے ہین

قید ہستی سے رہائی معلوم
اشک کو بے سر و پا باندھتے ہین

نشۂ رنگ سے ہے واشد گل
مست کب بند قبا باندھتے ہین

غلطیہاے مضامین مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہین

اہل تدبیر کی واماندگیان
آبلون پر بھی حنا باندھتے ہین

سادہ پرکار ہین خوبان غالب
ہم سے پیمان وفا باندھتے ہین

زمانہ سخت کم آزار ہے بجان اسد
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہین

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہین ہون مین
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہین ہون مین

کیون گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہون پیالہ و ساغر نہین ہون مین

یارب زمانہ مجھکو مٹاتا ہے کس لیے
لوح جہان پہ حرف مکرر نہین ہون مین

حد چاہیے سزا مین عقوبت کیواسطے
آخر گناہگار ہون کافر نہین ہون مین

کسواسطے عزیز نہین جانتے مجھے
لعل و زمرد و زر و گوہر نہین ہون مین

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھونسے کیون دریغ
رتبے مین مہر و ماہ سے کمتر نہین ہون مین

کرتے ہو مجکو منع قدمبوس کس لیے
کیا آسمان کے بھی برابر نہین ہون مین

غالبؔ وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے جو کہتے تھے نوکر نہین ہون مین

سب کہان کچھ لالہ و گل مین نمایان ہوگئین
خاک مین کیا صورتین ہونگی کہ پنہان ہوگئین

یاد تھین ہمکو بھی رنگارنگ بزم آرائیان
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیان ہوگئین

تھین بنات النعش گردون دنکو پردے مین نہان
شب کو انکے جی مین کیا آئی کہ عریان ہوگئین

قید مین یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھین روزن دیوار زندان ہوگئین

سب رقیبون سے ہون ناخوش پر زنان مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محو ماہ کنعان ہوگئین

جوی خون آنکھون سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
مین یہ سمجھونگا کہ شمعین دو فروزان ہوگئین

ان پریزادون سے لینگے خلد مین ہم انتقام
قدرت حق سے یہی حورین اگر وان ہوگئین

نیند اوسکی ہے دماغ اوسکا ہے راتین اوسکی ہین
تیری زلفین جسکی بازو پر پریشان ہوگئین

مین چمن مین کیا گیا گویا دبستان کھل گیا
بلبلین سنکر مرے نالے غزلخوان ہوگئین

وہ نگاہین کیون ہوئی جاتی ہین یارب دلکے پار
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگان ہو گئین

بس کہ روکا مین نے اور سینے مین ابھرین پے بہ پے
میری آہین بخیۂ چاکِ گریبان ہو گئین

وان گیا بھی مین تو انکی گالیونکا کیا جواب
یاد تھین جتنی دعائین صرفِ دربان ہو گئین

جان فزا ہے بادہ جسکے ہاتھ مین جام آگیا
سب لکیرین ہاتھ کی گویا رگِ جان ہو گئین

ہم موحد ہین ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتین جب مٹ گئین اجزای ایمان ہو گئین

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلین مجھ پر پڑین اتنی کہ آسان ہو گئین

یون ہی گر روتا رہا غالب تو ای اہلِ جہان
دیکھنا ان بستیون کو تم کہ ویران ہو گئین

دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہین
یعنی ہماری جیب مین اک تار بھی نہین

دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم مین طاقتِ دیدار بھی نہین

ملنا ترا اگر نہین آسان تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہین

بے عشق عمر کٹ نہین سکتی ہی اور یان
طاقت بقدرِ لذتِ آزار بھی نہین

شوریدگی کے ہاتھ سے ہی سر وبالِ دوش
صحرا مین ای خدا کوئی دیوار بھی نہین

گنجایشِ عداوتِ اغیار اک طرف
یان دل مین ضعف سے ہوسِ یار بھی نہین

ڈر نالہ ہای زار سے میرے خدا کو مان
آخر نوای مرغِ گرفتار بھی نہین

دل مین ہے یار کی صفِ مژگان سے روکشی
حال انکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہین

اس سادگی پہ کون نہ مرجای اے خدا
لڑتے ہین اور ہاتھ مین تلوار بھی نہین

دیکھا اسد کو خلوت و جلوت مین بارہا
دیوانہ گر نہین ہی تو ہشیار بھی نہین

نہین ہی زخم کوئی بخیے کے درخور مرے تن مین
ہوا ہی تارِ اشکِ یاس رشتہ چشمِ سوزن مین

ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی
کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن مین

ودیعت خانۂ بیداد کاوشہای مژگان ہون
نگینِ نامِ شاہد ہے مرا ہر قطرہ خون تن مین

بیان کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستان کی
شبِ مہ ہو جو رکھدین پنبہ دیوارون کے روزن مین

نکوہش مانعِ بے ربطیِ شورِ جنون آئی
ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن مین

ہوے اوس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پر افشان جوہر آئینے مین مثلِ ذرہ روزن مین

نجانون نیک ہون یا بد ہون پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہون تو ہون گلخن مین جو خس ہون تو ہون گلشن مین

ہزارون دل دیے جوشِ جنونِ عشق نے مجکو
سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خون تن مین

اسد زندانیِ تاثیرِ الفتہای خوبان ہون
خمِ دستِ نوازش ہو گیا ہے طوق گردن مین

مزے جہان کے اپنی نظر مین خاک نہین
سوای خونِ جگر سو جگر مین خاک نہین

غبار ہوئے پہ ہوا اوڑا لیجائے | وگرنہ تاب و توان بال و پر مین خاک نہین

کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے | کہ غیر جلوۂ گل رہگزر مین خاک نہین

بھلا اوسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا | اثر مرے نفس بے اثر مین خاک نہین

خیال جلوۂ گل سے خراب ہین مکش | شرابخانے کی دیوار و در مین خاک نہین

ہوا ہون عشق کی غارتگری سے شرمندہ | سوائے حسرت تعمیر گھر مین خاک نہین

ہمارے شعر ہین اب صرف دل لگی کے اسد
کھلا کہ فائدہ عرض ہنر مین خاک نہین

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیون | روئین گے ہم ہزار بار کوئی ہمین ستائے کیون

دیر نہین حرم نہین در نہین آستان نہین | بیٹھے ہین رہگزر پہ ہم غیر ہمین اوٹھائے کیون

جب وہ جمال دلفروز صورت مہر نیمروز | آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے مین منہ چھپائے کیون

دشنۂ غمزہ جانستان ناوک ناز بے پناہ | تیرا ہی عکس رخ سہی سامنے تیرے آئے کیون

قید حیات و بند غم اصل مین دونون ایک ہین | موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیون

حسن اور اوسپہ حسن ظن رہ گئی بلہوس کی شرم | اپنے پہ اعتماد ہے اور کو آزمائے کیون

وان وہ غرور عز و ناز یان یہ حجاب پاس وضع | راہ مین ہم ملین کہان بزم مین وہ بلائے کیون

ہان وہ نہین خدا پرست جاؤ وہ بیوفا سہی | جسکو ہو دین و دل عزیز اوسکی گلی مین جائے کیون

غالبؔ خستہ کے بغیر کونسے کام بند ہین
روئیے زار زار کیا کیجیے ہاے ہاے کیون

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یون
بوسہ کو پوچھتا ہون مین منہ سے مجھے بتا کہ یون

پرسش طرز دلبری کیجیے کیا کہ بن کہے
اوسکے ہر اک اشارہ سے نکلے ہے یہہ ادا کہ یون

رات کے وقت مے پیے ساتھہ رقیب کو لیے
آئے وہ یہان خدا کرے پر نکرے خدا کہ یون

غیر سے رات کیا بنی یہہ جو کہا تو دیکھیے
سامنے آن بیٹھنا اور یہہ دیکھنا کہ یون

بزم مین اوسکے روبرو کیون نہ خموش بیٹھیے
اوسکی تو خامشی مین بھی ہے یہی مدعا کہ یون

مینے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی
سنکے ستم ظریف نے مجھکو اوٹھا دیا کہ یون

مجھسے کہا جو یار نے جاتے ہین ہوش کس طرح
دیکھکے میری بیخودی چلنے لگی ہوا کہ یون

کب مجھے کوی یار مین رہنے کی وضع یاد تھی
آئینہ دار بنگئی حیرت نقش پا کہ یون

گر ترے دل مین ہو خیال وصل مین شوق کا زوال
موج محیط آب مین مارے ہے دست و پا کہ یون

جو یہہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشک فارسی
گفتۂ غالبؔ ایکبار پڑھ کے اوسے سنا کہ یون

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو
کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو

بقدر حسرت دل چاہیے ذوق معاصی بھی
بھرون یک گوشۂ دامن گر آب ہفت کشور ہو

اگر وہ سرو قد گرم خرام ناز آجاوے
کفِ ہر خاکِ گلشن شکل قمری نالہ فرسا ہو

کعبہ مین جارہا تو نہ دو طعنہ کیا کہین
بھولا ہون حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو

طاعت مین تا رہے نہ مے و انگبین کی لاگ
دوزخ مین ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

ہون منحرف نہ کیون رہ و رسمِ ثواب سے
ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سرنوشت کو

غالب کچھ اپنی سعی سے لہنا نہین مجھے
خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

وارستہ اس سے ہین کہ محبت ہی کیون نہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیون نہو

چھوڑا نہ مجھ مین ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بار نقشِ محبت ہی کیون نہو

ہے مجکو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ
ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیون نہو

پیدا ہوئی ہے کہتے ہین ہر درد کی دوا
یون ہو تو چارۂ غمِ الفت ہی کیون نہو

ڈالا نہ بیکسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہون خجالت ہی کیون نہو

ہے آدمی بجای خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہین خلوت ہی کیون نہو

ہنگامۂ زبونی ہمت ہے انفعال
حاصل نکیجے دہر سے عبرت ہی کیون نہو

وارستگی بہانۂ بیگانگی نہین
اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیون نہو

مٹتا ہی فوت فرصت ہستی کا غم کوئی — عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہو

اوس فتنہ خو کے در سے اب اوٹھتے نہیں اسد
اسمیں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہو

قفس میں ہوں گر اچھا بھی نجانیں میرے شیون کو — مرا ہونا برا کیا ہے نوا سنجان گلشن کو

نہیں گر ہمدمی آسان نہو یہ رشک کیا کم ہے — ندی ہوتی خدایا آرزوی دوست دشمن کو

نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اوس جراحت پر — کیا سینے میں جسنے خونچکان مژگان سوزن کو

خدا شرمائے ہاتھون کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں — کبھی میرے گریبان کو کبھی جانان کے دامن کو

ابھی ہم قتلگہ کا دیکھنا آسان سمجھتے ہیں — نہیں دیکھا شناور جوی خون میں تیرے توسن کو

ہوا چرچا جو میرے پانو کی زنجیر بننے کا — کیا بیتاب کان میں جنبش جوہر نے آہن کو

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے — سمجھتا ہون کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے — مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ خو مجھکو — جہان تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یون بیخبر سوتا — رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہون رہزن کو

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہون جواہر کے — جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جاکے معدن کو

مرے شاہ سلیمان جاہ سے نسبت نہیں غالب

فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

دھوتا ہون جب مین پینے کو اوس سیمتن کی پانو
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو

دی سادگی سے جان پڑون کوہکن کے پانو
ہیہات کیون نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو

بھاگے تھے ہم بہت سو اوسی کی سزا ہے یہ
ہوکر اسیر دابتے ہین راہزن کے پانو

مرہم کی جستجو مین پھرا ہون جو دور دور
تن سے سوا فگار ہین اس خستہ تن کے پانو

اللہ رے ذوق دشت نوردی کہ بعد مرگ
ہلتے ہین خود بخود مرے اندر کفن کے پانو

ہے جوش گل بہار مین یان تک کہ ہر طرف
اوڑتے ہوئے اولجھتے ہین مرغ چمن کے پانو

شب کو کسیکے خواب مین آیا نہو کہین
دکھتے ہین آج اوس بت نازکبدن کے پانو

غالب مرے کلام مین کیونکر مزا نہو
پیتا ہون دھوکے خسرو شیرین سخن کے پانو

وان اوسکو ہول دل ہے تو یان مین ہون شرمسار
یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہو

اپنے کو دیکھتا نہین ذوق ستم تو دیکھ
آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہو

وان پہنچکر جو غش آتا پی ہم ہے ہمکو
صد رہ آہنگ زمین بوس قدم ہے ہمکو

دل کو مین اور مجھے دل محو وفا رکھتا ہے
کسقدر ذوق گرفتاری ہم ہے ہمکو

ضعف سے نقشِ پئے مور ہے طوقِ گردن
ترے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہمکو

جانکر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو
یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہمکو

رشکِ ہمطرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزین
نالۂ مرغِ سحر تیغِ دو دم ہے ہمکو

سر اوڑانے کے جو وعدیکو مکرر چاہا
ہنسکے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہمکو

دل کے خون کرنیکی کیا وجہ ولیکن ناچار
پاسِ بیرونقیِ دیدہ اہم ہے ہمکو

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغان کہتے ہو
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہمکو

ق

لکھنو آنیکا باعث نہیں کھلتا یعنی
ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہمکو

لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہمکو

تم جانو تمکو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھکو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

کیا وہ بھی بیگنہ کش و حق ناشناس ہین
مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو

اوبھرا ہوا نقاب مین ہے اونکے ایک تار
مرتا ہون مین کہ یہ نہ کسیکی نگاہ ہو

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

سنتے ہین جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ ترا جلوہ گاہ ہو

غالب بھی گر نہو تو کچھ ایسا ضرر نہین
دنیا ہو یارب اور مرا پادشاہ ہو

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو
کہے سے کچھ نہوا پھر کہو تو کیونکر ہو

ہمارے ذہن مین اس فکر کا ہی نام وصال
کہ گر نہو تو کہان جائین ہو تو کیونکر ہو

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے
حیا ہے اور یہی گومگو تو کیونکر ہو

تمھین کہو کہ گزارا صنم پرستون کا
بتون کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو

اولجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر مین ہون ایکدو تو کیونکر ہو

جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نکہے رات کو تو کیونکر ہو

ہمین پھر اونسے امید اور اونھین ہماری قدر
ہماری بات ہی پوچھین نہ وو تو کیونکر ہو

غلط نتھا ہمین خط پر گمان تسلی کا
نمانے دیدۂ دیدار جو تو کیونکر ہو

بتاؤ اوس مژہ کو دیکھکر کہ مجکو قرار
یہ نیش ہو رگ جان مین فرو تو کیونکر ہو

مجھے جنون نہین غالب ولے بقول حضور
فراق یار مین تسکین ہو تو کیونکر ہو

کسیکو دیکے دل کوئی نواسنج فغان کیون ہو
نہو جب دل ہی سینے مین تو پھر منہ مین زبان کیون ہو

وہ اپنی خو نچھوڑینگے ہم اپنی وضع کیون چھوڑین
سبکسر بنکے کیا پوچھین کہ ہم سے سرگران کیون ہو

کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نلاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازدان کیون ہو

وفا کیسی کہان کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستان کیون ہو

قفس مین مجھسے رودادِ چمن کہتے نڈر ہمدم
گری ہے جسپہ کل بجلی وہ میرا آشیان کیون ہو

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل مین نہین ہین پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل مین تمھین تم ہو تو آنکھون سے نہان کیون ہو

غلط ہے جذب دل کا شکوہ دیکھو جرم کسکا ہے
نکھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیان کیون ہو

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جسکے دشمن اسکا آسمان کیون ہو

یہی ہے آزمانا تو ستانا کسکو کہتے ہین
عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحان کیون ہو

کہا تمنے کہ کیون ہو غیر کے ملنے مین رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہان کیون ہو

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنون سے تو غالب
ترے بیمہر کہنے سے وہ تجھپر مہربان کیون ہو

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہان کوئی نہو
ہم سخن کوئی نہو اور ہمزبان کوئی نہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایا نہو اور پاسبان کوئی نہو

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خوان کوئی نہو

از مہر تا بذرہ دل و دل ہے آینہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آینہ

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غمکدہ
جسکی بہار یہ ہو پھر اسکی خزان نہ پوچھ

ناچار بیکسی کی بھی حسرت اٹھائیے
دشواریِ رہ و ستمِ ہمرہان نہ پوچھ

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگان اٹھائیے
طاقت کہان کہ دید کا احسان اٹھائیے

ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق
یعنی ہنوز منتِ طفلان اٹھائیے

دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم
اے خانمان خراب نہ احسان اٹھائیے

یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجیے
یا پردۂ تبسمِ پنہان اٹھائیے

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے
بھون پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے

عاشق ہوئے ہین آپ بھی اک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی
ہان کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیے

سیکھے ہین مہ رخون کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

نشو و نما ہے اصل سے غالب فروع کو
ق
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے

ہے رنگِ لالہ و گل و نسرین جدا جدا
ہر رنگ مین بہار کا اثبات چاہیے

سرپائے خم پہ چاہیے ہنگامِ بیخودی
رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے

یعنی بحسبِ گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیے

بساطِ عجز مین تھا ایکدل اک قطرہ خون وہ بھی
سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگون وہ بھی

رہے اوس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنون وہ بھی

خیالِ مرگ کب تسکین دلِ آزردہ کو بخشے
مرے دامِ تمنا مین ہے اک صیدِ زبون وہ بھی

نہ کرتا کاش نالہ مجکو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہوگا باعثِ افزایشِ دردِ درون وہ بھی

نہ اتنا بُرّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بیتابی مین ہے اک موجِ خون وہ بھی

مئے عشرت کی خواہش ساقیِ گردون سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگون وہ بھی

مرے دل مین ہے غالب شوقِ وصل و شکوۂ ہجران
خدا وہ دن کرے جو اوس سے مین یہ بھی کہون وہ بھی

ہے بزمِ بتان مین سخن آزردہ لبون سے
تنگ آگئے ہین ہم ایسے خوشامد طلبون سے

ہے دورِ قدح وجہِ پریشانیِ صہبا
یکبار لگا دو خمِ مے میرے لبون سے

رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہین زاہد
زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبون سے

بیدادِ وفا دیکھ کہ جاتی رہی آخر
ہر چند مری جان کو تھا ربط لبون سے

۹۱

ناہمکو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا　　سن لیتے ہین گو ذکر ہمارا نہیں کرتے

غالب ترا احوال سنا دینگے ہم اونکو
وہ سنکے بلالین یہ اجارا نہیں کرتے

مضمون کیا تھا کہ ترا غم اوسے غارت کرتا　　وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

خو دیا سے گر پائے بھی فرصت مرا اوٹھانیکی　　فلک کا دیکھنا تقریب تیری یاد آنیکی
کھلے گا کسطرح مضمون میرے مکتوب کا یارب　　قسم کھائی ہے اوس کافر نے کاغذ جلانیکی
لپٹنا پرنیان مین شعلۂ آتش کا آسان ہے　　ولے مشکل ہے حکمت دل مین سوز غم چھپانیکی
اونہیں منظور اپنے زخمیون کا دیکھ آنا تھا　　اوٹھے تھے سیر گل کو دیکھنا شوخی بہانیکی
ہماری سادگی تھی التفات ناز پر مرنا　　ترا آنا نتھا ظالم مگر تمہید جانیکی
لکد کوب حوادث کا تحمل کر نہین سکتے　　مری طاقت کہ ضامن تھی بتون کے ناز اوٹھانیکی

کہون کیا خوبی اوضاع ابنائے زمان غالب
بدی کی اوسنے جس سے ہمنے کی تھی بارہا نیکی

ناامیدی سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی　　دل جوش گریہ مین ہے ڈوبی ہوئی اسامی
مین شمع کی طرح سے جسکو کوئی بجھاوے　　مین بھی جلے ہوؤن مین ہون داغ ناتمامی

کیا تنگ ہم ستمزدگان کا جہان ہے
جسمین کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرے مین جان ہے

حال انکہ ہے یہ سیلیٔ خارا سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے

کی اوسنے گرم سینۂ اہل ہوس مین جا
آوے نکیون پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

کیا خوب تمنے غیر کو بوسہ نہین دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ مین زبان ہے

بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوار یار مین
فرمانروای کشور ہندوستان ہے

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کس سے کہون کہ داغ جگر کا نشان ہے

ہے بارے اعتماد وفاداری اسقدر
غالب ہم اسمین خوش ہین کہ نامہربان ہے

درد سے میرے ہے تجکو بیقراری ہاے ہاے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہاے ہاے

تیرے دل مین گر نہ تھا آشوب غم کا حوصلہ
تونے پھر کیون کی تھی میری غمگساری ہاے ہاے

کیون مری غمخوارگی کا تجکو آیا تھا خیال
دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہاے ہاے

عمر بھر کا تونے پیمان وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہین ہے پایداری ہاے ہاے

زہر لگتی ہے مجھے آب وہواے زندگی
یعنی تجھسے تھی اسے ناسازگاری ہاے ہاے

خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری

گل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

...رم رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک مین
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہای ہای

...ل مین ناموس پیمان محبت مل گئی
اوٹھ گئی دنیا سے راہ و رسم یاری ہای ہای

...ی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک لگنے نپایا زخم کاری ہای ہای

...طرح کاٹے کوئی شبہاے تار برشکال
ہے نظر خو کردہ اختر شماری ہای ہای

...ش مہجور پیام و چشم محروم جمال
ایکدل تسپر یہ نا امیدواری ہای ہای

عشق نے پکڑا نتھا غالب ابھی وحشت کا رنگ
رہگیا تھا دلمین جو کچھ ذوق خواری ہای ہای

...ستگی مین عالم ہستی سے یاس ہے
تسکین کو دے نوید کہ مرنیکی آس ہے

...تا نہین مرے دلِ آوارہ کی خبر
ابتک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے

...یے بیان سرورِ تبِ غم کہان تلک
ہر مو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے

...ہے وہ غرورِ حسن سے بیگانۂ وفا
ہرچند اوسکے پاس دلِ حق شناس ہے

...یتعد رملے شب مہتاب مین شراب
اوس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

ہر اک مکان کو ہے مکین سے شرف اسد
مجنون جو مر گیا ہے تو جنگل اوداس ہے

گر خامشی سے فائدہ اخفای حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

کسکو سناؤن حسرت اظہار کا گلا
دل فرد جمع و خرچ زبانہای لال ہے

کس پردے مین ہے آینہ پرداز اے خدا
رحمت کہ عذر خواہ لب بے سوال ہے

ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی
ای شوق منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

مشکین لباس کعبہ علی کے قدم سے جان
ناف زمین ہے نہ کہ ناف غزال ہے

وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا
دریا زمین کو عرق انفعال ہے

ہستی کے مت فریب مین آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

تم اپنے شکوہ کی باتین نہ کھود کھود کے پوچھو
حذر کرو مرے دل سے کہ اسمین آگ دبی ہے

دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریہ سحری ہے نہ آہ نیم شبی ہے

ایک جا حرف وفا لکھا تھا سو بھی مٹ گیا
ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

جی جلے ذوق فنا کی ناتمامی پر نہ کیون
ہم نہین جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

آگ سی پانی مین بجھتی وقت اوٹھتی ہی صدا
ہر کوئی درماندگی مین نالے سے ناچار ہے

ہے وہی بدمستی ہر ذرہ کا خود عذر خواہ
جسکے جلوے سے زمین تا آسمان سرشار ہے

دستگاہِ دیدۂ خون بارِ مجنون دیکھنا
اک بیابانِ جلوۂ گل فرشِ پا انداز ہے

عشق مجھکو نہین وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہین ہے تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے مین ہے کیا رسوائی
اے وہ مجلس نہین خلوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہین ہین اپنے
غیر کو تجھسے محبت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہین غفلت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام
دل کے خون کرنیکی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہین
نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالین گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جاے اسد
گر نہین وصل تو حسرت ہی سہی

ہے آرمیدگی مین نکوہش بجا مجھے
صبحِ وطن ہے خندۂ دندان نما مجھے

ڈھونڈھے ہے اوس مغنیِ آتش نفس کو جی
جسکی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

ٹے کرون ہون وہ وادیٔ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

ے بسکہ باغ مین تو بیجا بیان
آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے

سی پہ کیون مرے دل کا معاملہ
شعرون کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

ن اپنی جب اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

م مین مجھے نہین بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے

ہی تو ہے سیاستِ دربان سے ڈر گیا
مین اور جاؤن در سے ترے بن صدا کیے

سا ہم وان بن خرقہ و سجادہ رہنِ مے
مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے

رقہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر
حضرت بھی کل کہینگے کہ ہم کیا کیا کیے

رہو تو خاک سے پوچھون کہ اے لئیم
تو نے وہ گنجہائے گرانمایہ کیا کیے

ن روز تمہین نہ تراشا کیے عدو
کسدن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے

بت مین غیر کی نہ پڑی ہو کہین یہ خو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے

ک سے اور بات مگر خو بری نہین
بھولے سے اسنے سیکڑون وعدے وفا کیے

غالب تمہین کہو کہ ملیگا جواب کیا

مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے

رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے — اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

مینائے مے ہے سرو نشاطِ بہار سے — بالِ تدرو جلوۂ موجِ شراب ہے

زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا — نے بھاگنے کی گون نہ اقامت کی تاب ہے

جاداد بادہ نوشیِ رندان ہے شش جہت — غافل گمان کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

نظارہ کیا حریف ہو اوس برقِ حسن کا — جوشِ بہار جلوہ کو جسکے نقاب ہے

مین نامراد دل کی تسلی کو کیا کرون — مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے

گزرا اسد مسرت پیغام یار سے
قاصد پہ مجھکو رشکِ سوال و جواب ہے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے — مین اسے دیکھون بھلا کب مجھسے دیکھا جائے ہے

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے مین ہے — آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے

غیر کو یارب وہ کیونکر منعِ گستاخی کرے — گر حیا بھی اوسکو آتی ہے تو شرما جائے ہے

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالے کھینچے جائیے — دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

دور چشمِ بد تری بزمِ طرب سے واہ واہ — نغمہ ہو جاتا ہے وان گر نالہ میرا جائے ہے

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق — پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہین کہ وہ پا جائے ہے

…سکی بزم آرائیان سنکر دل رنجوریان
مثل نقش مدعای غیر بیٹھا جاے ہے

…وکے عاشق وہ پریرخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جاے ہے جتنا کہ اوڑتا جاے ہے

…ش کو اوسکے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہین
کھینچتا ہے جسقدر اوتنا ہی کھنچتا جاے ہے

سایہ میرا مجھسے مثل دود بھاگے ہے اسد
پاس مجھ آتش بجان کے کس سے ٹھہرا جاے ہے

…رم فریاد رکھا شکل نہالی نے مجھے
تب امان ہجر مین دی برد لیالی نے مجھے

…سیہ ونقد دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھسے مری ہمت عالی نے مجھے

…ثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم
کر دیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے

…وس گل کا تصور مین بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پروبالی نے مجھے

کارگاہ ہستی مین لالہ داغ سامان ہے
برق خرمن راحت خون گرم دہقان ہے

غنچہ تا شگفتنہا برگ عافیت معلوم
باوجود دلجمعی خواب گل پریشان ہے

ہمسے رنج بیتابی کس طرح اوٹھایا جاے
داغ پشت دست عجز شعلہ خس بدندان ہے

اوگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب
ہم بیابان مین ہین اور گھر مین بہار آئی ہے

اوگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

سادگی بر ادسکی مرجانیکی حسرت دلمین ہے
بس نہین چلتا کہ پھر خنجر کف قاتل مین ہے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اوسنے کہا
مین نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دلمین ہے

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے باانہمہ
ذکر میرا مجھسے بہتر ہے کہ اوس محفل مین ہے

بس ہجوم ناامیدی خاک مین ملجائیگی
یہ جو اک لذت ہماری سعی بیحاصل مین ہے

رنج رہ کیون کھینچیے واماندگی کو عشق ہے
اوٹھہ نہین سکتا ہمارا جو قدم منزل مین ہے

جلوہ زار آتش دوزخ ہمارا دل سہی
فتنۂ شور قیامت کسکے آب و گل مین ہے

ہے دل شوریدۂ غالب طلسم پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل مین ہے

دل سے تری نگاہ جگر تک اوتر گئی
دونون کو اک ادا مین رضامند کر گئی

شق ہوگیا ہے سینہ خوشا لذت فراغ
تکلیف پردہ داریے زخم جگر گئی

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیان کہان
اوٹھیے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

اوڑتی پھرے ہے خاک مری کوی یار مین
باری اب اے ہوا ہوس بال و پر گئی

دیکھو تو دلفریبی انداز نقش پا
موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروی شیوۂ اہل نظر گئی

نظارہ نے بھی کام کیا وان نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا

فردا و دی کا تفرقہ یکبار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

مارا زمانے نے اسد اللہ خان تمھین
وہ ولولے کہان وہ جوانی کدھر گئی

تسکین کو ہم نہ روئین جو ذوقِ نظر ملے
حورانِ خلد مین تری صورت مگر ملے

اپنی گلی مین مجھکو نکر دفن بعدِ قتل
میرے پتے سے خلق کو کیون تیرا گھر ملے

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہین مے جسقدر ملے

تجھسے تو کچھ کلام نہین لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

تمکو بھی ہم دکھائین کہ مجنون نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہان سے گر ملے

لازم نہین کہ خضر کی ہم پیروی کرین
جانا کہ اک بزرگ ہمین ہمسفر ملے

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا
تمکو کہین جو غالبِ آشفتہ سر ملے

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی مین ہمنے ٹھانی اور ہے

آتشِ دوزخ مین یہ گرمی کہان
سوزِ غمہاے نہانی اور ہے

بارہا دیکھین ہین اون کی رنجشین
پر کچھ ابکی سرگرانی اور ہے

دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

قاطع اعمار ہین اکثر نجوم | وہ بلائے آسمانی اور ہے

ہو چکین غالب بلائین سب تمام
ایک مرگ ناگہانی اور ہے

کوئی امید بر نہین آتی | کوئی صورت نظر نہین آتی
موت کا ایکدن معین ہے | نیند کیون رات بھر نہین آتی
آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی | اب کسی بات پر نہین آتی
جانتا ہون ثواب طاعت و زہد | پر طبیعت ادھر نہین آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہون | ورنہ کیا بات کر نہین آتی
کیون نہ چیخون کہ یاد کرتے ہین | میری آواز گر نہین آتی
داغ دل گر نظر نہین آتا | بو بھی اے چارہ گر نہین آتی
ہم وہان ہین جہان سے ہمکو بھی | کچھ ہماری خبر نہین آتی
مرتے ہین آرزو مین مرنیکی | موت آتی ہے پر نہین آتی

کعبہ کس منہ سے جاؤگے غالب
شرم تمکو مگر نہین آتی

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے | آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہین مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

مین بھی منہ مین زبان رکھتا ہون
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

جب کہ تجھ بن نہین کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہین
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

شکن زلف عنبرین کیون ہے
نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے

سبزہ و گل کہان سے آئے ہین
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

ہمکو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہین جانتے وفا کیا ہے

ہان بھلا کر ترا بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے

جان تم پر نثار کرتا ہون
مین نہین جانتا دعا کیا ہے

مین نے مانا کہ کچھ نہین غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

کہتے تو ہو تم سب کہ بت غالیہ مو آئے
یکمرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے

ہو کشمکش نزع مین ہان جذب محبت
کچھ کہہ نہ سکون پر وہ مرے پوچھنے کو آئے

ہے زلزلہ و صرصر و سیلاب کا عالم
آتا ہے سمجھ مین مرے آتا نہین گو آئے

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگینگے نکیرین
ہان منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

جتلا دیے ڈرتے ہین واعظ سے جھگڑے — ہم سمجھے ہوے ہین اوسے جس بھیس مین جو آے

ہان اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت — دیکھا کہ وہ ملتا نہین اپنے ہی کو کھو آے

اپنا نہین وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھین — اوس در پہ نہین بار تو کعبے ہی کو ہو آے

کی ہمنفسون نے اثرِ گریہ مین تقریر — اچھے رہے آپ اوس سے مگر مجکو ڈبو آے

اوس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالب — ہم بھی گئے وان اور تری تقدیر کو رو آے

پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے — سینہ جویاے زخمِ کاری ہے

پھر جگر کھودنے لگا ناخن — آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز — پھر وہی پردۂ عماری ہے

چشم دلالِ جنسِ رسوائی — دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے

وہی صد رنگ نالہ فرسائی — وہی صد گونہ اشکباری ہے

دل ہواے خرامِ ناز سے پھر — محشرستانِ بیقراری ہے

جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے — روزِ بازارِ جان سپاری ہے

پھر اوسی بیوفا پہ مرتے ہین — پھر وہی زندگی ہماری ہے

قطعہ

پھر کھلا ہے در عدالت ناز
گرم بازار فوجداری ہے

ہو رہا ہے جہان مین اندھیر
زلف کی پھر سررشتہ داری ہے

پھر دیا پارۂ جگر نے سوال
ایک فریاد و آہ و زاری ہے

پھر ہوے ہین گواہ عشق طلب
اشکباری کا حکم جاری ہے

دل و مژگان کا جو مقدمہ تھا
آج پھر اوسکی روبکاری ہے

بیخودی بے سبب نہین غالب
کچھ تو ہے جسکی پردہ داری ہے

جنون تہمت کش تسکین نہو گر شادمانی کی
نمک پاش خراش دل ہے لذت زندگانی کی

کشاکش ہای ہستی سے کرے کیا سعی آزادی
ہوئی زنجیر موج آب کو فرصت روانی کی

پس از مردن بھی دیوانہ زیارتگاہ طفلان ہے
شرار سنگ نے تربت پہ میری گلفشانی کی

نکوہش ہے سزا فریادی بیداد دلبر کی
مبادا خندۂ دندان نما ہو صبح محشر کی

رگ لیلی کو خاک دشت مجنون ریشگی بخشے
اگر بووے بجای دانہ دہقان نوک نشتر کی

پر پروانہ شاید بادبان کشتی مے تھا
ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دور ساغر کی

کرون بیداد ذوق پرفشانی عرض کیا قدرت
کہ طاقت اوڑگئی اوڑنے سے پہلے میرے شہپر کی

پیر ہکہ نہان تاکہ مرے داں اوسکے یہ خیمہ کے پیچھے قیامت ہے
مری قسمت میں یارب کیا تھی دیوار پتھر کی

نے اعتدالیوں نے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنی زیادہ ہوگئے اوتنے ہی کم ہوئے

پنہان تھا دام سخت قریب آشیان کے
اوڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یان تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

سختی کشان عشق کی پوچھے ہے کیا خبر
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر مین
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

لکھتے رہے جنون کی حکایات خون چکان
ہرچند اس مین ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اللہ رے تیری تندی خو جسکے بیم سے
اجزای نالہ دل مین مرے رزق ہم ہوئے

اہل ہوس کی فتح ہے ترک نبرد عشق
جو پانو اوٹھ گئے وہی اونکے علم ہوئے

نالے عدم مین چند ہمارے سپرد تھے
جو وان نہ کھنچ سکے سو وہ یان آکے دم ہوئے

چھوڑی اسد نہ ہمنے گدائی مین دل لگی
سائل ہوئے تو عاشق اہل کرم ہوئے

جو نقد داغ دل کی کرے شعلہ پاسبانی
تو فسردگی نہان ہے بکمین بیزبانی

مجھے اوس سے کیا توقع بزمانہ جوانی
کبھی کودکی مین جسنے نہ سنی مری کہانی

یونہی دکھ کسیکو دینا نہین خوب ورنہ کہتا | کہ مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی

ظلمت کدے مین میرے شبِ غم کا جوش ہے | اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال | مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

مے نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے حجاب | اے شوق ہان اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے

گوہر کو عقدِ گردنِ خوبان مین دیکھنا | کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

دیدار بادہ حوصلہ ساقی نگاہ مست | بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل | زنہار اگر تمہین ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو | میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی | مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط | دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ | یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبحدم جو دیکھیے آکر تو بزم مین | نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی | اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہین غیب سے یہ مضامین خیال مین

غالب صریر خامہ نوای سروش ہے

آگہ میری جان کو قرار نہین ہے — طاقت بیداد انتظار نہین ہے

دیتے ہین جنت حیات دہر کے بدلے — نشۂ باندازۂ خمار نہین ہے

گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجکو — ہاے کہ رونے پہ اختیار نہین ہے

ہم سے عبث ہے گمان رنجش خاطر — خاک مین عشاق کی غبار نہین ہے

دل سے اوٹھا لطف جلوہ ہای معانی — غیر گل آینہ بہار نہین ہے

قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے — وای اگر عہد استوار نہین ہے

تو نے قسم میکشی کی کھائی ہے غالب
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہین ہے

ہجوم غم سے یان تک سرنگونی مجکو حاصل ہے — کہ تار دامن و تار نظر مین فرق مشکل ہے

رفوی زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی — سمجھیو مت کہ پاس درد سے دیوانہ غافل ہے

وہ گل جس گلستان مین جلوہ فرمائی کرے غالب
چٹکنا غنچۂ گل کا صدای خندۂ دل ہے

پا بدامن ہو رہا ہون بسکہ مین صحرا نورد — خار پا ہین جوہر آینۂ زانو مجھے

دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت — ہے نگاہ آشنا تیرا سر ہر مو مجھے

ہون سراپا سازِ آہنگ شکایت کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ لوگون مین نچھیڑے تو مجھے

جس بزم مین تو ناز سے گفتار مین آوے
جان کالبدِ صورتِ دیوار مین آوے

سایہ کی طرح ساتھ پھرین سرو و صنوبر
تو اوس قدِ دلکش سے جو گلزار مین آوے

تب نازِ گرانمایگیِ اشک بجا ہے
جب لختِ جگر دیدۂ خونبار مین آوے

دے مجکو شکایت کی اجازت کہ ستمگر
کچھ تجکو مزا بھی مرے آزار مین آوے

اوس چشمِ فسونگر کا اگر پاے اشارا
طوطی کی طرح آینہ گفتار مین آوے

کانٹون کی زبان سوکھ گئی پیاس سے یارب
اک آبلہ پا وادیِ پرخار مین آوے

مر جاؤن نکیون رشک سے جب وہ تنِ نازک
آغوشِ خمِ حلقۂ زنار مین آوے

غارتگرِ ناموس نہو گر ہوسِ زر
کیون شاہدِ گل باغ سے بازار مین آوے

تب چاکِ گریبان کا مزا ہے دلِ نالان
جب اک نفس اولجھا ہوا ہر تار مین آوے

آتشکدہ ہے سینہ مرا رازِ نہان سے
اے وای اگر معرضِ اظہار مین آوے

گنجینۂ معنی کا طلسم اوسکو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار مین آوے

حسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے
اوس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے

حسن مہ گرچہ یہ ہنگام کمال اچھا ہے
اوس سے میرا مہ خورشید جمال اچھا ہے

بوسہ دیتے نہین اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی مین کہتے ہین کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغر جم سے مرا جام سفال اچھا ہے

بےطلب دین تو مزا اوسمین سوا ملتا ہے
وہ گدا جسکو نہو خوی سوال اچھا ہے

اونکے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہین کہ بیمار کا حال اچھا ہے

دیکھیے پاتے ہین عشاق بتون سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

ہم سخن تیشہ نے فرہاد کو شیرین سے کیا
جسطرح کا کہ کسی مین ہو کمال اچھا ہے

قطرہ دریا مین جو ملجاے تو دریا ہوجاے
کام اچھا ہے وہ جسکا کہ مآل اچھا ہے

خضر سلطان کو رکھے خالق اکبر سرسبز
شاہ کے باغ مین یہ تازہ نہال اچھا ہے

ہمکو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

نہوئی گر مری مرنے سے تسلی نسہی
امتحان اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نسہی

خار خار الم حسرت دیدار تو ہے
شوق گلچین گلستان تسلی نسہی

مے پرستان خم مے منہ سے لگائے ہی بنے
ایکدن گر نہوا بزم مین ساقی نسہی

نفس قیس کہ ہے چشم و چراغ صحرا
گر نہین شمع سیہ خانۂ لیلی نسہی

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحہ غم ہی سہی نغمہ شادی نہ سہی

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالب اگر عمرِ طبیعی نہ سہی

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سائے سے سر پانو سے ہے دو قدم آگے

قضا نے تھا مجھے چاہا خراب بادۂ الفت
فقط خراب لکھا بس نہ چل سکا قلم آگے

غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی
وگرنہ ہم بھی اوٹھاتے تھے لذتِ الم آگے

خدا کے واسطے داد اس جنونِ عشق کی دینا
کہ اوسکے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اوٹھائی ہیں ہم نے
تمہارے آئیو اے طرہ ہائے خم بہ خم آگے

دل و جگر میں پرافشاں جو ایک موجۂ خوں ہے
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اوسکو دم آگے

قسم جنازے پہ آنیکی میرے کھاتے ہیں غالب
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیے تو گلا ہوتا ہے

پر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

گو سمجھتا نہیں پر حسنِ تلافی دیکھو
شکوۂ جور سے سرگرمِ جفا ہوتا ہے

عشق کی راہ میں ہے چرخ مکوکب کی وہ چال
ست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

کیون نہ ٹھہرین ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم — آپ اوٹھا لاتے ہین گر تیر خطا ہوتا ہے

خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ — کہ بھلا چاہتے ہین اور برا ہوتا ہے

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب — لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

خامہ میرا کہ وہ ہے باربدِ بزمِ سخن — شاہ کی مدح مین یون نغمہ سرا ہوتا ہے

ق

ای شہنشاہِ کواکب سپہ و مہرِ علم — ترے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے

سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے — تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے

ہر مہینے مین جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال — آستان پر ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے

مین جو گستاخ ہون آئینِ غزلخوانی مین — یہ ترا ہی کرمِ ذوق فزا ہوتا ہے

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی مین معاف — آج کچھ درد مرے دل مین سوا ہوتا ہے

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے — تمھین کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

نہ شعلے مین یہ کرشمہ نہ برق مین یہ ادا — کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تندخو کیا ہے

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے — وگرنہ خوفِ بدآموزیِ عدو کیا ہے

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن — ہماری جیب کو اب حاجت رفو کیا ہے

جلا ہے جسم جہان دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

رگون مین دوڑتے پھرنیکے ہم نہین قائل
جب آنکھ سے ہی نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

وہ چیز جسکے لیے ہمکو ہو بہشت عزیز
سوای بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

پیون شراب اگر خم بھی دیکھ لون دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

رہی نہ طاقت گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر مین غالب کی آبرو کیا ہے

مین اُنھین چھیڑون اور کچھ نہ کہین
چل نکلتے جو مے پیے ہوتے

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاشکے تم مرے لیے ہوتے

میری قسمت مین غم گر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

آ ہی جاتا وہ راہ پر غالب
کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

غیر لین محفل مین بوسے جام کے
ہم رہین یون تشنہ لب پیغام کے

خستگی کا تمسے کیا شکوہ کہ یہ
ہتھکنڈے ہین چرخ نیلی فام کے

خط لکھینگے گرچہ مطلب کچھ نہو
ہم تو عاشق ہین تمھارے نام کے

۱۱۴

رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم
دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا مگر
یہ بھی حلقے ہین تمھارے دام کے

شاہ کی ہے غسل صحت کی خبر
دیکھیے کب دن پھرین حمام کے

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک
اسکو کہتے ہین عالم آرائی

کہ زمین ہو گئی ہے سر تا سر
روکش سطح چرخ مینائی

سبزے کو جب کہین جگہ نملی
بن گیا روی آب پر کائی

سبزۂ و گل کے دیکھنے کے لیے
چشم نرگس کو دی ہے بینائی

ہے ہوا مین شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادپیمائی

کیون نہ دنیا کو ہو خوشی غالب
شاہ دین دار نے شفا پائی

تغافل دوست ہون میرا دماغ عجز عالی ہے
اگر پہلو تہی کیجے تو میری جا بھی خالی ہے

رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہونے سے
ولہ
بھرے ہین جسقدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

کب وہ سنتا ہے کہانی میری — اور پھر وہ بھی زبانی میری

خلشِ غمزۂ خونریز نہ پوچھ — دیکھ خونابہ فشانی میری

کیا بیان کر کے مرا روئینگے یار — مگر آشفتہ بیانی میری

ہون ز خود رفتۂ بیدای خیال — بھول جانا ہے نشانی میری

متقابل ہے مقابل میرا — رک گیا دیکھ روانی میری

قدر سنگ سر رہ رکھتا ہون — سخت ارزان ہے گرانی میری

گرد باد رہ بیتابی ہون — صرصر شوق ہے بانی میری

دہن اوسکا جو نہ معلوم ہوا — کھل گئی ہیچمدانی میری

کر دیا ضعف نے عاجز غالب
ننگ پیری ہے جوانی میری

نقش ناز بت طناز بآغوش رقیب — پای طاوس پی خامۂ مانی مانگے

تو وہ بدخو کہ تحیر کو تماشا جانے — غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

وہ تپ عشق تمنا ہے کہ پھر صورت شمع — شعلہ تا نبض جگر ریشہ دوانی مانگے

ولہ

گلشن کو تری صحبت ازبسکہ خوش آئی ہے — ہر غنچے کا گل ہونا آغوش کشائی ہے

وان کنگر استغنا ہر دم ہے بلندی پر		یان نالے کو اور الٹا دعوی رسائی ہے
ازبسکہ سکھاتا ہے غم ضبط کے انداز		جو داغ نظر آیا اک چشم نمائی ہے
	ولہ	
جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی		لکھدیجیو یارب اسے قسمت مین عدو کی
اچھا ہے سر انگشت حنائی کا تصور		دل مین نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی
کیون ڈرتے ہو عشاق کی بیحوصلگی سے		یان تو کوئی سنتا نہین فریاد کسو کی
	ق	
صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب		حسرت مین رہے ایک بت عربدہ جو کی
دشنے نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو		خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی
	ولہ	
سیماب پشت گرمی آئینہ دے ہے ہم		حیران کیے ہوے ہین دل بیقرار کے
آغوش گل کشودہ برای وداع ہے		ای عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے
	ولہ	
ہے وصل ہجر عالم تمکین و ضبط مین		معشوق شوخ و عاشق دیوانہ چاہیے
اوس لب سے مل ہی جائیگا بوسہ کبھی تو ہان		شوق فضول و جرأت رندانہ چاہیے

ولہ

چاہیے اچھون کو جتنا چاہیے
یہ اگر چاہین تو پھر کیا چاہیے

صحبتِ رندان سے واجب ہے حذر
جای مے اپنے کو کھینچا چاہیے

چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے

چاک مت کر جیب بی ایامِ گل
کچھ اودھر کا بھی اشارا چاہیے

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

دشمنی نے میری کھویا غیر کو
کسقدر دشمن ہے دیکھا چاہیے

اپنی رسوائی مین کیا چلتی ہے سعی
یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے

منحصر مرنے پہ ہو جسکی امید
ناامیدی اوسکی دیکھا چاہیے

قطعہ

چاہتے ہین خوبرویون کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

غافل ان مہ طلعتون کی واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

ولہ

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایان مجھسے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیابان مجھسے

درسِ عنوانِ تماشا بہ تغافل خوشتر
ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگان مجھسے

وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی مین
صورتِ دود رہا سایہ گریزان مجھسے

غمِ عشاق نہ ہو سادگی آموزِ بتان
کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویران مجھسے

اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرای جنون
صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغان مجھسے

بیخودی بسترِ تمہیدِ فراغت ہو جو
پُر ہے سائے کی طرح میرا شبستان مجھسے

شوقِ دیدار مین گر تو مجھے گردن مارے
ہو نگہ مثلِ گلِ شمع پریشان مجھسے

بیکسیہای شبِ ہجر کی وحشت ہے ہے
سایہ خورشیدِ قیامت مین ہے پنہان مجھسے

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگین تجھسے
آئینہ داریِ یک دیدۂ حیران مجھسے

نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسد
ہے چراغان خس و خاشاکِ گلستان مجھسے

نکتہ چین ہے غمِ دل اوسکو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہان بات بنائے نہ بنے

مین بلاتا تو ہون اوسکو مگر اے جذبۂ دل
اوسپہ بنجائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

کھیل سمجھا ہے کہین چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے
کاش یون بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

غیر پھرتا ہے لیے یون ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہین تو کیا
ہات آوین تو اونھین ہات لگائے نہ بنے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کسکی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اوسنے کہ اوٹھائے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھون کہ بن آئے نہ رہے — تمکو چاہون کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اوٹھائے نہ اٹھے — کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

چاک کی خواہش اگر وحشت بعریانی کرے — صبح کی مانند زخم دل گریبانی کرے

جلوے کا تیرے وہ عالم ہے کہ گر کیجے خیال — دیدۂ دل کو زیارتگاہ حیرانی کرے

ہے شکستن سے بھی دل نومید یارب کب تلک — آبگینہ کوہ پر عرض گرانجانی کرے

میکدہ گر چشم مست ناز سے پاوے شکست — موی شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

خط عارض سے لکھا ہے زلف کو الفت نے عہد — یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے

ولہ

وہ آکے خواب مین تسکین اضطراب تو دے — ولی مجھے تپش دل مجال خواب تو دے

کرے ہے قتل لگاوٹ مین تیرا رو دینا — تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے

دکھاکے جنبش لب ہی تمام کر ہمکو — نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہین جواب تو دے

پلادے اوک سے ساقی جو ہمسے نفرت ہے — پیالہ گر نہین دیتا نہ دے شراب تو دے

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پانو پھول گئے

کہا جو اوسنے ذرا میرے پانو داب تو دے

تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے
مرا سر رنجِ بالین ہے مرا تن بارِ بستر ہے

سرشکِ سر بصحرا دادہ نور العینِ دامن ہے
دلِ بیدست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہے

خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو تم آئے ہو
فروغِ شمعِ بالین طالعِ بیدارِ بستر ہے

بطوفان گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

ابھی آتی ہے بو بالش سے اوسکی زلفِ مشکین کی
ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

کہون کیا دلکی کیا حالت ہے ہجرِ یار مین غالب
کہ بیتابی سے ہر یکتارِ بستر خارِ بستر ہے

خطر ہے رشتۂ الفت رگِ گردن نہو جاوے
غرورِ دوستی آفت ہے تو دشمن نہو جاوے

سمجھ اس فصل مین کوتاہیٔ نشو و نما غالب
اگر گل سرو کے قامت پہ پیراہن نہو جاوے

فریاد کی کوئی لے نہین ہے
نالہ پابندِ نے نہین ہے

کیون بوتے ہین باغبان تونبے
گر باغ گدائے مے نہین ہے

ہر چند ہر ایک شے مین تو ہے
پر تجھ سی کوئی شے نہین ہے

ہان کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہین کہ ہے نہین ہے

شادی سے گزر کہ غم نہ ہووے — اردی جو نہ ہو تو دی نہیں ہے

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد — مَے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب

آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا — کہ اس مین ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

بہت دنون مین تغافل نے تیرے پیدا کی — وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

ولہ

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہین کرتے — مرتے ہین مگر ان کی تمنا نہین کرتے

درپردہ انھین غیر سے ہے ربطِ نہانی — ظاہر کا یہ پردا ہے کہ پردا نہین کرتے

یہ باعثِ نومیدیِ اربابِ ہوس ہے

غالب کو برا کہتے ہو اچھا نہین کرتے

کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ — خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچین ہے

کبھی تو اس سرِ شوریدہ کی بھی داد ملے — کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالین ہے

بجا ہے گر نہ سنے نالہای بلبلِ زار — کہ گوشِ گل نمِ شبنم سے پنبہ آگین ہے

اسد ہے نزع مین چل بیوفا برای خدا

مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکین ہے

کیون نہو چشمِ بتان محوِ تغافل کیون نہو
یعنی اس بیمار کو نظارے سے پرہیز ہے

مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہجائیگی
وای ناکامی کہ اوس کافر کا خنجر تیز ہے

عارضِ گل دیکھ روی یار یاد آیا اسد
جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

دیا ہے دل اگر اوسکو بشر ہے کیا کہیے
ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہیے

یہ ضد کہ آج نہ آوے اور آئے بن نہ رہے
قضا سے شکوہ ہمین کس قدر ہے کیا کہیے

رہے ہے یون گہ و بیگہ کہ کوی دوست کو اب
اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہیے

زہے کرشمہ کہ یون دے رکھا ہے ہمکو فریب
کہ بن کہے ہی اونھین سب خبر ہے کیا کہیے

سمجھ کے کرتے ہین بازار مین وہ پرسشِ حال
کہ یہ کہے کہ سرِ رہگذر ہے کیا کہیے

تمھین نہین ہے سرِ رشتۂ وفا کا خیال
ہمارے ہاتھ مین کچھ ہے مگر ہے کیا کہیے

اونھین سوال پہ زعمِ جنون ہے کیون لڑیے
ہمین جواب سے قطعِ نظر ہے کیا کہیے

حسد سزاے کمالِ سخن ہے کیا کیجے
ستم بہای متاعِ ہنر ہے کیا کہیے

کہا ہے کسنے کہ غالب برا نہین لیکن
سواے اسکے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیے

دیکھکر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے
کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے

بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فسان
مرحبا مین کیا مبارک ہے گرانجانی مجھے

کیون نہو بی التفاتی اوسکی خاطر جمع ہے
جانتا ہے محوِ پرسشہای پنہانی مجھے

میرے غم خانیکی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھدیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

بدگمان ہوتا ہے وہ کافر نہوتا کاشکے
اسقدر ذوقِ نوای مرغِ بستانی مجھے

وای وان بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا
لیگیا تھا گور مین ذوقِ تن آسانی مجھے

وعدہ آنیکا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے
تمنے کیون سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

ہان نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری واہ واہ
پھر ہوا ہے تازہ سودای غزلخوانی مجھے

دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی
میرزا یوسف ہے غالب یوسفِ ثانی مجھے

یاد ہے شادی مین بھی ہنگامۂ یارب مجھے
سبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیرِ لب مجھے

ہے کشادِ خاطرِ وابستہ دررہنِ سخن
تھا طلسمِ قفلِ ابجد خانۂ مکتب مجھے

یارب اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیے
رشک آسایش پہ ہے زندانیونکی اب مجھے

طبع ہے مشتاقِ لذتہای حسرت کیا کرون
آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے

عشق سے اٹھے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

حضورِ شاہ مین اہلِ سخن کی آزمایش ہے
چمن مین خوشنوایانِ چمن کی آزمایش ہے

قد و گیسو مین قیس و کوہکن کی آزمایش ہے
جہان ہم ہین وہان دار و رسن کی آزمایش ہے

کرینگے کوہکن کے حوصلے کا امتحان آخر
ہنوز اوس خستہ کے نیروی تن کی آزمایش ہے

نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعان کی ہوا خواہی
اوسے یوسف کی بوی پیرہن کی آزمایش ہے

وہ آیا بزم مین دیکھو نہ کہیو پھر کہ غافل تھے
شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمایش ہے

رہے دل ہی مین تیر اچھا جگر کے پار ہو بہتر
غرض شستِ بتِ ناوک فگن کی آزمایش ہے

نہین کچھ سبحہ و زنار کے پھندے مین گیرائی
وفاداری مین شیخ و برہمن کی آزمایش ہے

پڑا رہ اے دلِ وابستہ بیتابی سے کیا حاصل
مگر پھر تابِ زلفِ پرشکن کی آزمایش ہے

رگ و پی مین جب اُترے زہرِ غم تب دیکھیے کیا ہو
ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمایش ہے

وہ آوینگے مرے گھر وعدہ کیسا دیکھنا غالب
نئے فتنون مین اب چرخِ کہن کی آزمایش ہے

کبھی نیکی بھی اوسکے جی مین گر آجاے ہے مجھسے
جفائین کرکے اپنی یاد شرما جاے ہے مجھسے

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر اولٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہون اور کھنچتا جاے ہے مجھسے

وہ بدخو اور میری داستانِ شوق طولانی
عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جاے ہے مجھسے

...دہر وہ بدگمانی ہے ادہر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے اوس سے نہ بولا جائے ہے مجھسے

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھسے

...ف برطرف نظارگی مین بھی سہی لیکن
وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھسے

...ے ہین پانوہی پہلے نبردِ عشق مین زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھسے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھسے

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھسے

...کہ مشق تماشا جنون علامت ہے
کشاد و بستِ مژہ سیلیِ ندامت ہے

...ون کیون کہ مٹے داغِ طعنِ بدعہدی
تجھے کہ آئنہ بھی ورطۂ ملامت ہے

...یچ و تابِ ہوس سلکِ عافیت مت توڑ
نگاہِ عجز سرِ رشتۂ سلامت ہے

...ا مقابل و دعوای عشق بی بنیاد
جنون ساختہ و فصلِ گل قیامت ہے

ولہ

...اتا ہون کہ گر تو بزم مین جا دے مجھے
میرا ذمہ دیکھکر گر کوئی بتلا دے مجھے

...ب ہے جو اوسکو دیکھکر آجاے رحم
وان تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے

...نہ دکھلاوے نہ دکھلا پر بہ اندازِ عتاب
کھولکر پردہ ذرا آنکھین ہی دکھلا دے مجھے

...تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ مین
زلف گر بن جاؤن تو شانے مین الجھا دے مجھے

ولہ

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگ سلیمان مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

جز نام نہین صورت عالم مجھے منظور
جز وہم نہین ہستی اشیا مرے آگے

ہوتا ہے نہان گرد مین صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبین خاک پہ دریا مرے آگے

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

سچ کہتے ہو خودبین و خودآرا ہون نہ کیون ہون
بیٹھا ہے بت آئینہ سیما مرے آگے

پھر دیکھیے انداز گل افشانی گفتار
رکھدے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

نفرت کا گمان گزرے ہے مین رشک سے گزرا
کیونکر کہون لو نام نہ اونکا مرے آگے

ایمان مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

عاشق ہون پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنون کو برا کہتی ہے لیلا مرے آگے

خوش ہوتے ہین پر وصل مین یون مر نہین جاتے
آئی شب ہجران کی تمنا مرے آگے

ہے موجزن اک قلزم خون کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

گو ہاتھ کو جنبش نہین آنکھون مین تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا

غالب کو برا کیون کہو اچھا مرے آگے

کہون جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے
تمھین کہو کہ جو تم یون کہو تو کیا کہیے

نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ ہم ستمگر ہین
مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیے

وہ نیشتر سہی پر دل مین جب اوتر جاوے
نگاہِ ناز کو پھر کیون نہ آشنا کہیے

نہین ذریعۂ راحت جراحتِ پیکان
وہ زخمِ تیغ ہے جسکو کہ دلکشا کہیے

جو مدعی بنے اوسکے نہ مدعی بنیے
جو ناسزا کہے اوسکو نہ ناسزا کہیے

کہین حقیقتِ جانکاہیِ مرض لکھیے
کہین مصیبتِ ناسازیِ دوا کہیے

کبھی شکایتِ رنجِ گران نشین کیجے
کبھی حکایتِ صبرِ گریزپا کہیے

رہے نہ جان تو قاتل کو خون بہا دیجے
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے

نہین نگار کو الفت نہو نگار تو ہے
روانیِ روش و مستیِ ادا کہیے

نہین بہار کو فرصت نہو بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

رونے سے اور عشق مین بیباک ہو گئے
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

صرفِ بہائے مے ہوئے آلاتِ میکشی
تھے یہ ہی دو حساب سو یون پاک ہو گئے

رسوای دہر گو ہوے آوارگی سے تم
بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بی اثر
پردے مین گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہل شوق کا
آپ اپنی آگ سے خس و خاشاک ہو گئے

کرنے گئے تھے اوس سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

اس رنگ سے اوٹھائی کل اونے اسد کی لاش
دشمن بھی جسکو دیکھکے غمناک ہو گئے

نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مست طرب
شیشۂ مے سرو سبز جوئبار نغمہ ہے

ہمنشین مت کہہ کہ برہم کر نہ بزم عیش دوست
وان تو میرے نالے کو بھی اعتبار نغمہ ہے

ولہ

عرض ناز شوخی دندان برای خندہ ہے
دعوی جمعیت احباب جای خندہ ہے

ہے عدم مین غنچہ محو عبرت انجام گل
یکجہان زانو تامل در قفای خندہ ہے

کلفت افسردگی کو عیش بیتابی حرام
ورنہ دندان در دل افشردن بنای خندہ ہے

شورش باطن کے ہین احباب منکر ورنہ یان
دل محیط گریہ و لب آشنای خندہ ہے

ولہ

حسن بی پروا خریدار متاع جلوہ ہے
آئنہ زانوی فکر اختراع جلوہ ہے

جا ای آگہی رنگ تماشا باختن	چشم واگر دیدہ آغوش وداع جلوہ ہے

وله

ب تنگ ہان زخم نہ پیدا کرے کوئی	مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی
لم غبارِ وحشتِ مجنون ہے سر بسر	کب تک خیالِ طرۂ لیلا کرے کوئی
سردگی نہین طرب انشای التفات	ہان درد بنکے دل مین مگر جا کرے کوئی
ونے سے ای ندیم ملامت نکر مجھے	آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی
ک جگر سے جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی	کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی
ت جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل	تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی
ناکامیِ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز	تو وہ نہین کہ تجھکو تماشا کرے کوئی
ر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہرِ شکست	نقصان نہین جنون سے جو سودا کرے کوئی
سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر	فرصت کہان کہ تیری تمنا کرے کوئی
ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد یاس خیز	یہ درد وہ نہین کہ نہ پیدا کرے کوئی
بیکاریِ جنون کو ہے سر پیٹنے کا شغل	جب ہاتھ ٹوٹ جائین تو پھر کیا کرے کوئی

حسن فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسد
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکہ کی دوا کرے کوئی

شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

چال جیسے کڑی کمان کا تیر
دل مین ایسے کے جا کرے کوئی

بات پر وان زبان کٹتی ہے
وہ کہین اور سنا کرے کوئی

بک رہا ہون جنون مین کیا کیا کچہ
کچہ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

کون ہے جو نہین ہے حاجتمند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اوٹھ گئی غالب
کیون کسی کا گلا کرے کوئی

باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہی مجھے
سایۂ شاخ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

جوہر تیغ بسر چشمۂ دیگر معلوم
ہون مین وہ سبزہ کہ زہرآب اوگاتا ہے مجھے

مدعا محو تماشای شکست دل ہے
آئنہ خانے مین کوئی لیے جاتا ہے مجھے

نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کف خاک
آسمان بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

زندگی مین تو وہ محفل سے اوٹھا دیتے تھے
دیکھون اب مر گئے پر کون اوٹھاتا ہے مجھے

روندی ہوئی ہی کوکبۂ شہریار کی — اترائے کیون نہ خاک سر رہگذار کی

جب اوسکے دیکھنے کیلیے آئین بادشاہ — لوگون مین کیون نمود نہو لالہ زار کی

بھوکے نہین ہین سیر گلستان کے ہم ولی — کیونکر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی

ولہ

ہزارون خواہشین ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے — بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ڈرے کیون میرا قاتل کیا رہیگا اوسکی گردن پر — وہ خون جو چشم تر سے عمر بھر یون دمبدم نکلے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہین لیکن — بہت بی آبرو ہوکر ترے کوچے سے ہم نکلے

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا — اگر اس طرۂ پرپیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

مگر لکھوائے کوئی اوسکو خط تو ہم سے لکھوائے — ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھکر قلم نکلے

ہوئی اس دور مین منسوب مجھسے بادہ آشامی — پھر آیا وہ زمانہ جو جہان مین جام جم نکلے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی — وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغ ستم نکلے

محبت مین نہین ہے فرق جینے اور مرنیکا — اوسیکو دیکھکر جیتے ہین جس کافر پہ دم نکلے

کہان میخانے کا دروازہ غالب اور کہان واعظ

پر اتنا جانتے ہین کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

گو وے کے ہون بار خاطر گر صدا ہو جایے		نی تکلف ای شرار جستہ کیا ہو جایے
بیضہ آسا ننگ بال و پر ہے یہ کنج قفس		از سر نو زندگی ہو گر رہا ہو جایے

ولہ

ہستی بذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے		موج شراب یکمژۂ خواب ناک ہے
جز زخم تیغ ناز نہین دل مین آرزو		جیب خیال بھی ترے ہاتھون سے چاک ہے

جوشِ جنون سے کچہ نظر آتا نہین اسد
صحرا ہماری آنکہہ مین یکمشت خاک ہے

لب عیسی کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی		قیامت کشتۂ لعل بتان کا خواب سنگین ہے

ولہ

آمد سیلاب طوفان صدای آب ہے		نقش پا جو کان مین رکہتا ہے انگلی جادہ سے
بزم می وحشتکدہ ہے کسکی چشم مست کا		شیشے مین نبض پری پنہان ہے موج بادہ سے

ولہ

ہون مین بھی تماشائی نیرنگ تمنا		مطلب نہین کچہ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

ولہ

سیاہی جیسے گر جاوے دمِ تحریر کاغذ پر	مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

ولہ

ہجومِ نالہ حیرت عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے	خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے
تکلف بر طرف ہے جانستاں تر لطفِ بدخویاں	نگاہِ بے حجابِ ناز تیغِ تیزِ عریاں ہے
ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی	کہ صبحِ عید مجھکو بدتر از چاکِ گریباں ہے
دل و دیں نقد لا ساقی سے گر سودا کیا چاہے	کہ اس بازار میں ساغر متاعِ دستگرداں ہے
غم آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو	چراغِ روشن اپنا قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

ولہ

خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے	نگاہ دل سے ترے سرمہ سا نکلتی ہے
فشارِ تنگیِ خلوت سے بنتی ہے شبنم	صبا جو غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے
نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ	کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

ولہ

جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے	نافہ دماغِ آہوئے دشتِ تتار ہے
کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا	آئینہ فرشِ شش جہت انتظار ہے
ہے ذرہ ذرہ تنگیِ جا سے غبارِ شوق	گر دام یہ ہے وسعتِ صحرا شکار ہے

دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ / نظارے کا مقدمہ پھر روبکار ہے

چھڑکے ہے شبنم آئنہ برگ گل پر آب / ای عندلیب وقت وداع بہار ہے

پچ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے / وہ آئے یا نہ آئے پہ یان انتظار ہے

بی پردہ سوی وادی مجنون گزر نکر / ہر ذرّے کی نقاب مین دل بیقرار ہے

ای عندلیب اک کف خس بہر آشیان / طوفان آمد آمد فصل بہار ہے

دل مت گنوا خبر نسہی سیر ہی سہی / ای بیدماغ آئنہ تمثالدار ہے

غفلت کفیل عمر و اسد ضامن نشاط

ای مرگ ناگہان تجھے کیا انتظار ہے

آئینہ کیون ندون کہ تماشا کہین جسے / ایسا کہان سے لاؤن کہ تجھسا کہین جسے

حسرت نے لا رکھا تری بزم خیال مین / گلدستۂ نگاہ سویدا کہین جسے

پھونکا ہے کسنے گوش محبت مین ای خدا / افسون انتظار تمنا کہین جسے

سر پر ہجوم درد غریبی سے ڈالیے / وہ ایک مشت خاک کہ صحرا کہین جسے

ہے چشم تر مین حسرت دیدار سے نہان / شوق عنان گسیختہ دریا کہین جسے

درکار ہے شگفتن گلہای عیش کو / صبح بہار پنبۂ مینا کہین جسے

غالب برا نمان جو واعظ برا کہے

ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہین جسے

شبنم بگل لالہ نہ خالی ز ادا ہے
داغ دل بیدرد نظرگاہ حیا ہے

ل خون شدہ کشمکش حسرت دیدار
آئینہ بدست بت بدست حنا ہے

علے سے نہوتی ہوس شعلہ نے جو کی
جی کس قدر افسردگی دل پہ جلا ہے

ال مین تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق
آئینہ باندازِ گل آغوش کشا ہے

ی کف خاکستر و بلبل قفس رنگ
ای نالہ نشانِ جگر سوختہ کیا ہے

تری افسردہ کیا وحشت دل کو
معشوقی و بیحوصلگی طرفہ بلا ہے

بوری و دعوای گرفتاری الفت
دست تہ سنگ آمدہ پیمان وفا ہے

علوم ہوا حال شہیدان گزشتہ
تیغ ستم آئینہ تصویر نما ہے

پرتو خورشید جہانتاب ادھر بھی
سائے کیطرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

ردہ گناہون کی بھی حسرت کی ملی داد
یارب اگر ان کردہ گناہون کی سزا ہے

بیگانگی خلق سے بیدل نہ ہو غالب
کوئی نہین تیرا تو مری جان خدا ہے

نظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

خونچکان کفن مین کروڑون بناو ہین
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدون پہ حور کی

واعظ نہ تم پیو نہ کسیکو پلا سکو
کیا بات ہے تمھاری شراب طہور کی

لڑتا ہے مجھسے حشر مین قاتل کہ کیون اوٹھا
گویا ابھی سُنی نہین آواز صور کی

آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج
اوڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

گو وان نہین پہ وان کے نکالے ہوے تو ہین
کعبے سے ان بتونکو بھی نسبت ہے دور کی

کیا فرض ہے کہ سبکو ملے ایکسا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کرین کوہ طور کی

گرمی سہی کلام مین لیکن نہ اسقدر
کی جس سے بات اوسنے شکایت ضرور کی

غالب گر اس سفر مین مجھے ساتھ لیچلین
حج کا ثواب نذر کرونگا حضور کی

غم کھانے مین بودا دل ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مے گلفام بہت ہے

کہتے ہوے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یون کہ مجھے دُرد تہ جام بہت ہے

نی تیر کمان مین ہے نہ صیاد کمین مین
گوشے مین قفس کے مجھے آرام بہت ہے

کیا زہد کو مانون کہ نہو گرچہ ریائی
پاداش عمل کی طمع خام بہت ہے

ہین اہل خرد کس روش خاص پہ نازان
پابستگی رسم و رہ عام بہت ہے

زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوف حرم سے
آلودہ بمے جامۂ احرام بہت ہے

ہے قہر کہ اب بھی نہ بنے بات کہ اونکو
انکار نہین اور مجھے ابرام بہت ہے

...ن ہوئے کہ جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

...ت ہوئی ہے یار کو مہمان کیے ہوئے
جوش قدح سے بزم چراغان کیے ہوئے

...ا ہون جمع پھر جگر لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوت مژگان کیے ہوئے

پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسون ہوئے ہین چاک گریبان کیے ہوئے

پھر گرم نالہ ہای شرربار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیر چراغان کیے ہوئے

پھر پرسش جراحت دلکو چلا ہے عشق
سامان صدہزار نمکدان کیے ہوئے

پھر بھر رہا ہون خامۂ مژگان بخون دل
ساز چمن طرازی دامان کیے ہوئے

باہم دگر ہوئے ہین دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا سامان کیے ہوئے

دل پھر طواف کوی ملامت کو جاے ہے
پندار کا صنمکدہ ویران کیے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرض متاع عقل و دل و جان کیے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستان نگاہ کا سامان کیے ہوئے

پھر چاہتا ہون نامۂ دلدار کھولنا
جان نذر دلفریبی عنوان کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس
زلف سیاہ رخ پہ پریشان کیے ہوئے

چاہے ہے پھر کسیکو مقابل مین آرزو
سُرمے سے تیز دشنۂ مژگان کیے ہو

اک نوبہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مَی سے گلستان کیے ہو

پھر جی مین ہے کہ در پہ کسیکے پڑے رہین
سر زیر بارِ منتِ دربان کیے ہو

جی ڈہونڈہتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہین تصورِ جانان کیے ہوے

غالب ہمین نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہین ہم تہیۂ طوفان کیے ہوے

نوید امن ہے بیدادِ دوست جانکے لیے
رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسمان کے لیے

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خون ہے
رکھون کچہ اپنی بھی مژگانِ خونفشانکے لیے

وہ زندہ ہم ہین کہ ہین روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاودان کے لیے

رہا بلا مین بھی مین مبتلای آفتِ رشک
بلای جان ہے ادا تیری اک جہان کے لیے

فلک نہ دور رکہ اوس سے مجھے کہ مین ہی نہین
درازدستیِ قاتل کے امتحان کے لیے

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس مین فراہم خس آشیان کے لیے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آے
اوٹھا اور اوٹھکے قدم مین نے پاسبان کے لیے

بقدرِ شوق نہین ظرفِ تنگنای غزل
کچہ اور چاہیے وسعت مرے بیان کے لیے

دیا ہے خلق کو بھی تا اوسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خان کے لیے

زبان پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا — کہ میری نطق نے بوسے مری زبان کے لیے

نصیرِ دولت و دین اور معینِ ملت و ملک — بنا ہے چرخِ برین جسکے آستان کے لیے

زمانہ عہد مین اوسکے ہے محوِ آرائش — بنین گے اور ستارے اب آسمان کے لیے

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے — سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکران کے لیے

ادای خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا

صلای عام ہے یارانِ نکتہ دان کے لیے

رباعیات

بعد از اتمامِ بزمِ عیدِ اطفال — ایّامِ جوانی رہے ساغر کش حال

آپہونچے ہین تا سوادِ اقلیمِ عدم — ای عمرِ گزشتہ یکقدم استقبال

ولہ

شب زلف و رخِ عرق فشان کا غم تھا — کیا شرح کرون کہ طرفہ تر عالم تھا

رویا مین ہزار آنکھ سے صبح تلک — ہر قطرۂ اشک دیدۂ پرنم تھا

ولہ

آتشبازی ہے جیسے شغلِ اطفال — ہے سوزِ جگر کا بھی اسی طور کا حال

تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی — لڑکون کے لیے گیا ہے کیا کھیل نکال

ولہ

دل تھا کہ جو جان درد تمہید سہی	بیتابیٔ رشک و حسرت دید سہی
ہم اور فسردن اے تجلی افسوس	تکرار روا نہیں تو تجدید سہی

ولہ

ہے خلق حسد قماش لڑنے کے لیے	وحشتکدۂ تلاش لڑنے کے لیے
یعنی ہر بار کاغذباد کی طرح	ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لیے

ولہ

دل سخت نژند ہوگیا ہے گویا	اوس سے گلہ مند ہوگیا ہے گویا
پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں	غالب منہ بند ہوگیا ہے گویا

ولہ

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل	سن سن کے اوسے سخنوران کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش	گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

ولہ

بھیجی ہے جو مجکو شاہ جمجاہ نے دال	ہے لطف و عنایت شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال	ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

ولہ

ہین شہ مین صفات ذوالجلالی باہم　　آثار جلالی و جمالی باہم
ہون شاد نکیون سافل و عالی باہم　　ہے ابکی شب قدر و دوالی باہم

ولہ

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے　　تا شاہ شیوع دانش و داد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر مین گانٹھ　　ہے صفر کہ افزایش اعداد کرے

ولہ

اس رشتے مین لاکھ تار ہون بلکہ سوا　　اتنے ہی برس شمار ہون بلکہ سوا
ہر سینکڑے کو ایک گرہ فرض کرین　　ایسی گرہین ہزار ہون بلکہ سوا

ولہ

کہتے ہین کہ اب وہ مردم آزار نہین　　عشاق کی پرسش سے اوسے عار نہین
جو ہاتھ کہ ظلم سے اوٹھایا ہوگا　　کیونکر مانون کہ اوس مین تلوار نہین

ولہ

ہم گرچہ بنے سلام کرنیوالے　　کرتے ہین درنگ کام کرنیوالے
کہتے ہین کہین خدا سے اللہ اللہ　　وہ آپ ہین صبح و شام کرنیوالے

سامان خور و خواب کہانسے لاؤن	ولہ	آرام کے اسباب کہان سے لاؤن
روزہ مرا ایمان ہے غالب لیکن		خسخانہ و برف اب کہانسے لاؤن

ولہ

ان سیم کے بیجون کو کوئی کیا جانے	بھیجے ہین جو ارمغان شہ والا نے
گن کر دینگے ہم دعائین سو بار	فیروزے کی تسبیح کے ہین یہ دانے

ولہ

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالب	دل رک رک کر بند ہو گیا ہے غالب
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہین	سونا سوگند ہو گیا ہے غالب

خاتمہ

دمیدن سپیدۂ سحری از تیرہ شب سواد اوراق بفروغ گستری عبارت ماند اگر
پیدائی آن اثر پرستار آن تا خرام خامہ دلربا برابر بدل نزدیک جہان بر ابر عاد دودمان والا گہر

نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر سلمہ اللہ تعالے

بنا میزد سہی بالا ناظورہ ایست از قدسی خانوادہ فکر سر بر زدہ گرم جلوہ گری
لاابالی خرام محبوبہ ایست مقنعہ از رخ بردہ و دامن بکمر زدہ و راز پردہ دری
بوسعت شانی نشت حور انزادان معانی و دروی دمنب بر دوش عبہر زاریست جلوہ گاہ

جبریان با ختهٔ هوشش، پیمانه در پرندیست مانند سپهر ثوابت گوهر آگین خورنق
رونق شمارسائی بار نامه شکن صد نگارخانهٔ چین، فروغ آنی چهره ایست پری پروانه
سادی هیکلی ست حرز بازوی فرزانه، گوئی میکائیل قوال ثمر گلی فراخ سامعی [illegible]
درسنه چشمان سخن را صلای جام درداده، بیت الله تقدس معبدیست که کلیدش
بدست فهم درست داده اند، و درش بر احرام بندان مزدلفهٔ دل کشاده، سومناتی ست
صنمستان نازبندان خیال در روی جبین سای، ارژنگیست نمایش نقشهای بدیع
بهشت بست مانی وارژنگ بر زمین سای، بر صفحه ازین اوراق برهمنی ست بیغوان
بر ورق ازین کتاب سومنا تیست استادان، آیینه خانه ایست گیتی نما
صفوتکده ایست مصفا، پردگیانند حجله نشین سرادق حریم کرداری، شوخ چشمانند
پرده در تراز شاهان بازاری، تهیدستانند توانگر دل، آزادگانند پا در گل
عشاق طینتانند بخویشتن مائل، او دیگرانند نگارین دل، هاروت پیشگانند زهره فن
بیژن نگوهرانند بابل سکن، بهمن دانند قائم کش، نمب گیانند سینه پر آتش، برشگانند
پخته مغز، هم مغز پخته و هم پوست [illegible] سنه، باده آشامانند مست، از خود رفتگانند
بایکدگر همدست، هندی صنمانند پارسی گرد، دهلی نژادانند صفاهان پرورده، هان ای
برحسم که آنچه سرودم نسخه باشی، همانا منتخب دیوان اردو زبانست، ریخته کلک مسیحی فرتاب

خدیم قسطاس دانش، اسطرلاب بینش، جوهر آئینهٔ آفرینش، معیار نقد گرانمایگی، معراج سلم بلند پایگی، قهرمان قلمرو معنی پروری، فرمان فرمای گیهان سخنوری، گیتی خداوندگان نوآئین نگاری، جهان سالار تازه گفتاری، روان بخش کالبد سخن گستری، بینائی فزای چشم دیده وری، فرازندهٔ لوای شوکت خامه، فروزندهٔ چراغ دودهٔ آمه، آئینهٔ ناسخ شهرت همداستانان، سرخیل انجمن نکته دانان منشی

سخن را از خیالش ارجمندی — معانی را ز فکرش سربلندی

صریر خامه اش بس دلپذیر است — بهشتی عندلیبان را صفیر است

بهین فرزند آبای علوی — بهین شاگرد عقل کل عالی

جهان را بیدریغ آموزگار است — گزین معنی شناس روزگار است

سر و سر دفتر شیوا بیانان — درین فن افتخار همزبانان

بجولانگاه معنی یکه تازی — فلاطون فطرتی حکمت طرازی

ز کلکش پرورش گنج معانی — به ابر آذری در درفشانی

ز صهبای سخن سرشار گشته — ورق از فکر او گلزار گشته

خدا کیش، صافی منش، ستوده خو، فرهید بکنش، بزرگ نهاد، پاکیزه گوهر، فرشته سرشت، آزرم گستر، گنج گزار، مهر پرور، خورشید فروغ، کیوان فر

نکوہش نکوہ ستایش ستای، دکشوعینی راہ ونمای، سرتاسر وفا وفتوت، دیدہ تا
دل حیا ومروت، مصور روح مجسم، عالم جان وجان عالم، والا حسب، عالی نسب
سمی وصی واپسین وخشور بدآداش حضرت جاذبین دستور، اعنی استادی ومرشدی
مولائی اخی میرزا اسد اللہ خان بہادر غالب اللّٰہم کمّل الکلام بدیمومۃ بقائہم
وحصّل المرام بحیٰوۃ لقائہم پوزش آیین نیاز گستر ضیاء الدین نیر از دیرباز والائی
اندیشہ پست وران اندیشیدی، وگرانی قدر سبک اندران سنجیدی، کہ این گرامی
برادرزادہ ہارا کہ یکان یکان ملف الصدق ودومان ضمیر دبل ابوالآبای مضامین
دلپذیر پرست بہ تعلیم نو آموزان نکواز بد شناس برانگیزد، واین ارزندہ جواہر پارہا
کہ ہر یک از ان سیمین ساعد شخص خرد را یارہ ونازنین پیکر ہوش را گوشوارہ است
برشمسۂ پیشطاق شناسائی برآویزد باری کارسازایزد وبزرگ راہبران سپاس
کہ درین زمان کہ ۱۲۸۰ سنہ ہجریہ نبویہ علیٰ صاحبہا افضل التحیات
واکمل الصلوات بیکہزار ودوصد وہفت رسیدہ آن دیرین پیچ
لو دلنشین آرزو بمساعدت ز، کار راست ہنجار وقلادری بخت بیدار چو شتر
ازان کہ ہیچو استم روائی گرفت شاد کامے دردل جاگزید واندوہ تردد گراوری
بدر رفت چون با حصای او درین ہمایون صحیفہ شتافتم ہمگی اشعار شعری شعار

غزل و قصیدہ و قطعہ و مثنوی و رباعی یکہزار و بیست
و دو و اند یافتم الا با توانان ہوشان ہوشے دشنوا گوشان گوشے
بر شاہراہ شناخت فراوانی نیکو معانی باید رفت، نہ در پیغولہ پیغارہ زنی
نمرہ و بر قلت ابیات گرفت چنانکہ خود آن والا آموزگار در گزارش این ہنجا
بہ پارسی نامۂ خویشتن در پردہ سازان گفتار سرایہ آری را بست میفرماید

بیت

نگویم تا نباشد نغز غالب
چہ غم گر ہست اشعار من اندک

از من یادگارے ...... و برای دیگران تذکارے باد

صداقتوں کا نقیب، روایتوں کا امین

ماہنامہ تخلیق لاہور

اردو ادبی جرائد میں ایک روشن نام

ماہنامہ

تخلیق

لاہور

مدیر: اظہر جاوید

بھگوان سٹریٹ، پرانی انارکلی، لاہور

فون: 7230807

ڈاکٹر مس عصمت ناز
پیکنگ یونیورسٹی، بیجنگ، چین

چین میں اُردو

چین زمانہ قدیم سے ہی اپنی تہذیب و ثقافت وصنعت و حرفت اور علوم وفنون کی وجہ سے عالمگیر شہرت رکھتا تھا اور اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا کہ ''علم حاصل کرو خواہ تمھیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔'' یعنی یہ بات شک و شبے سے بالاتر ہے کہ چین ہمیشہ سے علم وفن کا گہوارہ رہا ہے اور چار دانگ عالم میں اس کی پہچان تھی۔ بہت سے ممالک کے ساتھ تجارتی روابط، بہت پرانی تہذیب بادشاہی نظام، وسیع و عریض رقبے اور کثیر آبادی نے اسے ہمیشہ مرکز دنیا بنائے رکھا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ گراں خوابی ان کا مقدر بنی —— مگر بقول اقبال ''گراں خواب چینی سنبھلنے لگے'' اور واقعی وہ اس طرح سے سنبھلے کہ دنیا کے لیے مثال قائم کر دی۔

چین پاکستان کا ہمسایہ ملک اور بہترین دوست ہے جس نے ہر آڑے وقت میں اور عام حالات میں پاکستان کا ہمیشہ بھرپور ساتھ دیا ہے۔ پاکستان کے ساتھ مختلف منصوبوں پر اور تجارتی روابط کے ذریعے دونوں قوموں کا تعلق بہت مضبوط ہے مگر زبان و بیان کی مشکل بہرحال موجود ہے اسے آسان بنانے کے لیے بہت کام کرنے کی ضرورت ہے۔

حال ہی میں میری تعیناتی پاکستان چیئر پر پیکنگ یونیورسٹی کے شعبہ اردو و مطالعہ پاکستان میں ہوئی ہے۔ وہاں جا کر میرے لیے یہ بات بہت خوش گوار حیرت کا باعث بنی کہ شعبے کے اساتذہ اور طالب علم اردو زبان سے بہت دلچسپی رکھتے ہیں اور انھیں اس زبان پر عبور بھی حاصل ہے۔ شروع میں یعنی ابتدائی سطح پر طلبا و طالبات کچھ مشکل محسوس کرتے ہیں مگر دوسرے سال میں ان کی زبان اور بیان میں خاصی بہتری آجاتی ہے اور ڈگری کی سطح پر اور ایم اے کے طلبا تو بہت شستہ اور صاف ستھری بلکہ بعض اوقات مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہم سے زیادہ خالص اردو زبان بولتے ہیں کیونکہ وہ اس زبان میں انگریزی کا استعمال بالکل نہیں کرتے ہیں۔ مگر بعض اوقات ایسے الفاظ بھی سننے میں آتے ہیں جن سے ہم زیادہ آشنا نہیں یا پھر ان کا استعمال ہمارے ہاں دیگر

معنوں میں ہوتا ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ میں راستہ بھول گئی میں نے کافی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی تو ایک چینی استاد کو فون کیا کہ وہ ڈرائیور کو سمجھا دیں انھوں نے نے سمجھا تو دیا مگر اگلے دن ان سمیت چند اور دوستوں نے کہا کہ ''کل آپ گمراہ ہوگئی تھیں۔ ہمیں بہت افسوس ہے۔'' جبکہ یہ بالکل برمحل اور مناسب لفظ ہے مگر ہمارے ہاں یہ اسلامی تشریح کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ چین میں ۱۹۴۶ء میں ہندی اردو شعبہ قائم ہوا تھا جو قیام پاکستان کے چند سالوں بعد علیحدہ علیحدہ ہوگیا تھا۔ اور پھر اس میں باقاعدہ پاکستان چیئر قائم کردی گئی تھی جسے بعد ازاں شعبہ اردو مطالعہ پاکستان بنا دیا گیا۔

اس شعبے میں سلیم ملک، خواجہ زکریا، آفتاب شمیم اور محمد علی صدیقی جیسی نامور علمی و ادبی شخصیات خدمات سرانجام دے چکی ہیں۔ مگر کئی سالوں سے یہ سیٹ خالی بھی رہی جس کا سبب شاید وزارت تعلیم کے دفتری امور ہیں۔ پاکستانی اساتذہ کے علاوہ یہاں پر چینی اساتذہ بھی خدمات سرانجام دیتے ہیں اور انھوں نے اردو زبان و ادب اور پاکستان پر بہت زیادہ کام کیا ہوا ہے۔ آج کل اس شعبے میں میرے علاوہ پانچ چینی اساتذہ ہیں اور تین نے پاکستان سے ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی ہوئی ہے اور بعد میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری یہاں یعنی اپنے ملک سے حاصل کی۔ باقی دو اساتذہ بھی پی ایچ ڈی کر رہے ہیں کیونکہ یونیورسٹی میں ملازمت کی بنیادی شرائط میں یہ شامل ہے مگر اردو و مطالعہ پاکستان کے اساتذہ کی کمی کی وجہ سے بعض فارغ التحصیل شاندار نتائج کے حامل طلبا کو اسسٹنٹ لیکچرر کے طور پر رکھ لیا جاتا ہے۔

یونیورسٹی میں اس شعبے میں ۱۵ طلبا داخلہ لیتے ہیں جن کا ابتدائی ٹیسٹ یا داخلہ ٹیسٹ انگریزی میں لیا جاتا ہے۔ یہ طلبا ایف اے کے بعد یونیورسٹی آتے ہیں کیونکہ چین سمیت دنیا کے اکثر ممالک میں بی اے کی چار سالہ ڈگری یونیورسٹی میں ہی ہوتی ہے۔ ان طلبا کی گریجویشن کے پہلے سال میں اردو حروف تہجی کی پہچان اور اس کا استعمال اور بولنا سکھایا جاتا ہے جو ان کے لیے بھی اور اساتذہ کے لیے بھی نسبتاً مشکل مرحلہ ہوتا ہے کیونکہ چینی زبان دنیا کی کسی بھی زبان سے لکھنے اور بولنے میں بہت مختلف ہے لیکن ان طلبا کی محنت اور ہمت کو داد دینا چاہیے کہ کس شوق اور محبت سے یہ اردو زبان سیکھتے ہیں اور یہ زبان سیکھنے کے ساتھ ساتھ یہ لوگ اور مضامین بھی پڑھتے ہیں جن میں پاکستانی تہذیب و ثقافت، تاریخ وغیرہ کے علاوہ انگریزی وغیرہ کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر جیسے مضامین بھی ہیں۔ یعنی طلبا کم و بیش سات سے دس پرچے اردو کے اور باقی دس بارہ اور مضامین پڑھتے ہیں اور ان کی طالب علمی کی زندگی انتہائی مصروف رہتی ہے۔ چار سال کے بعد انھیں ڈگری دی جاتی ہے اور پھر ان میں سے کچھ طلبا ایم اے کے لیے بھی اردو کا انتخاب کرتے ہیں اور بعض ڈاکٹریٹ تک تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

اردو کا نصاب بہت اعلیٰ اور معیاری ہے۔ جس میں تاریخ ادب اردو، تحقیق، تنقید، ناول، ڈرامہ، شاعری غرضیکہ ہر چیز شامل ہے تاکہ طلبا کی دلچسپی برقرار رہے۔ ایم اے کی سطح پر آتے آتے یہ طلبا خاصے ماہر ہو جاتے ہیں۔ آزادانہ گفتگو، وسیع مطالعہ انھیں اس قابل بنا دیتا ہے کہ اب وہ اپنا مقالہ لکھ سکیں۔ واضح رہے کہ انھیں بی اے کی ڈگری کے لیے بھی ایک مختصر ریسرچ پیپر تیار کرنا ہوتا ہے جس کا موضوع ادب یا پاکستان سے ہونا ضروری ہے۔ گذشتہ برسوں میں پاکستانی اساتذہ کی عدم موجودگی کے باعث طلبا نے کچھ دقت محسوس کی اور بتایا کہ بول چال کی مشق میں مشکل ہوتی تھی کیونکہ چینی اساتذہ بالکل اردو کا صحیح لہجہ نہیں بتا سکتے ہیں۔

شعبے کی ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ نئے داخلہ لینے والے طالب علموں کے پاکستانی یعنی اردو نام رکھے جاتے ہیں اور اس تقریب میں پاکستانی سفارت خانے سے بھی سفیر کو بھی خاص طور پر مدعو کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اساتذہ کے بھی چینی ناموں کے ساتھ پاکستانی نام ہیں جس سے بہت ہی قریبی تعلق سا محسوس ہوتا ہے اور یہ لوگ بھی خوشی محسوس کرتے ہیں۔

چین میں ریڈیو کی اردو سروس، چین باتصویر رسالے میں کام کرنے والے اکثر طلبا اس یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہیں اور مختلف شعبوں میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اساتذہ کا رابطہ پاکستان کے تقریباً تمام قابل ذکر ادیبوں اور شاعروں سے ہے اور وہ لوگ اکثر و بیشتر پاکستان کا دورہ کرتے رہتے ہیں۔ حال ہی میں صدر پاکستان جناب پرویز مشرف کی طرف سے جن ۲۹ چینی لوگوں کو ستارہ خدمت اور ستارۂ قائد اعظم دیا گیا ہے اُن میں پیکنگ یونیورسٹی کے شعبہ اردو مطالعہ پاکستان کے تین اساتذہ اور اردو اشاعت خانے کے سربراہ بھی شامل ہیں۔

علامہ اقبال تمام اردو بولنے والوں اور سمجھنے والے اساتذہ و طلبا کی پسندیدہ شخصیت ہیں اور انھوں نے اقبالیات پر بہت کام کیا ہے۔ مگر ابھی اس شعبے میں کتابوں اور جدید قسم کی لغات کی شدید کمی ہے۔ اردو اخبارات و رسائل بھی میسر نہیں ہیں۔ چند ایک رسائل و جرائد آتے ہیں جو ناکافی ہیں کیونکہ اس شعبے کو اس مد میں گرانٹ کی فراہمی حکومت پاکستان کی ذمہ داری ہے۔ کتابوں کے علاوہ باقی سہولتیں چینی حکومت دیتی ہے بلکہ بعض اوقات اس سلسلے میں بھی مدد کی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں طلبا و طالبات پاکستان آنا بھی ضروری سمجھتے ہیں تاکہ زبان کے ساتھ ساتھ وہ پاکستان کی سیر بھی کر سکیں اور یہاں کے رسم و رواج سے بھی واقف ہو سکیں۔

پروفیسر ڈاکٹر لیو شیو شانگ سے ایک ملاقات

پیکنگ یونیورسٹی میں شعبہ اُردو مطالعہ پاکستان چیئر موجود ہے۔ جہاں پاکستانی پروفیسرز اور

چینی پروفیسرز بھی خدمات سرانجام دیتے ہیں جن میں ایک بڑا نام پروفیسر لیو شیو شانگ کا ہے۔ پروفیسر مذکور شیان تان صوبے کے شہر ہونان سے تعلق رکھتے ہیں اور پیکنگ یونیورسٹی کے ہی پڑھے ہوئے ہیں۔ انھوں نے گریجویشن کی سطح پر اردو کا مضمون پڑھا اور یوں چار سال کی یہ آشنائی اتنی گہری ہوئی کہ آپ نے مزید سے مزید کا سفر جاری رکھا اور پھر پاکستان آئے اور دو سال تک سفارت خانے میں بطور انٹر پریٹر کام کیا اور اردو میں مزید مہارت حاصل کی۔ اگرچہ آپ نے انگریزی زبان بھی پڑھی ہے اس پر خاصا عبور بھی ہے مگر زیادہ دلچسپی اردو سے رکھتے ہیں۔ انھوں نے ۱۹۸۰ء میں نمل یونیورسٹی سے اردو ایڈوانس کا کورس دو سال میں مکمل کیا اور واپس چین چلے گئے اور وہاں شعبۂ اردو پیکنگ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی آپ کا موضوع "علامہ اقبال — جنوبی ایشیا کے مسلم شاعر" تھا۔

پروفیسر لیو کہتے ہیں کہ اردو پڑھتے پڑھتے انھیں بہت مزہ آتا ہے اور محسوس ہوتا تھا کہ یہ ایک وسیع زبان ہے اور خاص طور پر اقبال کو پڑھنے کے بعد تو ایک نئی طرح سے آشنا ہوا اور میرے دل میں اردو کی محبت بڑھتی چلی گئی۔ انھوں نے اقبال کی بے شمار نظموں اور غزلوں کا چینی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔

لیو صاحب پیکنگ یونیورسٹی میں درس و تدریس کے ساتھ ساتھ مختلف انتظامی عہدوں پر بھی کام کرتے رہے ہیں۔ آج کل بطور ڈپٹی چیئرمین اورینٹل ڈیپارٹمنٹ کام کر رہے ہیں اور وائس ڈین کا عہدہ بھی آپ کے پاس ہے۔ علاوہ ازیں وہ ٹیچنگ اکیڈیمی تنظیم کے بھی صدر ہیں۔ اور ٹیچنگ ایڈوائزری بورڈ، منسٹری آف ایجوکیشن چائنا کے تحت بھی امور سرانجام دیتے ہیں۔ مگر یہ تمام ذمہ داریاں اردو زبان کی راہ میں حائل نہیں ہیں۔ آپ باقاعدہ شعبے میں خدمات سرانجام دیتے ہیں اور مطالعہ پاکستان و مطالعہ اقبال کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب، تاریخ ادب اردو بھی پڑھاتے ہیں۔ بہت سے طالب علم آپ کے ساتھ تحقیق کا کام بھی کرتے ہیں اور کچھ آپ کے زیر نگرانی تحقیق کے بعد ڈگریاں بھی حاصل کر چکے ہیں۔

پروفیسر لیو ۱۹۹۱ء میں تہران گئے ۱۹۹۳ء میں انھیں فلپائن یونیورسٹی میں بلایا گیا جبکہ مشرقی ایشیا کے بارے میں خاصے صاحب الرائے ہیں۔ آپ نے امریکہ کی "Illionis" یونیورسٹی میں پروفیسر کے طور پر بھی خدمات سرانجام دی ہیں۔ علاوہ ازیں آپ نے "Minnesota" کے اسلامک سٹڈیز سنٹر کا دورہ کیا اور وہاں قیام کے دوران "چین میں اسلام" کے بارے میں تحقیق کی۔ ۱۹۹۵ء میں ٹوکیو یونیورسٹی جاپان کے غیر ملکی زبانوں کے شعبے میں گئے اور پھر ۱۹۹۷ء میں ملائشیا میں ہونے والی علامہ اقبال کانفرنس میں شرکت کی اور اقبال کی شاعری اور ان کے عالمی نقطۂ نگاہ کے بارے میں مقالہ پیش کیا۔

آپ نے علامہ اقبال کے بارے میں ۲۰۰۳ء میں ہونے والی عالمی کانفرنس میں ''مطالعہ اقبال چین میں'' کے بارے میں مقالہ پیش کر کے خراج تحسین حاصل کیا۔ اردو زبان و ادب سے دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے بے شمار تحقیقی مقالہ جات شائع ہو چکے ہیں جن میں نمایاں طور پر اقبال کے بارے میں لکھا گیا ہے، خدا کی بستی جیسے مشہور ناول کا ترجمہ بھی آپ کر چکے ہیں۔ پریم چند کے افسانوں اور چین کے لوشیان کے افسانوں کا تقابلی جائزہ بھی آپ نے پیش کیا ہے اور غالب اور ''اردو ادب''، اقبال اور اردو ادب، ہندوستان میں ترقی پسند ادبی تحریک، فارسی شاعری کا اثر اردو شاعری پر، اقبال کا نظریہ خودی، اقبال کا فلسفہ اور اس کا پس منظر، اقبال اور مشرقی مفکرین، اسرار خودی، فیض ایک عظیم شاعر، اقبال کی شاعری میں اخلاقیات و جمالیات، ہندوستان کا ابتدائی فارسی ادب، مثنوی اسرارِ خودی کے مفہوم، آگ کا دریا میں ثقافت اور نیشنلزم، دکن میں اردو پندرھویں سے سترھویں صدی تک، موجودہ دور میں اسلامی کلچر کا مطالعہ و نظریہ، بیسویں صدی میں اسلامی دنیا کے رجحانات، اردو افسانوں کے خاموش نسوانی کردار، ''اوور کوٹ'' میں نوآبادیاتی اثرات، کے علاوہ اردو داستان باغ و بہار پر بھی آپ نے بہت کام کیا ہے۔ پروفیسر لیو بہت شستہ اور صاف ستھری اردو بولتے ہیں اور آپ کا لہجہ بھی خاصا پختہ ہے وسیع مطالعہ کے حامل ہیں تمام قابل ذکر اردو ادبی جرائد سے واقفیت رکھتے ہیں۔ اور اردو کے بارے میں آپ کی وسیع خدمات کے پیش نظر آپ کو پاک چین دوستی کے ۵۵ سالہ جشن پر صدر پاکستان کی طرف سے تمغۂ قائد اعظم سے نوازا گیا۔

ایک سوال کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ اردو میں وہ تمام تر خصوصیات موجود ہیں جو ایک زبان کو معیاری زبان کہلانے یا بننے کے لیے ضروری ہیں۔ لیکن انھیں زندہ رکھنا بہت ضروری ہے۔ اردو بولنے والے لوگوں کو چاہیے کہ نئی نسل کو بھی اس زبان سے آشنا کریں اور اس بات سے گریز کیا جائے کہ اردو زبان میں بلا ضرورت انگریزی زبان کا استعمال کیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ چین کی ترقی میں چینی زبان جس طرح بالکل حائل نہیں ہوئی اور ہم اپنی زبان پر فخر کرتے ہیں اسی طرح دنیا بھر میں اور بالخصوص پاکستانیوں کو اپنی زبان سے پیار کرنا چاہیے اور اس کی ترقی و ترویج کے لیے بھرپور کام کرنا چاہیے۔

ظفر علی راجا نے اردو شاعری کی پامال شدہ زمینوں کے پس منظر میں نئی زمینیں دریافت کی ہیں۔ نظموں کے ایسے موضوعات تلاش کیے ہیں۔ جن سے اردو ادب پہلے ناآشنا تھا۔

احمد ندیم قاسمی

ظفر علی راجا کی شاعری میں گہرے غموں کا ارتعاش بھی ہے اور آرزوؤں، ولولوں، امنگوں کی لرزش بھی۔ اور ان سے زیادہ انسانی محبت کی شدت۔

میرزا ادیب

ظفر علی راجا نے اپنی شاعری میں ایک جہانِ دگر آباد کیا ہے۔ ان کی شاعری کا اپنا ایک الگ ذائقہ ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا

ظفر علی راجا کی شاعری سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لفظوں کو بڑی آزادی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے اور ایسی لفظیات بھی آزمائی جا سکتی ہیں جنھیں شاعری کی زبان میں کبھی استعمال نہ کیا جاتا ہو۔

جیلانی کامران

معنوی تہہ داری اور دل آویز انفرادیت سے آراستہ، ظفر علی راجا کی سخن طرازی کو اردو شاعری کے ایوان سے ایک بالکل جداگانہ آواز تصور کیا جا سکتا ہے۔

عارف عبدالمتین

جدید عصری احساسات کا خوبصورت عکس

ظفر علی راجا کا تازہ شعری انتخاب

رقصِ تمنّا

قیمت: 200 روپے

رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز

اقبال مارکیٹ، اقبال روڈ کمیٹی چوک، راولپنڈی - 5534774

کرن کرن اجالا

انتساب۔ 58 سرونج بھارت

سہ ماہی سورج کا شمار پاکستان کے بہترین خوبصورت اور اعلیٰ معیاری رسائل میں ہوتا ہے جس کے ایڈیٹر مشہور شاعر ادیب تسلیم احمد تصور ہیں۔ ''سورج'' کے ہر شمارے میں تسلیم احمد صاحب کی صلاحیتیں اور ان کی قابلیت کے علاوہ ان کے حسن انتخاب کی جھلکیاں نمایاں ہیں اتنا خوبصورت اور بہترین نایاب مضامین کو بہت سلیقے سے پیش کرنے کا ہنر ان میں اتنا ہے کہ پرچہ دیکھ کر ہی طبیعت خوش ہو جاتی ہے اس وقت اکتوبر ۲۰۰۵ء کا شمارہ میرے سامنے ہے جس میں پہلی کرن کے عنوان سے تسلیم احمد صاحب کا مختصر مگر جامع اداریہ ہے۔ علامہ اقبال کی دعائیہ نظم ہے۔ جس کا ترجمہ ڈاکٹر خالد حمید نے کیا ہے۔ اختر شیرانی کی نعت شریف کے ساتھ ۱۸ اکتوبر کے سانحے پر دل ہلا دینے والی تخلیقات عبدالعزیز خالد، امجد اسلام امجد، سید تابش الوری، ڈاکٹر وزیر آغا، اسلم کولسری، ریاض حسن چودھری، شاہدہ لطیف، واجد امیر، شاہد واسطی، ظفر علی راجا، محمد ظہیر، شہزاد احمد، ابن عبداللہ شاکر، ماجد صدیقی، شعیب احمد، لطیف ساحل، فوزیہ سلطان، اشرف جاوید، خاور نعیم ہاشمی کیپٹن عطا محمد، حمیدہ شاہین، مختار کھرل، عباس تابش اور شکیل جاوید کی نظمیں شامل ہیں۔ تحقیق وتنقید کے عنوان سے دو بہت اہم مضامین ہیں خط اور خطاطی کی مختصر تاریخ جس میں ایسے کئی نایاب خطوط کی عکاسی ہے کہ جن کے نام شہیدان اسلام کی فہرست میں نمایاں ہیں۔ مثلاً حضرت علیؓ، حضرت عثمان غنیؓ کے علاوہ عہد مغلیہ کے کئی نایاب قدیم خطوط کے عکس موجود ہیں۔ یہ مضمون بڑی محنت اور کھوج کے بعد تحریر کیا گیا ہے دوسرا مضمون کارواں اردو زبان کا پہلا سالنامہ پر ہے۔ بلاشبہ ظفر علی راجا اور ڈاکٹر ریاض قدیر قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے ایسے تحقیقی مضامین تحریر کئے جو کسی معمولی محقق کے بس کا روگ نہیں تھے۔ داستان

طرازی میں عادل ندیم، محمد سعید شیخ، رشید امجد، گلزار جاوید کے علاوہ برطانیہ کے مشہور کہانی کار مقصود الٰہی شیخ کی کہانیاں ہیں۔ بھارت کے نامور افسانہ نگار ڈاکٹر کیول دھیر کا منتخب افسانہ شناختی کارڈ اور ترنم ریاض کے بہترین افسانے ہیں غزلوں اور نظموں کی ایک خوبصورت محفل بھی ہے جن میں تمام معتبر شاعروں کی تخلیقات سورج کی تابناکی میں اضافہ کر رہی ہیں غیر ملکی شعری ادب میں اسلم کولسری نے بہت آسان زبان میں ترجمہ کے ذریعے اچھی نظموں سے روشناس کرایا ہے اس شمارے میں مجھے سب سے زیادہ اور اہم تحریریں دنیا کے عظیم اور ہندوستان کی شان پروفیسر گوپی چند نارنگ کی گفتگو ہے جو ذہن و دل پر گہرا نقش چھوڑتی ہے غرض یہ کہ سورج کے دیدار اور اس کے مطالعہ سے دنیا جہان کی نہ صرف معلومات ہو جاتی ہے بلکہ ایک نایاب خزانہ کی شکل میں قاری کو سب کچھ مل جاتا ہے۔

(ڈاکٹر سیفی سرونجی مدیر انتساب)

ڈاکٹر ستیہ پال آنند۔ امریکہ

بھائی جان: آداب ایک خط چند دن پہلے لکھ چکا ہوں۔ امید ہے آپ تک پہنچ چکا ہوگا۔ یہ خط اسی سلسلے کی کڑی ہے اس خط کے ساتھ دو نظمیں ملفوف ہیں شاید کسی قابل ہوں۔

''سورج'' یقیناً ایک منفرد مجلّہ ہے۔ مضامین نظم و نثر بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں عدم مصروفیت کی بنا پر (جس کی سب سے بڑی وجہ میری اہلیہ کی طویل اور تشویشناک علالت ہے) تفصیل سے کچھ نہیں لکھ پاؤں گا۔ تو بھی یہ عرض کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ مجھے ۱۸ اکتوبر کے زلزلے کے سانحے کے بارے میں نظمیں بے حد رقت انگیز لگیں۔ وقت کی پکار تھی کہ اہل قلم اس دردناک سانحے پر اپنا قلم اٹھائیں اور انہوں نے اپنا فرض بخوبی ادا کیا۔ ''تحقیق و تنقید'' میں ظفر علی راجا صاحب کا ''خط اور خطاطی کی مختصر تاریخ'' اپنی طوالت کے باوجود خاصے کی چیز ہے۔ جو Facsinilies آپ نے بھی ری پروڈیوس کی ہیں' وہ ہیرو غلافی کے تعلق سے مختلف کتابوں میں یہاں مغرب میں دستیاب ہیں، تو بھی اردو میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ یہ مضمون ایک Collector's Item ہے۔ ڈاکٹر ریاض قدیر کا ''کارواں'' کے سرورق کی نقل کے ساتھ مضمون بہت کچھ یاد دلاتا ہے۔ کچھ نام ۱۹۳۵ء کے سالنامے کی فہرست میں ایسے ہیں' جنہیں ہم بھول چکے ہیں۔ سردار کشمیرا سنگھ ایم اے (کارواں نمبر شمار ۱۹ء صفحہ ۸۴) میرے بڑے نانا تھے یعنی نانا کے بڑے بھائی تھے۔ ان کی وفات ۱۹۴۲ء میں ہوئی۔ افسانوں میں رشید امجد کے دونوں افسانے' ترنم ریاض کا' ٹیڈی بیئر، اور میرے دوست اور پسندیدہ افسانہ نگار کیول دھیر صاحب کا منتخب افسانہ پسند آئے۔

مقصود الٰہی شیخ کا ''برسورے نینوا میرے'' ان کے مخصوص انداز میں ہے۔ نظموں میں خالد اقبال یاسر کی طویل نظم بھی ایک Collectors'Item ہے۔ آپ کے قطعات نے متاثر کیا۔ ڈاکٹر نارنگ سے پریم کمار کا انٹرویو میں پہلے انگریزی میں پڑھ چکا ہوں نارنگ صاحب دورِ حاضر کے تیس برسوں میں سب سے بڑے دانشور' نقاد' محقق اور مدبر بن کر آئے ہیں۔ اللہ انہیں حیاتِ خضر دے۔ محمد حنیف رامے کی تصاویر فریم میں جڑوا کر رکھنے کے قابل ہیں اور میں یہ کام فی الفور کر رہا ہوں۔

شاہد واسطی۔ لاہور

تسلیم احمد تصور صاحب سلام و نیاز ابھی ابھی سہ ماہی سورج کا تازہ شمارہ ملا ہے۔ تیزی سے مطالعہ کرنے پر دل باغ باغ ہو گیا حقیقت یہ کہ آپ نے اعلیٰ درجہ کی خوش ذوقی کا ثبوت دیا ہے۔ کیسا عجیب اتفاق ہے کہ ملک کے ممتاز مصور اور دانشور حنیف رامے کا مضمون بعنوان ''غالب اور میں'' اس وقت طلوع ہوا جب رامے صاحب کی زندگی کا سورج غروب ہو رہا تھا اسکے علاوہ کئی بڑے بڑے لکھنے والے شامل ہیں جس سے پرچے کا وقار اور اعتبار بڑھا ہے۔ اور سورج ایک قیمتی دستاویز کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ میری جانب سے ڈھیروں مبارکباد، توقع ہے اردو کی لاتعداد بستیوں میں اسکا بڑی خوش دلی سے استقبال کیا جائے گا۔

گلشن کھنہ۔ ہونسو۔ برطانیہ

محترم تسلیم احمد تصور صاحب! آداب و نیاز! اُمید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔ آپ کے ارسال کردہ سہ ماہی ''سورج'' کا تازہ شمارہ کل ہی باصرہ نواز ہوا۔ اس کرم فرمائی کے لیے میں صمیمِ قلب سے آپکا شکر گزار ہوں ''سورج'' بلاشبہ ایک خوبصورت۔ اہم و قیع اور قابلِ قدر ادبی رسالہ ہے۔ اسے حاصل کر کے جہاں بڑی مسرت ہوئی وہاں اس بات کا افسوس بھی ہوا کہ اتنا اہم اور منفرد جریدہ اب تک میری نظموں سے اوجھل کیوں رہا۔

زیرِ نظر شمارہ مشمولات کے مزاج اور معیار کے لحاظ سے اعلا اور صوری گٹ اپ اور تہذیب و ترتیب کی رو سے بہت عمدہ ہے اور برصغیر کے مقتدر ادبا شعرا کی معیاری اور رنگارنگ نگارشات سے مزین ہے۔ اس میں شامل شعری و نثری تخلیقات نے اسے ایک اہم دستاویز کی حیثیت عطا کر دی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہوں کہ وہ اس خوبصورت جریدے کو نظرِ بد سے بچائے اور ہمیشہ خوب سے خوب ترکی راہ پر گامزن رہے۔ آمین!

برطانیہ میں سہ ماہی ''سورج'' کا تعارف کرانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا اور ممکن ہے کہ اسکے حلقۂ ارباب میں توسیع ہو۔ آپکو میرا اور میرے دوسرے شاعر و ادیب دوستوں کا قلمی

تعاون ملتا رہے گا۔

اہل خانہ کو میرا آداب اور سب ادبی احباب کو میرا سلام پیش کریں اخلاص کار: گلشن کھنہ

عذرا اصغر۔ کراچی

محترم تسلیم احمد صاحب آداب! آپکے پاس ''مسافتوں کی تھکن'' کے میرے لکھے ہوئے ۲۴ صفحات موجود ہیں۔ ۱۶ صفحات مزید ارسال کر رہی ہوں۔ موجودہ پرچے میں میرے لکھے ہوئے تقریباً چوبیس یا ساڑھے چوبیس صفحے پبلش ہوئے ہیں جو رسالے کے ۹ صفحے بنے ہیں۔ اسطرح اب کے چھپنے والی قسط ۹ صفحات سے بڑھ جائیگی۔ آپ اگر چاہیں گے تو میرا اور بھی Matter بھیج دوں گی۔ اگر آج اچانک محترم وارد نہ ہو گیا ہوتا تو میں اور بھی نقل کر لیتی۔ تاہم میں کوشش کروں گی کہ مزید Matter آپکو قبل از وقت ہی ارسال کر دوں۔ ویسے آپکے پاس ۳۸ صفحات موجود ہونگے ان سمیت جواب آپکو موصول ہو رہے ہیں۔

''مسافتوں کی تھکن'' بھی مختلف سائز کے کاغذوں اور دو رنگی سیاہی سے تحریر ہوئے ہیں اور یہ خط بھی۔ اہل علم اس کی کیا توضیح کریں گے، مجھے معلوم نہیں۔ لیکن میرے خیال میں یہ بے ترتیبی میری بے ہنگم مصروفیت کا نتیجہ ہے۔ ورنہ میں خاصی با ترتیب خاتون ہوں۔ گھریلو اور معاشرتی سطح پر۔ مگر میری ذات یونہی بکھری ہوئی اور بے ترتیب ہے۔ یہ سب لکھنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس بات کو اہمیت نہ دیجئے گا ہم سنتے اور پڑھتے آئے ہیں کہ فلاں لکھنے والا ایسا کاغذ استعمال کرتا تھا۔ اعلیٰ درجے کا قلم اور فلاں رنگ کی روشنائی۔'' تو بھائی ہوگا۔ ہمارے سامنے تو جو آجاتا ہے اسے قبول کر کے اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ لفظ لکھے گئے۔۔۔۔ قلم چلا تو سہی۔ اس رب نے اتنی صلاحیت اور طاقت بخشی۔۔۔ اسکا کرم۔۔۔ اس کا شکر۔۔۔۔ سو آپ اعتراض نہ کیجئے گا۔ میرے کرنے کا جو کام ہو بلا تکلف کہئے۔ میں کچھ کر سکی تو خوشی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ آپکو اس مشن میں کامیابی عطا کرے۔

شاہین فصیح ربانی۔ کراچی

محترم تسلیم احمد تصور صاحب السلام علیکم! اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ سہ ماہی ''سورج'' جنوری تا مارچ ۲۰۰۶ء محترم جامی کی وساطت سے حاصل ہوا۔ دیکھنے ہی میں خوبصورت نہیں ہے بلکہ اپنے اندر بہت عمدہ مواد بھی سمیٹے ہوئے ہے۔ مجھے اس میں شامل سانحہ ۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء کے حوالے سے شعری تخلیقات نے بہت متاثر کیا۔ دیگر افسانے اور غزلیں بھی بہت اچھی ہیں۔ محمد حنیف رامے نے غالب کے اشعار کو بہت عمدگی سے مصور کیا ہے یہ پینٹنگ اس شمارہ کی اہمیت کو اضافہ کر رہی ہیں۔

آئندہ شمارے کیلئے اپنی غزل اور ماہیئے پیش کر رہا ہوں امید ہے کہ جگہ دے کر ممنون فرمائیں گے۔

احباب کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہوں۔

ماہنامہ شاعر۔ بمبئی (بھارت)

حالیہ برسوں میں ہند و پاک اور اردو کی نئی بستیوں، سے جو ماہنامے دو ماہی اور سہ ماہی شائع ہوئے ہیں، ان میں ''سورج'' کو بعض خصوص میں انفرادیت حاصل ہے۔ اس کا جاذب نظر اور وجدان پرور رنگین سرورق، عالمی شہرت مند مصور اور خطاط، موجد (بشیر) کے موقلم کا شاہکار ہے اور ادبی رسائل کے متلاشی، ذہین قارئین کیلئے وجدان بھر کشش کا حامل بن گیا ہے۔ اس میں جو چوکٹے سجائے گئے ہیں ان میں اشفاق احمد، محمد طفیل، حمید اختر اور بیگم ریاض خیر آبادی شامل ہیں۔ سانسوں سانس جینے والے شاعر اور سیاستداں، جمیل الدین عالی کا چہرہ بھی نمایاں ہے۔ یہ خاموش بیانیہ سرورق قاری کو متجسس کر دیتا ہے کہ سرسری گزر کر اسے اپنے مطالعے کی میز پر، سجا دو اور پھر جستہ جستہ اپنے ذوق و وجدان کو سیراب کرتے جاؤ۔ ساتھ ہی آئندہ شمارے کے انتظار کو بھی اسی میز پر، خاموشی کے ساتھ رکھ دو۔

متنوع فہرست میں، تحقیق و تنقید کے تحت ایک جاندار اور چونکا دینے والے تاریخی حقائق (نادر و نایاب تصاویر و دستاویزات) پر مبنی لاہور شہر کے بارے میں مضمون رسالے کی جان ہے۔ اسے شہرہ آفاق، ماہر آثار قدیمہ، انجم رحمانی نے تحریر کیا ہے۔

داستان طرازی، فکشن کا باب ہے اس میں ۵ کہانیاں، ایک فراموش کار فکشن نگار حمید اختر پر مختصر گوشہ دیا گیا ہے اُردو کے ادبی رسائل میں گوشہ در گوشہ ایک نیا تجربہ ہے۔ جو شاعر کی اختراع ہے۔ تمام ادبی رسائل کے مدیران کو چاہیے کہ اپنے ملک، صوبے اور شہر کے مشاہیر پر مختصر گوشے، مکمل سوانحی کوائف کے ساتھ شائع کریں، تا کہ اُردو ادب کی ایک عالمی تاریخ، مرتب کرنے میں آسانی ہو اور تمام تر تحقیقی لوازمہ دستیاب ہو سکے۔ مشہور افسانہ نگار اور رسالہ تجدید نو کی مدیرہ عذرا اصغر کا ناول سانسوں کی تھکن (دوسری قسط) بھی دیا گیا ہے۔ موسیقی پر تحقیقی مضامین کیلئے مشہور شاعر و ادیب، ادیب سہیل کا مضمون، ساحر لدھیانوی کے شہر لدھیانہ کا ایک سفر شامل کیا گیا ہے۔

ایک مختصر گوشہ اشفاق احمد (مرحوم) کو محیط ہے۔ اس میں ۱۲ نادر و نایاب خطوط بنام محمد طفیل دیئے گئے ہیں۔ خطوط کے عکس مع متن اہم ہیں تاہم ان پر حواشی ضروری تھے۔ ایک مشہور ناولٹ قصہ داستان گو کا بھی دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ مختصر گوشہ خاصہ کامیاب ہو گیا ہے۔ تاہم

اس میں ایک کمی بے طرح چبھتی ہے۔ مدیر کے قلم سے ابتدائیہ مع اشفاق احمد۔ ایک نظر میں، سوانحی کوائف ضروری تھے۔

نوائے سروش کے باب میں جمیل الدین عالی کی طویل نظم انسان کا ایک باب شائع کیا گیا ہے۔ اس پر مدیر کے حوالہ جاتی شذرات درج ہیں۔ یہ تاریخی نظم پاکستان کے مختلف جرائد میں شائع ہوتی رہی ہے۔ اس کا ذکر تو کیا گیا ہے تاہم میرے خیال میں یہ نظم، قسط وار، افکار (کراچی) میں شائع ہونا شروع ہوئی تھی۔ اس کا حوالہ دینا ضروری تھا کہ کس شمارے سے کس شمارے تک شائع ہوئی تھی، صہبا لکھنوی مرحوم نے اس پر اپنا ادارتی شذرہ لکھا تھا۔ دیگر شعراء کی ۱۵ نظمیں اور ۱۴ شعراء کی غزلیں، رسالے کی معنویت میں اضافہ کرتی ہیں۔

ادبی کہانی۔۔۔ تصویروں کی کہانی، اس میں نقوش (لاہور) کے نئے مدیر، جاوید طفیل (ابن طفیل) کی طرف سے دیئے گئے گروپ فوٹو میں کئی ایک مشاہیر ماضی کے اردو ادب کے یاد بسیرے روشن کرتے ہیں۔ کلام شاعر، بخط شاعر، میں پاکستان کے معروف شاعر اسلم کولسری کی دو غزلیں مع تعارف اور اسکیچ دی گئی ہیں۔

پاکستان کے ایک اور باکمال مصور و شاعر، اسلم کمال کا طویل ترین مضمون مصور اور ماڈل، بیحد دلچسپ اور حیرت انگیز حقائق پر مبنی ہے۔ ۱۶ صفحات پر مشتمل یہ مضمون ''سورج'' کے معیار و وقار کو، وزن و وقار عطا کر رہا ہے۔

''سورج'' میں رنگین اشتہارات متوجہ کرتے ہیں۔ ابتدائی ۶ صفحات اور آخر کے ۲ صفحات پرکشش ہیں۔ کرن کرن اجالا مکاتیب کا باب ہے۔ اس میں قارئین کے ۲۸ مختصر و طویل خطوط دیئے گئے ہیں۔ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ کافی برسوں سے شائع ہو رہا ہے اور یکساں پسندیدگی کا مرکز بنتا جا رہا ہے۔ رسالے کا ابتدائیہ پہلی کرن مدیر نے تحریر کیا ہے اور دلچسپ کہانی انداز لئے ہوئے ہے۔

اپنی تمام ترخوب سیرتی کے باوجود، پاکستان کے ادبی رسائل کی ایک بڑی خامی، بے طرح چبھتی ہے اور وہ ہے قلم کاروں کی تصاویر اور پتے۔ ویسے بعض رسائل میں تصاویر دی جاتی ہیں۔ لیکن سوانحی کوائف کے معاملے میں رسائل ادھورے معلوم ہوتے ہیں کون شاعر و ادیب، کب پیدا ہوا، اس کا انتقال کب اور کہاں ہوا؟ اس کی تصانیف مع اشاعتی سنین درج نہیں ہوتے۔ سورج ایسے خاص ادبی جریدے کی تزئینی صورت گری کی جاسکتی ہے کہ آئندہ شماروں میں ان امور پر خصوصی توجہ دی جائے گی۔

Not patched together

by: Kazy Javed

Having completed 33 years of publication, the quarterly literary journal "Suraj" continues to appear almost regularly it is now edited and published by Tasleem Ahmad Tassawar, who is known as a writer and journalist. "Suraj's" current issue, January to March 2006, has already reached the book-stalls.

It carries some literary pieces which are expected to generate discussion in the coming weeks.

One of these pieces is penned by noted fictionist Rasheed Amjad, who has explained his creative process. He reveals that he never writes for the common people. "My readers," he writes, "look for me. I don't search for readers. Only those people can share my delights who can feel the depths of my experience. I don't patch together a story; I never piece together a story by joining various parts. It dawns upon me like an idea and is committed to paper as a unit after passing through the creative process."

Rasheed Amjad further claims that he never searches for words to express his idea. The Idea brings suitable words with itself. "My creative world," he says, "is different from that of many contemporary writers and so is my creative process. My literary creations are always based on my subjective experience."

Another interesting piece carried by the current issue of "Suraj" is a brief letter written by Shahzad Ahmad. He has raised a question: is composing poetry more difficult than writing prose?

His own answer is in the negative. Shahzad Ahmad, who has published volumes on philosophy, psychology and literary criticism, as well as many collections of poetry says that poetry is usually composed according to pattern that have been developed over the centuries. These patterns provide help in the process of poeticising. However, no such help is available to those who write in prose. They are left to make their own way. Hence their job is more difficult than that of a poet.

The current issue of the "Suraj" also contains interview of Mohsin Bhopali and Gopichand Narang. The short stories included in the issue are written by Adil Nadim Mohammad Saeed Sheikh, Rasheed Amjad and Maqsood Elahi Sheikh.

The News Lahore (15th January 2006)

مشتاق اعظمی (آسن سول، بھارت)

افسانہ پیش خدمت ہے۔ ہمارے یہاں اغوا کے جو مسلسل واقعات ہو رہے ہیں، افسانہ اسی پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ دو نا آسودہ حال نوجوانوں کی ذہنی کش مکش بالآخر مثبت انجام پر ختم ہوتی ہے۔ افسانہ پسند آئے تو خوش، پسند نہ آئے تو خوش! یہ محض آپ کے ارشاد کی تعمیل ہے۔

خدا کرے آپ مع الخیر ہوں۔

عبدالاحد سازؔ (ممبئی)

محترم تسلیم احمد تصور صاحب، آداب؛ دہلی میں آپ سے ملاقات کی مسرت و سرشاری ابھی ذہن میں بالکل تازہ ہے۔ آپ نے سورج کا تازہ شمارہ (بابت جنوری - مارچ ۲۰۰۶ء) عنایت فرمایا تھا۔ ممبئی لوٹ کر اسے غور سے پڑھا تو لگا اس قدر بھرپور اور توانا رسالے سے ہم اب تک کیوں محروم رہے۔ شروع سے آخر تک رسالہ آپ کے مدیرانہ ذوق انتخاب، دقت نظر اور اہتمام ادارت کا غماز ہے۔

سانحۂ ۸/ اکتوبر پر آپ نے اس قدر اہم شعرا کی اس قدر متاثر کن نظمیں اتنی جلدی فراہم کروا دیں۔ منظوم حصے میں نظمیں، غزلیں تقریباً سب ہی معیاری ہیں۔ خالد اقبال یاسر کی طویل نظم ''رخصتی'' اپنے اندازِ ترسیل کی ندرت، جمالیاتی تلازموں، غنائی و صوتی در و بست اور بحر کے بہاؤ کی بنا پر ایک مرقع حسن بن گئی ہے۔ اسلم کولسری کے غیر ملکی نظموں کے تراجم کا بھی جواب نہیں۔ افسانے تو ابھی پڑھ نہیں سکا ہوں مگر انھیں لکھنے والوں کے نام بہت متوجہ کن ہیں۔ ڈاکٹر نارنگ سے ملاقات اور غالب اور میں دونوں بے حد دلچسپ فیچرز ہیں۔ پہلی کرن میں آپ نے قاری سے بڑا اپنائیت بھرا مصافحہ کیا ہے۔

خدا آپ کو بخیر و عافیت رکھے۔

ناصر شہزاد (اوکاڑہ، پاکستان)

مرزا اسد اللہ غالب پر حنیف رامے کا مضمون ''قندِ مکرر کے طور پر'' میرے آئینہ ذہن میں دوبارا تقرر ہوا۔ یہ مضمون ''سویرا'' کے توسط سے پہلے بھی میری نگاہ کو ادب و آگہی کا گواہ بنا چکا ہے۔ غالب پر بیشتر مضمون پڑھے ہیں مگر اس سے زیادہ معتبر مضمون شاید اب تک میرے ضمیر اور

میرے وجدان کے خمیر کا حصہ نہیں بن سکا۔ جس میں تعمیر ہی تعمیر ہے انسانی زندگی اور اُس کی تابندگی کی:

سخن تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

ممتاز محقق اور ماہر لسانیات ڈاکٹر گوپی چند کا انٹرویو بہت سر بلند ہے پڑھ کر ان کی ادیبانہ سگندھ سے ارجمند ہوا۔ قرۃ العین طاہرہ کا محسن بھوپالی کے ساتھ کیا ہوا انٹرویو بس واجبی سا ہے۔ جو بہترین حاجی کے تقاضے پورے نہیں کرتا۔ مسعود اشعر ہمارے خاصے منجھے ہوئے ادیب ہیں۔ اُن کا مضمون ''ادب اور امن'' ڈھیروں سمندر ہونے والی بحثوں کو راجندر کر رہا ہے۔ اُن کا یہ کہنا درست ہے کہ پہلے ہم اُس لٹریچر کا قلع قمع کریں۔ جو گذشتہ پچاس سال میں ہم نے اپنے بچوں کو پڑھایا ہے۔ تب دوستی کے فعال رستے پرشکال ہو سکتے ہیں اور پاک و ہند کی سرحدوں میں جو دوری اور مہجوری ہے۔ وہ حمد وحضوری کی طرف بڑھ سکتی ہے۔

''پومئی کا آخری مسیحا'' عادل ندیم کا افسانہ دلچسپ تو ضرور ہے، لیکن اس کا آخری بچ افسانے سے مفرور ہے۔ جو افسانہ کے ظہور کو بے نور کر رہا ہے۔ محمد سعید شیخ بڑے صاف اور شفاف ذہن کے افسانہ نگار ہیں۔ کہانی کو جان بوجھ کر الجھن اور کسی فنی الجھیڑے کے سپرد نہیں کرتے، ان کی کہانی ابلاغی اعتبار سے پائیدار اور برقرار ہوتی ہے۔ اُن کی یہ کہانی بھی ارتقائی طور پر دلربائی اور معجز سرائی سے گزر رہی ہے۔ رشید امجد کا رقم کیا ہوا یہ جملہ ہی کافی ہے کہ ''میں لکھتا اس لیے ہوں کہ اپنا اظہار چاہتا ہوں۔ ہر لکھنے والے کو اپنی ذات کا اظہار، درکار ہوتا ہے۔ اُسے دشوار گزار مراحل اور ناہموار مسائل سے ہم کنار کر کے، کوئی کرن کار، کام نہیں ہوتا۔ رشید امجد کا زیرِ نظر افسانہ بھی ایک عام آدمی کے خواب اور اُس کے اندر کے عذاب کو بانصاب کر رہا۔ اپنے معاشرہ کے موجودہ قضیوں اور رویوں سے اجتناب کرتا ہوا۔ ان کے افسانے کا جن علی بخش ضمیر کی وہ آواز ہے۔ جو خواہشات کی جاگیر کو زنجیر کرنا واجب گردانتا ہے۔ اپنے ہم زاد کی خواہش اور فرمائش پر۔ گلزار جاوید نے اپنے افسانے کی بنت انشائیہ اور فکاہیہ کے ''شاہرائیہ'' راستوں پر چل کر کی ہے۔ جو فکشن کے لیے ایک اچھا تجربہ ہے۔ کیول دھیر کا افسانہ ''شناختی کارڈ'' ہمارے موجودہ نظام کی بے راہ روی اور صورت گری کی پہچان میں بلوان ہے۔ الفاظ کے مہان اور معتبر جہان کے ساتھ۔ مقصود الٰہی شیخ کا افسانہ واقعاتی طور پر بہت جذباتی افسانہ ہے۔ مجھے اس کے بہاؤ میں کہیں کہیں بہت اچھے اور سچے رچاؤ دکھائی دیے۔

ظفر علی راجا نے خطاطی کے بارے میں بڑا کراماتی مضمون لکھا ہے۔ اتنا کراماتی کہ اس کی مناجاتی صورتیں رہ رہ کر دل و دماغ میں مورتیں بناتی چلی جا رہی ہیں۔ آگاہی ــــ ایقان اور تخلیقی

سربراہی کی مورتیں۔

زلزلہ کے ضمن میں ''سورج'' نے جو نظمیں چھاپیں۔ وزیر آغا اور اسلم کولسری کی نظمیں، یقیناً کبھی ادب عالیہ کی فہرست میں شمار و استوار ہوں گی۔ اسلم کولسری نے انگریزی نظموں کے جو ترجمے اردو میں کیے ہیں۔ وہ بھی بہتر ہیں۔ خالد اقبال یاسر کی نظم ''رخصتی'' جہاں ان کی تاریخ دانی کا اظہار کرتی ہے۔ وہاں اُن کی شعری معجز بیانی کے وقار کی بھی عکاس ہے۔ دیگر نظموں میں ادیب سہیل اور تسلیم احمد تصور کی نظمیں بہتر ہیں۔ غزلوں میں امجد اسلام امجد، انور شعور، تسلیم احمد تصور اور ڈاکٹر سعید اقبال سعدی کی غزلیں اچھی لگیں۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگل پور (بھارت)

محترم تسلیم احمد تصور صاحب! سلام مسنون: انیسویں صدی کا عجوبہ ہوا کہ میرے پتہ پر بھاگل پور شہر کا نام نہیں تھا اس کے باوجود ''سورج'' میرے گھر آن پہنچا۔ جبکہ یہاں ڈاک کا نظم بے حد خراب ہے۔ چالیس فی صدی میری ڈاک ہر ماہ ضرور گم ہوتی ہے۔

''سورج'' پہلی بار دیکھا پڑھا۔ ذہن میں تازگی بھر گئی ہے۔ اس تنوع کے ساتھ اتنے دیدہ زیب اور بے حد معیاری رسالے پر مبارک باد قبول کریں اور مجھے بھیجنے کا شکریہ لیں۔ میں اس پر تبصرہ حیدر آباد کے ماہ نامہ ''رنگ و بو'' میں اپنے کالم ''میرا مطالعہ'' میں کروں گا۔

حکیم خان حکیم، ضلع اٹک، (پاکستان)

محترم جناب تسلیم احمد تصور صاحب! السلام علیکم! امید واثق ہے خیریت سے ہوں گے آپ کا جریدہ سہ ماہی ''سورج'' ایک دوست کی وساطت سے دیکھنا نصیب ہوا بہت دیدہ زیب ٹائٹل اور معیاری پرچہ ہے ماشا اللہ آپ نے خوب محنت سے اسے سنوار کر چار چاند لگا دیئے ہیں۔ غزلیات اور منظومات کا قابل ستائش انتخاب دل کو اپنی طرف کھینچنے لگا بے ساختہ دل آپ کو داد دینے پر مجبور ہوگیا۔

مضامین، افسانے، علمی ادبی اور تحقیقی حوالوں کے ساتھ زبردست ہیں۔ اگر کوئی پرانا جریدہ تعارفی طور پر ارسال کریں تو نہایت ممنون رہوں گا۔ علاوہ ازیں بذریعہ VP ہر تازہ شمارہ بھیج دیا کریں۔ اپنی ایک غیر مطبوعہ تازہ غزل ارسال کر رہا ہوں۔

البیلی رُتوں، اَن دیکھے موسموں، اَن سنی آہٹوں، چہچہاتے پرندوں، گیت گاتے مسافروں، لہلہاتے کھیتوں، جھومتی ہواؤں، اُڈتے بادلوں، سرسراتی ندیوں، گنگناتی آبشاروں، سرگوشیاں کرتے پہاڑوں، سوچوں میں گم سمندروں، خوشبو بکھیرتے پھول پودوں، گدگداتی اُمنگوں اور اَن دیکھے خوابوں سے منسوب

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہار سُو

مدیر مسؤل: گلزار جاوید

مدیر معاون: بینا جاوید

مجلس مشاورت
قارئین چہار سو

زر سالانہ
دل مضطرب نگاہِ شفیقانہ

رابطہ: 537، ویسٹریج-III، راولپنڈی۔ فون: 5467235 - 92-51-5462495

ای میل: waqars_0ma@yahoo.com

غالب میموریل ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام

غالبیات کے باب میں نئے منصوبے

غالب
میموریل
ٹرسٹ

نئی ضروریات
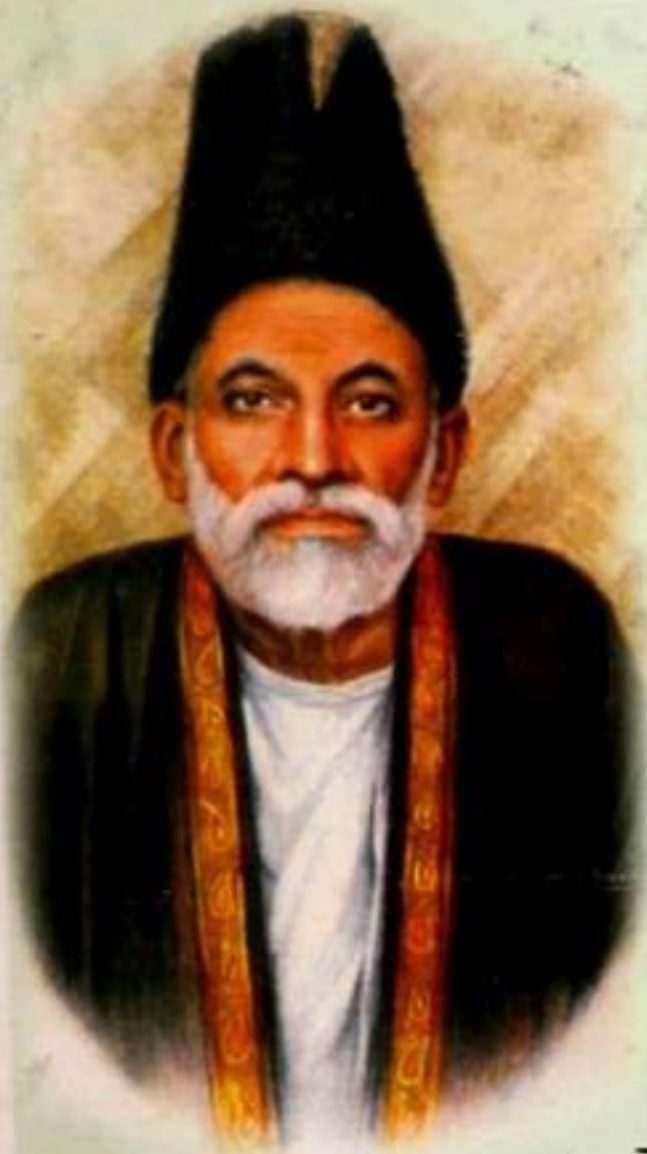
- غالب کے کل فارسی کلام کے ترجمے اور شرحیں لکھوائی جائیں گی۔
- سہ ماہی جریدے کا اجراء۔
- غالب کے معاصرین، متعلقین اور تلامذہ کی توضیحی فہرست مرتب کی جائے گی۔
- عالمی سطح پر ہونے والے غالب پر کام کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ۔
- غالب کے انگریزی تراجم کا لسانی تنقیدی مطالعہ۔
- نوادرات غالب کی جمع آوری اور غالب میوزیم کا قیام۔
- پاکستان کی علاقائی زبانوں میں کلامِ غالب کے تراجم کا اہتمام۔
- غالب کے نثری وشعری متون کی صحت کے ساتھ اشاعت۔
- کالج اور یونیورسٹی کے طلباء، وطالبات اور غالب سے عمومی دلچسپی رکھنے والوں کیلئے کلامِ غالب کی تسہیل۔
- اشارات وتلمیحات غالب کی کئی جلدوں میں تیاری اور فراہمی۔
- انٹرنیٹ پر غالب کے فن، کلام، زندگی اور کتب پر ویب سائیٹ کا قیام اور غالب ونڈوز پر فراہمی۔
- سی ڈیز پر غالب کے بارے میں پاکستانی اور ہندوستانی فلموں کی منتقلی،
- تمام ٹی وی اور تھیٹر ڈراموں کی ریکارڈنگ حاصل کر کے سی ڈی پر منتقل کرنا۔
- دلچسپی رکھنے والے غالب دوستوں کو غالب پر کمپیوٹرائزڈ مواد کی مناسب نرخوں پر فراہمی اور بین الاقوامی سطح پر مواد کی منتقلی۔
- غالب کے حوالے سے اہم دنوں کی روشنی میں ٹی وی پر خصوصی پروگراموں کا اجراء۔
- غالب کی نمائندہ غزلوں کو جدید انداز میں ریکارڈ اور عکس بند کر کے تجارتی بنیادوں پر تیار کرنا۔

غالب میموریل ٹرسٹ کو دیئے گئے عطیات انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں

غالب میموریل ٹرسٹ

رجسٹرڈ آفس: 6/A، نصیر الدین روڈ، اسلام پورہ، لاہور۔ فون: 7226970
Email: ghalib_trust@yahoo.com